وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (الحجر:٢٢)

تفسیرِ کبیر

مُصنّفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود

جلد پنجم

مشتمل بر

سُورۃ مریم ۔ سُورۃ طٰہٰ ۔ سُورۃ الانبیاء

نظارت نشر و اشاعت قادیان

نام کتاب : تفسیر پنجم۔ششم

تصنیف لطیف : حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ

سن اشاعت : فروری تبلیغ 2004

باہتمام : نظارت نشر و اشاعت قادیان

تعداد : 2000 (دو ہزار)

مطبع : پرنٹ ویل امرتسر

ISBN- 81-7912-051-1

نوٹ : تفسیر کبیر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے اس کے چار ایڈیشن ربوہ اور لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک عرصہ سے ہندوستان میں تفسیر کبیر کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ازراہ شفقت مکمل سیٹ کو پانچ جلدوں میں قادیان سے شائع کرنے کی منظوری عنایت فرمائی ہے۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اسے ہر لحاظ سے مبارک اور بابرکت کرے اور لوگوں کے ایمانوں کو جلا بخشنے کا باعث ہو۔ آمین۔

ناظر نشر و اشاعت قادیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ　　نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡدِ

پیش لفظ بار اوّل

تفسیر کبیر کی یہ جلد سورۂ مریم، سورۂ طٰہٰ اور سورۃ الانبیاء کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ اِس جلد میں عیسائی مذہب کے عقائد کی تردید نہایت جامع و مانع طریق سے کی گئی ہے اور محقق ادیان کو بڑی بڑی کتب کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتی ہے اور سورۂ مریم کی تفسیر میں عیسائی مذہب کے عقائد اور خیالات کا تاریخی رُو سے غلط ہونا ثابت کرکے قرآن مجید کے بیان کی صداقت ظاہر کی گئی ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اِن سورتوں کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے ایسے ایسے معارف و حقائق بیان فرمائے ہیں جو پہلی تفسیروں میں پائے نہیں جاتے اور جو شخص اِس تفسیر کا بغور مطالعہ کرے گا اُس پر قرآن مجید کا کلام اللہ ہونا روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جائے گا۔

دُعا کے لئے درخواست

حضرت امیر المؤمنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے اپنی مرحومہ و مغفورہ بیوی حضرت سیدہ اُمّ طاہر غفر اللہ لہا و نوّر مرقدہا و احسن مثواہا کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے دس ہزار روپیہ برائے طباعت تفسیر قرآن کریم دیا تھا تا اس کی آمد سے قرآن کریم کی تفسیر اور احادیث اور سلسلہ احمدیہ کی ایسی کتب جو تائیدِ اسلام کے لئے لکھی جائیں شائع کی جاتی رہیں اور اِس صدقۂ جاریہ کو اللہ تعالیٰ مرحومہ و مغفورہ کی بلندیٔ درجات اور قُربِ الٰہی کا موجب بنائے۔ چنانچہ اسی فنڈ کی آمد سے الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ ربوہ تفسیر کبیر کی یہ جلد شائع کر رہی ہے۔ اِس لئے میں قارئینِ کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ جہاں وہ اِس تفسیر میں مذکورہ معارف و حقائق سے مستفید ہوں اور حضرت امیر المؤمنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے لئے دعاءِ خیر کریں وہاں وہ حضرت سیدہ اُمّ طاہر غفر اللہ لہا و اکرم مثواہا کی بلندیٔ درجات کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ مرحومہ نے اپنی زندگی میں لجنہ اماء اللہ کی تنظیم کو کامیاب بنانے میں نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں اور یتامیٰ اور بیوگان کی خبرگیری میں ایک نہایت اعلیٰ اور شاندار مثال قائم کی تھی اور مرحومہ نہایت متواضع اور ملنسار طبیعت رکھتی تھیں اِس لئے خواتینِ سلسلہ کو مرحومہ سے حد درجہ محبت تھی۔ مرحومہ کے لئے دعا کرنے کے ساتھ قارئینِ کرام اُن کے بچوں صاحبزادی امۃ الحکیم سلمہا اللہ اور صاحبزادی امۃ الباسط سلمہا اللہ اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سلمہٗ ربّہٗ اور صاحبزادی امۃ الجمیل سلمہا اللہ کے لئے بھی دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جدّ امجد اور اپنے والد ماجد کے نوروں کا وارث بنائے اور وہ آسمانی بادشاہت کے چمکتے ہوئے ستارے بنیں۔ آمین

خاکسار

جلال الدین شمس

(مینجنگ ڈائریکٹر الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ)

۲۰ مارچ ۱۹۵۸ء

الفہرست

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ مریم ۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَهِیَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰیَۃً مَعَ الْبَسْمَلَۃِ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ننانوے آیات ہیں۔ [1]

[1] اس سورۃ کا نام اس مناسبت سے مریم رکھا گیا ہے کہ اس میں جو بڑا اور مہتم بالشان واقعہ بیان ہوا ہے اور جس کے گرد دوسرے تمام واقعات چکر لگاتے ہیں وہ حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ ہے۔ یوں تو حضرت مریم علیہا السلام حضرت عیسٰے علیہ السلام کی والدہ ہونے کے باوجود بہرحال ایک غیر نبیہ عورت تھیں اور حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو ان پر فضیلت حاصل تھی۔ لیکن ہر شخص اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً جب ہم نے اس بات کا ذکر کرنا ہو کہ کوئی شخص کسی نے اعلیٰ درجہ کے کیریکٹر کو دیکھ کر اپنی ذہانت اور تقویٰ کی وجہ سے کس طرح جلد سے جلد اس پر ایمان لے آتا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ ہم اس کی مثال میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں پیش کر سکتے کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مثال آپ کے مقام کی بلندی کے لحاظ سے یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ ایسے موقعہ پر لازماً ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام لیں گے اور انہی کے وجود کو بطور مثال پیش کریں گے۔ اسی طرح خواہ ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علیؓ سے اپنے درجہ اور مقام میں بڑا سمجھتے ہوں لیکن اگر یہ ذکر ہو کہ کس طرح بعض ذہین اور ہوشیار لڑکے چھوٹی عمر میں ہی صداقت کو پا لیتے ہیں اور اس کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو اس امر کی مثال کے طور پر ہم حضرت ابوبکرؓ کا نام نہیں لیں گے جب بھی نام لیں گے حضرت علیؓ کا لیں گے۔ تو چونکہ اس سورۃ میں زیادہ تر ایسے امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مریم اور مریمی صفات والے وجودوں کی طرف انسان کی توجہ کو منعطف کرتے ہیں۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس سورۃ میں حضرت ابراہیمؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت ادریسؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت زکریاؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت یحیٰؑ کا بھی ذکر ہے اس سورۃ کا نام مریم رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۃ ہم کو مریم اور مریمی صفات والے وجودوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ *(سورۂ مریم کی وجہ تسمیہ)*

یہ سورۃ مکی ہے اور وہ تمام صحابہؓ جنہوں نے اس بارہ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اس کو مکی ہی قرار دیتے ہیں۔ مغربی مصنف بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ راڈول وہیری اور میور یہ تینوں مستشرق اس کے مکی ہونے کے قائل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس کے زمانہ نزول کو ذرا آگے پیچھے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً میور کے نزدیک اس کا وقت نزول قبل از ہجرت زندگی کے آخری زمانہ کے ساتھ ملتا ہے یعنی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم طائف کے لوگوں کو تبلیغ کرنے کے لئے گئے اور انہی سنگدلی اور بدسلوکی *(سورۂ مریم مکی ہے)*

کی وجہ سے واپس آگئے تو میور کے نزدیک اُس وقت یہ سورۃ آپ پر نازل ہوئی تھی۔ اور یہ واقعہ دسویں سال نبوت کا ہے۔ گویا وہ اس سورۃ کو آخری مکی زندگی کی قرار دیتا ہے۔ راڈول اس کو مکی ہی قرار دیتا ہے لیکن کوئی خاص وقت اس کے لئے معیّن نہیں کرتا۔ اور وہیری جیسا کہ اس کی عام طور پر عادت ہے بات وہی کہہ دیتا ہے جو ہماری تاریخوں میں ہوتی ہے۔ لیکن کوشش کرتا ہے کہ نیش زنی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اُس نے بھی یہی قرار دیا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے لیکن ابتدائی زمانہ کی ہے۔ صرف اپنی علمیت جتانے کے لئے اتنا فرق بتاتا ہے کہ یہ سورۃ اتنی ابتدائی نہیں جتنی صحابہؓ کہتے ہیں بلکہ اس سے سال بھر پیچھے کی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تیرہ سو سال بعد پیدا ہو کر اس کو یہ کس طرح پتہ لگ گیا۔ کہ یہ سال بھر پہلے کی ہے یا بعد کی۔ اس قسم کا قول محض تمسخر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے اسلام کا جو دوسرا دور تھا یعنی ہجرتِ حبشہ کا۔ اس کے ابتداء میں یہ نازل ہوئی اور پھر کچھ عرصہ تک نازل ہوتی چلی گئی۔ گویا وہ اس کو پانچویں یا چھٹے سال کی قرار دیتا ہے۔ لیکن سند کوئی نہیں بیان کرتا۔ (کمنٹری آون دی قرآن وہیری جلد سوم)

اس بارہ میں حدیثوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہی اصل روایات ہیں جن پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنہوں نے اس زمانہ کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہی صحیح گواہی دے سکتے ہیں کہ یہ سورۃ کب نازل ہوئی۔ وہ یہی ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کی سورۃ ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نہایت ابتدائی صحابہؓ میں سے تھے وہ اس سورۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ میرے ابتدائی اموال میں سے ہے۔ بخاری میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے متعلق آتا ہے کہ قَالَ فِيْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَالْكَهْفِ وَمَرْيَمَ اِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ (بخاری کتاب التفسیر) یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم یہ ابتدائی زمانہ میں نازل ہونیوالی سورتوں میں سے ہیں۔ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ۔ اور یہ میرے پرانے اموال میں سے ہیں۔ یعنی جب میں ابتداء میں اسلام لایا تو اس وقت جو سورتیں میں نے حفظ کیں۔ اُن میں یہ سورتیں بھی شامل تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ابتداء میں اسلام لایا اور جس نے یہ سورتیں یاد کیں ہم اُسکی بات مانیں گے یا اس پادری کی بات مانیں گے۔ جو تیرہ سو سال بعد پیدا ہُوا۔

یہ تو مذہبی ثبوت ہے۔ تاریخی ثبوت اِس بات کا کہ یہ سورۃ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب دشمنی کا زور بڑھ گیا اور دشمنوں نے اسلام کو اپنی پوری طاقت اور قوت سے کچلنا چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو بلا کر فرمایا کہ تم لوگ یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ ہمیں ہجرت کے لئے فرماتے ہیں تو کیا آپ بھی ہجرت کر کے تشریف لے جائیں گے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں مَیں اس وقت تک انتظار کروں گا۔ جب تک کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے مجھے ہجرت کا واضح حکم نہ مل جائے لیکن تم پر جو مظالم ہو رہے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے میرا دل یہی چاہتا ہے کہ تم ہجرت کر جاؤ انہوں نے کہا یا رسول اللہ کونسا ملک ہے جہاں ہمیں امن میسر آسکتا ہے۔ آپ نے مغرب کی طرف ہاتھ اُٹھا کر

فرمایا ادھر ایک ملک ہے جس کا بادشاہ عادل اور منصف ہے۔ تم اگر وہاں چلے جاؤ تو تم کو امن میسّر آجائے گا۔ وہ اشارہ آپ کا ایبے سینیا کی طرف تھا جس کو حبشہ کہتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے ارشاد پر صحابہؓ کی ایک جماعت اُدھر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ جو لوگ اُدھر ہجرت کر کے گئے۔ اُن میں حضرت جعفر بن ابی طالب بھی تھے جو حضرت علیؓ کے سگے بھائی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ جب یہ لوگ مکہ سے حبشہ چلے گئے تو پہلے تو کفار نے خیال کیا کہ اچھا ہُوا مسلمان مکہ سے نکل گئے اور ہماری کوششیں کامیاب ہوگئیں لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے وفادار غلام حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور کئی اور بڑے بڑے خاندانوں کے نوجوان اطمینان سے مکہ میں بیٹھے ہیں اور مکہ کی تبلیغ اُسی پرانے جوش و خروش سے جاری ہے تو انہیں خیال آیا۔ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو مکہ سے نکال دینا ہماری کامیابی نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ ہماری شکست کی علامت ہے۔ کیونکہ اس طرح اسلام کے دو مرکز قائم ہوگئے اور مکہ سے نکل کر تبلیغ ایک قوم کی جگہ دو قوموں یعنی اہل مکہ اور حبشیوں میں ہونی شروع ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب انہیں یہ اطلاعات بھی ملنی شروع ہوگئیں۔ کہ ان لوگوں کو امن میسّر آگیا ہے اور نہ کوئی انہیں مارتا ہے نہ پیٹتا ہے اور نہ کسی قسم کا دُکھ دیتا ہے بلکہ وہ آرام سے عبادتیں اور ذکر الٰہی کرتے اور محنت کر کے اپنے لئے روزی پیدا کرتے ہیں۔ تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ تو ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ کہ ہم نے سختی کی اور مسلمان بھاگ گئے۔ اگر وہ اپنے ملک میں ہی رہتے تو ہم جب چاہتے ان کو مار سکتے تھے۔ مگر اب جو غیر ملک میں چلے گئے ہیں تو ہمارے قبضہ سے نکل گئے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو ضعف پہنچتا اُن کو ایسا ٹھکانا میسّر آگیا ہے کہ اب وہ ہمارے خلاف بڑی آسانی کے ساتھ پروپیگنڈا کریں گے اور ہماری ہمسایہ حکومت کو ہمارے خلاف اُکسائیں گے۔

چنانچہ اس کے انسداد کے لئے انہوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ایک وفد حبشہ جائے اور اسکے ساتھ مختلف قسم کے تحائف بھیجے جائیں جو بادشاہ اور اس کے امراء اور پادریوں وغیرہ کے لئے ہوں۔ یہ وفد بادشاہ کے سامنے پیش ہو اور اُسے کہے کہ تم ہمارے ہمسایہ ہو اور تمہارے ساتھ ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں لیکن اب ہماری قوم کے کچھ باغی تمہارے ملک میں آکر پناہ گزیں ہوگئے ہیں اِن لوگوں کو اپنے ملک سے نکال دو اور واپس مکہ میں بھجوا دو۔ اور تجویز کی کہ اسی موقعہ پر بادشاہ اور اس کے درباریوں کو تحائف دئے جائیں تا کہ ان کے دل میں نرمی پیدا ہو اور وہ اِن لوگوں کو واپس کر دیں۔

چنانچہ یہ وفد حبشہ گیا۔ اس وفد میں حضرت عمرو بن العاص بھی جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے شامل تھے۔ عمرو بن العاص بڑے سیاستدان آدمی تھے اور عام طور پر حکومت کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن جاتے تھے اُن میں عمرو بن العاص ضرور شامل ہوتے تھے چنانچہ بعض اور جگہوں پر بھی مکہ والوں نے ان کو بھیجا ہے انہوں نے نجاشی بادشاہ حبشہ کے سامنے بڑی عمدہ تقریر کی۔ اور کہا بادشاہ سلامت! آپ ہمارے ہمسائے میں یعنی یمن میں آپ کی حکومت ہے اور یمن اور حجاز ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اس وجہ سے ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مگر اب یہ ایک نیا فتنہ پیدا ہوگیا ہے کہ ہمارے ملک کے کچھ بھگوڑے آپ کے ملک میں آگئے ہیں اور آپ نے اُن کو پناہ دے دی ہے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ آپ نے ہمارا ہمسایہ اور تعلق دار ہو کر ہمارے دشمنوں کو

پناہ کس طرح دے دی ہے۔ آپ انہیں مکہ میں واپس بھجوا دیں تا کہ ہمارے تعلقات آپ سے بدستور اچھے رہیں۔ اور ان میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ بادشاہ نے کہا میں ان لوگوں کو بلوا کر اور ان سے پوچھ کر فیصلہ کروں گا چنانچہ مسلمان مہاجرین کو بلوایا گیا اور بادشاہ نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا جھگڑا ہے؟ صحابہؓ نے کہا۔ ہمارا ان سے کوئی سیاسی جھگڑا نہیں صرف مذہبی اختلاف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شہر میں خدا تعالیٰ کا ایک نبی آیا جسے ہم نے قبول کر لیا۔ اب یہ لوگ ہمیں ہمارے مذہب کے مطابق عبادت کرنے نہیں دیتے اور مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے رنگ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کریں اور یہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہم عبادت کرتے ہیں اُس طرح عبادت کرو اور چونکہ ہم ایسا نہیں کرتے اس لئے یہ بُرا مناتے اور ہمیں دُکھ دیتے ہیں۔ جس سے مجبور ہو کر ہمیں اپنا ملک اور اپنی قوم چھوڑنے پڑے۔ بادشاہ پر اس کا نیک اثر ہوا اور اس نے کہا عقائد میں اختلاف تو ہوا ہی کرتا ہے اس بنیاد پر ہم مسلمانوں کو واپس نہیں کر سکتے (تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۲) اور اس نے مسلمانوں سے کہا کہ تم میرے ملک میں آزادی سے رہو اور اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرو۔ جب یہ جواب ممبرانِ وفد نے سُنا تو انہوں نے وہ تحائف استعمال کئے جو مکہ والوں نے انہیں دئے تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے بطریقوں اور پادریوں کو انہوں نے تحفے دئے (بطریق درحقیقت PETRIARCH کا عربی تلفظ ہے جو ایک بڑے پادری کو جو اپنے حلقہ میں قریباً پوپ کی حیثیت رکھتا ہے کہا جاتا ہے) اور انہیں اکسایا کہ یہ در اصل تمہارے بھی دشمن ہیں اور ہمارے بھی۔ کیونکہ انکے خیالات اور عقائد عیسائیت کے سخت خلاف ہیں۔ اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی ہتک کرتے ہیں۔

اگر تم ان لوگوں کو حبشہ میں رہنے کا موقع دو گے۔ تو تم عیسائیت سے دشمنی کرو گے۔ اس اشتعال انگیزی کے نتیجہ میں جیسا کہ آج کل ہمارے خلاف لوگوں کو جوش آجاتا ہے اُن کا بھی مشتعل ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ انہیں غصہ آیا اور انہوں نے تجویز کی کہ دوسرے دن پھر بادشاہ کے سامنے یہ معاملہ رکھا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن جب دربار لگا۔ تو بڑے بڑے پادریوں نے پھر اس سوال کو اُٹھایا اور انہوں نے نجاشی سے کہا کہ یہ معاملہ خالی سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی بھی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ مذہباً مکہ والوں کے ہی خلاف نہیں بلکہ ہمارے بھی خلاف ہیں اور مسیحؑ اور ان کی والدہ کی ہتک کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے ملک میں نہیں رکھنا چاہیئے۔

بادشاہ نے اُن کو پھر بُلوایا اور پوچھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انکی والدہ کی ہتک کرتے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟ اس پر حضرت جعفرؓ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے مسلمانوں کی طرف سے آگے بڑھے اور انہوں نے کہا۔ اے بادشاہ! میں آپ کو اپنی مذہبی کتاب کی چند آیتیں سُنا دیتا ہوں۔ ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر ہے۔ آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ ہم اُن کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سورہ مریم کی چند ابتدائی آیتیں پڑھ کر سُنائیں۔ جب انہوں نے یہ آیتیں سُنائیں۔ تو چونکہ عام طور پر عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے اور ان کی والدہ کے متعلق خدا کی والدہ ہونے کا خیال پایا جاتا تھا اور ایبے سینیا میں یہ مشرکانہ خیالات زیادہ تھے اس لئے پادریوں نے شور مچا دیا کہ ہمارے مسیح کی ہتک کی گئی ہے۔ مگر بادشاہ کا یہ مذہب نہیں تھا۔

وہ یونیٹیرین خیالات کا تھا جو خدا تعالے کو ایک مانتے
ہیں۔ اور روایات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بعد میں مسلمان
بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کہا مسلمان جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک
ہے۔ بلکہ تاریخوں میں لکھا ہے اُس نے ایک تنکا اُٹھا کر
کہا خدا کی قسم جو کچھ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے مَیں
مسیح اور اُس کی والدہ کو اس سے ایک تنکے کے برابر
بھی زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس پر پادری اور زیادہ جوش میں
آگئے اور انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے ان لوگوں کے خلاف
کوئی کارروائی نہ کی تو ملک میں بغاوت ہو جائیگی اور
آپ کے خلاف لوگوں میں جوش پیدا ہو جائے گا۔ جب
انہوں نے یہ کہا کہ اگر مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی
نہ کی گئی تو ملک میں بغاوت ہو جائے گی۔ تو نجاشی کو
غصہ آگیا اور اس نے کہا۔ میں چھوٹا تھا کہ تم نے میرے
چچا سے مل کر مجھے بادشاہت سے محروم کرنا چاہا۔ مگر
میرے خدا نے میری مدد کی اور اُس نے مجھے حکومت
عطا فرمائی۔ پس میں اگر بادشاہ بنا ہوں تو اُس خدا کے
فضل سے جس نے میرے مقابلہ میں تمہیں شکست دی اور
مجھے کامیاب فرمایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس خدا نے میرے
بچپن میں میری مدد فرمائی تھی اس خدا کو میں اب جوان
ہو کر چھوڑ دوں گا۔ جاؤ جو تمہارے جی میں آتا ہے کرلو۔
میں انصاف کے معاملہ میں تمہاری کوئی بات سننے کیلئے
تیار نہیں۔ اور اس نے مکہ کے وفد کو واپس لوٹا دیا اور
مسلمانوں کو عزت کے ساتھ دربار سے رخصت کیا۔ ان
واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرتِ حبشہ جو دعویٰ نبوت
کے پانچویں سال کے نصف اول میں ہوئی۔ اُس سے پہلے
سورۂ مریم نازل ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں پھیل بھی چکی تھی تبھی تو
مہاجرین نے شاہ حبشہ کے سامنے اپنے عقیدہ کی توضیح کیلئے اسے پڑھا۔ پس
یہ ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورۃ ہے اور ہجرتِ حبشہ
سے پہلے کی ہے۔ (یہ روایت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے
محمد بن اسحاق نے ام سلمہؓ سے اپنی سیرۃ میں اور امام احمد
بن حنبل نے ابن مسعودؓ سے اپنی مسند میں بیان کی ہے)
مقاتل کے نزدیک سورۂ مریم کی صرف آیت سجدہ مدنی
ہے باقی ساری سورۃ مکی ہے۔ راڈول کا خیال ہے کہ اس
سورۃ کی آیت ۱ تا ۳۴ کی عبارت سورۃ آل عمران کی
آیت ۳۵ تا ۵۷ سے فرق رکھتی ہے (اس سورۃ میں بھی
یہی مضمون بیان ہوا ہے) وہ کہتا ہے کہ یہ فرق اس
اعتراض سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے کہ لوگ شاعر کہینگے
گویا اس کے نزدیک اہل عرب کے اعتراض سے ڈر کر ان
آیات کے طرز بیان کو بدل دیا گیا۔ ہے حالانکہ یہ بات
بالکل غلط ہے۔ دنیا میں ہر شخص جانتا ہے کہ شعر کس چیز
کا نام ہے اور اہل عرب تو خاص طور پر شعر گوئی میں مشہور
تھے۔ وہ قرآن کریم کی نثر کو شعر کس طرح کہہ سکتے تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ ان یوروپین مستشرقین نے قرآن
کو کیا سمجھنا تھا انہوں نے دشمنوں کا اعتراض بھی نہیں سمجھا
اُن کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ یہ کوئی باوزن کلام ہے بلکہ
اصل اعتراض اُن کا یہ تھا کہ یہ کلام اپنے اندر شاعرانہ
روح رکھتا ہے۔ مستشرقین یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ اس
سورۃ میں چونکہ نَدِيًّا اور رَضِيًّا وغیرہ الفاظ آتے
تھے اس لئے شاید ان الفاظ کی وجہ سے مشرکین مکہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہا کرتے تھے حالانکہ
اُن کا اعتراض روحِ شاعری کے متعلق تھا یعنی جس
طرح شاعر اپنے مضمون کو مختلف پیرایوں میں بدل بدل
کر بیان کرتا ہے اسی طرح قرآن کریم مختلف رنگوں میں
بات کو پھیر پھیر کر بیان کرتا ہے۔ ورنہ اُن میں خود
بڑے بڑے شاعر موجود تھے وہ بھلا کہہ سکتے تھے کہ
یہ کلام شعر ہے۔ مگر یوروپین مستشرقین نے یہ خیال کرکے
کہ انہوں نے نَدِيًّا اور رَضِيًّا کی وجہ سے آپکو شاعر قرار
دیا تھا یہ اعتراض کر دیا کہ آل عمران میں اس طرز کو

بدل دیا گیا ہے۔

میرے نزدیک اس سورۃ کا وقت نزول چوتھے سالِ نبوت کا آخر یا پانچویں سال نبوت کا شروع ہے کیونکہ تاریخوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ مکی وفد جب مسلمان مہاجرین کو حبشہ سے واپس لانے کیلئے گیا اور بادشاہ نے انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے پادریوں کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں پر ہتکِ مسیح کا الزام لگا دیا۔ اس پر حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھکر حضرت مسیحؑ کے متعلق اسلامی عقیدہ بتایا جس پر بادشاہ کی تسلی ہو گئی اور وہ اپنے جواب پر پختہ ہو گیا۔ اور ہجرتِ حبشہ رجب ۵ھ میں ہوئی تھی یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوی پر جب ساڑھے چار سال گذر چکے تھے۔ اگر ہم سال کو ابتداء یعنی محرم سے شمار کریں تو یہ عرصہ ساڑھے چار سال کا بنتا ہے اور اگر درمیان سے شمار کریں تو اور بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وحیٔ نبوت کا آغاز رمضان میں ہوا ہے میں اس وقت پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جب مورخین نبوت کے سال شمار کرتے ہیں تو پہلے سال کا شمار محرم سے کرتے ہیں یا رمضان سے۔ اگر وہ ابتدائی مہینہ سے شمار کرتے ہوں تب تو یہ ساڑھے چار سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اور اگر وہ رمضان سے شمار کرتے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ عرصہ تین سال دس ماہ کا بن جائیگا۔ بہرحال یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہجرت حبشہ سے پہلے یہ سورۃ نازل ہوئی اور اتنا عرصہ پہلے نازل ہوئی کہ صحابہؓ نے اس کو یاد کر لیا۔ اس غرض کے لئے ہمیں کم از کم پانچ چھ ماہ کا عرصہ ضرور نکالنا پڑیگا۔ جس میں یہ سورت اتنی معروف ہو گئی کہ صحابہؓ نے اسکو حفظ کر لیا۔ ان امور کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں۔ کہ زیادہ سے زیادہ چوتھے سال کا آخری حصہ اس کے نزول کا وقت تھا۔ اس سے پہلے تین سال تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر برابر الہامات نازل ہوتے رہے لیکن عیسائیت کو مخاطب نہیں کیا گیا۔ تین سال کے بعد یکدم عیسائیت کو مخاطب کیا گیا اور تفصیلی طور پر مخاطب کیا گیا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے ذکر کے علاوہ جن پیشگوئیوں پر عیسائیوں کے نزدیک انکے دعویٰ کی بنیاد تھی اُن سب کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اسی طرح مسیحیوں کے عقائد کو بیان کیا گیا اور اُن کو دلائل کے ساتھ رد کیا گیا۔ اس کے چار پانچ ماہ کے بعد حبشہ کیطرف ہجرت ہو جاتی ہے جہاں عیسائی بادشاہت ہوتی ہے۔ اور عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے متاثر ہو کر ایک صحابی عبید اللہ بن جحش جو مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے وہاں مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے (زرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۷۱)

اس سورۃ کا ایسے وقت میں نازل ہونا صاف طور پر بتاتا ہے۔ کہ اس کے نزول میں ایک بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ جو قرآن کریم کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے جہاں عیسائیت کا کوئی زور نہیں تھا۔ آپ کی مخالفت کرنیوالے وہ لوگ تھے جن کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ تین چار عیسائی غلام تھے مگر انکی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اور پھر تین سال تک آپ پر وحی ہوتی رہتی ہے مگر اس میں عیسائیت کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن یکدم چوتھے سال کے آخر یا پانچویں سال کے شروع میں تفصیلی طور پر عیسائیت کو مقابل میں رکھ کر بحث شروع کر دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ عیسائیت کیوں پیدا ہوئی مسیحؑ کے متعلق کیا کیا پیشگوئیاں تھیں اور اسلام کے

مقابلہ میں عیسائیت کی کیا حیثیت ہے اور پھر اس کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جاؤ جہاں ایک عیسائی حکومت ہے۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ اس کلام کا نازل کرنیوالا ایک عالم الغیب خدا ہے۔ جب تک اسلام اور عیسائیت کے ٹکراؤ کی کوئی صورت نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ قبل از وقت عیسائیت کا کوئی ذکر کیا جائے۔ لیکن جونہی وہ وقت قریب آگیا جب مسلمانوں نے ایک عیسائی ملک میں جانا تھا تو مسلمانوں کو بیدار رکھنے اور ان کو ہوشیار کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ اب عیسائیوں سے تمہارا مقابلہ ہوگا تمہیں ان کے مقابلہ میں کونسا پہلو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے یکدم ایک سورۃ نازل ہو جاتی ہے جس میں عیسائی عقائد اور عیسائی تعلیمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مسیحیت کی کیا غرض ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ اس میں صاف طور پر اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اب تم کو مسیحیوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس لئے اُنکے مذہب کے بارہ میں تم کو ہوشیار کیا جاتا ہے۔ پس سورۂ مریمؑ کے نزول میں قطعی اور یقینی طور پر ہجرت حبشہ کی پیشگوئی مخفی تھی۔ اور قبل از وقت مسلمانوں کو بتا دیا گیا تھا کہ اب تم ایک ایسی جگہ جانے والے ہو جہاں عیسائیت سے تمہارا واسطہ پڑے گا۔ اس لئے اُن کے عقائد کے متعلق ہوشیار رہو۔ یہ ایک غیر معمولی اشارہ تھا جس کو مسلمانوں نے تو نہیں سمجھا مگر عیسائیوں نے سمجھ لیا کیونکہ ریونڈ ویری اور سر میور کا سارا زور اس امر کے ثابت کرنے کیلئے صرف ہوتا ہے کہ اس سورۃ کو کسی اور سال کی نازل شدہ قرار دیں۔ حالانکہ سورۂ مریم چوتھے سال میں نازل ہو یا آٹھویں سال میں عیسائیوں کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا مضمون عیسائیت کو رد کر دیتا ہے تو خواہ یہ چوتھے سال کے آخر میں نازل ہو۔ یا دسویں سال میں عیسائیوں کے لئے برابر ہے مگر انہوں نے بڑا زور صرف کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے پہلے کی نہیں۔ کیونکہ اُن کا ذہن اس طرف چلا گیا ہے کہ اگر یہ ہجرت حبشہ سے پہلے کی نازل شدہ ثابت ہو جائے تو یہ اس امر کا ایک صریح اور واضح ثبوت ہوگا کہ اس میں ہجرت حبشہ کی پیشگوئی کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ اسلام اب عیسائی ممالک میں جانے والا ہے۔ پس یہ اعتراض ان کے دل کو کھٹکا۔ اور چونکہ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ قرآن کریم میں کوئی پیشگوئی نہیں اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس کا کوئی حل تلاش کریں ورنہ مسلمان مجبور کریں گے کہ بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ تین سال تک مشرکین مکہ کے سامنے عیسائیوں کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ نہ ان کی تعلیم کا۔ نہ تاریخ کا۔ نہ غلط عقائد کا۔ مگر پھر یکدم ایک پوری کی پوری سورۃ اتاری جاتی ہے اور توجہ دلائی جاتی ہے کہ اب ایسے واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے واسطہ پڑیگا اور اُن ممالک میں بھی جہاں عیسائیوں کا زور ہوگا۔ اسلام کو اُن کے مقابلہ کے لئے نکلنا پڑے گا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اسلام اور عیسائیت کا جو ٹکراؤ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قبل از وقت اس کی خبر دے دی تھی۔ اور چونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کو برداشت کرنا اُن کی طاقت سے بالکل باہر ہے اس لئے قرآنی نشان کو باطل کرنے کے لئے انہوں نے کوشش کی کہ اس سورۃ کو ہجرت حبشہ سے بعد کی قرار دیں۔ مگر اس عظیم الشان نشان پر پردہ ڈالنے کے لئے انہیں اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اپنے آپ کو بڑا ادیب ظاہر کرنے کے لئے

انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اس سورۃ کے الفاظ اور اس کا سٹائل بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ بعد میں نازل ہوئی تھی (تفسیر وہیری جلد ۳) حالانکہ عربی سٹائل کو وہ جانتے ہی نہیں۔ بلکہ عربی تو الگ رہی اگر شکسپیئر کے ڈرامے ہی ہم ان کے سامنے رکھ دیں اور ان سے دریافت کریں کہ بتاؤ یہ کونسے سال کا ہے اور وہ کونسے سال کا۔ تو وہ سخت ذلیل ہوکر شرمندہ اور لاجواب ہو جائیں گے اور یہ ہرگز نہیں بتا سکیں گے کہ یہ کس سال کا ہے اور وہ کس سال کا۔ زبان کا سٹائل پہچان کر یہ بتانا کہ یہ عبارت کس سن کی ہے ایک لمبی تاریخ پر عبور کا متقاضی ہوتا ہے جس میں کوئی زبان تدریجاً ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور پھر اس میں بھی ہزاروں قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض شاعر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے پچاس ساٹھ سال زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے ابتدائی ایام میں بعض الفاظ اپنے شعروں میں استعمال کئے ہیں جن کو آخری ایام میں انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ ایسے شخص کی کسی نظم کو اگر ہم دیکھیں گے تو اُن الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہہ سکیں گے کہ یہ آخری زمانہ کی نظم ہے یا ابتدائی زمانہ کی۔ مگر اس قسم کا اظہار خیال بھی صرف چند الفاظ کی بناء پر ہوگا۔ یہ نہیں کہ شعر کی بناوٹ دیکھ کر کوئی شخص کہہ سکے کہ یہ فلاں زمانہ کی ہے اور وہ فلاں زمانہ کی۔ غالب بہت بڑا شاعر گذرا ہے مگر اس کے کلام پر بھی جرح کرنے والے کہتے ہیں کہ جیسے بعض سہل سے سہل شعر ہم اس کے آخری زمانہ کے کلام میں دکھا سکتے ہیں ویسے ہی بعض آسان شعر ہم اس کے ابتدائی زمانہ کے کلام میں بھی دکھا سکتے ہیں۔ پس یہ کہنا کہ غالب کے کلام میں بعد میں امپروومنٹ ہوگئی تھی غلط بات ہے۔ اسی طرح ریورنڈ وہیری اور سرمیور کا یہ ایک فرضی ڈھکوسلہ ہے جس سے اُن کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم اتنے بڑے ماہر فن اور ادیب ہیں کہ ہم کلام کا سٹائل دیکھ کر ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ کون سے زمانہ کی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ماہر فن بھی اس قسم کی بات نہیں بتا سکتا۔ اس زمانہ میں ہی اگر جرمنی، فرانس، امریکہ اور انگلستان کے ادیبوں سے دریافت کیا جائے کہ فلاں فلاں قومی شاعر جو تم میں گذرے ہیں اُن کی فلاں فلاں نظمیں کس سنہ کی ہیں۔ تو وہ یہی کہیں گے کہ کیا ہم منجم ہیں کہ اس قسم کی بات بتا سکیں۔ سوائے اس کے کہ کسی کو ذاتی طور پر علم ہو کہ فلاں نظم کس سنہ میں کہی گئی تھی کوئی شخص نظموں کو دیکھ کر اُن کے سنہ کی تعیین نہیں کر سکتا۔ لیکن قرآن کریم کے متعلق وہ یہ اندازہ لگانے بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ آیتیں فلاں سنہ کی ہیں اور یہ فلاں سنہ کی۔ اس سے انکی غرض محض اتنی ہوتی ہے کہ جو پیشگوئی ثابت ہوتی ہو اس میں رخنہ ڈالدیں اور اسلام کی صداقت پر پردہ ڈال دیں۔

غرض وہیری اور میور کا فعل خود دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ اس سورۃ کا نزول ایسے وقت میں ہُوا ہے کہ یہ آئندہ کے حالات کے متعلق بڑی بھاری پیشگوئی بن جاتی ہے پس انہوں نے چاہا کہ اس پر پردہ ڈال دیں اور اسے بعد کے زمانہ کی قرار دے دیں۔ غرض یہ ایک عجیب نشان ہے کہ تین سال تک متواتر کلام الٰہی نازل ہوتا رہتا ہے مگر اس میں عیسائیت کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا لیکن جونہی عیسائیت سے ٹکراؤ کا زمانہ قریب آتا ہے ایک سورۃ نازل ہو جاتی ہے اور پھر چھ ماہ یا سال کے بعد مسلمان ہجرت کرکے ایک عیسائی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں عیسائیوں سے اُن کی بحثیں ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں عیسائی ایک مسلمان کا شکار کر لیتے ہیں اور اُسے عیسائی بنا لیتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اُن کے بادشاہ کا شکار کر لیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ پس قبل از وقت اس سورۃ کا

نازل ہونا اور اس کے معاً بعد ایسے حالات کا پیدا ہو جانا جن کے نتیجہ میں اسلام اور عیسائیت کا ٹکراؤ ہو گیا اسلام کی صداقت کا ایک بہت بڑا نشان ہے۔

اس سورۃ کے نزول کے بعد عیسائیت کا ذکر زمانۂ قبل از ہجرت میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مدینہ میں جاکر عیسائیت کا ذکر شروع ہوا ہے درمیان میں عیسائیت کی طرف اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ لیکن تفصیل کے ساتھ عیسائیت کا ذکر پھر سورۂ آل عمران میں ہوا ہے جو ہجرت کے بعد دوسرے یا تیسرے سال مدینہ میں نازل ہوئی خود اس سورۃ کا مضمون بھی اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں جنگِ اُحد اور اس کے متعلقہ واقعات کا ذکر ہے اور یا پھر عیسائیت کا ذکر سورۂ نساء میں آتا ہے کہ وہ بھی مدنی سورۃ ہے۔ بلکہ سورۂ آل عمران کے بعد چوتھے سال سے اس کا نزول شروع ہوا ہے اور کچھ حصہ چوتھے سال کے بعد بھی نازل ہوا ہے۔ سورۂ نساء کے علاوہ کسی حد تک تفصیل سے عیسائیت کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے اور یہ سورۃ بھی سورۃ نساء کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور اکثر حصہ اس کا پانچویں اور چھٹے سال ہجری میں نازل ہوا ہے بلکہ اس کی کچھ آیتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب بھی نازل ہوئیں۔ پس قبل از ہجرت کی سورتوں میں سے جس سورۃ میں عیسائیت کو براہ راست بیان کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ سورۂ مریم ہے۔ اور جیسا کہ قیاس کیا جا سکتا ہے یہ سورۃ چوتھے سال نبوت کے آخر یا پانچویں سال نبوت کے شروع میں نازل ہوئی ہے تبھی صحابہؓ نے اس کو ہجرتِ حبشہ سے پہلے یاد کر لیا اور حبش کے بادشاہ کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا۔ اس سورۃ کا یہ وقتِ نزول صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس سورۃ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ اب عیسائیت کے ساتھ بھی تعلقات کی بنیاد رکھی جانے والی ہے اور آنے والی حبشہ کی ہجرت کی طرف اس میں واضح طور پر اشارہ کیا گیا تھا جس سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کا نزول ایک عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہوا ہے جو واقعات اور حالات مسلمانوں کو پیش آنے والے ہوتے تھے۔ اُن کو قریب زمانہ میں بیان کر دیا جاتا تھا تاکہ وقت پر اللہ تعالیٰ کا کلام پورا ہو کر مومنوں کے لئے اُن کے ایمان کی زیادتی کا موجب ثابت ہو۔ میں سمجھتا ہوں ریورنڈ ویری اور میور کے دل پر بھی اسی بات کا اثر ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے باوجود تاریخی اور حدیثی شہادتوں کے اس سورۃ کو بعد از ہجرت حبشہ یا قریب ہجرت مدینہ کے رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اُنکے دل کی یہ دھڑکن بتاتی ہے کہ اس سورۃ کے نزول کا وقت ایک ایسا بیّن اشارہ تھا کہ اُسکے سمجھنے کو ریورنڈ ویری اور میور بھی نہیں چُوک سکے اور انہیں اس کے نزول کا وقت بدلنے کی ناکام کوشش کرنی پڑی۔ آخری تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں وہ کیا بات تھی جس پر مجبور ہو کر اُنکو اس کا وقتِ نزول بعد میں ثابت کرنا پڑا۔ صرف یہی کہ اگر اس کا وقتِ نزول وہی تھا جو تاریخ بتاتی ہے تو یہ اسلام کی سچائی کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا۔

یہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم یہ کس طرح مان لیں کہ خدا تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کی ہے کیوں نہ یہ سمجھ لیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بخود سوچ لیا ہوگا۔ کہ مکہ میں مخالفت زیادہ ہے اب لازماً ہمیں ہجرت کرنی پڑے گی اور یہ بھی سوچ لیا ہوگا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کریں اس لئے انہوں نے عیسائیت کا قرآن کریم میں ذکر کر دیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک عقلی طور پر یہ ممکن ہے لیکن ساتھ ہی عقل اسباب کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ اگر عیسائیت کا ذکر کیا جاتا تو اس کی تعریف کی جاتی نہ کہ تردید مگر اس سورۃ میں تو عیسائیوں کی شروع سے لیکر آخر تک تردید کی گئی ہے۔ دوسرے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو

سوچ سکتے تھے کہ وہ اپنے متبعین کو حبشہ بھجوا دیں گے مگر انہیں یہ کس نے بتا دیا کہ وہ ایک لمبے عرصہ تک وہاں رہیں گے۔ اُن کے عیسائیوں سے مباحثات ہونگے اور اس لئے ضروری ہے کہ عیسائیت کے متعلق انہیں تفصیلاً واقفیت ہو۔ کیونکہ اس سورۃ کے ذریعہ صرف یہی نہیں بتایا گیا تھا کہ ہجرت ہوگی بلکہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ایک لمبے عرصہ تک عیسائیوں سے مقابلہ ہوگا اور ایک دوسرے کی تردید کے لئے مختلف قسم کے دلائل استعمال کئے جائیں گے۔ پس یہ وسوسہ محض بے بنیاد ہے حقیقت یہی ہے کہ عیسائیوں نے چونکہ اس قرآنی معجزہ کو محسوس کر لیا تھا اس لئے انہوں نے پورا زور لگایا کہ اس سورۃ کو ہجرتِ حبشہ کے بعد کی نازل شدہ سورۃ قرار دیں۔ چنانچہ میور کہتا ہے کہ اس میں ہجرت کی طرف تو اشارہ ہے مگر ہجرتِ حبشہ کی طرف نہیں بلکہ ہجرت طائف کی طرف۔ گویا وہ اسے ان آخری ایام مکی کی جو طائف میں گذرے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طائف میں بھی بعض عیسائی غلام تھے اور واقعۂ طائف میں ایک عیسائی غلام عداس نامی کا ذکر بھی آتا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملا اور اس نے آپ سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا۔ مگر اس قسم کے عیسائی غلام خود مکہ میں بھی تھے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ لوہا کوٹا کرتے تھے یا اسی قسم کے بعض اور کام کیا کرتے تھے۔ سفرِ طائف میں جس عیسائی غلام کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق تاریخ میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا نینوہ کا۔ آپ نے فرمایا کیا وہی نینوہ جس میں میرا بھائی یونسؑ آیا تھا؟ اور پھر آپ نے اُسے تبلیغ کی۔ جس سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے آپ کے ہاتھ چوم لئے۔ پس بے شک طائف میں بھی کچھ عیسائی تھے مگر ان کے ساتھ کوئی مذہبی مقابلہ پیش نہیں آیا کہ اس سورۃ کو طائف کے واقعہ پر چسپاں کیا جائے۔ وہیری نے بھی اسے دبے لفظوں میں ہجرتِ حبشہ کے بعد کی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ سورۃ اتنی دور تو نازل نہیں ہوئی جتنی دور میور بتاتا ہے مگر اتنی قریب بھی نازل نہیں ہوئی جتنی قریب مسلمان بتاتے ہیں۔ اُس نے اس سورۃ کو بعد از ہجرتِ حبشہ پانچویں یا چھٹے سال کی قرار دیا ہے اور میور نے اسے گیارھویں سال میں نازل ہونے والی قرار دیا ہے۔ وہیری کہتا ہے اس میں بیان کردہ واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کتابِ مقدس کا بہت کم علم تھا اور جن لوگوں نے اُسے بتایا وہ بھی بہت کم جانتے تھے۔ اس کا جواب ہم اگلی آیتوں کی تفسیر میں دیں گے۔

ترتیبِ سورۃ اس سورۃ کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں اس سوال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ اسلام کس طرح ترقی کرے گا یہ بتایا گیا تھا کہ سلسلۂ محمدیہ سلسلۂ موسویہ سے مشابہ ہے۔ جس طرح موسوی سلسلہ نے ترقی کی تھی اسی طرح اسلام بھی ترقی کریگا چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں موسوی سلسلہ کے کچھ واقعات بیان کر کے بتایا گیا تھا کہ موسوی سلسلہ کے متعلق یہ مقدر تھا کہ اس پر زمانۂ موسیٰؑ کے بعد دو تباہیاں آئیں گی اور اسی طرح اس پر دو ترقیوں کا زمانہ بھی آئے گا۔ اور چونکہ اسلام کی ترقی موسوی سلسلہ کے مشابہ ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوگا۔ یعنی جس طرح وہاں زمانۂ موسیٰؑ کے بعد دو تباہیاں اور دو ترقیاں مقدر تھیں۔ اسی طرح یہاں بھی زمانۂ نبوی کے بعد مسلمانوں کے لئے دو تباہیاں اور دو ترقیاں مقدر ہیں چنانچہ

ترتیبِ سورۃ

سلسلۂ محمدیہ کی سلسلۂ موسویہ سے تشبیہ

جیساکہ بنی اسرائیل کی پہلی تباہی حضرت داؤدؑ کے زمانہ کے بعد ہوئی جو بڑی ترقی کا دَور تھا اور اس میں یروشلم تباہ ہُوا جو یہود کا مرکز تھا۔ اسی طرح زمانۂ نبوی کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں جو بڑی ترقی کا دَور تھا۔ پہلی تباہی آئی اور بغداد جو اسلامی حکومت کا مرکز تھا وہ تباہ ہوگیا اور مسلمان علماء بغداد سے بھاگ کر اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے اور مرکز غیروں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر جس طرح وہاں جو پہلی تباہی آئی وہ زیادہ تر حکومت کے مرکز کی تباہی تھی۔ یعنی بنوکدنضر نے یروشلم کو تباہ کیا اور وہاں کا تمام قیمتی سامان اپنے ساتھ لے گیا اور یہود جلاوطنی پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح یہاں جو پہلی تباہی آئی وہ بھی زیادہ تر اسلامی حکومت کے مرکز کی تباہی تھی اور زمانہ بھی قریبًا قریبًا وہی تھا یعنی جتنے عرصہ بعد یروشلم پر تباہی آئی اُتنے عرصہ بعد ہی بغداد پر تباہی آئی۔ اس کے بعد دوسری تباہی جو ٹائٹس کے زمانہ میں یہود پر آئی وہ ایسی تھی جس کے بعد یہودی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اُن میں سے کچھ ایران کے علاقہ میں چلے گئے۔ کچھ مصر کی طرف نکل گئے اور انہیں اپنا وطن بالکل چھوڑ دینا پڑا۔ اسی طرح کی ایک دوسری تباہی مسلمانوں کے لئے بھی مقدر تھی۔ چنانچہ جس طرح بنی اسرائیل کی دوسری تباہی ظہورِ مسیح سے پہلے شروع ہوئی اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ اسی طرح زمانۂ اسلام میں بھی ہُوا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دعویٰ کیا تو اس سے کچھ عرصہ پہلے سے ہی مسلمانوں پر یہ عمومی تباہی مغربی مسیحی طاقتوں کے ذریعہ سے جو رومی ایمپائر کے قائم مقام تھیں آنی شروع ہوئی اور وہ ہر جگہ کمزور ہوتے چلے گئے۔ انکی حکومتیں تباہ ہوگئیں اور اسلام کو پھر ایک سخت دھکا لگا اور ساری دنیا سے اسلامی حکومت کا نشان مٹ گیا۔

یہ تباہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی رہی اور بعد میں بھی جاری رہی لیکن جیسا کہ پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے مقدر یہی ہے کہ ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کی یہ تباہی ترقی کی صورت میں بدل جائیگی۔ اور انہیں دنیا میں پھر عروج حاصل ہو جائے گا۔

پہلی موسوی تباہی کے بعد یہود کو دوبارہ زندگی اس طرح حاصل ہوئی تھی۔ کہ جو دشمن قوم تھی اس نے انکو دوبارہ یروشلم بنانے میں مدد دی اور اس نے انہیں اپنے مرکز میں لاکر بسا دیا۔ اسی طرح مسلمانوں کی پہلی تباہی کے موقعہ پر بھی ایسا ہی نشان ظاہر ہُوا۔ بلکہ یہ نشان مسلمانوں کے حق میں زیادہ مکمل صورت میں ظاہر ہُوا۔ اور وہ اس طرح کہ فارس اور میدیا کا بادشاہ جس نے یہود کو یروشلم کے آباد کرنے میں مدد دی تھی یہودی نہیں ہُوا تھا صرف اُن کا ہمدرد اور خیرخواہ تھا۔ لیکن وہ تُرک بادشاہ جنہوں نے اسلامی حکومت کو تباہ کیا تھا خود مسلمان ہوگئے اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کی تباہی میں حصہ لیتے وہ اُن کی ترقی اور احیاء میں حصہ لینے لگے۔ اور اسلام پھر دوبارہ اُن کے ہاتھوں سے عروج کے ایک نئے دَور میں سے گذرنے لگا۔ اس کے مقابلہ میں دوسری تباہی جو بنی اسرائیل پر آئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ حاکم قوم خود مسیحی ہوگئی اور یہودی مذہب سے اُس کی اس حد تک دلچسپی ہوگئی۔ کہ مسیحی روایتوں کے ساتھ ساتھ تورات کا ادب اور احترام اور اسرائیلی انبیاء کا ادب اور احترام بھی اُن میں قائم ہوگیا۔ مسلمانوں کے لئے بھی یہی مقدر ہے۔ کہ وہ حاکم قومیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کیا ہے وہی ایک دن اسلام قبول کریں گی اور پھر دوبارہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل ہوگی۔ اس کے بعد

سورۂ کہف میں اسی مضمون کو اور کھول کر بیان کیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ دوسری تباہی کے بعد جو ذریعہ خدا تعالےٰ نے موسوی سلسلہ کو ترقی دینے کا اختیار کیا تھا وہی اب بھی اختیار کیا جائے گا۔ یہ کیا ذریعہ تھا جو اختیار کیا گیا اور موسوی سلسلہ کی یہ تباہی کس طرح ترقی میں تبدیل ہوئی۔ مسیحی دنیا اس سے خوب واقف ہے وہ رنگ جو اُس وقت تک موسوی سلسلہ کا چلا جاتا تھا۔ اُسے یکسر بدل دیا گیا اور مسیح ناصری جنہوں نے یہ کہا تھا کہ میں قانون کو بدلنے نہیں آیا بلکہ اُسے پورا کرنے آیا ہوں (متی باب ۵ آیت ۱۷-۱۸) اُن کی جماعت کو خدا تعالیٰ نے تبلیغِ دین کی ایسی توفیق دی کہ اُن کے ذریعہ سے پھر تورات کی حکومت ایک نئے رنگ میں دنیا میں قائم ہو گئی۔ اور وہی قوم جو مُردہ ہو چکی تھی پھر موسوی سلسلہ کے آخری خلیفہ مسیح ناصری پر ایمان لا کر دنیا میں ترقی کر گئی اور موسوی سلسلہ پھیل گیا۔ ایسا ہی بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں سے بھی ہو گا چنانچہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمانوں کی دوبارہ ترقی بھی ایک مسیح کے ذریعہ سے ہو گی سورۂ مریم کو سورۂ کہف کے بعد رکھا گیا اور اس میں مسیح علیہ السلام کے واقعات بیان کر کے توجہ دلائی گئی کہ ایک ایسا ہی نشان مسلمانوں میں بھی ظاہر ہو گا اور مسلمان پھر اس نشان کے ذریعہ سے ترقی کریں گے۔ چنانچہ جس طرح موسوی سلسلہ کی ترقی ایک مسیحؑ کے ساتھ وابستہ تھی اسی طرح اسلام کی ترقی ایک مسیحؑ کے ساتھ وابستہ ہو گی جس طرح وہاں اصحاب کہف یعنی مسیحؑ ناصری کے اتباع کے ذریعہ سے وہ غلبہ ملا تھا اسی طرح یہاں آنے والے مسیحؑ کے لئے نئے اصحاب کہف پیدا ہوں گے اور اُن کے ذریعہ سے دوبارہ اسلام غالب آئے گا۔

سورۂ کہف کے بعد سورۂ مریم کو رکھنے میں حکمت

پھر اللہ تعالےٰ نے سورۂ کہف میں معراج موسوی کا ذکر کیا اور بتایا کہ معراج موسوی کے اندر ہی اسلام کی ترقی کی خبر دی گئی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس معراج کے نتیجہ میں موسوی اور محمدی سلسلہ میں شدید رقابت پیدا ہو جائے گی چنانچہ جب محمدی سلسلہ ترقی کرے گا۔ موسوی سلسلہ اُسے رقابت کی نظروں سے دیکھے گا اور اس رقابت کے نتیجہ میں جیسا کہ عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب دو رقیب ہوں اور اُن میں سے ایک ذرا بھی غافل ہو تو وہ مارا جاتا ہے۔ مسلمان غفلت کریں گے اور موسوی سلسلہ کے علمبردار یعنی مسیح ناصری کے پیرو اُن پر غالب آ جائیں گے اور مسلمانوں کو مغلوب کر لیں گے۔

پھر اس مشابہت کے لئے سورۂ کہف میں ایک پُرانا واقعہ بنی اسرائیل کی قوم کا بیان کیا اور بتایا کہ بنی اسرائیل میں ذوالقرنین کا ایک واقعہ گذرا ہے۔ تم دیکھو کس طرح ذوالقرنین کے ذریعہ تباہ شدہ یہودیوں کو دوبارہ حکومت ملی۔ وہ واقعہ بھی اس موقعہ پر ظاہر کیا جائیگا اور مسلمان جو تباہ ہو چکے ہوں گے اللہ تعالےٰ انہیں پھر ایک دوسرے ذوالقرنین کے ذریعہ سے تباہی سے بچائے گا اور پھر اُن کی ترقی اور حفاظت کے سامان پیدا فرمائیگا۔

اس کے بعد سورۂ مریم کو شروع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں پہلی سورتوں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ترقی اور اس کے تنزل کا دَور موسوی سلسلہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح موسوی سلسلہ کے ٹوٹنے پر اس کا احیاء مسیحؑ ناصری کے ذریعہ سے ہُوا جو موسوی سلسلہ کا آخری نقطہ تھا اِسی طرح اسلام کی طاقت اور اُس کی شوکت کے ٹوٹنے پر اس کا دوبارہ احیاء مسیحِ محمدی کے ذریعہ سے ہو گا جو محمدی سلسلہ کا آخری نقطہ ہو گا۔ مگر چونکہ محمدی سلسلہ کا اصل مقابلہ مسیحؑ ناصری کی قوم کے ساتھ ہو گا اور اسلام کا ٹوٹنا مسیح ناصری کی قوم کی وجہ سے ہو گا جو موسوی سلسلہ کا آخری نقطہ تھا۔ اس لئے محمدی سلسلہ جب ترقی کرے گا

تو اُسے اصل مقابلہ مسیحؑ ناصری کی قوم سے ہی پیش آئے گا۔
اس لئے اگر ہم تاریخی طور پر غور کرنا چاہیں تو ہمیں بجائے
موسوی سلسلہ پر غور کرنے کے مسیحی سلسلہ پر غور کرنا پڑیگا۔
کیونکہ اسلام کے اصل دشمن وہی ہیں۔ اس مناسبت کے
لحاظ سے سورۂ کہف کی تشریحات کے بعد اب وہ اُس
قوم کے حالات کی طرف آتا ہے جن سے مسلمانوں کا اصل
مقابلہ تھا۔ اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں پر مسیحؑ کے ذریعہ سے
ہی تباہی آئی یعنی مسیحؑ ناصری کی قوم کے ذریعہ سے۔ اور
مسلمانوں نے اگر تباہی سے بچنا ہے تب بھی مسیحؑ کے ذریعہ
سے ہی یعنی مسیح موعودؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ اس
لئے اللہ تعالےٰ اب عیسائیت کی تاریخ بیان کرتا ہے اور
بتاتا ہے کہ یہ تاریخ تمہارے لئے شمع راہ ہوگی اور تمہیں
مدنظر رکھنا پڑے گا کہ اس اس طرح عیسائیت کی بنیاد
پڑی اور اس اس رنگ میں تمہارے احیاء کی بنیاد ڈالی
جائے گی۔ گویا سورۂ مریم۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف
کی تیسری کڑی ہے اور یہ تینوں سورتیں ایک ہی مضمون
کی حامل اور ایک ہی طریق پر چل رہی ہیں۔

پھر اس سورۃ کا ایک قریبی تعلق سورۂ کہف سے
یہ بھی ہے کہ سورۂ کہف کے آخر میں شریعت اور توحید
پر زور دیا گیا تھا اور اس سورۃ میں مسیحؑ کے ذکر سے کلام
شروع کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت اور توحید
میں دو خطرناک ابہام پیدا ہونے والے تھے اور اس طرح
بات صاف کر دی گئی۔

پھر ان دونوں سورتوں کا ایک یہ تعلق بھی ہے کہ
سورۂ کہف میں مسیحیوں کی انتہاء بیان کی گئی تھی اور اس
میں اُن کی ابتداء بیان کی گئی ہے۔ بظاہر اس کے اُلٹ
ہونا چاہیئے تھا۔ مگر مسیح چونکہ مخفی ہوتا ہے اور کسی چیز
کے ظاہر ہونے کے بعد ہی اس کی حقیقت کھلتی ہے۔ اِس
لئے اُسے بعد میں رکھا تاکہ مسیحیوں اور غیروں پر ظاہر ہو
کہ کہاں سے بات شروع ہوئی تھی اور ختم کس شکل میں
جاکر ہوئی۔

خلاصۂ سُورۃ

خلاصۂ سورۃ

اس سورۃ کے شروع کے مقطعات میں جو صفاتِ الٰہیہ کا اختصار ہیں
مسیحیت اور اسلام کے عقائد کا مقابلہ کیا گیا ہے اور
بتایا گیا ہے کہ گو مسیحیت کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف
سے ہے لیکن اُس میں خلافِ صداقت عقائد داخل ہو گئے
ہیں اور وہ عقائد صفات الٰہیہ کے بھی خلاف ہیں
(خلاصہ مفہوم کٓھٰیٰعٓصٓ)

اس کے بعد مسیحؑ کا واقعہ حضرت زکریا کے ذکر سے
شروع کیا۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام کی بہت بڑی علامت
جو یہود میں مشہور تھی وہ مسیح سے پہلے ایلیا نبی کا آسمان
سے اُترنا تھا (ملاکی باب ۴ آیت ۵) چنانچہ مسیح کے نزول
کے بعد سب سے اہم سوال اُن سے یہی کیا جاتا تھا۔ اور
اِسی سوال کے حل کرنے کی طرف انجیل نے غیر معمولی توجہ
دی ہے اور بتایا ہے کہ ایلیا سے مراد یوحنا ہے (متی
باب ۱۱ آیت ۱۵ و باب ۱۷ آیت ۱۲ و مرقس باب ۹ آیت ۱۳) اور یہ
کہ ایلیا نے آسمان سے نہیں آنا تھا بلکہ زمین سے ہی
نکلنا اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا تھا (متی باب ۱۱
آیت ۱۱ و لوقا باب ۷ آیت ۲۸) (ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ
عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا سے يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا تک)

ایلیا کے ذکر کے بعد مسیحؑ کا ذکر کیا لیکن مسیحؑ کے
دعویٰ کے ذکر کی بجائے اس کی والدہ کے ذکر سے اُس
کا ذکر شروع کیا۔ کیونکہ مسیحؑ کی پیدائش سے ہی
بعثتِ محمدیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کی تفصیل یہ ہے
کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے انکی دو بیویوں
سے تھے۔ یعنی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ حضرت
اسمٰعیل بڑے تھے اور حضرت اسحاق آپ کے دوسرے
بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان دونوں کے

بارہ میں وعدے تھے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۲ و باب ۱۷ آیت ۸ تا ۱۴ و آیت ۱۸ و ۲۰ و باب ۲۱ آیت ۱۴ تا ۱۷ و ۱۸ تا ۲۱ میں وعدے موجود ہیں۔

اور حضرت اسحاقؑ کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں اُن کا پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹ و ۲۱ میں ذکر ہے۔

پھر ان دونوں بیٹوں کے لئے مجموعی پیشگوئی پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷ و ۱۸ میں کی گئی۔ اِن حوالجات کو جب پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱ سے ملایا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ ابراہیمی حضرت اسحاقؑ کے ذریعہ سے شروع ہونا تھا مگر پورا دونوں بیٹوں کے ذریعہ سے ہونا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ ابراہیمی کا آخری ظہور نسلِ اسمٰعیل سے ہونا تھا۔ لیکن جب عہد کو اسحاق سے بدل کر اسمٰعیل کی طرف پھیرا جاتا تو لازماً نسلِ اسحاق کو ایک بڑا دھکا لگنا تھا اور اُن پر گراں بھی گذرنا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس تبدیلی کو تدریجی طور پر ظاہر کیا جائے اور مدلل طور پر قائم کیا جائے۔

اِن آیات میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بار بار اور متواتر عہد کے توڑنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اب اسحاقؑ کی نسل کی جگہ اسمٰعیلؑ کی نسل کے ذریعہ سے عہدِ ابراہیمی کو پورا کیا جائے۔ لیکن بنو اسحاق کو آخری تنبیہ کرتے ہوئے اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کنواری کے ہاں بیٹا پیدا کیا جائے اور اُسے موسیٰؑ کا خلیفہ مقرر کیا جائے اِس خلیفۂ موسوی کی وجہ سے بنو اسرائیل کے ذریعہ سے پورا ہونے والا عہد آدھا رہ گیا یعنی باپ کا تعلق بنو اسرائیل سے کٹ گیا اور صرف ماں کا تعلق رہ گیا جو بنی اسرائیل سے تھیں۔

پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ بن باپ کے بچہ ہونا ناممکن ہے گو خدا کے لئے سب کچھ ممکن ہے مگر پھر بھی لوگ اس کو سنت اللہ کے خلاف کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر تازہ تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ بات سنت اللہ کے خلاف نہیں بلکہ قانونِ قدرت کے اندر ہے چنانچہ ہم ذیل میں ایک تازہ شہادت پیش کرتے ہیں :۔

DR. HALEN SUPERWAY یونیورسٹی کالج لنڈن کی یہ تھیوری ہے کہ پیدائش کیلئے ہمیشہ ضروری نہیں کہ نر کی ضرورت ہو چنانچہ LENCET لنڈن کے ایک ہفتہ واری میگزین میں اسکے تجربات شائع ہوتے ہیں۔ پھر SUNDAY PICTORIAL لنڈن ۶ نومبر ۱۹۵۵ء میں اِسی تھیوری کے متعلق ایک شائع شدہ مضمون کے جواب میں ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۳ نومبر کو شائع ہونے والے رسالہ میں تین ایسی عورتوں کی شہادات بھی شائع ہوئی ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کا یہ بچہ خود بخود ہوا ہے۔ اس کی پیدائش میں کسی مرد کا دخل نہیں۔ اس کے بعد ۲۸ دسمبر کے رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ اُنیس ۱۹ عورتوں نے اس امر کی مزید شہادت دی ہے۔

بہرحال چونکہ قرآن کریم کا اصل منشاء یہ تھا کہ ابراہیمی وعدہ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ وسلم کے ذریعہ سے پورا ہوا ہے جو کہ بنو اسمٰعیل میں سے ہیں۔ اس لئے حضرت مسیحؑ ناصری کے بن باپ پیدا ہونے کے واقعہ کا ذکر تفصیلی طور پر کیا اور اس طرف اشارہ کیا۔ کہ خود پیدائشِ مسیحؑ ہی اس طرف اشارہ کر رہی تھی کہ بنو اسحاق کے ذریعہ سے ابراہیمی عہد کے پورا ہونے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ تبھی خدا تعالیٰ نے مسیح کے ذریعہ سے عہد کی آدھی اہمیت ختم کر دی۔ باقی آدھی خود مسیح ناصری کے پیروؤں نے کم کر دی۔ کیونکہ انہوں نے

ختنہ کو جو عہد کی علامت تھا موقوف کر دیا اور اس طرح
عہد کو بنو اسحاق سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ حالانکہ ختنہ
ابراہیمی عہد کی خاص شرط تھی۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے۔
کہ خدا تعالٰے نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ
"میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے
بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانوگے
سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ
کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ
کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور
تمہارے درمیان ہے۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۰-۱۱)
اسی طرح لکھا ہے
"میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا اور
وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں
میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا
عہد توڑا۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۴) (وَاذْكُرْ
فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے وَمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا تک)
پھر حضرت مسیح کے واقعات بتائے اور انکی صداقت
کی دلیلوں کے ساتھ اُن جھوٹے دعووں کا بھی ازالہ کیا جو
اُن کے متبعین ان کی نسبت کرتے ہیں (فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ
سے اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ تک)
اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے
ذکر کو چھیڑا کہ ان گزشتہ واقعات میں اور مسیح کی آمد
میں ایک اسمٰعیلی موعود کی خبر دی گئی تھی سو وہ محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن لوگ اُن کے مخالف ہیں۔
اور ان کی مخالفت کی بڑی وجہ اُن کی کثرت ہے جو دلیل
نہیں۔ اور اُن کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ خود
ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن انکی کثرت
فائدہ نہ دے گی اور آخر وہ سب تباہ ہونگے (وَاِنَّ اللّٰهَ
رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ سے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ تک)
پھر فرمایا آج تو یہ لوگ خوب باتیں بناتے ہیں اور
اسلام کے متعلق بات سننا بھی پسند نہیں کرتے لیکن
ایک دن عذاب کو دیکھ کر خوب دیکھنے اور سننے لگ جائینگے
اور زمین مسلمانوں کے سپرد ہو جائے گی (اَسْمِعْ بِهِمْ
وَاَبْصِرْ سے وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ تک)
اس کے بعد اُس وعدۂ ابراہیمی کو تفصیل سے
بیان کرتا ہے جس کا ذکر پہلے اشارۃً آیا تھا اور بتاتا ہے
کہ کس طرح ابراہیم سے ایک وعدہ ہوا جو اسحاقؑ اور
موسیٰؑ کے ذریعہ سے پورا ہوا (وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ
اِبْرٰهِيْمَ سے وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ
هٰرُوْنَ نَبِيًّا تک)
اس کے بعد اسمٰعیلؑ کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ اس جگہ
یہ بتانا مقصود تھا کہ اسحاقؑ کے وعدہ کے بعد اسمٰعیل کا
وعدہ پورا ہونا تھا اور نیز زمانہ کے لحاظ سے حضرت موسیٰؑ
حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد تھے اُن کا ذکر حضرت اسمٰعیل سے
پہلے اس لئے کیا گیا کہ وہ اسحاق کے وعدہ کا حصہ تھے جو
اسمٰعیلی وعدہ سے پہلے پورا ہونا ضروری تھا (وَاذْكُرْ
فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ سے وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا
تک)
اس کے بعد حضرت ادریسؑ کا ذکر کیا جن کے بارہ
میں رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا ذکر فرما کر بتایا کہ
اُن کو بھی حضرت مسیحؑ سے رفع روحانی میں ایک مشابہت ہے
چنانچہ عہد نامہ قدیم پیدائش باب ۵ آیت ۲۴ میں لکھا
ہے کہ حنوک (جسے عرب لوگ ادریسؑ کہتے ہیں۔ کیونکہ
وہ خدا تعالیٰ کی باتیں لوگوں کو سناتا تھا۔ بائبل میں بھی
لکھا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چلتا تھا۔ پیدائش باب ۵
آیت ۲۲۔ اور اس سے مراد بھی خدا تعالے کی صفات کا
علم حاصل کرنے کے ہیں یعنی وہ اللہ تعالے کا ایک

اعلیٰ ظہور تھا اور خدا تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرتا تھا) غائب ہو گیا۔ اس لئے کہ خدا نے اُسے لے لیا پیدائش ۵ آیت ۲۴) غائب ہو گیا کہ خدا نے اُسے لے لیا" کا ترجمہ قرآن کریم میں رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا سے کیا گیا ہے اور ایسے ہی الفاظ حضرت مسیح ناصری کے متعلق ہیں۔ لیکن باوجود اس کے مسیحی حنوک کو خدا نہیں کہتے بلکہ انسان ہی سمجھتے ہیں۔ پھر ان لفظوں سے مسیح کو کیوں خدا سمجھنے لگ گئے ہیں۔ بلکہ بقول بائبل حنوک کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ وہ موت کے بغیر ہی آسمان پر چلا گیا اور خدا باپ کی طرح اس نے کبھی موت نہ چکھی (وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ سے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا تک)

پھر بتاتا ہے کہ یہ سب لوگ آدمؑ سے لے کر نوحؑ تک اور نوحؑ سے اسرائیل کے آخری نبیوں تک انسان تھے اور خدا تعالیٰ کے فرمانبردار پھر کیا وجہ ہے کہ اُن میں سے مسیحؑ کو خدائی کا عہدہ دیا جاتا ہے (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا تک)

اس کے بعد بتایا کہ لوگوں نے تعلیمات سماوی کو بھلا کر لہو و لعب کو اختیار کر لیا ہے لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ نتیجہ انہی کے لئے اچھا ہوگا جو ان امور سے توبہ کر کے خدا تعالیٰ کی باتوں کو سنیں گے (فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ سے هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا تک)

پھر بعد الموت کا چونکہ اس زمانہ میں سب سے زیادہ انکار ہوتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا اور پھر اُن کے انکار کا ذکر کر کے دلیل دی کہ مابعد الموت زندگی کوئی عجیب شئے نہیں ایسا ضرور ہوگا اور مجرم ضرور سزا پائیں گے۔ اور نیک نجات حاصل کریں گے (وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ سے نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا تک)

پھر سچائی کے دشمنوں کا ایک حربہ بیان کرتا ہے کہ جب اخروی سزا کا ذکر کیا جاتا ہے تو منکر کہتے ہیں کہ قیامت کی بات تو قیامت کو دیکھی جائے گی اب کس کا حال اچھا ہے، کس کی دولت زیادہ ہے، کس کے افراد زیادہ ہیں۔ فرماتا ہے ہمیشہ سے سچائی آہستہ آہستہ ترقی کرتی رہی ہے جب تک وہ وقت نہ آئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ دلیل کس کے ساتھ ہے اور قربانی اور نیک نمونہ کس کے ساتھ ہے۔ جس کے ساتھ دلیل ہو اور جس کے ساتھ نیک نمونہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں بھی آخر وہی جیتے گا۔ (وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ سے وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا تک)

اس کے بعد فرماتا ہے منکرین صداقت ہمیشہ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور شرک کو تقویت کا موجب سمجھتے ہیں مگر شرک ہمیشہ ذلت اور شکست کا موجب ہوتا ہے۔ وہی چیزیں جن کو لوگ تقویت کا موجب بتاتے ہیں اُن کی کمزوری کا موجب ثابت ہوتی ہیں (وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً سے يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا تک)

پھر فرماتا ہے کہ جب دلائل سے کافر عاجز آ جاتا ہے تو دھینگا مشتی پر اتر آتا ہے مگر اس کی پرواہ نہ کر آخر یہ دھینگا مشتی ہی تو دنیوی غلبہ کا سبب بنے گی۔ دشمن دھینگا مشتی نہ کرے تو اسلام کو دنیوی غلبہ کس طرح حاصل ہوگا (یعنی اسلام جارحانہ لڑائی کی اجازت نہیں دیتا۔ پس اُس کے غلبہ کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ دشمن ظلم پر اتر آئے) جب وہ ظلم پر اُترے گا تو مسلمانوں کو بھی لڑنے کی اجازت ہوگی۔ اور چونکہ دشمن خدا تعالیٰ کو عقیدۃً بھی ناراض کر چکا ہوگا خدا تعالیٰ کی مدد سے مسلمان جیت جائیں گے (اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ سے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا تک)

پھر فرماتا ہے کہ یہود پر کلام عبرانی زبان میں نازل ہوتا تھا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

کٓہٰیٰعٓصٓ ○

کٓہٰیٰعٓصٓ ؎۲

لوگ یہ نہ اعتراض کریں کہ اب عربی زبان میں کلام کیوں اُترا ہے۔ ہر قوم سے اُس کی زبان میں کلام ہونا چاہیئے تاکہ آسانی سے تبلیغ ہو سکے اور دوست دشمن سمجھ سکیں۔ اور کفار پر حجت تمام ہو۔ ہماری طرف سے سزا حجت کے بعد ہی دی جاتی ہے اور وہی سزا عبرت ناک ہوتی ہے (فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ ~ تَتِمَّۃٌ لَھُمۡ رکھتا ہے)

؎۲ کٓہٰیٰعٓصٓ۔ میں نے متعدد بار بیان کیا ہے کہ حروفِ مقطعات کے متعلق مختلف ائمہ اسلام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی تشریح ایسی ہو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہو تو بہرحال وہ دوسرے لوگوں کے خیالات سے مقدم سمجھی جائے گی۔ اس نقطۂ نگاہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مقطعات کے متعلق دو ہی معنے منسوب ہیں۔ بعض روایتوں میں تو یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہودیوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ حروف اعداد کے حروف ہیں۔ مثلاً الٓمٓ ہے۔ اس میں الف کا ایک لام کے تیس اور م کے چالیس اعداد ہیں۔ گویا الٓمٓ کے اکتہتر عدد ہوئے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معنوں کو ردّ نہیں کیا۔ پس بوجہ ان معنوں کو رد نہ کرنے کے وہ معنے بھی ہمارے نزدیک قابل قبول ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ غلط ہوتے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو ردّ فرما دیتے۔ اور قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معنے بھی اپنے اندر بعض پیشگوئیاں رکھتے ہیں جو وقت پر پوری ہوئیں۔

اس کے علاوہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے معنے بھی منسوب ہیں جن میں صفاتِ الٰہیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہی کٓہٰیٰعٓصٓ ہے حضرت اُمِّ ہانیؓ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن تھیں وہ کہتی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے معنے کَافٍ۔ ھَادٍ۔ عَالِمٌ اَوْ عَلِیْمٌ اور صَادِقٌ کے ہیں یعنی ک قائم مقام صفت کافی کا ہے۔ ھا قائم مقام صفت ہادی کی ہے۔ ع قائم مقام صفتِ عَالِمٌ یا عَلِیْمٌ کی ہے اور ص قائم مقام صفتِ صادق کی ہے (فتح البیان) گویا ان مقطعات میں خدا تعالےٰ کی صفتِ کافی۔ صفتِ ہادی صفتِ عالم یا علیم اور صفتِ صادق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

کٓہٰیٰعٓصٓ کی تشریح

حضرت علیؓ کی بھی ان الفاظ کے متعلق ایک روایت آتی ہے جو ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی کٓہٰیٰعٓصٓ میں صفاتِ الٰہیہ کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو جب کوئی بڑی مصیبت پیش آتی۔ تو وہ اللہ تعالےٰ سے یہ دعا کیا کرتے تھے۔ کہ یَا کٓہٰیٰعٓصٓ اِغْفِرْ لِیْ۔ یعنی اے کٓہٰیٰعٓصٓ مجھے معاف فرما دے۔ اور چونکہ دعا کا صفاتِ الٰہیہ سے خاص تعلق ہوتا ہے اس لئے یہ روایت بتاتی ہے۔

کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کٓھٰیٰعٓصٓ کو صفاتِ الٰہیہ
کا قائم مقام سمجھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے بھی ان حروفِ مقطعات
سے صفاتِ الٰہیہ ہی مراد لی ہیں۔ مگر انہوں نے اُمِ ہانیؓ
والی روایت سے کچھ اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں
کٓ کَبِیْرٌ کا ہے ھا، ھَادٍ کی ہے یا، اَمِیْنٌ
کی ہے۔ ع سے عَزِیْزٌ مراد ہے اور ص سے صَادِقٌ
مراد ہے۔ گویا حضرت ابن عباسؓ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ
یہاں صفاتِ الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے مگر وہ اس کی تشریح
میں کچھ اختلاف کرتے ہیں۔ ام ہانیؓ کی روایت میں کٓ
سے کافٍ مراد لیا گیا تھا مگر ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس
سے کَبِیْرٌ مراد ہے۔ دوسرے ع سے انہوں نے عالم
یا عَلِیْمٌ مراد لیا تھا مگر ابن عباسؓ اس سے عَزِیْزٌ مراد
لیتے ہیں۔ اسی طرح اُم ہانیؓ کی روایت میں یا، کو چھوڑ
دیا گیا تھا مگر ابن عباسؓ یا، سے اَمِیْنٌ مراد لیتے ہیں
ابن مسعودؓ اور بعض اور صحابہؓ کہتے ہیں کہ کٓ سے
الملک مراد ہے۔ ھا، سے الالٰہ مراد ہے یا،
اور ع سے العزیز مراد ہے اور ص سے المصوّر
مراد ہے (فتح البیان)

یہ روایتیں گو مختلف ہیں مگر ہم ان سے اتنا نتیجہ
نکالنے میں ضرور حق بجانب ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
اور تمام صحابہؓ نے بالاتفاق ان حروف سے صفاتِ الٰہیہ مراد
لی ہیں گو اُن کی تعیین میں بعض صحابہؓ نے اختلاف کیا ہے
لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو تعیین رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے فرمائی وہی مقدم ہے اور صحابہؓ کی تعیین رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کی تعیین کے مقابلہ میں محض ظنی سمجھی جائیگی
اگر ابن مسعودؓ کچھ اور معنے کرتے۔ ابن عباسؓ کچھ اور معنے کرتے
حضرت علیؓ کچھ اور معنے کرتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ سب نے اپنے اپنے
پاس سے معنے بنالئے ہیں۔ مگر حضرت علیؓ بھی اُن سے
صفاتِ الٰہیہ مراد لیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ بھی صفاتِ
الٰہیہ مراد لیتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان سے
صفاتِ الٰہیہ مراد لیتے ہیں۔ پس ان روایات سے اتنا تو
پتہ لگ گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بات
ثابت ہے کہ یہ حروف صفاتِ الٰہیہ کے قائم مقام ہیں۔
باقی ہر شخص کا اپنی اپنی عقل کے مطابق کچھ صفاتِ الٰہیہ تجویز کر لینا
کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اس اصولی امر میں سب
متفق نظر آتے ہیں۔ کہ ان حروف میں صفاتِ الٰہیہ کی طرف
اشارہ کیا گیا ہے۔ رہا یہ کہ ان حروف میں کونسی صفات
بیان کی گئی ہیں اس کو سورۃ کا مضمون خود واضح کر دیتا ہے۔
اگر کوئی غلط معنے کرتا ہے تو ہمارے پاس صداقت کو معلوم
کرنے کا ایک ذریعہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ساری
سورۃ پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ اس میں کن صفاتِ الٰہیہ
کا ذکر آتا ہے۔ اگر اُن صفات کا ذکر موجود نہیں ہوگا تو ہم ان معنوں کو
غلط قرار دیدینگے اور اگر موجود ہوگا تو ہم اُن معنوں کو درست قرار
دیدینگے لیکن اور سورتوں کو جانے دو اس سورۃ میں جو صفات الٰہیہ بیان
کی گئی ہیں چونکہ اُنکی تعیین خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے ثابت ہے اس لئے اس بارہ میں کسی اور تشریح کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سورتوں کے مقطعات کے معنے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ لیکن اس
سورۃ کے مقطعات کے معنے خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے ثابت ہیں۔ اور اُم ہانیؓ کہتی ہیں کہ میں نے یہ معنے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنے ہیں اور دوسرے
صحابہؓ اپنے علم کے مطابق اس کی تشریح کرتے ہیں اور
چونکہ یہ مسلّمہ اصل ہے کہ جو تشریح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے ثابت ہو وہ ہر دوسری تشریح پر مقدم سمجھی جائے گی۔
اس لئے بہرحال اُم ہانیؓ کے بیان کردہ معنوں کو ہی ترجیح
دی جائے گی۔ یعنی کٓ کے معنے کافی کے ہیں ھ کے معنے
ہادی کے ہیں ع کے معنے عالم یا علیمؓ کے ہیں اور ص کے

معنے صادقؑ کے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی معنے اس سورۃ کی کنجی ہیں۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ حروف پانچ ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو صفاتِ الٰہیہ بیان فرمائی ہیں وہ چار ہیں۔ حروف ہیں ک ھا یا ع اور ص۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صفات بیان فرماتے ہیں ک ھا ع اور ص کی۔ یاء کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ یہ بات کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ یاء حرفِ نداء کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یاء کو حرفِ ندا ہی قرار دیا ہے اور پہلی دو صفات بعد کی دو صفات کا نتیجہ قرار دی گئی ہیں۔ گویا ان حروف کو اگر کھولا جائے تو عبارت یوں بنے گی کہ اَنْتَ کَافٍ اَنْتَ ھَادٍ یَا عَالِمُ یَا صَادِقُ۔ اے علیم اور اے صادق خدا تو کافی اور ہادی ہے۔

ان معنوں کے مطابق اللہ تعالےٰ کی صفات کافی اور ہادی جو ظاہر ہیں عالم یا علیم اور صادق کا وہ مسیحیت اور اسلام میں فیصلہ کن ہیں۔ کیونکہ جب ہم یہ کہیں کہ اے ع اور ص تم کاف اور ہاد ہو۔ تو اس کے صاف معنے یہ ہوں گے کہ ع اور ص منبع ہیں کاف اور ہاد کا۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عقلی طور پر بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کی صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صفات تو وہ ہوتی ہیں جو اپنا لازمی نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ لیکن بعض صفات ایسی ہیں جن کا لازمی نتیجہ پیدا ہوتا ہے گویا وہ صفات بعض دوسری صفات کے لئے بطور منبع ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا مُطْعِم ہے مگر کھلانے کی صفت پیدا کرنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر اگر رزق ہی موجود نہ ہو تو وہ کھلائے گا کیا؟ پس اُس کا مطعم ہونا تقاضا کرتا ہے کہ وہ رازق بھی ہو۔ تو بعض صفات ابتدائی اور منبع کے طور پر ہوتی ہیں اور بعض تابع صفات ہوتی ہیں۔ یہاں کاف اور ھاد کی صفات تابع ہیں اور ع اور ص کی صفات منبع کے طور پر ہیں اور کٓھٰیٰعٓصٓ کے یہ معنے ہیں کہ یَا عَلِیْمُ یَا صَادِقُ اَنْتَ کَافٍ وَّ اَنْتَ ھَادٍ۔ اے علیم اور صادق خدا تُو کافی اور ہادی ہے۔ گویا کافی اور ہادی تابع صفات ہیں اور علیم اور صادق اصل صفات ہیں یعنی خدا تعالےٰ کے علیم اور صادق ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کافی بھی ہو اور خدا ہادی بھی ہو۔ گویا اس جگہ خدا تعالےٰ اپنے بندوں سے یہ کہتا ہے کہ تم خدا سے یہ کہو کہ کٓھٰیٰعٓصٓ اے میرے علیم اور صادق خدا میں مانتا ہوں کہ تو علیم ہونے کی وجہ سے کافی ہے اور صادق ہونے کی وجہ سے ہادی ہے۔ جب تو علیم ہے تو ضروری ہے کہ تُو کافی بھی ہو اور جب تُو صادق ہے تو ضروری ہے کہ تُو ہادی بھی ہو۔ اور یہ بات عقلی طور پر بھی ظاہر ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص عالم ہوگا تو لازماً وہ کافی بھی ہوگا جیسے علاج کے لئے تشخیص کامل کی ضرورت ہوتی ہے اور تشخیص کامل کے لئے علم کامل کی ضرورت ہوتی ہے جس شخص کو معالجات سے تعلق رکھنے والی ساری باتیں معلوم نہیں وہ علاج نہیں کر سکتا اور جس کو معلوم ہوں وہ لازماً صحیح علاج بھی کر سکے گا۔ پس یہ ایک واضح امر ہے کہ جو علیم ہوگا وہ کافی بھی ہوگا کیونکہ علم ہی کفائت کرتا ہے نہ کہ جہالت۔

دنیا میں دو ہی قانون جاری ہیں۔ ایک قانونِ قدرت اور دوسرا قانونِ شریعت۔ قانونِ قدرت میں بھی کامل راہنمائی وہی کر سکتا ہے جو علیم ہو۔ جیسے وہی ڈاکٹر کامیاب ہو سکتا ہے جو بڑا جاننے والا ہو۔ اور قانونِ شریعت میں بھی وہی وجود کامل راہنمائی کر سکتا ہے جو علیم ہو۔ جو وجود ہماری جسمانی ضرورتوں کا علم نہیں رکھتا یا ہماری روحانی ضرورتوں کا علم نہیں رکھتا وہ ہمیں صحیح نسخہ بھی نہیں بتا سکتا۔ پس علیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کافی ہو۔ اسی طرح جو

صادق ہوگا وہی صحیح ہادی بھی ہوگا کیونکہ جھوٹ اور غلطی
گمراہ کرنے والی چیزیں ہیں اور ہادی کے لئے ضروری ہے
کہ وہ صادق ہو۔ پس وہی ہادی ہو سکتا ہے جو صادق ہو۔
بلکہ تمام صداقتوں کا منبع ہو۔ اس کے سوا ہر جگہ کی ہدایت
مشتبہ اور ناقابلِ قبول ہوگی۔

غرض جب کوئی شخص یہ مانے گا کہ کوئی ہستی علیم
ہے تو اُسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صفت کافی بھی اُس میں
پائی جاتی ہے۔ اور جب کوئی شخص یہ مانے گا کہ کوئی ہستی
صادق ہے تو اُسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صفتِ ہادی
بھی اُس میں پائی جاتی ہے۔ اور اگر یہ دو اصول درست ہیں
اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہودی مذہب جو بنیاد ہے
عیسائیت کی وہ خدا تعالےٰ کو علیم بھی سمجھتا ہے اور صادق
بھی سمجھتا ہے تو لازماً ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کافی بھی
ہے اور خدا تعالےٰ ہادی بھی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ
بائبل اس بارہ میں کیا کہتی ہے۔

پہلے ہم خدا تعالےٰ کی صفتِ علم کو لیتے ہیں۔ انجیل
میں لکھا ہے۔

"لیکن اُس دن اور اس گھڑی کو میرے باپ
کے سوا آسمان کے فرشتوں تک کوئی نہیں
جانتا" (متی باب ۲۴ آیت ۳۶)

یہ حوالہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں علم کی مختلف مقداریں ہیں
کوئی مقدارِ علم ایسی ہے جسے انسان جانتا ہے۔ کوئی
مقدارِ علم ایسی ہے جسے فرشتے جانتے ہیں اور کوئی مقدارِ علم
ایسی ہے جسے نہ انسان جانتا ہے نہ فرشتے جانتے ہیں
صرف خدا جانتا ہے۔ گویا علم کامل صرف خدا تعالےٰ کی
ذات سے مختص ہے اور جب علم کامل اُسی میں ہوا تو لازماً
اُسے کافی بھی ماننا پڑا۔ پھر لکھا ہے۔

"خداوند نے دانائی سے زمین کی بنیاد ڈالی اور
عقلمندی سے آسمان کو آراستہ کیا۔ اس کی
دانش سے گہرائیاں پھوٹ نکلیں اور آسمان سے
اوس کی بوندیں ٹپکیں" (امثال باب ۳ آیت ۱۹ و ۲۰)

یعنی خدا نے علم پر قانونِ قدرت کی بنیاد رکھی اور اُسے
آراستہ کیا اور پھر اس کے بعد جو بھی علم پیدا ہوتا ہے
خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی اس کے علم سے نکلتا ہے کیونکہ
لکھا ہے: "اس کی دانش سے گہرائیاں پھوٹ نکلیں" اس کے
بعد "آسمان سے اوس کی بوندیں ٹپکیں" یعنی خدا تعالےٰ نے
علم کو اتنا کامل کیا کہ آسمان بھی انسان کی ہدایت کے لئے
ٹپک پڑا یعنی الہام اور کلام الٰہی نازل ہوا اور اس نے علم
کو ہر رنگ میں مکمل کر دیا۔ یہ حوالہ بتاتا ہے کہ ہدایت
ہمیشہ خدا تعالےٰ کی طرف سے آتی ہے اور وہی کامل ہدایت
ہوتی ہے کیونکہ ایک علیم ہستی اس کے پیچھے ہوتی ہے انسان
اپنی طرف سے کچھ نہیں کر سکتا۔

پھر صدق کے متعلق لکھا ہے۔

"اے خداوند سچائی کے خدا تُو نے مجھے
مخلصی دی ہے" (زبور باب ۳۱ آیت ۵)

اس سے ظاہر ہے کہ مخلصی یعنی نجات کا واسطہ "خداوند
سچائی کے خدا" کے ساتھ ہے جس طرح شریعت کا واسطہ
ایک علیم ہستی کے ساتھ ہے۔ پھر لکھا ہے۔

"تیری صداقت ابدی صداقت ہے اور
تیری شریعت سچائی ہے" (زبور باب ۱۱۹ آیت ۱۴۲)

گویا بائبل اور انجیل دونوں سے یہ ثابت ہے کہ علم کامل صرف خدا تعالیٰ
کو حاصل ہے اور صداقتِ کاملہ بھی اُسی کو حاصل ہے اور جب بائبل کے نزدیک
علیم اور صادق صرف خدا تعالےٰ کا ہی وجود ہے تو عیسائیوں
کے لئے اس امر کے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔
کہ سوائے علیم کے کوئی کافی نہیں ہو سکتا اور سوائے صادق
کے کوئی نجات نہیں دے سکتا۔ اور اگر یہ دونوں باتیں
درست ہیں تو پھر خدا تعالےٰ کی صفتِ علیم اور اس کا
ظہور کافی یہ کفارہ کے خلاف ہیں اور خدا تعالےٰ کی

صفتِ صادق اور اس کا ظہور ہادی شریعت کے لعنت ہونے اور مسیحی مسئلہ نجات کے خلاف ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ عالم یا علیم ہے تو مذہب میں کفارہ کی کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ایک سکیم کے ماتحت اس دنیا کو چلایا اور اپنے انبیاء لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے مگر آخر وہ سکیم ناکام ہوئی اور پھر واپس لوٹ کر خدا تعالےٰ کو اپنے بیٹے کی قربانی دینی پڑی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر نہ وہ علیم ہوا اور نہ کافی۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی صفتِ صادق اور اس کا ظہور ہادی اگر درست ہے تو عیسائیوں کا شریعت کو لعنت قرار دینا اور نجات کے لئے کفارہ کا مسئلہ ایجاد کر لینا بالکل غلط ہے۔

غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیت کے مقابلہ کے لئے ایک بنیادی اصول بیان فرما دیا ہے اور بتایا ہے کہ عیسائیوں سے صفاتِ الٰہیہ کو مدنظر رکھ کر بحث کیا کرو۔ اس کے نتیجہ میں ان کے تمام عقائد باطل ثابت ہو جائیں گے۔ اگر خدا کافی ہو تو پھر یہ کہنا کہ شریعت میں انسان خود رستہ تجویز کر سکتا ہے یا شریعت لعنت ہے۔ بیوقوفی کی بات ہے۔ جو کافی ہے وہ رحمت ہے اور جو غیر کافی ہے وہ لعنت ہے۔ اسی طرح جو صادق ہے اور جس کے اندر تمام سچائیاں پائی جاتی ہیں مگر اس کا وجود نجات نہیں دلا سکتا تو پھر کسی غیر صادق کا وجود کس طرح نجات دلا سکتا ہے۔ نجات تو وہی دلائے گا جو صادق ہوگا جیسے حضرت داؤدؑ نے کہا کہ

"اے خداوند سچائی کے خدا تو نے مجھے مخلصی دی ہے" (زبور باب ۳۱ آیت ۵)

غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت اور اسلام کے مباحثات کا صحیح طریق بتایا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اگر عیسائیوں سے مقابلہ کرو تو صفاتِ الٰہیہ کی بناء پر کرو اور ان پر یہ امر واضح کر دو کہ تمہارے عقیدہ کو تسلیم کر لینے سے صفاتِ باری باقی نہیں رہتیں اور جب عیسائیت کو ماننے سے صفاتِ باری پر ہی زد پڑتی ہے تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا خدا نہ رہا اور یہ واضح بات ہے کہ سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو خدا تعالےٰ کا وجود لوگوں سے منوائے اور اُس کی صفات پر اُن کا ایمان قائم کرے۔ جو مذہب خدا تعالیٰ کو ہی ختم کرتا اور اس کی صفات پر تبر رکھ دیتا ہے وہ سچا کس طرح ہو سکتا ہے۔ غرض کافی اور ہادی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کو اگر مدنظر رکھا جائے تو اسلامی تعلیم اور عیسائی تعلیم دونوں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں اور صاف طور پر پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اسلام کیا کہتا ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کے وجود کو کس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور اسلام خدا تعالےٰ کے وجود کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے۔ پس ع اور ص دو صفات ہیں جن کو اگر مانا جائے تو لازماً اُسے کافی اور ہادی بھی ماننا پڑتا ہے۔ اگر اُسے ہادی نہ مانا جائے تو خدا تعالےٰ کا صادق ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اُسے کافی نہ مانا جائے تو خدا تعالےٰ کا علیم ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت کا مقابلہ کے لئے ایک بنیادی اصل

غرض ان مقطعات میں خدا تعالےٰ کی صفتِ کافی کو کفارہ کے مقابلہ میں اور صفتِ ہادی کو عیسائی نظریۂ نجات کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور درحقیقت عیسائیوں کے یہی دو بنیادی مسئلے ہیں جن میں اسلام کے ساتھ اُن کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ تثلیث اِن مسائل کے تابع ہے۔ اصل مسئلہ جس پر اسلام اور عیسائیت آپس میں ٹکراتے ہیں وہ کفارہ اور عدمِ نجات کا ہے۔ عیسائیت نجات کو باطل نہیں مانتی اور عیسائیت کفارہ کے بغیر کوئی روحانی ترقی تسلیم نہیں کرتی۔ ان دو عقیدوں سے خدا تعالےٰ کی صفتِ کافی اور خدا تعالےٰ کی صفتِ ہادی باطل ہو جاتی ہیں۔ اور ان دونوں صفات کے باطل ہونے سے اس کا

تعلیم اور صادق ہونا بھی باطل ہو جاتا ہے گویا عیسائیت کے اِن ہر دو عقائد کو مان لینے سے خدا تعالیٰ کی خدائی باطل ہو جاتی ہے اور جب کسی مذہب کی تعلیم کے نتیجہ میں خدا کی خدائی باطل ہو جائے تو ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ وہ مذہب خود باطل ہے کیونکہ مذہب خدا تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وابستہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے تثلیث بھی ایک اہم عقیدہ ہے لیکن اُن کا یہ عقیدہ کفارہ اور نجات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ اگر کفارہ اور عدم نجات باطل ہو جائیں تو ساتھ ہی تثلیث بھی باطل ہو جاتی ہے اور اگر تثلیث کو الگ کر لیا جائے تو کفارہ اور عدم نجات باطل ہو جاتے ہیں چنانچہ دیکھ لو عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو نجات دلانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح کو دنیا میں کفارہ کے لئے بھیجا۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس کے عدل کے خلاف ہے اگر وہ انسان کے گناہ معاف کر دیتا تو وہ عادل نہ رہتا۔ لیکن چونکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ بنی نوع انسان نجات پائیں اس لئے اُس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ وہ پھانسی پر لٹک جائے اور اس کے پھانسی پر لٹک کر مر جانے کے نتیجہ میں وہ لوگ جو اس پر ایمان لائیں روحانی سزا سے بچ جائیں اور اس کا پھانسی پر لٹک کر مر جانا لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کفارہ بغیر تثلیث کے نہیں ہو سکتا کیونکہ کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پھانسی دی اور تین دن کے بعد اس کو زندہ کیا۔ یہ چیز تبھی تسلیم کی جا سکتی ہے جب ایک سے زیادہ خدا ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ خدا نہ ہوں

تو یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے آپکو نعوذ باللہ پھانسی دے کر تین دن کے بعد اپنے آپ کو زندہ نہیں کر سکتا۔ مگر تین خداؤں کو تسلیم کرنے کی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ تینوں برابر کی طاقت رکھتے ہیں یا اُن میں کم و بیش طاقت ہے اگر ایک کم طاقت رکھتا ہے اور دوسرا زیادہ۔ تو خدا تعالیٰ میں نقص ثابت ہؤا اور ناقص چیز تمام مذاہب کے متفقہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہو سکتی۔ اس پر کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک منطقی نظریہ ہے کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہو سکتی اور جو ہستی ازلی ابدی نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتی۔ اس پر تمام مذاہب متفق ہیں بلکہ عیسائیت کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہو سکتی اور خدا تعالیٰ کے لئے ازلی ابدی ہونا ضروری ہے۔

مَیں ابھی نوجوان تھا قریباً بیس سال کی عمر تھی کہ میں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے ڈلہوزی گیا۔ وہاں ایک مشہور پادری آتے ہوئے تھے جن کا نام غالباً فرگوسن تھا۔ انہوں نے سینکڑوں عیسائی بنا لئے تھے اور وہ پہاڑ پر بھی اپنے ٹریکٹ تقسیم کرتے اور عیسائیت کی تعلیم پھیلاتے رہتے تھے۔ کچھ مسلمان جو غیرت مند تھے وہ مولویوں کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ اس فتنہ کا مقابلہ کریں مگر انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے تو مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ آپ چلیں اور اُن سے بات کریں ہم لوگ بڑے شرمندہ ہیں۔ میں ابھی چھوٹی عمر کا ہی تھا اور میری دینی تعلیم ایسی نہ تھی لیکن میں اُن کے کہنے پر تیار ہو گیا اور ہم چند آدمی مل کر اُن کی کوٹھی کی طرف چل پڑے وہاں جا کر میں نے اُن سے کہا کہ پادری صاحب مَیں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اُس وقت ہم

میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور میرے سامنے ایک پنسل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا فرمائیے اگر یہ پنسل اٹھانے کی ضرورت ہو اور آپ اُس وقت مجھے بھی آوازیں کہ آؤ اور میری مدد کرو۔ اپنے ساتھیوں کو بھی آوازیں دینی شروع کر دیں۔ اپنے بہرے کو بھی بلائیں۔ اپنے باورچی کو بھی بلائیں۔ اپنے ارد گرد کے ہمسایوں کو بھی بلائیں اور جب سارا محلہ اکٹھا ہو جائے تو آپ اُن سے یہ کہیں کہ یہ پنسل میز پر سے اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دو تو وہ آپ کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ کہنے لگا اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا مطلب خود بخود آجائیگا آپ صرف یہ بتائیں کہ آیا یہ بات معقول ہوگی اور اگر آپ ایسا کریں تو لوگ آپ کے متعلق کیا سمجھیں گے؟ کہنے لگا پاگل سمجھیں گے۔ میں نے کہا اب یہ بتائیے کہ باپ خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی۔ میں نے کہا۔ بیٹے خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی۔ میں نے کہا روح القدس خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا۔ تھی۔ میں نے کہا پھر یہ وہی پنسل والی بات ہوگئی کہ تینوں میں ایک جیسی طاقت ہے اور اس کام کے کرنے کے قابل ہیں۔ مگر تینوں بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں حالانکہ وہ اکیلے اکیلے بھی دنیا کو پیدا کر سکتے تھے۔ میں نے کہا آپ یہ بتائیں کیا دنیا میں کوئی کام ایسا ہے جس کو باپ خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا نہیں کر سکتا۔ یا بیٹا خدا کر سکتا ہے اور روح القدس خدا نہیں کر سکتا۔ یا روح القدس خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا۔ یا بیٹا خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا ہو کہنے لگا۔ کوئی نہیں۔ میں نے کہا پھر جھگڑا کیا ہے۔ اگر دو خدا فارغ بیٹھے رہتے ہیں تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ کہ وہ کام تو کر سکتے ہیں مگر فارغ بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں اور اگر ایک کام کو تینوں مل کر کرتے ہیں حالانکہ اُن تینوں میں سے ہر ایک اکیلا اکیلا بھی وہ کام کر سکتا ہے تو یہ جنون کی علامت ہے۔ اس پر وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ کہ عیسائیت کی اصل بنیاد کفارہ کے مسئلہ پر ہے تثلیث کا مسئلہ تو ایمان کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ میں نے کہا کہ جب تک تثلیث سمجھ میں نہ آئے انسان ایمان نہیں لا سکتا اور جب تک ایمان نہ لائے تثلیث سمجھ میں نہیں آسکتی تو یہ تو دورِ تسلسل ہو گیا جس کو تمام منطقی ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ مجھے معاف کریں کفارے پر بات کریں۔

پس درحقیقت کفارہ تعلق رکھتا ہے تثلیث کے ساتھ۔ اگر کفارہ باطل ہو جائے تو تثلیث خود بخود باطل ہو جاتی ہے اور چونکہ یہ عقیدہ صریح مشرکانہ ہے۔ اس لئے اس جگہ عالم کی صفت کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں اسباب پر بڑی بحث کی ہے کہ جس چیز کا انسان عالم کامل ہو اُسے وہ بنا بھی سکتا ہے مثلاً انسان کو علم ہے کہ اینٹیں جوڑنے سے مکان بن جاتا ہے تو اس علم کے نتیجہ میں وہ مکان بنا لیتا ہے یا اُسے علم ہے کہ مٹی گھول کر لکڑی کے سانچوں میں ڈھالو تو کچی اینٹ بن جاتی ہے اور پھر اُسے آگ میں ڈال دیا جائے تو پختہ ہو جاتی ہے۔ تو اس علم کے نتیجہ میں وہ پختہ اینٹ بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو پتہ لگ جائے کہ مٹی کس طرح بنتی ہے تو مٹی بھی بنا سکتا ہے۔ غرض خلق علم کے تابع ہے۔ جب کسی چیز کا کامل علم حاصل ہو جائے تو اُسے انسان بھی بنا سکتا ہے۔ اگر کسی کو گھڑی بنانے کا پورا علم حاصل ہو جائے تو وہ گھڑی بنا لے گا۔ جیسا ضعال الاعضار کا پورا علم حاصل ہو جائے

وہ ڈاکٹر بن جائے گا۔ غرض کسی چیز کا علم کامل خلق پر قدرت دے دیتا ہے اور جب کوئی ہستی کامل علم والی ہو تو لازماً اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ کامل خلق بھی کر سکتی ہے اور کامل تدبیر بھی کر سکتی ہے اور یہ کہ اُس کے ہوتے ہوئے کسی اور مدبّر کی ضرورت نہیں۔ جیسے فرگوسن کے سامنے میں نے یہی دلیل پیش کی کہ جب تینوں خدا کامل ہیں تو پھر ایک کی موجودگی میں باقیوں کی کیا ضرورت ہے۔ خدا باپ کو لے لو۔ خدا بیٹے کو لے لو۔ خدا روح القدس کو لے لو۔ جب باپ خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو بیٹا خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو روح القدس خدا کر سکتا ہے تو پھر ایک خدا ہی کافی ہے باقی دو کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اس جگہ کاف میں صفت کافی کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہے بندوں کی پیدائش کے لئے بھی اور اُن کے نظام کے لئے بھی اور اُن کی تدبیر کے لئے بھی اس میں نہ کسی کفارہ کی ضرورت ہے اور نہ بیٹے اور روح القدس کی مدد کی ضرورت ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ باوجود خدا تعالےٰ کو کافی سمجھنے کے تم بھی تو فرشتوں کے قائل ہو۔ اسی طرح تم اس دنیا میں ہواؤں کے اور بجلیوں کے اور مادہ کے قائل ہو یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہم تابع حیثیت دیتے ہیں اور تابع حیثیت اور ہوتی ہے اور برابر کی حیثیت اور ہوتی ہے۔ تابع چیز ایسی ہی ہوتی ہے جیسے خادم ہوتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو پسِ پردہ رکھنے کے لئے ایک قانون بنایا ہوا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ پر ایمان لانے کا کوئی نیک نتیجہ نکلنا تھا اور ہمیں اس کے بدلہ میں انعامات ملنے تھے تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پسِ پردہ رہتی۔ کیونکہ جو ظاہر چیزیں ہیں اُن پر ایمان لانا کسی ثواب کا موجب نہیں ہوتا۔ سورج ہمیں نظر آتا ہے اور ہم اس کا وجود مانتے ہیں مگر اس کے ماننے سے ہمیں انعام نہیں ملتا۔ اسی طرح پہاڑ نظر آتے ہیں اور ہم اُن کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر ہمیں اُن پہاڑوں کو ماننے سے ثواب نہیں ملتا۔ چونکہ انسانی پیدائش کی غرض تکمیلِ روحانیت تھی اور تکمیل روحانیت ثواب کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور روحانی نظر کی تیزی کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے جب کسی چیز کی تیزی اور اُس کے ارتقار کا سوال آئے گا لازماً امتحان اور آزمائش کا بھی سوال آجائے گا اور امتحان اور آزمائشیں زیادہ تر اُسی چیز کے متعلق ہوتی ہیں جس کے حصول میں مشکلات حائل ہوں۔ پس ضروری تھا کہ اللہ تعالےٰ کا وجود مخفی رہے۔ ورنہ بنی نوعِ انسان کی ترقی کی سکیم بالکل بے کار ہو جاتی اور جب خدا نے پوشیدہ رہنا تھا تو یہ لازمی بات تھی کہ کچھ روحانی سامان پیدا کئے جاتے اور کچھ جسمانی سامان پیدا کئے جاتے۔ روحانی اسباب میں فطرتِ صحیحہ اور فرشتے شامل ہیں اور جسمانی اسباب میں مادہ اور اس کو حرکت دینے والا قانون شامل ہے۔ پس فرشتوں کا وجود یا مادہ کا وجود کسی اعتراض کا موجب نہیں۔ عیسائی برابر کے خدا پیش کرتے ہیں اور ہم خادم اور تابع چیزیں پیش کرتے ہیں اور خادم اور تابع چیزوں کی ضرورت اس لئے ہے تا اللہ تعالےٰ کی ہستی وراء الورا رہے اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسا پردہ حائل رہے جس کو مجاہدہ اور محنت سے کام لینے والا انسان ہی پھاڑ سکے، ہر انسان نہیں۔ غرض علم مبداء اور علم موجودات کا جو واقف ہوگا لازماً قادرِ مطلق وجود ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا صادق ہونا بھی ایک مجاہد کی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر انسان

بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تھا تو تمام سابق انبیاء جھوٹے قرار پاتے ہیں اور اُن کو بھیجنے والا بھی جھوٹا قرار پاتا ہے۔ کیونکہ آدم آیا اور اس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ نوحؑ آیا اور اس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ آدمؑ کا واقعہ تو تورات میں تفصیل کے ساتھ موجود نہیں۔ نوحؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور بائبل بتاتی ہے کہ نوحؑ نے آکر یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ اگر انسان بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تو نوحؑ جھوٹا تھا اور نوحؑ کو بھیجنے والا بھی جھوٹا تھا۔ پھر ابراہیم آئے انہوں نے بھی بنی نوع انسان سے یہی کہا کہ جو صداقتیں میں پیش کرتا ہوں۔ اُن کو مانو۔ گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی بائبل میں ادھورا ہے۔ جیسے آدمؑ کا ذکر ادھورا ہے۔ لیکن اس کے بعد موسیٰؑ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اور بائبل بتاتی ہے کہ انہوں نے دنیا کے سامنے اپنی تعلیم پیش کی اور اُن سے یہی کہا کہ اگر تم اس تعلیم کو نہیں مانوگے تو تم خدا تعالےٰ کے غضب کے نیچے آجاؤگے اور اگر مانوگے تو نجات پا جاؤگے۔ انہوں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میں تعلیم تو دیتا ہوں مگر تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ جیسے عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ موسیٰؑ نے یہی کہا کہ اگر تم عمل کروگے تو نجات پا جاؤگے۔ پس عیسائی عقیدہ اگر سچا ہے اور نجات ناممکن ہے تو موسےٰ جھوٹا تھا اور اس نے نعوذ باللہ بڑا فریب کیا کہ اپنی تعلیم کے متعلق لوگوں سے یہ کہا کہ اگر تم اس پر عمل کروگے تو نجات پا جاؤگے اور اگر وہ نبی تھا جیسے بائبل کہتی ہے کہ وہ نبی تھا تو پھر خدا بھی نعوذ باللہ جھوٹا قرار پاتا ہے جس نے اسے اس تعلیم کے ساتھ بھیجا۔ اسی طرح موسیٰؑ کے بعد آنے والے باقی تمام انبیاء بھی جھوٹے ماننے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک نے یہی کہا کہ میری تعلیم پر چلوگے تو نجات پاؤگے چنانچہ زبور میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ

"تیری شریعت سچائی ہے۔" (زبور باب ۱۱۹ آیت ۱۴۲)

اگر شریعت پر عمل نہیں ہو سکتا جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت لعنت ہے تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ سچائی پر عمل نہیں ہو سکتا صرف جھوٹ پر عمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ سچائی سے نجات نہیں مل سکتی صرف جھوٹ سے مل سکتی ہے۔ غرض اگر ہم یہ مان لیں کہ انسان شریعت پر عمل کرنے سے نجات نہیں پا سکتا اور نبیوں کی اتباع نہیں کر سکتا تو سارے انبیاء کا سلسلہ جھوٹا ماننا پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ صادق خدا ہے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نجات ہے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تمام نبیوں نے یہی کہا کہ اگر تم ہماری باتوں کو مانوگے تو نجات پا جاؤگے۔

دوسرے عربی زبان میں صدق کے لفظ میں دوام کے معنے بھی پائے جاتے ہیں خالی سچائی کے معنے نہیں۔ بلکہ وہ چیز جو قائم رہنے والی ہوتی ہے اس پر بھی صدق کا لفظ حاوی ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ کے صادق ہونے کے یہ معنے بھی ہیں کہ اُس کا وجود اور اس کی تعلیم ہمیشہ قائم رہنے والی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ خدا تعالےٰ کا قول اور خدا تعالےٰ کا فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں اور خدا تعالےٰ کا قول اور اس کا فعل تبھی قائم رہنے والے ہو سکتے ہیں جب بنی نوع انسان بھی قائم رہنے والے ہوں۔ اگر مخلوق نے نجات نہیں پائی اور ہلاک ہو جاتا ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا تعالےٰ کے قول نے بھی قائم نہیں رہنا اور اس کے فعل نے بھی قائم نہیں رہنا کیونکہ اس کا قول اور اس کا فعل مخلوق کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کا قول اور فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں تو معلوم ہوا کہ انسان قائم رہے گا اور وہ نجات پا سکتا ہے۔

اگر اُس نے فنا ہو جانا تھا تو خدا تعالیٰ کا ہمیشہ قائم رہنے والا قول اور فعل باطل ہو جاتا ہے۔ غرض صدقِ کامل اپنے علمی صدق کا بھی مطالبہ کرتا ہے کیونکہ صدق دوام پر دلالت کرتا ہے اور دوامِ صفات بغیر دائمی موہبتِ صفات کے نہیں ہو سکتا۔ خود بائبل بھی ہماری اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ بائبل میں آتا ہے خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا (پیدائش باب آیت ۲۶ و ۲۷) اب خدا تعالیٰ کی شکل کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی نعوذ باللہ ہماری طرح ناک کان آنکھیں اور مُنہ ہیں۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اندر جو صفات پائی جاتی ہیں وہ انسان کے اندر بھی پائی جا سکتی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی شکل پر بنایا گیا اور خدا تعالیٰ صادق ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر تقویٰ اور راستبازی اور طہارت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ خدا تعالیٰ جو صادق ہے۔ اس کا ارادہ اور فعل غلط نکلے اور انسان بوجہ گندی سرشت کے شیطان بن گیا۔ پس جو مذہب یہ کہتا ہے کہ انسان گندی سرشت کے ساتھ دنیا میں آیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ارادہ کیا مگر کوئی وجود بھی وہ اپنی شکل پر پیدا نہ کر سکا۔ اُس نے آدمؑ کو اپنی شکل پر پیدا کیا لیکن وہ گنہگار ہو گیا۔ یعنی یا تو خدا تعالیٰ کی شکل ناقص ہے یا وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا۔ اور شیطان خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پہلے پھل کو بھی لے گیا اور اس کے اگلے پھلوں کو بھی چرا کر لے گیا بلکہ اس کے آخری پھل مسیحؑ کی بھی آزمائش کے لئے آ گیا۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی ہتک نہیں اور کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی صداقت پر حرف لانے والا نہیں؟ خدا تو یہ کہتا ہے کہ میں نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا مگر ہوتا یہ ہے کہ پہلا انسان بھی شیطان کی شکل پر بن جاتا ہے یعنی اُس کی بات ماننے لگ جاتا ہے اور اس کی آئندہ نسل بھی ورثہ کے گناہ میں ہمیشہ کیلئے مبتلا ہو جاتی ہے اور شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے لگ جاتی ہے حتیٰ کہ مسیحؑ جو نجات دہندہ کے طور پر آیا تھا وہ بھی اتنا کمزور ثابت ہوتا ہے کہ شیطان اسکی آزمائش کے لئے آ جاتا ہے (متی باب آیت ۱ تا ۱۱)

مگر اس کے مقابلہ میں قرآن کریم جو تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نجات دینے کیلئے کسی کفارہ کا محتاج نہیں۔ اس نے اپنے بندوں کو ہدایت کے لئے ہی بنایا ہے اور اُن کی پیدائش میں فطری طور پر اُس نے نیکی کا مادہ رکھا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں شیطان کے اس دعویٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ انسان کو خراب کریگا فرماتا ہے:-

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ز لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ط وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ط وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ط اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ (بنی اسرائیل ع)

یعنی جب آدمؑ پیدا ہوئے اور انکی عدم اطاعت اور نافرمانی کی وجہ سے شیطان پر غضب نازل ہوا تو اس نے کہا یہ آدمی جس کو مجھ پر فضیلت بخشی گئی ہے اس کے مقابلہ میں اگر آپ مجھے قیامت تک موقعہ دیں۔

تو میں اس کی اولاد پر غالب آجاؤں گا سوائے کچھ لوگوں کے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کے رُو سے (یہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ کہہ دیں یہ غلط بات ہے) شیطان بھی یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ سارے انسان خراب ہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ اور شیطان نے بھی یہ جرأت نہیں کی کہ سب کو خراب قرار دے بلکہ اس نے تسلیم کیا کہ کچھ انسان پھر بھی بچ جائیں گے لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا نہایت واضح آیت ہے۔ اور بتا رہی ہے کہ یہ مسئلہ اتنا غلط ہے کہ شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ کہے کہ ہر انسان خراب ہے۔ وہ بھی اقرار کرتا ہے کہ کچھ انسان میرے حملے سے ضرور بچ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا۔ جاؤ ان میں سے جو اپنی مرضی سے تمہارے پیچھے چلے گا اس کو سزا دی جائے گی اور تو انکو ڈرا یا بلا جس کو چاہے اپنی آواز سے اور اُن پر اپنے سوار اور پیادے لے جا اور اُن کو اموال اور اولاد میں شریک کر اور انہیں وعدے دے وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ اور شیطان تو ہمیشہ جھوٹے وعدے دیا کرتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ لیکن میں یہ بتا دیتا ہوں کہ تُو نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں بندوں کو چھین کر لے جاؤں گا مگر میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص میری طرف آنا چاہے گا تو اُسے کبھی اپنی طرف نہیں لے جاسکے گا۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا اور وہ انسان جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اس سے زیادہ حفاظت میں اور کون ہو سکتا ہے رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا۔

اور تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کشتی کو آرام سے سمندر میں لے جاتا ہے تاکہ تم اُس کے فضل کی تلاش کرو۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسانی فطرت پاک ہے اور اگر فطرت پاک ہے تو پھر یقیناً اس کو بدی پر غالب آنے کی طاقت بھی حاصل ہے اور اگر انسان بدی پر غالب آسکتا ہے تو پھر کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ صحیح فطرت کی کوشش اور توبہ اور اس کے نتیجہ میں خدا کا رحم نجات کیلئے کافی ہیں۔ چنانچہ ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

اوّل: شیطان نے یہ امید ظاہر کی ہے۔ کہ وہ اکثر بنی نوع انسان کو اپنے قابو میں لے آئے گا۔ گویا قرآن کریم بنی نوع انسان کی خرابی کے عقیدہ کو شیطان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہی نہیں کہ اسلام اس کو ردّ کرتا ہے۔ ردّ کرنا اور چیز ہوتی ہے اور کسی عقیدہ کو اتنا گندہ قرار دینا کہ اس کو شیطانی فعل کہنا بالکل اور بات ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کے متعلق قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ شیطان کا عقیدہ ہے اور شیطان کے متعلق بھی فرماتا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ سارے انسان خراب ہو جائیں گے بلکہ اس نے بھی یہ کہا کہ اکثر انسانوں کو میں خراب کر دوں گا۔

دوسری بات قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کہا کہ تم کوشش کرو ہم تمہیں روکتے نہیں۔ ہم نے انسان کو بنایا ہی اِسی لئے ہے کہ وہ تمہارا مقابلہ کرے اور اپنے اندر نیکی پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن فرماتا ہے۔ تم صرف بیرونی اثرات سے ہی اس پر اپنا اثر ڈال سکو گے ورنہ فطرتاً ہم نے اُسے پاک بنایا ہے۔ عیسائیت تو یہ کہتی ہے کہ گناہ انسان کے دل میں

گھس گیا اور ورثہ کے طور پر نسل انسانی میں چل پڑا۔ حالانکہ اگر یہ درست ہے تو شیطان کے پیچھے چلنے کی تحریک خود انسان کے دل سے پیدا ہونی چاہیئے۔ لیکن اسلام اُس کے دل کو پاک قرار دیتا ہے۔ بلکہ اُس انسان کے دل کو بھی پاک قرار دیتا ہے جو شیطان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔ فرماتا ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ۔ یعنی جسکو چاہے تو اپنی آواز سے ورغلانے کی کوشش کر اور جس پر چاہے اپنے گھوڑے پر چڑھا کر لے جا یعنی اپنا لاؤ لشکر اس پر لے جا اور جس پر چاہے اپنے پیادے لے جا یعنی خواہ جو غالب لوگ ہیں اُن کے ذریعہ اُن کو ورغلا یا جو تحت ہیں اُن کے ذریعہ ورغلا اور خواہ تو انہیں مال کی لالچ دے یا اولاد کی ترقی کی لالچ دے۔ بہرحال میرے بندوں پر تیرا کوئی اثر نہیں ہو گا۔

اس آیت میں بنی نوع انسان کو خراب کرنے والی جن تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو دل سے پیدا ہوتی ہو بلکہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو باہر سے آتی ہیں اور انسان کو خراب کر دیتی ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ تم گانے بجانے سے انسان کو خراب کرو گے۔ تم دھمکیوں سے اُسے خراب کرو گے یعنی یہ کہ اگر سچ بولا تو پھانسی پر لٹک جاؤ گے یا تم نے سچ بولا تو قید ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ تم اس کو لالچیں دو گے کہ اگر تم نے حرام مال نہ کھایا۔ تو ہمیشہ غریب رہو گے۔ اگر تم نے ترقی کرنی ہے تو حرام مال کھاؤ۔ وَالْاَوْلَادِ۔ اسی طرح جتھہ بنانے کیلئے اور پارٹی بازی کے لئے تم اُسے اکساؤ گے اور کہو گے کہ جب تک تم فریب نہ کرو گے کامیاب نہیں ہو سکو گے وَعِدْهُمْ اور پھر ہر قسم کی ترقیات کے وعدے دو گے کہ اگر تم جھوٹ اور فریب اور مکر اور دغا بازی سے کام لو گے تو خوب ترقی کرو گے۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو خارجی ہیں۔ اگر انسان کا دل ناپاک تھا تو پھر ان چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اللہ تعالیٰ فرما دیتا کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان گنہگار ہو گیا۔ مگر جتنی چیزیں قرآن کریم نے انسان کو بگاڑنے اور خرابی میں مبتلا کرنے والی بیان کی ہیں وہ ساری کی ساری ایسی ہیں جو خارجی ہیں یعنی (۱) گانا بجانا۔ (۲) دھمکیاں۔ مثلاً یہی کہ کہیں انبیاء کے ماننے والے ترقی نہ کر جائیں اس لئے اُن پر خوب ظلم کرو (۳) حرص اور لالچ۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی خرابی کے لئے تمہیں بیرونی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اندرونی طور پر وہ محفوظ ہے۔ مگر ورثہ کا گناہ اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ باہر سے نہیں آتا۔ جیسے کسی شخص کی والدہ کو سل کا مرض ہو اور وہ بچپن میں اپنی والدہ کا دودھ پیتا رہا ہو جس سے سل کا مادہ اس کے اندر داخل ہو گیا ہو تو ایسے شخص کو جب سل کا مرض ہو گا تو یہ اس کی اندرونی بیماری کہلائے گی لیکن ایک اور انسان ایسا ہوتا ہے جو کسی سل کی تیمارداری میں مشغول رہا اور اس کے کپڑوں اور سانس وغیرہ کے ذریعہ سے سل کے کیڑے اس کے اندر چلے گئے اور وہ بیمار ہو گیا۔ اب گو سل کا مرض اس کو بھی ہوا ہے مگر اس کی بیماری باہر سے آئی ہے اور اُس کی بیماری اندر سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح اور کئی بیماریاں ہیں جو ماں باپ سے ورثہ میں اولاد کو ملتی ہیں۔ مثلاً مرگی کا مرض ہے۔ عموماً جن بچوں کے ماں باپ کو مرگی ہوتی ہے انہیں بھی مرگی کے

دوسرے شعبہ ورثا ہو جاتے ہیں۔ یا جنون ہے یہ بھی ورثہ میں چلتا ہے۔ ہم نے بعض دفعہ تین تین پشتوں میں جنون کا مرض منتقل ہوتے دیکھا ہے۔ چونکہ انسان زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے اِس بارہ میں لمبا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ممکن ہے اگر کوئی سوسائٹی بن جائے اور وہ اس کی تحقیق کرے تو شاید سات سات آٹھ آٹھ پشتوں تک یہ مرض ظاہر ہوتی چلی جائے۔ آتشک کی ایک صورت تو یقیناً ایسی ہے جو سات سات پشتوں تک چلی جاتی ہے بلکہ یورپ کے تازہ لٹریچر میں میں نے پڑھا ہے کہ بعض دفعہ پندرہ پندرہ بیس بیس پشت تک بھی اس مرض کے نشان ملتے ہیں گو اُس کی شکل اس شکل سے بدل جاتی ہے جو ابتدائی حالت میں مرض کی ہوتی ہے لیکن بہرحال آئندہ نسل میں یہ مرض چلتی چلی جاتی ہے اب یہ مرض کہیں باہر سے نہیں آتی خود انسان کے اندر اس مرض کا مادہ ہوتا ہے۔ جب نفس پر ضعف اور کمزوری غالب آتی ہے تو کبھی ناک کی ہڈی بیٹھنی شروع ہو جائے گی اور کبھی کوئی اور علامت ظاہر ہو جائے گی جس سے معلوم ہوگا کہ آتشک کا مادہ اس کے اندر تھا لیکن اگر یہ مرض باہر سے آئے۔ مثلاً فرض کرو باپ کو آتشک نہیں تھی لیکن بچہ آگے آتشک والے مریض کو چھو گیا اور ایسی طرز پر چھوا کہ اُسے آتشک ہو گئی تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ مرض اسے باپ سے ملی ہے بلکہ ہم کہیں گے کہ یہ مرض باہر سے آئی ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم نے یہاں بگاڑ کے جتنے ذرائع بتائے ہیں۔ وہ سب کے سب خارجی ہیں یہ نہیں کہا کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان کو تم خراب کر لو گے بلکہ فرمایا کہ تم اُسے لالچیں دو گے۔ اس کے اندر ڈر اور خوف پیدا کرو گے۔ اُسے گانے بجانے کی طرف توجہ دلاؤ گے اور اِس طرح تم اُسے خراب کر دو گے گویا خرابی کے تمام اسباب خارجی ہوں گے اندرونی نہیں۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بیان فرمائی ہے جس میں صاف طور پر اُن معنوں کی طرف اِشارہ کیا گیا ہے جو میں نے مقطعات میں لک کے بیان کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ میرے ساتھ تعلق رکھنے والے بندے جو ہیں اُن پر تیرا قبضہ کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ اُن پر لالچ اور ڈر اور خوف وغیرہ کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا۔ اور تیرا رب اپنے بندے کا وکیل یعنی نگران ہونے کے لحاظ سے کافی ہے۔ جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے گا تو شیطان اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اپنا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہاں كَفٰى کا لفظ استعمال کر کے صاف طور پر اُن معنوں کی طرف اشارہ کر دیا جو میں نے بیان کئے تھے میں نے بتایا تھا کہ لک اس جگہ کافی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ظاہر کر دی اور كَفٰى کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ اس سورۃ میں خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا ذکر ہے۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر کارساز ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوتا ہے اور شیطان اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اگر ورثہ کے گناہ کی وجہ سے ہر انسان پیدائشی طور پر ناپاک ہوتا۔ جیسے عیسائی کہتے ہیں تو ایسے لوگ خواہ تقویٰ اختیار کرتے۔ خواہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ضرور تباہ ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوتا جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ گناہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔

فطرت اپنی ذات میں پاکیزہ ہے۔ آگے اس کی دلیل دیتا ہے اور فرماتا ہے۔ رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ تم گناہ کو ایک خطرناک طوفان سمجھتے ہو۔ ایک ایسی آفت خیال کرتے ہو جو تباہ کر دینے والی ہوتی ہے اور تم گناہ کو دیکھکر سمجھتے ہو کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس نے انسان کے اندر ڈیرہ ڈال لیا ہے اور اب یہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ مگر فرماتا ہے گناہ اپنی ذات میں کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ سارا وہم ہے۔ اس کی موٹی مثال سمندر ہے تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں۔ دُخانی کشتیاں تو اب بھی چلتی ہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں سودے لے جاتی ہیں۔ لیکن پہلے زمانہ میں بادبانی کشتیوں کا رواج تھا جو ہوا کے زور پر چلتی تھیں۔ فرماتا ہے کشتیوں کا انحصار ہی ہوا پر ہے لیکن کبھی ہوا طوفان بھی بن جاتی ہے۔ جب وہ حد سے بڑھ جاتی ہے تو طوفان کہلاتی ہے لیکن باوجود اس کے کہ کبھی کبھی ہوا طوفان بن جاتی ہے۔ جب دنیا میں ہواؤں سے کشتیاں چلا کرتی تھیں۔ اگر دنیا سے کہا جاتا کہ ہوائیں بند کی جائیں یا طوفان بند کئے جائیں تو ساری دنیا پکار اُٹھتی کہ طوفان کا کیا ہے یہ تو کبھی کبھی آتا ہے۔ اگر ہوائیں بند ہو گئیں تو ہماری تجارتیں ماری جائیں گی۔ اور ہماری روزی کا سارا سامان جاتا رہیگا۔ اگر طوفان کے نتیجہ میں ہزاروں کشتیوں میں سے کوئی ایک ڈوب بھی جاتی ہے تو کیا ہوا۔ یہ مثال بیان فرما کر اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ تم گناہ گناہ کرتے ہو حالانکہ وہ تو ایک اعتداء کا نام ہے جس طرح وہی ہوا جو جہازوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے بعض دفعہ طوفان بن جاتی ہے اسی طرح وہی قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے اس کے اندر رکھی گئی ہیں جب بگڑ جاتی ہیں تو انہی کا نام گناہ بن جاتا ہے۔ گویا گناہ ایک طوفان ہے جذبات کا یعنی طوفان ہوا کے حد سے بڑھنے کا نام ہوتا ہے اس کے پیچھے اس کی سب حرکت نیک ہوتی اور نیک نتائج پیدا کرتی ہے۔ مثلاً انسان کو خدا تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں جن سے وہ دن رات کام لیتا ہے۔ ایک بدمعاش سے بدمعاش انسان کے بھی سارے دن کے اعمال کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آنکھوں کا کتنا ناجائز استعمال کیا ہے تو پتہ لگیگا کہ دو سو دفعہ اُس نے اپنی آنکھوں کا جائز استعمال کیا ہے اور ایک دفعہ ناجائز استعمال کیا ہے۔ کہیں اس نے گھر کی صفائی کی ہوگی۔ کہیں اُس نے دوستوں سے ملاقات کی ہوگی۔ کہیں اس نے محنت اور مزدوری کی ہوگی اور یہ سارے کام اُس نے آنکھ سے کئے ہوں گے جو آنکھوں کا جائز استعمال ہے۔ لیکن ایک دفعہ اس نے کسی غیر عورت کو بھی دیکھ لیا ہوگا۔ اگر اس کی آنکھ ماری جاتی تو بیشک ناجائز فعل اُس سے نہ ہوتا۔ مگر جائز فعل بھی وہ نہ کر سکتا پس فرماتا ہے۔ گناہ کی تعریف جو تم نے سمجھی ہے وہ غلط ہے۔ تم گناہ کو اپنی ذات میں بُری چیز سمجھتے ہو حالانکہ وہ قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں اُنہی میں افراط اور تفریط کا نام گناہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسراف صدقہ کی زیادتی کا نام ہے اور بخل مال کی حفاظت میں شدت پکڑنے کا نام ہے۔ اور صدقہ اور حفاظتِ مال کے بغیر دنیا چل ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح زنا رجولیت کے بے موقعہ استعمال کا نام ہے اور رہبانیت اس کے عدم استعمال کا نام ہے اگر رجولیت کا استعمال نہ ہو تو دنیا کیونکر چلے اور اگر

اس پر ضبط نہ رکھا جائے تو انسان کی صحت کس طرح قائم رہے۔

غرض اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہ کا فلسفہ بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ انسان کی پیدائش نیک ہے۔ بدی باہر سے آتی ہے اور یہ دعویٰ کہ انسان کی اکثریت گناہ میں مبتلا ہوگی ایک شیطانی خیال ہے۔

(۲) دوسری آیت جو اس مضمون کو واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۵ (التین)

فرماتا ہے ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوتیں دیکر پیدا کیا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ مگر اس کے بعد ہم اس کو بعض دفعہ نیچے ہی نیچے لے جاتے ہیں۔ یہاں ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ پہلے آدمؑ آیا اور اس نے ترقی کی مگر اس کے گناہ کی وجہ سے نسلِ انسانی گرگئی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں سارے انسان نہیں جاتے بلکہ وہ حصہ جو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ والا تھا وہ تو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ پر قائم رہا۔ صرف دوسرا حصہ جس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تھا وہ سزا میں مبتلا ہوا اور نبیوں کی جماعت سے الگ ہو گیا۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ نبیوں کی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں اور ان کی نیکی بھی کسبی ہے اور گناہ بھی کسبی ہے۔ نہ نیکی ورثہ کی ہے نہ گناہ ورثہ کا ہے۔ اور عیسائیوں سے ہماری بحث ہی یہی ہے کہ تم بتاؤ آیا نبیوں کی جماعتیں بھی کفارہ پر ایمان لائے بغیر بچ سکتی ہیں یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ مومن اور عملِ صالح کرنے والوں یعنی نبی کی تعلیم کے مطابق عمل کرنیوالے لوگوں کے لئے ایک غیر مقطوع اجر ہوگا۔ پس یہ خیال کہ گناہ انسان کی پیدائش میں رکھا گیا ہے بالکل غلط ہے۔

یہاں عیسائی اعتراض کرسکتے ہیں کہ ہمارا تو یہی دعویٰ ہے۔ کہ انسان کی فطرت میں چونکہ بدی ہے وہ نیک عمل کر ہی نہیں سکتا اور اسی لئے ہم شریعت کو لعنت قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم مندرجہ ذیل آیت میں دیتا ہے۔ فرماتا ہے:-

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۵ (الشمس)

ہم شہادت کے طور پر نفسِ انسانی کو اور اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ قوتوں کے ساتھ پیدا کرنے کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ سَوّٰی کے معنے ہوتے ہیں جس میں کوئی کجی نہ ہو اور تسویہ کے معنے ہوتے ہیں برابر کر دینا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا میں ما مصدریہ ہے۔ اور اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں نفس کو اور اس کے بغیر افراط و تفریط کے اعلیٰ درجہ کی قوتوں کے ساتھ پیدا کئے جانے کو۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ جب ہم نے اُسے پیدا کر دیا تو اس کے بعد ہم نے اس نفس کو الہام کیا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کہ فجور کیا ہے یعنی کن باتوں سے تو راستہ سے اِدھر اُدھر ہو سکتا ہے وَتَقْوٰىهَا اور کون سے ایسے راستے ہیں جن پر چل کر تُو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اس آیت سے ایک تو یہ پتہ لگا کہ اللہ تعالیٰ یہ دعویٰ

کرتا ہے کہ انسانی نفس میں تسویہ پایا جاتا ہے کجی نہیں پائی جاتی نیکی پائی جاتی ہے بدی نہیں پائی جاتی۔

دوسرے نہ صرف اپنی ذات میں اس میں درستی پائی جاتی ہے بلکہ اُس میں نیکی اور بدی کا ایک احساس بھی پایا جاتا ہے یعنی ہم نے اس کے اندر ایک کانشنس رکھی ہے جو پہچانتی ہے کہ کونسا اچھا راستہ ہے اور کونسا بُرا۔ مثلاً ایک سوٹی جسے چھیل کر صاف کر لیا گیا ہو اُسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میں صاف ہوں۔ لیکن انسان کو پتہ ہوتا ہے کہ میرے اندر فلاں خوبی پائی جاتی ہے۔ یا مثلاً یوں سمجھ لو کہ ایک انسان جس کی جیب میں روپیہ ہو ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ آدمی بے پیسہ کے نہیں لیکن اگر اس کو پتہ نہیں کہ میری جیب میں روپیہ پڑا ہوا ہے تو وہ اس کو استعمال نہیں کر سکے گا۔

یہاں بھی دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم نے انسان کو ہر قسم کی کجی سے پاک بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ صرف پاک ہی نہیں بنایا۔ بلکہ اُسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تیرے اندر یہ یہ باتیں خرابی کی ہوں گی۔ اور یہ یہ باتیں نیکی کی ہوں گی۔ گویا وہ صرف پاک ہی نہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ میرے اندر جو قوتیں پائی جاتی ہیں میں نے اُن کو اِس اِس طرح استعمال کرنا ہے۔ اور اس کے اندر ایک کانشنس ہے جو پہچانتی ہے کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرا یہ فعل بدی ہوگا اور اگر اس طرح کیا تو میرا فعل نیکی ہوگا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا کی آیت میں مضمون کو اور بھی واضح کر دیا۔ کہ وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اس کو پاک رکھا یعنی اس کے اندر خدا تعالیٰ نے خرابیاں پیدا نہیں کیں۔ پس جو شخص اس کے تزکیہ کو قائم رکھتا ہے اور اسے خراب نہیں ہونے دیتا وہ بڑا کامیاب انسان ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ اور جو اس کی پاکیزگی کو مسل ڈالتا اور اُس کی نیکی کو اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا ہے وہ سخت ناکام اور نامراد ہوگا۔

(۲) پھر فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى وَالَّذِيْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (سورۃ الاعلیٰ)

یعنی اے انسان تو اپنے اعلیٰ رب کی تسبیح کر۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تیرا رب اعلیٰ ہے۔ اس کے جواب میں فرماتا ہے اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى اس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے ہر قسم کے عیب سے پاک بنایا وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى پھر اس نے انسان کی طاقتوں کا ایک معیار مقرر کیا کہ اس حد تک انسان ترقی کر سکتا ہے فَهَدٰى اور پھر بتایا کہ اس اس مقام تک پہنچنے کی یہ یہ ترکیب ہے۔ یعنی اگر ادنیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ تدبیر ہے۔ اعلیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ کام کرو۔ شہید اور صدیق بننا چاہتے ہو تو اِس اِس طرح کرو۔ گویا قَدَّرَ فَهَدٰى میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے مختلف روحانی گریڈ مقرر کر کے ساتھ ہی طریقے بھی بتا دیئے کہ اس اس طرح عمل کرو گے تو ان گریڈوں کو حاصل کر لو گے۔

درحقیقت اَلَّذِيْ خَلَقَ کے معنے اَلَّذِيْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ کے ہیں۔ کیونکہ آگے ساری باتیں وہ بیان کی گئی ہیں جو انسان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ واضح بات ہے کہ ہدایت درختوں کے لئے

نہیں ہوتی۔ جانوروں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کے لئے ہوتی ہے۔ پس فرماتا ہے تم اپنے اندازہ سے یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ خدا تعالےٰ کا قانون انسان کے متعلق کیا ہے اور دوسری مخلوق کے متعلق کیا ہے۔ تم کھیتیوں اور سبزیوں ترکاریوں کو دیکھو وَالَّذِيٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى۔ تمہیں دکھائی دے گا کہ ایک وقت کے بعد وہ بالکل بے کار اور سیاہ ہو جاتی ہیں اور اُن کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں انسان آتا ہے تو انسانوں کی اچھی چیزیں یعنی اُن کا مغز اور روحانیت قائم رہتی ہے۔ پچھلے سال کے پھل سے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن آدمؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے نوحؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے۔ ابراہیمؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے۔ موسیٰؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے معلوم ہوا کہ اس جگہ اور قانون ہے اور اس جگہ اور قانون ہے۔ اگر یہ گندی چیز ہوتی تو اس کے قائم رکھنے کے معنے کیا تھے اور ضرورت کیا تھی کہ اُسے ہزاروں سال تک زندہ رکھا جاتا؟ پھر فرماتا ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى۔ آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی تعلیم کے متعلق تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا پتا انہوں نے یہی تعلیم دی تھی یا کچھ اور دی تھی اب ہم تجھے بتاتے ہیں کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى۔ ہم تجھکو ایک سبق پڑھائینگے جو تو کبھی نہیں بھولے گا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ سوائے اِسکے کہ کسی حکم کے متعلق خدا تعالیٰ خود کہدے کہ یہ عارضی ہے اور اُسے بعد میں منسوخ کردے جیسے پہلے بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھی جاتی تھی لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا اس قسم کے عارضی احکام کے سوا ہم تجھ کو ایک ایسی تعلیم دینے والے ہیں فَلَا تَنْسٰٓى جسے تُو بھولے گا نہیں۔ اس جگہ مخاطب صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ تمام انسان مخاطب ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ یہ بتاتا ہے کہ انسان جتنا بھی زور لگا لے اس تعلیم کو تُو بُھلا نہیں سکتا۔ یعنی ہم اسے قائم رکھیں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں انسان کے مخفی سے مخفی خیالات کا بھی ذکر ہے اور اُن بیرونی حوادث کا بھی ذکر ہے جو اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى اور ہم اس تعلیم کے پھیلانے میں تمہارے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور یہ تعلیم پھیلتی چلی جائیگی اگر شریعت لعنت ہے تو ہم ایک تعلیم بھیجنے والے ہیں ہم دیکھیں گے کہ اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى۔ یہ جو ہم نے دلیلیں دی ہیں اِن سے پتہ لگتا ہے کہ انسانی قلوب کی اصلاح شریعت اور اس سے متعلقہ چیزوں سے ہو جاتی ہے پس انہی طریقوں کو تم بھی استعمال کرو۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى۔ جب تم اس تعلیم کو پیش کرو گے تو جو لوگ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھنے والے ہوں گے وہ اس سے ضرور فائدہ اُٹھالیں گے۔ اس میں بھی اشارہ کیا ہے کہ نیکی ورثہ کی چیز ہے نہ کہ بدی۔ کیونکہ خشیت دل میں پیدا ہوتی ہے وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى اور اس سے وہ شخص بچنے کی کوشش کرے گا جو اپنے آپکو مصیبت میں ڈال چکا ہو۔ آیت کا یہ دوسرا حصہ بھی بتاتا ہے کہ شقاوت خود انسان کی پیدا کردہ ہوتی ہے ورنہ ہر انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پاک ہے۔

(۵) پھر فرماتا ہے اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (سورۃ البلد) کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اُسے آنکھیں دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان گنہگار ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان نے گناہ کو ورثہ میں لیا ہے۔ کیا ہم نے اُسے آنکھیں نہیں دیں۔ کیا ہم نے اُسے زبان نہیں دی۔ کیا ہم نے اُسے ہونٹ نہیں دئے اگر انسان فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تھا اور اس کی نجات کفارہ پر ہی منحصر تھی تو ہم نے اُسے آنکھیں کیوں دی تھیں اور وہ

دنیا میں ہے اور اگر اس کا دل گندا تھا اور وہ کسی واقف انسان سے تبادلہ خیالات کر کے اپنے گند کو دور نہیں کر سکتا تھا تو ہم نے اُسے زبان کیوں دی تھی اور اس کے ہونٹ کیوں بنائے تھے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ - پھر ہر انسان کے اندر خدا تعالےٰ نے ایک کانشنس رکھی ہے جو نیکی اور بدی کا موازنہ کرتی ہے اگر یہ نیکی اور بدی کا موازنہ کر ہی نہیں سکتا تو اس کانشنس کی کیا ضرورت تھی - کفارہ تو ایسا ہی ہے جیسے گڑھے میں پتھر ڈال کر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس طرح اُس کا پیٹ بھر جائے گا جیسے وہ ہوتی ہے جس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہو - جب اس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہی نہیں اور انسان دیکھتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تو اُسے سوچنا چاہیئے کہ پھر اس کی ضرورت کیا ہے - اگر کفارہ پر ہی بنی نوع انسان کی نجات کا انحصار تھی تو کیا ضرورت تھی آنکھ کی - کیا ضرورت تھی زبان کی - کیا ضرورت تھی ہونٹوں کی - اس کے بعد فرماتا ہے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ - پھر ہم نے اس کو دونوں راستے بتلا دئے -

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض دفعہ چھوٹے سے چھوٹے لفظ میں بڑی بھاری بات بیان کر دیتا ہے - قرآن کریم میں رستہ کا ذکر کئی دوسرے مقامات پر بھی آتا ہے مگر کسی جگہ اس کے لئے سبیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کسی جگہ طریق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہاں اللہ تعالےٰ نے نجد کا لفظ استعمال کیا ہے - سبیل اور طریق کے الفاظ چھوڑ دئے ہیں - اس اختلاف سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں مضمون کے ساتھ نجد کا ہی تعلق ہے سبیل اور طریق کا تعلق نہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ لغت میں نجد کے معنے اونچے راستے کے ہیں - جو چڑھائی والا ہو - قرآن کریم نے دوسری جگہ یہ مضمون بیان کیا ہے کہ چڑھائی والے راستہ پر جب انسان چلتا ہے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے - سانس پھولتا ہے اور اس کے پاؤں وغیرہ میں کھلیاں پڑ جاتی ہیں - اسی حالت کی طرف اللہ تعالےٰ نے یہاں اشارہ کیا ہے - یہ تو سیدھی بات ہے کہ جیسے فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ میں تشریح کر دی گئی ہے - اس سے دنیوی رستہ مراد نہیں - کیونکہ آگے یہ مضمون آتا ہے کہ اس نے صدقہ نہیں دیا - خیرات نہیں دی - یتامیٰ اور مساکین کا خیال نہیں رکھا پس صاف پتہ لگتا ہے کہ اس جگہ ظاہری رستہ مراد نہیں - بلکہ دو راستوں سے مراد نیکی اور بدی کا راستہ ہے - قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کے اندر ورثہ سے آ جائے اُس کے لئے اُسے محنت نہیں کرنی پڑتی - مثلاً آنکھیں ہیں یہ ہمیں ورثہ میں ملی ہیں ان میں ہمارا کوئی دخل نہیں - اس لئے آنکھوں سے دیکھنے کے لئے ہمیں نہ کسی مشق کی ضرورت ہوتی ہے نہ محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے - آپ ہی آپ ہم دیکھنے لگ جاتے ہیں اسی طرح زبان ہمیں ورثہ میں ملی ہے اور ہم آپ ہی آپ بولنے لگ جاتے ہیں یا ہاتھ اور پاؤں ہیں یہ بھی آپ ہی آپ چلنے لگ جاتے ہیں - کیونکہ یہ ہمیں ورثہ کے طور پر ملے ہیں - اگر گناہ بھی ورثہ میں ملا ہوتا - تو اس کے لئے کسی مشق کی ضرورت نہیں تھی اور گناہ کا راستہ چڑھائی والا راستہ نہیں ہونا چاہیئے تھا - جیسے ہاتھ اور پاؤں ہمیں ورثہ میں ملے ہیں - ہم نے اپنے ماں باپ سے لئے - انہوں نے اپنے ماں باپ سے لئے - نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے ہلانے جلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی - اسی طرح گناہ بھی اگر ورثہ میں ملا ہے تو اس کے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیئے تھی - کیونکہ وہ طاقتیں جو ورثہ کے ساتھ آتی ہیں اُن کے استعمال میں انسان کو

محنت نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن فرماتا ہے ہم نے نجدین بنائے ہیں یعنی اگر تم نیکی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر تم بدی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی۔ پس نہ نیکی ورثہ میں ملی ہے نہ بدی ورثہ میں ملی ہے۔ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کیلئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ گویا ہر چیز SELF ACQUIRED ہے۔ بدی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑیگی۔ نیکی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑے گی۔ اگر گناہ ورثہ میں ملا ہوتا تو پہلے جھوٹ اور پہلی چوری کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑتی۔ مگر جب کوئی پہلا جھوٹ بولتا ہے تو اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب کوئی پہلی چوری کرتا ہے وہ آپ ہی بھاگا پھرتا ہے۔ اور بعض دفعہ تو ایسی حرکات کرتا ہے کہ لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اُس نے چوری کی ہے۔ ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ ایک برہمن سے گائے ماری گئی۔ اس زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر برہمن گائے مارے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ وہ گائے کو اپنے مکان میں ہی بند کر کے بھاگا۔ راستہ میں جب بھی وہ دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتا دیکھتا۔ فوراً ان کے پاس پہنچتا اور کہتا کہ آپ گائے گائے کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہم تو گائے کا کوئی ذکر نہیں کر رہے۔ وہ کہتا نہیں نہیں تم مجھ سے چھپاتے ہو۔ ضرور تم گائے کا ذکر کر رہے ہو پھر آگے چلتا اور جب پھر دو تین آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتا تو اُن کے پاس پہنچتا اور کہتا یہ آپ "بچھڑا، بچھڑا" کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہم تو کوئی ذکر نہیں کر رہے۔ وہ کہتا نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی بازار ختم نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کو شبہ پڑ گیا اور انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ گھر گئے تو مری ہوئی گائے نکل آئی۔ تو جب انسان کسی قسم کا بھی گناہ کرتا ہے پہلی مرتبہ اُس کا نفس اُسے ملامت کرتا ہے اور وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ چور چوری کرنیکے بعد گھبرایا پھرتا ہے۔ ڈاکو ڈاکہ مارنے کے بعد گھبرایا پھرتا ہے۔ اگر گناہ ورثہ میں آیا ہوتا تو گناہ کا راستہ نجد کیوں ہوتا اور اس کے لئے چڑھائی کیوں چڑھنی پڑتی۔

(۶) پھر فرماتا ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ع۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی طاقت کے مطابق قوتیں دی ہیں اور پھر یہ بتایا ہے کہ وہ اِس اِس طرح ترقی کر سکتی ہے۔ اس جگہ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ میں انسان کی خلق بھی شامل ہے اور بائبل خود مانتی ہے کہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اُس کا خدا سے تعلق ہو۔ اور وہی انسان مبارک ہے جو اُس کے احکام کو سُنتا اور اُن پر عمل کرتا ہے (امثال باب ۸ آیت ۳۴)

(۷) اسی طرح فرماتا ہے وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (سجدہ ع۲)

اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اس کی ہدایت دیدیتے

اس جگہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون پہلی آیتوں کے مضمون کے خلاف ہے لیکن حقیقتاً خلاف نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا وَلَوْ شِئْنَا لَهَدَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ۔ اگر یہ الفاظ ہوتے تب بھی اس کا مضمون پہلے مضامین کے خلاف نہ ہوتا لیکن یہاں هُدٰىهَا کے الفاظ ہیں یعنی ہر نفس جو ہم نے

پیدا کیا ہے اُس کے اندر اُس کی ہدایت کا بھی سامان رکھا ہے بعض لوگ اس ہدایت کو نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو مجبور کر کے انہیں ہدایت واپس دے دیتے۔ مگر جبر سے چونکہ پیدائش انسانی غرض باطل ہو جاتی تھی اس لئے ہم نے جبر نہیں کیا۔ یہ بھی اسی بات کی دلیل ہے کہ انسان کا نفس بالعبد پیدا کیا گیا ہے اور ہر انسان ہدایت کے ساتھ بھیجا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اپنی حماقت اور بیوقوفی سے اپنے اندر سے ہدایت نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو ہم اُن کے نفس کی اندرونی ہدایت انہیں پھر واپس دے دیتے یعنی اُنکو ہدایت رد کرنے کی توفیق نہ ملتی۔ مگر جو لوگ اپنے دل کی ہدایت کو چھوڑ گئے ہمارا فیصلہ اُن کے بارہ میں یہی ہے کہ اُن کو ہم اُن کے عمل کی سزا دیتے ہیں ورنہ ہمارا دل یہی چاہتا تھا کہ اُن کو بھی ہدایت دیتے چنانچہ اسی مضمون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ یعنی ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے دوزخ میں چلا جاتا ہے۔ ورنہ ہماری طرف سے تو اُس کی ہدایت کے سامان موجود تھے۔

(۸) اسی طرح فرماتا ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (شعراء ع۵) ہم نے متقیوں کے لئے جنت کو قریب کر دیا ہے یعنی ایک طرف اُن کی فطرت انہیں جنت کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مدد اُن کو جنت کی طرف لے جاتی ہے اس طرح اندرونی اور بیرونی ہدائتیں اُن کو جنت کی طرف راغب کرتی ہیں۔

(۹) اسی طرح فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات ع۳) میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بنیں۔ یعنی تمام بنی نوع انسان کے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ عبد بنیں اور عبد کے متعلق دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ تشریح آتی ہے کہ يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر ع۱) یعنی اے نفسِ مطمئنہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے پر راضی ہو گیا تو اپنے رب کیطرف ایسی حالت میں لوٹ آ کہ تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔" تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے" کے معنے یہ ہیں کہ وہ پاک ہے اور اُس کا دل اس قدر صفائی اختیار کر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن گیا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ اس کے بعد فرماتا ہے جب یہ مقام کسی انسان کو میسر آ جائے کہ وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہو جائے اور خدا تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا عبد بن جاتا ہے گویا وہ جو فرمایا تھا کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ میں نے جن اور انس کو صرف اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس مقصدِ پیدائش کو وہ پا لیتا ہے۔ اور جو شخص اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لے لازماً وہ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ کا مستحق ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کی غرض یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبد بن جائیں اور جو غرض پیدائش انسانی کی اللہ تعالیٰ نے قرار دے اُسے کون باطل کر سکتا ہے۔ پھر نہ صرف

اُس نے پیدائش انسانی کی یہ غرض قرار دی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ انسانوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کو وہ خوشخبری دیتا ہے اور کہتا ہے کہ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔

یہاں ایک اور لطیف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ نفس مطمئنہ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً جن سے خدا راضی ہو گیا اور جو اپنے خدا سے راضی ہو گئے۔ اِدھر خدا تعالیٰ صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبہ ع۱۲) اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔ اب اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي پر غور کرو۔ تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ يَا أَيَّتُهَا الْجَمَاعَةُ الصَّحَابَةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ گویا قرآن کریم کی ان آیتوں نے شہادت دے دی کہ صحابہ کرامؓ اُس مقام تک پہنچ چکے تھے جس پر پہنچکر انسان خدا تعالیٰ کے عباد میں داخل ہو جاتا اور اس کی جنت کا وارث ہو کر اپنے مقصدِ حیات کو پا لیتا ہے۔

(۱۰) ایک اور آیت جو اس مضمون کو واضح کرتی ہے وہ قرآن کریم میں اسی واقعہ کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گذرا۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کے متعلق فرماتا ہے لَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ ع۷) یعنی حضرت آدمؑ سے جو غلطی ہوئی تھی وہ اجتہادی تھی۔ اُس میں اُن کے عزم کا کوئی دخل نہیں تھا۔ غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک اجتہادی غلطیاں اور ایک عزم کے ساتھ تعلق رکھنے والی غلطیاں۔ آگے اجتہادی غلطیوں کی کئی قسمیں ہیں اور عزم والی غلطیوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ غلطی اجتہادی قسم کی تھی عزم والی غلطیوں میں سے نہیں تھی۔ ارادہ آدم نہیں تھا کہ غلطی کرے مگر ہو گئی۔ اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک گناہ کا ظاہری حصہ ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی حصہ ہوتا ہے۔ جو چیز انسان کو نجات سے محروم کرتی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ گناہ کی ظاہری سزا بعض لوگوں کو مل جاتی ہے۔ مگر نجات سے محروم کرنے والا صرف باطنی حصہ ہوتا ہے ظاہری نہیں۔ مثلاً چوری ہے۔ چوری کہتے ہیں کسی کا مال اُٹھا کر لے جانے کو۔ اب بیسیوں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلطی سے دوسرے کی چیز اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کے پیروں میں حس کم ہوتی ہے اور وہ دوسرے کی جوتی پہن کر چلے جاتے ہیں۔ فرض کرو ایسا شخص پکڑا جائے۔ اس کا مقدمہ عدالت میں جائے اور وہ قید ہو جائے۔ تو گناہ کی ایک ظاہری سزا تو اُسے مل جائے گی۔ مگر اس کا دل سیاہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے جوتی ارادۃً نہیں اُٹھائی تھی۔

حیدرآباد کے جو نظام تھے اُن کے ایک پھوپھی زاد بھائی کا بیٹا مجھے ملنے کے لئے قادیان آیا۔ اُس نے کسی مقصد کے لئے مجھ سے دعا کروانی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ایسے لوگ روز روز کہاں قابو آتے ہیں انہیں اچھی طرح نصیحت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ شام کا کھانا میں نے ان کو اپنے ساتھ ہی کھلایا اور پھر میں نے انہیں نصیحتیں کرنی شروع کر دیں اور گیارہ بارہ بجے تک انہیں سمجھاتا رہا۔ میں نے کہا بتاؤ تم نماز پڑھتے ہو۔ وہ کہنے لگا۔ گھر پر تو کبھی پڑھ ہی لیتے ہیں مگر سفر میں صفائی وغیرہ

کا چونکہ پورا اہتمام نہیں رہتا اس لئے نماز نہیں پڑھی
جاتی۔ میں نے کہا۔ تم لاکھوں روپے کے مالک ہو اور
اب بھی تم آتے ہو تو پانچ سات نوکر تمہارے ساتھ ہیں
اگر تمہارا یہ حال ہے تو غرباء کا کیا حال ہوتا ہوگا حالانکہ
غرباء پر نماز زیادہ فرض نہیں۔ جیسے تم پر فرض ہے
ویسے ہی اُن پر فرض ہے۔ مگر تمہیں اُن کے مقابلہ میں
بیسیوں سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ تم نے گاڑی کے
کمرے ریزرو کرائے ہوتے ہیں اور تم مزے سے اُن
میں لیٹے ہوتے آتے ہو۔ تم خدا تعالیٰ کو کیا جواب
دوگے اور نمازیں نہ پڑھنے کا کیا عذر پیش کروگے
سب غریب تو کہہ دیں گے کہ اللہ میاں ہمیں غصہ آگیا کہ
میرے خدا نے مجھے نہیں پوچھا تو میں اس کی عبادت
کیوں کروں۔ اُس کا یہ جواب چاہے پاگلانہ ہو۔ مگر
بہرحال کچھ نہ کچھ جواب تو ہے لیکن تمہارے پاس کیا
جواب ہوگا؟ میں نے دیکھا جس طرح کسی پر پورا اثر ہوجاتا
ہے ویسی ہی کیفیت اس کی ہوگئی۔ اُس کی رونے والی
حالت ہوگئی اور اُس نے کہا کہ اب میں باقاعدہ نماز
پڑھا کروں گا۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب ہم فارغ ہوئے
اور وہ اپنی قیامگاہ پر چلے گئے۔ گھر پہنچے تو انہوں نے
اپنے نوکروں سے کہا۔ کہ صبح نماز کے لئے مجھے ضرور جگادینا
آج میں سخت شرمندہ ہوا ہوں۔ اگر کل انہوں نے پھر
مجھ سے پوچھ لیا کہ نماز پڑھی تھی یا نہیں تو میں کیا جواب
دوں گا۔ نوکروں نے کہا کہ آپ بارہ بجے سونے لگے ہیں
نو بجے سوکر بھی آپ صبح نہیں اُٹھتے اور اب تو بہت رات
گذر چکی ہے آپ صبح اُٹھیں گے کس طرح؟ انہوں نے
کہا کچھ ہو مجھے ضرور جگا دینا۔ اگر تم نے مجھے نہ جگایا
تو میں تمہیں سزا دوں گا۔ چنانچہ صبح ہوئی تو نوکروں نے
جگادیا۔ اب وہ بیچارہ نماز پڑھنے کا عادی تو نہیں تھا۔
نوکروں کے جگانے پر اُٹھ تو بیٹھا مگر اسی طرح سوئے سوئے
مسجد کی طرف چل پڑا راستہ میں کہیں ٹھوکر لگتی۔ تو
نوکر دوڑ کر اُسے پکڑ لیتے۔ آخر اسی طرح مسجد پہنچے اور
پھر سوئے سوئے ہی انہوں نے نماز پڑھی۔ جب نماز سے
فارغ ہوئے تو نیند کے غلبہ میں آتے وقت اپنا بوٹ تو
وہیں چھوڑ گئے اور کسی کی پھٹی پُرانی جوتی پہن کر چل پڑے
نصف راہ تک پہنچے تو کسی نوکر کی نظر پڑ گئی اور اُس
نے کہا۔ نواب صاحب یہ کیا؟ آپ تو کسی کی جوتی پہنکر
آگئے ہیں۔ اس پر نواب صاحب کی بھی آنکھ کھلی اور وہ
اپنے پاؤں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ بھئی جلدی جاؤ
اور یہ جوتی بدل لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص یہ کہے کہ
میں اس کی جوتی چُرا لایا ہوں۔ اس واقعہ کی وجہ سے صبح
مجھے معلوم ہُوا کہ انہوں نے میری نصیحت پر عمل
کرتے ہوئے آج مسجد میں جاکر نماز پڑھی تھی۔ مگر نیند
کے غلبہ کی وجہ سے وہ اپنا نرم اور نازک اور ملائم بوٹ
تو وہیں چھوڑ آتے اور کسی کی پھٹی پُرانی جوتی پہنکر
آگئے۔ اب دیکھو کسی نواب کے مُنہ پر تو یہ نہیں لکھا ہوتا
کہ یہ نواب ہے۔ فرض کرو جوتی کا مالک وہاں پہنچ جاتا۔
اور اُن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتا کہ چل تجھے پولیس
کے حوالے کروں تو تو چور ہے۔ تو بظاہر انہیں سزا
مل جاتی مگر یہ غلطی انہیں نجات سے محروم کرنیوالی نہیں
تھی کیونکہ اس میں اُن کے عزم کا دخل نہیں تھا۔ اسی
طرح آتشک اور سوزاک یہ دو مرضیں بظاہر گناہ کا پھل
سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ گناہ اس کا نہ ہو
بلکہ اس کے باپ یا دادا کا ہو۔ فرض کرو ایک شخص کسی
بیوہ سے شادی کرتا ہے اسکے پہلے خاوند کو آتشک
کا مرض تھا جس سے اُسے بھی آتشک ہوگئی۔ اب
جب یہ اپنی بیوی کے پاس جائے گا اسے بھی آتشک
ہوجائے گی اور یہ بھی اس سزا میں مبتلا ہوجائے گا۔
اب بظاہر یہ ہے تو زنا کی سزا مگر اس کی وجہ سے

وہ جہنم میں نہیں جائے گا اور نہ اس کا دل سیاہ ہوگا بلکہ شاید اس کا دل اس کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ صاف ہو جائے۔ تو اصل چیز جو دل کو سیاہ کرنیوالی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہوتا ہے اُس کے ظاہری حصہ کی وجہ سے اگر کوئی نقصان پہنچ بھی جائے تو وہ عارضی ہوتا ہے مستقل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ آدمؑ کے متعلق فرماتا ہے کہ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آدمؑ کے اندر ہم نے عزم نہیں پایا۔ یعنی اُس سے جو غلطی ہوئی وہ اجتہاداً ہوئی۔ جیسے بائبل کے حوالجات سے ثابت ہے کہ شیطان نے کہا یہ بڑا نیک کام ہے اس کے نتیجہ میں تمہیں نیک اور بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہو جائے گی اور آدم نے سمجھا کہ یہ بات درست ہے اور وہ غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ پس اُن کی غلطی اجتہادی غلطی تھی عزم والی غلطی نہیں تھی۔

(۱۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر ع) یعنی سچی توبہ سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کہتی ہے کہ گناہ معاف نہیں ہوتے مگر ہم یہاں یہ بحث نہیں کر رہے کہ انجیل کا بیان درست ہے یا قرآن کریم کا بیان درست ہے۔ ہم صرف یہ بحث کر رہے ہیں کہ اس بارہ میں قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جب معاف ہو جاتے ہیں تو لازماً سزا بھی معاف ہو جاتی ہے۔

(۱۲) اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ع) جو شخص خدا تعالیٰ کے مقام کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے اُسے دو۲ جنتیں ملتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں اور ایک اگلے جہان میں۔ اب یہ واضح بات ہے کہ یہاں جنت ملنے سے مراد دنیوی اموال نہیں ہو سکتے۔ اگر دنیوی اموال مراد لئے جائیں تو خدا تعالیٰ کے کئی نیک بندے ایسے گذرے ہیں جن کے دنیوی حالات کفار سے بہت ہی ادنیٰ تھے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہی لے لو۔ آج یورپ کا مزدور آپ سے زیادہ اچھا کھانا کھاتا اور زیادہ اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ پس اگر اس جگہ جنت سے دنیوی نعماء مراد لی جائیں تو یقیناً یورپ کا مزدور جنت میں ہے اور بڑے بڑے صلحاء اور اولیاء نعوذ باللہ جنت میں نہیں تھے۔ پس اس جگہ جنت سے مراد روحانی امن ہی ہو سکتا ہے اور جنت ملنے سے مراد خدا تعالیٰ کے قرب کا حصول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ جو شخص خدا تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اس جہان میں بھی خدا تعالیٰ کا مقرب ہے اور اگلے جہان میں بھی خدا تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے گا۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ہر انسان میں خدا تعالیٰ کا مقرب بننے کی قابلیت موجود ہے۔ اگر گناہ انسان کو ورثہ میں ملا ہُوا ہوتا تو اس کا قرب اُسے کہاں حاصل ہو سکتا تھا۔

(۱۳) اسی طرح فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل ع) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ اب اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے۔ کہ جو شخص اس دنیا میں جسمانی لحاظ سے اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک شخص اس جہان میں بھی اندھا ہو اور اُسے اگلے جہان میں بھی اندھا رکھا جائے۔ اس کے معنے بھی درحقیقت خدا تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھنے والے کے ہیں اور اندھے سے مراد وہ ہے۔

..س نے خدا تعالےٰ کو نہیں دیکھا۔ پس مَنْ كَانَ فِی هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی سے دو معنے نکلتے ہیں۔ ایک منفی صورت میں اور ایک مثبت ..رت میں۔ ایک وہ ہیں جو اعمٰی ہیں اور ایک وہ ہیں جو اعمٰی نہیں۔ کیونکہ فرماتا ہے جو اس دنیا میں اعمٰی ہو گا وہ اگلے جہان میں بھی اعمٰی رہے گا۔ اس کے معنے ..یں کہ کچھ لوگ اعمٰی ہوں گے اور کچھ اعمٰی نہیں ہونگے ..س یہ آیت بھی بتا رہی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بعض کا دل پاک بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اس جگہ ..ی مضمون بیان فرمایا ہے کہ اس دنیا میں جس شخص کا قلب خراب ہو گیا (معلوم ہوا کہ ساری دنیا کا قلب خراب نہیں) وہ اگلے جہان میں بھی خدا تعالےٰ کو دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھیگا۔

(۱۴) اسی طرح حدیث میں آتا ہے كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ ..يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (بخاری کتاب الجنائز ..ب ما قیل فی اولاد المشرکین) ہر بچہ فطرتِ صحیحہ ..ر پیدا ہوتا ہے اور نیکی کی روح اپنے اندر رکھتا ہے۔ ..ر اس کے ماں باپ اسے سکھا کر کبھی یہودی بنا دیتے ..یں۔ کبھی نصرانی بنا دیتے ہیں اور کبھی مجوسی بنا دیتے ..ں۔ اس سے بھی پتہ لگا کہ انسان جو پیدا ہوتا ہے ..طرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور بدی پیدائش کے بعد اردگرد کے اثرات کے نتیجہ میں آتی ہے۔

(۱۵) اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ..ہ انسان کا دل خدا تعالےٰ نے صاف بنایا ہے پھر وہ ..نیا میں آکر یا نیکی کرتا ہے یا بدی کرتا ہے جب وہ ..وئی نیکی کرتا ہے۔ تو ایک سفید نقطہ اُس کے دل پر ..گ جاتا ہے۔ اور جب کوئی بدی کرتا ہے تو ایک سیاہ ..قطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ نیکیاں یا بدیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سفید یا سیاہ نقطوں کی تعداد بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہانتک کہ ایک دن اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے یا اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ تو وہ بدی سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اگر اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے تو وہ نیکی سے محروم ہو جاتا ہے (تفسیر ابن جریر زیرآیت كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پ۳۰ سورۃ تطفیف) اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ انسان فطرتِ صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے اور ایک لمبے عرصہ تک اُس کی فطرتِ صحیحہ قائم رہتی ہے جب اس کا سارا دل سفید ہو جاتا ہے اور نیکی اُس پر غالب آجاتی ہے تو بغیر کفارہ کے نجات پا جاتا ہے اور جب اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور بدی اُس پر غالب آجاتی ہے تو پھر کوئی کفارہ اُسے فائدہ نہیں دے سکتا۔ اسکے برخلاف مسیحیت یہ کہتی ہے کہ آدمؑ نے گناہ کیا اور اس کی وجہ سے اُسے سزا دی گئی۔ پھر اس کا گناہ ورثہ میں اس کی اولاد کو ملا۔ اب انسان گناہ سے خود بخود نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ یہ اُسے ورثہ میں ملا ہے۔ اس کے لئے کفارہ کی ضرورت تھی جو مسیحؑ نے پیش کیا۔ اور انسان کا تمام گناہ اس نے اپنے سر پر اُٹھا لیا۔ گویا مسیحی تعلیم کے مطابق انسان شیطان کا غلام بنکر پیدا ہوتا ہے اور پھر مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے کے نتیجہ میں شیطان کے پنجہ سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ مسیحیت کے اس عقیدہ سے تعلق رکھنے والے تمام امور کا قرآن کریم نے انکار کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک نہ گناہ ورثہ میں ملا نہ انسان پیدائشی لحاظ سے گنہگار ہے اور نہ اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت ہے۔ انسان کی فطرت پاکیزہ بنائی گئی ہے اور اس میں ترقی کی قابلیت رکھی گئی ہے۔

یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کا محبوب بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اُس کی توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے تو اس عقیدہ کا ردّ کیا ہے۔ کیا خود بائبل بھی اس کی تصدیق کرتی ہے؟ اگر بائبل بھی اس عقیدہ کی تصدیق نہیں کرتی تو پھر عیسائیوں کیلئے بھی اس عقیدہ کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس بارہ میں اگر ہم غور کریں تو چار مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ مسئلہ کہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا۔

۲۔ یہ مسئلہ کہ چونکہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا اس لئے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔

۳۔ یہ مسئلہ کہ انسان پاک نہیں ہو سکتا تھا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ رحیم و کریم بھی ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کے ماتحت اس کے لئے کسی قربانی کی ضرورت تھی۔

۴۔ یہ مسئلہ کہ اس قربانی سے انسان حقیقتہً پاک ہو گیا؟

یہ چار مسائل ہیں جو اس امر پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا۔ اس لئے تمام نسل انسانی گنہگار ہو گئی۔ کیونکہ اُسے آدمؑ سے ورثہ میں گناہ ملا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا آدمؑ نے واقعہ میں گناہ کیا تھا اور آیا بائبل اور انجیل اس کی تصدیق کرتی ہے؟ اگر بائبل کے رُو سے آدمؑ نے گناہ ہی نہیں کیا تو یہ سارا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں بائبل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمؑ نے گناہ نہیں کیا بلکہ بائبل سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی گناہ نہیں کیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر میں نے جب بائبل کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ گناہ نہ آدمؑ نے کیا تھا نہ شیطان نے بلکہ نعوذ باللہ گناہ خالص خدا تعالیٰ کا تھا اس کا ثبوت میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

آدمؑ کا واقعہ پیدائش کی کتاب میں بیان ہے (یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بائبل سے مراد وہ مجموعہ کتب ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے حواریوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے ملاکی نبی تک کے حالات کا جو حصہ ہے وہ پُرانا عہد نامہ کہلاتا ہے اور حضرت مسیحؑ اور اُنکے حواریوں کے حالات پر جو حصہ مشتمل ہے وہ نیا عہد نامہ کہلاتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک صرف پُرانا عہد نامہ واجب العمل ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک پُرانا اور نیا دونوں عہد نامے واجب العمل ہیں۔ پُرانے عہد نامہ میں حضرت موسےٰ علیہ السلام کی پانچ کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب پیدائش ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے)

پیدائش باب ۲ آیت ۸ تا ۱۰ میں لکھا ہے:۔

"اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کیلئے اچھا تھا زمین سے اُگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا"

اس جگہ بائبل یہ بتاتی ہے کہ آدمؑ کی پیدائش کے بعد خدا تعالیٰ نے عدن میں ایک باغ لگایا جس میں ہر قسم کے درخت اُگائے اور اس باغ کے عین وسط میں حیات اور نیک و بدی کی پہچان کا درخت لگایا۔ یہ مَیں آگے چل کر

بتاؤں گا کہ نیک و بد کی پہچان کا درخت الگ تھا اور حیات کا درخت الگ۔ یا دونوں ایک ہی تھے۔ میرے نزدیک یہ دونوں ایک تھے۔ لیکن بائبل اس بارہ میں مضطرب اور متردد ہے۔ کہیں وہ ان دونوں کو ایک درخت بتاتی ہے اور کہیں دو بتاتی ہے۔

آگے لکھا ہے :۔

"اور خداوند خدا نے آدمؑ کو حکم دیا اور کہا کہ تُو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تُو نے اُس میں سے کھایا تُو مرا۔" (پیدائش باب ۲ آیت ۱۶ و ۱۷)

گویا خدا نے عدن کے باغ میں ہر قسم کے درخت لگائے اور درمیان میں حیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت لگایا اور آدمؑ سے کہا کہ تجھے اور تو تمام درختوں کے پھل کھانے کی اجازت ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا۔ اگر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ آگے حوا کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا

"جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔" (پیدائش باب ۳ آیت ۳)

غرض پہلے تو بائبل کی اپنی روایت ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدمؑ سے یہ کہا کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا ورنہ مر جاؤ گے اور پھر حوا کی روایت نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا تھا کہ نہ اس درخت کے پھل کو کھانا اور نہ اُسے چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔

اب آدمؑ کے پاس شیطان آتا ہے (شیطان کے لئے بائبل نے سانپ کا لفظ استعمال کیا ہے) وہ آکر کیا کہتا ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ :۔

"سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔" (پیدائش باب ۳ آیت ۵)

ان روایتوں پر غور کر کے دیکھیں تو نہ آدمؑ کا گناہ نظر آتا ہے نہ شیطان کا۔ بلکہ سارا گناہ نعوذ باللہ خدا کا نظر آتا ہے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت زندگی کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا۔ یعنی اُس درخت سے زندگی حاصل ہوتی تھی اور اُس درخت سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہوتی تھی مگر بائبل کہتی ہے کہ خدا نے آدمؑ سے یہ کہا کہ :۔

"جس روز تُو نے اس میں سے کھایا تُو مرا" (پیدائش باب ۲ آیت ۱۷)

گویا خدا نے آدمؑ سے جھوٹ بولا۔ درخت تو وہ زندگی کا تھا۔ درخت تو وہ علم کی ترقی کا تھا۔ مگر خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ جس روز تُو نے اس میں سے کچھ کھایا تُو مر جائے گا۔ مرنے کے معنے جسمانی بھی ہو سکتے ہیں اور روحانی بھی۔ لیکن کوئی معنے لے لئے جائیں۔ دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ کی یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اگر روحانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ نیک و بد کی پہچان سے انسان کی روحانی موت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُسے روحانی زندگی ملتی ہے۔ اور اگر جسمانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کا درخت تھا جس کے کھانے سے موت نہیں آسکتی تھی۔ غرض بائبل کے خدا نے آدمؑ کو دھوکا دیا کہ وہ درخت جو زندگی بخشنے والا تھا۔ وہ درخت جو عقل پیدا کرنے والا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کہا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ۔ ورنہ

مرجاؤ گے اور حوا بھی یہی کہتی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کہا کہ

"تم نہ تو اُسے کھانا اور نہ چھُونا ورنہ مرجاؤ گے"

(پیدائش باب ۳ آیت ۳)

صاف پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ من ذالک غلط بیانی کی اور آدم کو دھوکا دیا۔ اس کے مقابلہ میں جب شیطان نے کہا کہ

"تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھُل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے" (پیدائش باب۳ آیت ۵)

تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ دونوں باتیں وہی تھیں جو اس درخت کے خواص میں شامل تھیں۔ وہ حیات کا درخت تھا اور وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی اس کے کھانے سے زندگی بھی ملتی تھی اور اُس کے کھانے سے نیک و بد کے پہچاننے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی تھی۔ پس شیطان نے آدم کو دھوکا نہیں دیا بلکہ بائبل کی رُو سے خود خدا نے نعوذ باللہ آدم کو دھوکا دیا۔ پھر اَور آگے دیکھو۔ جب آدم اور حوا نے اُس درخت کا پھل کھا لیا تو کیا وہ مرگئے؟ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ رہے اور شیطان کی بات ہی سچی نکلی کہ "تم ہرگز نہ مروگے" خدا تعالیٰ کی یہ بات کہ "جس روز تُو نے اس میں سے کھایا تُو مرا" غلط نکلی۔ اِسی طرح وہ اس درخت کو کھا کر جیسا کہ بائبل میں آگے ذکر آتا ہے۔ نیک و بد کو بھی پہچاننے لگ گئے۔ پس بائبل کے رُو سے آدم اور شیطان کا کوئی قصور نہیں خود خدا نے اُن کو دھوکا دیا۔ آدمؑ نے کوشش کی کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے لگے اور آدمی بن جائے۔ اور اس کو دنیا کا کوئی شخص بدی نہیں کہہ سکتا۔ آدم نے نیکی کے راستہ میں ترقی کرنے کی کوشش کی اور شیطان نے کہا کہ خدا تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے اس کے کھانے سے تم مرجاؤ گے حالانکہ تم مروگے نہیں بلکہ زندہ رہو گے اور پھر اس کے کھانے سے تمہارے اندر عقل پیدا ہو جائے گی اور تمہیں سمجھ آجائے گی کہ نیکی کیا چیز ہے اور بدی کیا چیز ہے۔ اور بائبل خود مانتی ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے اُن کے اندر عقل پیدا ہو گئی اور وہ نیک و بد کو پہچاننے لگ گئے۔ پس نہ آدم نے گناہ کیا اور نہ شیطان نے۔ گناہ کا مرتکب صرف ایک ہی ہے اور وہ بائبل کا خدا ہے جس نے حیات کے درخت کو جھوٹ بول کر موت کا درخت ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے کھانے سے تم مرجاؤ گے۔ اور یہ مرنا یا جسمانی ہو سکتا تھا یا روحانی۔ مگر دونوں باتیں غلط تھیں جسمانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ حیات کا درخت تھا اور روحانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی انسان کو ایک نئی روحانی زندگی بخشنے والا تھا۔ پس اگر گناہ کیا تو آدم نے نہیں کیا بلکہ نعوذ باللہ خدا نے کیا اور آدم کو دھوکا دیا۔

یہاں عیسائیت یہ نہیں کہہ سکتی کہ خدا باپ نے جھوٹ بولا ہے۔ خدا بیٹے نے جھوٹ نہیں بولا۔ کیونکہ عیسائیت میں جب خدا تعالیٰ کا ذکر ہو تو اس سے مراد اقانیم ثلاثہ ہوتے ہیں۔ باپ خدا بیٹے سے جدا نہیں اور بیٹا روح القدس سے جدا نہیں۔ پس جب باپ خدا نے جھوٹ بولا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیٹے نے بھی جھوٹ بولا اور روح القدس نے بھی جھوٹ بولا۔

پس اگر گناہ ورثہ میں آیا ہے تو بائبل کی رُو سے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آدم گنہگار نہ تھا بلکہ خدا یا دوسرے لفظوں میں یسوع گنہگار تھا جس نے

نعوذ باللہ من ذالک جھوٹ بولا اور اُسی پر سارا الزام [illegible] تا ہے۔ بہرحال بائبل نے خدا تعالیٰ کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا ہے جو نہایت خطرناک اور افسوسناک ہے۔ اور ان حوالجات کی موجودگی میں یسوع ہرگز نجات دہندہ نہیں کہلا سکتا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے والا اور دوسرے کو دھوکا اور فریب دینے والا نجات دہندہ ہو سکے۔ بائبل بتاتی ہے کہ خدا نے جھوٹ بول کر آدم سے کہا کہ تم اس درخت کا پھل کھانے سے مر جاؤ گے اور تمہیں نقصان پہنچیگا۔ حالانکہ وہ زندگی کا درخت تھا وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا اُس کے کھانے سے نہ جسمانی لحاظ سے آدم مر سکتا تھا اور نہ روحانی لحاظ سے مر سکتا تھا۔

پھر آدم کے گنہگار نہ ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ اُسے جو غلطی لگی وہ محض اجتہادی تھی۔ قرآن کریم نے بھی یہی بتایا ہے کہ آدمؑ سے اجتہادی غلطی ہو گئی اور اگر ہم بائبل کے واقعہ کو صحیح مانیں تب بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آدم سے اجتہادی غلطی ہوئی۔ پیدائش باب آیت ۲۷ میں لکھا ہے

"خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔
خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری
اُن کو پیدا کیا"

یعنی انسان جس کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اُس میں مرد بھی شامل ہے اور عورت بھی۔ انسان مرد بھی خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اور انسان عورت بھی خدا کی صورت پر بنائی گئی ہے۔ اب خدا کی صورت پر بنانے کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی اسی طرح ناک، کان، آنکھ اور منہ وغیرہ ہیں بلکہ اسکے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات آدمؑ میں آگئیں اور جب خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور بتایا کہ تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم میری صفات کے مظہر بنو۔ تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ نیک و بد کے پہچاننے کی صفت آدم میں نہ آتی۔ پس شیطان نے آدم سے کہا کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے اور اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے کی طاقت رکھتا ہے۔ پس جس طرح خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے تمہیں بھی نیک و بد کو پہچاننا چاہیئے۔ اور اس کا طریق یہی ہے کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھالو۔ اگر تم اسے کھاؤ گے نہیں تو نیک اور بد کی پہچان کس طرح کرو گے۔ اور جب نیک اور بد کو پہچاننے کی قابلیت تم میں پیدا نہ ہوگی تو تم خدا تعالیٰ کی صفات کے کامل مظہر نہیں بن سکو گے۔ پس ضروری ہے کہ تم اس درخت کا پھل کھاؤ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اس درخت کا پھل کھاکر خدا تعالیٰ کی طرح ہو جاؤ یا تیسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ اگر تم اس درخت کا پھل کھالو گے تو تم اُس مقصد کو حاصل کر لو گے جس کے لئے خدا نے تم کو پیدا کیا ہے

فرض کرو تمام واقعہ اسی طرح ہوا ہو تو اس سے بعد آدم کو اگر اجتہادی غلطی لگ گئی تو اس میں اُس کا قصور کیا تھا۔ ایک شخص آدم کے پاس آتا ہے۔ وہ آکر کہتا ہے کہ تم کو معلوم ہے کہ تمہیں خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا ہے اور تم کو معلوم ہے کہ اس کے معنے صرف اتنے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہو اور تم کو پتہ ہے کہ اُس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچانتا ہے۔ پس اگر تم نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھالو گے تو تم اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر لو گے اور خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر بن جاؤ گے۔ یہ اتنی زبردست دلیل تھی کہ آدم اجتہادی غلطی میں

مبتلا ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بالکل درست ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں آدم کے ایک دفعہ دھوکا کھانے کے باوجود اگر آج بھی اسی رنگ میں لوگوں کے سامنے دلیل پیش کی جائے تو کئی لوگ آج بھی دھوکا کھا جائیں گے اور سمجھیں گے کہ خدا تعالےٰ کا منشا یہی تھا کہ اس درخت کا پھل کھا لیا جائے یہ منشاء نہیں تھا کہ اسے نہ کھایا جائے۔

غرض آدم کو غلطی لگنے کا امکان بائبل کے رُو سے موجود ہے۔ خود بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ نیک و بد کو پہچاننا خدا تعالےٰ اپنی صفت قرار دیتا ہے۔ پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ میں لکھا ہے:۔

"اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔"

اس جگہ "ہم" سے عیسائیوں کے نزدیک اقانیم ثلاثہ مراد ہیں۔ یعنی ہم اقانیم ثلاثہ میں سے ایک کی مانند اور یہودیوں کے نزدیک "ہم" سے خدا اور اس کے فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے اسی طرح فرشتے بھی نیک اور بد کو پہچانتے ہیں۔ پس یہودیوں کے نزدیک تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے خدا اور اس کے فرشتے نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں اسی طرح آدمؑ بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا۔ اور عیسائیوں کے نزدیک اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے باپ خدا اور بیٹا خدا اور روح القدس خدا نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں۔ اسی طرح آدم بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا۔

اس حوالہ سے صاف پتہ لگ گیا کہ نیک اور بد کو پہچاننا خدا تعالےٰ کی صفت ہے اور جو اسے پہچانتا ہے وہ خدا جیسا ہو جاتا ہے یا خدا کی صورت پر ہو جاتا ہے یا بائبل کی رو سے اُس صورت پر ہو جاتا ہے جس صورت پر اُسے خدا نے پیدا کیا۔

ضمناً میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ حیات کے درخت کے بارہ میں بائبل کا خیال عجیب مضحکہ خیز ہے۔ پیدائش باب ۲ آیت ۱۰ و ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخت ایک ہی تھا۔ لکھا ہے خدا نے

"باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا"

یہاں مفرد لفظ "لگایا" استعمال کیا گیا ہے۔ "لگائے" جو جمع کا لفظ ہے وہ یہاں استعمال نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی درخت میں یہ دونوں صفات تھیں۔ اس کے کھانے سے حیات بھی ملتی تھی اور اس کے کھانے سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت بھی پیدا ہوتی تھی۔

اس کے بعد آیت ۱۷ میں لکھا ہے

"خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تُو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تُو نے اُس میں سے کھایا تُو مرا۔"

یہاں سے بھی پتہ لگتا ہے کہ ایک درخت ہے اور ایک درخت سے ہی آدم کو روکا گیا۔ اگر دو درخت ہوتے تو دونوں سے روکنا چاہیئے تھا مگر وہ منع کرتا ہے ایک درخت سے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی حیات کا درخت تھا۔ اور وہی نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا لیکن پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ میں لکھا ہے۔

"اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔"

یہاں دو درخت ہو گئے۔ نیک و بد کی پہچان کا
درخت الگ ہو گیا اور حیات کا درخت الگ ہو گیا۔
چونکہ آدم نے نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے
کھا کر نیک و بد کو پہچاننے کی قابلیت پیدا کر لی تھی
اس لئے خدا نے اُسے باغ عدن سے باہر نکال دیا کہ
کہیں وہ حیات کے درخت کا پھل بھی نہ کھا لے اور
ہمیشہ کی زندگی کا وارث نہ ہو جائے۔

پھر پیدائش باب ۲ آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا
ہے کہ گناہ سے پہلے آدم کے لئے موت مقرر نہ تھی۔
چونکہ لکھا ہے:-

"جس روز تُو نے اس میں سے کھایا تُو مرا۔"

اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر آدم اور حوّا اُس میں سے نہیں
کھائیں گے تو وہ نہیں مریں گے۔ پس موت اس درخت
میں سے کھانے کا نتیجہ تھی اگر نہ کھاتے تو وہ کبھی نہ
مرتے۔ اسی طرح پیدائش باب ۳ آیت ۴ میں آتا ہے کہ

"تم نہ تو اُسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔"

اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ موت کو اس درخت کا پھل
کھانے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح رومیوں
باب ۵ آیت ۱۲ میں لکھا ہے کہ

"گناہ کے سبب سے موت آئی۔"

پھر یعقوب باب ۱ آیت ۱۵ میں لکھا ہے:-

"گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے۔"

ان حوالجات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ
بائبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ اگر تم نے اس درخت
میں سے کچھ کھایا تو مر جاؤ گے۔ حالانکہ تھا وہ درخت
حیات کا۔ اور حیات کے درخت میں سے کھا کر انسان
مرتا نہیں جیتا ہے۔

دوسری طرف رومیوں اور یعقوب میں لکھا ہے کہ
موت گناہ کے نتیجہ میں آئی یعنی اگر وہ گناہ نہ کرتے تو
نہ مرتے۔ اب ہم اس کے ساتھ پیدائش باب ۳ آیت ۲۲
کو ملاتے ہیں تو حیرت آتی ہے۔ اُس میں یہ ذکر آتا ہے
کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو باغ عدن میں سے نکال دیا کہ
کہیں ایسا نہ ہو وہ حیات کے درخت میں سے کچھ کھا کر
ہمیشہ زندہ رہے۔ حالانکہ جب گناہ کا نتیجہ موت تھا تو
چونکہ وہ پہلے نیک و بد کے درخت میں سے کھا کے گنہگار
بن چکا تھا اس لئے خواہ دس ہزار دفعہ بھی وہ اُس درخت
میں سے کھاتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

پس یا تو یہ کہنا چاہیئے کہ گناہ کا نتیجہ موت نہیں
اُس درخت کے کھانے کا نتیجہ زندگی ہے۔ لیکن ایک
طرف یہ کہا جاتا ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے اور دوسری
طرف بائبل یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو باغ عدن
میں سے نکال دیا تا ایسا نہ ہو کہ وہ درخت میں سے کچھ
کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ معلوم ہُوا کہ گناہ کا نتیجہ
موت نہیں بلکہ اُس درخت کا پھل کھانے کے نتیجہ میں گناہ
کے باوجود انسان زندہ رہ سکتا تھا۔

پھر یہ سوال ہے کہ آدم کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔
کہ اُس نے گناہ کیا۔ حالانکہ آدم کے باپ نے کوئی
گناہ نہیں کیا تھا نہ آدم کی ماں نے کوئی گناہ کیا تھا۔
اگر بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی گناہ کیا ہو بیٹا
گناہ کر سکتا ہے تو بغیر اس کے کہ ماں باپ نے
کوئی نیکی کی ہو بیٹا نیکی بھی کر سکتا ہے۔ اور اگر آدمؑ
نیکی کر سکتا تھا تو باقی لوگ کیوں نہیں کر سکتے؟ معلوم ہُوا
کہ اس میں ورثہ کا کوئی سوال نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے
انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ ترقی بھی کر سکتا ہے
اور تنزّل بھی کر سکتا ہے۔ آدمؑ کا باپ گنہگار نہیں تھا
بلکہ اُس کا تو کوئی باپ تھا ہی نہیں۔ مگر آدم نے گناہ
کر لیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ گناہ اور نیکی دونوں
خاص حالات میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور ان چیزوں میں

ورثہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

پس کفارہ ایک بلا ضرورت شئے ہے۔

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم کا گناہ کس طرح بخشا گیا؟ اگر توبہ سے بخشا گیا تو اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے اور کفارہ کی کوئی ضرورت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

غرض وہ ساری بنیاد جس پر کفارہ کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسائیت کہتی ہے کہ چونکہ انسان گناہ سے خود بخود نجات نہیں پا سکتا اس لئے کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے بائبل اور خود انجیل کی گواہی سے باطل ثابت ہوتی ہے۔

پھر بائبل سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ کا سارا واقعہ تمثیلی ہے اور اس پر کسی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب حوّا نے درخت کا پھل کھالیا اور پھر آدمؑ کو بھی دیا

"تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُن کو معلوم ہُوا کہ وہ ننگے ہیں" (پیدائش باب ۳ آیت ۷)

درخت کا پھل کھانے سے ننگا ہو جانا۔ یہ صاف بتاتا ہے کہ اس واقعہ میں تمثیلی زبان اختیار کی گئی ہے۔

پھر لکھا ہے:

"اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سُنی"

(پیدائش باب ۳ آیت ۷ و ۸)

یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے تمثیلی ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ ٹھنڈک اور گرمی پیدا کرنے والا خود خدا ہے۔ اور اُسے اِن چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ یہ نہیں کہ جس طرح لوگ گرمی کے موسم میں کوٹھے اور ہری چلے جاتے ہیں اسی طرح خدا تعالےٰ کو بھی ضرورت ہے کہ وہ ٹھنڈے وقت باہر نکلا کرے اور گرمی سے اپنے آپ کو بچالے۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ٹھنڈا وقت دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ ابھی سورج نہیں نکلا باغ میں پھرنا شروع کر دیا تاکہ گرمی سے اُسے تکلیف نہ ہو۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے استعارہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

اِسی طرح لکھا ہے:۔

"اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا" (آیت ۸)

یہ بھی تمثیلی زبان ہے کیونکہ خدا تعالےٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ قرآن کریم میں بھی ذکر آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالےٰ سے مخفی ہو۔ خواہ زمین کی سطح پر کوئی چیز ہو یا تحت الثریٰ میں۔ سب اس کے علم میں ہیں مگر بائبل بتاتی ہے کہ آدم اور حوّا باغ کے درختوں میں چھپ گئے تاکہ خدا تعالےٰ انہیں دیکھ نہ سکے۔ یہ الفاظ بھی اِس واقعہ کے تمثیلی ہونے کا ثبوت ہیں۔

پھر ایک اور بات لکھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کے علم کی محدودیت کا پتہ چلتا ہے لکھا ہے:۔

"تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تُو کہاں ہے" (آیت ۹)

گویا وہ خدا جو زمین و آسمان کے ذرّہ ذرّہ کو جانتا ہے جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں اُس نے آوازیں دینی شروع کر دیں کہ ارے آدم تُو کہاں ہے ارے آدم تُو کہاں ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے ورنہ وہ تو عرش پر بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا تو مخلوق کی نگرانی کس طرح کر رہا ہے؟ غرض بائبل بتاتی ہے کہ جب وہ باغ میں چھپ گئے تو خدا تعالےٰ نے انہیں آوازیں دینی شروع کر دیں کہ اے آدم تو کہاں ہے۔

"اُس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سُنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔" (پیدائش باب ۳ آیت ۱۰)

کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے آدم کا یہ خیال کر لینا کہ میں باغ میں چھپ کر خدا تعالےٰ کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاؤں گا یہ بھی عقل کے بالکل خلاف ہے۔

غرض یہ حوالہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اس جگہ ظاہری واقعہ مراد نہیں بلکہ تمثیلی رنگ میں اِس کو بیان کیا گیا ہے اور استعارہ کی زبان اس کے اظہار کے لئے اختیار کی گئی ہے اور تمثیلی کلام اور استعارات ہمیشہ تعبیر طلب ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بھی ایک تعبیر طلب کلام ہے نہ کہ حقیقی واقعہ۔

پس جس کلام پر اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے کہ آدم نے گناہ کیا اور اس کا دل سیاہ ہو گیا ہم کہتے ہیں کہ وہ سارا کلام ہی تمثیلی ہے۔ جیسے خدا تعالےٰ کا باغ میں پھرنا۔ اُس کا ٹھنڈے وقت سیر کے لئے آنا۔ آدم کا اُسے نظر نہ آنا اور پھر اللہ تعالیٰ کا آدم کو آوازیں دینا اور کہنا اے آدم تُو کہاں ہے۔ یہ سب تمثیلی کلام ہے اسی طرح باقی واقعہ بھی تمثیلی ہے۔ پس اِس پر کسی مذہبی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے خلاف ہے۔

پھر جیسا کہ میں اُوپر بتا چکا ہوں آدم کا گناہ لے لینا حالانکہ اُس کا نہ باپ تھا نہ ماں یہ بھی بتاتا ہے کہ گناہ اور نیکی دونوں خاص حالات میں ظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور مٹ بھی سکتے ہیں۔ پس کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر باہر سے نیکی نہیں آسکتی تو باہر کا گناہ بھی نہیں آسکتا۔ اور اگر گناہ باہر سے آسکتا ہے تو نیکی بھی آسکتی ہے۔ اگر آدم جس کا نہ باپ تھا نہ ماں۔ اُس کے اندر باہر سے گناہ آگیا تو اولاد میں باہر سے نیکی بھی آسکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں مساوی سمجھی جائیں گی۔

پھر بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ آدم گناہ کے باوجود خدا تعالےٰ کا مقدس رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب عیسائیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ آدم کا گناہ بخشا گیا۔ ہم کہتے ہیں اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے اُن کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

کفارہ کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے یا انسان کے نفس کے ایسے خراب ہو جانے کے لئے کہ اُس کی درستی اور اصلاح ناممکن ہو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد انسان خراب ہو گیا اور وہ نیکی پر قائم نہیں رہ سکا۔ اگر بائبل سے یہ ثابت ہو کہ انسان آدم کے گناہ کے بعد نیکی پر قائم نہیں رہ سکا تو پھر بائبل کے مطابق کفارہ کو درست تسلیم کرنا پڑے گا لیکن اگر بائبل سے ہی پتہ لگے کہ آدم کے گناہ کے بعد (جسے قرآن کریم گناہ قرار نہیں دیتا) انسان خراب نہیں ہوا بلکہ وہ نیکی پر قائم رہا تو پھر کفارہ کی بنیاد ہی باطل ہو جاتی ہے۔ جب کفارہ کے بغیر انسان نیک بھی ہو سکتا تھا اور گناہ سے بھی بچ سکتا تھا تو اس کی نجات کے لئے کسی نئی چیز کی ضرورت نہ رہی۔ اس بارہ میں ہم انجیل ہی کی تعلیم لے لیتے ہیں۔ رومیوں باب ۵ آیت ۱۴ میں لکھا ہے:-

"آدم سے لیکر موسیٰ تک موت نے اُن پر بھی بادشاہی کی جنہوں نے اُس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنیوالے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا۔"

اس جگہ آنے والے سے مراد مسیح ہے اور آنیوالے کا مثیل آدم کو قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے اُن پر بھی بادشاہت کی جنہوں نے آدم کی طرح (جو مسیح کا مثیل تھا) گناہ نہیں کیا تھا۔ گویا پولوس مانتا ہے کہ آدمؑ سے لیکر موسیٰؑ تک بہت سے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا تھا۔ اور جب انہوں نے گناہ نہیں کیا تھا تو یہ ثابت ہوا کہ انسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ بہر حال انجیل مانتی ہے کہ آدمؑ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ حضرت مسیح کی صلیب کے واقعہ کے بعد جب لوگوں کی طرف سے اعتراضات ہوئے تو گھبراہٹ میں جلدی کر بنا لیا گیا تھا۔ اسی لئے حواری کبھی کچھ کہہ دیتے تھے اور کبھی کچھ۔ مثلاً یہی فقرہ جس کو اوپر درج کیا گیا ہے صاف طور پر بتاتا ہے کہ آدم سے لیکر موسیٰؑ تک ایسے کئی لوگ گذرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا گویا آدم کے گناہ کرنے کے باوجود اُس کی اولاد کو ورثہ میں گناہ نہیں ملا۔ لیکن اسی کتاب کے اسی باب کی بارھویں آیت میں لکھا ہے کہ

"یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی
اس لئے کہ سب نے گناہ کیا"

یعنی آدم کو گناہ کی سزا موت ملی۔ اور آدم کی وجہ سے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا

"کیونکہ شریعت کے دئے جانے تک دنیا
میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں
وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا"

(رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا پولوس ایک ہی باب میں دو آیتیں لکھتا ہو پہلے تو یہ لکھتا ہے کہ چونکہ سب نے گناہ کیا اس لئے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی (کیونکہ موت کے متعلق اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ گناہ کے نتیجہ میں آئی ہے) لیکن آیت ۱۴ میں جاکر کہہ دیا کہ

"موت نے اُن پر بھی بادشاہی کی جنہوں
نے اُس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنیوالے
کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا"

لیکن اب انہیں ایک اور مشکل پیش آگئی اور وہ یہ کہ مسیحیوں کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شریعت شروع ہوئی ہے پہلے نہیں۔ جب پہلے کوئی شریعت ہی نہیں تھی تو گناہ کہاں تھا؟ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ

"شریعت کے دئے جانے تک دنیا میں گناہ
تو تھا۔ مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ
محسوب نہیں ہوتا" (رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا اُن کے نزدیک شریعت اور گناہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔ اس میں ہم بھی اُن سے متفق ہیں۔ شریعت الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ اس اِس طرح نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا۔ اور گناہ تب ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس سے شریعت نے بنی نوع انسان کو بصراحت روکا ہو ورنہ شریعت کے نزول سے پہلے گناہ محسوب نہیں ہوتا پس اتنی بات تو درست ہے۔ لیکن خواہ شریعت موجود نہ ہو جو چیز بُری ہے وہ بہر حال بُری ہوگی۔ مثلاً قرآن کریم نازل ہوا اور اُس نے کہا کہ ظلم نہ کرو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور ہم نے سمجھ لیا کہ ظلم کرنا اچھا نہیں۔ لیکن اگر قرآن کریم میں یہ حکم نازل نہ ہوتا اور یہ

جاتا کہ ظلم نہ کرے۔ تو پھر بھی ظلم کرنے والا ایک بُرے فعل کا مرتکب ہوتا۔ یہی حال اور بُرائیوں کا ہے شریعت نہ ہوتی تو پھر بھی بُرائیاں، بُرائیاں ہی رہتیں فرق صرف اتنا ہوتا کہ ایک فعل کو دس بیس آدمی بُرا کہتے اور دس بیس آدمی بُرا نہ کہتے۔ پچاس ساٹھ کہتے کہ یہ نیکی ہے اور پچاس ساٹھ کہتے یہ نیکی نہیں۔ بہرحال احساس بُرائی کا اور احساس نیکی کا یہ شریعت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا فطرت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہی چیز پولوس پیش کرتا ہے کہ دنیا میں گناہ تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا تھا اور یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ گناہ ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی موقعہ پر شریعت نہ ہو تو ہر بُرا فعل گناہ تو ہوگا لیکن وہ گناہ شریعت کے مطابق محسوب نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک جگہ پر شریعت موجود نہیں اور لوگ نمازیں نہیں پڑھتے۔ فرض کرو وہ جنگلوں میں رہتے ہیں یا دور پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اُنہیں پتہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں تو خدا تعالےٰ اُن سے یہ نہیں پوچھیگا کہ تم نے اسلام کی بتائی ہوئی نماز کیوں نہیں پڑھی یا تم نے اسلام کا بتایا ہوا روزہ کیوں نہیں رکھا۔ کیونکہ اِس نماز اور روزہ کا تو اُنہیں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ حدیثوں میں صاف طور پر آتا ہے کہ قیامت کے دن چار قسم کے لوگ شرعی مؤاخذہ سے محفوظ ہوں گے۔ اوّل مادر زاد بہرے۔ دوم پاگل۔ سوم۔ پیرِ فرتوت۔ چہارم وہ لوگ جن تک اسلام کی تبلیغ نہیں پہنچی اور وہ اِسی حالت میں فوت ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے امتحان کے لئے اُن کی طرف کوئی اور رسول مبعوث کیا جائے گا اگر وہ اُسے مان لیں گے تو نجات پا جائیں گے اور اگر نہیں مانیں گے تو سزا پائیں گے (روح المعانی جلد ۴ زیر آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا)

اِس کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم سے استدلال کر کے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کا محاسبہ فطرت کے مطابق ہوگا یعنی قرآن کریم کی شریعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کا محاسبہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کی فطرت کے اندر جو باتیں رکھی ہیں ان کے ماتحت اُن کا محاسبہ ہوگا۔ انسانی فطرت بھی بعض چیزوں کو گناہ قرار دیتی ہے بغیر اس کے کہ شریعت انسان کی راہنمائی کرے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک چور آپ کے پاس علاج کے لئے آیا۔ آپ نے اُسے نصیحت کی کہ تم لوگوں کا مال لُوٹ لیتے ہو یہ بہت بُری بات ہے تمہیں اس قسم کی حرام کمائی سے بچنا چاہیئے۔ اس نصیحت کو سُنکر وہ کہنے لگا واہ مولوی صاحب آپنے بھی مولویوں والی ہی بات کی۔ بھلا ہمارے جیسا بھی کوئی حلال مال کماتا ہے۔ آپ تو تھوڑی دیر نبض پر ہاتھ رکھ کر فیس وصول کر لیتے ہیں اور ہم سردی کے موسم میں ٹھٹھرتے ہوئے اور اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے جاتے ہیں۔ کس طرح ہمیں پولیس کا ڈر ہوتا ہے کس طرح قدم قدم پر ہمیں پکڑے جانے کا خوف ہوتا ہے مگر ہم تمام مصیبتوں کو برداشت کرنے کے بعد جاتے ہیں اور اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں ڈال کر روپیہ لاتے ہیں۔ بھلا ہم سے زیادہ حلال کمائی اَور کسی کی ہو سکتی ہے؟ آپ فرماتے تھے یہ سُن کر میں نے جھٹ اُسے اَور باتوں میں لگا دیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اُس سے پوچھا کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا ہم سات آٹھ آدمی مل کر چوری کرتے ہیں ایک گھر کی ٹوہ لگانے والا ہوتا ہے جو بتاتا ہے کہ فلاں گھر میں اتنا مال ہے۔ ایک سیندھ لگانے کا

مشتاق ہوتا ہے۔ ایک باہر کھڑا پہرہ دیتا رہتا ہے دو آدمی گلی کے سروں پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ادھر آئے تو وہ فوراً بتا دیں۔ ایک آدمی اندر جانے والا ہوتا ہے اور ایک آدمی اچھا لباس پہن کر دور کھڑا ہوتا ہے جس کے پاس چوری کا تمام مال ہم جمع کرتے جاتے ہیں تا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو شبہ نہ کرے بلکہ سمجھے کہ یہ کوئی شریف آدمی ہے جو اپنا مال لئے کھڑا ہے باقیوں نے اپنے جسم پر تیل ملا ہوا ہوتا ہے اور وہ لنگوٹ باندھ کر اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر ایک سُنار ہوتا ہے جس کو ہم تمام زیورات دیدیتے ہیں وہ سونا گلا کر ہمیں دے دیتا ہے اور ہم سب آپس میں مل کر تقسیم کر لیتے ہیں۔ جب وہ یہاں تک پہنچا تو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں نے کہا اگر وہ سُنار سارا مال لے جائے اور تمہیں کچھ نہ دے تو پھر تم کیا کرو؟ اس پر وہ بے اختیار کہنے لگا۔ کیا وہ اتنا بے ایمان ہو جائے گا کہ دوسروں کا مال کھا جائے؟ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے تمہاری نگاہ میں بھی ایمان اور بے ایمانی میں کچھ فرق ضرور ہے اور تمہاری فطرت سمجھتی ہے کہ فلاں فعل بے ایمانی ہے اور فلاں فعل نیکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی یہی فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی فطرت پر امتحان ہو جائے گا اللہ تعالیٰ یہ نہیں کہیگا کہ تم نے وہ نماز کیوں نہیں پڑھی جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ یہ کہیگا کہ تمہاری فطرت میں کسی نہ کسی ہستی کی عبادت کا مادہ رکھا گیا تھا تم یہ بتاؤ کہ اس فطرت کی آواز کے مطابق تم نے عبادت کی تھی یا نہیں؟ یا مثلاً جھوٹ ہے، چوری ہے، ڈاکہ ہے۔ دوسرے کا مال تو انسان کھا لیتا ہے

لیکن جب اِس کا اپنا مال کوئی شخص اُٹھا لیتا ہے تو کہتا ہے فلاں بڑا بے ایمان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی چیز کھانا یہ بھی بے ایمانی سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شریعت کے مطابق اس کو مجرم نہیں کہا جائے گا لیکن فطرت کے مطابق وہ مجرم ہوگا اور اُسے سزا دی جائے گی۔ پس یہ مسئلہ تو ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ درست ہے تو پھر کفارہ کہاں رہا؟

انجیل اگر یہ کہتی کہ فطرتِ انسانی لعنت ہے تو پھر یہ مسئلہ قائم رہ جاتا۔ لیکن انجیل یہ کہتی ہے کہ شریعت لعنت ہے (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) یعنی وہ جو انسان کا نفس کسی فعل کو گناہ قرار دیتا ہے انجیل اُس کے خلاف نہیں بلکہ انجیل کہتی ہے کہ شریعت لعنت ہے یعنی شریعت میں ایسے احکام دئے گئے ہیں جن پر لوگ عمل نہیں کر سکتے اور وہ کہتی ہے کہ اسی وجہ سے مسیحؑ نے شریعت اُڑا دی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موسیٰؑ سے پہلے بھی شریعت اُڑی ہوئی تھی اور انسان کی نجات کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ فطرت کے مطابق عمل کرکے وہ نجات پا جاتا تھا یا فطرت کے خلاف عمل کرکے سزا پالیتا تھا۔ پھر اب کسی کفارہ کی کیا ضرورت ہے؟ گویا اصل مسئلہ صرف اتنا بنا کہ موسیٰؑ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے شریعت بھیجکر لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیا مگر اس کا علاج کفارہ نہیں تھا۔ اصل علاج صرف اتنا تھا کہ شریعت کو منسوخ کر دیا جاتا۔ یہ جا ہے کتنی ہی بیوقوفی کی بات ہوتی مگر بہرحال جہاں تک علاج کا سوال ہے اصل علاج صرف اتنا تھا۔ کیونکہ رومیوں کے حوالہ سے صاف ماننا پڑتا ہے کہ موسیٰؑ سے پہلے شریعت نہیں تھی اور بوجہ شریعت نہ ہونے کے

لوگوں کو شریعت کے ماتحت گنہگار نہیں قرار دیا
جا سکتا تھا اور جب شریعت کے مطابق وہ گنہگار نہیں
تھے تو شریعت اُنہیں سزا بھی نہیں دلا سکتی تھی اور
پھر یہودیوں کے حوالہ کے مطابق ایسے لوگ بھی تھے جو
گنہگار نہیں تھے یعنی فطرت کے گنہگار بھی نہیں تھے۔
ان سارے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو
... پیدا ہوئی وہ آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے پیدا
ہوئی بلکہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی اس غلطی سے
ہوئی کہ اُس نے موسیٰؑ کے ذریعہ ایک شریعت نازل
کر دی۔ جب لوگ اس پر عمل نہ کر سکے اور اُنکی سزا
کا سوال آیا تو اللہ تعالیٰ نے یسوع مسیح کو بھیجکر شریعت
کو ہمیشہ کے لئے اُڑا دیا۔ حالانکہ اس کیلئے یسوع مسیح
کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس خدا نے موسیٰؑ کو
شریعت دی تھی وہی یوشعؑ کو کہہ دیتا کہ چونکہ لوگ
اس پر عمل نہیں کر سکتے اس لئے میں اِسے منسوخ
کرتا ہوں۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر گناہ ہوتا ہی مگر محسوب
نہیں ہوتا تو پھر خدا تعالیٰ کا عدل کہاں رہا۔ کفارہ کی
دوسری بنیاد عدل پر رکھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے
کہ اگر خدا تعالیٰ بنی نوع انسان کو گناہوں کی سزا
نہ دے تو وہ عادل نہیں رہتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ
صرف نام بدل دینے سے تو کوئی چیز اپنی ماہیت
سے الگ نہیں ہو سکتی۔ ایک چور چوری کر رہا ہے
اور ہم کہتے ہیں۔ اِس کو کوئی سزا نہیں ملے گی کیونکہ
ابھی موسیٰؑ کی شریعت نازل نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ
میں ایک اور شخص چوری کرتا ہے اور ہم کہتے ہیں پکڑا
جائے گا کیونکہ موسیٰؑ کی شریعت اُس کو
گنہگار قرار دیتی ہے۔ حالانکہ چیز ایک ہے
اس نے بھی اسی طرح مال اٹھایا ہے جس طرح پہلے نے
اٹھایا ہے۔ مگر ایک کے فعل کو ہم اس لئے جُرم قرار
نہیں دیتے کہ موسیٰؑ کی شریعت ابھی نازل نہیں ہوئی۔
اور ایک کو ہم اس لئے جُرم قرار دے دیتے ہیں۔ کہ
موسیٰؑ کی شریعت نازل ہو چکی ہے۔ ایک کو ہم چھوڑ دیتے
ہیں اور دوسرے کو ہم پکڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں سے
ایک ہی فعل سرزد ہوا ہے۔ یہ کہاں کا عدل ہے
اور کونسا انصاف اس کی اجازت دیتا ہے۔ بہرحال
عدل تو پھر بھی نہ رہا۔ یا مثلاً جھوٹ بولنا یا لوگوں پر
ظلم کرنا ہے۔ اگر اس سے ہم لوگوں کو منع نہیں کرتے
یا یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص نے جھوٹ بول کر یا ظلم
کر کے گناہ کیا۔ تو اِن فعلوں کا مرتکب متقی اور پاک
کس طرح ہو سکتا ہے؟ محض ہمارے نہ روکنے کی وجہ
سے۔ محض ہمارے جھوٹے کو گنہگار نہ کہنے کی وجہ سے
یا ظالم کو گنہگار نہ کہنے کی وجہ سے یا چور کو گنہگار
نہ کہنے کی وجہ سے وہ متقی کس طرح بن سکتا ہے؟ اور اگر
وہ گنہگار نہیں اور ایک دوسرا شخص انہی افعال کی وجہ
سے گنہگار کہلاتا ہے تو عدل تو پھر بھی قائم نہ رہا۔

یہاں تک تو اصولی اور فلسفیانہ طور پر میں نے
بحث کی ہے۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ عملاً بھی بائبل
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نیک لوگ پیدا
ہوتے رہے ہیں۔ حنوک جو حضرت آدمؑ کے پڑپوتے
اور نوحؑ کے پردادا تھے اُن کے متعلق لکھا ہے۔

"حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ
چلتا رہا اور اُس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا
ہوئیں اور حنوک کی کل عمر تین سو پینسٹھ برس
کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا
رہا۔ اور وہ غائب ہو گیا کیونکہ خدا نے
اُسے اُٹھا لیا" (پیدائش باب ۵ آیت ۲۲ تا ۲۴)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حنوک خدا تعالیٰ کے ساتھ

چلتے رہے۔ اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ حنوک اور خدا دونوں سفر پر اکٹھے رہے اور جس طرح لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ چلو امریکہ دیکھ آئیں یا کسی اور ملک کی سیر کر آئیں۔ اسی طرح وہ تین سو سال تک خدا تعالےٰ کے ساتھ سیریں کرتے رہے۔ یہ بائبل کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حنوک نیک انسان تھا اور خدائی صفات اُس نے اپنے اندر پیدا کر لی تھیں یعنی جو کام خدا تعالےٰ کرتا ہے وہی کام حنوک کیا کرتا تھا۔ وہ بڑا رحم کرنے والا تھا، وہ بڑا حسن سلوک کرنے والا تھا، وہ ظلم نہیں کرتا تھا، وہ ہر شخص سے پیار اور محبت سے پیش آتا تھا، وہ عدل اور انصاف سے کام لیتا تھا، وہ غرباء کی خبرگیری کیا کرتا تھا۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی یہ صفات کہ وہ رب ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، مالک ہے، غفور ہے۔ یہ ساری صفات اُس میں بھی پائی جاتی تھیں اور پھر وہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ گویا مسیحؑ کے ساتھ اُسے کلّی مشابہت تھی اور ویسا ہی مقام حنوک کو حاصل تھا جیسے مسیحؑ کو حاصل ہُوا۔ بلکہ مسیحؑ کو تو ساری زندگی تینتیس سال ملی مگر حنوک ۳۶۵ سال تک زندہ رہا اور تمام عمر اُس نے نیکی اور تقوٰی میں بسر کی۔ اِس سے پتہ لگا۔ کہ حنوک جو آدمؑ کا پڑپوتا اور نوحؑ کا پڑدادا تھا وہ اتنا نیک تھا کہ گویا خدا کی مثال تھا اور پھر وہ زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ اس کے ساتھ جب ہم حضرت مسیحؑ کا یہ حوالہ ملاتے ہیں کہ

"آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا اس کے جو آسمان سے اُترا" (یوحنا باب ۳ آیت ۱۳)

تو حنوک کا مقام اَور بھی واضح ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حنوک کا آنا بھی آسمان سے ہی تھا تبھی وہ آسمان پر چلا گیا۔

درحقیقت اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ آسمان پر جانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر بچپن سے ہی اللہ تعالےٰ اپنا تصرف رکھتا ہے اور انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے حنوک بھی تھے جنہوں نے بچپن سے ہی خدا تعالےٰ کے فضل اور اس کے رحم کے سایہ کے نیچے پرورش پائی اور بقول بائبل وہ بھی آسمان پر اٹھا لئے گئے۔

پھر حنوک سے بھی زیادہ شاندار ذکر بائبل میں ملک صدق سالم کا موجود ہے اور انجیل بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب عراق میں ظلم ہوئے اور اُن کے چچا اور بھائیوں نے اُنہیں دکھ دیا تو خدا تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ یہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے جائیں صرف حضرت لوطؑ آپ پر ایمان لائے تھے وہ لوطؑ کو ساتھ لے کر چلے۔ آپ کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ راستہ میں مصر سے ہوتے ہوئے اور حضرت ہاجرہؓ سے شادی کرتے ہوئے فلسطین پہنچے۔ اس ملک کے متعلق آپکو بشارت مل چکی تھی کہ یہاں آپ کو جگہ دی جائے گی اور آپ کو ماننے والے یہاں پیدا ہو جائیں گے۔ جب آپ فلسطین میں آکر بس گئے اور ارد گرد کے بادشاہوں نے دیکھا کہ ابراہیمؑ لوگوں میں مقبول ہو رہا ہے تو انہوں نے آپ سے لڑائی کی۔ آپ بھی اُن کے مقابلہ میں نکلے اور انہیں شکست دی۔ جب آپ انہیں شکست دے کر واپس آ رہے تھے تو ملک صدق سالم ایک بادشاہ آپ سے ملا۔ وہ اپنے زمانہ میں بہت بڑا نیک اور بزرگ اور ولی اللہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غنیمت کے اموال کا دسواں حصہ ملک صدق سالم کی خدمت میں پیش کیا۔ ملک صدق سالم نے اُس روپیہ کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ روپیہ کی مجھے ضرورت نہیں

جو آدمی آپ پکڑ لائے ہیں صرف وہ دے دئے جائیں
لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں یہ مال
آپ کو ضرور دوں گا تا ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ
ملک صدق سالم کی وجہ سے میں دولت مند ہوا ہوں
گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اطاعت اور
فرمانبرداری کو قبول کیا۔ (پیدائش باب ۱۴ آیت ۱۸ تا ۲۴)
انجیل میں اس واقعہ کو زیادہ تشریح کے
ساتھ بیان کیا گیا ہے لکھا ہے :-
"یسوع ہمیشہ کے لئے ملک صدق کے طریقہ
کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو کے
طور پر داخل ہوا ہے" (عبرانیوں باب ۶ آیت ۲۰)
اس جگہ پولوس اپنی قوم کو مخاطب کرکے کہتا
ہے کہ یسوع مسیح ہمیشہ کے لئے ملک صدق سالم
کے طریقہ کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو
کے طور پر داخل ہوا ہے یعنی باقی لوگ تو مر جاتے
ہیں۔ موسیٰؑ آئے اور فوت ہو گئے، داؤدؑ آئے اور
فوت ہو گئے سلیمانؑ آئے اور فوت ہو گئے لیکن
ملک صدق سالم نہیں مرا۔ اسی طرح مسیح بھی نہیں مرا۔
پھر آگے لکھا ہے :-
"اور یہ ملک صدق۔ سالم کا بادشاہ۔ خدا تعالیٰ
کا کاہن ہمیشہ کاہن رہتا ہے"
(عبرانیوں باب ۷ آیت ۱)
یعنی ملک صدق سالم پر کبھی موت نہیں آتی۔
پھر لکھا ہے :-
"جب ابراہام بادشاہوں کو قتل کرکے واپس
آتا تھا تو اسی نے اُس کا استقبال کیا۔ اور
اُس کے لئے برکت چاہی" (")
یعنی ملک صدق سالم نے ابراہیمؑ کو برکت دی معلوم
ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے

بڑا سمجھتا تھا۔ کیونکہ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ملک
صدق سالم نے یہ نہیں کہا کہ اے ابراہیم خدا تجھے
برکت دے بلکہ اُس نے یہ کہا کہ اے ابراہیم تیرے
مال میں برکت ہو یعنی میں تجھے برکت دیتا ہوں۔
اور لکھا ہے :-
"اسی کو ابراہیم نے سب چیزوں کی دہ یکی دی"
آگے لکھا ہے :-
"یہ اوّل تو اپنے نام کے معنی کے موافق
راستبازی کا بادشاہ ہے (کیونکہ صدق
راستبازی کو کہتے ہیں) اور پھر سالم یعنی
صلح کا بادشاہ (سالم سلامتی سے نکلا ہے)
یہ بے باپ، بے ماں، بے نسب نامہ ہے۔
نہ اسکی عمر کا شروع نہ زندگی کا آخر بلکہ خدا
کے بیٹے کے مشابہ ٹھہرا"
(عبرانیوں باب ۷ آیت ۱ تا ۳)
یعنی ملک صدق سالم کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی۔ وہ
خدا تعالیٰ کی طرح ازلی ابدی تھا۔ نہ اسکی عمر کا کوئی شروع
ہے اور نہ زندگی کا آخر۔ نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی مرتا
ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ ہے اور خدا تعالیٰ
کے بیٹے کے مشابہ ہے جس طرح مسیح ازل سے ابد تک
ہے (وہ مسیح نہیں جو مریم کے پیٹ سے پیدا ہوا۔
بلکہ وہ مسیح جو اقنوم ثلاثہ میں شامل ہے) اسی طرح
ملک صدق سالم بھی ازلی ابدی ہے۔ نہ اسکی کوئی
ابتداء ہے اور نہ انتہاء۔
اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک
اور وجود بھی تھا جو نیک تھا اور ایسا نیک تھا کہ وہ
راستبازی اور صلح کا بادشاہ تھا اور ابراہیمؑ کو
برکت دینے کا حق رکھتا تھا۔
پھر انجیل میں حضرت زکریاؑ اور انکی بیوی کے متعلق

لکھا ہے

" وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے" (لوقا باب ۱ آیت ۶)

پھر یوحنا کے بارے میں حضرت زکریا علیہ السلام کو فرشتے نے کہا :-

" وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئے گا اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائیگا" (لوقا باب ۱ آیت ۱۵)

گویا یوحنا پر روح القدس کا نزول ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد نہیں ہوگا بلکہ ابھی وہ ماں کے پیٹ میں ہی ہوگا کہ روح القدس اُس پر نازل ہوگا اور وہ اسے اپنے تصرف میں لے لیگا اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب کسی پر ماں کے پیٹ میں ہی روح القدس نازل ہو جائے گا تو وہ گناہ کا مرتکب ہی نہیں ہو سکیگا۔ غرض یوحنا کے متعلق بھی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ اور خرابی اُن کے قریب نہیں آئی۔ بلکہ حضرت مسیح نے یہاں تک کہا کہ :-

" میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں اُن میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں "

(متی باب ۱۱ آیت ۱۱ و ۱۲)

اس طرح اُس نے یوحنا کو اپنی ذات سے بھی بالا ثابت کیا۔ کیونکہ مسیح بھی عورت سے پیدا ہوا تھا اور یوحنا بھی عورت سے پیدا ہوئے۔

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ انجیل کے رُو سے حضرت زکریا اور اُن کی بیوی دونوں بے عیب تھے اور خدا تعالےٰ کے قانون پر چلنے والے تھے۔ اسی طرح یوحنا ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھرے ہوئے تھے اور وہ کامل اور بے عیب تھے۔ اب اگر یوحنا اور زکریا اور اُن کی بیوی بے گناہ ہو سکتے ہیں تو اسی قانون کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کیوں بے گناہ نہیں ہو سکتے۔ جب عملاً حضرت مسیح سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں جو کفارہ واقعہ ہونے سے پہلے نیک، راستباز، بے عیب اور شریعت پر چلنے والے تھے تو معلوم ہوا کہ کفارہ کے بغیر بھی دنیا میں نیکی قائم تھی۔ اور جب کفارہ کے بغیر دنیا میں نیکی قائم تھی تو آئندہ بھی قائم رہ سکتی ہے اور اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

بعض دفعہ مسیحی علماء اس سوال کے متعلق کہ پہلے لوگ جو نجات پا گئے تھے انہوں نے کس طرح نجات پائی اور پہلے لوگوں میں سے جو نیک گذرے ہیں وہ کس طرح نیک ہوئے تھے ؟ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ پہلے لوگ بھی مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے سے نیک ہوئے تھے اور مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہی اُن کو نجات ملی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعوےٰ محض ڈھکوسلہ ہے۔ وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد محض اِسی بات پر رکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤدؑ اور بعض اور انبیاء نے مسیحؑ کی خبر دی تھی حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیوں میں کہیں مسیح کی خبر کا پتہ نہیں لگتا۔ یہ محض ایک دعوےٰ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنی خبر دی تھی کہ اُن کی اولاد کو بابرکت کیا جائے گا اور یہ کہ اُن کی اولاد کے ذریعہ خدا تعالےٰ اپنے تقدس کو ظاہر کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر اولاد ابراہیم کے حق میں ہے کسی خاص فرد کے حق میں نہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جو خدا تعالےٰ کے

ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آجاتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام جو خدا تعالےٰ کے ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آجاتے ہیں۔ اسی طرح یعقوبؑ۔ یوسفؑ۔ موسیٰؑ۔ داؤدؑ اور زکریاؑ سب اس پیشگوئی کے ماتحت آتے ہیں۔ بعض اور نبیوں کی پیشگوئیوں سے بے شک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آنے والے مسیحؑ کی خبر دے رہے ہیں لیکن کسی آنیوالے کے متعلق خبر دینا اور یہ خبر دینا کہ خدا تعالےٰ کا ایک بیٹا ہوگا جو لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگا اور اس کے بغیر دنیا کو نجات نہیں مل سکیگی اِن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قریب سب ہی کی خبر پہلے نبیوں نے دی ہے حضرت یحییٰ کی خبر پہلے سے موجود تھی حضرت داؤد کی خبر پہلے سے موجود تھی اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبر بھی پہلے سے موجود تھی مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ انکے آنیکی اس رنگ میں خبر موجود تھی کہ انکے کفارہ پر ایمان لانے سے دنیا کو نجات ملیگی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خبر اپنی اولاد کے متعلق دی تھی وہ خبر اگر فرض کرو اس مفہوم کی بھی ہو کہ آئندہ زمانہ میں میرا ایک بیٹا ایسا ہوگا جس سے دنیا کو نجات ملےگی۔ تو بہر حال وہ مسیحؑ پر چسپاں نہیں ہو سکتی کیونکہ مسیحؑ کے دعویٰ کی ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کے بیٹے ہیں۔ عیسائیت کہتی ہے کہ آدم کے بیٹے کا گنہگار ہونا ضروری ہے اور گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا پس ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا وجود تلاش کیا جائے جو آدمؑ کا بیٹا نہ ہو چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے اپنا اکلوتا بیٹا یسوع مسیحؑ دنیا میں بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ مسیح خدا تعالےٰ کا بیٹا تھا تو پھر وہ ابراہیمؑ کا نہیں تھا اور اگر وہ ابراہیمؑ کا بیٹا تھا تو کفارہ کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خدا تعالےٰ کا بیٹا نہیں تھا۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کو مسیحؑ پر چسپاں کرنا کفارہ کی ساری بنیاد ہی اکھیڑ دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے مَیں چھوٹا تھا سترہ اٹھارہ سال میری عمر ہوگی کہ میں لاہور گیا اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں کسی پادری سے گفتگو کروں۔ لاہور کا سب سے بڑا پادری جو بعد میں مشنری کالج سہارنپور کا پرنسپل مقرر ہو گیا تھا مَیں اُس سے ملنے چلا گیا اور مَیں نے اُس سے یہی سوال کیا کہ پہلے لوگ کس طرح نجات پاتے تھے؟ وہ کہنے لگا وہ بھی مسیحؑ پر ایمان رکھتے تھے اور اس ایمان کی وجہ سے ہی انہوں نے نجات پائی۔ مَیں نے کہا اگر میں کہہ دوں کہ مجھ پر ایمان لاکر انہوں نے نجات پائی ہے تو پھر اِس کا کیا حل ہوگا؟ وہ کہنے لگا پیشگوئی بھی تو ہونی چاہیئے۔ مَیں نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ مسیحؑ کے متعلق کونسی پیشگوئی تھی؟ اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی پیش کی۔ میں نے کہا آپ ابراہیمؑ کی ساری پیشگوئیاں نکال لیں اگر اُن میں ایک طرف یہ ذکر آتا ہے کہ میں اسحاقؑ کی اولاد کو یوں برکت دُوں گا تو ساتھ ہی اسمٰعیلؑ کی اولاد کا بھی ذکر ہے۔ اگر آپ کا یہ حق ہے کہ آپ اس پیشگوئی کو مسیحؑ پر چسپاں کریں تو ہمیں کیوں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم اس پیشگوئی کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرلیں جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے؟ پھر میں نے کہا پہلے آپ میرے اس سوال کا جواب دیں کہ کفارہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا۔ اگر وہ ابراہیم کا بیٹا تھا تو کفارہ نہیں ہو سکتا۔ میرے اس سوال پر اُس نے بڑے چکر کھائے حالانکہ وہ پچپن ساٹھ سال کی عمر کا تھا۔ آخر گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا مجھے معاف فرمائیں۔ یونانی میں ایک مثل ہے کہ ہر بیوقوف سوال کر سکتا ہے

مگر جواب دینے کے لئے عقلمند انسان چاہیئے۔ گویا اُس نے مجھے بیوقوف بنایا اور اپنے متعلق کہا کہ میں اتنا عقلمند نہیں کہ ہر بے وقوف کا جواب دے سکوں۔ میرا بھی اُس وقت جوانی کا زمانہ تھا میں بھلا کب رُکنے والا تھا۔ میں نے کہا مجھے بڑا افسوس ہے میں آپکو عقلمند سمجھ کر ہی آیا تھا۔ تو مسیحؑ اگر ابراہیم کی اولاد میں سے تھا تو کفارہ باطل ہو جاتا ہے اور اگر وہ خدا کا بیٹا تھا تو ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔ گویا دونوں صورتوں میں اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ ایک صورت میں مسیحؑ کفارہ نہیں بن سکتا اور دوسری صورت میں ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں سے کسی آنے والے کی خبر دی ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ ہے کون۔ حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ میری اولاد میں سے ایک شخص آئیگا اور ابراہیمی نسل میں بھی یہ مشہور ہے کہ اُس نے کسی بڑے آدمی کے ظہور کی خبر دی تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو آدمی کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے میں اس پیشگوئی کا مستحق ہوں اور دوسرا کہتا ہے میں اس پیشگوئی کا مستحق ہوں۔ ایک سے ہم پوچھتے ہیں کہ تیرے پاس اسباب کا کیا ثبوت ہے کہ تو اس پیشگوئی کا مصداق ہے؟ وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اور اس کا باپ ابراہیم تھا۔ دوسرے سے ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس اسباب کا کیا ثبوت ہے کہ تم ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہو وہ کہتا ہے میری ماں فلاں تھی۔ وہ فلاں سے بیاہی گئی تھی۔ اور وہ شخص جس سے میری ماں بیاہی گئی تھی وہ فلاں کا بیٹا تھا وہ فلاں کا بیٹا تھا اور وہ ابراہیمؑ کا بیٹا تھا۔ کیا دنیا کا کوئی بھی معقول آدمی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ وہ واقعہ میں ابراہیم کی اولاد میں سے ہے۔ وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا، دادا فلاں تھا، پردادا فلاں تھا اور اس طرح چلتے چلتے وہ اپنا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میری ماں فلاں سے بیاہی گئی تھی اور وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا۔ ہر شخص اُسی کی بات مانیگا جو اپنے باپ دادا کا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا رہا ہو۔ اُس کی بات کوئی نہیں مانیگا جو اپنی ماں کے شوہر کو ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دے کر یہ سمجھ رہا ہو کہ میں بھی ابراہیم کی اولاد میں سے ہوں۔ مسیحؑ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی یہی کیفیت ہے۔ حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ متی باب ۱ میں درج کیا گیا ہے اور جسے "یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ" قرار دیا گیا ہے اُس کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ

"یعقوب سے یوسف پیدا ہُوا یہ اُس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہُوا جو مسیح کہلاتا ہے" (انجیل متی باب آیت ۱۶)

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک مسیح کا نسب نامہ نہیں پہنچتا بلکہ یوسف کا نسب نامہ پہنچتا ہے جن سے حضرت مریمؑ بیاہی گئی تھیں۔ اسکے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میرا باپ عبداللہ تھا وہ عبدالمطلب کا بیٹا تھا اور اسی طرح چلتے چلتے آپ اس نسب نامہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتے ہیں۔ پس ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں کہ تم جس وجود پر ابراہیم کی پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہو اور جسے ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دیتے ہو وہ تو صاف کہتا ہے کہ میری ماں مریم جس سے بیاہی گئی تھی وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا۔ میں ابراہیم کی اولاد میں سے نہیں۔ لیکن ہم جس وجود پر اس پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہیں

یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ وہ یقینی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر تم اس پیشگوئی کا مصداق حضرت مسیح کو کس طرح قرار دیتے ہو۔

باقی رہا یہ دعویٰ کہ میں دنیا کا نجات دہندہ ہوں یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی کہا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ع۴) اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کرو کہ اللہ تعالےٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو اور میری بیعت میں شامل ہو جاؤ نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف تم نجات پا جاؤ گے بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ گویا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انسان کو صرف نجات ہی نہیں ملتی بلکہ وہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال ع۳) کہ اے مومنو! تم خدا اور اس کے رسول کے احکام کو قبول کرو کیونکہ وہ تمہیں زندہ کرنے کے لئے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس جگہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو زندہ کرتے ہیں اور چونکہ انجیل خود تسلیم کرتی ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے۔ اِس لئے اِن الفاظ میں درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا نجات دہندہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپکی اتباع میں ہی بنی نوع انسان کو اُس موت سے نجات مل سکتی ہے جو گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

کفارہ کے متعلق ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تین اقنوم تھے تو پھر مسیحؑ کے ذمہ کفارہ کیوں لگایا گیا۔ مان لیا کہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا۔ یہ بھی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ آدمؑ کا گناہ ورثہ کے طور پر اُس کی اولاد میں چلا گو یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔ اس کے بعد ہم یہ تیسری احمقانہ بات بھی مان لیتے ہیں کہ ورثہ کا گناہ ایسی چیز ہے جو کسی طرح علاج پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بہرحال کوئی خارجی علاج چاہیئے۔ پھر یہ چوتھی احمقانہ بات بھی ہم مان لیتے ہیں کہ اس ورثہ کے گناہ کا علاج کفارہ ہے۔ گو یہ علاج بالکل ویسا ہی ہے جیسے ہمارے ملک کی مثل ہے کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کسی کے گھٹنے پر چوٹ لگی تو اُس نے اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ ہائے مر گیا۔ ہائے مر گیا۔ یہ بھی بالکل وہی بات ہے کہ دنیا سے گناہ دور نہیں ہو سکتا لیکن مسیحؑ کے صلیب پر لٹکنے سے وہ گناہ دُور ہو گیا۔ یہ بالکل بے جوڑ بات ہے لیکن چلو ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہُوا اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی خدائی طاقتوں والا وجود چاہیئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس غرض کیلئے خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ آخر رحم کی صفت خدا باپ میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ جب وہ دنیا پر اتنا رحم کرتا ہے کہ جس کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ تو خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو کفارہ کے لئے پیش کر دیا؟ روح القدس خدا نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ بیٹے نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یا تو یہ بات ماننی پڑے گی کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے مرنے سے دنیا فنا ہو جاتی تھی اس لئے خدا بیٹے نے اپنے آپکو قربانی کیلئے

پیش کر دیا۔ لیکن اس صورت میں ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیٹا ناقص خدا ہے اُس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہوسکتی تھی اس لئے اُسے پیش کر دیا گیا۔ باپ خدا نے اپنے آپ کو اس لئے پیش نہ کیا کہ اگر وہ مرا تو ساری دنیا تباہ ہوجائے گی۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے دل میں بنی نوع انسان کی اتنی محبت اور اتنا پیار نہیں تھا جتنا پیار خدا بیٹے کے دل میں تھا۔ مگر یہ جواب خدا باپ اور خدا روح القدس دونوں کو ناقص قرار دیتا ہے۔ دوسرے انجیل کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ خدا محبت ہے (۲ کرنتھیوں باب ۱۳ آیت ۱۱) اور یہ فقرہ نہ روح القدس کے متعلق ہے نہ مسیح کے متعلق ہے۔ غرض ایک صورت میں بیٹا ناقص قرار پاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک غیر ضروری شئے تھا جس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن اگر خدا باپ مرجاتا تو ساری دنیا تباہ ہوجاتی۔ اور اگر بیٹے کے دل میں بنی نوع انسان کی کامل محبت تھی تو پھر باپ خدا اور روح القدس خدا دونوں ناقص قرار پاتے ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک نہ ایک خدا ضرور ناقص قرار پاتا ہے اور ناقص چیز تمام مذاہب کے مسلّمہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہوسکتی۔

پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہودیت کے نزدیک کفارہ ضروری ہے؟ ہم کہتے ہیں بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ کفارہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ کفارہ کی ضرورت تب پیش آتی ہے جب گناہ معاف نہ ہوسکتے ہوں۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ گناہ معاف ہوسکتے ہیں اور تمام بائبل گناہوں کی معافی کی تعلیم سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح اُن قربانیوں کی تعلیم سے بھری پڑی ہے جو خدا تعالےٰ کے حضور مقبول ہوتی ہیں۔ بلکہ بائبل بتاتی ہے کہ خود آدمؑ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی قربانیوں کو خدا نے قبول کیا اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دی۔ بائبل میں لکھا ہے :۔

"چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پلوٹھے بچوں کا اور کچھ اُن کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا (یعنی ہابل بھی خدا تعالےٰ کا مقرب ہوگیا اور اُس کا ہدیہ بھی منظور ہوگیا) پر قائن کو اور اُس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔ (یہ قائن وہی ہے جسے ہمارے ہاں قابیل کہتے ہیں) اسلئے قائن نہایت غضبناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا۔ اور خداوند نے قائن سے کہا تو کیوں غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے (یعنی خدا تعالےٰ نے جب قائن کے ہدیہ کو قبول نہ کیا تو اُس کا منہ بگڑ گیا اور اُسے سخت غصہ آیا۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کا منہ بگڑا ہوا دیکھا تو اُس نے کہا کہ اے قائن تجھے کیوں غصہ آیا ہے اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے) اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پر تو اُس پر غالب آ" (پیدائش باب ۴ آیت ۳ تا ۷)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ :۔

اوّل باوجود آدمؑ کے گناہ کے اُس کے بعض بیٹوں کی قربانی قبول ہوتی تھی۔ چنانچہ ہابیل کی قربانی قبول ہوئی اور وہ خدا تعالےٰ کا منظورِ نظر ہوگیا۔ کیونکہ لکھا ہے

خداوند نے ہابل کو اور اُس کے ہدیہ کو منظور کیا۔"
لو قبول کرنے کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ
دانے ہابل کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اس کا مطلب
ہے کہ خدانے اُس کو اپنا منظورِ نظر بنا لیا اور
س کے ہدیہ کو ایک زندہ قربانی تصوّر کیا جو انسان
درجہ کو برابر بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ ہدیہ قبول
رنے کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ اُس کا نتیجہ خدا تعالیٰ
طرف سے بندہ کو ملنا شروع ہو جائے۔ اب ہابل
نسا اُن دونوں آدمؑ کی اولاد تھے اور آدمؑ کے گناہ
بعد پیدا ہوئے۔ اِن دونوں میں ورثہ کے طور
گناہ آنا چاہیئے تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ گناہ
کر پیدا ہوئے تھے جب انہوں نے قربانی کی
یک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قربانی ردّ
نی۔ اگر ورثہ میں انہیں گناہ ملا تھا تو اول توانہیں
ربانی کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی اور اگر کرتے تو
دونوں کی قربانیاں ردّ کر دی جاتیں۔

دوم۔ اسی حوالہ میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں
خدا تعالےٰ نے قائن سے کہا
"اگر تُو بھلا کرے تو کیا تُو مقبول نہ ہوگا"
یعنی اگر تُو نیک بنے تو کیا خدا تجھے اپنا مقرب نہ بنائیگا۔
ان الفاظ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر تُو نیک بننا
چاہے تو بن سکتا ہے اور نیک بننے کا دروازہ تیرے
لئے ہر وقت کھلا ہے اور "کیا تو مقبول نہ ہوگا" کے
معنے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا مقبول اور اُس کا مقرب
بننے کا دروازہ بھی تیرے لئے کھلا ہے جو نجات سے
درجہ ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت
بنی نوع انسان خدا تعالےٰ کے حضور عمل سے مقبول
ہوتے تھے نہ کہ کفارہ سے۔ اور یہ کہ گناہ کرنے کے
بعد بھی انسان توبہ سے مقبول ہو سکتا تھا۔ اور

یہ دونوں باتیں بتاتی ہیں کہ ہر انسان نیک بھی بن سکتا
ہے اور ہر انسان خدا تعالےٰ کا مقرب بھی ہو سکتا ہے
اگر ایسا نہ ہوتا تو قائن جو گناہ کی وجہ سے نامقبول
ہو چکا تھا اُسے یہ نہ کہا جاتا کہ "اگر تُو بھلا کرے تو کیا
تُو مقبول نہ ہوگا۔"

سوم۔ پھر لکھا ہے:۔
"اگر تُو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا
بیٹھا ہے۔"

مسیحیت کہتی ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد گناہ
انسان کے دل میں بویا گیا۔ ورثہ کے بھی یہی معنے ہوتے
ہیں۔ مگر بائبل کہتی ہے کہ گناہ اس کے دل میں نہیں گیا
بلکہ وہ اُس کے گھر کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے
جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسان کے دل میں نہیں بلکہ
باہر سے آتا ہے۔ پس بائبل کے نزدیک آدم کے گناہ
کے بعد گناہ کا بیج انسان کے دل میں نہیں بویا گیا بلکہ
ہر انسان کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے گویا گناہ
ایک خارجی شئے ہے نہ کہ ورثہ کی چیز جو جزوِ بدن
ہو جاتی ہے۔

چہارم۔ پھر لکھا ہے:۔
"پر تُو اُس پر غالب آ"

یعنی اے قائن تُو اس پر غالب آ۔ جب خدا کہتا ہے
تُو ایسا کر۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔
ایک چھوٹے بچے کو پیار میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے (سوائے
اس کے کہ ہم غلط مذاق کر رہے ہوں) کہ جا اور موٹر کو
اُٹھا لا یا جا اور ہاتھی کو پکڑ لا۔ ہم اس سے وہی بات
کہیں گے جو اُس کی طاقت کے اندر ہوگی۔ اگر دفتر میں
ہی کوئی افسر اپنے چپڑاسی کو بلائے اور کہے کہ جیکب آباد
کی طرف جو انجن جاتا ہے وہ اُٹھا کر لے آ۔ تو تم جانتے ہو
وہ کیا کرے گا؟ وہ چُپ کرکے اور کوئی بہانہ بنا کر

وہاں سے کھسک جائے گا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ جائے گا اور وہ دوسروں سے جاکر کہیگا کہ صاحب پاگل ہوگیا ہے۔ کیونکہ اُس نے ایک ایسی بات کہی ہے جو انسانی طاقت میں ہی نہیں۔ اِسی طرح اگر گناہ دب ہی نہیں سکتا تھا تو خدا تعالےٰ نے قائن سے یہ کیوں کہا کہ تُو اُس پر غالب آسکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالےٰ نے اس کی قربانی کو رد کردیا اور کہا کہ چونکہ تُو نے اس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی نہیں کی جس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی قبول ہوسکتی ہے۔ اِس لئے میں تیری قربانی کو قبول نہیں کرتا۔ مگر ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ میں نے جو قربانی رد کردی ہے وہ ہمیشہ کے لئے رد کردی ہے تیرے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ تُو گناہوں پر غالب آجائے اور میرا قرب حاصل کرلے۔ گویا انسان کے لئے اپنی ذاتی جد و جہد سے گناہ پر غالب آنا ممکن تھا

غرض آدم کا گناہ تو الگ رہا۔ قائن کے اپنے گناہ کے متعلق بھی اللہ تعالےٰ کہتا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دبائی نہ جاسکے۔ اگر تُو کوشش کرے تو گناہ پر غالب آسکتا ہے اور میں تجھے بھی نصیحت کرتا ہوں کہ تُو اُس پر غالب آ۔

اُوپر کے حوالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی قابیل کے تبع ہیں اور مسلمان ہابیل کے تبع کیونکہ عیسائی کفارہ کی معافی کے قائل ہیں۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے اس لئے دشمن ہیں کہ قابیل کی طرح اُن کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ پس وہ اس کا بدلہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکی جماعت سے لینا چاہتے ہیں۔ پھر جیسا کہ خدا تعالےٰ نے قابیل سے کہا تھا کہ اگر تُو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے۔" آج کل ہمیں وہی نظارہ نظر آرہا ہے۔ عیسائی دنیا میں اس کثرت کے ساتھ گناہ پایا جاتا ہے کہ اُس کی کوئی حد ہی نہیں۔

بہرحال بائبل کے نزدیک انسان بعد از گناہِ آدم بھی نیک ہوسکتا تھا اور یہ کہ گناہ کا بیج اُس کے دل میں نہیں بویا گیا تھا۔ بلکہ اُس وقت بھی وہ باہر سے آتا تھا اور اگر وہ گناہ کر بیٹھتا تھا تب بھی اُس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا تھا اور آئندہ گناہ پر غالب آنے کا امکان اُس کیلئے موجود تھا۔ بلکہ نہ صرف وہ گناہ پر غالب آنے کی طاقت رکھتا تھا بلکہ وہ خدا تعالےٰ کا مقبول ہونے کی بھی طاقت رکھتا تھا۔ پس وہ کیفیت جس کے نتیجہ میں کفارہ کی ضرورت مسیحی بتاتے ہیں بائبل کے بیان کے رُو سے موجود ہی نہیں۔

ایک سوال کفارہ کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ فرض کرو دنیا میں نیکی موجود نہیں تھی اور فرض کرو کہ کفارہ کی ضرورت تھی۔ پھر بھی کیا اِس کفارہ کیلئے خدا تعالےٰ کے بیٹے کی ضرورت تھی؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا؟

یہ سوال کہ کفارہ کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ہم خود مسیحؑ کی کتاب کو دیکھتے ہیں۔ بائبل اس بات کو مانتی ہے کہ خدا تعالےٰ کے انبیاء مختلف معجزات دکھاتے رہے ہیں۔ اُس کے نزدیک نبی مردے زندہ کرتے تھے۔ نبی بیماروں کو اچھا کرتے تھے نبی تھوڑے سے کھانے کو بڑھا دیتے تھے۔ اِسی طرح اور قسم قسم کے معجزات دکھاتے تھے۔ لیکن مسیحی کہتے ہیں (میں مسیحیوں کا لفظ اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ بہت سی باتیں مسیحی اپنے پاس سے کہہ دیتے ہیں اور باوجود اس کے کہ انجیل بگڑ چکی ہے۔ پھر بھی اُن باتوں کا انجیل میں ثبوت نہیں ملتا) کہ گناہ کا معاف کرنا یہ انسانی طاقت سے

بالا ہے۔ انبیاء بے شک مُردے زندہ کر لیتے تھے۔
جیسا کہ ایلیاہ نبی اور الیسع کے متعلق آتا ہے کہ انہوں
نے مردے زندہ کئے (۱۔ سلاطین باب ۱۷ آیت ۲۲ و
۲۔ سلاطین باب ۴ آیت ۳۵) مگر گناہ کا معاف کر دینا
یہ ناممکن تھا اور اس کے لئے بیٹے کے کفارہ کی
ضرورت تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا انجیل اِس
عقیدہ کی تصدیق کرتی ہے۔

انجیل میں لکھا ہے کہ لوگ ایک مفلوج کو
چارپائی پر پڑا ہوا مسیح کے پاس لائے۔ مسیح نے اُسے
دیکھا اور کہا

"بیٹا خاطر جمع رکھ تیرے گناہ معاف ہوئے"
(متی باب ۹ آیت ۲)

اس پر لوگ حیران ہو گئے کہ کیا یہ گناہ معاف کرتا
ہے۔ یہی بات آج کل مسیحیت کہتی ہے کہ انسان گناہ کس
طرح معاف کر سکتا ہے۔ لیکن انجیل میں لکھا ہے کہ

"یسوع نے اُن کے خیال معلوم کر کے کہا کہ تم
کیوں اپنے دلوں میں بُرے خیال لاتے ہو۔
آسان کیا ہے یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف
ہوئے یا یہ کہنا کہ اُٹھ اور چل پھر"

یعنی اِن دونوں میں سے کونسی آسان بات ہے۔ ایک
مفلوج کو یہ کہہ دینا کہ اُٹھ اور چل پھر یہ آسان ہے
یا ایک گنہگار کو یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے
یہ آسان ہے۔ مسیحیت کی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے
یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُٹھ اور چل پھر کہنا زیادہ آسان
ہے اور یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے ناممکن
ہے۔ لیکن حضرت مسیح کے متعلق انجیل بتاتی ہے کہ انہوں
نے کہا:۔

"اِس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر
گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے (اُس نے
مفلوج سے کہا) اُٹھ اپنی چارپائی اُٹھا اور
اپنے گھر چلا جا۔ وہ اُٹھ کر اپنے گھر چلا گیا
لوگ یہ دیکھ کر ڈر گئے اور خدا کی تمجید
کرنے لگے جس نے آدمیوں کو ایسا
اختیار بخشا" (متی باب ۹ آیت ۱ تا ۸)

گویا پہلے حضرت مسیح کے گناہ معاف کرنے کے فقرہ پر لوگ حیران
ہوئے کہ کیا آدم زاد بھی لوگوں کے گناہ معاف کر سکتا
ہے۔ مسیح نے کہا اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو
زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے میں اِس
مفلوج سے یہ کہتا ہوں کہ اُٹھ۔ اپنی چارپائی اُٹھا اور
اپنے گھر چلا جا۔ اِس پر وہ اور حیران ہوتے اور
اُس خدا کی تمجید کرنے لگے جس نے آدمیوں کو ایسا
اختیار بخشا ہے۔ یہ واقعہ جو انجیل میں آتا ہے بتاتا
ہے کہ گناہ معاف کرنا اور کسی بیمار سے یہ کہنا کہ اُٹھ
اور اپنے گھر چلا جا یہ معجزہ آدمیوں کا ہے خدا کا نہیں

اِسی طرح یوحنا باب ۸ آیت ۱ تا ۱۱ میں ایک
زانیہ عورت کا قصہ درج ہے جس میں بتایا گیا ہے۔ کہ
اُس عورت کو مسیح نے معاف کر دیا۔ حالانکہ وہ مسیح یا
اس کے کفارہ پر ایمان نہیں لائی تھی۔

باقی رہا یہ امر کہ اگر خدا کے بیٹے کے ذریعہ ہی
گناہ معاف ہو سکتا ہے تو کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا؟
اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کچھ
نہیں کہ مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا لیکن سوال
یہ ہے کہ کیا مسیح میں خدائی صفات بھی پائی جاتی تھیں؟
مثلاً ہم جب کہتے ہیں کہ خدا ہے تو اس کی ہستی کے
دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور وہ مختلف قوتیں اور
طاقتیں جو انسان میں نہیں پائی جاتیں اس کی ہستی
کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن مسیحی کوئی
ایسی چیز پیش نہیں کرتے جو اور نبیوں میں تو

نہ پائی جاتی ہو اور مسیحؑ میں پائی جاتی ہو۔ بلکہ بہت سی باتیں بائبل میں نبیوں کے متعلق ایسی پائی جاتی ہیں جو مسیحؑ میں نہیں پائی جاتیں۔ مگر یہ ایک الگ بحث ہے سوال یہ ہے کہ مسیحیت کی ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اور چونکہ اُس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اس لئے خدا کا بیٹا ہوگیا۔ ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا بیٹا کوئی اصطلاح ہے یا یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں عام طور پر یہ لفظ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ زید کا بیٹا یا عمرو کا بیٹا یا خالد کا بیٹا۔ یا اس کے کوئی اور معنے ہیں۔

جہاں تک اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنے کا تعلق ہے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اُس میں حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ

"ہاں اے باپ کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا۔ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے۔ اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اُس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے۔" (متی باب ۱۱ آیت ۲۶-۲۷)

یہاں مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے۔ جہاں تک لفظوں کا تعلق ہے ہم مانتے ہیں کہ خدا کے بیٹے کے الفاظ انجیل میں مسیح کے متعلق آئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسیح کو بیٹا کہنے کے وہی معنے ہیں جو جسمانی بیٹے کے ہوتے ہیں یا اس کے کچھ اَور معنے ہیں۔

اسی طرح یوحنا باب ۳ آیت ۱۷ میں آتا ہے:-

"خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اُس کے وسیلہ سے نجات پائے"

یہاں مسیحؑ نے پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی بات کہی ہے جو انجیل کے ایک دوسرے حوالہ کے خلاف ہے۔ یہاں وہ کہتے ہیں "خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اُس کے وسیلہ سے نجات پائے" لیکن دوسری جگہ لوقا باب ۲۰ آیت ۹ تا ۱۶ میں حضرت مسیحؑ ایک تمثیل بیان کرتے ہیں جو باغ کی تمثیل کہلاتی ہے۔ اُس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے باغ لگایا اور اُسے کرایہ پر دیدیا جن لوگوں کو وہ باغ کرایہ پر دیا گیا تھا اُن کے پاس باغ کے مالک نے اپنا ایک نوکر بھیجا تاکہ وہ پھل کا حصہ دے دیں۔ لیکن باغبانوں نے اُسے مارا اور خالی ہاتھ واپس کر دیا۔ پھر اُس نے ایک دوسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اُس کو بھی پیٹ کر نکال دیا پھر اُس نے ایک تیسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اُس کو بھی مارا اور زخمی کر کے نکال دیا۔ . . . . . .

. . . .

اس پر باغ کے مالک نے کہا اب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیجتا ہوں شاید باغبان اس کا لحاظ کریں اور باغ کا پھل اُسے دے دیں۔ لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا باغبانوں کے پاس آیا تو انہوں نے آپس میں مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آؤ ہم اسے قتل کر دیں تاکہ یہ باغ ہماری میراث ہو جائے اور پھر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہ رہے چنانچہ انہوں نے بیٹے کو باغ کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا۔ حضرت مسیحؑ یہ تمثیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں تم جانتے ہو پھر کیا ہو گا۔ پھر یہی بات رہ جائے گی کہ باغ کا مالک آپ آئے گا اور وہ ان مالیوں کو نکال دیگا۔ اور باغ کو کسی اور قوم کے سپرد کر دے گا۔

یہ تمثیل صاف بتاتی ہے کہ بیٹے کا آنا سزا کیلئے ہوگا چونکہ وہ لوگ باغ کا مالیانہ ادا نہیں کرتے تھے اِس لئے خدا اپنے بیٹے کو بھیجے گا تاکہ اُن پر حجت تمام کر کے انہیں سزا دے۔ پس یہ تمثیل مسیحؑ کے اس قول کے بالکل خلاف ہے کہ "خدا نے بیٹے کو دنیا میں اِس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اِس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے۔"

پھر متی میں لکھا ہے کہ مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ :۔

"تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انکو
باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے
بپتسمہ دو۔" (متی باب ۲۸ آیت ۱۹)

اس کے علاوہ بھی بعض جگہوں پر حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا تعالے کا بیٹا کہا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھلانا چاہیئے کہ جہاں حضرت مسیحؑ نے بعض جگہ اپنے آپ کو بیٹا بلکہ اکلوتا بیٹا کہا ہے وہاں اکثر مقامات پر اپنے آپ کو ابن آدم بھی کہا ہے۔ پس ہمارا کیا حق ہے کہ ہم اُن کے ایک دعویٰ کو دوسرے دعوے پر فوقیت دیں۔ مسیحؑ ہی کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور مسیحؑ ہی کہتا ہے کہ میں ابن آدم ہوں۔ اور جب دونوں دعوے ایک شخص کے ہیں تو اُن میں سے کسی ایک دعویٰ کو دوسرے دعویٰ پر فوقیت دے دینا ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یا تو دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن اللہ والی بات غلط ہے اور یا دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن آدم والی بات غلط ہے۔ بہرحال جب ایک شخص دونوں باتیں کہتا ہے تو محض اپنی عقل سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں بات سچی ہے اور فلاں بات غلط۔ انجیل میں لکھا ہے :۔

"ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ
اس لئے کہ خدمت کرے۔" (متی باب ۲۰ آیت ۲۸)

(مثیل مسیحؑ یعنی بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی یہی کہا ہے ؎
"منہ از بہر ما کرسی کہ ماموریم خدمت را"
یعنی میرے لئے کرسی نہ رکھو کہ مجھے خدا نے دنیا کی خدمت کے لئے مامور کیا ہے) چونکہ دنیا میں عام طور پر لوگ غرباء سے کام لیتے ہیں اور اُن پر کئی قسم کے مظالم کرتے ہیں۔ اس لئے مسیح نے کہا۔ کہ ابنِ آدم اس لئے نہیں آیا کہ وہ خدمت لے بلکہ اس لئے آیا ہے کہ خدمت کرے۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال ہے یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے کہ انسان کو ظلم نہیں کرنا چاہیئے اور دوسروں کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے لیکن جہاں تک یہ سوال ہے کہ مسیحؑ کیا تھا؟ اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسیحؑ آدم کا بیٹا تھا۔

پھر لکھا ہے

"جیسا نوح کے دنوں میں ہُوا ویسا ہی
ابنِ آدم کے آنے کے وقت ہوگا۔"
(متی باب ۲۴ آیت ۳۸)

اسی طرح اِسی باب کی چوالیسویں آیت میں لکھا ہے

"جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا ابنِ آدم
آ جائے گا۔"

یعنی مسیح کی پہلی آمد بھی ابن آدم کی حیثیت میں تھی اور جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم کی حیثیت میں ہی آئے گا۔ مگر وہ ایسا اچانک آئیگا کہ لوگوں کو اُس کی آمد کا گمان بھی نہ ہوگا۔ یعنی جس طرح خدا تعالیٰ کے انبیاء آتے ہیں اور لوگ اُن کی آمد کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے انہیں جھوٹا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اِسی طرح مسیحؑ کے ساتھ ہوگا۔

پھر لکھا ہے:۔

" فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو بلکہ اس خوراک
کے لئے جو ہمیشہ کی زندگی تک باقی رہتی ہے
جسے ابنِ آدم تمہیں دے گا" (یوحنا باب ۶ آیت ۲۷)

یعنی لوگ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں روٹی کپڑا ملے لیکن تمہیں ان چیزوں کے لئے کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ اس خوراک کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے جو حقیقی زندگی بخشتی ہے اور جو ابن آدم یعنی مسیح سے حاصل ہوتی ہے۔ باقی چیزیں تو سب فانی اور عارضی فائدہ پہنچانے والی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس تعلیم کے باوجود سب سے زیادہ حضرت مسیحؑ کی اُمت نے ہی دنیا کمانے کی طرف توجہ کی ہے اور سب سے زیادہ انہوں نے ہی روحانیت کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔

پھر لکھا ہے مسیحؑ نے کہا

" اے یہوداہ کیا تُو بوسہ لے کر ابن آدم کو
پکڑواتا ہے" (لوقا باب ۲۲ آیت ۴۸)

یہوداہ حضرت مسیح کا ایک شاگرد تھا جس نے تیس روپوں کے بدلے انہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ مسیحؑ اُن دنوں چھپے پھرتے تھے اور وہ اور اُن کے شاگرد ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے اور مُنہ کو بھی ڈھانک کر رکھتے تھے۔ تاکہ حضرت مسیح کا ان کو پتہ نہ چل جائے۔ (یوحنا باب ۱۲ آیت ۹) دشمن بھی آپ کی تلاش میں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ہمیں پتہ لگ جائے کہ ان میں سے مسیحؑ کونسا ہے۔ آخر انہوں نے تیس روپے رشوت دے کر حضرت مسیحؑ کے ایک شاگرد کو جس کا نام یہوداہ تھا اپنے ساتھ ملا لیا اور اُس نے کہا تم میرے ساتھ چلو۔ جہاں سب اکٹھے بیٹھے ہوتے ہوں گے۔ وہاں آگے بڑھ کر میں جس شخص کا بوسہ لوں تم سمجھ جانا کہ وہی مسیح ہے اور اُسے گرفتار کر لینا۔ ادھر حضرت مسیح کو اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت الہام کے ذریعہ بتا دیا تھا کہ تمہارا فلاں شاگرد اس طرح غداری کرے گا۔ چنانچہ جب یہوداہ دشمن کے سپاہی لے کر وہاں پہنچا اور وہ آپ کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا تو حضرت مسیح نے کہا۔" اے یہوداہ کیا تُو بوسہ لے کر ابنِ آدم کو پکڑواتا ہے۔ (لوقا باب ۲۲ آیت ۴۸)

گویا مسیحؑ جب آیا تب بھی ابن آدم تھا جب دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم ہوگا اور جب صلیب پر لٹکایا گیا تب بھی وہ اپنے قول کے مطابق ابن آدم ہی تھا

پس جب مسیحؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہتا ہے تو خدا تعالیٰ کے بیٹے کے ایسے معنے کرنے جو تورات اور انجیل کی تعلیم کے خلاف ہوں کس طرح جائز ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں یا تو ہم یہ کہیں گے کہ حضرت مسیح نعوذ باللہ فاترالعقل لوگوں کی طرح کبھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیتے تھے اور کبھی ابن آدم کہنے لگ جاتے تھے اور یا پھر ہمیں اس کا کوئی حل نکالنا پڑے گا اور ان میں سے ایک کو استعارہ اور دوسرے کو اصل قرار دینا پڑے گا۔ اگر ہمیں پتہ لگ جائے کہ استعارہ کونسا ہے اور اصل کونسا تو ہم بڑی آسانی سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ابن آدم استعارہ ہو تو پھر ابن اللہ کو اصل ماننا پڑے گا اور اگر ابن اللہ استعارہ نکل آئے تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی پر جو کفارہ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ساری کی ساری غلط ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اُس میں مسیحؑ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ:۔

" مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ

خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔" (متی باب ۵ آیت ۹)
یہاں حضرت مسیح اپنے سوا دوسرے انسانوں کو بھی
خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ خدا
کا بیٹا کہلانا انسان کو خدا نہیں بنا دیتا۔ اگر کسی شخص
کو خدا کا بیٹا ماننے سے اُس میں خدائی تسلیم کرنی پڑتی
ہے تو پھر وہ تمام لوگ جو صلح کراتے ہیں اس حوالہ کے
مطابق خدائی کے دعویدار بن سکتے ہیں اور وہ تمام
کے تمام اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ کفارہ
دے سکیں۔ لیکن اس حوالہ سے صرف یہی نہیں نکلتا کہ
حضرت مسیح کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے
ہیں اور اس طرح جو حق مسیح کا سمجھا گیا تھا کہ وہ لوگوں
کے لئے کفارہ ہو سکتا ہے باطل ہو جاتا ہے بلکہ اس
سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے حضرت مسیح اس حوالہ میں
یہ کہتے ہیں کہ

" مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ
خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اس جگہ لوگوں کو صرف خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا گیا بلکہ
وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ کیوں خدا کے بیٹے کہلائیں گے
اگر خالی خدا تعالیٰ کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے
جاتے تو یہ پتہ نہیں لگ سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ کے
بیٹے کہلانے کی وجہ کیا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ ہم کوئی وجہ
پیش کرتے اور دوسرا کہہ دیتا کہ ممکن ہے کوئی
اور وجہ ہو۔ لیکن حضرت مسیح نے یہاں وجہ بھی بتائی ہے
کہ کیوں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے
ہیں اور وہ وجہ صلح کرانا بتائی گئی ہے۔ آپ فرماتے
ہیں مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا
کے بیٹے کہلائیں گے۔ گویا صلح کو خدا تعالیٰ کا بیٹا
کہلانے کی شرط رکھا ہے اور بتایا ہے کہ جو صلح
کرواتا ہے وہ بڑا مبارک ہے کیونکہ صلح کرانے سے انسان
خدا تعالیٰ کا بیٹا بن جاتا ہے۔ اس حوالہ سے صرف
یہی نہیں نکلتا کہ مسیح کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ
کے بیٹے ہیں بلکہ ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے
کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے نہیں۔ اگر انہیں بیٹا کہا
گیا ہے تو پھر کسی چھوٹی وجہ سے کہا گیا ہے یہ وجہ
اُن میں موجود نہ تھی۔ کیونکہ حضرت مسیح خود کہتے ہیں کہ

" یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔
صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔"
(متی باب ۱۰ آیت ۳۴)

گویا متی کا ایک حوالہ تو یہ بتاتا ہے کہ صلح کرانے کی وجہ
سے انسان کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلانے کا حق ہوتا
ہے اور دوسرا حوالہ یہ بتاتا ہے کہ یہ وجہ مسیح میں نہیں
تھی اس لئے مسیح خدا کا بیٹا نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح ایک اور حوالہ ہے جس میں دوسرے انسانوں
کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اور حضرت مسیح خود یہ
بتاتے ہیں کہ میرا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا
یہ معنے نہیں رکھتا کہ میں واقعہ میں خدا یا خدا کا بیٹا ہوں
یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۳۹ میں لکھا ہے حضرت مسیح
نے یہود سے کہا: ۔

" جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں
وہی میرے گواہ ہیں (یعنی میری سچائی معلوم
کرنے کے لئے تمہیں باہر سے کسی شہادت
کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ۔ جو کام
خدا تعالیٰ نے مجھ سے کروائے ہیں وہ اپنی
ذات میں اس بات کی شہادت دے رہے
ہیں کہ میں سچا اور راستباز انسان ہوں) لیکن
تم اس لئے یقین نہیں کرتے کہ میری بھیڑوں
میں سے نہیں ہو (یعنی چونکہ تم میری جماعت
سے نہیں اس لئے تم میرے مخالف ہو) میری

بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں (یعنی جو لوگ میری جماعت میں سے ہیں وہ میری آواز کو سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں) اور میں انہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں اور مَیں انہیں ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہوں اور وہ ابد تک کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہ لے گا۔ میرا باپ جس نے مجھے وہ دی ہیں سب سے بڑا ہے اور کوئی انہیں باپ کے ہاتھ سے نہیں چھین سکتا۔ مَیں اور باپ ایک ہیں۔ (جب حضرت مسیح نے یہودیوں سے یہ بات کہی تو چونکہ آخری فقرہ یہ تھا کہ کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہیں سکتا اور پھر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ میں اور باپ ایک ہیں اور باپ سے مراد خدا تھا تو اس کے معنے یہ بن گئے کہ مَیں اور خدا ایک ہیں۔ اس سے یہودیوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص خدا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے اس فقرہ پر) یہودیوں نے اُسے سنگسار کرنے کے لئے پھر پتھر اُٹھائے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھلائے ہیں۔ اُن میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگسار کرتے ہو (یعنی مسیحؑ نے اُن سے کہا کہ میں لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو حلم اور عفو کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو محبت الٰہی اور خدا ترسی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو مَیں بنی نوع انسان کی خود بھی خدمت کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی خدمت کرنے کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو جو کام خدا تعالیٰ نے میرے سپرد کئے ہیں۔ اُن میں سے بہتیرے کام مَیں نے کئے ہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرا کونسا جرم ہے جس کی وجہ سے تم مجھے سنگسار کرنا چاہتے ہو؟) یہودیوں نے اُسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں۔ بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں (یعنی خدمت خلق اور غریبوں سے اچھا سلوک اور حلم اور عفو کی تعلیم اور رحم دلی یہ چیزیں نہیں جن کی وجہ سے ہم تجھے سنگسار کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہمارے سنگسار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تُو نے اپنی زبان سے کفر کا کلمہ نکالا ہے) اور اس لئے کہ تُو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے (یعنی تُو نے انسان ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا ہوں۔ اس لئے ہم تجھے سنگسار کریں گے) یسوع نے انہیں جواب دیا۔ کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو (یعنی کیا بائبل میں یہ بات درج نہیں کہ خدا نے اپنے بندوں کو خدا کہا ہے؟) جبکہ اُس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا اور **کتاب مقدس کا باطل ہونا** ممکن نہیں۔ آیا تم اُس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تُو کفر بکتا ہے۔ اس لئے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں؟ (حضرت مسیحؑ کہتے ہیں تمہارے لئے بائبل میں خدا کا لفظ بولا گیا ہے مگر تم خدا نہیں ہو گئے نہ تم اس لفظ کی وجہ سے کافر بن گئے لیکن میرے لئے صرف

بیٹے کا لفظ بولا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں کافر ہوں۔ جب مجھ سے پہلے لوگوں کے لئے خدا کا لفظ استعمال ہوا اور وہ کافر نہ ہوئے بلکہ یہ سمجھا گیا کہ یہ ایک استعارہ ہے جو استعمال کیا گیا ہے تو میرے لئے بیٹے کے لفظ کا استعمال کونسا قہر ہو گیا کہ تم نے مجھے کافر قرار دے دیا۔ یہاں حضرت مسیح نے صاف طور پر اقرار کیا ہے کہ بائبل میں جو اُن کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ بیٹے کے معنوں میں نہیں کیونکہ دوسروں کی نسبت خدا کا لفظ آیا ہے۔ مگر تم یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ واقعہ میں خدا بن گئے تھے۔ جب تم اُنہیں مشرک نہیں کہتے۔ جب تم اس لفظ کے باوجود اُنہیں خدائی کا دعویٰ کرنے والے قرار نہیں دیتے تو مجھے کیوں کہتے ہو کہ میں نے یہ لفظ استعمال کر کے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے اور اس وجہ سے میں کافر اور سنگسار کئے جانے کے قابل ہوں۔ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو (یعنی لفظی ہیر پھیر اور شرارتوں سے کام لینے کا کیا فائدہ؟ سوال یہ ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ خدا تعالےٰ کی توحید اور اس کے جلال کے اظہار کیلئے کرتا ہوں یا اس کے خلاف کرتا ہوں موحدوں والے کرتا ہوں یا مشرکوں والے کرتا ہوں۔ اگر میں تمام کام موحدوں والے کرتا ہوں تو الہام میں اگر میرے متعلق خدا تعالیٰ نے بیٹے کا لفظ استعمال کیا ہے تو بہر حال اس کے کچھ اور معنے کرنے پڑیں گے۔ اور ضروری ہوگا کہ استعارہ میں کسی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل میرے کاموں کو دیکھا جائے) لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر اُن کاموں کا تو یقین کرو تاکہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں۔ انہوں نے پھر اُسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔" (یوحنا باب آیت ۲۵ تا ۳۹)

اس حوالہ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیح نے خود اپنے بیٹا ہونے کے معنے کر دئے ہیں اور بتایا ہے کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ واقعہ میں خدا کی خدائی مجھ میں آگئی ہے یا میں بھی ایک خدا ہوں۔ بلکہ جس طرح بائبل میں دوسرے لوگوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ خدا ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خدا نہیں بن گئے۔ بلکہ یہ ایک استعارہ تھا جو استعمال ہوا۔ اسی طرح جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو یہ بھی ایک استعارہ ہوتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ میں واقعہ میں خدا بن گیا ہوں۔

اس حوالہ میں یہود کی شریعت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے وہ ہمیں زبور میں ملتا ہے۔ زبور باب ۸۲ میں آتا ہے

"خدا کی جماعت میں خدا موجود ہے۔ وہ الٰہوں کے درمیان عدالت کرتا ہے (یعنی مومن لوگ خدا ہیں اور اُن خداؤں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے) تم کب تک بے انصافی سے عدالت کرو گے اور شریروں کی طرفداری کرو گے۔ غریب اور یتیم کا انصاف کرو۔ غمزدہ اور مفلس کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ۔ غریب اور محتاج کو بچاؤ۔ شریروں کے ہاتھ سے اُن کو چھڑاؤ۔ وہ نہ تو کچھ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں وہ اندھیرے میں اِدھر اُدھر

چلتے ہیں زمین کی سب بنیادیں ہل گئی ہیں۔
میں نے کہا تھا کہ تم الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ
کے فرزند ہو تو بھی تم آدمیوں کی طرح مروگے
اور امراء میں سے کسی کی طرح گر جاؤ گے۔ اے
خدا اُٹھ زمین کی عدالت کر۔ کیونکہ تو ہی سب
قوموں کا مالک ہو گا۔"

حضرت داؤدؑ کے انہی کلمات کی طرف حضرت مسیحؑ
اوپر کے حوالہ میں اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ
آیت ہے کہ

" وہ الٰہوں کے درمیان عدالت کرتا ہے"

اور پھر آیت ۶ اور ۷ تو بالکل واضح ہیں یعنی یہ کہ

" میں نے کہا تھا کہ تم الٰہ ہو اور تم سب
حق تعالیٰ کے فرزند ہو"

اس جگہ حضرت داؤدؑ یہ کہتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل تم
سب الٰہ ہو۔ تم سب خدا ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے
فرزند ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس طرف بھی
توجہ دلائی کہ باوجود اس کے کہ میں نے تمہیں خدا کہا
ہے اور خدا کا بیٹا بھی کہا ہے تمہیں یاد رکھنا چاہیئے
کہ چونکہ تم نہ اصلی خدا ہو اور نہ اصل میں خدا کے بیٹے
ہو۔ اس لئے تم آدمیوں کی طرح مروگے۔ یعنی خدا تو
مرتا نہیں لیکن تم موت سے نہیں بچو گے۔ تمہیں خدا
اور خدا کا بیٹا اس لئے کہا گیا ہے کہ تم دنیا میں خدا کی
طرح انصاف قائم کروگے۔ اور خدا تعالیٰ کے قوانین
لوگوں میں جاری کروگے۔ پس چونکہ تم دنیا میں خدا
کے مظہر ہوگے اس لئے استعارۃً تمہیں کبھی خدا اور
خدا کا بیٹا کہہ دیا گیا ہے۔

بعض لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء
کے دلی خیالات کا نام ہی الہام ہوتا ہے وہ اس کتاب
کو داؤد کی زبور کہتے ہیں۔ لیکن ہم قرآن کریم کی تعلیم کے
مطابق اُسے خدا تعالیٰ کا الہام سمجھتے ہیں اور ہمارے
نقطۂ نگاہ سے حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے
یہ بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔
لیکن آگے تشریح کر دی گئی ہے کہ اس کے یہ معنے نہیں
کہ یہ واقعہ میں خدا یا خدا کے بیٹے بن جائیں گے۔ بلکہ
خدا اور خدا کے بیٹے کہلانے کے باوجود یہ مریں گے بھی۔
یہ کھائیں گے بھی۔ یہ پہنیں گے بھی۔ صرف اس لئے
اُن کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے کہ یہ دنیا میں
انصاف قائم کریں گے اور خدا تعالیٰ کے احکام پر
لوگوں کو چلائیں گے۔ حضرت داؤدؑ بنی اسرائیل کو
توجہ دلاتے ہیں کہ خدا نے تم کو اپنا نام دیا ہے۔ خدا
نے تم کو اپنا بیٹا قرار دیا ہے۔ تم کو بھی چاہیئے کہ
اس نام کی وجہ سے اپنے کردار کا جائزہ لو۔ غریبوں
سے انصاف کرو۔ کمزوروں کو اُٹھاؤ۔ ستم رسیدوں
پر رحم کرو۔ عفو اور درگذر سے کام لو اور خدائی صفات
اپنے اندر پیدا کرو۔

اِن حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت
مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا تو ان معنوں میں
نہیں کہا تھا کہ سچ مچ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا سمجھتا تھا
کیونکہ اپنے قول کے مطابق وہ اپنے آپ کو اُسی طرح
خدا تعالیٰ کا بیٹا سمجھتا تھا جس طرح داؤد نے
بنی اسرائیل کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اسی طرح
بائبل میں اور کئی مقامات پر مختلف لوگوں کے متعلق
خدا یا خدا کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں
پس جن معنوں میں وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے انہی
معنوں میں حضرت مسیحؑ نے بھی اپنے آپکو خدا کا بیٹا کہا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام طور پر یہ دھوکا دیا
جاتا ہے کہ حضرت مسیح کو خدا یا خدا کا بیٹا اور معنوں
میں کہا گیا ہے۔ لیکن یوحنا کا حوالہ صاف بتاتا ہے۔

کہ وہ اپنے آپ کو انہی معنوں میں خدا کا بیٹا کہتا تھا جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا تھا۔ اگر اور معنے ہوتے تو حضرت مسیح کی دلیل باطل ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو بے شک خدا کا بیٹا کہا ہے لیکن بیٹا کہنے سے میں خدائی کا مدعی نہیں بن جاتا۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو بھی خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسیح کا دعویٰ اور قسم کا تھا تو یہ دلیل باطل ہو جاتی ہے یہودی کہہ سکتے تھے کہ پہلے لوگوں کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے مگر تم اپنے آپ کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ مگر مسیح کا اس حوالہ کو پیش کرنا صاف بتاتا ہے کہ مسیح اِسبات کا اقرار کرتا ہے کہ جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے انہی معنوں میں میں بھی خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی ہوں۔ اور جب مسیح انہی معنوں میں خدا کے بیٹے ہوئے جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے تھے تو کفارہ دینے کا حق جیسے مسیح کو حاصل تھا ویسے ہی تمام اسرائیلی نبیوں کو اور اُن کے مخلص مومنوں کو حاصل تھا۔ اور اگر ان کو یہ حق حاصل نہیں تھا تو مسیح کو بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کفارہ کی بنیاد مسیح کے ابن اللہ ہونے پر ہے اور میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ مسیح بیٹا کہلانے میں منفرد نہیں بلکہ سینکڑوں انبیاء اور ہزاروں لاکھوں مومنوں کو بھی بائبل میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔

یہاں تک تو اِسبات کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسیح کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی تھا اور اسی لئے وہ کفارہ ہوا یہ بائبل کی رُو سے درست نہیں۔ بے شک وہ بیٹا ہونے کا مدعی تھا مگر انہی معنوں میں جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے کہلاتے اور پھر وہ اسکے ساتھ ہی ابن آدم ہونے کا بھی مدعی تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسیح کا ابن آدم ہونا اصل حقیقت تھی یا اس کا ابن اللہ ہونا اصل حقیقت ہے۔ اور اس کے لئے ہم پھر اُس کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

میں نے بتایا ہے کہ مسیح نے یہ تسلیم کیا ہے۔ کہ مَیں اُنہی معنوں میں خدا کا بیٹا ہوں جن معنوں میں بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ اور جب مسیح کے اپنے قول سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ تو معلوم ہُوا کہ اگر مسیح کو کفارے کا حق حاصل تھا تو ان کو بھی حاصل تھا اور اگر اُن کو حاصل نہیں تھا تو مسیح کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اب ہم ایک اَور طرح اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ دنیا میں جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو اُس کا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا استعارۃً بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعہ میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے رہا ہو۔ اور چونکہ یہ دونوں امکان موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ کے لئے ہمیں بہرحال کوئی نہ کوئی رستہ نکالنا پڑے گا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ کسی شخص کے متعلق ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیر ہے اور کسی کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ باز ہے۔ لیکن ہم اصلی شیر کو بھی شیر ہی کہتے ہیں۔ ہم اپنے بچہ کو چڑیا گھر لے جاتے ہیں تو ایک جانور جو پنجرہ میں بند ہوتا ہے اُس کی طرف اشارہ کر کے ہم کہتے ہیں یہ شیر ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے اگر کوئی بڑا بہادر اور دلیر انسان بیٹھا ہو تو اس کے متعلق بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بچہ کس طرح پہچانتا ہے کہ وہ شیر اَور ہے اور یہ شیر اَور ہے؟ بہرحال کوئی پہچان ہونی چاہیئے جو اس فرق کو

واضح کر سکے اور وہ پہچان اسی طرح ہوتی ہے کہ بچہ نے جو نیچرل ہسٹری کی کتابیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اُن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ شیر کے پنجے ہوتے ہیں دم ہوتی ہے۔ مُنہ اس طرح ہوتا ہے شکل اس طرح ہوتی ہے پس جب ہم کسی انسان کو شیر کہہ دیتے ہیں اور بچہ دیکھتا ہے کہ اس کی دُم نہیں۔ اس کے پنجے نہیں اس کی شکل آدمیوں کی سی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اسے شیر استعارہ کے طور پر کہا گیا ہے اور جب ہم چڑیا گھر کے شیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ وہی شیر ہے جس کی کتابوں میں تصویریں آتی ہیں۔ اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص خدا کا بیٹا تھا اور ہم استعارۃً کلام کرتے ہیں ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ حقیقتاً خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے تو اُس وقت ہمارا سامع یہ کس طرح فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کو ہم نے جو خدا یا خدا کا بیٹا کہا ہے تو ہماری مراد استعارہ ہے حقیقت نہیں۔ اس کے لئے بہر حال کوئی نہ کوئی معیار ہونا چاہیئے تاکہ لوگوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (الفتح ع۱) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری بیعت نہیں کرتے بلکہ خدا کی بیعت کرتے ہیں یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ اُن کے ہاتھوں پر اللہ تعالےٰ کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہاتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تھا خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا تھا اب اس آیت کے باوجود ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نہیں مانتے۔ کیوں نہیں مانتے؟ اسلئے کہ قرآن کریم نے بعض اور مقامات پر خدا تعالےٰ کی جو خصوصیات

بیان کی ہیں وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کھاتا پیتا نہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کھاتے پیتے تھے اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ خدا تعالےٰ کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اونگھ بھی آتی تھی اور نیند بھی آتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ خدا تعالےٰ کو بیوی کی ضرورت نہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں۔ گویا وہ باتیں جو خدا میں نہیں ہوتیں وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھیں اور وہ باتیں جو خدا میں ہوتی ہیں وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ پس جب خدا نے کہا اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ تو ہم نے سمجھ لیا کہ یہ استعارہ ہے۔ یہ مراد نہیں کہ آپ واقعہ میں خدا بن گئے تھے چنانچہ ہمارا عقیدہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی ہے کہ آپ بشر تھے سوائے بعض جہلاء کے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر قرار نہیں دیتے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا ایک دوست مجھ سے ملنے کے لئے آئے وہ اَن پڑھ تھے مگر قرآن کریم کی آیتیں بہت صاف پڑھتے تھے۔ میں نے اُن سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ جس دوست کے ذریعہ مجھے احمدیت میں داخل ہونے کی توفیق ملی ہے وہ قرآن کریم نہایت اچھا پڑھتے تھے اُن کے پاس رہنے کی وجہ سے میری زبان بھی صاف ہوگئی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میں ایک دفعہ اپنے بعض رشتہ داروں کے پاس گیا اور انہیں میں نے کہا کہ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (حٰم سجدہ ع۱)

...ں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگے دیکھو میاں یہ اچھی طرح سُن لو۔ تم ہمارے رشتہ دار ہو۔ اس لئے ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم تمہیں ماریں لیکن اب تم چپ کرکے یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ یہ بات ہم نے کبھی نہیں سُنی تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی آدمی ہیں۔ آج تم نے یہ بات بھی کہہ دی ...و بعض جہلاء اس قسم کے بھی ہیں لیکن مسلمانوں کا ...محدار طبقہ ہمیشہ سے یہی تسلیم کرتا چلا آیا ہے کہ ...مد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم گو تمام انسانوں ...ے سردار ہیں۔ تمام نبیوں کے سردار ہیں اور ...للہ تعالے کے محبوب اور پیارے ہیں لیکن بہرحال ...نسان ہیں۔ پس مسیح جب کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ...ں تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ باتیں جو خدا تعالیٰ ...طرف منسوب کی جاتی ہیں کیا وہ اُن کا مدعی ہے؟ جہاں تک کھانے پینے کا سوال ہے عیسائی ...کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسیحؑ انسانی بھیس میں آیا تھا ...س لئے وہ کھاتا پیتا تھا۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے ...یکن کم از کم جو روحانی باتیں ہیں وہ تو خدا میں رہینگی ...۔ تو نہیں کہ خدا اس دنیا میں آکر وہ کمالات بھی ...معول جائے گا جو خدا ہونے کی حیثیت سے اُس میں ...ئے جانے چاہئیں۔ مرقس باب ۱۰ آیت ۱۷-۱۸ ...ں لکھا ہے :-

"اور جب وہ باہر نکل کر راہ میں جا رہا تھا تو ایک شخص دوڑتا ہُوا اُس کے پاس آیا اور اُس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اُس سے پوچھنے لگا کہ اے نیک اُستاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ یسوع نے اُس سے کہا تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

پہلی صفت خدا تعالیٰ کی اس کا نیک ہونا ہے کیونکہ عیب دار خدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پہلی ہی صفت جو خدا میں پائی جانی ضروری ہے مسیح اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

میں اس جگہ دوستوں کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات سُن کر عیسائیوں نے اب بعض مقامات سے بائبل کو بدل ڈالا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کو متی میں اب اس طرح درج کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اُسے یہ جواب دیا کہ "تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے۔" (متی باب ۱۹ آیت ۱۷)

حالانکہ انگریزی بائبلیں جو انگلستان میں چھپی ہوئی ہیں اور بائبل کے وہ اُردو ایڈیشن جو ۱۹۱۰ء سے پہلے کے ہیں۔ اُن سب میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اُسے یہ جواب دیا کہ "تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔" حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعتراض کیا کہ تم کہتے ہو کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا اس لئے وہ کفارہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ حوالہ صاف بتا رہا ہے کہ مسیح خدا نہیں تھا کیونکہ وہ تو اپنے نیک ہونے سے بھی انکار کر رہا ہے اور جب وہ خدا نہیں تھا تو کفارہ کس طرح ہُوا۔ گویا ایک طرف اس سے کفارہ باطل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے توحید ثابت ہوتی ہے۔ عیسائیوں کو اور تو کوئی جواب نہ سُوجھا۔ انہوں نے بائبل کے نئے اُردو ایڈیشنوں میں اُن الفاظ کی بجائے یہ الفاظ لکھ دئے کہ:-

"تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے۔"

گویا یہ ظاہر کیا کہ حضرت مسیحؑ نے اُسے یہ جواب دیا تھا کہ تُو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں سوال کر رہا ہے نیک تو صرف خدا ہے۔ حالانکہ تمام انگریزی بائبلوں میں اور تمام یونانی اور جرمن بائبلوں میں اور اُردو کی تمام پُرانی بائبلوں میں یہ الفاظ تھے کہ "تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" اس قسم کی سترہ اٹھارہ تبدیلیاں ہیں جو حضرت مسیح موعودؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات کے نتیجہ میں عیسائیوں نے بائبل میں کی ہیں۔ بہرحال کہنے والے نے یہی کہا کہ اے نیک استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ اور حضرت مسیحؑ نے اُسے کہا کہ "تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

اس حوالہ سے دو باتیں نکل آئیں۔ اوّل خدا میں نیکی ہے کیونکہ بغیر نیکی کے وہ خدا ہی نہیں ہو سکتا دوم مسیحؑ میں نیکی نہیں اور ان دو باتوں کا یہ لازمی نتیجہ نکل آیا کہ چونکہ مسیحؑ میں نیکی نہیں اس لئے وہ خدا نہیں۔

اسی طرح متی باب ۲۴ آیت ۳۲ تا ۳۷ میں لکھا ہے :-

" اب انجیر کے درخت سے ایک تمثیل سیکھو
جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی اور پتے نکلتے ہیں
تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح
جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ
نزدیک بلکہ دروازہ پر ہے (یعنی مسیحؑ کی
آمد ثانی) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک
یہ سب باتیں نہ ہو لیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی
آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری
باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی۔ لیکن اُس دن (یعنی
مسیح کی آمد ثانی کے دن) اور اس گھڑی کی بابت
کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ"

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسیح اپنے عالم الغیب ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت اس کا عالم الغیب ہونا بھی ہے پس جب مسیح کہتا ہے کہ میں علم غیب نہیں جانتا اور مستقبل کے حالات کا مجھے علم نہیں۔ تو دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو میں حقیقتاً نہیں کہتا بلکہ صرف استعارۃً کہتا ہوں۔ یعنی میری مراد صرف اتنی ہوتی ہے کہ میں خدا کا پیارا ہوں

اسی طرح انجیل میں خدائے واحد کے لفظ پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یوحنا باب ۵ آیت ۴۴ میں لکھا ہے۔

" تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو
اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے
ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو؟"

عیسائیت ہمارے سامنے تثلیث پیش کرتی ہے لیکن مسیح صاف طور پر خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو۔

اسی طرح یوحنا باب ۱۷ آیت ۳ میں لکھا ہے :-

" اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد
اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تُو نے
بھیجا ہے جانیں۔"

یہاں سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی۔ پہلا حوالہ جو یوحنا باب ۵ کا تھا اُس کا ایک بودہ سا جواب مسیحی دے سکتے تھے اور وہ یہ کہ جب ہم خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد اقنوم ثلاثہ ہوتی ہے جس میں خدا باپ بھی شامل ہے خدا بیٹا بھی شامل ہے اور خدا روح القدس بھی شامل ہے اور وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ " تین ایک ہیں اور ایک تین "

پس وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی تین کو ایک سمجھتے ہیں اور خدائے واحد سے مراد خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس کا مجموعہ ہے۔ اس جواب کو یوحنا کے اوپر کے حوالہ نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہاں مسیح کا ذکر خدائے واحد سے الگ کر کے کیا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:-

"اور ہمیشہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تُو نے بھیجا ہے جانیں۔"

پس جبکہ خدائے واحد کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس میں مسیح شامل نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مسیح سے علیحدہ ہو کر خدائے واحد بنتا ہے اس کے ساتھ شامل نہیں اور توحید اسی کا نام ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے نہ بیٹے کو نہ روح القدس کو اور نہ کسی اور کو۔

غرض اس حوالہ نے بھی بتا دیا کہ بیٹے کا لفظ ایک استعارہ تھا جو مسیح کے متعلق استعمال کیا گیا تھا اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ خدا کا شریک تھا بلکہ یہ ویسا ہی ایک پیار کا کلمہ تھا جیسے مائیں اپنے بیٹے کو کہتی ہیں کہ یہ میرا بیٹا میرے جگر کا ٹکڑا اور میرا دل ہے۔ جس طرح بندوں کو حق حاصل ہے کہ وہ پیار میں اس طرح کلام کریں اسی طرح خدا کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بندوں سے پیار اور محبت کی گفتگو کرے۔ دنیا میں بسا اوقات اپنے کسی عزیز یا دوست کے بچہ کو جب انسان دیکھتا ہے تو کہہ دیتا ہے تو میرا بچہ ہے۔ اب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ بعد میں ورثہ کا دعویٰ کر دے اور کہے فلاں فلاں اصحاب کے گواہ ہیں اس نے اُن کے سامنے مجھے اپنا بچہ قرار دیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں

اسی طرح مائیں اپنے بچوں کا ذکر کرتی ہیں تو کہتی ہیں۔ ہائے میرا کلیجہ۔ ہائے میرا دل۔ ہائے میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ وہ بچہ سچ مچ اُن کا کلیجہ یا دل یا آنکھیں ہوتا ہے یا عورت مر جائے تو ساتھ ہی بچے کو بھی دفن کر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بچہ تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو اس عورت کا کلیجہ یا دل تھا۔ کیا دنیا میں کبھی کسی نے ایسی حماقت کی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اِسی قسم کے الفاظ خدا تعالیٰ بھی اپنے پیاروں کے متعلق استعمال کر لیتا ہے اور بعض دفعہ ان کو اپنا بچہ کہہ دیتا ہے۔ جیسے اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا یا جیسے اُس نے اور کئی نبیوں کو کہا پس کسی کو بیٹا کہنے کے یہ معنے نہیں کہ اب خدائے واحد نہیں رہا یا نعوذ باللہ دو یا تین خدا ہو گئے ہیں۔

غرض یہ حوالہ بھی بتاتا ہے کہ مسیح کے نزدیک خدا اَور ہے اور وُہ اَور۔ چنانچہ خدائے واحد کے وجود کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور مسیح کا الگ ذکر کیا گیا ہے۔ اگر مسیح خدا ہوتا تو اُس کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خدائے واحد میں باپ خدا بھی آ جاتا، بیٹا خدا بھی آ جاتا اور روح القدس خدا بھی آ جاتا مگر اُسے خدائے واحد سے الگ کیا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کے وجود میں شامل نہیں پس اِن حوالوں سے ثابت ہُوا کہ جب مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا تو اس سے مراد حقیقتاً بیٹا نہ تھا بلکہ اُسے استعارہ کے طور پر بیٹا کہا گیا تھا۔

پھر مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ مسیح خدا کی طرح بے جسم ہے۔ جب وہ اس دنیا میں آیا تو اُس نے لوگوں کے لئے جسم اختیار کیا ورنہ خدا کے بیٹے کا کوئی جسم نہیں جیسے باپ خدا کا کوئی جسم نہیں یا جیسے روح القدس خدا کا

کوئی جسم نہیں۔ اسی طرح بیٹے کا بھی کوئی جسم نہیں جب وہ اس دنیا میں آیا تاکہ بنی نوع انسان کے گناہوں کی خاطر صلیب پر لٹک جائے تو اس نے اپنے لئے ایک جسم اختیار کر لیا۔ گویا جسم اختیار کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بنی نوع انسان کے بدلہ میں پھانسی پر لٹک جائے اور ایک دفعہ موت اختیار کرے کیونکہ موت کو گناہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ جب مسیح نے دوسروں کا گناہ اٹھالیا تو اُس پر موت آنی لازمی تھی۔ مگر جب موت آگئی تو اس کے بعد وہ سکیم جو بنی نوع انسان کے گناہ معاف کرانے کے لئے اختیار کی گئی تھی ختم ہوگئی۔ اب اگر عیسائیوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو ضروری تھا کہ مسیح جب دوبارہ زندہ ہُوا تو اس کے ساتھ اس کا جسم نہ ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی غرض پوری ہو چکی تھی۔ بنی نوع انسان کے گناہ معاف ہو چکے تھے اور اب بیٹے کے تجسّم کی کوئی ضرورت نہ تھی، وہ ویسا ہی کامل ہو چکا تھا جیسے خدا باپ کامل ہے۔ مگر انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد بھی جب اُن کے نزدیک مسیح دوبارہ زندہ ہُوا مسیح کے ساتھ اس کا جسم تھا اور وہ اسی جسم سمیت آسمان پر گیا یا بعض دوسری روایتوں کے مطابق اسی جسم کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر غائب ہو گیا۔ گویا صرف یہی نہیں کہ انجیل کے رو سے مسیح قبر میں سے جسم لیکر نکلا۔ حالانکہ اُسے جسم کے ساتھ نکلنا نہیں چاہیئے تھا۔ بلکہ وہ آسمان پر بھی اس جسم کو لے گیا۔ حالانکہ اب جسم کے کوئی معنے ہی نہیں تھے۔ جب تک وہ دنیا میں نہیں آیا تھا اُس کا کوئی جسم نہیں تھا۔ پھر عارضی طور پر اُس نے بنی نوع انسان کے گناہوں کو اپنے اوپر لینے کے لئے جسم اختیار کیا۔ اس کے بعد جب وہ غرض پوری ہو چکی تو لازماً اس کے ساتھ اس کا جسم نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ دوبارہ جی اُٹھنے کے بعد بھی وہ جسم سمیت اٹھا اور پھر آسمان پر بھی جسم سمیت گیا۔ اس طرح اس کی خدائی کی ساری عمارت گر جاتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسیح جو عیسائیوں کے نزدیک خدا باپ کے برابر ہے۔ وہ اب تک اسی جسم کے ساتھ آسمان پر بیٹھا ہُوا ہے اور اس قید کے ساتھ مقیّد ہے۔ اور پھر انجیل میں یہ بھی کوئی ذکر نہیں کہ وہ کب اس جسم سے الگ ہوگا بلکہ انجیل سے تو یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی اسی جسم کے ساتھ آئے گا۔ کیونکہ لکھا ہے جب وہ آئے گا تو

"اُس وقت لوگ ابن آدم کو بڑی قدرت
اور جلال کے ساتھ بادلوں میں آتے دیکھینگے"
(یعنی اس کا دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں پہچانا
جائے گا بلکہ کئی قسم کے شکوک و شبہات
بھی اس کے متعلق پیدا کئے جائیں گے)
(مرقس باب ۱۳ آیت ۲۷)

گویا انجیل یہ بتاتی ہے کہ دوبارہ بھی لوگ اسی جسم کے ساتھ مسیح کو آسمان سے اُترتا دیکھیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اب دوبارہ مسیح پر موت نہیں آ سکتی۔ کیونکہ پہلی موت اُس پر کفارہ کے لئے آئی تھی جب وہ کفارہ ہو چکا تو اب دوسری موت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو عیسائیوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح اب ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں رہے گا اور وہ اس سے کبھی رہائی حاصل نہیں کر سکتا اور یا انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ تھیوری جو اُن کے تجسّم کے متعلق انہوں نے پیش کی تھی وہ باطل ہے کیونکہ اگر یہ تھیوری درست ہوتی تو صلیب کے واقعہ کے بعد انہیں جسم سے آزاد ہو جانا چاہیئے تھا مگر بجائے آزاد ہونیکے وہ بائبل کے رو سے اسی جسم کے ساتھ زندہ ہوئے اور اسی جسم کے ساتھ آسمان پر چلے گئے۔

پھر عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ مسیح کفارہ ہو گیا ہے اس دعویٰ کے ثابت کرنے سے پہلے یہ سوال حل کرنا بھی ضروری ہے کہ کیا مسیح کفارہ پر راضی تھا۔ ساری دلیل کفارہ کی یہی ہے کہ خدا لوگوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا اور چونکہ وہ معاف نہیں کر سکتا اس لئے اُس نے بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ مسیح کو سزا دے کر قبول کر لیا۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ اگر زید مقروض ہے اور بکر اُس کا قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے تو زید کا قرضہ ادا ہو جاتا ہے۔ بنی نوع انسان گناہ کر کے خدا تعالےٰ کے مقروض ہو گئے ہیں اور وہ بوجہ عادل ہونے کے انکو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ اُن کے خیال میں عدل اِس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گنہگار کو ضرور سزا دی جائے۔ پس اس کا علاج اُس نے یہ کیا کہ اپنے بیٹے سے لوگوں کا قرضہ وصول کر لیا۔ فرض کرو یہ بات ٹھیک ہے۔ اگرچہ گناہ روپیہ کی طرح نہیں بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کو سرطان کا پھوڑا نکلا ہوا ہو۔ ایسے شخص کے متعلق اگر دس ہزار لوگ بھی یہ کہیں کہ یہ پھوڑا اُسے نہیں نکلا ہوا بلکہ ہمیں نکلا ہوا ہے اور ہم اس کی تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہیں تو وہ اُس کی تکلیف کو نہیں اُٹھا سکتے۔ اسی طرح دنیا میں اَور کئی چیزیں ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جا سکتا اور گناہ بھی انہی چیزوں میں سے ہے۔ لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گناہ کا بدلہ دیا جا سکتا ہے اور عیسائیوں کی بات درست ہے۔ تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کے قرض کے بدلہ میں دوسرے سے زبردستی روپیہ چھین لینا جائز ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر الف کا قرضہ ب اپنی مرضی سے ادا کر دے تو ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر الف کا قرضہ ہم معاف نہ کریں اور ب کی جیب سے جبراً روپیہ نکال لیں تو ہم نے انصاف ہی نہیں کیا بلکہ ظلم کیا۔ انصاف اس لئے نہیں کیا کہ ہم نے اُس سے قرض وصول نہیں کیا جس سے وصول کرنا چاہیئے تھا اور ظلم اس لئے کیا کہ ہم نے جبر سے کام لیا اور دوسرے کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال لیا۔ پس اگر مسیح لوگوں کے گناہوں کا قرض ادا کرنے پر راضی ہو اور باقی باتیں بھی ثابت ہو جائیں تو ہمیں مان لینا پڑے گا کہ وہ کفارہ ہو گیا۔ لیکن اگر باقی باتیں مسیحیت ثابت بھی کر دے جن کا ہم نے اوپر رد کیا ہے اور یہ ثابت نہ کرے کہ بنی نوع انسان کے گناہ کا بوجھ اپنی مرضی سے مسیح نے اُٹھایا تو کفارے کا تمام گھروندا ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جس کو کفارہ کے لئے پیش کیا گیا ہے وہ کفارہ دینے پر راضی نہیں تھا۔ اس کے متعلق ہم انجیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارہ میں کیا بیان دیتی ہے۔ مرقس باب ۱۴ آیت ۳۲ تا ۴۲ میں لکھا ہے:۔

"پھر وہ ایک جگہ آئے جس کا نام گتسمنی (GETHSEMANE) تھا اور اُس نے (یعنی مسیح نے) اپنے شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھے رہو جب تک میں دعا کروں۔ اور پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا (یعنی حضرت مسیح نے صرف تین ساتھی لئے اور علیحدگی میں دعا کرنے کے لئے چلا گیا) اور اُن سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو (یعنی پہلے تو باقی شاگردوں کو پیچھے چھوڑا تھا اور صرف تین شاگرد اپنے ساتھ لئے تھے لیکن پھر اِس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی وجہ سے طبیعت میں حجاب پیدا ہو اور پوری طرح گریہ وزاری نہ ہو سکے اُس نے انہیں بھی کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو) اور وہ تھوڑا آگے

بڑھا اور زمین پر گر کر دعا کرنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ پر سے ٹل جائے۔ (یعنی صلیب پر لٹکنا جس کے ذریعہ سے اُس نے تمام بنی نوع انسان کے گناہ اُٹھانے تھے۔ اس کے متعلق اُس نے یہ دعا کی کہ اے خدا یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور دشمن مجھے صلیب پر نہ لٹکا دے) اور کہا اے ابّا اے باپ تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے اس پیالہ کو میرے پاس سے ہٹا لے۔ (اِن الفاظ کے صاف معنے یہ ہیں کہ اُسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ پھانسی پر لٹکے۔ اپنی مرضی سے وہ پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار نہیں تھا پھر اس نے کہا) تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تُو چاہتا ہے وہی ہو (یعنی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ صلیب پر نہ لٹکوں اور کفارہ نہ بنوں لیکن تو چاہتا ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں گویا مجھ سے زبردستی ایک کام لے رہا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی بینکر اُس شخص سے تو قرضہ وصول نہ کرے جس نے روپیہ لیا ہو اور بازار جاتے ہوئے کسی کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال کر یہ سمجھ لے کہ اُس کا قرضہ ادا ہو گیا ہے۔ مسیح صاف الفاظ میں کہتا ہے "تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تُو چاہتا ہے وہی ہو"۔ یعنی میں تو نہیں چاہتا کہ صلیب پر لٹکوں لیکن اگر تُو لٹکانا چاہتا ہے تو مجھے منظور ہے) پھر وہ آیا اور اُنہیں سوتے پاکر پطرس سے کہا اے شمعون تو سوتا ہے کیا تُو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا (پطرس کا اصل نام شمعون تھا مسیحؑ نے اس کا نام پطرس رکھا جس کے معنے چٹان کے ہیں اور جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آئندہ زمانہ میں یہ شخص مسیحیت کے لئے چٹان ثابت ہوگا) جاگو اور دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے (یعنی چونکہ خدا کا منشاء ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں اس لئے میرا دل تو نہیں ڈرتا مگر جہاں تک بشریت کا تعلق ہے میرا جسم اپنی کمزوری محسوس کرتا ہے) وہ پھر چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا کی (یعنی پھر یہی کہا کہ اے خدا میری مرضی صلیب پر لٹکنے کی نہیں لیکن اگر تو لٹکانا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں) اور پھر آکر انہیں سوتے پایا کیونکہ اُن کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور وہ نہ جانتے تھے کہ اُسے کیا جواب دیں (غرض مسیح گھبراہٹ اور بے قراری میں بار بار آتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ میرے حواری اس مصیبت اور تکلیف کی گھڑی میں میرا ساتھ دے رہے ہیں یا نہیں۔ مگر وہ جب بھی آتے۔ حواریوں کو سویا ہوا پاتے) پھر تیسری بار آکر اُن سے کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ بس وقت آ پہنچا ہے۔ دیکھو ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جاتا ہے۔ دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آ پہنچا ہے۔"

اس حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے ہرگز کفارہ نہیں ہوا۔ اس کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح

یہ پیالہ ٹل جائے اور صلیب پر اُسے نہ لٹکنا پڑے پس جو کچھ ہوا زبردستی ہوا۔

اسمارہ میں دوسری گواہی لوقا کی ہے اُس میں لکھا ہے:۔

"پھر وہ نکل کر اپنے دستور کے موافق زیتون کے پہاڑ کو گیا اور شاگرد اُس کے پیچھے ہو لئے اور اس جگہ پہنچکر اُس نے اُن سے کہا دعا کرو کہ آزمائش میں نہ پڑو اور وہ اُن سے بمشکل الگ ہو کر کوئی پتھر کا ٹپہ آگے بڑھا اور گھٹنے ٹیک کر یوں دعا کرنے لگا کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو (گویا یہ انجیل بھی مانتی ہے کہ مسیح نے یہ کہا کہ میری مرضی تو اس میں نہیں لیکن اگر تیری مرضی مجھے صلیب پر لٹکانے کی ہی ہو تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو کہ میں تو قرضہ دینا نہیں چاہتا لیکن اگر تو چھیننا چاہتا ہے تو چھین لے) اور آسمان سے ایک فرشتہ اس کو دکھائی دیا وہ اُسے تقویت دیتا تھا (یعنی خدا کو فرشتہ تقویت دیتا تھا یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھوڑے کو کوئی چوہا بلکہ اس سے بھی کوئی چھوٹی چیز سہارا دے) پھر وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو کر اور بھی دلسوزی سے دعا کرنے لگا۔ (گویا فرشتے کی تقویت بھی کام نہ آئی اور وہ اس دعا میں مشغول ہو گیا کہ کسی طرح یہ صلیب کی مصیبت مجھ سے ٹل جائے) اور اُس کا پسینہ گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں ہو کر زمین پر ٹپکتا تھا (حالانکہ وہ دن سخت سردی کے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا شمالی علاقہ میں مسیح رہتے تھے اور پھر اس وقت پہاڑی پر چڑھے ہوئے تھے مگر اس پریشانی کا اُن پر اتنا اثر تھا کہ ایسی سخت سردی میں بھی دعا کرتے وقت اُن کا پسینہ ٹپ ٹپ بہنے لگا اس دعا کے بعد وہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے چونکہ انسان کے لئے اپنا عیب بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کہیں دشمن کوئی طعنہ نہ دیدے اس لئے یہاں لوقا نے ایک عجیب بات لکھدی ہے مرقس نے تو صاف طور پر بیان کر دیا تھا کہ اس شدت گھبراہٹ میں مسیح بار بار اپنے شاگردوں کے پاس آتے اور کہتے کہ اُٹھو اور دعا کرو۔ مگر وہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے لیکن لوقا کو خیال آیا کہ یہ تو بڑی بدنامی کی بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ مسیح کے اچھے شاگرد تھے اتنی بڑی مصیبت میں بھی وہ نہ جاگ سکے۔ اور باوجود اس کے کہ مسیح بار بار کہتے تھے کہ اٹھو اور دعا کرو وہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اس بدنامی کے دھبّہ کو دور کرنے کے لئے لوقا لکھتا ہے) جب دعا سے اُٹھ کر شاگردوں کے پاس آیا تو انہیں غم کے مارے سوتے پایا۔ (گویا شدتِ غم میں وہ بالکل سو رہے تھے) اور اُن سے کہا تم سوتے کیوں ہو (لوقا کے نزدیک اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم غم کیوں کرتے ہو اور شدتِ غم میں تم کیوں سو رہے ہو۔ گویا غم میں انسان سویا کرتا ہے اور جب غم نہ ہو تو اٹھ کر دعا کیا کرتا ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ چونکہ لوقا کو یہ خیال آگیا

کہ پڑھنے والے کیا خیال کریں گے کہ عجیب
شاگرد تھے جو اتنی بڑی مصیبت میں بھی
سوئے رہے۔ اس لئے اُس نے یہ الفاظ لکھ
دئے کہ وہ حواری شدتِ غم میں سو رہے
تھے۔ مسیحؑ نے اُن سے کہا) اُٹھ کر دعا
کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔"

(لوقا باب ۲۲ آیت ۳۹ تا ۴۶)

اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ صلیب پر لٹکنا نہیں چاہتا تھا اور کفارہ کی ساری بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں صلیب پر لٹکا۔ جب وہ اپنی مرضی سے صلیب پر ہی نہیں لٹکا تو کفارہ کس طرح ہُوا؟

بعض دفعہ عیسائی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں۔ مسیحؑ نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ "تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو" ہم کہتے ہیں ٹھیک ہے ایک نبی سے یہ کب امید ہو سکتی ہے کہ خدا چاہے اور وہ نہ چاہے۔ مسیحؑ نے بھی جب دیکھا کہ خدا کی مرضی اسی میں ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں تو اس نے خدا تعالیٰ سے کہا کہ اے خدا تیری مرضی پوری ہو لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی مرضی سے کفارہ نہیں ہُوا۔ اور کفارہ خدا تعالیٰ کی مرضی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کفارہ ہو سکتا ہے تو کفارہ دینے والے کی مرضی سے ہوتا ہے۔ مسیحؑ صاف طور پر کہتا ہے کہ میری مرضی نہیں کہ میں کفارہ پیش کروں یہ اور بات ہے کہ جبر کے بعد وہ تیار ہو گیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ ڈاکو جنگل میں کسی مسافر کو پکڑ لیتے ہیں تو وہ ہنس ہنس کر انہیں روپیہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں بولا تو یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ اپنی مرضی سے انہیں روپیہ دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ سوال نہیں کہ خدا نے اُسے جبراً ایک بات پر تیار کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات مسیحؑ کی اپنی مرضی سے ہوئی؟ اگر اس کی اپنی مرضی سے ہوئی ہے تب تو وہ کفارہ ہُوا ورنہ نہیں۔ اور اوپر کے حوالہ جات بتا رہے ہیں کہ مسیحؑ نے صاف طور پر یہ کہا کہ میری مرضی نہیں کہ میں صلیب پر لٹکوں پس جو کچھ ہُوا جبر سے ہُوا اور یہ چیز ایسی ہے جو کفارہ کو باطل ثابت کر دیتی ہے۔

بعض عیسائی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مسیحؑ کی عارضی حالت تھی بعد میں اس کی یہ کیفیت بدل گئی تھی۔ اس امر کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صلیب کے وقت مسیحؑ کی کیا حالت تھی۔ ساری انجیل میں عبرانی کا ایک ہی فقرہ محفوظ ہے جو مسیحؑ نے صلیب کے وقت بولا۔ اور وہ فقرہ یہ ہے کہ "ایلی ایلی لما سبقتنی" (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) یعنی جب مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا اور اُن کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑے گئے تو مسیحؑ نے نہایت ہی دردناک طور پر خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ ایلی ایلی اے میرے خدا اے میرے خدا لم سبقتنی تُو کس وجہ سے مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ تو نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھ سے اپنے رحم و کرم کی نظر ہٹا لی۔ اس دعا سے بھی صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے صلیب پر نہیں لٹکا بلکہ آخری حالت میں بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور اُس نے مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ گویا مسیحؑ اس بات پر خوش نہیں تھا کہ اُس کو صلیب پر لٹکایا جائے اور جب وہ اس بات پر خوش نہ تھا نہ صلیب سے پہلے اور نہ بعد۔ اور وہ یہ قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھا تو اُس کا

صلیب پر لٹکنا کفارہ کا موجب نہیں ہو سکتا۔

پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی حل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا مسیح آدم کے گناہ سے خود پاک تھا کہ قابلِ کفارہ ہو؟ کفارہ کی تھیوری یہ ہے کہ انسان پاک نہیں ہو سکتا کیونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اور وہ آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ نسل اپنے باپ کی وارث ہوتی ہے۔ اس لئے جو آدم کی اولاد ہے وہ بہرحال اپنے باپ کے گناہ کی وارث ہے اور چونکہ وہ گناہ کی وارث ہے اس لئے اولادِ آدم گناہ سے بچ نہیں سکتی۔ اور چونکہ وہ گناہ سے بچ نہیں سکتی اور نجات نہیں پا سکتی اور نہ کوئی گنہگار انسان دوسرے گنہگار کے لئے کفارہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا وجود ہوتا جو گنہگار نہ ہوتا اور اپنی مرضی سے لوگوں کے گناہ اُٹھا لیتا اور اُن کی سزا خود برداشت کر لیتا تاکہ دوسرے لوگ گناہ کی سزا سے بچ جائیں۔ اور یہ وجود مسیح ناصری تھا جو خدا کا بیٹا تھا۔ اُس نے تمام لوگوں کے گناہ اُٹھا لئے اور صلیب پر لٹک کر اُن کے لئے کفارہ بن گیا۔ یہ ہے کفارہ کی تھیوری۔ اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسیح گناہ سے پاک نہیں تھا تو یہ ساری تھیوری ختم ہو جاتی ہے۔ جب وہ گناہ سے پاک ہی نہیں تھا تو کفارہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انبیاء کے متعلق عیسائی یہی کہتے ہیں کہ چونکہ وہ گنہگار تھے اس لئے کفارہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ابراہیمؑ کفارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ موسیٰؑ کفارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ داؤدؑ کفارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود گنہگار تھے اور گنہگار دوسرے گنہگار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن بائبل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح خود بھی پاک نہیں تھا اور جب وہ پاک نہیں تھا تو دوسرے گنہگاروں کا وہ بھی بوجھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔

انسان کو گنہگار ثابت کرنے کی دلیل مسیحیت یہ دیتی ہے کہ وہ گناہ کرنے والے آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ وہ آدم کی نسل میں سے ہے۔ اس لئے گنہگار ہے۔ ہم کہتے ہیں مسیح بھی حوا کے ذریعہ آدم کی اولاد میں سے تھا اور اس لئے وہ بھی گنہگار تھا۔ مسیحی کہتے ہیں کہ انسان نے گناہ آدم سے ورثہ میں لیا ہے۔ جب مسیح کا کوئی باپ ہی نہیں تھا تو آدم کا گناہ اس کے ورثہ میں نہیں آیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ورثہ باپ اور ماں دونوں سے مل سکتا ہے۔ مثلاً اگر ماں کے اندر آتشک ہو تو بچے کے اندر بھی آتشک کا مادہ آ سکتا ہے یا اگر ماں کو سل ہو تو بچے کے اندر بھی سل کا مادہ آ سکتا ہے۔ کئی مائیں مسلول ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اُنکی اولاد میں بھی سل کا مادہ آ جاتا ہے۔ اسی طرح ماؤں کو مرگی یا جنون کا مرض ہوتا ہے تو اولاد میں بھی مرگی اور جنون کا مرض آ جاتا ہے۔ غرض دنیا کے حالات پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی، جسمانی یا روحانی عیوب جو ماں یا باپ میں ہوتے ہیں وہ ورثہ کے طور پر اُن کی اولاد میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ صرف باپ سے ورثہ کے طور پر کوئی بات آ جائے اور ماں کی طرف سے نہ آئے بلکہ باپ اور ماں دونوں کا ورثہ ملتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب مسیحؑ حوا کی اولاد میں سے تھا تو خواہ اُس کا باپ کوئی نہ ہو تب بھی اُس نے اپنی ماں سے ورثہ کا گناہ پا لیا تھا اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح گنہگار تھا۔ مسیح اُسی صورت میں گناہ کے ورثہ سے بچ سکتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ وہ آدم اور حوا دونوں کی اولاد میں سے نہیں تھا جب اس کا نہ باپ ہو نہ ماں۔ تب بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے ورثہ کا گناہ نہیں پایا۔ اور یا پھر یہ ثابت ہو جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا۔ تب حضرت مسیح

ورثہ کے گناہ سے بچ سکتے ہیں کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسیح حوا کی اولاد میں سے ہے جس نے گناہ نہیں کیا تھا آدم کی اولاد میں سے نہیں جس نے گناہ کیا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مسیح گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا تھا۔ گناہ صرف آدم نے کیا تھا تب بھی اگر مسیح کو حوا نے جنا ہوتا تب تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اُس میں گناہ کا مادہ نہیں آیا۔ لیکن مسیح تو اُس عورت کا بیٹا ہے جو حوا سے ہزاروں سال بعد ہوئی اور جو کئی ہزار واسطے حوا تک رکھتی تھی اس دوران میں ہزاروں دفعہ آدم کی اولاد نے حوا کی بیٹیوں کو چھوا پھر اور حوا کی بیٹیاں ہوئیں تو ان کو پھر آدم کی اولاد نے چھوا۔ اس طرح کئی ہزار چکر کھانے کے بعد حضرت مریم پیدا ہوئیں۔ وہ اتنے ہزار چکر میں آدم کے گناہ کے اثر سے بچ کس طرح سکتی تھیں اگر تو وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے ہوتیں اور حوا بے گناہ ہوتیں تب بے شک یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ حوا بے گناہ ہے اور چونکہ مریم براہ راست بغیر کسی واسطے کے حوا کی بیٹی ہے۔ اس لئے گناہ کا مادہ اس میں نہیں آیا مگر وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے نہیں بلکہ حوا کی اُن بیٹیوں کی اولاد میں سے ہے۔ جو ہزاروں دفعہ گناہوں سے ملوث ہو چکی ہیں۔ پس وہ عورت جو آدم کے گناہ کا حصہ لے چکی تھی کس طرح مسیح کے پاک ہونے کا موجب ہو سکتی تھی۔

پھر یہ بھی درست نہیں کہ حوا بے گناہ تھی۔ بلکہ بائبل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حوا آدم سے بھی زیادہ گنہگار تھی۔

بائبل میں لکھا ہے :۔

"اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا (یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بائبل میں سانپ سے مراد شیطان ہوتا ہے) اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا (گویا شیطان حوا کے پاس گیا اور اس نے چالاکی یہ کی کہ حوا سے جا کر یہ نہیں کہا کہ میں نے سنا ہے کہ فلاں درخت کا پھل کھانے کی اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو ممانعت ہو چکی ہے بلکہ اس نے یہ کہا کہ کیا خدا نے یہ کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا) عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اُس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اُس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا - تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس نے کہا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے کیا تو نے اُس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اُسے نہ کھانا آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اُس نے مجھے اُس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تُو نے یہ کیا کیا۔ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اِس لئے کہ تُو نے یہ کیا تُو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تُو اپنے پیٹ کے بل چلیگا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹیگا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تُو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔ پھر اُس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا تُو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کریگا اور آدم سے اُس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اُسے نہ کھانا۔ اس لئے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا۔ تُو اپنے مُنہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے اس لئے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے کیونکہ تُو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائیگا ۔"

(پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۲۰)

یہ وہ واقعہ ہے جو بائبل میں آدم کے گناہ کے متعلق آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کا مقصود آدم کو ورغلانا تھا۔ کیونکہ شیطان سمجھتا تھا کہ آدم کے وجود سے میری حکومت باطل ہوجاتی ہے حوّا کا مقام ایسا نہیں تھا کہ شیطان کو اس سے خطرہ ہوتا۔ پس اُس کی اصل غرض یہ تھی کہ آدم کو جنت سے نکالا جائے۔ گویا اصل ساکن جنت آدم تھا۔ حوّا آدم کے طفیل پیدا ہوئی اور آدم کے طفیل ہی اُسے جنت ملی۔ پس شیطان کا اصل مقصد آدم کو بہکانا تھا مگر شیطان آدم کے پاس نہیں گیا بلکہ حوا کے پاس گیا اور اُسے پھل کھانے پر آمادہ کیا اور پھر حوّا نے آگے آدم کو پھل کھلایا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور شیطان پہلے حوا کے پاس کیوں گیا جبکہ اس کی اصل غرض آدم کو بہکانا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی اصل غرض گو آدم کو بہکانا تھی مگر وہ ڈرتا تھا کہ اگر میں براہِ راست آدم کے پاس گیا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونگا۔ اور آدم میرے دھوکا میں نہیں آئے گا۔ اس لئے

وہ پہلے حوّا کے پاس گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حوّا جلد قابو آجائیگی اور پھر حوا کے ذریعہ آدم کو ورغلانا آسان ہو جائیگا۔ چنانچہ جب آدم سے اللہ تعالٰے نے کہا کہ

"کیا تُو نے اُس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا"

تو آدم نے یہی جواب دیا کہ

"جس عورت کو تُو نے میرے ساتھ کیا ہے اُس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔"

یعنی آپ کی طرف سے یہ عورت مجھے تحفہ کے طور پر ملی تھی۔ میں دھوکا میں آگیا اور میں نے سمجھا کہ یہ عورت جو خدا تعالےٰ کا عطیہ ہے یہ تو غلطی نہیں کر سکتی اور میں نے اس کے کہنے سے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ غرض آدم بھی یہی کہتا ہے کہ عورت نے مجھے بہکایا اور شیطان بھی پہلے حوّا کے پاس ہی گیا اور اس نے اُسے ورغلایا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ

۱۔ پہلے گناہ حوّا نے کیا

۲۔ حوّا آدم سے زیادہ کمزور اور گناہ میں پھنسنے کے زیادہ قابل تھی۔ اسی لئے شیطان پہلے حوّا کے پاس گیا حالانکہ اُس کا اصل مقصود آدم تھا۔

۳۔ جو نسل آدم اور حوّا سے پیدا ہوگی اُس میں ورثہ کے گناہ کی کمزوری اس اولاد سے کم آئے گی جو صرف حوّا سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ آدم اور حوّا کی اولاد نے کچھ باپ کا ورثہ لیا ہے اور کچھ ماں کا ورثہ لیا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب طاقتور اور کمزور چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو وہ ایک درمیانی کیفیت پر آجاتی ہیں لیکن وہ اولاد جو خالص حوّا سے پیدا ہوگی وہ لازماً گناہ کے زیادہ قریب ہوگی۔

جب یہ حالات ہیں تو مسیح صرف حوّا سے پیدا ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی نسبت گناہ کے زیادہ قریب ہو گئے پس وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالٰے کی طاقت میں ہے کہ حوّا کی نسل میں سے نیک لوگوں کو پیدا کر دے۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰے کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ حوّا کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوں۔ لیکن کفارہ کی بنیاد اس بات پر نہیں کہ خدا تعالےٰ کی طاقت میں یہ بات داخل ہے یا نہیں کہ وہ حوا کی نسل سے نیک لوگوں کو پیدا کر دے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے اور یہ گناہ کا مادہ اُس نے آدم سے ورثہ میں لیا ہے۔ ورنہ جہاں تک اللہ تعالٰے کی طاقت اور اس کی قدرت کا سوال ہے ہمارا عقیدہ تو آدم کی اولاد کے متعلق بھی یہی ہے۔ کہ اُس میں سے بھی نیک لوگ ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالٰے کی طاقت کا ہی سوال ہو تو خدا تعالٰے کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ حوّا گنہگار کی اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے اور خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ آدم گنہگار کی اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے لیکن عیسائیوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو گنہگار ہو اس کی اولاد نیک ہی نہیں ہو سکتی اور جب ان کا یہ عقیدہ ہے تو پھر اللہ تعالٰے کی طاقت کا کیا سوال رہا۔ اور اگر وہ اللہ تعالٰے کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ حوّا کی اولاد نیک بن سکتی ہے تو پھر ہم کہیں گے کہ خدا تعالیٰ میں یہ بھی طاقت ہے کہ وہ آدم کے نطفہ سے نیک اولاد پیدا کر دے۔ ایسی صورت میں نہ ورثہ کے گناہ پر زور دینے کی کوئی ضرورت رہتی ہے نہ گنہگاروں کی

نجات کے لئے خدا تعالے کے بیٹے کی قربانی کی ضرورت رہتی ہے گویا کفارے کی تمام عمارت ایک آن میں منہدم ہو جاتی ہے۔ عیسائی جس طرح تسلیم کرلیں کہ خدا تعالےٰ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ گنہگار ماں باپ سے نیک اولاد پیدا کر دے لیکن اگر وہ حوّا کی اولاد کے متعلق تو خدا تعالیٰ کی طاقت تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں اور آدم کی اولاد کے متعلق اسکی طاقت تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تو یہ خود ایک قابلِ اعتراض امر ہوگا۔ بہرحال اصل سوال صرف اتنا ہے کہ خدا میں نیک اولاد پیدا کرنیکی طاقت ہے یا نہیں؟ اگر خدا تعالیٰ میں گنہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرنیکی طاقت ہے تو خدا تعالیٰ میں گنہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے اور اگر خدا میں گنہگار باپ سے نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالےٰ میں گنہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں۔ بہرحال اگر وہ گنہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے تو گنہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے اور وہ گنہگار باپ سے نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا تو گنہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔

غرض مسیح اگر گنہگار ماں کے بطن سے نیک پیدا ہوسکتا ہے تو باقی لوگ بھی نیک پیدا ہوسکتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ مسیح سے زیادہ نیک ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اندر باپ اور ماں دونوں کے اثرات ہیں۔

میں نے اُوپر لاہور کے ایک پادری کا ذکر کیا ہے جو بعد میں سہارنپور مشنری کالج کا پرنسپل ہوگیا میری اس سے جو گفتگو ہوئی۔ اُس کا ایک حصہ میں بیان کرچکا ہوں۔ اب گفتگو کا دوسرا حصہ بیان کرتا ہوں۔ اس پادری کا نام غالباً وُڈ تھا۔ میں نے اس سے کہا پادری صاحب آپ یہ بتائیں کہ ٹھنڈے پانی اور گرم پانی کو اگر آپس میں ملائیں تو کیا ہوگا۔ وہ کہنے لگا پانی سمویا جائے گا۔ کچھ گرم پانی کی گرمی کم ہو جائیگی اور کچھ سرد پانی کی سردی کم ہو جائے گی ایک درمیانی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ میں نے کہا اب یہ بتایئے شیطان پہلے آدم کے پاس گیا تھا یا حوّا کے پاس؟ کہنے لگا حوّا کے پاس۔ میں نے کہا شیطان کا مقصود کیا تھا۔ کیا حوّا کو بگاڑنا مقصود تھا یا آدم کو بگاڑنا مقصود تھا؟ کہنے لگا شیطان کا مقصود تو آدم کو بگاڑنا تھا۔ میں نے کہا جب آدم مقصود تھا تو وہ براہِ راست آدم کے پاس کیوں نہیں گیا۔ راستہ میں چکر کاٹنے کی اُسے کیا ضرورت تھی؟ اس نے کہا وہ براہِ راست آدم کے پاس اس لئے نہیں گیا کہ اُس نے سمجھا حوّا کمزور ہے اور میں اُسے آسانی سے ورغلا لوں گا۔ اس کے بعد آدم کو یہ حوّا خود بخود ورغلا لے گی میری ضرورت نہیں رہے گی۔ میں نے کہا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حوّا آدم سے کمزور تھی۔ کہنے لگا ہاں۔ میں نے کہا جب حوّا آدم سے کمزور تھی اور گناہ کا ارتکاب پہلے اُسی نے کیا اور اُسی نے آدم کو ورغلایا تو وہ وجود جو صرف حوّا سے پیدا ہوا وہ بے گناہ کس طرح ہوگیا؟ میں نے کہا آپ گرم اور ٹھنڈے پانی کی مثال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یوں سمجھ لیں کہ آدم کی مثال ٹھنڈے پانی کی سی تھی اور حوّا کی مثال گرم پانی کی سی تھی۔ ان دونوں کے ملنے سے جو اولاد پیدا ہوتی وہ لازماً اتنی گنہگار نہیں ہوسکتی جتنی وہ اولاد گنہگار ہوسکتی ہے جو صرف حوّا سے پیدا ہوئی ہے۔ پس مسیح جو حوّا سے پیدا ہوا وہ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ گنہگار تھا۔ کہنے لگا کیا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا؟ میں نے کہا ہمارا اور آپ کا سارا جھگڑا ہی یہی ہے۔ اگر مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو پھر آدم کو آپ بے شک گنہگار کہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ اس کی اولاد نیک ہوسکتی ہو ضروری نہیں کہ وہ گنہگار ہی ہو۔

اب جو میں نے اس طرح پکڑا تو کہنے لگا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا، سونے میں سے سونا نکلتا ہے۔ آدم چونکہ گنہگار تھا اس لئے اس کی اولاد بھی ضرور گنہگار ہوگی وہ نیک نہیں ہو سکتی کیونکہ سونے میں سے سونا نکلتا ہے میں نے کہا تو پھر حوّا کا بیٹا دوسروں سے زیادہ گنہگار ماننا پڑے گا کیونکہ حوّا آدم سے زیادہ گنہگار تھی۔ اس نے نہ صرف خود درخت کا پھل کھایا بلکہ آدم کو بھی کھلایا اور اس طرح وہ دوہری گنہگار تھی۔ اس پر وہ پھر جھنجلا کر کہنے لگا۔ مٹی کی کان میں سے سونا نہیں نکلتا۔ کان مٹی کی ہوتی ہے مگر اندر سے سونا نکل آتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر آدم کے متعلق بھی یہی نظریہ تسلیم کریں کہ گو وہ گنہگار تھا مگر اس کی اولاد میں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو نیک ہوں اور ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں۔

اب عیسائیوں کے لئے صرف ایک ہی پہلو رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ مسیح کے متعلق وہ یہ کہیں کہ اُس کے ماں باپ کے گناہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ابن اللہ تھا اور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا۔ اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حوّا کی نسل میں سے ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی نسبت کم گنہگار تھا یا زیادہ گنہگار تھا۔ وہ بوجہ ابن اللہ ہونے کے گناہ سے پاک تھا۔ گویا اُس کا پاک ہونا ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے سبب سے نہیں تھا بلکہ ابن اللہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ اگر مسیح کے بغیر باپ کے پیدا ہونے میں کوئی خاص حکمت نہیں تھی اور ابن اللہ ہونے کی وجہ سے اس نے ماں باپ کا اثر قبول نہیں کرنا تھا تو اگر اس کا باپ ہوتا تب بھی اس نے اس کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔ اگر مسیح ایک شادی شدہ عورت کے گھر میں پیدا ہوتا اور اس کا باپ ہوتا تو پھر بھی اس نے آدم اور حوّا کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ اُسکی اصل حیثیت ابن اللہ کی تھی۔ پھر خدا نے یہ کیا ظلم کیا کہ اُس نے گنہگار تو ہونا نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے مسیح کو ایسے رنگ میں پیدا کیا کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل ہو گیا اور جہاں بھی لوگ بیٹھتے یہی کہتے کہ وہ نعوذ باللہ حلال زادہ نہیں۔ جب اس نے نہ باپ کا اثر قبول کرنا تھا نہ ماں کا اثر قبول کرنا تھا تو اس جھگڑے کی ضرورت کیا تھی اور خدا نے مریم اور مسیح کو ایک گندے الزام کے نیچے رکھ کر کیوں تکلیف دی جب وہ ابن اللہ تھا اور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا تو اُسے باپ اور ماں دونوں سے پیدا کرنا چاہیئے تھا تاکہ وہ اپنے زور سے پاک ہوتا اور ولد الزنا ہونے کے الزام سے بھی بچتا۔

اس جگہ مسیحی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم بھی تو اُس کو بن باپ مانتے ہو آخر تم کس وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا اور دشمن کو اس پر یہ الزام لگانے کا موقع ملا کہ وہ ولد الزناء ہے۔ تم کفارہ کو تو مانتے نہیں اور جو وجہ ہم پیش کرتے ہیں اُس کو ردّ کرتے ہو۔ پھر تم کیوں کہتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی یہ وجہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ تھا کہ آئندہ اُنکی اولاد میں پے درپے انبیاء آئیں گے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت زمین و آسمان کے قیام تک اُن کی نسل میں رہیگی اور پھر پے درپے نبیوں کی معرفت یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ وعدہ صدیوں تک اس طرح متواتر پورا ہوا۔ کہ موسوی سلسلہ کے لوگ دلیر ہو گئے اور انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جاتے خدا تعالیٰ نے اولاد ابراہیم کو نہیں

چھوڑ سکتا اور موسوی سلسلہ سے نبوت اور بادشاہت باہر نہیں جا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا شروع ہوا کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء کا انذار بیکار جانے لگا۔ نبی آتے اور وہ اپنی تعلیم پیش کرتے تو یہود اُن کا مضحکہ اڑا دیتے۔ جیسے یرمیاہ وغیرہ آتے اور یہود نے ہنس کر اُن کو ردّ کر دیا اور سمجھا کہ خدا نے یہ نعمت ہمیں ہمیشہ کے لئے دے دی ہے۔ تب خدا نے انہیں بعض نبیوں کی معرفت یہ خبر دی کہ ایک کنواری بیٹا جنیگی یعنی وہ موعود آدھا اسرائیلی اور آدھا غیر اسرائیلی ہوگا یہ ایک انذار تھا جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر یہود نبیوں کی باتیں نہ سننے پر اسی طرح مصرّ رہے تو آئندہ وہ نبی آئے گا جو نہ باپ کی طرف سے اسرائیلی ہوگا اور نہ ماں کی طرف سے اسرائیلی ہوگا سو مسیح کے وجود میں وہ وعدہ پورا ہوا مسیح بن باپ کے پیدا ہوا اور اس کے ذریعہ سے یہود کو نوٹس دے دیا گیا کہ آدھی نبوت اُن سے لے لی گئی ہے۔ کیونکہ نسل ہمیشہ باپ سے چلتی ہے۔ سو انہیں کہا گیا کہ اب جو نبی آیا ہے وہ باپ کی طرف سے یہود میں سے نہیں ہے اگر اس کے انذار سے بھی یہود نے فائدہ نہ اٹھایا تو اگلا نبی بالکل ہی غیر اسرائیلی ہوگا گو ابراہیم کی نسل سے ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے وعدے تھے اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ بلا وجہ اُن وعدوں کی برکات سے یہود کو محروم کر دے اس لئے اُس نے پہلے متواتر انبیاء بھیجے جب یہود میں متواتر نبی آتے رہے اور اُن کو یہ یقین کامل ہو گیا کہ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نبوت غیر اسرائیلیوں میں چلی جائے تو خدا تعالیٰ نے اپنے بعض انبیاء کی معرفت ایک ایسے رنگ میں انذار کیا جس کے بعد اگر اُن کے اندر کچھ بھی ایمان ہوتا تو اُن کو ہوش آجانا چاہیئے تھا اور یہ سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اب ہماری شرارتوں کی وجہ سے ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مگر وہ پھر بھی نہ سمجھے اور اپنی شرارتوں پر مصر رہے۔ آخر خدا تعالیٰ نے اپنے انذار کے مطابق مسیح کو بن باپ پیدا کیا اور یہودیوں کو سمجھایا کہ آدھی نبوت تو ہم نے لے لی ہے اگر آئندہ بھی باز نہ آئے تو سزا کے طور پر نبوت کا باقی حصہ بھی لے لیا جائے گا۔ چنانچہ اب جو نبی آیا ہے یہ ماں کی طرف سے تو یہودی ہے مگر باپ کی طرف سے نہیں۔ لیکن آئندہ ایک بالکل غیر اسرائیلی نبی آئے گا گو وہ ابراہیم کی نسل میں سے ہی ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جو بنو اسمٰعیل میں سے تھے۔ اور بنی اسرائیل میں سے نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ پس ہمارا حضرت مسیح کو بن باپ ماننا قابلِ اعتراض نہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں بڑی حکمت ہے لیکن جو حکمت وہ بتاتے ہیں ہم نے اُسے ردّ کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس طرح حضرت مسیح بے گناہ نہیں بلکہ دوسروں سے بھی زیادہ گنہگار ثابت ہوتے ہیں اور کفارہ بالکل باطل چلا جاتا ہے۔

مسئلہ کفارہ کے متعلق ایک اور قابلِ غور سوال یہ ہے کہ کیا مسیح کے صلیب پانے سے دنیا کا کفارہ ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسیح کی صلیب کا واقعہ جس رنگ میں بائبل پیش کرتی ہے اگر ہم اُسے تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مسیح نے واقعہ میں کوئی قربانی پیش کی تھی۔ کیونکہ انجیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیح صرف ڈیڑھ دن کے قریب قبر میں رہا۔

جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسیحؑ کی صلیب کا واقعہ ہوا ہے اور اتوار کے دن صبح کے وقت وہ اُٹھ بیٹھا (مرقس باب ۱۶)۔ جمعہ کے بعد کی رات سے ہفتہ کی شام تک چوبیس گھنٹے ہوئے اور ہفتہ کی شام سے اتوار کی صبح تک بارہ گھنٹے ہوئے۔ گویا انجیل کی رو سے مسیح صرف ۳۶ گھنٹے قبر میں رہا۔ فرض کرو یہ عیسائی عقیدہ کہ مسیحؑ ڈیڑھ دن تک دوزخ میں رہا درست ہو تو بھی سوال یہ ہے کہ مسیحؑ کا ڈیڑھ دن قبر میں رہنا دنیا کے گناہوں کا کفارہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ عیسائی عقیدہ کے مطابق دوزخ ابدی ہے اور ہر انسان جو دوزخ میں ڈالا جائے گا ہمیشہ کے لئے ڈالا جائے گا۔ لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد خدا تعالیٰ دوزخیوں کو بھی معاف فرما دے گا اور انہیں جنت میں داخل کر دیگا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعہ) یعنی دوزخ رحمِ مادر کی طرح ہے جس طرح رحم میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد بچہ باہر آجاتا ہے اسی طرح دوزخی کچھ عرصہ تک دوزخ میں رہنے کے بعد اُس میں سے نکل آئیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ لیکن عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ دوزخ ابدی ہے اور جو بھی اس میں جائے گا وہ اس میں سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اب ساری دنیا جو مسیح پر ایمان رکھتی ہے وہ کروڑوں کروڑ کی ہے اسی زمانہ میں ساٹھ ستر کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ عیسائی ہیں۔ اگر یہ ستر کروڑ آدمی دوزخ میں جاتا اور اُس میں ابد تک رہتا تو ستر کروڑ کو ابدیت سے ضرب دے کر دیکھ لو کہ کتنا وقت بن جاتا ہے اور یہ تو صرف اس زمانہ کے عیسائیوں کی تعداد ہے۔ اگر مسیحؑ سے لے کر اس وقت تک کے اُن تمام لوگوں کا شمار کیا جائے جو مسیح پر ایمان لائے تھے اور ایک انسانی نسل کی اوسط عمر ہم تیس سال فرض کرلیں اور دنیا کی اوسط عیسائی آبادی دس کروڑ مان لیں کیونکہ پہلے وہ تھوڑے تھے پھر لاکھ دو لاکھ ہوئے۔ پھر ستر اسّی لاکھ ہوئے پھر کروڑوں کروڑ تک پہنچ گئے یہاں تک کہ اُن کی ایک ایک زمانہ میں ستر ستر اسّی اسّی کروڑ تک تعداد ہو گئی۔ اس تمام تعداد کی اوسط اگر ہم صرف دس کروڑ رکھیں اور ایک صدی میں تین نسلیں فرض کریں تو اب تک ستاون ۵۷ عیسائی نسلیں دنیا میں گذر چکی ہیں۔ ستاون کو دس کروڑ سے ضرب دیں تو پانچ ارب ستر کروڑ آدمی بن جاتا ہے۔ اب پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کی سزا کو ابدیت سے ضرب دے کر دیکھو تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ گویا اگر مسیح کفارہ نہ بنتا تو اس پانچ ارب ستر کروڑ نے ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ میں رہنا تھا اور یہ زمانہ اتنا بڑا تھا جس کی تعیین ہندسوں میں ہو نہیں سکتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو صرف ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کے ابدی عذاب کا کفارہ قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسیحؑ کو اس لئے صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے عدل پر کوئی حرف نہ آئے۔ مگر یہ کیا عدل ہے کہ پانچ ارب ستر کروڑ ضرب ابدیت کا عذاب ڈیڑھ دن میں پورا کر لیا گیا۔ گویا اور لوگ دوزخ میں پڑتے تو انہیں ابد الآباد تک دوزخ میں رکھا جاتا لیکن اپنے بیٹے کا سوال آیا تو اُسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر کہہ دیا کہ چلو سب کا کفارہ ہو گیا۔ یہ تو ویسی ہی مثال ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک گاؤں کے کچھ شرارتی لڑکے باہر کھیل رہے تھے کہ انہوں نے ایک مردہ گدھا دیکھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ ہم اسے پکا کر کھائیں زندہ کیا اور مُردہ کیا۔ گوشت تو ہے ہی۔ چنانچہ انہوں نے مل کر گدھا پکایا اور کھا لیا۔ گاؤں والے ایسی باتوں کو سخت بُرا سمجھتے ہیں انہیں پتہ لگا۔ تو وہ

بھاگے بھاگے اپنے ملّاں کے پاس گئے اور اُسے کہنے
لگے کہ غضب ہوگیا۔ آج لڑکوں نے مردہ گدھا پکاکر
کھالیا ہے ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کا کوئی عذاب ہم پہ
نازل ہوجائے۔ ملّاں نے کہا یہ تو بڑے گناہ کی بات
ہوئی ہے اب فوراً اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے ورنہ
اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوجائے گا۔ وہ پہلے
ہی گھبرائے ہوئے تھے ملّاں نے انہیں اَور ڈرا دیا۔
اس پر انہوں نے کہا کہ ملّاں جی اس مشکل کا آپ ہی کوئی
حل نکالیں ایسا نہ ہو کہ ہم سب برباد ہوجائیں۔ ملّاں
نے کہا اچھا میں کتابیں دیکھوں گا اور پھر بتاؤں گا کہ
اس کا کیا علاج ہے۔ چنانچہ وہ سارا دن فقہ کی
کتابیں دیکھتا رہا اور شام کو گاؤں والوں سے کہنے
لگا کہ لو بھئی مسئلہ نکل آیا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے
کہ اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ ایک بڑا سا شہتیر کھڑا کرکے
اُس کے چاروں طرف روٹیوں کا ڈھیر لگانا شروع
کردیا جائے یہاں تک کہ وہ ڈھیر شہتیر کے آخری سرے
تک پہنچ جائے۔ اور پھر وہ روٹیاں خدا تعالیٰ کے نام پہ
دے دی جائیں۔ مطلب یہ تھا کہ روٹیاں مجھے دے دی
جائیں کیونکہ خدا کے نام پر جو کچھ دیا جاتا ہے ملاں کو ہی
دیا جاتا ہے۔ اُس نے سمجھا کہ چلو اس طرح کچھ دن مفت
روٹیاں کھالیں گے اور جو باقی رہیں گی وہ بیچ لیں گے
گاؤں چھوٹا سا تھا اور لوگ غریب تھے۔ انہوں نے یہ
سُنا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے اور کہا مُلّاں جی ہم تو یہ
کفارہ دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس نے کہا نہ دوگے
تو سارے دوزخ میں جاؤگے۔ فقہ میں یہی لکھا ہے کہ اس
گناہ کا کفارہ اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔ انہوں نے پھر
آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ایک
لڑکا بولا کہ ملّاں جی کا اپنا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل
تھا۔ انہوں نے کہا سچ کہتے ہو؟ لڑکوں نے کہا بالکل سچ
ہے وہ ہمارے ساتھ تھا۔ آخر انہوں نے مشورہ کیا۔ کہ
اب پھر ملّاں جی سے پوچھنا چاہیئے شاید مسئلہ کی کوئی شکل
بدل جائے۔ چنانچہ وہ پھر ملّاں جی کے پاس آئے اور کہنے
لگے ملّاں جی آپ کا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل تھا
یہ سُنکر ملّاں جی کو فکر ہوا کہ اب تو مجھے بھی کفارہ دینا
پڑے گا۔ کہنے لگے اچھا میں پھر کتابیں دیکھونگا چنانچہ
کتابیں دیکھ کر کہنے لگے لو میاں یہ بھی مسئلہ نکل آیا ہے
کہ اگر اتنی توفیق نہ ہو تو پھر شہتیر کو زمین پر ڈال کر
اس پر ایک ایک پھلکا رکھ دیا جائے اور وہ چند
پھلکے صدقہ میں دے دئے جائیں تو یہ تو میاں نور جمال
والی بات ہوگئی۔ کہ پانچ ارب ستّر کروڑ کو اگر عذاب دیا
جائے تو ابدی طور پر عذاب دیا جائے لیکن جب اپنے
بیٹے کا سوال آیا تو کہہ دیا کہ ہم انصاف سے کام لے رہے
ہیں ہم اُسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں
کہ ساری دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔ اور ابھی تو
دنیا جاری ہے پانچ سو یا ہزار سال تک بھی دنیا اَور
جاری رہی تو گو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب احمدیت
کی وجہ سے عیسائیت دن بدن کم ہی ہوگی ترقی نہیں کریگی
لیکن ہمارے بڑھتے بڑھتے بھی تین چار ارب کا اس
تعداد میں اَور اضافہ ہوجائے گا۔ مگر اتنی بڑی تعداد
کے گناہوں کے کفارہ کا جب سوال آیا تو کہہ دیا گیا کہ
ہم نے اپنے بیٹے کو ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر سب
سزا پوری کرلی ہے اور ہمارے عدل اور انصاف کا
تقاضہ پورا ہوگیا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات
اور کیا ہوسکتی ہے کہ پانچ ارب ستّر کروڑ کو تو ابدی
عذاب دینے کا فیصلہ کرنا اور یہ کہنا کہ وہ دوزخ میں
سے کبھی نکل نہیں سکیں گے اور اپنے بیٹے کے متعلق یہ کہہ دینا
کہ چونکہ وہ ڈیڑھ دن جہنم میں رہ آیا ہے اس لئے سب لوگوں
کی سزا معاف ہوگئی ہے۔ تم اس تجویز کو کسی کے سامنے

رکھ کر دیکھ لو۔ مسیح اور خدا کا نام نہ لو۔ اتنا کہو کہ ایک شخص تھا جس کے ذمہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب قرض تھا۔ لوگوں نے اس سے روپیہ کا تقاضا کیا مگر وہ ادا نہ کر سکا آخر معاملہ عدالت میں گیا۔ اُس نے درخواست کی کہ یہ قرض مجھے معاف کر دیا جائے۔ مگر جج نے کہا کہ میں معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنا میرے عدل کے منافی ہے میں ایسی بے انصافی نہیں کر سکتا کہ تمہارے ذمہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہو اور تمہیں سزا نہ دی جائے۔ مگر اس کے بعد اُس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ اِس ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے بدلہ میں تم ڈیڑھ روپیہ دیدو اور جب اُس نے ڈیڑھ روپیہ دے دیا تو اس نے کہا کہ اب سارا قرض معاف ہو گیا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی عقلمند اس فیصلہ کو معقول قرار دے گا؟ ہر شخص کہیگا کہ قاضی صرف بے ایمان ہی نہیں بلکہ بڑا چالاک اور فریبی بھی تھا۔ گویا اس کا الزام بڑھ جائے گا اور دنیا اُسے عادل نہیں کہے گی بلکہ کہیگی کہ وہ بڑا ظالم تھا بڑا چالاک اور فریبی تھا۔ کہ اُس نے اپنے بیٹے سے ڈیڑھ روپیہ لے کر یہ فیصلہ کر دیا کہ لوگوں کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا ہو گیا ہے۔ اسی طرح کفارہ کی جو صورت بتائی جاتی ہے وہ خدا تعالٰے پر الزام کو بڑھانے والی ہے گھٹانے والی نہیں۔ اور اس قسم کے کھیل سے اس کا عادل ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ غیر عادل ہونے کے علاوہ چالاک اور دھوکے باز ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر ڈیڑھ دن بھی اُسے دوزخ میں کیوں رکھا؟

اگر کہو کہ انسان اور خدا میں بے انداز فرق ہے چونکہ انسان کی حالت اَور ہے اور خدا تعالیٰ کی حالت اَور ہے اس لئے انسان کو جتنا عذاب ابدی جہنم میں ملے گا وہی عذاب خدا تعالٰے کے بیٹے کو ڈیڑھ دن میں مل گیا ہے۔ اس وجہ سے بنی نوع انسان کی ابدی سزا کے مقابلہ میں ابن اللہ کا صرف ڈیڑھ دن کے لئے جہنم میں جانا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں۔ جو عذاب اُن کو ابدیت میں ملنا تھا وہی مسیح کو ڈیڑھ دن میں مل گیا۔ یہ بھی ایک جواب ہے جو دیا جا سکتا ہے۔

اس کا ردّ یہ ہے کہ جب خدا اور انسان میں بے انداز فرق ہے۔ اور عیسائی بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو بے انداز فرق کے لحاظ سے یہ انسانی طاقت میں ہی نہیں کہ وہ خدا اور اس کی مخلوق کے باہمی فرق کو سمجھ سکے بے انداز چیز انسانی اندازوں سے باہر ہوتی ہے اور اندازہ ہمیشہ اُسی چیز کا کیا جاتا ہے جو محدود ہو اور جس کا سمجھنا انسانی طاقتوں کے لحاظ سے ممکن ہو۔ اب بے انداز فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ ارب ستر کروڑ انسانوں کے مجموعی عذاب کے مقابلہ میں خدا تعالٰے کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ڈیڑھ دن کے لئے دوزخ میں چلا گیا اور انسانوں کا کفارہ ہو گیا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ انسانی عذاب کی جو مقدار ہے وہ خدا تعالیٰ کو کتنے عرصہ میں مل سکتی ہے۔ حالانکہ جب انسان اور خدا میں ہے ہی بے انداز فرق تو وہ یہ اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں کہ ڈیڑھ دن میں تمام عذاب خدا تعالیٰ کو پہنچ گیا ہے ایسی صورت میں تو اُسے ایک منٹ کے لئے بھی دوزخ میں رکھنا درست نہ تھا بلکہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی اُس کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ کیونکہ یہاں مقابلہ محدود طاقتوں والے انسانوں اور غیر محدود طاقتوں والے خدا کا ہے اور غیر محدود طاقت والے خدا کا اندازہ محدود طاقت والوں کے ساتھ کرنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ پھر تو ایک سیکنڈ کی تعیین بھی اس کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ بے انداز فرق کے لحاظ سے تو جتنی دیر آنکھ جھپکنے میں لگتی ہے اُتنی دیر کا عذاب بھی خدا تعالٰے کے لئے ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں ڈیڑھ دن کا اندازہ

انہوں نے کہاں سے نکال لیا اور اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ غیر محدود طاقتوں والے خدا کے متعلق یہ کس طرح سمجھ لیا کہ اس نے ڈیڑھ دن میں وہ عذاب برداشت کر لیا جو انسان اربوں سال میں برداشت کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی سوال ہے کہ دوزخ میں گیا کون تھا ابن آدم گیا تھا یا ابن اللہ گیا تھا؟ اگر ابن آدم گیا تھا تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ ابن آدم کی روح چونکہ بہرحال جسم سے پیدا ہوتی ہے اور وہ جسم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کی روح دوزخ میں چلی گئی۔ لیکن وہاں تو کوئی اور روح تھی ہی نہیں۔ جسم بے شک انسان کا تھا لیکن اُس میں ابن اللہ تھا۔ اور ابن اللہ اگر جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو اُسی وقت خدا بن جاتا ہے۔ وہ اُسی وقت تک ابن آدم کہلا سکتا ہے جب تک وہ جسم کی قید میں ہے جب وہ اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو وہ اُسی وقت ابن اللہ بن جاتا ہے۔ اور جب وہ ابن اللہ ہو گیا تو اُس کی حالت خدا کی سی ہو گئی اور جب اس کی حالت خدا والی ہو گی تو اس کے دوزخ میں جانے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ کیا خدا کو بھی سردی گرمی لگتی ہے یا وہ بھی سردی سے آرام اور گرمی سے تکلیف محسوس کرتا ہے؟ انسان کی روح تو اگر دوزخ میں جائے گی تو وہ گرمی محسوس کرے گی۔ سرد مقام پر رکھی جائے گی تو سردی محسوس کرے گی مگر ابن اللہ جو خدا ہے اس کے لئے سردی اور گرمی کا کیا سوال ہے۔ دوزخ بھی اس کی پیدائش ہے اور جنت بھی اس کی پیدائش ہے نہ دوزخ اُسے تکلیف پہنچا سکتی ہے اور نہ جنت اُسے آرام پہنچا سکتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا پاؤں ڈالیگا اور وہ ٹھنڈی ہو جائے گی کیونکہ خدا تعالیٰ کے لئے دوزخ کوئی چیز ہی نہیں۔ پس اگر مسیح ابن آدم تھا اور اس میں انسانی روح تھی تو دوزخ میں خدا نہیں گیا بلکہ انسان گیا اور اگر اس میں ابن اللہ کی روح تھی تو جونہی اُس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہوئی وہ فوراً خدا کی طرح ہو گئی اور جب وہ خدا کی طرح ہو گئی تو اب خواہ اُسے دوزخ میں بھی لے جاؤ اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ آخر مسیح کی کوئی دو روحیں تو تھی نہیں کہ کہا جائے ایک اُس میں آدمی کی روح تھی اور ایک خدا کی روح تھی۔ اس میں ایک ہی روح تھی جو ابن اللہ کی تھی اور جب وہ روح جسم کی قید سے آزاد ہو گئی تو اس کے لئے دوزخ، دوزخ ہی نہ رہا۔ پھر اگر اُسکو دوزخ میں بھی لے جاؤ تو وہاں اُس کا جانا اس کیلئے کسی عذاب کا موجب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ مادی احساسات سے بالا ہے نہ اُس پر دوزخ اثر کرتی ہے نہ جنت۔

عیسائی بعض دفعہ گھبرا کر یہ کہدیا کرتے ہیں کہ یہ سب تمثیلی کلام ہے تم خواہ مخواہ اسے حقیقت پر محمول کرتے ہو۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو تمثیلی کلام سے نئے نئے مسئلے نہیں نکالا کرتے۔ اس صورت میں بھی کفارہ باطل ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تم حقیقت بیان نہیں کر رہے بلکہ تمثیل بیان کر رہے ہو۔ تو اس سے عجیب و غریب مسائل نکالنا اور اُن پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دینا تمہارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کے متعلق یہ کہیں کہ وہ سچ مچ شیر ہے اور جب کوئی شخص ہم سے پوچھے کہ اس کی دم کہاں ہے یا اس کے پنجے وغیرہ کہاں ہیں اور ہم کہیں کہ یہ تو تمثیلی کلام تھا تم نے خواہ مخواہ اُسے حقیقی شیر سمجھ لیا۔ تو اسکے بعد ہمارے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ ہم اُسے حقیقی شیر ہی کہتے پھریں۔ اسی طرح اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو عیسائیوں کو ماننا پڑیگا کہ مسیح کو ابن اللہ بھی تمثیلی طور پر کہا گیا تھا اور اگر وہ تمثیلی طور پر ابن اللہ تھا تو پھر نہ وہ لوگوں کے گناہ اُٹھا سکتا تھا اور نہ ڈیڑھ دن دوزخ میں

رہ سکتا تھا۔ یہ ساری کی ساری باتیں ہی باطل اور بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ عیسائیوں کی ساری باتیں مان لینے کے باوجود کہ کفارہ بھی کوئی ممکن چیز ہے اور مسیح ابن اللہ تھا کیا یہ بات ثابت ہے کہ وہ قربانی مسیح نے پیش کر دی تھی جسے کفارے کا موجب کہا جاتا ہے؟ انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ مسیح نہ تو صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اُس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارے کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔ مسیح کا صلیب پر سے زندہ اُتر آنا درحقیقت ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عیسائیت کی موت ہے۔ اگر مسیح صلیب پر سے زندہ اُتر آئے تھے تو عیسائیت کلی طور پر ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسیح صلیب کے واقعہ کے بعد اپنی طبعی موت مر گئے تھے تو وہ غلط عقائد جو غیر احمدیوں میں پھیلے ہوئے ہیں سب کے سب ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا مسیح کا صلیب پر سے زندہ اُتر آنا عیسائیت کو ختم کر دیتا ہے اور مسیح کا طبعی موت مر جانا اسلام سے الحاد کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر عیسائیت مر جاتی ہے تو اس میں بھی اسلام کی زندگی ہے اور اگر الحاد مٹ جاتا ہے تو اس میں بھی اسلام کی زندگی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دونوں کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ آپ نے مسیح کو صلیبی موت سے بچا کر ایک طرف مسیح کو لعنت سے بچایا اور دوسری طرف عیسائیت کو مار دیا۔ اُدھر مسیح کی طبعی موت ثابت کر کے اسلام کو الحاد سے بچا لیا۔ کیونکہ ایک ایسا نبی جس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل نہیں کیا۔ جس نے آپ کے دین سے استفادہ نہیں کیا۔ جس نے آپ کے باغ سے خوشہ چینی نہیں کی اُس کا اسلام میں آنا اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف ہتک ہے بلکہ اُن کے کام کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہ حملے کر کے عیسائیت اور الحاد دونوں کو ختم کر دیا۔ ایک دفعہ آپ نے مسیح کو زندہ کر کے عیسائیت کو ختم کیا اور دوسری دفعہ آپ نے مسیح کو مار کر اسلام سے الحاد کو ختم کیا۔ یہ اتنے بڑے کارنامے ہیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ہماری جماعت نے اِن کارناموں کی طرف توجہ کی ہے اور نہ ان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا ہے۔ باقی باتیں کہ مسیح واقعۂ صلیب کے بعد کہاں گیا یہ ضمنی دلائل ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کئے ہیں۔ اصل چیز مسیح کا صلیب سے زندہ اُتر آنا ہے۔ اگر وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آیا ہے تو عیسائیت ختم ہے۔ چنانچہ اس امر کا اقرار خود مسیحی لوگ بھی کر رہے ہیں MR. CRILTONDON جو کہ انٹر یونیورسٹی فیلوشپ آف لنڈن کے سکرٹری جنرل ہیں انہوں نے ۱۱ اپریل ۶۶ء کو لنڈن مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"اگر مسیح کی وفات کے متعلق جماعت احمدیہ کا نظریہ درست ہے تو پھر عیسائیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر فی الواقع مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو پھر عیسائیت کی ساری بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور ایسی صورت میں عیسائیت کی تمام عمارت کا زمین پر آ رہنا یقینی ہے۔"

(الفضل ۲۷ نومبر ۱۹۶۶ء)

پس اگر مسیح طبعی موت مر چکا ہے تو مسلمانوں کا الحاد ختم ہے۔ اِس طرح وہ تمام تانا بانا جو انہوں نے بنایا ہوا ہے سب کا سب ٹوٹ جاتا ہے اور وہ غلط عقائد جن میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہو چکے ہیں سب کے سب باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر مسیح طبعی موت مر گیا ہے تو آنے والا مسیح اُمتِ محمدیہ میں سے ہوگا۔ اور جب

آنے والا اُمتِ محمدیہ میں سے ہو گا تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا ملجح نظر قائم ہو جاتا ہے۔ وہ قومیں جن کی امیدیں مرجاتی ہیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ قومیں جن کی امیدیں نہیں مرتیں وہ کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ جب بھی وہ گرنے لگتی ہیں اُن کی امیدیں اُن کو پھر کھڑا کر دیتی ہیں۔ پھر اُن کے اندر بیداری اور ہوشیاری پیدا کر دیتی ہیں۔ اور وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہمارے سے لئے بڑے بڑے سور ہے حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں لیکن جب کسی قوم کی اُمید کا پہلو مار دیا جائے تو وہ قوم بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو عظیم الشان کارنامے سرانجام دئے ہیں۔ ایک طرف آپ نے مسیح کو صلیب سے اُترنے کے بعد زندہ کرکے عیسائیت کو مار دیا اور دوسری طرف آپنے مسیح کو قرآن کریم کی آیات کے مطابق وفات یافتہ ثابت کرکے اسلام کو الحاد سے بچالیا۔ یہ کیسا شاعرانہ مضمون ہے کہ آپ نے مسیح کو زندہ کر دیا اور عیسائیت کو مار دیا اور مسیح کو مار دیا اور اسلام کو زندہ کر دیا۔ چونکہ عیسائیت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیح صلیب پر لٹک کر مر گیا اس لئے جب یہ ثابت ہو جائے کہ مسیح صلیب پر مرا ہی نہیں بلکہ زندہ رہا اور زندہ اُترا تو ساتھ ہی کفارہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک سوال ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے کہ کیا مسیح صلیب پر لٹک کر فوت ہُوا اور کیا اس نے وہ قربانی پیش کی جو کفارہ کا موجب ہو سکتی تھی؟ انجیل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے مسیح نہ صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارہ کہا جاتا ہے۔ اگر ہم انجیل پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کا اصل معجزہ جس پر مسیحیت کو ناز ہے اور جو مسیحیت کے

ابتدائی آثار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے یوناہ نبی کا معجزہ ہے۔ صلیب کے واقعہ کے بعد ایک لمبے عرصہ تک عیسائی کمزور رہے۔ وہ کبھی کسی ملک میں بھاگ کر چلے جاتے تھے اور کبھی کسی ملک میں۔ عام طور پر وہ چھپ کر رہتے تھے۔ کیونکہ جب لوگوں کو اُن کا پتہ لگتا۔ تو وہ اُن پر مختلف قسم کے مظالم کرتے۔ ابتدائی مظالم کے سوا جو فلسطین میں یہودیوں کی طرف سے ہوئے۔ بعد میں یہ مظالم زیادہ تر مشرک قوموں خصوصاً رومیوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ ایک عیسائی یہ رٹ لگانے سے نہیں رہ سکتا تھا کہ مسیح اس دنیا کا بادشاہ ہے۔ مگر ادھر بادشاہت کا لفظ اس کی زبان پر آتا اور اُدھر رومیوں کو آگ لگ جاتی اور وہ فوراً مظالم شروع کر دیتے اس زمانہ میں یہودیت کا حملہ کمزور ہو چکا تھا بلکہ بعض جگہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسیحی چھپتے تو ان کے ساتھ یہودی بھی چھپ جاتے تھے۔ چونکہ مذہب ملتا جُلتا تھا اور یہودی ابھی موسوی شریعت سے اتنے دُور نہیں ہوئے تھے جتنے آج کل ہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے جس طرح ہم بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور غیر احمدی بھی نمازیں پڑھتے ہیں ہم بھی روزے رکھتے ہیں اور غیر احمدی بھی روزے رکھتے ہیں۔ ہم بھی حج کرتے ہیں اور غیر احمدی بھی حج کرتے ہیں ہم بھی قرآن مانتے ہیں اور غیر احمدی بھی قرآن مانتے ہیں اور اگر کوئی شخص صرف ظاہری شکل دیکھے عقائد کے اختلاف پر نظر نہ ڈالے تو وہ یہی کہیگا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو ایمان تورات پر مسیحیوں کو تھا ویسا ہی ایمان یہودیوں کو تھا جس طرح صدقہ و خیرات عیسائی کرتے تھے ویسے ہی صدقہ و خیرات یہودی کرتے تھے۔ جس طرح تورات کی تعلیموں کو عیسائی قابلِ عمل سمجھتے تھے اسی طرح تورات کی تعلیموں کو یہودی

قابلِ عمل سمجھتے تھے۔ اور چونکہ تمام تعلیم میں دونوں مشترک نظر آتے تھے اس لئے جب رومی لوگ عیسائیت کے خلاف بھڑکے اور انہوں نے ظلم کرنے شروع کئے تو ساتھ ہی انہوں نے یہودیوں پر بھی ظلم کرنے شروع کر دئے اور یہ خیال کیا کہ یہ بھی اُن کے ساتھ ہی ہیں۔ پس ابتدائے عیسائیت میں تو ظلم یہودیوں کی طرف سے ہوئے مگر پھر شکل بدل گئی اور جب رومی دکھ دیتے تو وہ عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اکٹھا دکھ دیتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان میں سے یہودی کون ہے اور عیسائی کون ہے۔ چنانچہ جب عیسائی بھاگ کر کہیں چھپتے تھے تو یہودی بھی اُن کے ساتھ ہی چھپ جاتے تھے اور روما میں جو آثار پائے جاتے ہیں اُن سے اِسبات کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں عیسائیوں نے بڑی ہمت کی کہ باوجود اس کے کہ روم میں اُن کی بڑی مخالفت تھی اور حکومت کی طرف سے اُن پر شدید مظالم ہوتے تھے۔ پھر بھی اُنہوں نے وہاں تبلیغ پر بڑا زور دیا۔ چنانچہ روم میں اُن کے بڑے بھاری مشنز قائم تھے۔ وہاں انکی تبلیغ کی وجہ سے لوگ مخالفت بھی کرتے، ظلم بھی کرتے، جائدادیں بھی چھین لیتے۔ مگر ظلم زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا۔ پہلے کچھ عرصہ مارتے پیٹتے اور پھر چھوڑ دیتے جیسے آج کل ہندوستان میں ہندوؤں کو بعض مقامات پر جوش آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد خاموشی ہو جاتی ہے۔ پھر کسی اَور علاقہ میں ظلم شروع ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں بھی خاموشی ہو جاتی ہے۔ اُن کا بڑا مرکز ایک تو روم تھا دوسرا مرکز انطاکیہ تھا اور تیسرا مرکز اسکندریہ تھا۔ اِن تینوں جگہ عیسائی پادریوں پر حملے ہوتے تھے اور دشمن انہیں یا تو مار دیتا یا زخمی کر دیتا۔ ان متواتر حملوں کی وجہ سے عیسائی بعض دفعہ اپنے گھروں یا محلوں میں چھپ جاتے یا بھاگ کر ارد گرد کے گاؤں میں چلے جاتے یا اپنی رہائش کے لئے زمین دوز جگہیں بنا لیتے۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ اپنی قبریں تہ خانوں میں بناتے تھے اور اُن کے لئے زمین سے پتھر نکال کر لاتے تھے۔ اِن پتھروں کے نکالنے سے جو زمین میں گڑھے بن جاتے تھے اُنہی کو صاف کر کے عیسائی اُن میں رہنا شروع کر دیتے تھے۔ روم میں ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں عیسائی ایک لمبے عرصہ تک چھپے رہے۔ اور جن کو کیٹاکومبز (CATACOMBS) کہتے ہیں۔ اُن میں ابھی تک ایسی تصویریں ہیں جو دینی روح قائم رکھنے یا اپنے شہداء کی یاد تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے کھینچی ہوئی ہیں۔ اسی طرح قبروں پر کئی جگہ کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اور اُن میں یہ ذکر ہے کہ یہ کس کی قبر ہے اور کس طرح شہید ہُوا ہے۔ اِن غاروں کا ایک حصہ میں نے بھی دیکھا ہے سارا تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ستر میل تک یہ علاقہ پھیلا ہُوا ہے۔ بہرحال اِن کیٹاکومبز کے دیکھنے سے پُرانی عیسائی تاریخ کا پتہ لگ جاتا ہے کیونکہ مسیحیت کے پھیلنے سے پہلے کے مظالم کا نقشہ ان آثار کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور کتبوں کی عبارات اور تصویروں سے پتہ لگتا ہے کہ اُس وقت مسیحیوں کے کیا عقائد تھے۔ تیسری صدی مسیحی میں روم کا بادشاہ عیسائی ہو گیا تھا اور پھر مسیحیت کو طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے زمانہ سے تعلق رکھنے والی جس قدر باتیں ہیں اُن کا پتہ انہی کیٹاکومبز کے دیکھنے سے لگتا ہے۔ اِن کیٹاکومبز میں ہمیں زیادہ تر تین تصویریں ملتی ہیں۔ ایک نوح کی کشتی کی۔ ایک گڈریا کی جس کے ارد گرد بھیڑیں ہیں اور ایک یوناہ نبی کی جسے مچھلی نگل رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تاریخ میں عیسائی مذہب کی بنیاد صرف تین چیزوں پر رکھی گئی تھی یا یوں کہو کہ تین مسئلے تھے

جو عیسائیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ گڈریا کی تصویر میں اس طرف اشارہ تھا کہ مسیح یہود کی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے۔ نوح کی کشتی کے یہ معنے تھے کہ مسیح ہمارا نجات دہندہ ہے اور یوناہ نبی کی تصویر سے وہ معجزہ مراد تھا جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ گویا ان تین تصویروں کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ مسیحیت کی بنیاد انہی تین باتوں پر ہے (۱) اس پر کہ مسیح اپنی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے (۲) اس پر کہ مسیح نجات دہندہ ہے (۳) اس پر کہ مسیح کو ویسا ہی معجزہ دیا گیا ہے جیسے یوناہ نبی کو دیا گیا تھا۔

پس مسیحیت کی بنیاد اس معجزہ پر ہے بلکہ مسیحیت اسکو ہی ایک حقیقی معجزہ قرار دیتی ہے اور تمام ابتدائی زمانہ کے نقوش اور تصاویر جن کا مسیحیت کے لٹریچر سے پتہ لگتا ہے وہ بھی اسی طرف راہنمائی کرتی ہیں یعنی گڈریا کی تصویر جسے اپنی بھیڑوں سمیت دکھایا گیا ہے۔ نوح کی کشتی کی تصویر اور یوناہ نبی کے مچھلی کے پیٹ میں جانے کی تصویر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا اصل معجزہ یہی تھا خود مسیح بھی اسے اپنا منفرد اور اصل معجزہ قرار دیتا ہے انجیل میں لکھا ہے حضرت مسیح وعظ کر رہے تھے کہ

> "بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اُس سے کہا اے اُستاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں (یعنی ہم ماننے کے لئے تو تیار ہیں لیکن دلائل سے ہماری تسلی نہیں ہوتی ہمیں کوئی نشان دکھایا جائے) اس نے جواب دے کر اُن سے کہا اس زمانہ کے بُرے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان اُن کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہیگا"
>
> (متی باب ۱۲ آیت ۳۸ تا ۴۰)

مسیح نے اس سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں تم کو اَور کئی نشان دکھا چکا ہوں تم اُن سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ اسی طرح مسیح نے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو کئی نشان دکھاؤں گا۔ بلکہ مسیح نے کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا اُن کو اَور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا یہ بتاتا ہے کہ مسیح اپنے اس نشان کو ایک ہی نشان قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی نبی ایسا نہیں ہو سکتا جس نے ایک ہی نشان دکھایا ہو۔ خود انجیل سے ظاہر ہے کہ مسیح نے اَور بھی کئی نشان دکھائے ہیں۔ پس مسیح کا یہ کہنا کہ "یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان انکو نہ دیا جائے گا" اس کے معنے یہ ہیں کہ جہانتک یہودیت کا تعلق ہے بنیادی نشان مسیح کو یوناہ نبی والا ہی دیا جائیگا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں کی شہادت سے بھی یہی بات ثابت ہے۔ اور درحقیقت ابتدائی زمانہ کا عیسائی ہی اس بات کا اہل تھا۔ کہ وہ یہ سمجھتا کہ عیسائیت کی کیا غرض ہے۔ اُن کی تصویروں میں سے پہلی تصویر ہی یوناہ نبی کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو بتاتی ہے کہ ابتدائی زمانہ کے مسیحی یہ تسلیم کرتے تھے۔ کہ یوناہ نبی والا نشان ہی مسیح کا اصل نشان ہے۔ باقی دو تصویریں اس پہلی تصویر کے تابع ہیں یعنی یوناہ نبی والے نشان میں ہی نجات بھی شامل ہے اور یوناہ نبی والے نشان میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا گڈریا والی مثال بھی شامل ہے۔ کیونکہ مسیح واقعہ صلیب کے بعد اپنی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ایران اور افغانستان اور کشمیر میں گیا اور اُس نے انہیں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اور پھر مسیح خود بھی کہتا ہے کہ ایک ہی نشان ہے

جو اس زمانہ کے لوگوں کو دکھایا جائیگا اور وہ یوناہ نبی والا نشان ہے ایک ہی نشان کے معنے یہ ہیں کہ یہ ایک ہی اہم نشان ہی یا ایک ہی قابل اعتماد نشان ہی۔ غرض ابتدائی زمانہ کا عیسائی بھی تسلیم کرتا ہی کہ عیسائیت کی حقیقی شان یوناہ نبی والے نشان سے ہی ظاہر ہوتی ہی اور مسیح بھی اسکو اپنا منفرد اور مہتم بالشان نشان قرار دیتا ہی۔

لوقا میں بھی یہی ذکر آتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

"اس زمانہ کے لوگ بُرے ہیں وہ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان اُن کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ٹھہرے گا۔"

(لوقا باب ۱۱ آیت ۲۹-۳۰)

لوقا نے یہاں ایک زائد بات کہی ہے جبکہ متی نے تو یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر دی تھی کہ "یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان اُن کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔" یہاں متی نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ متی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "نینوہ کے لوگ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اُن کو مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ انہوں نے یوناہ کی منادی پر توبہ کر لی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو یوناہ سے بھی بڑا ہے۔" (متی باب ۱۲ آیت ۴۱) مگر لوقا اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ گویا اس نشان کے متعلق وہ خاص طور پر یہ بتاتا ہے کہ نینوہ کے لوگوں کے لئے جس رنگ میں یوناہ نشان ٹھہرا تھا اُسی رنگ میں اِس زمانہ کے لوگوں کے لئے مسیح نشان ٹھہریگا۔

اِن حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل نشان جو زمانہ مسیح میں دکھایا جانے والا تھا وہ یوناہ نبی والا نشان تھا۔ یہ نشان کیا تھا۔ اس کے متعلق مسیح خود کہتا ہے کہ:۔

"جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔"

اس جگہ حضرت مسیح نے خود تشریح کر دی ہے کہ یوناہ نبی کے نشان سے کیا مراد ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ مشابہت کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ہر چیز میں مشابہت ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصولی باتوں میں مشابہت ہوگی۔ چنانچہ اسی مشابہت کی بناء پر مسیح کہتا ہے کہ جس طرح یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا اسی طرح مسیح قبر میں تین دن رات رہے گا۔ گویا اس نشان کا مقصد یہ تھا کہ مسیح بھی تین دن رات قبر میں رہے اور یوناہ نبی کی طرح خدا تعالیٰ کی حفاظت میں رہے۔ آخر کسی کا مچھلی کے پیٹ میں چلے جانا تو کوئی معجزہ نہیں۔ ہزاروں لوگ مچھلی کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں کہتا کہ یہ معجزہ ہوا ہے پھر یوناہ نبی کا کیا معجزہ تھا؟ یوناہ نبی کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں خدا تعالےٰ کی حفاظت میں رہا۔ تاکہ اُسکی قوم کے لئے اُس کا وجود خدا تعالےٰ کا ایک نشان ثابت ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یوناہ نبی کس طرح مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا۔ اس کے لئے ہم یوناہ نبی کی کتاب کو دیکھتے ہیں اُس میں لکھا ہے:۔

"خداوند کا کلام یوناہ بن متی پر نازل ہوا

کہ اُٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کے خلاف منادی کر کیونکہ اُن کی شرارت میرے حضور پہنچی ہے (نینوہ ایک بڑا شہر تھا خدا تعالےٰ نے یوناہ سے کہا کہ جاؤ اور ان لوگوں کو سمجھاؤ) لیکن یوناہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو بھاگا اور یافا میں پہنچا۔ اور وہاں اُسے ترسیس کو جانے والا جہاز ملا۔ اور وہ کرایہ دے کر اس میں سوار ہُوا تاکہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو اہل جہاز کے ساتھ جائے (یعنی بجائے اس کے کہ وہ اور نبیوں کی طرح خدا تعالےٰ کی ہدایت پر عمل کرتے اور نینوہ والوں کو تبلیغ کرتے اُن کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم وکریم ہے پہلے اس کی طرف سے عذاب کی خبریں ملتی ہیں اور پھر لوگوں کے تضرع پر وہ اُن کو معاف کر دیتا ہے اور لوگ نبیوں کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نینوہ میں جاتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ ترسیس جانے کے لئے جہاز میں سوار ہو گئے) لیکن خداوند نے سمندر پر بڑی آندھی بھیجی اور سمندر میں سخت طوفان برپا ہُوا اور اندیشہ تھا کہ جہاز تباہ ہو جائے۔ تب ملّاح ہراساں ہوئے اور ہر ایک نے اپنے دیوتا کو پکارا اور وہ اجناس جو جہاز میں تھیں سمندر میں ڈال دیں تاکہ اُسے ہلکا کریں (پہلے زمانہ میں بادبانی جہاز ہوتے تھے جو زیادہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتے تھے اس لئے جب طوفان آتا اور جہاز ڈوبنے کا خطرہ ہوتا تو وہ اپنے سامان کا کچھ حصہ سمندر میں

پھینک دیتے تھے تاکہ اُس کا بوجھ ہلکا ہو جائے) لیکن یوناہ جہاز کے اندر پڑا سو رہا تھا (باقی لوگ تو دعائیں کر رہے تھے اور جہاز کا بوجھ ہلکا کر رہے تھے اور یوناہ اندر سو رہے تھے) تب ناخدا اُس کے پاس جا کر کہنے لگا تو کیوں پڑا سو رہا ہے اُٹھ اپنے معبود کو پکار شاید وہ ہم کو یاد کرے اور ہم ہلاک نہ ہوں اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب سے آئی چنانچہ انہوں نے قرعہ ڈالا اور یوناہ کا نام نکلا۔ تب انہوں نے اُس سے کہا۔ تُو ہم کو بتا کہ یہ آفت ہم پر کس سبب سے آئی ہے۔ تیرا کیا پیشہ ہے اور تو کہاں سے آیا ہے۔ تیرا وطن کہاں ہے اور تو کس قوم کا ہے۔ اُس نے اُن سے کہا۔ میں عبرانی ہوں (ضمنی طور پر ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے یوناہ عبرانی نہیں تھا بلکہ کسی اور قوم کا نبی تھا۔ کیونکہ وہ نینوہ والوں کی طرف بھیجا گیا تھا جو کہ اشور کا دارالخلافہ تھا اور وہاں کے لوگ اشور قوم کے تھے۔ اشور سے مراد سیریا یعنی شام کا علاقہ نہیں بلکہ یہ الگ علاقہ ہے اور شہر بابل کے شمال سے شروع ہو کر آرمینیا کی سرحد سے جا ملتا ہے اور مشرقی طرف اس کی کردستان سے ملتی ہے۔ اور مغربی سمت دجلہ کے مغرب کے علاقہ کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ گویا موجودہ عراق کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔ ایک زمانہ میں اس علاقہ میں زبردست حکومت قائم تھی۔ اس کا دارالخلافہ پہلے تو اسور تھا جو موصل سے ساٹھ میل جانب شمال واقع تھا اور اب اسے قلعات شرجت کہتے ہیں

لیکن تیرہ سو سال قبل مسیح اس شہر کو چھوڑ کر
نینوہ کو دار الحکومت قرار دیا گیا۔ محققین یورپ
بھی اس بارہ میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا یونس نبی
اسرائیلی ہے یا نہیں) اور خداوند آسمان کے
خدا بحر و بر کے خالق سے ڈرتا ہوں۔ تب وہ
خوف زدہ ہو کر اس سے کہنے لگے تو نے یہ کیا
کیا۔ کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ وہ خداوند کے
حضور سے بھاگا ہے۔ اِس لئے کہ اُس نے
خود اُن سے کہا تھا۔ تب انہوں نے اس سے
پوچھا ہم تجھ سے کیا کریں کہ سمندر ہمارے لئے
ساکن ہو جائے کیونکہ سمندر زیادہ طوفانی
ہوتا جاتا ہے؟ تب اُس نے اُن سے کہا مجھ
کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دو تو تمہارے
لئے سمندر ساکن ہو جائے گا کیونکہ میں جانتا
ہوں کہ یہ بڑا طوفان تم پر میرے ہی سبب سے
آیا ہے۔ تو بھی ملاحوں نے ڈانڈ چلانے میں
بڑی محنت کی کہ کنارہ پر پہنچیں لیکن نہ پہنچ سکے
کیونکہ سمندر اُن کے خلاف اور بھی زیادہ
موجزن ہوتا جاتا تھا۔ تب انہوں نے خداوند
کے حضور گڑگڑا کر کہا۔ اے خداوند ہم تیری
منت کرتے ہیں کہ ہم اس آدمی کی جان کے
سبب سے ہلاک نہ ہوں اور تو خونِ ناحق کو
ہماری گردن پر نہ ڈالے۔ کیونکہ اے خداوند
تو نے جو چاہا سو کیا۔ اور انہوں نے یوناہ کو اٹھا کر
سمندر میں پھینک دیا اور سمندر کا تلاطم موقوف ہو گیا
تب وہ خداوند سے بہت ڈر گئے اور انہوں نے
اس کے حضور قربانی گذرانی اور نذریں مانیں
لیکن خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی
تھی کہ یوناہ کو نگل جائے اور یوناہ تین دن رات

مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ تب یوناہ نے مچھلی کے
پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے یہ دعا کی۔
میں نے اپنی مصیبت میں خداوند سے دعا کی
اور اس نے میری سنی۔ میں نے پاتال کی
تہ سے دہائی دی تو نے میری فریاد سنی۔
تُو نے مجھے گہرے سمندر کی تہ میں پھینک دیا
اور سیلاب نے مجھے گھیر لیا۔ تیری سب موجیں
اور لہریں مجھ پر سے گذر گئیں اور میں سمجھا کہ تیرے
حضور سے دور ہو گیا ہوں۔ لیکن میں پھر تیری
مقدس ہیکل کو دیکھوں گا۔ سیلاب نے میری
جان کا محاصرہ کیا۔ سمندر میری چاروں طرف
تھا۔ بحری نبات میرے سر پر لپٹ گئی۔ میں
پہاڑوں کی تہ تک غرق ہو گیا۔ زمین کے اڑبنگے
ہمیشہ کے لئے مجھ پر بند ہو گئے۔ تو بھی
اے خداوند میرے خدا تُو نے میری جان پاتال
سے بچائی جب میرا دل بیتاب ہوا تو میں نے
خداوند کو یاد کیا اور میری دعا تیری مقدس
ہیکل میں تیرے حضور پہنچی۔ جو لوگ جھوٹے
معبودوں کو مانتے ہیں وہ شفقت سے محروم
ہو جاتے ہیں۔ میں حمد کرتا ہوا تیرے حضور قربانی
گذرانوں گا۔ میں اپنی نذریں ادا کروں گا۔
نجات خداوند کی طرف سے ہے اور خداوند
نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے یوناہ کو خشکی پر
اُگل دیا اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ
پر نازل ہوا کہ اُٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا
اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے
حکم دیتا ہوں۔ تب یوناہ خداوند کے کلام
کے مطابق اُٹھ کر نینوہ کو گیا اور نینوہ
بہت بڑا شہر تھا۔ اس کی مسافت تین دن کی

راہ تھی اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن
کی راہ چلا۔ اُس نے منادی کی اور کہا چالیس
روز کے بعد نینوہ برباد کیا جائیگا تب نینوہ
کے باشندوں نے خدا پر ایمان لاکر روزہ
کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سبنے ٹاٹ اوڑھا
اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی۔ اور
وہ اپنے تخت پر سے اُٹھا اور بادشاہی لباس
کو اُتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا
اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے
فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا۔ اور
اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا
حیوان گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے
نہ پئے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے
ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ و زاری
کریں بلکہ ہر شخص اپنی بُری روش اور اپنے
ہاتھ کے ظلم سے باز آئے شاید خدا رحم کرے
اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے
باز آئے۔ اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے
انکی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بُری روش
سے باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اُس نے
اُن پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اُسے
نازل نہ کیا۔ لیکن یوناہ اس سے نہایت ناخوش
اور ناراض ہوا اور اس نے خداوند سے یوں
دعا کی کہ اے خداوند جب میں اپنے وطن ہی
میں تھا اور ترسیس کو بھاگنے والا تھا تو کیا
میں نے یہی نہ کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تو رحیم و
کریم خدا ہے جو قہر کرنے میں دھیما اور
شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے
سے باز رہتا ہے۔ اب اے خداوند میں
تیری منت کرتا ہوں کہ میری جان لیلے
کیونکہ میرے اس جینے سے مرجانا بہتر ہے
تب خداوند نے فرمایا کیا تو ایسا ناراض ہے
اور یوناہ شہر سے باہر مشرق کی طرف جا بیٹھا
اور وہاں اپنے لئے ایک چھپر بنا کر اُس کے
سایہ میں بیٹھ رہا کہ دیکھے شہر کا کیا حال ہوتا
ہے۔ تب خداوند خدا نے کدو کی بیل اُگائی
اور اُسے یوناہ کے اوپر پھیلا دیا کہ اس کے
سر پر سایہ ہو اور وہ تکلیف سے بچے۔
(بائبل کہتی ہے اُس نے پہلے چھپر بنایا اور
پھر خدا نے کدو کی بیل اُگائی حالانکہ چھپر
کے بعد بیل کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ چھپر
زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم میں
چھپر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا خالی بیل کا ذکر کیا
گیا ہے جو ثبوت ہے کہ قرآنی بیان ہی صحیح
ہے اور عقل کے مطابق ہے) اور یوناہ اُس
بیل کے سبب سے نہایت خوش ہوا۔ لیکن
دوسرے دن صبح کے وقت خدا نے ایک کیڑا
بھیجا جس نے اس بیل کو کاٹ ڈالا۔ اور
وہ سوکھ گئی اور جب آفتاب بلند ہوا تو
خدا نے مشرق سے لُو چلائی اور آفتاب کی
گرمی نے یوناہ کے سر میں اثر کیا اور وہ بیتاب
ہو گیا اور موت کا آرزومند ہو کر کہنے لگا کہ
میرے اس جینے سے مرجانا بہتر ہے اور
خدا نے یوناہ سے فرمایا کیا تو اس بیل کے
سبب سے ایسا ناراض ہے۔ اُس نے کہا
میں یہاں تک ناراض ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں
تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس بیل کا اتنا
خیال ہے جس کے لئے تو نے نہ کچھ محنت کی

اور نہ اُسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگی اور ایک
ہی رات میں سوکھ گئی۔ اور کیا مجھے لازم نہ تھا
کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ کا خیال کروں۔
جس میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ
ایسے ہیں جو اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ میں امتیاز
نہیں کر سکتے اور بے شمار مویشی ہیں "

(یوناہ باب ۱ تا ۴)

یہ ہے وہ یوناہ نبی کا واقعہ جس کی طرف حضرت مسیح
اشارہ کرتے ہیں۔ اس واقعہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ یوناہ نبی کو جب یہ الہام ہُوا کہ جا اور اپنی قوم کو تبلیغ
کر۔ تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی قوم کو تبلیغ کرتے اس
خیال سے کہ نبی جب تبلیغ کرتے ہیں تو انہیں کچھ انذاری
پیشگوئیاں بھی ملتی ہیں۔ لیکن خدا تعالٰے رحم کرکے اپنے
بندوں کو معاف کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں شرمندہ
ہونا پڑتا ہے، انہوں نے ایک دوسرے ملک کو بھاگ کر
جانا چاہا۔ تاکہ وہ اُس ذلّت سے بچ سکیں جو انہیں اپنی قوم
سے پہنچ سکتی تھی۔ لیکن اللہ تعالٰے چاہتا تھا کہ وہ نینوہ
کے لوگوں کی طرف ہی جائیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام
پہنچائیں چنانچہ اس نے تدبیر کرکے انہیں سمندر میں
پھینکوا دیا۔ اور پھر ایک بڑی مچھلی کو انہیں نگل جانے کا
حکم دے دیا جس نے انہیں زندہ نگل لیا۔ چنانچہ بائبل کے
بیان کے مطابق وہ مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں
کرتے رہے اور دعائیں زندہ شخص ہی کیا کرتا ہے نہ کہ مُردہ۔
پس مچھلی کے پیٹ میں وہ زندہ گئے اور مچھلی کے پیٹ
میں جب تک رہے زندہ رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ
کے منشاء کے مطابق مچھلی نے آپ کو اُگل دیا۔ سمندر میں
نہیں بلکہ خشکی پر۔ اور پھر اُنہیں اللہ تعالٰے کی طرف
سے نینوہ کے لوگوں کی تبلیغ کے لئے بھجوایا گیا۔ چنانچہ
وہ گئے اور اپنی تبلیغ میں کامیاب ہوئے۔ اس معجزہ
سے ظاہر ہے کہ

(۱) یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا۔
(۲) وہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا۔
(۳) وہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا۔
(۴) اُس کا اصل تبلیغ کا زمانہ مچھلی کے پیٹ سے
نکلنے کے بعد شروع ہُوا۔

پہلے تو انہوں نے لوگوں کو بتایا ہی نہیں کہ مجھے
تمہاری اصلاح کے لئے بھجوایا گیا ہے۔ ممکن ہے چند
لوگوں سے انہوں نے ذکر کیا ہو لیکن عام لوگوں کو اُن کے
مشن کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ وہاں سے بھاگے اور
انہوں نے چاہا کہ ایک دوسرے ملک کو نکل جائیں لیکن
مچھلی کے واقعہ کے بعد اللہ تعالٰے نے پھر اُن کو اپنے
ملک میں بھجوا کر کہا کہ اب تبلیغ کرو۔ چنانچہ انہوں نے
تبلیغ کی اور لوگ آپ پر ایمان لائے۔

اس نشان کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص
اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ اسی صورت میں مسیح
پر چسپاں ہو سکتا ہے۔ جب

اوّل۔ مسیح زندہ قبر میں جاتے
دوم۔ مسیح زندہ قبر میں رہتے
سوم۔ مسیح زندہ قبر میں سے نکلے
چہارم۔ قبر سے نکلنے کے بعد اُسے ایک کامیاب
تبلیغ کا زمانہ میسر آئے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو یوناہ نبی کے واقعہ سے
نکلتی ہیں۔ اگر مسیحی کہانی صلیبی موت کی ٹھیک ہے تو
پھر یہ چاروں باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں (۱) اگر مسیح
صلیب پر مر گیا اور زندہ قبر میں نہیں گیا اور (۲) اگر
مسیح قبر میں تین دن رات مردہ رہا بلکہ دوزخ میں رہا۔ تو
یوناہ نبی سے اُس کی کوئی مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی۔
کیونکہ یوناہ نبی تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا۔

اور اُس کی خدا تعالیٰ سے صلح رہی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا رہا۔ لیکن مسیح اول تو مر کر قبر میں گیا اور پھر دوزخ میں رہا۔ گویا وہ خدا تعالیٰ سے دور ہو گیا۔

(۳) اسی طرح اگر مسیح قبر میں سے دوبارہ زندہ ہو کر نکلے ہیں تو اس صورت میں بھی وہ یوناہ نبی کے مثیل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ سے دوبارہ زندہ ہو کر نہیں نکلے۔ وہ پہلے بھی زندہ تھے، مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رہے اور زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔

(۴) اگر قبر میں سے جی اُٹھنے کے بعد مسیح کا مشن ختم ہو گیا جیسے مسیحیت کہتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر پہلے تین دن دوزخ میں رہا اور جب دوبارہ جی کر اُٹھا تو آسمان پر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھنے کے لئے چلا گیا۔ تو اس کی یوناہ نبی سے کوئی بھی مشابہت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ یوناہ نبی کا تو یہ معجزہ تھا کہ اُسے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک کامیاب تبلیغ کا موقع عطا فرمایا۔ اور درحقیقت اصل معجزہ یہی تھا کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ دیکھو یوناہ نے میری بات کو رد کیا اور وہ میرا پیغامبر نہ بنا وہ ڈرا کہ میں ذلیل ہوں گا اور لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ بھاگا لیکن ہم نے اُسے مچھلی کے پیٹ میں ڈالا اور پھر مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا اور آخر ہم نے مچھلی کو حکم دیا تو اس نے یوناہ کو خشکی پر اُگل دیا۔ اس کے بعد ہم نے پھر اُسے نینوہ میں ہی بھجوایا اور اس نے تبلیغ کی اور وہ اپنی تبلیغ میں کامیاب رہا۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے اسباب کا اظہار کیا کہ جس شخص کو خدا اپنا پیغامبر بناتا ہے وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا بھی کمزور خیال کرے اور خواہ دنیا کے لوگ اُسے کتنا بھی حقیر سمجھیں اللہ تعالیٰ یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ اُسی کے ذریعہ اپنے پیغام کو کامیاب کرے اور لوگوں میں اُسے مقبول بنا دے۔ یہ ہے یوناہ کا اصل نشان جو نینوہ والوں کو دکھایا گیا لیکن مسیح کا واقعہ جس رنگ میں عیسائی پیش کرتے ہیں اگر اُسے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یوناہ سے کوئی بھی مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یوناہ نبی کا اصل معجزہ یہ تھا کہ اُسے تبلیغ کا موقعہ دیا گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ وہی جو اپنی کمزوری کی وجہ سے ڈر کر بھاگ گیا تھا ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا۔ اور لوگوں نے اس کو قبول کر کے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی۔ ورنہ یوناہ نبی جب مچھلی کے پیٹ میں گئے تھے نینوہ والوں نے اُن کو نہیں دیکھا تھا۔ یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہے تب بھی نینوہ والوں نے اُن کو نہیں دیکھا تھا۔ یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلے تب بھی نینوہ والوں نے اُن کو نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے اور نینوہ والوں کے درمیان اُس وقت پانچ سات سو بلکہ ہزار میل کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے یہ کب دیکھا کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا ہے یا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا ہے یا مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلا ہے۔ پس ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو نینوہ والوں نے دیکھی ہو۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا تب بھی نینوہ والوں نے اُسے نہیں دیکھا۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تب بھی نینوہ والوں نے اُسے نہیں دیکھا اور جب مچھلی نے اُسے اُگل دیا تب بھی نینوہ والوں نے اُسے نہیں دیکھا۔ لیکن جب یوناہ نینوہ والوں کے پاس دوبارہ گیا اور انہوں نے دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو ڈر کر بھاگ گیا تھا مگر پھر خدا تعالیٰ اُسے پکڑ کر واپس لایا ہے اور جس جگہ کے متعلق یہ سمجھتا تھا کہ وہاں مجھے کامیابی نہیں ہوگی وہیں اللہ تعالیٰ نے اُسے کامیابی عطا فرمائی ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور اُس کی طاقتوں کا ایک بہت بڑا نشان بن گیا جو انہوں نے دیکھا اور مسیح نے اپنے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ

"جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کیلئے نشان ٹھہرا اُسی طرح ابنِ آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ٹھہرے گا۔"

(لوقا باب ۱۱ آیت ۳۰)

اب سوال یہ ہے کہ نینوہ والوں نے کیا دیکھا تھا۔ نینوہ والوں نے یوناہ کو مچھلی کے پیٹ میں جاتے نہیں دیکھا۔ مچھلی کے پیٹ میں رہتے نہیں دیکھا مچھلی کے پیٹ میں سے نکلتے نہیں دیکھا۔ نینوہ والوں نے یہی دیکھا کہ ایک شخص پر الہام نازل ہُوا کہ جا اور نینوہ والوں کو ہماری طرف بُلا۔ مگر اُسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغام اُن کو پہنچاتے۔ اور اُس نے بھاگ کر کسی اور ملک کو جانا چاہا۔ مگر کئی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد خدا تعالیٰ اُسے پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور نینوہ والے اس کا پیغام ماننے پر مجبور ہو گئے۔ پس اگر کوئی نشان ایسا ہے جو نینوہ والوں نے دیکھا تو وہ یہی نشان ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مچھلی کے پیٹ میں اُن کا جانا ہے یہ بھی ایک نشان ہے۔ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا یہ بھی ایک نشان ہے اور مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلنا یہ بھی ایک نشان ہے۔ مگر یہ نشانات ایسے ہیں جو نینوہ والوں نے نہیں دیکھے۔ انہوں نے جو نشان دیکھا وہ یہی ہے کہ یوناہ نبی کے دل میں وسوسہ پیدا ہُوا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اُس نے نہ چاہا کہ نبوت کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ لیکن خدا اُسے سینکڑوں میل سے مجبور کر کے اور کئی قسم کی تکلیفوں میں سے گذار کر پھر اُسے اپنی قوم کے پاس لایا اور خدا تعالیٰ نے وہ مشن پورا کر کے دکھا دیا جس کے لئے اُس نے یوناہ کو کھڑا کیا تھا۔ لوگوں نے اُن کا انکار بھی کیا، مقابلہ بھی کیا مگر آخر قوم کو جھکنا پڑا۔ یہ نشان تھا جو نینوہ والوں نے دیکھا

پس مسیح کے لئے بھی یہ نشان اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مسیح قبر میں زندہ جائے، قبر میں زندہ رہے، اور قبر میں سے زندہ نکلے۔ مگر اتنا حصہ وہ ہوگا جس کو دشمن نے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد نشان کا یہ حصہ آئیگا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تبلیغ کرے جو اس وقت نینوہ کے قریب اور ایران اور افغانستان اور کشمیر میں رہتی تھیں اپنے مذہب میں داخل کرے اور اس طرح اُس مقصد میں کامیاب ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو یوناہ نبی سے مسیح کی مماثلت ثابت ہو جاتی ہے اور وہ معجزہ جس کے دکھانے کا انہوں نے وعدہ کیا تھا وہ دنیا پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یوناہ نبی والا نشان پورا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال جس طرح یوناہ نبی نے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اپنی قوم کو تبلیغ کی اور وہ اس تبلیغ میں کامیاب ہوئے اسی طرح مسیح کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ قبر میں سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو تبلیغ کرتا اور انہیں ہدایت پر لاتا۔ اگر اُس نے ایسا نہیں کیا تو یوناہ نبی کا نشان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے وہی نشان دکھایا ہے جو یوناہ نبی نے اپنی قوم کو دکھایا تھا۔ نینوہ والوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو ناقابل سمجھتے ہوئے یہاں سے بھاگ گیا تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے گریز کیا تھا وہ پھر ہم میں واپس آیا اور ہم اُس پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن مسیح واقعہ صلیب کے بعد اگر غائب ہو گیا تھا تو یوناہ سے اس کی مشابہت کس طرح ہوئی اور نینوہ والوں کی طرح کونسا نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا۔ گویا وہ نشان جو یوناہ نبی کی طرح مسیح کے لئے دکھانا ضروری تھا اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ

کس طرح اللہ تعالیٰ اُن لوگوں سے بھی کام لے لیتا ہے جو اپنے آپ کو کام کے ناقابل سمجھتے ہیں وہ تو مسیح نے نہ دکھایا اور وہ حصہ جو یوناہ نبی نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھا دیا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب یوناہ کو پھر نینوہ میں لایا تو انہوں نے لوگوں کو کام کر کے دکھایا کہ دیکھو خدا تعالیٰ سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا۔ میں بھاگا تھا مگر پھر مجھے پکڑ کر خدا تمہاری طرف واپس لایا۔ یہ نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا اور ہر شخص جو معمولی عقل و سمجھ سے کام لے کر بھی اس نشان پر غور کرے گا وہ بے اختیار یہ کہہ اُٹھے گا کہ سبحان اللہ یہ کتنا بڑا نشان ہے۔

یوناہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغامبر بنے اور وہ ڈر کر کسی اور ملک کی طرف بھاگا مگر خدا اُسے پکڑ کر پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور جب اُس نے پیغام پہنچایا تو وہی نینوہ والے جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے یوناہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

جو اس نشان پر جتنا بھی غور کرے گا اُسے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان لانا پڑے گا اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھے گا کہ اللہ تعالیٰ کتنی بڑی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رُتبہ بخشتا ہے۔ لیکن اگر یوناہ لوگوں سے یہ کہتا کہ دیکھو میں مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تھا یا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا تھا۔ تو لوگ کہتے یہ بالکل جھوٹ اور فریب ہے ہم اسے نہیں مان سکتے۔ پس مسیح کی یوناہ نبی سے مماثلت اگر پوری ہو سکتی تھی تو اسی طرح کہ وہ یوناہ نبی کی طرح زندہ ہی قبر میں جاتا، زندہ ہی قبر میں رہتا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلتا اور پھر واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کے ایک حصہ میں کامیاب تبلیغ کرتا۔ لیکن انجیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو نشان یوناہ نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ تو مسیح نے لوگوں کو دکھایا اور جو نشان یوناہ نے لوگوں کو دکھایا وہ مسیح نے نہیں دکھایا۔ مچھلی کے پیٹ میں زندہ جانے، اُس کے پیٹ میں زندہ رہنے اور اسکے پیٹ میں سے زندہ نکلنے کا نشان یوناہ نے نینوہ والوں کو نہیں دکھایا۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ قبر میں جانے، قبر میں رہنے اور قبر میں سے نکلنے کا نشان مسیح نے لوگوں کو دکھایا۔ پھر بائبل بتاتی ہے کہ یوناہ نے نینوہ والوں کو یہ نشان دکھایا کہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اس نے تبلیغ کی اور نینوہ والے اُسے ماننے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن انجیل کہتی ہے کہ مسیح قبر میں سے نکلنے کے بعد غائب ہو گیا اور اس نے کوئی تبلیغ نہیں کی۔ گویا جو نشان یوناہ نے دکھایا تھا اور جو اصل نشان تھا وہ تو مسیح نے نہیں دکھایا اور جو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھایا۔ پھر بائبل تو بتاتی ہے کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا، زندہ رہا اور زندہ نکلا۔ لیکن مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح قبر میں مر گیا، قبر میں تین دن مردہ پڑا رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکل آیا۔ اگر مسیحیوں کی یہ بات درست ہے تو یوناہ نبی کا نشان مسیح نے نہیں دکھایا اور اگر اُس نے یوناہ نبی کا نشان دکھایا تھا اور وہ صلیب پر نہیں مرا۔ نہ مُردہ ہونے کی حالت میں قبر میں رہا تو کفارہ کا مسئلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کفارہ تب ثابت ہوتا ہے

جب یہ مانا جائے کہ مسیح نے صلیب پر لٹک کر لوگوں
کے گناہ اٹھالئے۔ اگر وہ زندہ ہی رہا تھا تو ثابت ہُوا
کہ اُس نے کوئی قربانی نہیں دی تھی اور جب قربانی
نہیں دی تھی تو کفارہ بھی باطل ہُوا۔

غرض صلیب کا واقعہ جسے مسیحی پیش کرتے
ہیں سرتاپا اس نشان کے خلاف ٹھہرتا ہے جو یوناہ
نے دکھایا تھا اور جس کے دکھانے کا مسیح نے اپنی قوم
سے وعدہ کیا تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نتیجہ جو ہم نے یوناہ نبی
کی پیشگوئی سے نکالا ہے آیا اس کا ذکر مسیح کی کسی پیشگوئی
میں بھی ہے؟ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم انجیل پر غور
کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ یہی
بات حضرت مسیح نے بھی بیان کی ہے بلکہ مسیح سے پہلے
جو انبیاء گذرے ہیں اور جنہوں نے حضرت مسیح کے
آنے کی پیشگوئی کی تھی انہوں نے بھی اس واقعہ کی طرف
اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ یسعیاہ میں لکھا ہے:۔

"خداوند یہوواہ جو اسرائیل کے تتر بتر کئے
ہوؤں کا جمع کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے
کہ میں اُن کے سوا جو اُسی کے ہو کے جمع
ہوئے ہیں اوروں کو بھی اس پاس جمع کرونگا۔"

(یسعیاہ باب ۵۶ آیت ۸)

یہاں یسعیاہ نبی یہ پیشگوئی فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا
آئے گا جبکہ خدا تعالیٰ اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو
پھر اکٹھا کرے گا اور ایک نبی بھیجیگا جس کے اردگرد
وہ جمع ہو جائیں گی۔ یسعیاہ نبی جو اس جگہ خبر دیتے
ہیں یہ مسیح کے بارہ میں ہے کیونکہ مسیح کے سوا اور کوئی
شخص نہیں جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں بنی اسرائیل
کی گمشدہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں۔ یہ جو
گمشدہ بھیڑیں ہیں ان سے مراد بنی اسرائیل کے وہ
دس قبیلے ہیں جن کو نبوکد نضر کے زمانہ میں عراقی حکومت
نے حملہ کرکے تباہ کر دیا تھا۔ اس حملہ کا افسوسناک
پہلو یہ تھا کہ اُس وقت یہودیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی
تھی اور وہ ایک دوسرے کی دشمنی میں مشغول رہتے تھے
چنانچہ اُس وقت یہود کی دو حکومتیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک
اسرائیل کہلاتے تھے اور دوسرے یہودی کہلاتے
تھے۔ ایک یروشلم سے تعلق رکھتے تھے اور دوسروں نے
اپنا الگ دارالحکومت بنایا ہوا تھا۔ جب عراقی حکومت
نے یہودی حکومت کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کیا۔ تو یہود
کا ایک حصہ دوسروں کی دشمنی کی وجہ سے اس کے ساتھ
مل گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عراقی حکومت یہود کی آپس کی پھوٹ
کی وجہ سے ملک پر غالب آگئی۔ اور اس نے یہود کے
تمام مقدس مقامات تباہ کر دئے حتیٰ کہ یروشلم کا معبد
جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہُوا تھا اُس میں
سؤر کی قربانی کی گئی۔ اور اسی طرح اور بہت کچھ
مظالم کئے گئے۔ چونکہ یہود کا حکومت سے دیر سے
مقابلہ چلا آتا تھا اس لئے حکومت نے فیصلہ کیا کہ اب
ان کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ چنانچہ بارہ یہودی
قبائل میں سے دس کو اُس نے پکڑ لیا اور مشرق کے
علاقہ میں لاکر پھیلا دیا۔ صرف دو قبائل فلسطین میں رہ گئے
تھے۔ اور یہ دو قبائل وہ تھے جنہوں نے اپنی قوم سے
دشمنی کرکے دشمن کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے اُن سے دشمن
نے رعایت برتی۔ بہرحال وہ دس قبائل جو مشرق کے
علاقہ میں لاکر پھیلا دئے گئے تھے اُن کے متعلق بائبل
میں تو اتنا ہی لکھا ہُوا ہے کہ ایران کے مشرق کے علاقہ
میں یہود کے دس قبائل کو پھیلا دیا گیا۔ لیکن ہماری
تحقیقات سے ثابت ہے کہ یہ علاقے افغانستان اور کشمیر
کے تھے اور چونکہ ایک لمبا فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا
تھا اور بابلیوں کی کوشش بھی یہی تھی کہ یہ لوگ واپس نہ آئیں

اس لئے دیر تک اُن کا حال چھپا رہا۔ مگر تمام یہود
انہوں نے مشرق میں نہیں بھیجے بلکہ کچھ لوگ اپنی خدمت
کے لئے انہوں نے بابل اور اس کے اردگرد رکھ لئے
تھے۔ یہ لوگ جو وہاں رہے تھے فارس اور میدیہ کے
بادشاہوں کی مدد سے پھر واپس آئے اور انہوں نے یروشلم
کی بستیاں دوبارہ بسائیں۔ ان یہودیوں کا قرآن کریم
میں بھی ذکر آتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو کشمیر اور افغانستان
بھیج دئے گئے تھے اُن کا واپس آنا مشکل تھا اور پھر
چونکہ وہ ایک لمبا عرصہ بدھوں کے ساتھ رہے اور
اُن کی تہذیب سے متاثر ہوگئے اس لئے وہ اپنی
روایات اور اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو بھی بھول
گئے۔ اس وجہ سے اُن کے واپس آنے کی کوئی صورت
نہیں بنتی تھی۔ اِن لوگوں کے متعلق یہود کا یہ خیال تھا
کہ یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مطابق مسیح ان گمشدہ
بھیڑوں کو واپس لاکر اپنی قوم سے ملا دے گا۔ اور
یسعیاہ نبی کی پیشگوئی جس سے یہود کو یہ امید تھی
کہ اُن کی گمشدہ بھیڑیں پھر اپنے بھائیوں سے
آملیں گی وہی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام بھی اسی بارہ میں کئی
جگہ پر ذکر فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے
شاگردوں کی جماعت کو تبلیغ کے لئے بھجوایا تو اس
موقعہ پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحتیں کیں
اُن میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے
کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل
کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے
پاس جانا" (متی باب ۱۰ آیت ۶)

یہ نصیحت انہوں نے اسی لئے کی تاکہ وہ پیشگوئی
پوری ہو جائے جو یسعیاہ نبی نے کی تھی کہ جو اسرائیلی
کھوئے گئے ہیں وہ مسیح کے ذریعہ پھر اکٹھے ہو جائیں گے
آپ کہتے ہیں غیر قوموں کی طرف توجہ نہ کرنا بلکہ صرف
اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس
جانا اور انہیں تبلیغ کرنا۔

اِسی طرح متی باب ۱۵ آیت ۲۱ تا ۲۸ میں لکھا ہے
کہ ایک عورت کی لڑکی بیمار تھی معلوم ہوتا ہے اُس زمانہ
میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جن آدمی کو بیمار
کر دیا کرتے ہیں اور اگر جن نکال دیا جائے تو آدمی
اچھا ہو جاتا ہے۔ اُس نے سُنا ہوا تھا کہ مسیح جن
نکالتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح کہیں جا رہے تھے کہ
اُس نے آپ کو دیکھ لیا اور وہ آپ کے پیچھے پیچھے شور
مچاتی اور آوازیں دیتی دوڑی کہ اے خدا کے مقدس
مجھ پر رحم کر اور میری لڑکی کا جن نکال دے۔ لیکن
حضرت مسیح اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے کیونکہ
وہ غیر قوم کی تھی۔ مگر وہ برابر شور مچاتی چلی جاتی تھی
اور درخواست کرتی تھی کہ اُس کی بیٹی کو بدروح سے
بچایا جائے۔ جب شاگردوں نے دیکھا کہ اس طرح
ایک عورت پیچھے پیچھے شور مچاتی آ رہی ہے تو انہوں
نے آپ کو توجہ دلائی کہ حضور یہ عورت میلوں میل
سے بھاگی چلی آ رہی ہے اور شور مچا رہی ہے۔ کہ
میری بیٹی کی بدروح نکالی جائے۔ اس پر حضرت
مسیح نے کہا

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی
بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں
بھیجا گیا"

اس میں حضرت مسیح نے بتایا کہ میرا اصل مقصد یہ
ہے کہ اسرائیل کے گھرانے کی وہ دس قومیں جو کھوئی
گئی ہیں انہیں تبلیغ کروں اور انہیں پھر اپنے مذہب پر
قائم کروں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبیوں کو الہام سے

یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دوسری قوموں میں رہنے کی وجہ سے وہ اپنے مذہب کو بھول چکی ہیں اور موسوی شریعت پر اُن کا عمل نہیں رہا۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ دوبارہ اُن کو مذہب کی طرف لایا جائے۔ "کھوئی ہوئی بھیڑوں" کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ظاہری طور پر وہ غیر ملک میں چلی گئی تھیں بلکہ روحانی طور پر بھی غیر مذاہب کا اثر انہوں نے قبول کر لیا تھا پس وہ روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے کھوئی ہوئی تھیں۔ اِسی وجہ سے جس طرح حضرت مسیحؑ نے یہ کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان یہودیوں کو نہیں دکھایا جائے گا اور یہی میرا سب سے بڑا نشان ہوگا۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ میرا سب سے بڑا مشن یہی ہے کہ میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو پھر جمع کر دوں۔ اِسی طرح یوحنا میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول درج ہے کہ

> "میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں مجھے اُنکا بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔" (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۶)

یہاں حضرت مسیحؑ یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ یہودی کسی اور ملک میں رہتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ "میری اَور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں" یعنی اس ملک کی نہیں بلکہ وہ کسی اور ملک میں رہتی ہیں اور میرے لئے یہ امر فیصل شدہ اور مقدر ہے کہ میں اُن کو لاؤں اِن بھیڑوں نے تو میرا انکار کیا ہے لیکن وہ میری آواز سنیں گی اور مجھے مان لیں گی۔ یوں تو نبی کا انکار لوگ کیا ہی کرتے ہیں حضرت مسیحؑ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو ضد کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں مگر وہ ضد کی وجہ سے انکار نہیں کریں گے بلکہ جلدی ہی مجھ پر ایمان لے آئیں گے "پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا" یہ الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ اُس وقت موسوی قوم کا ایک بڑا حصہ موسوی شریعت کو چھوڑ بیٹھا تھا اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کے ذریعہ پھر اُن کو موسوی مذہب کی طرف واپس لائے اور اس طرح سب کو ایک قوم بنا دے۔

اِن حوالجات سے ثابت ہے کہ گذشتہ نبیوں کے ذریعہ سے مسیحی مشن کی نسبت یہ خبر دی گئی تھی کہ

(۱) وہ اُسی طرح مشرقی ممالک کے یہود کو پیغام دے گا جس طرح فلسطین کے یہود کو دے گا۔

(۲) یہ کہ مسیحؑ کے نزدیک جہاں فلسطین کی بھیڑوں نے اس کو کم مانا ہے وہاں دوسری بھیڑیں اس کی آواز کو زیادہ سنیں گی اور اس پر جلد ایمان لائیں گی۔

(۳) مسیحؑ کا اُن لوگوں تک جانا اور اُنہیں پیغام پہنچانا ضروری ہے۔

یہ تین باتیں ہیں جو اِن حوالوں سے نکل آتی ہیں اوّل یہود کے ملک سے باہر کچھ یہودی قبائل ہیں جن تک مسیحؑ اپنا پیغام پہنچائے گا۔ دوسرے وہ لوگ اسکی بات سنیں گے اور اُسے مان لیں گے۔ تیسرے مسیحؑ کا اُن لوگوں تک جانا کوئی اختیاری بات نہیں۔ بلکہ اُن کا وہاں جانا اور پیغام پہنچانا ایک ضروری امر ہے۔ اِن تین نتیجوں کو یوناہ نبی کی پیشگوئی سے ملا لو تو ایک ہی بات بن جاتی ہے یوناہ نبی کو بھی ایک غیر ملک کی طرف بھجوایا گیا تھا چنانچہ واقعات پڑھ کر دیکھ لو۔ یوناہ نینوہ کی مملکت میں نہیں رہتے تھے۔ انہیں الہام ہوا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ جو مشرق کی طرف ہے۔ اسی طرح مسیحؑ کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرق کی طرف ایک غیر ملک میں جائیں اور انہیں پیغام پہنچائیں۔ دوسرے یوناہ نبی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو خدا تعالیٰ نے جبری طور پر وہاں بھجوایا ورنہ وہ تو وہاں سے بھاگ گئے تھے اور

چاہتے تھے کہ نینوہ نہ جائیں لیکن خدا تعالیٰ نے جبر کر کے یوناہ کو وہاں بھجوا دیا۔ اسی طرح پیشگوئی بتاتی تھی کہ حضرت مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ جبراً اپنے ملک سے نکال کر ایک غیر ملک میں لے جائے گا اور اُن کے ذریعہ اپنا پیغام یہود کی گمشدہ بھیڑوں تک پہنچائے گا (۳) جب وہ وہاں جائیں گے تو لوگ اُن کو قبول کر لیں گے اور اُن کے دعوٰی پر ایمان لائیں گے۔

یوناہ نبی کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ اسی طرح ہوا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں گئے۔ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ پھر مچھلی نے اُن کو خشکی پر اُگلا۔ اور جب وہ اچھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ اس طرح یہ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی کہ میں کتنا بھی بھاگوں بہرحال خدا تعالیٰ کی بات مجھے ماننی پڑے گی چنانچہ وہ واپس آئے اور انہوں نے نینوہ والوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ پہلے تو انہوں نے معمولی سا انکار کیا۔ مگر جونہی عذاب کے آثار ظاہر ہوئے انہوں نے مان لیا۔

غرض ان حوالوں کو جب ہم یوناہ نبی کی پیشگوئی کے حوالہ سے ملا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یوناہ نبی والا معجزہ جو حضرت مسیحؑ نے دکھانا تھا وہ مسیح کے زندہ قبر میں جانے، زندہ قبر میں رہنے اور زندہ قبر میں سے نکلنے پر ہی مشتمل نہیں تھا۔ بلکہ اس میں یہ چوتھی بات بھی بتائی گئی تھی اور یہی اہم بات تھی۔ کہ مسیح کو خدا تعالیٰ یوناہ نبی کی طرح اُن اسرائیلی قبائل کی طرف لے جائے گا جو کھوئے گئے تھے۔ اور وہ اُن کو خدا کا کلام سنائیگا اور وہ لوگ اُس کی باتیں مانیں گے اور یہ ایک ایسا نشان ہوگا۔ جسے اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں دیکھیں گی۔ جیسے نینوہ کے لوگوں نے نشان دیکھا تھا۔ اب دیکھو مسیح کے ساتھ جو حالات گذرے ہیں وہ بھی بالکل اسی طرح تھے۔ مسیحؑ فلسطین میں پیدا ہوا۔ اس کی بولی عبرانی تھی۔ اسکی ماں بھی فلسطین میں موجود تھی اور اس کا جو باپ کہلاتا تھا وہ بھی وہیں موجود تھا۔ اسی طرح باپ کے دوسرے بیٹے بھی موجود تھے۔ پھوپھی زاد بھائی بھی وہیں تھے پھر وہاں سب کے سب اُن کی اپنی قوم کے لوگ تھے۔ اپنا رسم و رواج تھا۔ اپنا تمدّن اور اپنا طریق تھا اور یہ چیزیں ایسی ہیں جو بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں اور جن سے انسان کا غیر معمولی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر جہاں اُن کو بھیجا جا رہا تھا وہ ایک غیر ملک تھا اور اس کے ساتھ مسیحؑ کا کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ افغانستان کی زبان کہاں اور فلسطین کی زبان کہاں۔ اسی طرح کشمیری زبان کہاں اور مسیح کی زبان کہاں۔ ان دونوں میں کوئی بھی تو نسبت نہیں تھی۔ پھر اسرائیلی قبائل بدھوں اور دوسری اقوام سے مل کر اُنہی کے تمدّن اور اُنہی کے رسم و رواج کو اختیار کر چکے تھے جن کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فلسطین سے افغانستان اور کشمیر تک کا رستہ بھی بڑا کٹھن اور تکلیف دہ تھا۔ اوّل تو کوئی سہولتیں میسّر نہ تھیں اور پھر دو اڑھائی ہزار میل طے کر کے جانا اور بھی مشکل تھا۔ پس جس طرح یوناہ نبی کا دل نینوہ والوں کی طرف جانے سے گھبراتا تھا اسی طرح مسیحؑ کا دل بھی افغانستان اور کشمیر جانے سے گھبراتا تھا کیونکہ وہاں جانے سے اپنی زبان کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ اپنی قوم کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ آسان طریق یہی تھا کہ مسیح اپنی قوم میں رہتے اور فلسطین میں بیٹھے ہوئے یہود کو تبلیغ کرتے رہتے۔ مگر جس طرح یوناہ نبی نے گریز کیا تو خدا تعالیٰ نے اس پر جبر کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ جن کے

نتیجہ میں وہ مجبور ہو کر نینوہ والوں کے پاس جائیں اور انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ خدا تعالےٰ سے بھاگنے کے کوئی معنے نہیں جہاں وہ مجھے بھجوانا چاہتا ہے وہاں مجھے ضرور جانا چاہیئے۔ اِسی طرح حضرت مسیح کے متعلق بھی اللہ تعالےٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ ملک میں اُن کے خلاف مخالفت کی ایک عام رَو چل پڑی۔ یہاں تک کہ اُن پر مقدمہ ہوا۔ انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑا اور آخر عدالت نے انہیں پھانسی کا حکم دے دیا اور پھر صلیب پر انہیں لٹکنا پڑا۔ یہ اَور بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنی پیشگوئی کے مطابق اسی طرح بچا لیا جس طرح یوناہ کو بچایا تھا۔ جس طرح یوناہ نبی کو جب سمندر میں ڈالا گیا تو اللہ تعالےٰ نے ایک مچھلی مقرر کر دی تھی جس نے انہیں زندہ نگل لیا اور پھر وہ مچھلی کے پیٹ میں تین رات دن زندہ رہے اور پھر زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکل آئے اور یہ دیکھ کر اُن کا ایمان تازہ ہو گیا۔ کہ میرے رب میں کتنی بڑی طاقتیں ہیں اور وہ کس طرح اپنے بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ اِسی طرح حضرت مسیح بھی جب صلیب پر سے زندہ اُترے۔ قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی قبر میں سے باہر آئے تو اُن کا ایمان بھی تازہ ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ تعالےٰ میں بہت بڑی طاقتیں ہیں۔ مگر جب قبر میں سے نکلے تو اب حالات کی وجہ سے وہ اُس ملک میں جانے پر مجبور ہو گئے جس ملک میں اللہ تعالےٰ انہیں بھجوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ حکومت کی طرف سے جس کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور پھر وہ بچ رہا ہو وہ اس ملک میں رہ ہی نہیں سکتا اگر رہیگا تو پکڑا جائے گا اور پھر دوبارہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ غرض خدا تعالےٰ نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ یوناہ نبی کی طرح وہ مجبور ہو کر کشمیر اور افغانستان کی طرف چلے گئے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی خدا کی راہ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن نبی نکمّی زندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ کام کیلئے پیدا کیا جاتا ہے اور کام ہی کا عاشق ہوتا ہے۔ وہ ایک مشین ہوتا ہے جو ہر وقت چلتی ہے پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ مسیح اپنی باقی عمر اِدھر اُدھر چھپ کر گذار دے۔ پس اس واقعہ نے جہاں اُس کے ایمان کو اور بھی مضبوط کر دیا وہاں اُسے جلد سے جلد فلسطین چھوڑ کر یوناہ نبی کی طرح مشرق میں جا کر خدا تعالےٰ کا کلام سُنانے پر مجبور کر دیا۔ جب مسیح نے اُن کو یہ واقعات سنائے ہونگے اور بتایا ہوگا کہ اِن اِن حالات کی وجہ سے میں تمہاری طرف آنے پر مجبور ہوا ہوں تو کس طرح اُن کے ایمان بڑھ گئے ہوں گے اور کس طرح اُن کے دلوں میں اللہ تعالےٰ کے شکر کے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے۔ کشمیر کی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ جب حضرت مسیح کشمیر میں داخل ہوئے تو اُن کے زخم ابھی موجود تھے معلوم ہوتا ہے اُس زمانہ میں جرّاح اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب شہزادہ نبی کشمیر پہنچا تو اس کے ہاتھوں اور پیروں پر زخم تھے جن کا ایک لمبے عرصہ تک وہاں کے جرّاح علاج کرتے رہے۔ جب حضرت مسیح نے اُن کو یہ واقعات سُنائے ہوں گے کہ اس طرح جبراً اللہ تعالیٰ مجھے فلسطین سے نکال کر تمہاری طرف لایا۔ اگر میں وہیں رہتا تو وہ دوبارہ مجھے پھانسی دیدیتے۔ تو وہ اپنی خوش قسمتی پر کتنا ناز کرتے ہوں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ قدرت رکھتا تھا کہ انہیں پھر بچا لیتا۔ وہ پھر صلیب پر لٹکاتے تو پھر بچا لیتا مگر اس طرح صلیب پر چڑھنا اور اُترنا ہی رہتا۔ تو حضرت مسیح تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال جب یہ باتیں انہوں نے سُنی ہوں گی تو اُن کے دلوں میں خدا تعالےٰ کی محبت

کتنی بڑھ گئی ہوگی کہ وہ ایک نبی کو مجبور کرکے ہمارے ملک میں لایا تاکہ ہم اُس کے ذریعہ سے ہدایت حاصل کریں۔ بے شک بعض لوگوں نے مخالفت بھی کی ہوگی اور مخالفت ہونی بھی چاہیئے مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیح کے بہت جلد معتقد ہو گئے اور بہت جلد انہوں نے ایک نبی کی حیثیت میں آپ کو ماننا شروع کر دیا۔ غرض اِن حالات میں خدا تعالیٰ نے اُن کو مجبور کرکے وہاں بھجوا دیا۔ اگر ہم یہ تشریح نہ مانیں تو کفارہ تو الگ رہا مسیح ایک سچا اور راستباز انسان بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ مسیح صاف کہتا ہے کہ مَیں قبر میں زندہ جاؤں گا، قبر میں زندہ رہوں گا اور قبر میں سے زندہ نکلوں گا اور یہ کہ اِن واقعات کے بعد میرا گمشدہ بھیڑوں کی طرف جانا ضروری ہے تاکہ یوناہ نبی سے میری مماثلت ثابت ہو جائے۔ یوناہ آخر کس وقت تبلیغ کے لئے نینوہ والوں کی طرف گئے تھے۔ اُسی وقت جب وہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔ اسی طرح مسیحؑ کا اصل کام کا زمانہ وہی تھا جب وہ قبر میں سے نکلا۔ اگر یہ بات واقع نہیں ہوئی اور اگر قبر میں سے زندہ نکلنے کے بعد مسیح نے تبلیغ نہیں کی اور اس نے اپنی گمشدہ بھیڑوں کو جمع نہیں کیا۔ تو مسیح بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور یسعیاہ وغیرہ وہ انبیاء بھی نعوذ باللہ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ جنہوں نے مسیح کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کریگا۔

پس یہ واقعات اس امر کا قطعی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ مسیح کے لئے صلیب پر مرنا یا کفارہ ہونا مقدر ہی نہیں تھا۔ اور اگر کفارہ کو مانا جائے تو مسیح کو سچا ماننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی پیشگوئی جھوٹی نکلتی ہے۔ اسی طرح وہ کلام بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے جو یسعیاہ نبی پر نازل ہوا اور جس کی بعض اور نبیوں نے بھی خبر دی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ مسیح نے وہ قربانی نہیں کی جو کفارہ ماننے والے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور نہ وہ کفارہ ہوا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو واقعہ ہوا کیا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح زندہ قبر میں جائے گا زندہ قبر میں رہے گا اور زندہ قبر میں سے نکلے گا یا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح قبر میں مردہ گیا۔ مردہ ہونے کی حالت میں ہی رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکلا۔ مَیں اس غرض کے لئے چند بڑی بڑی باتیں بیان کرتا ہوں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسیح جس حاکم کے سامنے پیش کیا گیا وہ حاکم مسیح کا خیر خواہ تھا اور مسیح کے بعض ماننے والوں کا دوست تھا۔ مسیح کے ماننے والے جو ابھی ظاہر میں حواری نہیں بنے تھے لیکن دل سے آپ پر ایمان لا چکے تھے اُن میں ایک یوسف آرمیتیا بھی تھا۔ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ یوسف آرمیتیا بوجہ اس کے کہ یہودیوں میں بڑا معزز اور مالدار انسان تھا پیلاطوس کا دوست تھا۔ جب مسیح پیلاطوس کے سامنے پیش ہوئے تو پیلاطوس نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح وہ مسیح کو چھوڑ دے۔ اِس بارہ میں اُس نے جو تدابیر کیں اُن میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ جس دن وہ پیش ہوئے وہ جمعہ کا دن تھا اور جمعہ کے ساتھ ہی سبت کا دن آتا تھا۔ جو یہودیوں کا ایک مقدّس تہوار ہے۔ مگر اُس دن ایک اور خاص تہوار بھی تھا جس میں رومی حکومت یہود کو خوش کرنے کے لئے ایک قیدی چھوڑا کرتی تھی تاکہ یہود یہ سمجھیں کہ حکومت مذہب کا احترام کرتی ہے اور اُس کا دل اُن کے مذہب سے متاثر ہے۔ اس تقریب کی وجہ سے پیلاطوس نے یہ کوشش کی کہ وہ حضرت مسیح کو یہ کہکر کہ ہم نے کوئی نہ کوئی قیدی تو چھوڑنا ہی ہے

چلواسے ہی چھوڑ دیں آپ کو رہا کر دے۔ مگر یہودیوں نے کہا کہ ہم اِس تجویز کو نہیں مان سکتے فلاں ڈاکو کو بیشک چھوڑ دیا جائے مگر مسیحؑ کو نہ چھوڑا جائے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۲۱ و ۲۲) اس بارہ میں انجیل میں بہت سے اختلافات ہیں جن میں اس وقت پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال مسیحؑ کو انہوں نے چھڑوانے نہیں دیا بلکہ میں جب پیلاطوس اپنی ذاتی دلچسپی سے مسیحؑ کو چھوڑنے کی کوشش کر رہا تھا عدالت میں ایک پیغامبر آیا اور اُس نے کہا کہ مجھے آپ کی بیوی نے بھجوایا ہے۔ جب پیلاطوس اُس کی بات سننے کیلئے اُٹھا تو اس نے کہا آپ کی بیوی نے مجھے یہ پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا ہے کہ آج میں ساری رات سوئی نہیں کیونکہ فرشتے مجھے بار بار آکر کہتے تھے کہ یہ شخص بے گناہ ہے اسے سزا نہ دینا ورنہ مر جاؤ گے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۱۹)۔ پیلاطوس نے جب یہ بات سُنی تو اُس نے مزید کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح یہودی مسیحؑ کو رہا کر دینا مان لیں۔ مگر انہوں نے نہ مانا بلکہ انہوں نے دھمکی دی کہ ہم روم میں بادشاہ کو لکھیں گے کہ ایک شخص جو حکومت کا باغی تھا اور بادشاہت کا دعوے کرتا تھا پیلاطوس نے اُسے چھوڑ دیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ پیلاطوس بھی باغی ہے۔ یہ سُنکر پیلاطوس ڈر گیا اور اُس نے پانی منگوایا۔ یہودیوں کو تمثیلی زبان میں گفتگو کرنے کا بہت شوق تھا اسی طریق کے مطابق اُس نے پانی منگوایا اور سب کے سامنے اپنے ہاتھ دھو کر کہا کہ مجھ پر اس گناہ کی کوئی ذمہ واری نہیں مَیں اس انسان کے خون سے بری ہوں۔ اگر گناہ ہوگا تو وہ تم پر اور تمہاری اولادوں پر ہوگا۔ اس پر اُن سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ہاں اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں کی گردن پر ہے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۲۴ و ۲۵) تب پیلاطوس نے مسیحؑ کو اُن کے حوالے کر دیا کہ اِسے لے جاؤ اور صلیب پر لٹکا دو۔

جب وہ مسیحؑ کو لے کر صلیب کے مقام پر پہنچے ہیں تو انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ اُس وقت چھٹا گھنٹہ آ گیا تھا۔ اور چھٹے گھنٹے کے معنے اُس زمانہ کے لحاظ سے تین اور چار بجے کے درمیان کے وقت کے ہیں۔ اُس دن دو اور مجرم بھی پیش تھے جن کو پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ ایک مجرم کے لٹکانے اور تین مجرموں کے لٹکانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو تھوڑے سے وقت میں لٹکایا جا سکتا ہے مگر تین آدمیوں کو لٹکانے کے لئے لازماً زیادہ وقت لگے گا۔ پھر ایک اور بات بھی ہے جس کو عام طور پر نہ مسلمان سمجھتے ہیں اور نہ بوجہ اپنے مذہب سے ناواقف ہونے کے عیسائی سمجھتے ہیں۔ اُس زمانہ میں صلیب کے لئے ایک لکڑی گاڑی جاتی تھی جس کی شکل اس قسم کی ہُوا کرتی تھی

جب کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ ہو جاتا تھا کہ اُسے صلیب پر لٹکا دیا جائے تو وہ اس لکڑی کے ساتھ سیدھا کھڑا کر دیا جاتا اور اُس کے بازوؤں کو پھیلا کر دو ڈنڈوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ اس کے بعد مجرم کے بازوؤں اور ٹانگوں کے نرم گوشت میں کیل گاڑ دئے جاتے اور وہ اسی طرح بھوکا پیاسا صلیب پر لٹکا لٹکا مر جاتا۔

بعض حالات میں علاوہ اُن کیلوں کے جو بازوؤں کے گوشت اور پنڈلیوں کے گوشت میں گاڑے جاتے تھے وہ ایک ایک کیل ہتھیلیوں میں بھی گاڑ دیتے تھے لیکن جن لوگوں کو علم التشریح کی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ یہاں بھی کیلوں کا گاڑنا ہڈیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ بہرحال صلیب دیتے وقت کیل جسم کی ہڈیوں میں نہیں گاڑے جاتے تھے بلکہ بازوؤں اور پنڈلیوں کے نرم نرم گوشت میں گاڑے جاتے تھے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسم کے گوشت میں کیل گاڑ دینا یہ بھی انسان کو خطرناک تکلیف پہنچاتا ہے۔ بلکہ کیل تو الگ رہے معمولی ٹیکہ سے بھی بعض لوگ چیخیں مارنے لگ جاتے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس صلیب سے انسان کی موت کئی دنوں کے بعد واقع ہوتی تھی اور وہ سسک سسک کر اپنی جان دیتا تھا فوری طور پر موت واقع نہیں ہوتی تھی۔ اس میں صرف ہیبت کا پہلو ہے جو دماغی لحاظ سے سخت اذیت پہنچاتا ہے یعنی انسان یہ دیکھتا ہے کہ اب کیل آ گئے ہیں اب ہتھوڑا آ گیا ہے۔ اب کیل گاڑنے والا آ گیا ہے۔ اب کیل گاڑنے کے لئے اُٹھا ہے۔ اب کیل جسم پر رکھا گیا ہے۔ اب کیل پر ہتھوڑا پڑنے والا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو اس کے دماغ کو خوف زدہ کر دیتی ہیں اور وہ اس کی ہیبت سے شدید متاثر ہوتا ہے ورنہ محض گوشت کٹ جانے سے ایسی تکلیف نہیں ہوتی جسے برداشت نہ کیا جا سکتا ہو۔ لڑائیوں میں ہزاروں مرتبہ تلوار لگتی ہے اور گوشت کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے مگر چونکہ وہ تلوار یکدم آ پڑتی ہے اس لئے اُسکی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔ لیکن کیل کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اب نہ معلوم کیا ہونیوالا ہے۔ لیکن تلوار لگ کر اگر گوشت کٹ جائے تو بعض دفعہ اُس کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جتنی ڈاکٹر کی سوئی سے انسان محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا پتہ اُسی وقت لگتا ہے جب گوشت کٹ چکا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسی حالت میں جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہڈی سلامت ہے تو بجائے گھبرانے کے بے اختیار الحمد للہ کہہ اُٹھتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر ٹیکا لگانے کے لئے سرنج تیار کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید ڈاکٹر مجھے ذبح کرنے لگا ہے۔ اور اُس پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیح کے ساتھ جو کچھ گذرا وہ دماغی لحاظ سے ایک نہایت ہی تکلیف دہ واقعہ تھا۔ لیکن وہ حقیقی تکلیف جس سے انسان مر جاتا ہے وہ آپ کو نہیں ہوئی۔ لیکن چونکہ آپ نازک طبیعت انسان تھے آپ نے اس تکلیف کو بھی شدت سے محسوس کیا اور بیہوش ہو گئے۔ اس کے مقابلہ میں وہ چور جو آپ کے دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے وہ ایک دوسرے سے مذاق کرتے رہے۔ بلکہ اُن میں سے ایک نے مسیح کو طعنہ دے کر کہا کہ اگر تو مسیح ہے تو اپنے آپ کو بھی اور ہم کو بھی بچا۔ اس پر دوسرے نے اُسے جھڑک کر کہا کہ تُو خدا سے ڈر۔ ہم تو اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں۔ اور یہ بے گناہ ہے۔ (انجیل لوقا باب ۲۳ آیت ۳۹-۴۰) اب دیکھو وہ صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں مگر مذاق جاری ہے کیونکہ وہ سنگدل لوگ تھے اور ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اِسی قسم کی طبیعت اُن لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو اپنے اندر سختی برداشت کرنے کا مادہ رکھتے ہیں۔ کشمیر میں ہی ہمارا ایک احمدی خاندان ہے جو پہلے زمانہ میں مظفر آباد کے راجہ تھے۔ مہاراجہ کشمیر نے حملہ کر کے انہیں شکست دی اور راجہ کو قید کر کے سرینگر لے آیا اور اُن کے گزارہ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت کی بات ہے جس کے زمانہ میں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ

ریاست جموں و کشمیر میں ملازم تھے۔ وہ مسلمان راجہ بڑا
خوبصورت اور قوی نوجوان تھا اور اس کی شکل مہاراجہ کو
بڑی پسند تھی۔ ایک دن وہ پولو کھیلتے ہوئے گرا اور
اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ انہوں نے علاج کرایا
اور ہڈی جُڑ گئی۔ مگر ہڈی کچھ ٹیڑھی جُڑی۔ ایک دن
دربار لگا ہوا تھا کہ مہاراجہ نے کہا کیوں راجہ صاحب
آپ فلاں دن پولو کھیلتے ہوئے گرے تھے اور آپ کو چوٹ
آئی تھی۔ بتلائیے اب ہڈی کا کیا حال ہے جُڑ گئی ہے
یا نہیں؟ انہوں نے کہا جُڑ گئی ہے۔ اس نے کہا آپ
مجھے دکھائیں۔ انہوں نے دکھائی تو کہنے لگا راجہ صاحب
یہ آپ نے کیا کیا۔ یہ ہڈی تو ٹیڑھی جڑی ہے اور اس
سے آپ کی خوبصورتی پر دھبہ آگیا ہے۔ آپ اتنے
خوبصورت انسان تھے۔ آپ مجھے بتاتے تو میں اپنا ڈاکٹر
آپ کے لئے مقرر کر دیتا اور اس ہڈی کو بالکل صحیح
جڑوا دیتا۔ وہ اُس وقت کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں
نے بڑے اطمینان سے اپنے بازو پر دباؤ ڈال کر اتنے
زور سے اُسے جھٹکا دیا کہ بازو دو ٹکڑے ہو گیا اور
کہنے لگے "مہاراج اب جڑوا دیں"۔ یہ دیکھ کر مہاراجہ کی
ایسی حالت ہو گئی کہ وہ بے ہوش ہونے لگا۔ اور
دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ تو ایسے ایسے سنگدل لوگ بھی
ہوتے ہیں جنہیں ان باتوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی
مگر حضرت مسیح ایک نازک مزاج انسان تھے۔ ارد گرد کے
چور تو مذاق کرتے رہے اور مسیح بے ہوش ہو گئے جب
اُنہیں ہوش آیا تو کراہنا شروع کر دیا۔ مگر معلوم
ہوتا ہے آپ کے حواس قائم تھے۔ کیونکہ انجیل بتاتی ہے
کہ اُوپر سے آپ کی والدہ آگئیں۔ آپ نے اپنی والدہ کو
دیکھا اور آپ پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔
آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ معلوم میری والدہ کو
اس وقت کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی سامنے ہی آپ کا ایک
شاگرد تھوما بھی کھڑا تھا۔ آپ نے تھوما کی طرف دیکھا
اور کہا اے تھوما یہ تیری ماں ہے اور اپنی والدہ
سے کہا اے عورت یہ تیرا بیٹا ہے۔ بعض لوگ تھوماس
سے یہ غلطی کھاتے ہیں کہ تھوماس کے معنے ہوتے ہیں
توأم بھائی جس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح کا باپ تھا
لیکن اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ تھوماس کے معنے عبرانی
میں دودھ شریک بھائی کے ہوتے ہیں۔ پس اس
نام سے صرف اتنا نکلتا ہے کہ حضرت مسیح کو جس عورت
کا دودھ پلایا گیا تھا اُسی عورت نے تھوماس کو بھی دودھ
پلایا تھا۔ یا یہ کہ خود حضرت مریم کا دودھ اُس نے پیا تھا
اور اس طرح وہ حضرت مسیح کا دودھ شریک بھائی ہو گیا تھا
بہرحال حضرت مسیح نے اس چھوٹے سے فقرہ میں نہایت
لطیف طریق پر ایک طرف تھوما کو توجہ دلائی کہ میں تو
اس وقت صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور گو مجھے اللہ تعالیٰ
کے وعدوں پر یقین ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں
نے اس کے وعدوں کے سمجھنے میں کوئی غلطی کی ہو۔ اس
لئے اب مَیں اپنی والدہ کو تیرے سپرد کرتا ہوں اور
اپنی والدہ سے کہا کہ تھوما کو اپنا بیٹا سمجھنا۔ ساری
انجیل میں اپنی ماں سے محبت کا اظہار اگر حضرت مسیح نے
کیا ہے تو صرف اس جگہ۔ ورنہ انجیل پڑھ کر کچھ ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں اپنی والدہ سے کچھ خارسی
ہے۔ کیونکہ کسی جگہ پر اُن کی محبت کا اظہار نہیں۔ بہرحال
حضرت مسیح کی یہی کیفیت رہی۔ کبھی انہیں ہوش آ جاتا
اور کبھی وہ بے ہوش ہو جاتے۔ اس موقع پر پیلاطوس
کی طرف سے جو پہریدار مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل
میں اُن کے مرید تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت مسیح
تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تو وہ دوڑ کے گئے۔ اور
انہوں نے اسفنج کا ایک ٹکڑا لے کر اُسے شراب اور مُر
سے بھگویا اور حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا۔ انجیل میں تو

صرف اتنا لکھا ہے کہ اسفنج کو سرکہ میں ڈبو کر انہوں نے حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۳۶) مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ کو شراب اور مُر کا مرکب دیا گیا (جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ زیر لفظ صلیب) عیسائی لوگ بعض دفعہ اِس بات پر بڑا زور دیا کرتے ہیں کہ یہود نے آپ پر اتنا ظلم کیا کہ جب آپ شدتِ تکلیف سے کراہ رہے تھے تو انہوں نے شراب اور مُر کے مرکب میں اسفنج بھگویا اور چوسنے کے لئے آپ کو دیا۔ حالانکہ رومی کتب کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص کے ساتھ وہ رعایت کرنا چاہتے تھے اور جس کو وہ تکلیف سے بچانا چاہتے تھے اُس کو وہ شراب اور مُر کا مُرکب دیا کرتے تھے معلوم نہیں طبّی طور پر یہ چیز فائدہ بخش بھی ہے یا نہیں لیکن اُس زمانہ میں لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جس کو شراب اور مُر دی جائے اس کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ پس یہ واقعہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ لوگ جو آپ کے پہرہ کے لئے مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل میں آپ کے مرید تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی تکلیف کو کم کرنے میں وہ جس قدر بھی حصہ لے سکتے ہوں لیں۔ پھر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اُنہیں جمعہ کے دن پچھلے پہر صلیب پر لٹکایا گیا تھا اور مغرب سے سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا آج کل تو رات کے بارہ بجے کے بعد سے اگلا دن شمار کیا جاتا ہے لیکن اسلامی طریق یہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی یہ سمجھ لیا جاتا ہو کہ اگلا دن شروع ہو گیا ہے اور یہی طریق بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا۔ اس لحاظ سے سورج کے غروب ہوتے ہی سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا اور یہودیوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی سبت کے دن صلیب پر لٹکا رہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے چنانچہ دو تین گھنٹہ کے بعد ہی پیلاطوس نے انہیں توجہ دلائی کہ اگر یہ صلیب پر لٹکا رہا اور سبت کا دن شروع ہو گیا تو تم پر عذاب آ جائے گا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے یکدم ایک زوردار آندھی چلا دی جس سے چاروں طرف تاریکی چھا گئی (انجیل مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳) اس کو دیکھ کر یہودی اور بھی ڈرے کہ ایسا نہ ہو یہ صلیب پر رہے اور سبت شروع ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیلاطوس کو خود درخواست کی کہ اب اِن کو اُتار لیا جائے (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱) ایسا نہ ہو کہ ہم پر عذاب نازل ہو جائے۔ اب فرض کرو انہیں سورج غروب ہونے سے آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ پہلے اتار لیا گیا تھا۔ تب بھی اُن کی صلیب کا وقت کچھ نہ کچھ تو ضرور کم ہو جائے گا اگر سات بجے سورج غروب ہُوا کرتا تھا اور ساڑھے تین بجے انہیں صلیب پر لٹکایا گیا تھا تو یہ کل وقت ساڑھے تین گھنٹے بنتا ہے۔ لیکن چونکہ شدید آندھی کی وجہ سے سخت تاریکی چھا گئی تھی اور سبت شروع ہو جانے کے خوف سے اُنہیں جلدی اتار لیا گیا تھا اس لئے اگر آدھ یا پون گھنٹہ بھی یہ وقت فرض کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اڑھائی سے تین گھنٹہ تک حضرت مسیح کو صلیب پر رہنا پڑا۔ حالانکہ اس صلیب پر سات سات دن تک بھی بعض لوگ زندہ رہتے تھے اور وہ صرف بھوک اور پیاس کی وجہ سے یا زخموں کا زہر جسم میں پھیل جانے کی وجہ سے ہلاک ہوتے تھے۔ پھر یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو لوگ صلیب پر سے زندہ اُتر آتے تھے اُن کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں۔ مگر پہرے دار چونکہ حضرت مسیح کے مرید تھے انہوں نے چوروں کی تو ہڈیاں توڑیں مگر حضرت مسیح کی ہڈیاں نہیں توڑیں دراصل صلیب دینے کے اصل معنے بھی ہڈیاں توڑ کر گودا نکال دینے کے ہیں اور یہ نام اسی لئے رکھا گیا تھا کہ

اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ بعد میں ہڈیاں توڑ کر اُن کا گودا نکالا جاتا تھا۔ لیکن حضرت مسیحؑ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۳) پھر حضرت مسیحؑ کے صلیب پر سے زندہ اُتر آنے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ انجیل میں لکھا ہے۔ جب حضرت مسیحؑ کو اُتارا گیا تو ایک سپاہی دوڑتا ہوا گیا اور اُس نے آپ کی پسلی میں آہستہ سے نیزہ مارکر دیکھا تو اُس میں سے خون اور پانی بہ نکلا (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴) جسم میں سے خون اور پانی نکلنا یہ تو کوئی محاورہ نہیں۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ سیال خون نکل آیا۔ ورنہ انجیل کا بیان ہی اگر درست ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پانی الگ چیز ہے اور خون الگ۔ اور خون کو سیال بنانے والی سرم کے علاوہ کوئی اور بھی چیز ہے حالانکہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں۔ پس اس کے معنے پانی اور خون کے نہیں بلکہ بہتے ہوئے خون کے ہیں۔ مگر یہودیوں میں انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ مرگیا ہے اور اسی لئے ہم نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں۔ معلوم ہوتا ہے یہودی بھی دل میں گھبرائے ہوئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے ایک بیگناہ کو سزا دلوائی ہے پس چونکہ اُن کے دل میں چور تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہم ایک نیک اور خدا رسیدہ انسان کو سزا دلوا رہے ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے ایک شدید آندھی دیکھی تو ڈر گئے کہ یہ تو اللہ تعالےٰ کا عذاب معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی بلکہ کہا کہ اچھا اگر وہ مرگیا ہے تو اُسے دفن کردو۔

ان تمام واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے صلیب پر مرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ عام طور پر ساتویں دن تک بھی لوگ زندہ رہا کرتے تھے اور ہڈیاں توڑ کر انہیں مارنا پڑتا تھا مگر یہ کہ اڑھائی یا تین گھنٹہ تک صلیب پر رہنے کے نتیجہ میں وہ فوت ہو جاتے۔ اُن کا صلیب پر لٹکنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹے ہوسکتا ہے مگر جب اس صلیب پر سات سات دن تک بھی لوگ زندہ رہتے تھے تو ساڑھے تین گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں آپ کس طرح فوت ہوسکتے تھے اور پھر وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ آپ کے ماننے والے آپ کے پہریدار تھے اور انہوں نے آپ کی تکلیف کو کم کرنے اور آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہرحال جب حضرت مسیحؑ کو صلیب پر سے اتار لیا گیا تو یوسف آرمیتیاہ پیلاطوس کے پاس آئے اور اُس سے کہا کہ لاش میرے حوالے کی جائے۔ چنانچہ پیلاطوس نے حکم دیدیا کہ لاش یوسف آرمیتیاہ کو دے دی جائے (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۵۸) اس کے بعد یوسف آرمیتیاہ نے اُن کو ایک قبر میں جا کر رکھ دیا۔ مگر وہ قبر ہماری قبروں جیسی نہیں تھی۔ اس قبر میں تو کسی کو رکھا جائے تو اس کا سانس بند ہو جائے کیونکہ یہ اور طرح بنائی جاتی ہے۔ وہ قبر ایک کُھلی کوٹھڑی تھی جو چٹان میں کُھدی ہوئی تھی (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۰) یوسف آرمیتیاہ نے اس قبر میں حضرت مسیحؑ کو جا کر رکھ دیا اور سامنے دروازہ پر ایک پتھر لڑھکا دیا (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۱) تاکہ لوگوں کو شبہ بھی نہ ہو اور ہوا کی آمد و رفت بھی جاری رہے۔ یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ امر قطعی طور پر ناممکن تھا کہ مسیحؑ صلیب پر مرسکتا۔ یوں تو بعض دفعہ انسان بیٹھے ہوئے زمین پر سے اُٹھنے لگتا ہے تو اُس کا دم نکل جاتا ہے۔ چلتے چلتے کھڑا ہوتا ہے تو دم نکل جاتا ہے مگر یہ اور چیز ہے۔ ہم جس امر پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ عام طور پر اُن حالات میں جو حضرت مسیحؑ کو پیش آئے لوگ مرا نہیں کرتے بلکہ زندہ رہتے ہیں اور حضرت مسیحؑ کی موت بھی ان حالات میں قطعی طور پر ناممکن تھی۔

شروع سے لے کر آخر تک اُنکے ساتھ ایسے لوگ رہے جو اُن کے مرید تھے یا اُن کے دوست اور خیرخواہ تھے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش آپ کو بچانے کے لئے کی۔ پھر اُن کی خیرخواہی کا اس امر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت مسیح کو صلیب پر سے اُتار لیا گیا اور ایک قبر میں رکھ دیا گیا تو یہودیوں نے درخواست کی کہ جس کوٹھڑی میں مسیح کو رکھا گیا ہے اُس پر تین دن تک پہرہ لگا دیا جائے کیونکہ مسیح کہا کرتا تھا کہ میں یوناہ کی طرح تین دن رات کے بعد زندہ ہو جاؤں گا۔ مگر پیلاطوس نے انہیں سرکاری پہریدار دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "تمہارے پاس پہرے والے ہیں جاؤ جہاں تک تم سے ہوسکے اس کی حفاظت کرو" (انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۵)

پیلاطوس کی اس انکار سے یہی غرض تھی کہ اگر سرکاری پہریدار مقرر کئے گئے تو حضرت مسیح باہر نہیں نکل سکیں گے۔ اور اگر وہ پہریداروں کا مقابلہ کریں گے تو اُن کا مقابلہ حکومت کا مقابلہ سمجھا جائیگا لیکن اگر عام لوگ پہرہ پر ہوتے تو اُن کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکیگا۔ پس پیلاطوس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں پولیس دینے کے لئے تیار نہیں۔

پھر اس کے بعد جو واقعات ہوئے وہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے۔

اگر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق مسیح مر کر زندہ ہو چکے تھے تو وہ خدا کے بیٹے بن چکے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں لوگوں کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد وہ چھپ چھپ کر پھرا کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ بلکہ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے حواریوں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ ممکن ہے یوسف آرمیتیاہ کے مکان میں ہی رہتے ہوں۔ کیونکہ لکھا ہے کہ مسیح یکدم ظاہر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی کہیں اِدھر اُدھر غائب ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب وہ اپنے حواریوں کے پاس آئے تو انہیں دیکھنے کے باوجود یہ یقین نہ آیا کہ یہ سچ مچ مسیح کھڑا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اور کچھ شہد دیا اور اُس نے اُن کے سامنے کھایا تب انہیں یقین آیا کہ وہ واقعہ میں مسیح کو دیکھ رہے ہیں (انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳)

اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی روح ایسا نہیں کیا کرتی۔ اس قسم کے کام جسم ہی کیا کرتا ہے۔ مگر چونکہ قانونِ حکومت کے مطابق وہ پھانسی کی سزا کے مستحق ہو چکے تھے اور اگر پکڑے جاتے تو دوبارہ پھانسی پر لٹکا دئے جاتے اس لئے ضروری تھا کہ وہ چھپ کر رہتے اور حواریوں کو بھی نہ بتاتے کہ وہ کہاں رہائش رکھتے ہیں۔

بہرحال انجیل کے بیانات سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ صلیب پر زندہ رہے۔ قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی اس قبر میں سے نکلے اور انہوں نے حواریوں کو بتایا کہ میں زندہ ہوں۔ لطیفہ یہ ہے انجیل بتاتی ہے جب تھوما کو یہ خبر پہنچی کہ مسیح زندہ ہے تو اُس نے کہا جب تک میں اس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھوں گا اور جب تک اُن کیلوں کے نشان میں اپنی انگلی نہ ڈال لوں گا میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس پر حضرت مسیح نے تھوما کو بلایا اور کہا میرے ہاتھوں کو دیکھ اور اپنا ہاتھ میری پسلی میں ڈال اور دیکھ کہ میں مسیح ہی ہوں

کوئی روح نہیں (انجیل یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۴ تا ۲۹)

یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے جو پیشگوئی کی تھی کہ یوناہ نبی کا نشان اِس قوم کو دکھایا جائے گا وہ لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ ایک گوشت پوست والے مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا مگر وہ صلیب پر زندہ رہا۔ وہ زندہ قبر میں داخل ہُوا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلا اور اسکے بعد وہ لوگوں سے چھپتا پھرا۔ کیونکہ قانون اُس ملک میں رہنے کی انہیں اجازت نہیں دیتا تھا۔ اور یہی اللہ تعالےٰ کی وہ مخفی تدبیر تھی جس کے ماتحت وہ مجبور ہوئے کہ کشمیر اور افغانستان کیطرف جائیں اور بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کریں۔ خدا تعالےٰ جانتا تھا کہ اِن حالات کے نتیجہ میں مسیح اس ملک میں رہنا مناسب ہی نہیں سمجھے گا اور وہ خوشی سے خود اُن قوموں کی طرف چلا جائے گا جن کی ہدایت اور اصلاح کے لئے اُسے مبعوث کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا جب انہوں نے دیکھا کہ اب فلسطین میں میرا رہنا مشکل ہے تو وہ مشرق کی طرف چلے گئے اور اللہ تعالےٰ کا پیغام بنی اسرائیل کے اُن دس قبائل کو پہنچاتے رہے جو کشمیر اور افغانستان میں آ بسے تھے۔ اِس بحث کا اگلا حصہ بائبل سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ افغانستان اور کشمیر کی تاریخوں اور بعض پُرانی قبائلی روایات وغیرہ سے اس کا تعلق ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ایک کتاب میں جس کا نام "مسیح ہندوستان میں" ہے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ واقعۂ صلیب کے بعد حضرت مسیحؑ ہجرت کر کے افغانستان اور کشمیر کی طرف آ گئے تھے۔ اِس کے علاوہ بعض اور تحقیقاتیں بھی ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کی طرف سے ایک نبی جسے شہزادہ نبی کہا جاتا تھا اور جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زخموں کے نشانات تھے ہجرت کر کے کشمیر میں آیا اور اُس نے لوگوں کو اللہ تعالےٰ کا پیغام پہنچایا۔

غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت کے ابطال کے لئے خدا تعالےٰ کی چار صفات پیش کی گئی ہیں۔ یعنی صفتِ کافی۔ صفتِ ہادی۔ صفتِ علیم اور صفتِ صادق۔ اور جیسا کہ میں شروع میں بتا چکا ہوں خدا تعالےٰ کی صفتِ کافی اور ہادی اس کی صفتِ علیم اور صادق کے تابع ہیں۔ جو علیم ہوتا ہے وہ کافی ہوتا ہے اور جو صادق ہوتا ہے وہ ہادی ہوتا ہے۔ اُس وقت ہی کسی کا علاج ناقص ہوتا ہے جب اُسے ساری مرض کا علم نہ ہو۔ یا مرض کا علاج معلوم نہ ہو تشخیص ناقص ہو تب بھی نسخہ ناقص لکھا جاتا ہے اور اگر علاج پورا معلوم نہ ہو تب بھی نسخہ ناقص ہوتا ہے۔ لیکن جو علیم ہو گا اور جسے ہر بات کا علم ہو گا اس کا نسخہ اپنی ذات میں مکمل ہو گا یہ نہیں ہو گا کہ باوجود علم کے وہ مرض ادھوری بتائے یا باوجود علم کے نسخہ ناقص لکھے۔ دوسری صفت صادق ہے صادق کے معنے ہوتے ہیں مخلص۔ سچا اور دوستی میں پکا اب جو شخص سچا ہو گا مخلص ہو گا اور دوستی میں پکا ہو گا لازماً وہ ہادی بھی ہو گا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک صادق انسان کا دوست اور پیارا اور رحم کا مستحق وجود ڈوب رہا ہو اور وہ اُسے نکالے نہیں۔ تباہ ہو رہا ہو اور وہ اُسے بچائے نہیں۔ غرض علم کی صفت کے ماتحت کافی کا لفظ آتا ہے اور صادق کی صفت کے ماتحت ہادی کا لفظ آتا ہے۔ عیسائیت کے تمام مسائل انہی چار صفات کے اردگرد چکر کھاتے ہیں کیونکہ انہوں نے خدا تعالےٰ کے علیم اور کافی ہونے کو اور اس کے صادق اور ہادی ہونے کو نہیں سمجھا اور اس لئے انہوں نے غلط عقائد اختیار کر لئے۔ اس سورۃ

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝٣ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ

(اس سورت میں) تیرے رب کی (اس) رحمت کا ذکر (ہے) جو اُس نے اپنے بندہ زکریا پر (اُس وقت) کی جب اُس نے اپنے رب کو

نِدَآءً خَفِيًّا ۝٤

آہستہ آواز سے پکارا ۵۳

میں چونکہ خدا تعالیٰ نے عیسائیت کا ذکر کیا ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُن صفات کو بیان کیا گیا ہے جو عیسائیت کے ردّ میں کام آنے والی تھیں۔

میں نے بتایا تھا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِن مقطعات کو صفاتِ الٰہیہ قرار دیا ہے اور میری ایک پُرانی رویا بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ میں ایک دفعہ سندھ سے آ رہا تھا۔ کہ میں نے رویاء میں دیکھا کہ کسی نے مجھ سے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو کٓھٰیٰعٓصٓ آتا ہے اِن حروفِ مقطعات میں تمہارا بھی ذکر ہے۔ گویا مجھے بتایا گیا کہ کٓھٰیٰعٓصٓ میں میرا بھی ذکر آتا ہے۔ اور چونکہ میرا کام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام مثیلِ مسیح ناصری ہیں۔ اس لئے درحقیقت ان حروفِ مقطعات میں میرا ذکر ہونے کے یہ معنے ہیں کہ کٓھٰیٰعٓصٓ میں مسیحیت کا ذکر ہے اور جب اس میں پہلی مسیحیت کا ذکر ہے تو لازماً اس میں دوسرے مسیح کا بھی ذکر ہوگا۔ اس میں پہلی مسیحیت کا ذکر تو اس لحاظ سے ہے کہ انہوں نے خدا تعالےٰ کے کافی اور ہادی ہونے اور اس کے علیم اور صادق ہونے کی صفات کو نہ سمجھ کر غلط مذہب اختیار کر لیا۔ اور ہمارے حق میں یہ مقطعات اس لحاظ سے ہوں گے کہ ہم نے انہی صفات سے کام لے کر عیسائیت کا ردّ کر دیا۔ گویا مراد تو دونوں سلسلے ہوں گے مسیح ناصری کا سلسلہ بھی اور مسیح موعودؑ کا سلسلہ بھی۔ مگر عیسائیت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اِن صفات کو مدنظر نہ رکھ کر وہ صحیح راستہ سے بھٹک گئے اور ہمارے لئے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالےٰ کی اِن صفات نے ہماری تائید کی اور ہم نے اُن کے ذریعہ سے عیسائیت کو کچل دیا۔

درحقیقت دنیا میں تمام روحانی کام صفاتِ الٰہیہ سے ہی چلتے ہیں اور اگر کسی کو علم صحیح عطا ہو جائے تو وہ صرف صفاتِ الٰہیہ سے ہی تمام غلط مذاہب کو رد کر سکتا اور اُن کا باطل ہونا ثابت کر سکتا ہے۔

۵۳ حل لغات:۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ خبر ہے ایک مبتداء محذوف کی جو ھٰذَا ہے یعنی ھٰذَا ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ یہ ذکر ہے تیرے رب کی رحمت کا۔ یہاں مصدر جو ذکر ہے فعل کا عمل کر رہا ہے اور یہ عبارت اپنے معنوں کے لحاظ سے اس طرح ہے کہ ھٰذَا ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ اَىْ زَكَرِيَّا حِيْنَ نَادَاهُ یعنی یہ ذکر ہے تیرے رب کی رحمت کا وہ رحمت جو اس نے اپنے بندہ پر کی۔ کون سے بندہ پر؟ زکریا پر۔ کس وقت کی؟ جب اُس نے اپنے رب کو ایک ایسی آواز میں پکارا جو خفی یعنی آہستہ تھی۔

نَادٰى کے معنے ہوتے ہیں صَاحَ بِهٖ یعنی اونچی اور بلند آواز سے پکارا۔ اور نَادٰى فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں جَالَسَهٗ فِى النَّادِىْ اس کے ساتھ مجلس میں اُٹھتا بیٹھتا رہا اور اس کے معنے فَاخَرَهٗ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ مفاخرت کی باتیں کیں اور نَادٰى بِسِرِّهٖ کے معنے ہوتے ہیں اَظْهَرَهٗ اُس نے اپنے دل کا راز

اس پر ظاہر کیا (اقرب)

تفسیر :- میں اوپر بتا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں عیسائیت پر بحث کی گئی ہے اور عیسوی عقائد کی تردید کے لئے کھٰیٰعٓصٓ میں چار صفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ دو بنیادی صفات کی طرف اور دو ایسی صفات کی طرف جو اُن صفات کا لازمی ظہور ہیں۔ بنیادی صفات عالم اور صادق کی ہیں اور وہ صفات جو ان دو کا لازمی نتیجہ ہیں وہ کافی اور ہادی کی صفات ہیں۔ لیکن ابتداء زکریاؑ کے ذکر سے کی گئی ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ اور عیسائیت کے ذکر سے پہلے حضرت زکریاؑ کا کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جگہ زکریا سے وہ زکریا مراد نہیں جن کی کتاب بائبل میں شامل ہے وہ زکریا ۴۸۷ سال قبل مسیح گذرے ہیں اور یہ زکریا وہ ہیں جو حضرت مسیح کے قریب زمانہ میں آپ کی والدہ کے کفیل تھے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زکریاؑ بھی نبی تھے لیکن اناجیل میں ان کا ذکر بطور کاہن کیا گیا ہے بطور نبی کے نہیں۔ مگر اس مشکل کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بالکل حل کر دیتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابوداؤد جلد ۲ کتاب الملاحم صفحہ ۲۱۲) یعنی اللہ تعالےٰ اس اُمت میں ہر صدی کے سر پر احیاء دین کے لئے ایک مجدد مبعوث فرمایا کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (نور ع ۷) یعنی اللہ تعالےٰ نے مومنوں اور عمل صالح کرنے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں بھی زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اُس نے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اُمت محمدیہ کے خلفاء یعنی مجددین کو پہلے زمانہ کے اسرائیلی خلفاء کا مثیل قرار دیا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ (مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم صفحہ ۲۳ مکتوب نمبر ۲۳۴ و صفحہ ۲۴۹) یعنی میری اُمت کے علماء روحانی یعنی مجددین انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں پس ممکن ہے کہ ایسے نبی جو کسی دوسرے نبی کے کام کی تکمیل کے لئے آتے ہوں اُنکے لئے بائبل میں کاہن کا لفظ استعمال ہوتا ہو۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کفار یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ شخص کاہن ہے۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل ایسے رنگ میں نبیوں اور کاہنوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس سے وہ دونوں ایک وجود معلوم ہوتے تھے۔ لیکن چونکہ مکہ والے کاہن کو بُرا سمجھتے تھے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نبی ہونے کا دعویٰ کرتے تو وہ سمجھتے کہ یہ کاہن ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جب ہم بائبل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اللہ تعالےٰ یہود کے حالات دیکھکر بہت چھوٹی چھوٹی جگہوں میں اپنے نبی بھیج دیا کرتا تھا یہاں تک کہ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ بعض دفعہ سینکڑوں انبیاء ایک ہی زمانہ میں ہوئے ہیں (۱۔ سلاطین باب ۱۸ آیت ۶) بلکہ بعض بڑے بڑے پایہ کے انبیاء بھی ایک ہی زمانہ میں بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ حزقی ایل[۵۱] - دانی ایل[۵۲] اور یرمیاہ[۵۳] یہ سب ایک ہی وقت میں آگے پیچھے ہوئے بلکہ کچھ حصہ اِن کی زندگیوں کا متوازی بھی گذرا ہے پس اگر بائبل نے زکریا کو نبی نہیں کہا تو یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔ جب بائبل کہتی ہے کہ بعض دفعہ ایک ایک زمانہ

---

[۵۱] ۵۹۵ قبل مسیح [۵۲] ۶۰۷ قبل مسیح [۵۳] ۶۲۹ قبل مسیح

میں چار چار سو نبی آتے (۱۔ سلاطین باب ۲۲ آیت ۶)
اور وہ نام ایک کا بھی نہیں لیتی۔ تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل
میں اتنی کثرت سے نبی آیا کرتے تھے کہ بائبل نے اُن کے
ناموں کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ قرآن کریم نے اپنی ضرورت
کے مطابق جن نبیوں کا نام ضروری سمجھا لے لیا اور بائبل نے
جن نبیوں کی ضرورت سمجھی اُن کا نام لے لیا۔ باقیوں کے
متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون تھے اور اُن کے کیا نام
تھے۔ بہرحال حضرت زکریاؑ کو انجیل نے گو کاہن قرار دیا
ہے مگر قرآن کریم انہیں نبی قرار دیتا ہے اور اس جگہ زکریاؑ
سے وہی زکریا مراد ہیں جو حضرت مسیحؑ کی والدہ کے کفیل
تھے اور حضرت مسیحؑ کے قریب ترین زمانہ میں گذرے ہیں۔

عیسائیت کے تفصیلی ذکر سے پہلے حضرت زکریاؑ
کا ذکر کرنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہود میں یہ پیشگوئی
پائی جاتی تھی کہ مسیح کی آمد سے پہلے ایلیاہ نبی کا آنا ضروری
ہے۔ چونکہ حضرت زکریا کے ہاں یحییٰ پیدا ہونے والے
تھے اور حضرت یحییٰ ارہاص تھے مسیح ناصری کے۔ یعنی وہ
اس لئے آئے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے آنے کے
لئے راستہ تیار کریں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ وہ
یہود کو حضرت مسیحؑ سے واقف اور انٹروڈیوس کرانے کے
لئے آئے تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے مسیحؑ کے ذکر سے
پہلے حضرت زکریا کا ذکر فرما دیا۔ چنانچہ جب ہم بائبل کو
دیکھتے ہیں تو ہمیں ملاکی نبی کی یہ پیشگوئی نظر آتی ہے کہ

"دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے
سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا"
(ملاکی باب ۴ آیت ۵)

اس جگہ "خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن" سے مراد
حضرت مسیح کی آمد ہے۔ چنانچہ جب مسیح ناصری نے دعویٰ کیا
تو یہود نے یہی سوال کیا کہ وہ ایلیاہ جو آنے والا تھا وہ
کہاں ہے؟ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا کہ اس سے مراد
یوحنا ہے اور فرمایا کہ

"چاہو تو مانو ایلیاہ جو آنے والا تھا یہی ہے"
(انجیل متی باب ۱۱ آیت ۱۴)

پس چونکہ حضرت یحییٰ جن کا انجیل میں یوحنا نام آتا ہے
اور جو ایلیاہ نبی کے بروز تھے جب تک ظاہر نہ ہوتے
حضرت مسیح نہیں آسکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسیحؑ
کے ذکر سے پہلے حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا جاتا۔
تا ملاکی نبی کی پیشگوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ
کر دیا جاتا اور لوگوں کو بتا دیا جاتا کہ دیکھو وہ ایلیاہ بھی
آ گیا جس کی ملاکی نبی نے خبر دی تھی اور پھر ہمارا مسیحؑ
بھی دنیا میں ظاہر ہو گیا۔

دوسری وجہ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے
کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا موجب حضرت
مریم علیہا السلام ہوئیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ
وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ
هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ
يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ
دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي
مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ
سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ (آل عمران ع ۴)

یعنی حضرت زکریا علیہ السلام جو حضرت مریم کے کفیل
تھے اور جن کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی وہ ایک دفعہ اپنی
عبادت گاہ میں گئے اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت مریم
جو اس وقت چھوٹی بچی تھیں اُن کے پاس کھانے پینے کی
چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مریم سے پوچھا کہ
اَنّٰى لَكِ هٰذَا۔ بیٹی تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملی ہیں۔
چھوٹے بچوں سے عام طور پر لوگ محبت اور پیار کی وجہ سے

اِس قسم کی باتیں پوچھا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ اللہ تعالےٰ نے دی ہیں مفسرین اِس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اُن کیلئے آسمان سے یہ چیزیں بھجوا دیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہاں آسمان سے آنے کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ جواب صرف اُس نیک تربیت کا نتیجہ تھا جو حضرت مریم علیہا السلام کی ہوئی تھی۔ ہمارے گھروں میں بھی بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔ کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ فلاں چیز تمہیں کہاں سے ملی ہے تو تم یہ کہا کرو کہ خدا نے دی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام نے جب یہ جواب دیا تو ایک تین چار سال کے بچہ کے مُنہ سے یہ بات سُنکر کہ اللہ سب کچھ دیتا ہے یہ نعمتیں بھی اللہ نے ہی دی ہیں حضرت زکریا علیہ السلام کے دل پر چوٹ لگی اور انہوں نے خیال کیا کہ جب یہ عقیدہ ہی ہے کہ ہر چیز اللہ دیتا ہے اور ایک بچی بھی یہی کہہ رہی ہے تو میں تو سمجھدار اور تجربہ کار ہوں میں کیوں نہ یقین کروں کہ ہر چیز خدا ہی دیتا ہے۔ چنانچہ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ۔ یہ جواب سنکر حضرت زکریا علیہ السلام کو توجہ ہوئی کہ مَیں بھی اپنی ضرورت کی چیز خدا تعالےٰ سے مانگوں۔ میرے گھر میں بھی کوئی بچہ نہیں۔ اگر مریم کی طرح میرے گھر میں بھی بچہ ہوتا اور میں اس سے پوچھتا کہ یہ چیز تمہیں کس نے دی ہے اور وہ کہتا کہ خدا نے۔ تو جس طرح مریم کی بات سُنکر میرا دل خوش ہوا ہے اسی طرح اپنے بچہ کی بات سُنکر میرا دل خوش ہوتا۔ پس حضرت مریم علیہا السلام حضرت یحییٰ کی پیدائش کے لئے اللہ تعالےٰ سے دعا کرنے کا ایک محرک ہو گئیں اور اس طرح بالواسطہ طور پر جہاں خدا تعالےٰ کی پیشگوئی کے ماتحت حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت مسیحؑ کے ارہاص کے طور پر آئے وہاں حضرت مریم علیہا السلام جو حضرت مسیحؑ کی والدہ تھیں حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کے لئے ارہاص بن گئیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی دعا سُنی اور انکے گھر میں بچہ پیدا ہو گیا۔

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا یہاں خالی یہ نہیں فرمایا کہ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ زَكَرِيَّا بلکہ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا فرمایا ہے۔ اس میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا ایک بہت بڑی حکمت ہے اور قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ہر لفظ ایسے موقع پہ استعمال کرتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے کوئی لفظ زائد یا بے معنی نہیں ہوتا۔

اس آیت میں بھی پہلے فرمایا ذِكْرُ یعنی هٰذَا ذِكْرُ اور ذِکر کے معنے صرف ایک واقعہ بیان کرنے کے نہیں ہوتے بلکہ اُسے یاد کرانے کے ہوتے ہیں۔ یعنی جو واقعہ ہم بیان کرنے لگے ہیں یہ ایسا اہم ہے کہ ہر شخص کو یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے اور خدا تعالےٰ کی طاقتوں اور اس کی قدرتوں پر ایمان لانا چاہیئے۔ رَحْمَتِ رَبِّكَ۔ یہ واقعہ کیا ہے یہ تیرے رب کی رحمت کا نشان ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمت تھی زکریا پر۔ ربوبیت ہوتی مریم کی۔ پھر رَبِّكَ کیوں کہا گیا۔ خالی یہ کیوں نہیں کہا کہ ذِكْرُ رَحْمَةِ الرَّبِّ۔ یہ رب کی رحمت کا ذکر ہے رَحْمَتِ رَبِّكَ کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ قرآن کریم کا رب کی بجائے رَبِّكَ کے الفاظ لانا صاف بتا رہا ہے کہ یہاں کسی ایسی چیز کا بیان ہے جس میں ربوبیت محمدؐ کا بھی ذکر ہے۔ اب اگر غور کرو۔ تو معلوم ہوگا کہ جس طرح یحییٰ علیہ السلام ارہاص تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارہاص تھے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کیونکہ حضرت عیسیٰ کے وجود میں جو بن باپ پیدا ہوتے یہ خبر

دی گئی تھی کہ اب موسوی دور ختم ہو چکا ہے اور وہ پیشگوئی
شروع ہونے والی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے بڑے بیٹے اسمٰعیلؑ کے متعلق یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ

"دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند
کروں گا اور اُسے بہت بڑھاؤں گا اور اُس
سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اُسے
بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰ و
پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۸)

اسی طرح وہ وعدہ پورا ہونے والا ہے جو
موسیٰ سے کیا گیا تھا کہ

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان
سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری
مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا"
(استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵)

پس یہ واقعہ چونکہ ایک لمبے سلسلہ کی کڑی تھا۔
اس لئے اللہ تعالیٰ نے رَحْمَتِ رَبِّكَ کے الفاظ
استعمال کئے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو
بتایا کہ یہ تیرے رب کی رحمت کا نشان ہے کہ اس نے
اتنے لمبے عرصہ سے دنیا کو تیری طرف متوجہ کرنے
کے لئے تیار کیا۔ پہلے اس نے یحییٰ کو پیدا کیا جو عیسیٰؑ
کے لئے ارہاص تھا۔ پھر اس نے عیسیٰؑ کو پیدا کیا جو
تیرے لئے راستہ صاف کرنے والا تھا۔

پھر فرماتا ہے عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا۔ حالانکہ اگر
عبدہ کا ذکر نہ بھی کیا جاتا تب بھی فقرہ مکمل تھا۔ اس لفظ کو
زائد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں دو
قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک عمومی اور ایک خصوصی۔ یعنی ایک وہ
رحمتیں ہوتی ہیں جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت ہوتی ہیں
اور مومن اور کافر سب کو ملتی ہیں اور ایک وہ رحمتیں ہوتی
ہیں جو خاص طور پر اعلیٰ درجہ کے کارکنوں کو ملتی ہیں۔
جو جزاء کے طور پر ہوتی ہیں اور صفتِ رحیمیت کے ماتحت
نازل ہوتی ہیں۔ رَحْمَتِ رَبِّكَ میں صرف رحمت
کا ذکر تھا۔ یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ رحمانیت سے تعلق
رکھنے والی رحمت ہے یا رحیمیت سے تعلق رکھنے والی رحمت
ہے۔ عَبْدَهٗ نے بتا دیا کہ یہ رحیمیت والی رحمت ہے
وہ رحمت مراد ہے جو کسی کام کے نتیجہ میں نازل ہوتی ہے
ایسے احسان کا ذکر نہیں جو بغیر خدمت اور کوشش کے
صرف رحمانیت کے نتیجہ میں کیا جاتا ہے۔

اگر صرف زکریا کہا جاتا تو یہ سارا مضمون غائب
ہو جاتا لیکن عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا کہہ کر بتایا کہ ہم نے
زکریا پر جو رحمت نازل کی وہ عام رحمت نہیں تھی بلکہ خود زکریا
بھی بہت نیک تھے اور انہوں نے بڑی بڑی خدمات
کی تھیں۔ یہ سارا مضمون صرف ونحو کے چند اشاروں
میں اللہ تعالیٰ نے ادا کر دیا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ لگا کہ ایک دعا ایسے شخص
کی ہوتی ہے جو رحمت کا مستحق نہیں ہوتا اور ایک دعا
ایسے شخص کی ہوتی ہے جو رحمت کا مستحق ہوتا ہے مگر
رحمت کی صفت بھی آپ ہی آپ ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس
کے لئے بھی بعض ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے
جو اس رحمت کو ابھارنے والی ہوں۔ چنانچہ کبھی مشکلات،
کبھی دشمنوں کے مظالم اور کبھی اپنی بیکسی اور بے بسی
انسانی قلب میں دعا کا ایک غیر معمولی جوش پیدا کر دیتی
ہے اور آسمان سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو جاتی
ہے۔ گویا صفاتِ الٰہیہ کا ظہور بعض خاص خاص محرکات
کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ اس جگہ اس رحمت کے نزول
کی کیا وجہ ہوئی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت
میں کیا ہے کہ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا یعنی حضرت
زکریاؑ کے پکارنے کی وجہ سے وہ رحمت آئی جو خالص
خدمت گاروں کے لئے آیا کرتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے نَادٰی کے کئی معنے ہوتے ہیں جن میں سے ایک معنے بلند آواز سے پکارنے کے بھی ہیں مگر وہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ معنے لئے جائیں تو پھر خَفِیًّا کے کوئی معنے نہیں بنتے۔ پس یہاں لازماً کوئی اور معنے لینے پڑیں گے اور وہ معنے یہی ہیں کہ اُس نے مخفی آواز میں اپنے دل کا بھید اُس پر ظاہر کیا۔

دنیا میں دو طرح کی دعائیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو وہ دعا ہوتی ہے جس میں انسان دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے اور اس غرض کے لئے وہ بلند آواز سے دعائیہ کلمات کو دُہراتا چلا جاتا ہے اور ایک دعا ایسی ہوتی ہے جو انسان علیحدگی میں کرتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اَور بھی اس کے ساتھ شامل ہو جب ایسی دعا ہوتی ہے تو اس کا اصل مقام اخفاء ہوتا ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ دعا کرنا۔ تا کہ دوسروں کے کانوں میں آواز نہ پڑے۔ مثلاً اگر اُس میں اضطراب اور اضطرار ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نے لوگوں کے سامنے تضرع سے دعا کی تو میری آواز نکلے گی جس کو میں پسند نہیں کرتا تو وہ علیحدگی میں دعا کرتا ہے تا کہ اس کے اضطراب اور اضطرار پر کوئی دوسرا مطلع نہ ہو۔ یہاں حضرت زکریاؑ کے متعلق اللہ تعالےٰ یہ فرماتا ہے کہ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا حضرت زکریا نے آہستہ آواز میں دعا کی یعنی وہ اس دعا میں دوسروں کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں نہیں کرتے تھے؟ اس کا ہمیں سورۂ آل عمران سے پتہ چلتا ہے۔ اور یہاں بھی اُس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب کسی انسان کو الٰہی ارشادات سے معلوم ہو کہ اب خدا تعالےٰ کا فیضان کسی اور طرف منتقل ہونیوالا ہے تو چاہے وہ خود اللہ تعالےٰ کے انوار کا حامل ہو۔ اُس کے دل کو دُکھ پہنچتا ہے اور وہ نہیں چاہتا

کہ اس کے ہاتھ سے وہ نور ختم ہو بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خواہ ایک منزل پرے ہٹ کر نور ختم ہو بہر حال میں وہ آخری چراغ نہ بنوں جس پر آسمانی نور کا خاتمہ ہو۔ سورۂ آل عمران سے پتہ چلتا ہے کہ مریم کی حالت دیکھکر حضرت زکریاؑ کو یہ شبہ پڑ گیا تھا کہ آنیوالا اسرائیلی موعود مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا ہے۔ کچھ اللہ تعالےٰ کی طرف سے بھی ایسے اشارے ہوئے کہ مریم کا خیال رکھو اِدھر مریم نے چھوٹی عمر میں ایسی باتیں شروع کر دیں جو اُن کی نیکی اور تقویٰ اور اللہ تعالےٰ کی محبت اور اس کے پیار پر دلالت کرتی تھیں اور پھر اللہ تعالےٰ نے بھی اُن کیلئے اپنے نشانات دکھانے شروع کر دئے اور لوگوں کے دلوں میں اُن کے تقویٰ اور اُن کی بزرگی کا احساس پیدا کر دیا۔ چنانچہ کوئی کھانا لا رہا ہوتا، کوئی پھل پیش کر رہا ہوتا اور کوئی اور چیز تحفۃً لا کر دے رہا ہوتا۔ اِدھر انہوں نے مریم کو دیکھا کہ اس کے دل میں کوئی دنیوی رغبت نہیں۔ بچہ ہونے کے باوجود وہ محسوس کرتی تھیں کہ یہ نعمتیں خدا تعالےٰ کی طرف سے آئی ہیں اور اُسی کے فضل اور احسان کا نتیجہ ہیں۔ حضرت زکریا نے ان تمام باتوں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ موعود جس پر بنی اسرائیل کی نبوت کا خاتمہ مقدر ہے۔ مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہے۔ اُدھر ملاکی نبی اور بعض دوسرے انبیاء کی پیشگوئیاں اُن کے سامنے تھیں جو بتا رہی تھیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ اب ختم ہونے والا ہے۔ پس حضرت زکریا نے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا فیضان اب ختم ہونے والا ہے اللہ تعالےٰ سے وہ دعا کی جس کا ان آیات میں ذکر آتا ہے اور کہا کہ اے میرے رب میرے دل میں دیر سے یہ خواہش پائی جاتی تھی مگر آج مریم کی بات سنکر میرا دل بیقرار ہو گیا ہے اور میں اپنے

قَالَ رَبِّ إِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ

(اور) کہا اے میرے رب (میری حالت تو یقیناً ایسی ہے کہ) میری تمام ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں اور (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک

شَيْبًا وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝

اُٹھا ہے۔ اور اے میرے رب میں (کبھی بھی) تجھ سے دعائیں مانگنے کی وجہ سے ناکام (و نامراد) نہیں رہا ۵۴

دل کا راز تجھ پر ظاہر کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔ پس یہاں نَادٰی کے وہ معنے نہیں جو شور مچانے کے ہیں بلکہ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا کے یہ معنے ہیں کہ اُس نے خدا سے وہ راز سربستہ بیان کیا جو اُس نے اپنے دل میں چھپایا ہوا تھا اور خدا تعالیٰ سے مانگتا نہیں تھا مریم کی بات سُنکر اس کے دل میں جوش پیدا ہوا اور اس نے اپنے رب سے اپنے درد کا اظہار کر دیا۔ بیشک خدا تعالیٰ کے لئے کوئی چیز راز نہیں مگر جب تک کوئی دعا مانگی نہیں جائے گی اصطلاحاً اُسے ایک راز ہی سمجھا جائے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی رنگ میں ایک جگہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

وہ دے مجھ کو جو اس دل میں بھرا ہے
زباں چلتی نہیں شرم و حیا ہے

حقیقت یہی ہے کہ کئی خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بندہ ایک مدت تک چھپائے رکھتا ہے اور کہتا ہے خدا تعالیٰ سے کیا مانگنا ہے لیکن کسی وقت محرک ایسا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دل کا راز سربستہ خدا تعالیٰ کے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے نِدَآءً خَفِيًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ خدایا یہ میرے دل کا ایک راز تھا۔ میری پہلے سے یہی خواہش تھی کہ مجھے بیٹا ملے مگر اب مریم کی بات میں نے سنی ہے تو اس خواہش کو دل میں چھپائے رکھنے کی طاقت نہیں رہی۔

لوھن

۵۴ حل لغات:۔ اَلْوَهْنُ کے معنے ہیں ضَعْفٌ مِنْ حَيْثُ الْخَلْقِ اَوِ الْخُلُقِ (مفردات) یعنی خواہ پیدائش کے لحاظ سے کمزوری ہو یا اخلاق کے لحاظ سے کمزوری ہو اُسے وھن کہتے ہیں پس وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ کے معنے ہوں گے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔

تفسیر:۔ حضرت زکریا علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بڑھاپے میں ہڈیاں BRITTLE ہو جاتی ہیں یعنی ایسی نازک ہو جاتی ہیں کہ ذرا سی ٹھوکر سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کا جُڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جوان کی ہڈی تو جلدی جُڑ جاتی ہے لیکن بوڑھے آدمی کی ہڈی ٹوٹ جائے تو وہ آسانی سے نہیں جُڑتی۔ پس رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ کے یہ معنے ہوئے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور میرا ضعف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب مجھ میں تاب مقاومت باقی نہیں رہی۔ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا۔ اور میرا سر بڑھاپے کی وجہ سے شعلے مارنے لگ گیا ہے۔ بال جب سفید ہوتے ہیں تو یکدم سفید نہیں ہوتے بلکہ پہلے بالوں کا رنگ اُڑتا ہے اور وہ سیاہی سے زردی مائل ہو جاتے ہیں پھر اُن میں سفیدی آتی ہے مگر وہ اتنی تیز اور نمایاں نہیں ہوتی۔ صرف ہلکی ہلکی سفیدی ہوتی ہے۔ لیکن جب بڑھاپا غالب آ جائے تو سر کے بال بہت زیادہ

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ

اور میں یقیناً اپنے رشتہ داروں سے اپنے (مرنے کے) بعد (کے سلوک) سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی

عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَ

بانجھ ہے۔ پس تو اپنے پاس سے ایک دوست (یعنی بیٹا) عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو اور

یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝

آل یعقوب (سے جو دین و تقویٰ ہم کو ورثہ میں ملا ہے اس) کا بھی وارث ہو اور اے میرے رب اسکو (اپنا) پسندیدہ (وجود) بنائیو۔

سفید ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کا ان الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے کہ میرا سر تو اب بڑھاپے کی وجہ سے شعلے مارنے لگ گیا ہے۔

وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا۔ اور اے میرے رب میں تیری دعا کے ساتھ کبھی شقی نہیں ہوا۔

اس کے ایک معنے یہ ہیں بِدُعَائِیْ اِیَّاكَ یعنی تجھے پکارنے کی وجہ سے یا اُن دعاؤں کی وجہ سے جو میں تجھ سے مانگا کرتا ہوں میں کبھی شقی نہیں ہوا۔

دوسرے معنے حضرت زکریا کے لحاظ سے ایک اور بھی ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت زکریا چونکہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے اس لئے بِدُعَائِكَ کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ بِدُعَائِكَ اِیَّایَ یعنی اے خدا جب تُو نے مجھے پکارا اور مجھے اپنا نبی بنایا تو تیرا مقرب اور ہمکلام ہونے کی وجہ سے میں کسی بات میں بھی شقی نہیں ہوا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مجھے اپنے کسی مقصد میں ناکامی ہوئی ہو اور شقاوت میرے حصہ میں آئی ہو۔

شقاوت سعادت کی ضد ہے اور سعادت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ایسی مدد انسان کے شامل حال ہونا جس سے اُسے خیر حاصل ہو جائے اور شقاوت کے معنے ہوتے ہیں خدا تعالیٰ کی مدد کا میسر نہ آنا جس کی وجہ سے اُسے مخصوص خیر حاصل نہ ہو۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس آیت کے دونوں مطلب لئے جاسکتے ہیں۔ یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تیرے حضور دعا کرنے کی وجہ سے مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوئی اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ اے میرے رب چونکہ تُو نے مجھے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اس لئے تیرے مخصوص کر لینے کی وجہ سے اور تیرے انعامات کی وجہ سے میں نے یہ برکت پائی ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مشکلات میں مجھے ناکامی ہوئی ہو بلکہ ہمیشہ مجھے کامیابی ہوئی ہے اور میں نے اپنے مقصد کو حاصل کیا ہے۔

۵۵ حل لغات:۔ مَوَالِیْ مَوْلٰی کی جمع ہے اور اس کے بہت سے معنے ہیں چنانچہ مَوْلٰی کے ایک معنے دوست کے بھی ہوتے ہیں۔ اور مَوْلٰی کے معنے اِبْنُ الْعَمِّ یعنی چچا زاد بھائی کے بھی ہیں جنہیں پنجابی میں "شریکے والے" کہتے ہیں (اقرب) اس جگہ موالی سے مراد شریک ہی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنے شریکوں سے ڈرتا ہوں کہ وہ نہ معلوم میرے بعد کیسا معاملہ کریں گے

عَاقِر اس مرد یا عورت کو کہتے ہیں جس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو۔ اصل میں عَقَرَ کے معنے زخمی کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ عَقَرَ النَّخْلَةَ کے معنے ہوتے ہیں

مَوَالِیْ ۵۵

عَاقِر

قَطَعَ رَأْسَهَا كُلَّهُ مَعَ الْجُمَّارِ فَيَبَسَتْ۔ یعنی
اُس نے کھجور کے درخت کا اوپر کا حصہ اس قدر کاٹ دیا
کہ وہ سوکھ گیا اور اس میں پھل لگنا بند ہوگیا (اقرب)
جس مرد یا عورت کی اولاد نہ ہو چونکہ وہ بھی اپنے خاندان
کو زخمی کر دیتا اور اُسے مار دیتا ہے اس لئے بے نسلی کے
معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے
اصل معنے کاٹ دینے اور زخمی کر دینے کے ہی ہیں۔ عقر
کا لفظ عورت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور مرد کیلئے بھی۔

اَلْمَوَالِيْ: اَلْمَوْلیٰ کے معنے ہیں اَلْمُحِبُّ وَ
الصَّدِيْقُ۔ مُحِب اور دوست۔ نیز اس کے معنے ہیں۔
اَلنَّصِيْرُ۔ مددگار۔ وَقَالَ ابْنُ فَارِسٍ وَكُلُّ مَنْ
وَلِيَ أَمْرَ أَحَدٍ فَهُوَ وَلِيُّهُ۔ جو شخص کسی کے امور
کو سنبھالنے والا ہو وہ اُس کا ولی کہلاتا ہے۔ نیز ولی
کے معنے حافظ النسب کے بھی ہیں یعنی نسب کا محافظ
(اقرب)

مفردات میں ہے هَبْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا
أَيْ اِبْنًا يَكُوْنُ مِنْ أَوْلِيَائِكَ یعنی ایسا بیٹا عطا کر
جو تیرے مقربین میں سے ہو۔

تفسیر:۔ اس دعا میں حضرت زکریا علیہ السلام
نے اپنی ضرورتِ حقہ کا اظہار کیا ہے وہ کوئی دولت مند
نہیں تھے کہ انہیں اپنے بعد اپنی دولت کا فکر ہوتا۔ وہ
خدا تعالیٰ کے ایک نبی تھے پس اُن کا خوف دولت کے
جانے کا نہیں تھا بلکہ تعلیم کے مفقود ہونے کا تھا۔
حضرت زکریا علیہ السلام پروہت فیملی میں سے تھے اور
اُن کے رشتہ دار بھی پروہت تھے جو بیت المقدس اور
دوسری عبادت گاہوں کے ساتھ تعلق رکھتے تھے حضرت
زکریا علیہ السلام اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ
الٰہی اُن میں ایسی دنیاداری آچکی ہے کہ اُن کا کوئی قدم
یہودیت اور مذہب کو بچانے کے لئے نہیں اٹھتا معلوم
ہوتا ہے مسلمان پیروں کی طرح یہود میں بھی گدی وراثت
بن گئی تھی اور گدیاں قائم ہوگئی تھیں جیسے مسلمانوں میں
پیر مر جائے تو اس کے بیٹے کو پیر بنا لیا جاتا ہے چاہے
وہ کیسا ہی بے دین ہو۔ اسی طرح وہاں بیٹا موجود ہوتا تو
بیٹا گدی سنبھال لیتا۔ بیٹا نہ ہوتا تو چچا کا بیٹا گدی پر
بیٹھ جاتا۔ گویا اُن کی حالت مسلمان پیروں جیسی ہوگئی
تھی۔ جو کہلاتے تو پیر ہیں مگر عملی لحاظ سے وہ دین سے
کوسوں دور ہوتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک
سیّد پیر صاحب کا لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ وہ ایک
دفعہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہرن کے شکار کے لئے گئے۔
شکار کرنا منع نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے گو
خود شکار نہیں کیا مگر حدیثوں سے ثابت ہے کہ آپ
شکار کروایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک غزوہ میں آپ نے
سعد بن ابی وقاص کو بلایا اور فرمایا کہ دیکھو وہ ہرن جا رہا
ہے اُسے تیر مارو۔ جب وہ تیر مارنے لگے تو آپ نے
پیار سے اپنی ٹھوڑی اُن کے کندھے پر رکھ دی اور
فرمایا اے خدا اس کا نشانہ بے خطا کر دے۔ تو شکار
بُری چیز نہیں۔ اس میں جو لطیفہ ہے وہ آگے آتا ہے
بہرحال پیر صاحب نے ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال
دیا۔ ہرن بہت مضبوط تھا۔ اُس نے بھاگنا شروع کیا
اور کئی میل تک بھاگتا چلا گیا۔ اُس زمانہ میں بندوقیں
نہیں تھیں تیر یا نیزہ سے شکار کرتے تھے۔ پیر صاحب
بھی ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑاتے چلے گئے اور آخر
اُسے زخمی کر کے گرا لیا۔ جب وہ نیچے اُترے اور ہرن کو
ذبح کرنے لگے تو بجائے اس کے کہ وہ تکبیر کہہ کر اُسے ذبح
کرتے اُنہیں اتنا غصہ چڑھا ہوا تھا کہ چھری پھیرتے جاتے
تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے کہ ”اے سؤر تو نے تو
میرا گھوڑا ہی مار دیا ہے اے سؤر تو نے تو میرا گھوڑا ہی مار دیا ہے“

گویا غصہ یہ تھا کہ وہ بھاگا کیوں۔ حالانکہ انسان ہو یا جانور بچے بھی اپنی جان کا خوف ہوگا بھاگیگا۔

غرض یہودیوں میں بھی مسلمانوں کی طرح یہ رواج تھا کہ جب خاندان میں ایک دفعہ کوئی بزرگ ہوجاتا تو تو اس کی اولاد اس کی گدی سنبھال لیتی تھی خواہ وہ کیسی ہی نالائق ہوتی۔ حضرت زکریا علیہ السلام اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ۔ خدایا میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے بھی ڈرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اُن کے اندر دین کی خدمت کا کوئی احساس نہیں۔ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا۔ اور پھر میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اگر میں جوان ہوتا یا میری بیوی جوان ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ میرے ہاں کوئی اولاد پیدا ہوجاتی۔ کیونکہ بوڑھے مرد سے بھی جوان عورت کو بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ادھیڑ عمر والی عورت اگر کسی جوان مرد سے شادی کرے تو اُس کے ہاں بھی بچے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں مگر فرماتے ہیں دنیا میں بچہ پیدا ہونے کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ نہ میرے اندر پائے جاتے ہیں اور نہ میری بیوی کے اندر پائے جاتے ہیں۔ فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا پس اے خدا تو مجھے اپنے پاس سے ایک ایسا شخص عطا فرما جو ہمارے خاندان کی اولادوں کا حافظ ہو اور اُن کو دین پر قائم کرے۔ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ۔ جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوب کا بھی وارث ہو۔ یعنی جو میرے اندر قوم کی خدمت اور دین کی اشاعت کے لئے نیک جذبات پائے جاتے ہیں وہ بھی اُس میں پائے جائیں اور اسی طرح بنی اسرائیل میں جو نیکیوں کا ورثہ چلا آتا ہے اور موسیٰ اور ہارون اور داؤد اور سلیمان اور دوسرے انبیاء نے انہوں نے جو جو خوبیاں حاصل کی ہیں وہ سب کی سب اس میں پائی جائیں۔

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا اور اے میرے رب تُو اُس کو دنیا میں ایک پسندیدہ وجود بنا دے۔

دیکھو یہ کیسی لطیف دعا ہے اور کس طرح دعا کے چاروں کونے اس میں پورے کر دئے گئے ہیں۔ اس دعا کو اگر ہم اپنے الفاظ میں بیان کریں تو اس کی یہ صورت ہوگی کہ

"اے میرے خدا میرے اندر کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ میرا بیوی چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی تیرے الطاف خسروانہ کا عادی ہوں۔ اس لئے مایوسیاں اور ناکامیاں میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ ناز کرنے کی عادت مجھ میں پیدا ہو چکی ہے۔ رشتہ دار میرے بُرے اور موت کے بعد گدی سنبھالنے کے منتظر۔ بیوی میری بیکار۔ ان سب وجوہ کے ساتھ میں مانگنے آیا ہوں اور کیا مانگنے آیا ہوں۔ یہ مانگنے آیا ہوں کہ اے میرے خدا تو مجھے بیٹا دے۔ ایسا بیٹا دے۔ جو میرا ہم خیال اور دوست ہو ایسا بیٹا دے جو میرے بعد تک زندہ رہنے والا اور میرے خاندان کو سنبھالنے والا ہو اور ایسا بیٹا دے جو میرے اخلاق اور آلِ یعقوب کے اخلاق کو پیش کرنے والا ہو گویا صرف میرے نام کو ہی زندہ نہ کرے بلکہ اپنے دادوں پردادوں کے نام کو بھی زندہ کر دے اور پھر وہ انسانوں ہی کے لئے باعثِ خوشی نہ ہو۔ بلکہ اے میرے رب وہ تیرے لئے بھی باعث خوشی ہو۔"

سبحان اللہ کیسی لطیف دعا ہے کہ اندر میرا خراب ہو چکا ہے۔ باہر میرا خراب ہو چکا ہے۔ بیوی میری بیکار ہو چکی ہے۔ رشتہ دار میرے خراب ہو چکے ہیں۔ اور میں مانگتا یہ ہوں کہ تُو مجھے بیٹا دے۔ مگر اس بڑھاپے میں بھی

میں ناقص بیٹا نہیں مانگتا بلکہ میں یہ مانگتا ہوں کہ تو مجھے
وہ بیٹا دے جو میرے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور
اور اپنے باپ دادوں کے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو
اور پھر وہ میرا ہی پسندیدہ نہ ہو بلکہ تیرا بھی پسندیدہ
اور محبوب ہو۔ یہ دعا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام نے
کی۔ بے شک وہ پیشگوئیوں کی بنا پر جانتے تھے کہ نبوت
کا نور اب بنی اسرائیل سے چھینا جانے والا ہے۔ مگر
پھر بھی انسان خیال کرتا ہے کہ شاید کوئی ایسا ذریعہ نکل
آئے جس سے قوم بچ جائے اور وہ ہلاکت اور تباہی کے
گڑھے میں نہ گرے پس حضرت زکریا علیہ السلام نے یحییٰ
کے لئے اس لئے دعا کی کہ وہ جانتے تھے کہ اب ایک
ایسا شخص آنے والا ہے جس پر بنی اسرائیل کی نبوت
ختم ہو جائے گی۔ سو انہوں نے چاہا کہ کوئی ایسی صورت
نکل آئے جس کے نتیجہ میں آنے والے موعود کو قوم مان
لے اور اُس کی امداد اور نصرت کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ
کے عذاب سے بچ جائے اور خدا تعالیٰ کا نور کچھ دنوں
کے لئے اور ہماری قوم میں باقی رہ جائے۔ چنانچہ حضرت
یحییٰ علیہ السلام کا انجیل سے جو حال معلوم ہوتا ہے اُس
سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی آمد کی بڑی غرض
یہی تھی کہ قوم کو حضرت مسیحؑ پر ایمان لانے کے لئے تیار
کریں۔ انجیل میں لکھا ہے حضرت یحییٰؑ نے لوگوں سے کہا

"میں تو تمہیں توبہ کے لئے پانی سے بپتسمہ دیتا
ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے (یعنی مسیح) وہ
مجھ سے زور آور ہے میں اس کی جوتیاں اٹھانے
کے لائق نہیں وہ تمہیں روح القدس اور آگ
سے بپتسمہ دے گا۔" (انجیل متی باب ۳ آیت ۱۱)

بہر حال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سارا زور اس
بات پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود مقصود نہیں بلکہ مسیح کی
مدد کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور حضرت زکریا علیہ السلام نے
جو دعا مانگی وہ بھی اسی لئے مانگی تھی کہ اُن کا بیٹا آنیوالے
اسرائیلی موعود کے لئے رستہ صاف کرے شاید وہ
اپنی کوشش اور جد و جہد سے بنی اسرائیل کو آنیوالے
مسیح کی طرف متوجہ کر سکے اور اس طرح قوم پر جو عذاب
آنے والا ہے وہ ٹل جائے یہ چیز ہے جو حضرت زکریا
علیہ السلام کے سامنے تھی۔ اب اس پس منظر کے سامنے ساری
عیسائیت کو رکھ لو اُس کی کوئی حقیقت بھی باقی نہیں رہتی
عیسائیت اپنے آپ کو بنیاد قرار دیتی ہے اور یہ پس منظر
بتاتا ہے کہ وہ عمارت کی آخری اینٹ تھی کسی نئے مذہب
اور نئے اصول کی تعلیم اُس کا مقصد نہیں تھا بلکہ ایک
لمبے عرصہ سے جو نبوت اور وحی و الہام کا سلسلہ
بنی اسرائیل میں جاری تھا اُس کے خاتمہ کا اس ذریعہ
سے اعلان کیا گیا تھا۔ گویا مسیحیت کوئی بنیادی چیز
نہیں بلکہ خاتمہ کی اینٹ ہے۔ حضرت زکریا کی کوشش یہ
تھی کہ یہ نور کچھ اور دیر قائم رہے اور انہیں ایک ایسا بیٹا ملے
جو اس بات کے لئے اپنا پورا زور صرف کردے کہ بنی اسرائیل
مسیح کے منکر نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا سُنکر
حضرت یحییٰ کو بھیج دیا اور اس نے اپنا سارا زور بھی
لگا لیا مگر پھر خدا تعالیٰ کی تقدیر ہی پوری ہوئی اور
وہی کچھ ہوا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے زمانہ میں جب فرشتے اُن کے پاس لوطؑ کی
بستی کی ہلاکت کی خبر لے کر آئے یا انسان آئے جیسا کہ
ہمارا عقیدہ ہے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے
لوطؑ کی قوم کو تباہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس خبر کو سُنکر
انہیں درد پہنچا اور انہوں نے دعا کرنی شروع کی کہ یا اللہ
اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے۔ دعا کرتے کرتے اُن کے
دل میں جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے کہا خدایا!

"کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کریگا شاید
اُس شہر میں پچاس راستباز ہوں کیا تو اُسے

ہلاک کرے گا اور اُن پچاس راستبازوں کی
خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑیگا
ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے
ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں"

اللہ تعالےٰ نے کہا اے ابراہیم!
"اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز
ملیں تو میں اُن کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دونگا"

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال آیا کہ معلوم ہوتا ہے اُس میں پچاس بھی نیک آدمی نہیں ہیں اور انہوں نے کہا اچھا

"اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں شاید پچاس
راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا اُن پانچ
کی کمی کے سبب سے تُو تمام شہر کو نیست
کرے گا۔ اُس نے کہا۔ اگر مجھے وہاں
پینتالیس ملیں تو میں اُسے نیست نہیں
کروں گا۔ پھر اُس نے اُس سے کہا کہ شاید
وہاں چالیس ملیں۔ تب اُس نے کہا کہ مَیں
اُن چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔
پھر اس نے کہا۔ خداوند ناراض نہ ہو تو میں
کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔
اُس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی
ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا۔ دیکھئے
میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی
شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں بیس
کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں کرونگا۔ تب
اُس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایکبار
اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس
نے کہا میں دس کی خاطر بھی اُسے نیست نہیں
کرونگا" (پیدائش باب۱۸ آیت ۲۳ تا ۳۲)

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش ہوگئے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب یہ بستی ضرور تباہ ہو کر رہے گی۔ اب دیکھو خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی خوش کر دیا اور اپنی تقدیر بھی پوری کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب یہ دعا کر رہے ہوں گے تو وہ اپنے دل میں کتنے خوش ہوں گے اور انہوں نے اسے خدا تعالےٰ کا کتنا بڑا احسان سمجھا ہوگا کہ خدا تعالےٰ ایک بستی کو تباہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہے مگر اُن کی دعا اور التجا پر وہ کہتا ہے کہ اچھا میں نے تمہاری بات مان لی۔ اگر اس میں پچاس مومن ہوئے تو میں اُس بستی کو کبھی ہلاک نہیں کروں گا۔ پھر وہ پینتالیس پر آئے تو خدا تعالےٰ نے یہ بات بھی مان لی۔ پھر چالیس پر آئے تو یہ بات بھی مان لی۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے دس پر بات آگئی۔ مگر اس کے بعد خود بخود اُن کی زبان بند ہوگئی اور انہوں نے خیال کیا کہ اب میں اس سے زیادہ خدا تعالےٰ کو اور کیا کہوں میری تو اب زبان ہی نہیں چلتی۔ اسی طرح حضرت زکریا کے دل میں جب اس بات سے گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ قوم تباہ ہونے والی ہے تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ میں تو اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ اس بوجھ کے اٹھانے کی اب مجھ میں ہمت نہیں رہی اگر خدا تعالےٰ مجھے کوئی بیٹا دے اور ایسا بیٹا دے جو نبی ہو اور وہ آنے والے اسرائیلی موعود کا راستہ صاف کرے اور لوگوں کو اُس پر ایمان لانے کی تحریک کرے تو ممکن ہے یہ عذاب ہماری قوم پر سے ٹل جائے اور خدا تعالیٰ کا نور اس میں کچھ اور مدت تک باقی رہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ بہت اچھا ہم تجھے بیٹا دیں گے اور اُسے نبی بھی بنا دینگے مگر پھر بھی ہماری تقدیر ہی پوری ہوگی یہودی قوم پھر بھی ایمان نہیں لائے گی بلکہ خود تمہارا بیٹا انہی لوگوں کے ہاتھ سے قید خانہ میں قتل کیا جائیگا۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اِۨسْمُهٗ يَحْيٰى

(اس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی خبر دیتے ہیں (جو جوانی کی عمر تک پہنچے گا اور) اس کا نام

لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑧

(خدا کی طرف سے) یحییٰ ہوگا ہم نے اس سے پہلے کسی کو اس نام سے یاد نہیں کیا۔ ۵۶

۵۶ حل لغات :۔ غلام کا لفظ تین مختلف عمروں والوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی پیدائش سے لے کر جوانی تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں۔ جوانی سے لے کر کہولت تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں اور کہولت سے لے کر بڑھاپے تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں۔ گویا زندگی کے چار دور ہیں بچپن۔ جوانی۔ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں سو بڑھاپے کو چھوڑ کر باقی تینوں زمانوں کے لئے غلام کا لفظ بولا جاتا ہے۔

غلام

سمیؑ کے معنے ہم نام کے بھی ہوتے ہیں۔ اور سمیؑ کے معنے نظیر اور مثل کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

سَمِيًّ

تفسیر:۔ دعا مانگنے والا خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ انسان زکریا تھا جس نے اللہ تعالےٰ سے ایک کامل دعا مانگی۔ اب دوسرے کامل کی قبولیت کو دیکھو۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے سنو اے زکریا! ہم تمہیں ایک بچہ کی بشارت دیتے ہیں جو ادھیڑ عمر تک پہنچیگا مگر بڑھاپا نہیں دیکھے گا۔ اِسْمُهٗ يَحْيٰى اور اُس کا نام یحییٰ ہوگا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ پیدائش سے پہلے نام نہیں رکھا جاتا بلکہ پیدائش کے بعد نام رکھا جاتا ہے۔ پس اِسْمُهٗ یحییٰ کے معنے یہ ہیں کہ جب وہ پیدا ہو تو تم اُس کا نام یحییٰ رکھنا۔ یہ مطلب نہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی کہنا شروع کر دے گا کہ میرا نام یحییٰ ہے۔

یحییٰ کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں تو اُن کا نام یحییٰ آتا ہے لیکن اردو بائبل میں یحییٰ کی بجائے یوحنا نام لکھا ہے۔ عبرانی اور یونانی زبان میں انہیں JOHN اور JHANAN بھی کہتے ہیں۔ انگریزی بائبلوں میں اُن کا نام JOHN لکھا ہے۔ عبرانی کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں کہ یوحنا کے کیا معنے ہیں لیکن عربی میں یہ بامعنی لفظ ہے۔ اور یحییٰ کے معنے ہیں وہ شخص جو زندہ رہتا ہے پس اِسْمُهٗ يَحْيٰى میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ یہ بچہ زندہ رہے گا تم اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ یا اس کی صفت یحییٰ ہوگی اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہوگا۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ شہداء ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یحییٰ نام میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ یہ خدا تعالےٰ کی راہ میں شہید ہوگا اور اسے اعلےٰ درجہ کا روحانی مقام رکھیگا۔ کہ دنیا میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ چنانچہ یہ واضح بات ہے کہ مسیح جیسا نبی کبھی مر نہیں سکتا اور جب مسیح مر نہیں سکتا تو جس کی نبوت مسیح سے وابستہ ہے وہ بھی کبھی مر نہیں سکتا۔ مسیح اس لئے نہیں مر سکتا کہ وہ ایک نہ مرنے والے نبی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارہاص تھا۔ اور یوحنا اس لئے نہیں مر سکتا کہ وہ مسیح کا ارہاص تھا۔ جو خود ایک نہ مرنے والے نبی کا ارہاص تھا چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اب تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء گذرے ہیں۔

مگر ہمیں تو سو نبیوں کا بھی علم نہیں باقی سب مر گئے ہیں
پس نبی کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے
بعض زندہ رہتے ہیں اور بعض مر جاتے ہیں۔ حضرت یحییٰؑ
اُن نبیوں میں سے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھے گئے ہیں
کیونکہ اُن کی نبوت مسیحؑ کے ساتھ وابستہ تھی اور مسیحؑ اسلئے
نہیں مر سکتے کہ اُن کی نبوت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ وابستہ تھی جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہنے والے
نبی ہیں۔

لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ سَمِیٌّ کے
معنے ہوتے ہیں اُسی قسم کا نام رکھنے والا یعنی ہم اسم۔ اور
سَمِیٌّ کے معنے مثل کے بھی ہوتے ہیں۔ مفسرین غلطی سے
یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ سَمِیٌّ ہم اسم کے معنوں میں استعمال
ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پہلے
دنیا میں کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ یہ بالکل
غلط ہے۔ خود بائبل میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر آتا ہے
جن کا نام یوحنا تھا۔ چنانچہ ۲ سلاطین باب ۲۵ آیت ۲۳
میں یہودیوں کے ایک سردار کا نام یوحناہ لکھا ہے۔
اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک پڑپوتے کا
نام یوحنا تھا۔ دیکھو ۱ تواریخ باب ۳ آیت ۱۵۔ اسی طرح
عزرا نبی کے ساتھ جو لوگ ایران سے یروشلم بسانے کے
لئے آئے اُن میں سے ایک شخص کا نام یوحنا تھا (عزرا باب ۸
آیت ۱۲) پس مفسرین کا یہ خیال کہ اِس نام کا پہلے کوئی
شخص نہیں گذرا یہ واقعات کے خلاف ہے۔

عیسائیوں کو ایسی بات خدا دے۔ انہوں نے
سَمِیًّا کے معنے مفسرین کے بیان کے مطابق یہ سمجھ لئے
کہ اُس کا ہم نام کوئی نہیں۔ اور پھر بائبل سے یوحنا کے
ہم نام بتانے لگ گئے۔ اور پھر اس اعتراض کو مزید پختہ
کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ گویا رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ کسی سے بائبل کی تھوڑی سی
باتیں سُنی ہوئی تھیں اُن سے دھوکا کھا کر آپ نے یہ خیال
کر لیا کہ یحییٰ نام کا پہلے کوئی شخص نہیں گذرا۔ چنانچہ
اِس کے لئے وہ یہ حوالہ بیان کرتے ہیں کہ انجیل میں لکھا
ہے جب حضرت زکریا کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو چونکہ وہ
اس سے پہلے گونگے ہو چکے تھے اس لئے آٹھویں دن
اُن کے رشتہ دار لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور انہوں
نے تجویز کیا کہ اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا
رکھا جائے۔ مگر اس کی ماں نے کہا نہیں اس کا نام یوحنا
رکھا جائے۔ اِس پر اُنہوں نے اس سے کہا۔ کہ :-

"تیرے گھرانے میں کسُو کا یہ نام نہیں"
(لوقا باب ۱ آیت ۶۱)

یعنی تیرے خاندان میں چونکہ پہلے یہ کسی کا نام نہیں۔ اس
لئے ہم یہ نام نہیں رکھتے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ انہوں
نے حضرت زکریا کو اشارہ کیا کہ تُو اس کا کیا نام رکھنا
چاہتا ہے۔ انہوں نے تختی منگوا کر اُس پر لکھا کہ اُس کا
نام یوحنا ہے اور اُسی وقت اُن کی زبان کھل گئی۔ اور وہ
بولنے لگ گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ انجیل میں یہ جو فقرہ آتا ہے کہ
"تیرے گھرانے میں کسُو کا یہ نام نہیں"
معلوم ہوتا ہے یہ فقرہ کسی نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم)
کو سنایا مگر انہیں پوری طرح یاد نہ رہا اور بجائے اس
کے کہ وہ یہ سمجھتے کہ یوحنا نام زکریا کے خاندان میں سے کسی
کا نہیں تھا۔ انہوں نے قرآن میں یہ لکھوا دیا کہ اس سے
پہلے یہ نام دنیا میں کسی شخص کا نہیں تھا۔ حالانکہ قرآن کریم
نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ اس سے پہلے کسی کا نام یوحنا
نہیں تھا۔ قرآن کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ مفسرین کی
غلطی اُن کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہی نہیں کہ
اُن کا ہم نام کوئی نہیں تھا۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ لَمْ
نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ ہم نے اس سے پہلے

کسی اَور کو اُس کا سمی نہیں بنایا۔ اب بتاؤ کہ بچوں کا نام اُن کے ماں باپ رکھا کرتے ہیں یا خدا رکھا کرتا ہے؟ عیسائیوں میں دیکھ لو۔ ہندوؤں میں دیکھ لو۔ مسلمانوں میں دیکھ لو۔ کون نام رکھا کرتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ ماں باپ بچوں کے نام رکھا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ہم نے اس سے پہلے کسی کا نام یوحنا نہیں رکھا۔ اب فرض کرو یوحنا دنیا میں دس کروڑ بھی ثابت ہو جائیں۔ تب بھی کیا حرج ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ یوحنا نام پہلے تھا یا نہیں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے پہلے کسی اَور کا نام خود خدا تعالیٰ نے یوحنا رکھا تھا؟ بیشک دس کروڑ چھوڑ دس ارب یوحنا ثابت ہو جائیں اُن کا نام خدا نے یوحنا نہیں رکھا تھا بلکہ اُن کے ماں باپ نے رکھا تھا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے یہ نام پہلے کسی کا نہیں رکھا۔ اگر ایک نام دس کروڑ دفعہ بھی ماں باپ رکھیں تب بھی خدا اگر پہلی دفعہ کسی کا وہ نام رکھے گا تو وہ تو یہی کہیگا کہ میں نے یہ نام اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا۔ ہمارے ملک میں لاکھوں محمد ہوں گے۔ لاکھوں عبداللہ ہوں گے۔ لاکھوں عبدالرحمٰن ہوں گے۔ لاکھوں عبدالرحیم ہوں گے مگر اُن کے نام ماں باپ نے رکھے ہیں۔ اگر کل کسی کو الہام ہو کہ تُو اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھ اور یہ وہ نام ہے جو ہم نے اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا اور پھر وہ اس کا نام عبدالرحمٰن رکھدے تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ عبدالرحمٰن تو اس سے پہلے لاکھوں موجود ہیں۔ وہ یہی کہے گا کہ عبدالرحمٰن خواہ لاکھوں ہوں خدا نے اس سے پہلے اَور کسی کا نام عبدالرحمٰن نہیں رکھا۔ وہ نام اُن کے ماں باپ نے رکھے ہیں۔ اسی طرح اگر تو خدا تعالیٰ نے یہ کہا ہوتا کہ یوحنا کا ہمنام کوئی نہیں ہوگا تب تو اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہم نے اور کسی کو یہ نام نہیں دیا۔ اور یہ ٹھیک بات ہے جتنے نام بتائے جاتے ہیں وہ سب ایسے ہیں جو ماں باپ نے رکھے تھے اور یہاں اُس نام کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ نے رکھا۔ اس لئے اعتراض کی کوئی بات نہیں۔

دوسرے عربی زبان میں سَمِيًّا کے معنے مثل کے بھی ہوتے ہیں پس لَمْ نَجْعَلْ لَّهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی مثل نہیں بنایا۔ گویا اس میں اُن کے بے مثل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ یحییٰ بے مثل کس طرح ہو گئے۔ کیا موسیٰؑ اُس جیسا نہیں تھا؟ ہم کہتے ہیں بے مثل ہونا بھی اپنے اپنے دائرہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شخص گھوڑے کا بے مثل سوار ہے۔ فلاں بے مثل کاتب ہے۔ فلاں بے مثل رنگریز ہے۔ اب اس کے یہ معنے تو نہیں ہوتے کہ جو گھوڑے کی سواری میں بے مثل ہے وہ بے مثل کاتب بھی ہے یا بے مثل رنگساز بھی ہے یا بے مثل تفسیر لکھنے والا بھی ہے۔ جو شخص بے مثل کہلاتا ہے وہ اپنی کسی خاص خوبی میں بے مثل کہلاتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ سارے جہان کی خوبیاں اور کمالات اس میں پائے جاتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یحییٰ کس بات میں بے مثل تھے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ وہ پہلے نبی ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ الیاس کا نام پا کر آئے ہیں گویا ارہاص والے نبیوں میں سے یہ پہلے نبی تھے۔ جو الیاس کا نام پا کر اسی کی خو بو پر آئے۔ اس سے پہلے پرانے نبیوں میں کوئی ایسا نبی نہیں مل سکتا جو کسی دوسرے نبی کے لئے ارہاص کے طور پر آیا ہو۔ لیکن یحییٰ کے بعد حضرت مسیحؑ آ گئے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیلئے ارہاص تھے۔

اور پھر حضرت سید احمد صاحب بریلوی آ گئے جو حضرت مسیح موعودؑ کیلئے ارہاص تھے۔ پس لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا میں یہی خبر دی گئی تھی کہ ہم نے اِس سے پہلے کسی اور کو اس کا مثل نہیں بنایا۔ یعنی یحییٰ وہ پہلے شخص ہیں جو کسی کے مثیل ہو کر آئے ہیں چنانچہ دیکھ لو اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں تو ہمیں بار بار یحییٰ کا نام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ پیشگوئیوں میں بتایا گیا تھا کہ مسیح آسمان سے نازل ہوگا۔ جب مخالف ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ مسیح کہاں ہے؟ تو ہم کہتے ہیں مسیح ناصری کے وقت میں بھی لوگوں نے یہی سوال کیا تھا۔ جب حضرت مسیحؑ نے دعویٰ کیا تو لوگوں نے پوچھا کہ ملاکی نبی کی کتاب میں ایلیاہ کے دوبارہ نزول کی خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ مسیح سے پہلے آئے گا وہ ایلیاہ کہاں ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا کہ یوحنا ہی ایلیا ہے۔ اگر چاہو تو قبول کرو۔ پس جس طرح وہاں ایلیاہ کے نام پر یوحنا آیا اسی طرح یہاں مسیح ناصری کے نام پر خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے مسیح کو بھیجدیا۔ اس طرح اب ہماری جماعت بھی مجبور ہے کہ وہ یحییٰ کے نام کو زندہ رکھے کیونکہ مثیلیت کا نکتہ انہی کے ذریعہ سے حل ہوا ہے۔

غرض لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا سے یہ مراد ہے کہ ہم نے اس کا مثل پہلے نہیں بنایا اور اُسے ایسی خصوصیت عطا فرمائی ہے جو پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ چنانچہ موٹی مثال موجود ہے کوئی بتادے کہ یوحنا سے پہلے کسی اور نبی کو مثیل ایلیاہ قرار دیا گیا ہو۔ اگر عیسائی اور یہودی بھی مانتے ہیں کہ اس پہلو کے لحاظ سے اس کا کوئی مثل پہلے نہیں گذرا تو اُس کا بے مثل ہونا ثابت ہو گیا۔ بے مثل ہونے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ساری دنیا کی خصوصیات کسی میں پائی جائیں۔ کسی ایک بات میں بھی اگر کوئی بے مثل ہو۔ تو اُسے بے مثل کہا جاسکتا ہے۔ جیسے ایک بات میں نے بھی بتادی ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض خوبیاں ہو سکتی ہیں جو اُن کو بے مثل بنانے والی ہوں۔ انجیل میں بھی اس کے مطابق ہی حضرت یحییٰؑ کی تعریف آتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا کہ

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اُن میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی نبی بڑا نہیں" (انجیل لوقا باب ۷ آیت ۲۸)

گویا انجیل بھی اُن کو بے مثل قرار دیتی ہے۔ مگر انجیل نے جو مثال دی ہے وہ غلط ہے۔ انجیل کہتی ہے کہ اس سے کوئی بڑا نبی نہیں ہوا۔ مگر کیا وہ موسیٰؑ سے بھی بڑا تھا؟ حالانکہ وہ موسیٰؑ کا تابع تھا۔ کیا وہ ابراہیمؑ سے بھی بڑا تھا؟ حالانکہ وہ ابراہیمؑ کا تابع تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات جو بیان کی گئی ہے غلط ہے۔ کیونکہ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور دوسرے کئی انبیاء یوحنا سے بڑے تھے۔ لیکن قرآن نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اُس میں اُس نے یہ مثال نہیں دی صرف اتنا کہا ہے کہ کسی بات میں ہم نے اُسے بے مثل بنایا تھا۔ مسیح کہتا ہے کہ وہ بڑے نبی ہونے میں بے مثل ہے مگر خود عیسائی عقیدہ اس کے خلاف ہے پس حضرت یحییٰ کے بے مثل ہونے کا ثبوت بھی انجیل سے مل گیا اور انجیل کے جھوٹا ہونے کا بھی ثبوت مل گیا۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منافق تیرے پاس آتے ہیں۔ اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ تُو اس کا رسول ہے مگر خدا اس بات کا بھی گواہ ہے کہ یہ منافق اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ اسی طرح اس حوالہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جو بے مثل کہا تھا وہ درست تھا انجیل بھی اسے بے مثل مانتی ہے

مگر ساتھ ہی جو وجہ اُس نے بتائی اُس نے بتادیا کہ
انجیل جھوٹی ہے اور قرآن سچا۔ کیونکہ وہ وجہ خود عیسائی
مسلّمات کے خلاف ہے اور وہ یوحنا کو تمام انبیاء سے
بڑا قرار نہیں دیتے۔

اب میں بتاتا ہوں کہ یوحنا یعنی یحییٰ کا انجیل سے
کیا حال معلوم ہوتا ہے

لوقا میں لکھا ہے زکریا کاہن اور اس کی بیوی
الیسبات (یعنی الزبتھ) بڈھے تھے۔ عورت بانجھ تھی۔
لڑکا کوئی نہ تھا سو دونوں نیک اور راستباز تھے۔ ایک دن
وہ خوشبو جلانے کے لئے ہیکل میں گیا تو فرشتہ ملا
جس نے کہا کہ

" زکریا مت ڈر کہ تیری دعا سنی گئی اور
تیری جورو الیسبات تیرے لئے ایک بیٹا
جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے
خوشی و خورمی ہوگی اور بہتیرے اسکی پیدائش
سے خوش ہوں گے۔ کیونکہ وہ خداوند کے
حضور بزرگ ہوگا اور نہ مے اور نہ کوئی
نشہ پئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے
روح القدس سے بھر جائے گا اور بنی اسرائیل
میں سے بہتوں کو اُن کے خداوند خدا کی طرف
پھیرے گا اور وہ اُس کے آگے الیاس کی
طبیعت اور قدرت کے ساتھ چلیگا۔"

(لوقا باب۱ آیت ۵ تا ۲۵)

پھر لکھا ہے کہ یہ فرشتہ جبریل تھا۔ اور لکھا ہے کہ چونکہ
زکریا نے فرشتہ کی بات پر شک کیا اس لئے اُسے یوحنا
کی پیدائش بلکہ ختنہ کے وقت تک کے لئے یعنی قریباً
دس ماہ کے لئے گونگا کیا گیا۔ یہ بات قرآن شریف سے
مختلف ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اُن کے نبی ہونے کے لحاظ
سے قرآن کریم کا بیان زیادہ درست ہے۔ قرآن کریم کا بیان
ایک نبی کی شان کے مطابق ہے اور انجیل کا بیان
نبی کی شان کے خلاف ہے۔

بائبل کے بیان اور قرآنی بیان میں کچھ اختلافات بھی
ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کہتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو دعا کی تحریک
حضرت مریم علیہا السلام کے ایک معصومانہ کلام سے ہوئی
بائبل اس بارہ میں خاموش ہے۔ مگر خاموش ہونا واقعہ
کے غلط قرار دینے کے مترادف نہیں ہوتا۔ بائبل نے
جہاں بشارت کا ذکر کیا ہے تسلیم کیا ہے کہ زکریاؑ بیٹے
کے لئے دعا کیا کرتے تھے۔ کیونکہ لکھا ہے فرشتے نے
اُسے کہا کہ " تیری دعا سنی گئی" (لوقا باب۱ آیت ۱۳)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا بیٹے کے لئے
دعا کیا کرتے تھے۔ لیکن بائبل نے یہ نہیں بتایا کہ اس
دعا کا محرک کیا ہوا۔ قرآن کریم نے یہی واقعہ ابتداء سے
بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام
سے اُن کی باتیں ہوئیں تو اُس بچی کے معصومانہ کلام
سے اُن کے دل میں دعا کا جوش پیدا ہوا اور انہوں
نے اپنے رب سے یہ دعا کی۔ گویا بائبل نے صرف
اتنا واقعہ بیان کیا ہے جو بعد کا ہے دعا کے محرک
کا ذکر اُس نے نہیں کیا۔ اس سے اس کے نقص کا تو اظہار
ہوتا ہے لیکن قرآن کریم کی غلطی ظاہر نہیں ہوتی۔

ہمارے پاس اس بات کا ثبوت کہ قرآن کریم کی
روایت ہی صحیح ہے یہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ حضرت زکریاؑ
کی آخری عمر میں پیدا ہوئے تھے اور اس بات کو خود
بائبل بھی تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب فرشتے نے
انہیں یحییٰ کی پیدائش کی خوشخبری دی تو انہوں نے کہا کہ

" میں اس بات کو کس طرح جانوں۔ کیونکہ
میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے"۔

(لوقا باب۱ آیت ۱۹)

اب سوال یہ ہے کہ حضرت زکریا نے اس سے پہلے کیوں نہیں دعا کی؟ آخری عمر میں جا کر دعا کرنا صاف بتاتا ہے کہ کوئی نیا محرک پیدا ہوا تھا اور وہ نیا محرک یہی تھا کہ حضرت مریمؑ پیدا ہو چکی تھیں جن کے ایک معصومانہ کلام سے انہیں دعا کی تحریک پیدا ہوئی پس قرائن اسباب کی گواہی دے رہے ہیں کہ قرآن کریم کی بات ہی صحیح ہے۔ بہرحال اس بات کو اختلاف قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص صبح کی بات بیان کرے اور دوسرا دس بجے کی اور ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر کوئی شخص کہنا شروع کر دے کہ ان میں بڑا اختلاف ہے۔ ہر شخص جو حقیقت کو سمجھتا ہوگا وہ فوراً کہے گا کہ ان میں اختلاف کونسا ہے۔ ایک صبح کی بات ہے اور دوسری دس بجے کی ہے۔ اختلاف تب ہوتا جب ایک ہی وقت کی بات میں متضاد بیان ہوتا۔ بائبل کے یہ الفاظ کہ اے زکریا تیری دعا سنی گئی بتلاتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کو قبولیتِ دعا سے شروع کرتی ہے لیکن قرآن کریم جو واقعہ بیان کرتا ہے وہ دعا کرنے سے پہلے کا ہے۔ پس بائبل کی اس خاموشی کے صرف یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم میں ابتداء سے واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بائبل نے اس دعا کے محرک کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے اُس کے بیان کے نامکمل ہونے کا تو پتہ چلتا ہے لیکن قرآن کریم کی غلطی ظاہر نہیں ہوتی۔

(۲) بائبل کہتی ہے کہ ایک فرشتہ نے یہ بشارت دی مگر قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے کہا کہ اے زکریا تیرے ہاں بیٹا ہوگا۔ بظاہر یہ اختلاف ہے لیکن حقیقت میں نہیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کا کلام اکثر فرشتے لاتے ہیں اور فرشتے اپنے پاس کی غیب کی باتیں نہیں کر سکتے ورنہ اُن کو خدا ماننا پڑے گا۔ پس اگر فرشتے نے کہا تب بھی وہ خدا کی طرف سے کہا

اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ نے یوں کہا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے یوں کہا۔ اور چونکہ اس جگہ پر یہ الفاظ ہیں کہ "تیری دعا سنی گئی" اِس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ فرشتے کو خدا نے بتایا تھا کہ میں نے زکریا کی دعا سن لی ہے۔ پس فرشتہ کا قول خدا تعالےٰ کی نمائندگی میں تھا۔ اور اس کا ذکر دونوں طرح کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح بھی کہ فرشتے نے کہا اور اس طرح بھی کہ خدا نے کہا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے خواب میں اگر کوئی شخص آم دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص ایسی خواب دیکھے اور اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے اور وہ اُس کی پیدائش پر کہے کہ خدا نے مجھے پہلے سے بتا دیا تھا کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو تمہیں خدا نے کب کہا تھا تم نے تو آم دیکھا تھا؟ اگر کوئی شخص ایسا اعتراض کرے تو سب لوگ اُسے پاگل کہیں گے کیونکہ خواہ آم کی شکل میں اُسے بتایا گیا ہو بہرحال بتایا تو اُسے خدا نے ہی تھا۔ اسی طرح تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ فرشتے نے یوں کہا اور تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ خدا نے یوں کہا۔ آخر فرشتہ اپنے پاس سے تو کچھ نہیں کہتا۔ وہ تو جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے ہی کہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے ایک دوسری جگہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہی حقیقت ہے۔ کیونکہ سورۃ آل عمران میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى (آل عمران ع ۴) یعنی حضرت زکریا علیہ السلام اللہ تعالےٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اتنے میں ملائکہ ظاہر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ خدا تمہیں یحییٰ کی پیدائش کی بشارت دیتا ہے

دیکھ لو یہاں خدا تعالے کے بولنے کا ذکر نہیں بلکہ ملائکہ کے بولنے کا ذکر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سورۂ مریم میں خدا تعالے کے بولنے کا جو ذکر ہے۔ اس سے مراد بھی براہ راست بولنا نہیں بلکہ ملائکہ یا اُن کے سردار جبریل کی معرفت بولنا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں لکھا ہے پس یہ اختلاف نہیں ایک مزید لطیف تشریح ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ فرشتہ جب کلام کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ ہی کا کلام ہوتا ہے۔ اسکے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے یوں کہا۔ ریہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ نے یوں کہا۔ وہیری اس جگہ لکھتا ہے کہ مسلمان دماغ بھی کیسا عجیب ہے بائبل میں لکھا ہے کہ جبریل ظاہر ہوا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ فرشتوں نے اُسے پکارا۔ اور پھر اُسے ایک معمولی اختلاف سمجھتے ہیں۔ گویا وہیری نے یہ ہنسی اڑائی ہے کہ مسلمان بھی عجیب انسان ہیں اتنا بڑا اختلاف قرآن اور انجیل میں پایا جاتا ہے اور پھر اُسے معمولی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اگر غور کیا جاتے تو یہ کہنا بھی ٹھیک ہے۔ کہ فرشتوں نے یوں کہا اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ فرشتہ نے یوں کہا۔ کیونکہ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالے کے جتنے اہم کلام ہوتے ہیں۔ اُن کے نزول کے وقت کئی کئی فرشتے ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالے فرماتا ہے عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۝ (جن ع۲) یعنی اللہ تعالے عالم الغیب ہے اور وہ سوائے اپنے رسولوں کے اور کسی کو اپنے غیب سے کثرت کے ساتھ اطلاع نہیں دیتا اور پھر جو غیب نازل ہوتا ہے اس کے ساتھ بہت سے فرشتے بھی نازل ہوتے ہیں تاکہ وہ اس کلام کی نگرانی کریں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ جب اللہ تعالے اپنا کوئی اہم کلام کسی فرشتہ کے ذریعہ بھجواتا ہے تو اُس کے ساتھ اور بھی بہت سے سپاہی فرشتے متعین ہوتے ہیں۔ پس فرشتہ کہو تب بھی درست ہے کیونکہ بولتے وقت ایک ہی بولے گا اور اگر فرشتے کہو تب بھی درست ہے کیونکہ کلام الٰہی کے ساتھ کئی کئی فرشتے آتے ہیں۔ جب خدا تعالے نے یہ کہا کہ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اُسے ملائکہ نے پکارا تو اس کے معنے یہ تھے کہ چونکہ یہ ایک اہم کلام تھا اس لئے ہم نے بہت سے فرشتوں کے ساتھ اپنا کلام بھجوایا۔ اور اگر انجیل نے اسے ایک فرشتہ قرار دیا ہے تب بھی درست ہے کیونکہ جب بولے گا تو ایک ہی بولے گا۔ مگر اُس کا بولنا دوسروں کی نمائندگی میں ہوگا۔ جیسے گورنر یا وزراء سے ملنے کے لئے جب کوئی وفد جاتا ہے تو اخبار والے یہی لکھتے ہیں کہ وفد نے یہ بات کہی۔ حالانکہ وفد نہیں بولتا بلکہ اُن کی طرف سے کوئی ایک شخص بولتا ہے۔ آئیں گے سات آٹھ لیکن بولیگا ایک۔ اگر سات آٹھ یکدم بولنا شروع کر دیں تو گورنر اُن سب کو نکال دے۔ کہ تم کیسے بد تہذیب ہو۔ پس اسی طرح فرشتہ کہو تب بھی درست ہے اور فرشتے کہو تب بھی درست ہے۔ تعجب ہے کہ اتنی معمولی بات جس کے یوروپین لوگ رات دن عادی ہیں اور وہ وفود کے طریق ملاقات کو اچھی طرح جانتے ہیں وہی اگر قرآن کریم میں آجائے تو اس پر ہنسی اڑانے لگ جاتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

یہ گناہ وہ ہے جو تمہارے شہر میں بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں یہ طریق وہ ہے جو رات دن تمہارے ہاں جاری ہے اس پر اعتراض کیسا؟

پھر ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو اُس میں بھی اِس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے

"پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اُسے نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی۔ اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں (یعنی پہلے خدا نظر آیا اور پھر دیکھا تو تین مرد سامنے کھڑے تھے) وہ اُن کو دیکھ کر خیمہ کے دروازہ سے اُن سے ملنے کو دوڑا اور زمین تک جھکا۔ اور کہنے لگا کہ اے میرے خداوند اگر مجھ پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اُس درخت کے نیچے آرام کریں۔ میں کچھ روٹی لاتا ہوں آپ تازہ دم ہو جائیں تب آگے بڑھیں کیونکہ آپ اِسی لئے اپنے خادم کے ہاں آئے ہیں۔ انہوں نے کہا جیسا تُو نے کہا ہے ویسا ہی کر۔ اور ابراہام ڈیرے میں سارا کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ باریک آٹا جلد لے اور اُسے گوندھ کر پھلکے بنا اور ابراہام گلّہ کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اور اس نے جلدی جلدی اُسے تیار کیا۔ پھر اُس نے مکھن اور دودھ اور اُس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لیکر اُن کے سامنے رکھا اور آپ اُن کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انہوں نے کھایا

پھر انہوں نے اس سے پوچھا کہ تیری بیوی سارہ کہاں ہے۔ اُس نے کہا وہ ڈیرے میں ہے۔ تب اُس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور دیکھ تیری بیوی سارہ کے بیٹا ہوگا (دیکھو یہاں پہلے خدا نظر آتا ہے۔ پھر تین مرد دکھائی دیتے ہیں اور وہ باتیں شروع کر دیتے ہیں مگر یکدم اُن کی گفتگو میں ہی پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ "میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤں گا") اُس کے پیچھے ڈیرے کا دروازہ تھا سارہ وہاں سے سن رہی تھی اور ابرہام اور سارہ ضعیف اور بڑی عمر کے تھے۔ اور سارہ کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو عورتوں کی ہوتی ہے۔ تب سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے۔ پھر خداوند نے ابرہام سے کہا (اب پھر میں کی بجائے خداوند ہو گیا ہے) کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہوگا۔ کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے۔ موسم بہار میں معین وقت پر میں تیرے پاس پھر آؤں گا اور سارہ کے بیٹا ہوگا۔ تب سارہ انکار کر گئی کہ میں نہیں ہنسی کیونکہ وہ ڈرتی تھی پر اُس نے کہا نہیں تو ضرور ہنسی تھی"

(پیدائش باب ۱۸ آیت ۱ تا ۱۵)

اس حوالہ کو دیکھو۔ پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کو

خدا نظر آیا۔ پھر خدا کی بجائے تین مرد کہا گیا اور انہوں نے گفتگو شروع کر دی اور کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد پھر تینوں غائب ہو گئے۔ اور ذکر اس طرح شروع کیا گیا کہ "اُس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤنگا" یعنی پھر تین کا ذکر ایک شخص کے طور پر کرنا شروع کر دیا گیا اور اُن کے لئے ضمیر "اُس" اور "میں" کی استعمال کی گئی۔ مگر آگے چل کر کہہ دیا گیا کہ "خداوند نے ابرہام سے کہا کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہو گا" پس اس میں تو عیسائیوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اگر قرآن نے ایک جگہ یہ کہہ دیا کہ ملائکہ نے زکریا کو خبر دی تھی اور دوسری جگہ یہ کہہ دیا کہ خدا نے اُسے خبر دی تھی تو اس میں اُن کے نزدیک بڑے تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ تعجب کی بات ہے۔ انجیل میں بے شک ایک فرشتے کا ذکر آتا ہے مگر جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اہم کلام کے ساتھ کئی فرشتے نازل ہوا کرتے ہیں گو کلام ایک ہی فرشتہ کرتا ہے۔ پس ہم بائبل کے بیان کو بھی غلط نہیں کہتے۔ اُس نے بھی ٹھیک کہا اور قرآن نے جو کچھ کہا وہ بھی ٹھیک کہا۔

(۳) انجیل میں لکھا ہے کہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص ہو گا مگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ بھی ایک اختلاف ہے جو عیسائیوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اس کا یہاں ذکر نہیں مگر سورۃ آل عمران میں لکھا ہے مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ (آل عمران ع۴) پس اختلاف کوئی نہ رہا۔ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ ایلیاہ کی روح اور اُس کی قوت میں مسیح کے آگے آگے چلیگا اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنی آمد سے ایک پیشگوئی کو پورا کریگا جو صحفِ سابقہ میں پائی جاتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ سب واقعہ ایک ہی جگہ بیان ہو۔ بائبل میں بھی کوئی ٹکڑہ کسی جگہ پایا جاتا ہے اور کوئی کسی جگہ۔

(۴) قرآن میں لکھا ہے کہ زکریا کو تین دن خاموش رہنے کا نشان دیا گیا (خواہ خود خاموش رہنے کا یا خدا تعالیٰ کی طرف سے زبان بند ہو جانے کا) مگر بائبل کہتی ہے کہ اُن کی زبان بطور سزا بند رہی اور یحییٰؑ کی پیدائش کے بعد اُن کے ختنہ کے دن تک وہ گونگے رہے۔ آخر ختنہ کے دن جب انہوں نے یہ لکھ کر دیا کہ اس کا نام یحییٰ رکھو تب اُن کی زبان کھلی۔

(لوقا باب ۱ آیت ۶۴)

اِن دونوں میں اختلاف تو ہے لیکن خود سوچ لو کہ عقل اور فطرت کسے سچا بتاتی ہے۔ ایک نبی یا بائبل کے بیان کے مطابق کاہن پر (جو ایسا ہی مقام رکھتا ہے جیسے ہمارے ہاں محدّث کا مقام ہوتا ہے) خدا تعالیٰ ابراہیمی انعام نازل کرتا ہے یعنی جس طرح ابراہیمؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں بیٹے کا وعدہ کیا تھا اسی طرح زکریاؑ کے ساتھ اس نے بیٹے کا وعدہ کیا ایسے بیٹے کا جو بقول مسیحؑ سب نبیوں کا موعود تھا اور اُس نے ضرور پیدا ہونا تھا کیونکہ اس کے بغیر مسیحؑ پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن محض زکریا کے اِس قول پر کہ میں بھی بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی بوڑھی ہے بچہ کہاں سے ہو گا اُس پر یہ عذاب نازل کیا جاتا ہے کہ اُسے دس ماہ کے لئے گونگا کر دیا جاتا ہے حالانکہ بائبل سے ثابت ہے کہ یہی فعل ستری زوجۂ ابراہیمؑ نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

"سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے" (پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۲)

لیکن اس پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے اُس کو ایک دن کے لئے بھی گونگا نہیں کیا۔ حالانکہ اگر یہ فعل جرم تھا تو اس جرم کے بدلہ میں یہی عذاب سارہ پر بھی نازل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اُس پر تو کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ اور زکریا نے یہی بات کہی تو اسے دس ماہ کے لئے گونگا کر دیا گیا۔

پھر بائبل سے ہی ثابت ہے کہ زکریا کا یہ قول انکار کے طور پر نہ تھا بلکہ محض اظہار تعجب کے طور پر تھا یعنی یہ کتنی بڑی عظمت اور شان کا نشان ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لوقا میں فرشتہ کا یہ قول درج ہے کہ "اے زکریا مت ڈر کہ تیری دعا سنی گئی"

(لوقا باب آیت ۱۳)

اب سوال یہ ہے کہ کیا زکریا اُس دن بوڑھے ہوئے تھے یا زکریا کی بیوی اُس دن بوڑھی ہوئی تھیں وہ لازماً چھ مہینے یا سال دو سال پہلے بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور اگر یہ بات انہیں قطعی طور پر ناممکن نظر آتی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہی نہیں ہو سکتا تو وہ اس قسم کی دعا کرتے ہی کیوں؟ اُن کا دعا کرنا اور بائبل میں فرشتے کا یہ قول درج ہونا کہ "اے زکریا مت ڈر کہ تیری دعا سُنی گئی" بتاتا ہے کہ زکریا کا اس بات پر ایمان تھا کہ خدا ایسا کر سکتا ہے۔ زکریا جانتا تھا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زکریا جانتا تھا کہ میری بیوی بھی بوڑھی ہو چکی ہے۔ مگر وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ خدا تعالیٰ بڑی قدرتوں کا مالک ہے۔ اس لئے وہ اس سے دعائیں کرتا رہتا تھا۔ پس جب اُس کی دعا کی قبولیت کی اطلاع اُسے ملی۔ تو وہ حیرت واستعجاب کا شکار تو ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ایسا قادر ہے کہ ایسی غیر معمولی دعا بھی سن سکتا ہے مگر وہ منکر اور متردد نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سزا منکر اور متردد کو ملا کرتی ہے۔ حیرت اور استعجاب ظاہر کرنے والے کو انعام ملا کرتا ہے۔ پس بائبل کی اپنی شہادت قرآنی معنوں کی تائید کرتی ہے کہ زکریا نشان کا طالب ضرور ہوا مگر انکار کا مرتکب نہیں ہوا۔ پس بائبل کا یہ بیان کہ اُسے سزا ملی اور وہ دس ماہ تک گونگا رہا غلط ہے اور قرآن کریم کا یہ بیان ہی درست ہے کہ صرف تین دن تک اُس نے کلام نہ کیا۔ اور یہ خاموشی ذکر الٰہی کے لئے تھی نہ کہ بطور سزا کے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ (آل عمران ع۴) یعنی تیرے لئے حکم یہ ہے کہ تُو لوگوں سے تین دن تک کلام نہ کر سوائے اشارہ کے اور بجائے لوگوں سے باتیں کرنے کے اِن ایام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو۔ چونکہ تین دن انہوں نے ذکر الٰہی کرنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ اِن دنوں میں اور باتیں نہ کرو۔ ورنہ اُسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی الزام کو دور کرنے کے لئے جو انجیل نے حضرت زکریا پر لگایا ہے کہ وہ گونگے ہو گئے تھے فرمایا اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا۔ تیرا نشان یہ ہے کہ تو تین دن رات کلام نہیں کرے گا مگر ہو گا بے عیب اور تندرست (سَوِیًّا) کوئی بیماری تجھے نہیں ہو گی۔ اب دیکھو قرآنی بات کتنی سچی نظر آتی ہے کہ خدا نے جب حضرت زکریا کی دعا قبول کی۔ تو انہوں نے کہا خدایا اب مجھے بھی شکریہ کا موقع دیجئے۔ خدا نے کہا تین دن مسجد میں اعتکاف بیٹھو اور ذکر الٰہی میں مشغول رہو یہ تمہاری طرف سے ہمارے شکریہ کا ایک نشان ہو گا لیکن بائبل کا بیان عقلاً بھی غلط ہے اور نقلاً یعنی دلیل کے

لحاظ سے بھی باطل ہے۔

قرآن کریم اور بائبل میں یہ ایک نمایاں فرق ہے۔ کہ بائبل ہمیشہ انبیاء پر گناہ کا الزام لگانے پر دلیر ہوتی ہے۔ مگر ایسے ہر الزام کی قرآن کریم تردید کرتا ہے۔ مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ ہارون نے شرک کیا (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶) قرآن کہتا ہے کہ اُس نے شرک نہیں کیا۔ بائبل کہتی ہے کہ زکریا نے خدا کی قدرت کا انکار کیا تو اُسے سزا ملی (لوقا باب ۱ آیت ۲۰ و ۲۱) قرآن کہتا ہے کہ اُس نے خدا کی وعدہ کو سُنکر چاہا کہ اُسے شکریہ کا کوئی کام بتایا جائے چنانچہ خدا تعالےٰ نے تین دن چُپ کا روزہ رکھنے اور ذکر الٰہی کی کثرت کا ارشاد فرمایا اور اس عرصہ میں اُن پر نہ کوئی عذاب آیا نہ بیماری ہوئی۔

اِسی طرح بائبل نے حضرت سلیمانؑ کو مجرم اور عیاش اور بے دین قرار دیا ہے (۱ سلاطین باب ۱۱ آیت ۱ تا ۶) لیکن قرآن کریم نے اُن کو راستباز اور مومن اور نیک قرار دیا ہے۔ یہ کتنا بڑا ثبوت ہے اِس بات کا کہ قرآنی تاریخ سچی ہے اور بائبل کی روایات مخدوش۔ اگر یہ لوگ جن کا ذکر ہے خدا کے برگزیدہ تھے تو پھر اُن سے اِن افعال کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر برگزیدہ نہ تھے تو پھر نبیوں میں اُن ذکر کرنا حماقت ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہی باتیں جو بائبل میں نبیوں کی نسبت لکھی ہیں عوام الناس یا پادریوں کے ماں باپ کی نسبت کہی جائیں تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے مگر دلیری سے اِن باتوں کو نبیوں کی نسبت تسلیم کر لیتے ہیں۔

(۵) بائبل کہتی ہے کہ جب مریم حاملہ ہوئیں اور یوحنا کی ماں کے پاس گئیں تو یوحنا کی ماں روح القدس سے بھر گئیں اور بولیں کہ

"یہ کیونکر ہُوا کہ میرے خداوند کی ماں میرے
پاس آئی کہ دیکھ تیرے سلام کی آواز جونہی
میرے کان تک پہنچی لڑکا میرے پیٹ میں
خوشی سے اچھل پڑا" (لوقا باب ۱ آیت ۴۳ و ۴۴)

لیکن قرآن کہتا ہے کہ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا (مریم ع ۱) اور یہ کہ سَیِّدًا وَّحَصُوْرًا (آل عمران ع ۴) یعنی اُس کو خدا نے روحانی طاقت اور روحانی حکمت اور روحانی بادشاہی بچپن سے ہی عطا فرمائی تھی۔ اور یہ کہ وہ سردار تھا اور ہر قسم کی بدیوں سے پاک اور منزہ تھا۔ گویا عیسائیوں کے نزدیک اختلاف یہ ہے کہ بائبل تو یحییٰ کو مسیحؑ کا غلام قرار دیتی ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ یحییٰ سید تھا اور بچپن سے ہی اُسے سرداری عطا کی گئی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انجیل کے دوسرے حوالوں سے ظاہر ہے کہ لوقا کا بیان محض زیبِ داستان کے لئے ہے ورنہ حقیقت سے اُسے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر یوحنا مسیحؑ کا خادم تھا جیسا کہ لوقا نے اس واقعہ میں لکھا ہے تو کیا مصیبت پڑی تھی کہ مسیحؑ یوحنا کا شاگرد ہوتا۔ اناجیل کے مصنفوں نے اپنے آقا کو عزت دینے کیلئے اس موقعہ پر سخت ظلم کئے ہیں۔ مثلاً متی کہتا ہے کہ مسیحؑ یوحنا سے بپتسمہ پانے کے لئے آیا اور اُسے کہا کہ مجھے اپنا مرید بناؤ تو یوحنا نے کہا کہ میں تجھ سے بپتسمہ پانے کا محتاج ہوں (متی باب ۳ آیت ۱۴) یعنی حضور میرے اُستاد ہیں اور مَیں تو آپ کا شاگرد ہوں مَیں آپ کو کس طرح بپتسمہ دے سکتا ہوں۔ پھر یہ بات مسیحؑ کے مُنہ میں بھی ڈالی گئی ہے کہ "اب ہونے دے کیونکہ ہمیں مناسب ہے کہ یوں ہی سب راستبازی پوری کریں" (انجیل متی باب ۳ آیت ۱۵) یعنی ہے تو یہ ٹھیک کہ مَیں بڑا ہوں اور تُو چھوٹا ہے لیکن چونکہ نبی خبر دے چکے ہیں اُس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ جواب کتنا غیر معقول ہے اگر مسیحؑ یوحنا کی شاگردی سے بالا تھا تو نبیوں نے یہ پیشگوئی

کیوں کی اور خدا تعالیٰ نے ایسا مقدر کیوں کیا؟ یہ عجیب
بات ہے کہ مسیح جاتا ہے یوحنا کی بیعت کرنے اور یوحنا
آگے سے یہ کہتا ہے کہ میں کس کی بیعت لوں میں تو خود
چھوٹا ہوں اور تُو بڑا ہے اور مسیح کہتا ہے پہلے نبیوں سے
غلطی ہو گئی ہے۔ ہے تو یہی درست کہ میں بڑا ہوں لیکن
چونکہ وہ ایک بات کہہ چکے ہیں اس لئے اب اس کا پورا
کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ ایسی ہی بات ہے جیسے شیعوں کا عقیدہ ہے
کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب معراج کی رات
خدا تعالےٰ کے پاس گئے اور باتیں ہونے لگیں تو
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ حضور اتنی دُور
سے میں چل کر آیا ہوں اب دیدار تو کروا دیجئے۔ اس پر
اللہ میاں نے پردہ اُٹھایا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے کیا دیکھا کہ حضرت علیؓ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کہا حضور
نے اتنی تکلیف دے کر بلایا۔ یہ دیدار تو نیچے بھی روزانہ
ہو جاتا ہے۔ خدا تعالےٰ نے کہا اس میں بھی راز ہوتے
ہیں۔ اِسی قسم کا راز یوحنا والے واقعہ میں ہے کہ مسیح
یوحنا کے پاس اُن کے مرید بننے کے لئے جاتے ہیں اور
یوحنا کہتے ہیں توبہ توبہ بھلا مجھ میں یہ جُرأت ہو سکتی
ہے کہ میں آپ کی بیعت لُوں اور حضرت مسیح کہتے ہیں کہ
ہوں تو میں ہی سردار۔ لیکن چونکہ نبیوں کے مُنہ سے
ایک بات نکل چکی ہے اس لئے اس کو پورا کرنا بھی ضروری
ہے۔ کیا لغویت ہے۔ مرقس نے بھی اسی رنگ کو
اختیار کیا ہے گو اُوپر والی گفتگو اس نے بیان نہیں
کی۔ لوقا نے بھی اس گفتگو کا تو ذکر نہیں کیا۔ لیکن یوحنا
کی شاگردی اور ماتحتی کا اُوپر کے واقعہ میں اظہار
کیا ہے۔ یوحنا نے مسیح کے یوحنا سے بپتسمہ پانے کا
ذکر چھوڑ دیا ہے مگر ان باتوں سے کیا بنتا ہے۔ تین
اناجیل کہہ رہی ہیں کہ یوحنا نے مسیح کو بپتسمہ دیا جس کے
معنے یہ ہیں کہ وہ استاد بنا۔ بے شک مسیح اُس سے
بڑھ گیا مگر بڑھنے کے وقت بڑھا۔ اُس سے پہلے تو وہ بہرحال
یوحنا کا شاگرد تھا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے دنیا
میں کئی شاگرد اُستاد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اُستاد
پرائمری پاس ہوتا ہے لیکن اُس کا شاگرد ایم اے پاس
کر لیتا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ جب وہ پرائمری
میں پڑھ رہا ہو تو پرائمری کا اُستاد اُسے پڑھانے سے
انکار کر دے اور کہے کہ تو بڑا ہے اور میں چھوٹا۔ بیشک
جب وہ ایم اے ہو جائے گا تو استاد سے آگے نکل
جائے گا۔ لیکن اِس سے پہلے وہ اپنے اُستاد کی شاگردی
سے انکار نہیں کر سکتا۔ پس یہ کہنا کہ یوحنا نے پہلے سے
اُس کی بڑائی کا اقرار کیا ایک عبث فعل ہے مگر ایسا
تھا تو اُسے بپتسمہ پر مقرر ہی کیوں کیا گیا؟

قرآن نے جو بات بیان کی ہے کہ یوحنا مسیح کا مصدق
تھا۔ وہیری اپنی کتاب کی جلد ۲ ص۱ میں اس پر سخت
برافروختہ ہوا ہے کہ ایک ماتحت اور چھوٹے درجہ کے
نبی کو مصدق قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ اس کی حماقت ہے
جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہی انجیل نے بھی کہا ہے اور
بتایا ہے کہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص تھا۔

(٦) قرآن کہتا ہے کہ مریم کے پاس رزق آتا تھا
بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔ اس اختلاف سے کچھ ثابت
نہیں ہوتا۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ لوگ بچوں کو محبت کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً اُن بچوں کو جو نذر کے ہوں۔ اور
لوگ اُن کی خدمت کرتے ہیں۔ جو لوگ صحیح طور پر انکی قدر
سمجھتے ہیں وہ اُن کا ادب اور احترام کرتے ہیں اور
جو نہیں سمجھتے وہ انہیں صدقہ وغیرہ دے دیتے ہیں۔ اِسی
جذبہ کے ماتحت حضرت مریم کے لئے بھی لوگ مختلف
تحائف لاتے ہوں گے۔ چنانچہ میور اور آرنلڈ نے اپنی
کتب میں مسیحیوں کی روایات سے اس کے مشابہ باتیں

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ

(زکریا نے) کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ میری بیوی

عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٩﴾ قَالَ كَذٰلِكَ

بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہوں۔ (الہام لانیوالے فرشتہ نے)

قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ

کہا کہ (جس طرح تو کہتا ہے واقعہ) اسی طرح (ہے) (مگر) تیرا رب کہتا ہے کہ یہ (بات) مجھ پر آسان ہے اور (دیکھ کہ) میں تجھے اس سے

وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ﴿١٠﴾

پہلے پیدا کر چکا ہوں حالانکہ تو کچھ بھی نہیں تھا ے۵

نقل کی ہیں (دیکھو وہیری جلد ۲ صلا) اور انہوں نے اسے معجزانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے بھی نہیں کہ ہم تفاسیر کے قصوں کو صحیح سمجھیں۔ مثلاً تفاسیر والے لکھتے ہیں کہ حضرت زکریا نے مریم کے پاس کھانا دیکھا تو انہیں شبہ ہوا کہ کوئی بدمعاش آتا ہے اور وہ اس قسم کی چیزیں پہنچا جاتا ہے چنانچہ وہ مریم کو کمرہ میں بند کر دیتے تھے اور پھر سات دروازے آگے پیچھے بند کر دیتے تھے مگر رزق اُنکے پاس پھر بھی آجاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے مفسرین کو سات دروازوں سے کوئی خاص دلچسپی ہے کیونکہ یوسفؑ کے واقعہ میں بھی وہ لکھتے ہیں کہ زلیخا نے سات دروازے بند کرکے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی۔ پس سات دروازوں سے مفسرین کو کوئی خاص لگاؤ ہے۔ مریم کو بھی اگر روٹی آتی تھی تو سات بند دروازوں سے اور زلیخا اگر یوسف کو چھیڑتی تھی تو سات دروازے بند کر کے۔ قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ حضرت زکریا نے اُن کے پاس کھانے پینے کی

۲ عِتِيًّا

چیزیں دیکھیں تو انہوں نے پوچھا کہ یہ چیزیں تمہیں کس نے دی ہیں۔ حضرت مریم نے جواب دیا کہ اللہ نے۔ ایک معصوم بچی کے یہ الفاظ اُن کے لئے دعا کا محرک بن گئے اور انہوں نے کہا کہ خدایا مجھے بھی ایک بچہ عطا فرما جو اپنے اندر روحانی اوصاف اور کمال رکھتا ہو۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہودی روایتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ میور اور آرنلڈ نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

ے۵ حل لغات:۔ عِتِيًّا عَتَی سے بنا ہے اور عَتَا کے معنے حد سے نکل جانے کے ہیں عَاتٍ اسم فاعل ہے۔ عِتِيًّا بھی عَاتٍ کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ آیت مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا میں عِتِيًّا سے مراد بڑھاپے کی اُس حالت کے ہیں جس کا کوئی مداوا اور علاج نہیں ہو سکتا۔

تفسیر:۔ حضرت زکریا کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی کہ اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا

تو انہوں نے کہا اے میرے رب اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ میرے ہاں کس طرح بیٹا پیدا ہوگا۔ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔

غلام ہونے میں دو باتیں پائی جاتی تھیں۔ اوّل یہ کہ بیٹا ہو اور دوسرے یہ کہ کہولت کی عمر تک پہنچنے والا ہو۔ اور پھر جب کسی شخص کو بیٹے کی بشارت دیجاتی ہے تو اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ تم بھی اس کی زندگی کا اچھا حال دیکھو گے۔ حضرت زکریا اتنے عظیم الشان انعام کے وعدہ پر استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اوّل تو میں بوڑھا اور میری بیوی بانجھ اور پھر میں حد درجہ کا بوڑھا لیکن مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہوگا اور اس کی پیدائش کے بعد بھی کچھ عرصہ بعد تک میں زندہ رہوں گا اور اس کی تربیت کر سکوں گا۔ گویا یہ ذوالعجائب الہام ہے۔ قَالَ کَذٰلِکَ اس نے کہا اسی طرح ہوگا قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ۔ تیرا رب کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر آسان ہے۔

ہمارے مفسرین نے اِس جگہ عیسائیوں سے ڈر کر یہ لکھا ہے کہ قَالَ کَذٰلِکَ میں فرشتہ کے قول کا ذکر ہے اور قَالَ رَبُّکَ میں اللہ تعالیٰ کی بات بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں کثرت سے ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ حاضر کا صیغہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے مگر وہ غائب میں بدل جاتا ہے اور غائب کا صیغہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے اور پھر وہ حاضر میں بدل جاتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ قَالَ کَذٰلِکَ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ فرشتہ کا قول ہے اور اگلے حصہ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرشتہ اگر کچھ کہتا ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوتا ہے کیونکہ فرشتہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا کلام دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ پس اس امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر فرشتہ نے یہ کہا تھا کہ اسی طرح واقعہ ہوگا تب بھی اس نے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی کہا تھا اپنی طرف سے نہیں کہا۔ پس یہ بات بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوگی۔ درحقیقت قَالَ کَذٰلِکَ اور قَالَ رَبُّکَ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ دونوں باتوں کو تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھو جہاں فرشتہ کلام کرتا ہے وہاں یہ سمجھو کہ اس کلام کا منبع خدا تھا۔ اور جہاں خود کلام کرے وہاں یہ سمجھو کہ اب اس نے براہِ راست کلام کیا ہے۔

وَقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا۔ اور اس سے پہلے میں نے تجھے پیدا کیا تھا اور تُو کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہاں جسمانی پیدائش مراد نہیں۔ کیونکہ جسمانی پیدائش زکریا سے خاص طور پر تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اگر پیدائش جسمانی کا ذکر ہوتا تو خَلَقْتُکَ کی بجائے یہ کہنا چاہیئے تھا۔ کہ ساری دنیا کو میں نے پیدا کیا ہے حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر یہاں حضرت زکریا کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جسمانی پیدائش کا ذکر نہیں بلکہ درحقیقت اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا میں ذکر آتا ہے کہ ہم تجھے ایک غیر معمولی بیٹا عطا فرمائیں گے جو بعض باتوں میں بے مثل ہوگا۔ اوّل بیٹا ہونا اور پھر بعد تک زندہ رہنے والا بیٹا ہونا اور پھر غیر معمولی شان کا بیٹا ہونا یہ ساری باتیں اپنے اندر حیرت انگیز رنگ رکھتی تھیں۔ قَالَ کَذٰلِکَ

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ

(زکریا نے) کہا اے میرے رب! میرے لئے کوئی حکم بخش۔ فرمایا تیرے لئے یہ حکم ہے کہ تو لوگوں سے

النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑪

تین راتیں متواتر کلام نہیں کرے گا (یعنی کلام نہ کرنا) ۵۸

قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ میں اللہ تعالیٰ نے پہلی دو باتوں کا جواب دے دیا تھا۔ اب تیسری بات کا جواب دیتا ہے کہ تمہاری بھی پہلے کوئی حیثیت نہیں تھی مگر پھر ہم نے تمہیں علوم بخش دئے۔ اسی طرح ہم میں یہ بھی طاقت ہے کہ ہم تیرے بیٹے کو بھی علوم عطا فرما دیں۔

۵۸ تفسیر:۔ آیت کے معنے قرآن کریم میں کئی مقامات پر حکم کے بھی آئے ہیں۔ آیات قرآنیہ کو بھی اسی وجہ سے آیات کہا جاتا ہے کہ ان میں احکامِ الٰہیہ کا بیان ہوتا ہے۔ پس رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً کے یہ معنے ہیں کہ خدایا مجھے کوئی حکم دے جس کی میں تعمیل کروں۔ یعنی تو نے جو مجھ پر یہ احسان فرمایا ہے میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو مجھے کوئی ایسا حکم دے جو تیرے شکر کی ایک ظاہری علامت ہو اور جس کو پورا کرکے میرا دل خوش ہو جائے کہ میں نے رب کا حکم پورا کر دیا ہے۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں آئندہ کی خبروں کے لئے نشان مقرر ہوتے تھے جن میں سے بعض نشان تو آسمانی ہوتے تھے اور بعض میں صرف عبادت کا حکم ملتا تھا۔ چنانچہ پیدائش باب ۹ میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے حضرت نوح اور انکی اولاد سے آئندہ سب دنیا پر طوفان نہ لانے کا عہد کیا اور اس کے لئے قوس قزح کو نشان مقرر کیا۔ بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"خدا نے نوح اور اس کے بیٹوں سے کہا دیکھو میں خود تم سے اور تمہارے بعد تمہاری نسل سے اور سب جانداروں سے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا پرندے کیا چوپائے۔ کیا زمین کے جانور یعنی زمین کے ان سب جانوروں کے بارے میں جو کشتی سے اترے عہد کرتا ہوں۔ میں اس عہد کو تمہارے ساتھ قائم رکھوں گا کہ سب جاندار طوفان کے پانی سے پھر ہلاک نہ ہونگے اور نہ کبھی زمین کو تباہ کرنے کے لئے پھر طوفان آئے گا۔ اور خدا نے کہا کہ جو عہد میں اپنے اور تمہارے درمیان اور سب جانداروں کے درمیان جو تمہارے ساتھ ہیں پشت در پشت ہمیشہ کے لئے کرتا ہوں اُس کا نشان یہ ہے کہ میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں۔ وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہوگی اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤنگا تو میری کمان بادل میں دکھائی دیگی اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے یاد کرونگا اور تمام جانداروں کی ہلاکت کے لئے پانی کا

طوفان پھر نہ ہوگا اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کروں گا تاکہ اُس ابدی عہد کو یاد کروں جو خدا کے اور زمین کے سب طرح کے جاندار کے درمیان ہے۔ پس خدا نے نوح سے کہا کہ یہ اس عہد کا نشان ہے جو میں اپنے اور زمین کے کل جانداروں کے درمیان قائم کرتا ہوں"
(پیدائش باب ۹ آیت ۹ تا ۱۷)

یہ روایت گو بگڑی ہوئی ہو مگر بہرحال اِس سے یہود کی روایات اور اُن کے دستور کا علم ہو جاتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ جب کوئی عہد کرتا تھا تو اس کے پورا ہونے کا وہ کوئی ظاہری نشان بھی مقرر کر دیتا تھا۔ اِسی طرح بعض دفعہ ایسا نشان مقرر کیا جاتا تھا جس کا کرنا خود بندے کے اختیار میں ہو۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۷ آیت ۹ تا ۱۱ میں لکھا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ

"تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اُس **عہد کا نشان ہوگا** جو میرے اور تمہارے درمیان ہے"

اسی طرح حزقی ایل باب ۲۰ میں سبت کو ایک نشان قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"میرے سبتوں کو مقدس جانو کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان نشان ہوں تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں"

اِن حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی نیک کام کا کرنا پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے لئے ایک ظاہری نشان سمجھا جاتا تھا۔ اِسی رنگ میں حضرت زکریاؑ نے بھی خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی مجھے کوئی نشان دیا جائے یعنی مجھے کوئی ایسا حکم دیا جائے کہ جب میں اُسے پورا کر دوں تو یہ وعدہ اٹل ہو جائے کیونکہ جب بندہ اپنا وعدہ پورا کر دے تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرتا ہے اور اُس کو کسی اَور رنگ میں نہیں بدلتا۔

قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تیرے لئے وہ حکم جو اِس بات کی علامت ہوگا کہ تُو نے خدا کا شکر ادا کر دیا ہے یہ ہے کہ تُو لوگوں سے تین راتیں کلام نہیں کرے گا **اِس حالت میں کہ تو تندرست اور بے عیب ہوگا اور بغیر کسی بیماری کے ہوگا**۔ اور اُن دنوں میں ذکر الٰہی کرتا رہے گا۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ ثَلٰثَ لَیَالٍ بلکہ فرمایا ہے اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ **تُو لوگوں سے کلام نہیں کرے گا**۔ اِس میں حکمت یہ ہے کہ انسانِ کامل صرف انسانوں سے ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے بھی باتیں کیا کرتا ہے چنانچہ دیکھ لو۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے کتنی لمبی باتیں کی ہیں کہ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى
اس کے بعد (زکریا) محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس گئے اور انہیں

اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۲﴾
آہستہ آواز میں کہا کہ صبح اور شام خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتے رہو ۵۹

یہ تمام باتیں کسی آدمی سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے کی گئی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے بعض دفعہ فرشتوں سے بھی ہمکلام ہوتے ہیں پس النَّاس کے لفظ نے اُس کلام کا استثناء کر دیا جو خدا اور اُس کے ملائکہ سے کی جاتی ہے اور اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ صرف ایک روزہ تھا جس میں انہیں خاموشی کے ساتھ ذکر الٰہی کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ نہیں کہ اُن کی زبان ماری گئی تھی۔ اگر زبان ماری جاتی تو لَا تُكَلِّمُ کہنا چاہیئے تھا مگر کہا یہ گیا ہے کہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ تو اِن تین راتوں میں لوگوں سے کلام نہیں کرے گا یعنی اِن تین راتوں میں لوگوں سے کلام نہ کیجیو۔ گویا تُو خدا کے لئے اپنے اُوپر یہ واجب کرلے گا کہ میں نے تین رات دن لوگوں سے گفتگو نہیں کرنی حالانکہ تو تندرست ہوگا اور تجھ میں طاقت ہوگی کہ تُو باتیں کرے۔

یہاں خدا تعالیٰ کے ایک وعدے کو اس کے ایک حکم کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر بندہ وہ حکم پورا کر دے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسے دیا گیا ہے تو وہ وعدہ کسی صورت میں بھی ٹل نہ سکے اور وہ بہرحال پورا ہو جائے۔

اسی طرح ثَلٰثَ لَيَالٍ سے صرف تین راتیں مراد نہیں بلکہ دن بھی ساتھ ہی مراد ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (اعراف ع ۱۷) ہم نے موسیٰؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا حالانکہ وہاں دن بھی مراد ہیں۔ پس یہاں بھی تین راتوں سے تین رات دن مراد ہیں نہ کہ صرف تین راتیں۔

۵۹ حل لغات:۔ مِحْرَابٌ کے معنے چوبارہ کے بھی ہوتے ہیں اور محراب کے معنے گھر کے اچھے حصے کے بھی ہوتے ہیں۔ مسجد کے محراب کو اسی لئے محراب کہتے ہیں کہ وہاں امام کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ معزز ہوتا ہے اور محراب اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں بادشاہ علیحدگی میں مسائل پر غور کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں اور عوام کو وہاں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور قلعہ کو بھی محراب کہتے ہیں اور کبھی کبھار کو بھی محراب کہتے ہیں۔ (اقرب)

اَوْحٰۤى اِلَيْهِ اِيْحَاءً کے معنے ہوتے ہیں۔ بَعَثَهٗ اُس کو مبعوث کیا۔ اسی طرح اَوْحٰى بِكَذَا کے معنے ہوتے ہیں اَلْهَمَهٗ بِهٖ۔ اس کو کسی بات کی خبر دی۔ اور اساس میں لکھا ہے کہ وَحَيْتُ اِلَيْهِ وَ اَوْحَيْتُ اِذَا كَلَّمْتَهٗ بِمَا تُخْفِيْهِ مِنْ غَيْرِهٖ یعنی وَحَيْتُ اِلَيْهِ اور اَوْحَيْتُ کے معنے ہوتے ہیں ایسی طرز پر بات کرنا کہ دوسرے اس کو نہ سنیں۔ اور مصباح میں ہے کہ بَعْضُ الْعَرَبِ يَقُوْلُ وَحَيْتُ اِلَيْهِ وَ وَحَيْتُ لَهٗ وَ اَوْحَيْتُ اِلَيْهِ وَ لَهٗ یعنی بعض اہل عرب کے نزدیک

محراب

اَوْحٰى اِلَيْهِ

وَحَيْتُ اِلَيْهِ اور وَحَيْتُ لَهٗ بھی استعمال
ہوتا ہے اور اَوْحَيْتُ اِلَيْهِ اور اَوْحَيْتُ لَهٗ
بھی استعمال ہوتا ہے۔ معنے سب کے ایک ہی ہیں پس
اَوْحٰی کے معنے صرف اشارہ کرنے کے نہیں بلکہ اس
سے مراد کسی سے ایسے رنگ میں بات کرنا ہے کہ دوسرے
لوگ نہ سنیں۔

بُکْرَۃً صبح سے دوپہر تک کو کہتے ہیں۔ اور
عَشِیًّا دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں بعض لغت دان
کہتے ہیں کہ مغرب سے عشاء تک کے وقت کے لئے
عَشِیٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے (اقرب)

تفسیر: حضرت زکریاؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف
سے جب تین رات دن خاموش رہ کر ذکر الٰہی کرنے کی
ہدایت ہوئی تو انہوں نے نیت کر لی کہ میں اب کوئی
بات نہیں کروں گا اور خدا کے ذکر میں مشغول رہونگا۔
چنانچہ وہ اپنے کمرہ میں سے یا مسجد کے اس حصہ میں
سے جہاں امام کھڑا ہوتا ہے باہر آتے اور انہوں نے
ایسے رنگ میں بات کی کہ غیر لوگ اس کو نہ سنیں گویا
نہایت آہستگی سے اپنے دوستوں کے پاس کھڑے
ہو کر بات کی تا کہ غیر لوگ نہ سنیں۔ اس سے بھی
معلوم ہوا کہ ان کے گونگے ہونے کا کوئی سوال نہیں
تھا صرف ایسے رنگ میں بات کرنا مراد تھا کہ دوسروں
کو سنائی نہ دے۔

سورۂ آل عمران میں اَوْحٰی اِلَیْھِمْ کی بجائے
رَمْزًا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ
اِلَّا رَمْزًا (ع۴) رَمْزًا کے معنے چونکہ عام طور پر اشارہ
کے ہوتے ہیں اس لئے انجیل سے متاثر ہو کر ہمارے
مفسرین نے بھی اس کے معنے اشارہ کے کر لئے ہیں
حالانکہ لغت والے لکھتے ہیں کہ اس کے معنے ہونٹوں کو
یا آنکھوں سے یا بھووں سے اشارہ کرنے کے ہیں۔
اور ظاہر ہے کہ ہونٹوں سے انسان اشارہ نہیں کیا
کرتا صرف آہستگی سے گفتگو کیا کرتا ہے پس ہونٹوں
کے اشارہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ صوت نہ نکلے جیسے
کسی کا گلا خراب ہو تو کہا جاتا ہے کہ تم اس طرح بولو
کہ تمہاری آواز نہ نکلے۔ بلکہ ثعالبی جو لغت کے امام ہیں
وہ تو اپنی کتاب فقہ اللغۃ میں لکھتے ہیں کہ اَلرَّمْزُ
مُخْتَصٌّ بِالشَّفَۃِ۔ رمز کا لفظ ہونٹوں
سے اشارہ کرنے کے لئے مخصوص ہے۔
(اقرب و فقہ اللغۃ فصل فی تفصیل تحریکات
مختلفۃ) یعنی صرف ہونٹ سے بولنا گلا استعمال
نہ کرنا اور یہ معنے اَوْحٰی اِلَیْھِمْ کے بالکل مطابق ہیں
یعنی اونچا بولنا ان کو منع تھا۔ ہونٹوں میں یعنی
آہستہ کلام کر سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی
طرف سے اس کی اجازت تھی۔ چونکہ خدائی
ارشاد پہنچانے کے لئے بعض تو بھی لوگوں
کو بتانا ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے آہستگی
سے کہہ دیا۔ کہ میں خدائی حکم کے ماتحت تین
دن ذکر الٰہی کروں گا تم بھی صبح و شام ذکر الٰہی
کرو۔

بُکْرَۃً چونکہ صبح سے لے کر دوپہر تک
کے وقت کو کہتے ہیں اور عَشِیًّا کا لفظ زوال
سے لے کر رات تک کے وقت پر استعمال
ہوتا ہے۔ اس لئے بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا
سے مراد یہ ہے کہ تم سارا دن عبادت کرو۔
میں بھی یہ ایام عبادت میں بسر کروں گا۔

بُکْرَۃً

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ

(اس کے بعد یحییٰ پیدا ہو گیا اور ہم نے اُسے کہا) اے یحییٰ! تو (الٰہی) کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور ہم نے اُسے چھوٹی عمر میں

صَبِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۴﴾

ہی (اپنے) حکم سے نوازا تھا۔ (اور یہ بات) ہماری طرف سے بطور مہربانی پرورش شفقت کے تھی) اور (اُسے) پاک کرنے کیلئے (تھی) اور وہ بڑا متقی تھا۔

حَنَانًا

حل لغات: حَنَان کے کئی معنے ہیں اس کے معنے رحمت کے بھی ہیں۔ رزق کے بھی ہیں۔ برکت کے بھی ہیں۔ دل کی نرمی کے بھی ہیں۔ ہیبت کے بھی ہیں اور وقار کے بھی ہیں (اقرب) اس جگہ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے اُسے دل کی نرمی بخشی۔

تفسیر: اس آیت سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ تورات اور اُس کے صحیفے اُس وقت تک منسوخ نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر کسی نئی کتاب کے اُترنے کے نہ مسلمان قائل ہیں اور نہ عیسائی۔ پس اَلْكِتٰب سے مراد تورات ہی ہے جس کو مضبوطی سے پکڑنے کا حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حکم ہوا اور پھر آگے مسیح نے بھی یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ گویا اُسی کے دین کی اتباع کا اقرار کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کوئی نئی کتاب نہیں لائے۔ کیونکہ جب ایک ہی زمانہ میں دو نبی ظاہر ہو رہے تھے اور ایک ہی قوم کی طرف آنے والے تھے اور ایک دوسرے کا شاگرد ہونے والا تھا۔ تو کس طرح ممکن تھا کہ ایک تو تورات پر مضبوطی سے قائم ہو اور دوسرا اُس شریعت کو منسوخ کر کے ایک اَور کتاب لے آئے۔ پس یہ الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ موسوی شریعت ابھی جاری رہنے والی تھی۔ اگر وہ مسیح کے ذریعہ منسوخ ہونے والی ہوتی تو اتنی شدت کے ساتھ نہ کہا جاتا کہ خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔ اس کتاب پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرو۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اُس وقت تک بنی اسرائیل کے لئے تورات ہی واجب العمل تھی۔ اگر وہ جلدی ہی منسوخ ہو جانے والی ہوتی تو اس قدر تاکید نہ کی جاتی۔ کہ تم پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر عمل کرو۔ یہ الفاظ دفع الوقتی کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اسی صورت میں استعمال ہو سکتے ہیں جب اس شریعت نے ابھی کچھ عرصہ تک قائم رہنا ہو۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۔ اور ہم نے اُس کو بچپن کی عمر سے ہی حکم دیا تھا۔ صَبِيًّا کے معنے بچپن کی عمر کے بھی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت مراد یہ ہے کہ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنا قرب عطا کر دیا۔ یعنی ابھی لوگ اُن کو بچہ ہی جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن پر کلام نازل ہونے لگ گیا۔ ہماری زبان میں بھی محاورہ ہے کہ فلاں تو ابھی کل کا بچہ ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ابھی تو وہ چھوٹی عمر کا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ دُودھ پیتا بچہ ہے لیکن اس کے علاوہ جوانی کے لئے بھی یہ لفظ بول لیتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے۔ کہ اُس زمانہ میں دو نبی یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام آگے پیچھے آئے اور اُن دونوں کے متعلق صَبِيًّا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ جب اُن کی والدہ نے یہود یوں سے کہا کہ اس سے

بات کرو تو انہوں نے کہا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا ہم ایک بچہ سے کس طرح بات کر سکتے ہیں گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لوگوں نے صبی کہا اور یحییٰ علیہ السلام کو بھی خدا نے صبی قرار دیا۔ اِس میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں کلام کی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ اٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا۔ پھر وہاں تو دشمنوں نے آپکو صبی قرار دیا تھا اور یہاں خدا نے حضرت یحییٰ کو صبی قرار دیا ہے۔ اگر دشمن کے قول کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عظمت دی جا سکتی ہے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق تم اُسی عظمت کے کیوں قائل نہیں جبکہ یحییٰ کو دشمنوں نے نہیں بلکہ خدا نے صبی قرار دیا ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا (آل عمران ع۵) کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں مگر آپ کے متعلق صَبِیّ کا لفظ دشمنوں نے ہی استعمال کیا ہے۔

جس طرح اٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر مسیح کی عظمت کے تم اس وجہ سے قائل ہو کہ وہ بچپن میں ہی اپنے دشمنوں پر بھاری تھا تو وہی عظمت تم یحییٰ کو بھی کیوں نہیں دیتے جبکہ ہم نے اُسے بھی بچپن میں ہی اپنا قرب عطا کر دیا تھا۔ اسی طرح یہاں بھی حضرت مسیح کی تعلیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیوں کا بڑا زور اس امر پر ہے کہ حضرت مسیح نرمی اور حلم اور عفو اور بُردباری کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں فرما دیا کہ یحییٰ بھی دل کا بڑا حلیم اور بُردبار اور نرم مزاج تھا۔ اگر نرمی اور حلم کی فضیلت کا باعث ہیں تو یہ فضیلت حضرت یحییٰ کو بھی حاصل ہے

غرض جتنی باتیں حضرت مسیح کی افضلیت کے متعلق پیش کی جاتی ہیں اُن سب کی اللہ تعالیٰ نے اس جگہ تردید کر دی ہے۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح دل کے بڑے حلیم تھے اور اُن کی طبیعت میں رأفت اور محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یحییٰ بھی دل کا بڑا حلیم تھا اور اُس کی طبیعت میں بھی رأفت اور محبت ڈالی گئی تھی۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ مسیح ایک نئی شریعت لایا تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یحییٰ کو بھی کہا تھا کہ خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ تو اس کتاب پر مضبوطی سے عمل کر۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح نے بچپن میں کلام کیا اور یہ اُن کی فضیلت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یحییٰ کو بھی بچپن میں اپنا مامور بنا کر لوگوں کی طرف بھیجدیا تھا۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ مسیح گناہوں سے پاک تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یحییٰ بھی گناہوں سے پاک تھا۔ کیونکہ ساتھ ہی فرماتا ہے وَزَکٰوۃً اس میں پاکیزگی اور تقدس بھی پایا جاتا تھا۔

غرض جتنی خصوصیات حضرت مسیح میں بیان کی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کی سب حضرت یحییٰ میں بیان کر دی ہیں اور اس طرح عیسائیوں پر حجت تمام کی ہے کہ اگر ان خصوصیات کی وجہ سے حضرت مسیح کو تم تمام نبیوں پر فضیلت دیتے ہو تو پھر یحییٰ کو بھی تم ایسا ہی کیوں نہیں سمجھتے جبکہ اس میں بھی یہی باتیں پائی جاتی تھیں۔

وَکَانَ تَقِیًّا۔ اور وہ صاحبِ تقویٰ تھا۔

پہلے فرمایا کہ اُس میں زکوٰۃ یعنی پاکیزگی پائی جاتی تھی پھر فرمایا کہ اُس میں تقویٰ پایا جاتا تھا۔ اُردو میں جب ہم معنی الفاظ آجائیں تو انسان سمجھتا ہے کہ ان کے کوئی الگ الگ

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۵﴾

اور وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا اور ظالم اور نافرمان نہیں تھا ۔ ﴿۵﴾

معنے نہیں صرف ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ میں حُسن کلام کے لئے ادا کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہ بات نہیں۔ عربی زبان میں ہر لفظ الگ الگ معنے رکھتا ہے۔ پس کَانَ تَقِیًّا اور مفہوم کا حامل ہے اور زَکٰوۃ کا لفظ اور مفہوم کا حامل ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ عربی زبان میں اندرونی خرابیوں کو دُور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تقویٰ کا لفظ باہر کی آنیوالی خرابیوں کو دور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے اس کو اپنے پاس سے حلم اور نرمی بخشی اور ہم نے اُس کے اندرونی خیالات بھی پاکیزہ بنائے اور جو باہر سے خرابیاں آتی ہیں اُن کے مقابلہ کی بھی اُس کو طاقت بخشی۔

حل لغات:۔ بَرَّ فِی یَمِیْنِہٖ کے معنے ہوتے ہیں صَدَقَ۔ اُس نے اپنی قسم کو پورا کرکے دکھا دیا یعنی اپنی بات کا پکّا اور سچا نکلا۔ اور بَرَّ وَالِدَہٗ کے معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَۃَ اِلَیْہِ وَ رَفَقَ بِہٖ۔ اس نے اپنے والد کی پوری اطاعت کی اور اس کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کیا۔ وَ تَحَرّٰی مَحَابَّہٗ وَ تَوَقّٰی مَکَارِھَہٗ اور جو باتیں اس کو پسند تھیں اُن کو اُس نے اختیار کیا اور جو باتیں اس کو ناپسند تھیں اُن کو اُس نے چھوڑ دیا فَھُوَ بَرٌّ بِہٖ وَ بَارٌّ۔ ایسے شخص کو بَرّ بھی کہتے ہیں اور بارّ بھی کہتے ہیں (اقرب)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے باپ کو خوش کرنے کیلئے ظاہری اور باطنی طور پر وہ تمام اخلاق اپنے اندر پیدا کرے جن کو وہ پسند کرتا ہو اور اُن تمام برائیوں کو ترک کر دے جن کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اُس وقت اُسے بَرّ اور بارّ کہتے ہیں۔ لیکن بَرّ میں بَارّ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

جَبَرَ الْعَظْمَ کے معنے ہوتے ہیں اَصْلَحَہٗ مِنْ کَسْرٍ۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کیا۔ یہ متعدی اور لازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی جَبَرَ الْعَظْمَ کے تو یہ معنے ہوں گے کہ اُس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کیا۔ لیکن جَبَرَ الْعَظْمُ بِنَفْسِہٖ کے معنے ہوں گے صَلُحَ بَعْدَ الْکَسْرِ۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی مگر پھر درست ہوگئی اور جَبَرَ الْفَقِیْرَ کے معنے ہوتے ہیں اَغْنَاہُ اس نے فقیر کو غنی کر دیا۔ اور جَبَرَ فُلَانًا عَلَی الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں اَکْرَھَہٗ۔ اس نے فلاں کو کسی کام پر سختی سے مجبور کیا (اقرب) گویا جہاں اس کے معنے اصلاح کرنے کے ہیں وہاں کسی کی مرضی کے خلاف اُس پر ظلم کرکے جبراً اُس سے کام لینے کے بھی ہیں گویا ایک معنے ایسے ہیں جن میں نیکی اور اصلاح پائی جاتی ہے اور ایک معنے ایسے ہیں جن میں سختی اور ظلم پایا جاتا ہے۔

عَصِیًّا بمعنے عاصی استعمال ہوا ہے یعنی وہ نافرمان نہیں تھا۔

تفسیر:۔ بَرًّا بِوَالِدَیْہِ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اُس کا اپنے ماں باپ سے یہ سلوک تھا کہ وہ اُن کا پورا مطیع اور فرمانبردار تھا۔ وہ اُن تمام اخلاق فاضلہ کو پسند کرتا تھا جن کو وہ پسند کرتے تھے اور اُن تمام بُرائیوں سے بچتا تھا جنکو وہ ناپسند کرتے تھے

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ

اور جب وہ پیدا ہُوا تب بھی اُس پر سلامتی تھی اور جب وہ مرے گا اور جب وہ

يُبْعَثُ حَيًّا ⑯

زندہ کرکے اٹھایا جائیگا (تب بھی اس پر سلامتی ہوگی) ۱۲ھ

ع ۴

وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ اور پھر وہ جبار اور نافرمان بھی نہیں تھا۔

یہ خوبیاں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں یہ بھی اسی لئے بیان کی ہیں کہ عیسائی حضرت مسیح کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ اُس نے کیا ہی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ

"جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے"

(انجیل متی باب ۵ آیت ۳۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یحییٰ بھی جبار نہیں تھا۔ اُس نے جو تعلیم دی اُس میں بھی ظلم کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

اسی طرح عیسائی حضرت مسیح کی یہ بڑی خوبی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا

"جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو"

(انجیل متی باب ۲۲ آیت ۲۱)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یحییٰ بھی عَصِيًّا نہیں تھا۔ اس نے بھی یہی تعلیم دی تھی کہ نافرمانی مت کرو۔ اور قیصر کا حق قیصر کو اور خدا کا حق خدا کو دو۔

غرض وہ ساری خوبیاں جو حضرت مسیح میں بیان کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رنگ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی دی تھیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت یحییٰ حضرت مسیح سے درجہ میں کم تھے لیکن یہاں درجہ اور مقام پر بحث نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا ذکر کر رہا ہے کہ حضرت مسیح میں کوئی نرالی خصوصیت نہیں تھی۔ چونکہ عیسائی حضرت مسیح کو غیر معمولی عظمت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن میں بعض اخلاق مخصوص طور پر پائے جاتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن باتوں کو رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ساری خوبیاں حضرت یحییٰ میں بھی پائی جاتی تھیں۔ اگر ان باتوں کی وجہ سے تم عیسیٰ کو فضیلت دیتے ہو تو یحییٰ کو کیوں فضیلت نہیں دیتے ؟

۱۲ھ تفسیر:۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے کہ جب وہ پیدا ہُوا تب بھی اس پر سلامتی تھی اور جب وہ مریگا تب بھی اس پر سلامتی ہوگی اور جب وہ زندہ کرکے دوبارہ اٹھایا جائے گا تب بھی اس پر سلامتی ہوگی۔ اس سے بعض لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہُوا ہے کہ یہاں سلامتی سے جسمانی سلامتی مراد ہے اور چونکہ یہ سلامتی اُن کی موت کے دن کے لئے بھی مقدر تھی۔ اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام شہید نہیں ہوئے۔ حالانکہ اگر آپ پر سلامتی نازل ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ آپ قتل سے محفوظ رہے تو قیامت کے دن آپ پر سلامتی نازل ہونے کے کیا معنے ہیں۔ کیا قیامت کے دن بھی کوئی دشمن آپ کے قتل کی تدبیر کرے گا کہ اُس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سلامتی آپ کے لاحق حال ہوگی۔ اگر سلامتی کا اس جگہ یہی مفہوم لیا جائے

کہ اس میں دشمنوں کی تدابیر قتل کا رد ہے۔ تو اس کے
معنے یہ بنیں گے کہ جس دن حضرت یحییٰ پیدا ہوئے اُس
دن بھی وہ قتل سے محفوظ رہیں گے۔ جس دن وہ فوت
ہوں گے اُس دن بھی وہ قتل نہیں ہوں گے اور جب
قیامت کے دن وہ دوبارہ زندہ ہوں گے تو اُس دن بھی
قتل نہیں ہوں گے۔ اب بتاؤ کیا قیامت کے دن بھی
وہ قتل ہو سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اُن کے متعلق
یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا پر بھی سلامتی کا وعدہ کرنا پڑا۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ
میں تین مختلف زمانوں کو بیان کیا ہے مگر لوگوں نے
غلطی سے اس کا مفہوم کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔ دراصل
انسانی زندگیاں تین ہوتی ہیں۔ ایک زندگی شروع
ہوتی ہے انسانی پیدائش سے اور ختم ہوتی ہے انسانی
موت پر۔ دوسری زندگی موت سے شروع ہوتی اور
قیامت تک قائم رہتی ہے۔ اس زندگی کو برزخی زندگی
کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد ایک تیسرا زمانہ ہے۔
جسے قرآن کریم نے یوم البعث قرار دیا ہے اور جس دن
کامل طور پر جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل
کر دئے جائیں گے۔ یہ تین ابتدائی نقطے ہیں انسانی
زندگی کے۔ پیدائش ابتدائی نقطہ ہے حیوٰۃ الدنیا
کا۔ موت ابتدائی نقطہ ہے حیاتِ برزخی کا۔ اور
یوم البعث ابتدائی نقطہ ہے حیاتِ اُخروی کا۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے
تینوں نقطہ ہائے حیات میں سلامتی ہی سلامتی ہے
اس کی پیدائش پر بھی ہماری طرف سے سلامتی نازل
ہوگی اور وہ زندگی بھر اس سے متمتع ہوتا رہے گا۔ پھر
جب وہ وفات پائے گا تب بھی اس پر سلامتی نازل ہوگی
اور وہ عالم برزخ میں بھی سلامتی سے حصہ پائیگا اور
اس کے بعد جب یوم البعث آئے گا تو اُس دن بھی
اس پر سلامتی نازل ہوگی اور وہ اُخروی حیات میں بھی
اللہ تعالیٰ کے فضل کے ماتحت رہیگا۔

غرض اس آیت میں قتل کا کوئی ذکر ہی نہیں۔
اس میں تین زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا
ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اِن تینوں زندگیوں میں
اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے مورد ہوں گے مگر یہ سلام
صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام
کے لئے نہیں آیا بلکہ سب مومنوں کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ
سورہ انعام ع۶ میں آتا ہے وَإِذَا جَآءَكَ الَّذِينَ
يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ
رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔ یعنی جب
تیرے پاس ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے لوگ آئیں
تو اُن کو ہمارا یہ پیغام دے دینا کہ تم پر سلام ہو تمہارے
رب نے تمہارے لئے اپنے آپ پر رحمت واجب کرلی
ہے۔ یہ سلام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ
اُن میں سے کئی شہید ہوئے۔ پھر سب مومنوں کی نسبت آتا
ہے اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ (نحل ع۴) یعنی جن لوگوں کی روح فرشتے
اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں فرشتے
انہیں کہتے چلے جاتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو۔ جاؤ اپنے
اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اب یہ تو ظاہر
ہے کہ فرشتے مومنوں کی جان کئی طرح نکالتے ہیں بعض
کی شہادت کے ذریعہ سے نکالتے ہیں۔ تو کیا اگر سلامتی
کے معنے دشمنوں کے ہاتھوں سے نہ مارے جانے کے ہیں تو
یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ دشمن اُن کو قتل بھی کر رہا ہوگا
اور فرشتے ساتھ ساتھ سلام بھی کرتے جا رہے ہونگے۔
گویا جو بات ہو رہی ہوگی اس کی تردید کر رہے ہونگے۔
اسی طرح سورہ طٰہٰ میں آتا ہے اَلسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى

جو بھی ہدایت کے تابع چلے اُس پر سلامتی ہے۔ اگر سلام کے معنے دشمنوں کے قتل سے محفوظ رہنے کے لئے جائیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کبھی کوئی مومن قتل نہیں ہوتا پھر سورۂ مائدہ ع۳ میں مومنوں کی نسبت فرماتا ہے يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ یعنی قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اُن کو جو خدا تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتے ہیں سلام کے راستے دکھاتا ہے۔ اب اگر سلام کے معنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل نہ ہونے کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو ایسی زندگی بخشتا ہے کہ وہ کبھی دشمن کے ہاتھ سے قتل نہیں ہوتے جو بالبداہت غلط ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سلام ایک وسیع معنوں کا حامل لفظ ہے بعض موقعوں پر یقیناً اس کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ دشمن کے کسی حملہ سے بچائے گا۔ لیکن بعض جگہ بیماری سے بچانے کے اور بعض جگہ ناکامی سے بچانے کے معنے ہوں گے۔ بہرحال بغیر کسی زبردست قرینہ کے ایک عام لفظ کے کوئی خاص معنے کرنے اور وہ بھی ایسے جو تاریخی واقعات کے سراسر خلاف ہوں کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتے۔ پس یہاں سلامتی سے جسمانی سلامتی مراد نہیں بلکہ روحانی سلامتی مراد ہے۔ اگر جسمانی سلامتی مراد ہو تو موت کے دن بھی اس پر سلامتی ہونیکے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انسان جب بھی مرتا ہے کسی بیماری یا حادثہ سے مرتا ہے اور جب وہ کسی بیماری یا حادثہ سے ہلاک ہوگا تو اس کے لئے سلامتی کہاں ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جسمانی سلامتی مراد نہیں بلکہ روحانی سلامتی مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جس دن وہ پیدا ہوگا اُس دن بھی اُس پر سلامتی ہوگی اور وہ تمام دماغی اور جذباتی کمزوریوں سے محفوظ ہوگا اور جس دن وہ مریگا اُس دن بھی اُس پر سلامتی ہوگی یعنی وہ تمام روحانی امراض سے پاک ہوگا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کرکے اُٹھایا جائیگا اُس دن بھی اُس پر سلامتی ہوگی۔

یہ آیت بھی حضرت مسیح کی ایک خصوصیت کو رد کرنے کے لئے بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ سوائے حضرت عیسیٰؑ اور اُس کی والدہ کے دنیا میں کوئی شخص مسِ شیطان سے پاک نہیں۔ یہ بات عیسائیوں نے نہیں کہی بلکہ مسلمانوں نے مسیحیوں پر احسان کرکے اُن کے لئے پیدا کی ہے۔ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب خود مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دینا ہے کہ مسیح مسِ شیطان سے پاک تھا اور یہ اُس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں وہ منفرد ہے۔ اس کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کی نسبت فرما دیا کہ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ۔ یوحنا بھی اپنی پیدائش کے دن خدا تعالیٰ کی سلامتی کے نیچے تھا۔ اگر پیدائش کے وقت شیطان ہر شخص کو چھیڑتا ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کیا ہی برکت والا وہ دن تھا جس دن یحییٰ پیدا ہوا اور شیطان نے اُسے چھیڑا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر شیطان ہر انسان کو اس کی پیدائش پر چھیڑتا ہے تو یحییٰ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بڑی برکتوں والا اور سلامتی کا دن تھا جس دن یحییٰ پیدا ہوا۔ ہاں اگر شیطان نے اُسے نہیں چھیڑا تب بے شک کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی ہی برکتوں والا دن تھا جب یحییٰ پیدا ہوا۔ اور شیطان نے اُسے نہیں چھیڑا۔ پس حضرت یحییٰ علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے وہ ساری خوبیاں بیان کر دی ہیں۔ جو عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح میں پائی جاتی تھیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں جو اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور کمالات پائے جاتے تھے مسلمانوں نے اُن کو عیسائیوں کے سامنے پیش کرنا تھا اور عیسائیوں نے

وقف لازم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۷﴾

اور تُو (اس) کتاب میں مریم کا (جو) ذکر (آتا ہے اُسے) بیان کر (خصوصاً اس بات کو کہ) جب وہ اپنے رشتہ داروں سے مشرقی (جانب ایک) جگہ چلی گئی ۔ ۵۱۳

اُن کا انکار کرتے ہوئے یہ کہتا تھا کہ ساری خوبیاں تو مسیح میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ اس طرف پھیری کہ تم انجیل میں یوحنا کے حالات دیکھو تو تمہیں وہ ساری خوبیاں بلکہ اُن سے بھی بڑھ کر یوحنا میں دکھائی دیں گی جو مسیح میں بیان کی جاتی ہیں۔ میں نے بتایا ہے کہ یوحنا کے متعلق اناجیل میں یہاں تک لکھا ہے کہ

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اُن میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی نبی بڑا نہیں۔"

(انجیل لوقا باب ۷ آیت ۲۸)

اِسی طرح یوحنا کے متعلق سابق انبیاء کی پیشگوئیاں بھی پائی جاتی ہیں پس مسیح کو کوئی خاص خصوصیت حاصل نہیں جس کی وجہ سے اُسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جا سکے۔ باقی یہ کہ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اس سے ہم بھی انکار نہیں کرتے۔ لیکن یہ کہ وہ کوئی نرالی خصوصیات رکھتا تھا یہ ایک ایسی بات ہے جو اناجیل کے رُو سے بالکل باطل ہے بلکہ یوحنا کے متعلق تو یہ بھی لکھا ہے کہ

"وہ خدا کے حضور میں بزرگ ہوگا اور نہ ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا۔"

(انجیل لوقا باب ۱ آیت ۱۵)

اور مسیح انجیل کے رُو سے نہ صرف خود شراب پیتا تھا بلکہ شراب بنانے کا معجزہ بھی اُس نے دکھایا تھا (انجیل یوحنا باب ۲) اسی طرح مسیح اگر روزہ رکھتا اور عبادتیں کرتا تھا تو یہ باتیں یوحنا میں بھی پائی جاتی تھیں۔ غرض خدا تعالیٰ نے اس سورۃ میں مسلمانوں کو یہ گُر بتایا ہے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں تم یحیٰی کے حالات کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جتنی باتیں مسیح کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ ساری کی ساری یوحنا میں بھی پائی جاتی ہیں اور جب یہ حالت ہے تو مسیح کی اس میں خصوصیت کیا رہی۔

پس یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ سے آخر رکوع تک مسیحیت کے ردّ کے دلائل بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان کرو گے تو عیسائی مانیں گے نہیں۔ ہم تمہیں گُر بتاتے ہیں کہ انجیل میں یوحنا کا ذکر پڑھو۔ وہاں تمہیں وہی باتیں ملیں گی جو عیسائی حضرت مسیح میں بیان کرتے ہیں۔ پس تم اُنہیں بتاؤ کہ مسیح میں کوئی نرالی خصوصیت نہیں جس کی وجہ سے اُسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جا سکے۔

۵۱۳ حل لغات:- اِنْتَبَذَ کے معنے ہوتے ہیں اِعْتَزَلَ وَ تَنَحّٰی نَاحِیَۃً۔ وہ الگ ہوگیا۔ اور ایک طرف چلا گیا۔ (اقرب)

شَرْقِیٌّ کے متعلق لغت میں لکھا ہے اَلشَّرْقِیُّ الْمَنْسُوْبُ اِلَی الشَّرْقِ وَ کُلُّ مَکَانٍ فِیْ جِھَۃِ الشَّرْقِ وَ کُلُّ مَا اتَّجَہَ نَحْوَ الشَّرْقِ۔ یعنی شَرْقِیٌّ کے معنے مشرق کی طرف کے بھی ہوتے ہیں

اِنْتَبَذَ

شَرْقِیٌّ

اور مشرقی ہر ایسے مکان کو بھی کہتے ہیں جس کا منہ مشرق کی طرف ہو (اقرب)

تفسیر:- وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ کے یہ معنے ہیں کہ تو کتاب میں مریم کا ذکر کر یا کتاب میں مریم کا جو ذکر ہے اس کو اپنے ذہن میں لا۔

اَلْکِتٰب سے مراد اگر قرآن کریم لیا جائے تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ اس قرآن کے ذریعہ تو مریم کا ذکر بیان کر۔ لیکن اَلْکِتٰب سے مراد بائبل بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ بائبل میں مریم کا جو ذکر آتا ہے اس کو بیان کر یا اُسے اپنے ذہن میں لا۔ یہ ظاہر ہے کہ بائبل میں بہت کچھ غلط واقعات اپنی طرف سے شامل کر دیئے گئے ہیں پس وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ کے یہ معنے ہوں گے کہ بائبل میں مریم کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں اُن کو بھی دیکھو۔ اور پھر قرآن کریم میں جو حالات بیان ہوئے ہیں اُن کو پڑھو۔ اور دونوں کا مقابلہ کر کے اندازہ لگاؤ کہ مریم کے حالات کس کتاب نے زیادہ عمدگی کے ساتھ اُن کی شان کے مطابق پیش کئے ہیں۔

اس سورۃ میں خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا۔ کیونکہ پیشگوئیوں کے مطابق یحییٰ کی پیدائش مسیح کے لئے بطور ارہاص تھی اور مسیحؑ دنیا میں اُس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ اُن سے پہلے ایلیاہ کا بروز ظاہر نہ ہو جاتا۔ اب خدا تعالیٰ یحییٰ کے ذکر کے بعد مریم کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح یحییٰ کا وجود مسیحؑ سے پہلے ضروری تھا اور یحییٰ کا آنا ایک نشان کے طور پر تھا اسی طرح مسیح کی بن باپ ولادت بھی یہود کے لئے ایک عظیم الشان نشان تھی۔ کیونکہ اس ذریعہ سے یہود کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اب بنی اسرائیل میں سے نبوت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس نعمت کو اُن کے دوسرے بھائیوں کی طرف منتقل کر دیگا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم نے بیسیوں دفعہ سنا ہے کہ مسیح کی بن باپ ولادت نبوت کا کانٹا پھیرنے اور یہود کو یہ بتانے کے لئے تھی۔ کہ بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ نے اب اپنا منہ موڑ لیا ہے اور وہ اُن کی بداعمالیوں کی سزا میں اب نبوت کا سلسلہ ایک دوسری قوم میں منتقل کرنے والا ہے۔ چونکہ سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے چلتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے مسیح کو بن باپ پیدا کیا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اب یہود میں کوئی مرد ایسا نہیں رہا جس کی اولاد میں سے کسی کو نبی بنایا جا سکے۔ چنانچہ اب ہم جس کو نبی بنا رہے ہیں بغیر باپ کے بنا رہے ہیں صرف اس کی ماں اسرائیلی ہے مگر آنے والے نبی میں اتنا حصہ بھی نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اسرائیل سے اپنے تعلقات کلّی طور پر منقطع کر لیگا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں بھی اس مسئلہ کا بار بار ذکر فرمایا ہے چنانچہ مواہب الرحمٰن وغیرہ میں یہ مضمون پایا جاتا ہے۔ اور درجنوں دفعہ ہم نے آپ کی زبان سے بھی یہ بات سُنی ہے کہ حضرت مریم بھی ایک علامت تھیں اس خدائی انتباہ کی کہ نبوت اب بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہونے والی ہے اور موسیٰؑ کی اُس پیشگوئی کا ظہور بالکل قریب ہے جس میں اُس نے بتایا تھا کہ

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں (یعنی بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کریگا" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵)

پس چونکہ مریم بھی ایک خدائی نشان تھیں اس لئے ہمیں پوری طرح تحقیق کرنی چاہیئے کہ بائبل اور قرآن نے

اُن کا وجود کس شکل میں پیش کیا ہے۔

عربی زبان میں حضرت مسیح کی والدہ کے لئے مریم کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن عبرانی زبان میں اس کا تلفظ کئی رنگ میں آتا ہے۔ چنانچہ ماریہ۔ مریم۔ مریوم۔ یہ تین تلفظ ہیں جن میں اس لفظ کو ادا کیا جاتا ہے۔ انجیل میں جہاں حضرت مسیح کی والدہ کا ذکر آتا ہے وہاں تو مریم کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے مگر جہاں دوسری عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اُن کا نام کبھی مریم آتا ہے اور کبھی ماریہ۔ غرض مریم۔ ماریہ اور مریوم یہ مختلف تلفظ ہیں جو اُس زمانہ کے لوگوں میں رائج تھے۔ مگر غالباً حضرت مسیح کی عظمت کی وجہ سے اُن کی والدہ کیلئے صرف ایک ہی نام رکھا گیا تھا یعنی مریم۔

سب سے پہلے بائبل میں یہ نام تورات کے صحیفہ میں آیا ہے اور اُس میں حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ کا یہ نام بتایا گیا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہی وہ بہن تھی جو موسیٰ کے دریا میں پھینکنے کے بعد اُن کے پیچھے پیچھے گئی جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر آتا ہے مگر اس کے نام کا تلفظ بائبل میں مِریَم آتا ہے یعنی میم کی زیر سے۔ اس کے بعد یہ نام دوسری دفعہ نئے عہدنامہ میں آتا ہے اور اُس جگہ اس کا تلفظ مَریم میم کی زبر سے آتا ہے

اس لفظ کے معنوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے اس کے معنے تلخ سمندر کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے سمندر کا ستارہ کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ مریم کے معنے "دن کی ملکہ" کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے "ماسٹر کی مہر" کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنے سمندر کے استاد کے لئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مریم کے معنے سمندر کی مر (MYRRH) کے ہیں۔ مر ایک قسم کی گوند ہوتی ہے جو دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔

درحقیقت جن لوگوں نے عبرانی زبان کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ مریم کے جو مختلف معنے کئے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مشابہ بعض اور الفاظ عربی اور ایرانی اور دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں لوگوں نے ان زبانوں کے ملتے ہوئے الفاظ سے یہ معنے اخذ کرلئے اور اس طرح اختلاف پیدا ہوگیا۔ مثلاً "سمندر کے مر" کے جو معنے کئے گئے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ کی بہن کا نام تورات میں مریم آتا ہے اور مر عربی زبان میں ایک گوند کا نام ہے اور یَم سمندر کو کہتے ہیں۔ پس انہوں نے دوسری زبانوں کے مشابہ الفاظ کو دیکھ کر مریم کا یہ ترجمہ کرلیا کہ "سمندر کا مر" اسی طرح بعض معنے ایرانی اور دوسری زبانوں کے ملتے ہوتے الفاظ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے HEBREW زبان کی پوری تحقیق کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے معنے یا تو سینہ زور کے ہیں یا موٹی کے ہیں۔ گویا اس کے ایک معنے خودسر کے اور ایک موٹاپے کے کئے جاتے ہیں۔ خودسر کا مفہوم بھی موٹاپے کی طرف ہی جاتا ہے کیونکہ جو مضبوط بچہ ہوتا ہے وہی اکڑتا اور مقابلہ کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عام طور پر جو بچے مشکل سے پیدا ہوتے تھے اور وزنی ہوتے تھے اُن کا نام مریم رکھا جاتا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں ہر ملک کی خوبصورتی کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ سامی نسلوں میں یعنی یہودیوں اور عربوں میں موٹاپا خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بانت سعاد میں شاعر اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

هَيْفَاءُ مُقْبِلَةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً

یعنی جب وہ سامنے سے آرہی ہو تو پتلی کمر والی دکھائی دیتی ہے اور جب وہ واپس جارہی ہو تو موٹی دکھائی دیتی ہے۔

تو چونکہ موٹاپا اُن میں خوبصورتی کا معیار تھا اس لئے جو
لڑکی خوبصورت ہوتی تھی اور موٹی بھی ہوتی تھی اُس کا نام
مریم رکھ دیا جاتا تھا۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ صرف
خوبصورتی کی وجہ سے یہ نام رکھا جاتا تھا۔ موٹاپے کو
خاص طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ معنے غالباً انہوں
نے اس لئے کرتے ہیں کہ حضرت مریم کی عیسائیوں میں جو
تصویریں پائی جاتی ہیں اُن میں وہ زیادہ موٹی نظر نہیں آتیں
انجیل میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مریم اور ماریہ
کے نام تبدیل ہوتے رہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی
جگہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح کی والدہ کیلئے ہمیشہ
مریم کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُس زمانہ
میں یہ نام بہت معروف تھا کیونکہ انجیل میں کئی عورتوں کا
یہ نام مذکور ہے۔

مریم کی زندگی کے حالات

انجیل قبل از ولادت مسیح مریم
کے حالات کے بارہ میں
بالکل خاموش ہے۔ متی باب ۱ آیت ۱۸ سے صرف اتنا معلوم
ہوتا ہے کہ مریم کنواری حاملہ ہوئی تو یوسف جس سے اُس کی
منگنی ہوئی تھی اُس نے اُسے چھوڑنا چاہا مگر فرشتہ نے
اُسے منع کیا اور اسے یوسف کی جورو قرار دیا اور کہا اے یوسف
تُو اپنی جورو کو گھر لے جا۔ اس سے پہلے کا کوئی واقعہ متی میں
نہیں ہے۔ مرقس نے اس پیدائش کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔
لوقا نے اس معجزانہ پیدائش کا ذکر کیا ہے مگر اُسی وقت
سے اُس نے مریم کا ذکر کیا ہے جب فرشتہ نے اُسے
حمل کی خبر دی اور وہ حاملہ ہو گئی۔ کیونکہ لکھا ہے
کہ مریم کنواری تھی اور اس کی یوسف سے منگنی ہوئی تھی
مگر شادی سے پہلے فرشتہ نے اُسے حمل کی خبر دی
اور وہ حاملہ ہوئی (انجیل لوقا باب ۱ آیت ۲۷ تا ۳۵) لیکن
حاملہ ہونے سے پہلے کے حالات پر لوقا نے کوئی روشنی
نہیں ڈالی۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ مریم زکریا کی بیوی کی
رشتہ دار تھی اور اُس کے گھر آتی جاتی تھی۔ اُس کے ماں
باپ اور اس کے بچپن کے حالات پر اُس نے کوئی روشنی
نہیں ڈالی۔ یوحنا اس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔

قرآن کریم نے مریم کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے
اور اس کی والدہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی پیدائش
کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے جس سے مسیح کی پیدائش کی
طرف اشارہ ملتا ہے۔ آخر اتنا بڑا نشان دکھانے کے
لئے کوئی ابتدائی علامات بھی تو ہونی چاہئیں۔ وہ ابتدائی
علامات قرآن کریم پیش کرتا ہے انجیل نہیں۔ چنانچہ
سورۂ آلِ عمران ع۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عمران کے
خاندان کی ایک عورت تھی (یعنی موسوی خاندان کی) اُس
نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ دین کی حالت خراب ہو رہی
ہے اور اس کی اصلاح کے لئے واقفین زندگی کی ضرورت
ہے اگر میرا بچہ ہوا تو میں اس کام کے لئے اُسے وقف
کر دوں گی اور خدا تعالیٰ سے اُس نے یہ وعدہ کیا اور
دعا کی کہ وہ اس کی نذر کو قبول کرے اور اس میں برکت
دے۔ لیکن جب اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو بجائے لڑکے
کے وہ لڑکی تھی جس پر اُسے مایوسی ہوئی کہ وہ کام جس کے
لئے اس نے اپنی اولاد وقف کی تھی لڑکی سے نہ ہو سکیگا
اور گھبرا کر پھر خدا سے دعا کی کہ الٰہی اب کیا کروں میرے
گھر میں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ خدا جانتا تھا
کہ جو نر اولاد اُس نے مانگی تھی وہ اس لڑکی کے برابر
کام نہیں کر سکتی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ زمانہ کی خرابی کا احساس تو
نیک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چکا تھا مگر اس خرابی
کو دُور کرنے کا جو صحیح وقت تھا اُسے وہ نہیں جانتے
تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ خرابی پیدا ہو چکی ہے اور دین سے
محبت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں جوش تھا کہ وہ اس
کی اصلاح کریں۔ مرد اپنی جگہ فکرمند تھے اور عورتیں اپنی جگہ

عقلمند تھیں۔ عورتوں نے اِس طرف توجہ کی کہ ہم اپنی اولادیں خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کریں گی۔ مگر اُن کو کیا معلوم تھا کہ اس اصلاح کا صحیح موقعہ کونسا ہے۔ اگر مریم کی والدہ کی دعا اُس وقت قبول ہو جاتی تو مسیح اپنے وقت سے بیس سال پہلے پیدا ہو جاتے۔ حالانکہ درمیان میں یحییٰ نے بھی آنا تھا اور اُن کا آنا مسیح کے لئے ارہاص کے طور پر تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو اس رنگ میں قبول کیا کہ بجائے اس کے کہ انہیں وہ بیٹا دیتا جو دین کی خدمت کرتا اُس نے اُنہیں وہ بیٹی دی جس سے آگے چل کر ایک عظیم الشان بیٹا پیدا ہونے والا تھا۔ اس طرح دعا بھی قبول ہو گئی اور زمانہ کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وقت مقدر تھا وہ بھی نہ ٹلا۔

غرض خدا تعالیٰ جو حالات سے واقف تھا اگر اُسی وقت اُس کی دعا سن لیتا تو وہ بچہ اس خدمت کو سرانجام نہیں دے سکتا تھا جو اُمِّ مریم کے ذہن میں تھی۔ اُس نے پُرانی پیشگوئیوں کے مطابق کہ کنواری لڑکا جنیگی جو یہود کو نجات دلوائے گا اور وہ ایک غیر معمولی فرزند کی ماں ہوگی لڑکے کی بجائے لڑکی دے دی۔ اور اُس کی ماں کی دعا اِس رنگ میں سنی گئی کہ لڑکی سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوا جو یہود کی رستگاری کا موجب ہوا۔

بہرحال ماں نے جب دیکھا کہ لڑکی ہوئی ہے تو چونکہ نذر مان چکی تھی۔ اُس نے اُسے علماء اور مجاوروں کی تربیت میں دے دیا۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ بے بیاہی رہے بلکہ صرف دینی تربیت کے لئے۔ کیونکہ ماں دعا کرتی ہے کہ میں اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اِس خیال سے کہ میں چونکہ دعا کر چکی ہوں اس لئے اگر علماء کے سپرد اسے کیا گیا تو وہ اس کی اچھی تربیت کرینگے اور اسے دین کی باتیں سکھائیں گے اور یہ آگے اپنی اولاد کو سکھائے گی اُسے پادریوں اور مجاوروں کے سپرد کر دیا۔ ورنہ اُن کی خواہش تھی کہ یہ لڑکی شادی کرے اور اس کے بچے پیدا ہوں کیونکہ وہ اس کے لئے اور پھر اس کی اولاد کے لئے بھی دعا کرتی ہیں کہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ چاہتی تھیں کہ اُن کی بیٹی شادی کرے اور اس کے بچے ہوں۔

خدا تعالیٰ نے ماں کی دعا سُنی اور مریم پر خاص فضل کیا۔ وہ زکریا کاہن کی تربیت میں پلی اور دوسرے کاہنوں کی نگرانی میں رہی اور اس کے دل میں دین کی محبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ بچپن ہی میں وہ اس یقین پر پہنچی کہ جو کچھ ملتا ہے خدا سے ملتا ہے۔ اُس کے ایک ایسے ہی جواب سے زکریا متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے لئے بھی لڑکے کی دعا کی جس سے یحییٰ پیدا ہوئے اور اس طرح عیسیٰ کی ماں عیسیٰ کے ارہاص والے نبی کے پیدا کرنے میں ممد ہوئی اور اپنے بیٹے کی سخت سے سخت مشکل کے حل کرنے والی بن گئی۔ کہ ایلیاء نبی کی آمد کے بغیر اس کا دعویٰ ثابت نہ ہو سکتا تھا سو یحییٰ ایلیاء کا مثیل بنا اور عیسیٰ کی ماں کی ایک معصوم حرکت سے اس کا وجود ظہور میں آیا۔

مریم کی بعد کی زندگی کے حالات انجیل میں یہ لکھے ہیں کہ حمل کے بعد یوسف اُسے گھر لے گیا۔ شادی کا کوئی ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہود میں منگنی شادی ہی سمجھی جاتی تھی اور حضرت مسیح پیدا ہوئے اُن کی پیدائش تک یوسف نے مریم سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اُن کی پیدائش کے بعد وہ اُن کے پاس گیا۔ اور دوسرے بچے پیدا ہوئے۔ (انجیل متی باب آیت ۲۵)

پھر لکھا ہے

"یسوع بچپن سے اپنے ماں باپ سے
نفور تھا اور جب اُس نے دعوٰی کیا مریم
اُس پر ایمان نہیں لائی بلکہ اس کی باتوں کو
تعجب سے دیکھتی رہی"

متی باب ۱۲ آیت ۴۶ تا ۵۰ میں لکھا ہے :۔

"جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو
اُس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور
اُس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے
اُس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے
بھائی باہر کھڑے تجھ سے بات کیا چاہتے
ہیں۔ پر اُس نے جواب میں خبر دینے والے
سے کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں
میرے بھائی اور اپنا ہاتھ اپنے شاگردوں
کی طرف بڑھا کر کہا کہ دیکھو میری ماں
اور میرے بھائی کیونکہ جو کوئی میرے باپ
کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے میرا
بھائی اور بہن اور ماں وہی ہے"

اس سے پتہ لگا کہ مسیح نے اپنے بھائیوں اور اپنی ماں کو مومن نہیں قرار دیا۔ کیونکہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ "جو کوئی میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے میرا بھائی اور بہن اور ماں وہی ہے یعنی یہ خدا کی مرضی پر چلنے والے نہیں۔

پس انجیل کی رُو سے حضرت مریم منکرہ اور کافرہ تھیں۔ انہوں نے مسیح کی باتوں کو نہیں مانا — مرقس باب ۳ آیت ۳۱ تا ۳۵ اور لوقا باب ۸ آیت ۲۰ میں بھی یہی مضمون ہے۔ اور یوحنا تو اس واقعہ پر بالکل خاموش ہے۔

متی میں پھر اور وضاحت سے لکھا ہے کہ لوگوں نے کہا کہ کیا یسوع کی ماں اور بھائی اور سب بہنیں ہمارے ساتھ نہیں۔ یعنی لوگوں نے کہا کہ اگر یہ سچا ہے تو اس کی ماں ہمارے ساتھ کیوں ہے۔ اس کے بھائی ہمارے ساتھ کیوں ہیں۔ اس کی بہنیں ہمارے ساتھ کیوں ہیں۔ وہ اس پر کیوں ایمان نہیں لائے۔ گویا متی صاف طور پر اقرار کرتا ہے کہ مسیح پر نہ مریم ایمان لائی تھیں نہ مسیح کی بہنیں ایمان لائی تھیں نہ مسیح کے بھائی ایمان لائے تھے۔ اور یہود کہا کرتے تھے کہ یسوع کے سب بھائی اور بہنیں اور اس کی والدہ ہمارے ساتھ ہیں۔ اگر یہ سچا ہے تو چاہیئے تھا کہ وہ اُس پر ایمان لاتے۔ جس پر مسیح نے کہا کہ

"نبی اپنے وطن اور گھر کے سوا اور کہیں
بے عزت نہیں ہے"

(انجیل متی باب ۱۳ آیت ۵۵ تا ۵۷)

یعنی میں اپنے وطن میں بھی بے عزت ہوں اور اپنے گھر میں بھی بے عزت ہوں۔ مگر میری یہ بے عزتی راستبازی کی دلیل نہیں کہ میں جھوٹا ہوں کیونکہ نبیوں کے گھر والے ہمیشہ اُن کے مخالف ہوا کرتے ہیں۔

پھر یہیں تک بس نہیں۔ مرقس باب ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے عزیز اور رشتہ دار اُسے پاگل سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"جب اُس کے عزیزوں نے یہ سُنا تو
اُسے پکڑنے کو نکلے کیونکہ کہتے تھے وہ
بے خود ہے" (انجیل مرقس باب ۳ آیت ۲۱)

گویا بجائے اس کے کہ وہ اس پر ایمان لاتے وہ اُسے دیوانہ اور مجنون سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُسے پکڑ کر رکھیں تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ پھرے۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انجیل کے نزدیک مریم اور اُن کی دوسری اولاد اور یوسف جو باپ

کہلاتا تھا مسیحؑ پر ایمان نہیں لائے اور مسیحؑ اُن سے تُرش روئی سے پیش آتا تھا۔ حتیٰ کہ بائبل کے رُو سے عین صلیب کے وقت بھی مسیحؑ نے اپنی ماں کی طرف توجہ نہیں کی۔ ماں کے دل میں درد تھا اور وہ صلیب کے وقت وہاں پہنچی۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ اُس وقت بھی مسیحؑ نے اپنی ماں سے محبت کے ساتھ بات نہیں کی۔ بلکہ اُسے جب کھڑا دیکھا تو تھوما سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تیری ماں ہے اور مریم سے کہا اے عورت یہ ہے تیرا بیٹا۔ (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۲۶ و ۲۷) گویا اُس وقت بھی انجیل کی رو سے مسیح کے دل میں مریم کی نسبت اتنا بُغض تھا کہ بجائے یہ کہنے کے کہ اے ماں یا اے مریم مسیح نے اُس وقت بھی یہ کہا کہ اے عورت یہ ہے تیرا بیٹا۔ اس طرح انہوں نے اپنا اخلاقی فرض تو ادا کر دیا اور ماں کو اس کا ٹھکانہ بتا دیا اور تھوما سے بھی کہہ دیا کہ اس کی اپنی ماں کی طرح خدمت کرنا لیکن اُس وقت بھی اُن کے جذبات انجیل کی رُو سے اتنے زخمی تھے کہ بجائے اس کے کہ ایسے خطرناک موقعہ پر جبکہ انہیں صلیب پر لٹکایا جا رہا تھا وہ اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ انہوں نے اُس وقت بھی ماں کا لفظ نہیں بولا بلکہ اُسے اے عورت کہہ کر مخاطب کیا۔

پھر انجیل کے بیان کے مطابق اُس کی اپنی ماں سے بے رُخی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ایک عورت نے اس کے لیکچر سے متاثر ہو کر کہا کہ

"مبارک ہے وہ پیٹ جس میں تُو رہا اور وہ چھاتیاں جو تُو نے چوسیں۔"

یعنی کیا ہی وہ اچھی عورت تھی جس کے پیٹ میں تُو رہا۔ اور کیا ہی وہ اچھی عورت تھی جس کی چھاتیوں سے تُو نے دودھ پیا۔ اب کم از کم اس موقعہ پر ہی مسیح اس عورت کی تعریف کو پی جاتے اور کچھ نہ کہتے۔ مگر مسیح سے اتنی بات بھی برداشت نہ ہو سکی اور انہوں نے کہا

"ہاں مبارک ہیں وہ جو خدا کا کلام سنتے ہیں اور اُسے مانتے ہیں۔" (انجیل لوقا باب ۱۱ آیت ۲۷ و ۲۸)

یعنی وہ ماں کوئی مبارک نہیں جس کے پیٹ میں مَیں رہا۔ وہ ماں کوئی مبارک نہیں جس کی چھاتیوں سے میں نے دودھ پیا۔ بلکہ مبارک وہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اُسے مانتے ہیں۔ جس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ مریم نے نہ خدا کا کلام سُنا اور نہ اُسے مانا۔ غرض دوسرے کے مُنہ سے بھی وہ اُن کی تعریف نہیں سُن سکتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن کے دشمن جانی تھے اور وہ انہیں مومن نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن قرآن خود مسیحؑ کے مُنہ سے کہلواتا ہے کہ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ (مریم ع ۲) میں تو اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں۔ میں اُس سے بڑی محبت اور پیار کرنے والا ہوں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ ان دونوں میں سے کونسی تاریخ سچی ہوگی۔ ایک طرف بائبل کہتی ہے کہ فرشتہ نے مریم سے کہا کہ

"خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہُوا ہے اور دیکھ تُو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اُس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا خدا تعالےٰ کا بیٹا کہلائے گا۔

(انجیل لوقا باب ۱ آیت ۳۰ و ۳۱)

مگر باوجود اس کے کہ فرشتہ اسے ایک ایسی خبر دے گیا تھا جو ظاہری حالات کے لحاظ سے قطعی طور پر ناممکن نظر آتی تھی۔ اور پھر خدا نے اس ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا پھر بھی یہ عظیم الشان نشان دیکھنے کے باوجود وہ بائبل کے مطابق مسیح کو پاگل سمجھتی رہی اور اُس پر ایمان نہ لائی۔ یوں اگر کسی کو بچہ کے متعلق خواب آ جائے اور پھر اس کے ہاں بچہ پیدا بھی ہو جائے تو بے شک یہ ایک نشان تو ہوگا

مگر اتنا بُرا نہیں ہوگا جتنا یہ معجزہ تھا۔ اگر کسی عورت
کو ایسی خواب آجائے اور پھر اُس کے ہاں بچہ پیدا
ہوجائے اور وہ نیک بھی بن جائے تب بھی ممکن ہے
کہ ماں کسی وقت ناراض ہوکر اُسے کہہ دے کہ تُو نے
میرا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ لیکن یہاں کوئی معمولی
نشان نہیں دکھایا جاتا۔ یہاں ایک کنواری حاملہ ہوتی
ہے۔ فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور اُسے خبر دیتا
ہے کہ تیرے ہاں بچہ ہوگا اور وہ اپنے اندر یہ یہ
صفات رکھے گا۔ اور پھر واقعہ میں اُسے حمل ہو جاتا
ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دنیا
میں غیر معمولی عزت اور شہرت حاصل کرتا ہے۔ کیا دنیا
کی کوئی بھی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ اتنے عظیم الشان واقعہ
کے بعد بھی وہ عورت اپنے بچہ کو پاگل کہے گی یا اُسکے
دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کردے گی۔ جس نے
خدا تعالےٰ کی قدرت کا اتنا عظیم الشان نشان دیکھا ہو
اُس کے لئے تو انکار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی
پس انجیل کا یہ بیان کہ وہ اپنی ماں کا نافرمان تھا
عقلی لحاظ سے بھی بالکل ناقابلِ تسلیم ہے۔ مگر قرآن
خود مسیح کی زبان سے یہ کہلواتا ہے کہ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ
میں تو اپنی والدہ سے نہایت ہی حسن سلوک کرنیوالا ہوں۔

پھر بائبل کہتی ہے کہ مریم کافرہ تھی مگر قرآن
کہتا ہے کہ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ
اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران ع۴) یعنی خدا
نے مریم کی والدہ کی دعا کو قبول فرمایا اور وہ نیکیوں پر
پختہ ہو گئی اور خدا تعالےٰ نے اُسے غیر معمولی ترقی
اور عظمت بخشی۔ پس قرآن اُسے مومن اور اعلیٰ درجہ کی
نیکیوں کی حامل قرار دیتا ہے لیکن انجیل جو اُسے خدا
کی ماں قرار دیتی ہے وہ اُسے کافرہ اور بے ایمان
ٹھہراتی ہے۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ع۵)
یعنی اے مریم اللہ تعالےٰ نے تجھ کو بزرگ بنایا ہے
اللہ تعالےٰ نے تجھے پاک کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے
تجھے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر فضیلت بخشی ہے غرض
قرآن وہ بات کہتا ہے جو فطرت کہتی ہے اور انجیل وہ
بات کہتی ہے جس کا فطرت انکار کرتی ہے۔ اِتنے بڑے
نشان کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ مریم انکار کرے۔
پس صحیح بات وہی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔
دشمن کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو
واقعات کا صحیح علم نہیں تھا انہوں نے غلط باتیں اس میں
درج کردیں۔ ہم اُن سے کہتے ہیں اے احمقو! تم صحیح
لکھنے والوں کو اس قرآن کے سامنے لاؤ۔ وہ جس کے
متعلق تم کہتے ہو کہ اُسے پتہ نہیں تھا وہ تو سچی باتیں
بتاتا ہے اور جن کے متعلق تم کہتے ہو کہ انہیں سب کچھ
پتہ تھا وہ جھوٹی باتیں بتاتے ہیں۔ کیا یہ محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا عظیم الشان ثبوت نہیں؟

اس جگہ اللہ تعالےٰ نے اِصْطَفٰكِ عَلٰى
نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے
کہ انجیل میں کئی مریموں کا نام آتا ہے جن کی نیکی اور
تقدس کی بڑی تعریف کی گئی ہے لیکن وہ مریم جو
ماں تھی مسیح کی اُسی کو عیسائیوں نے مسیح کا دشمن اور
مخالف ظاہر کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ
تم مریم مگدلینی اور دوسری عورتوں کو اُمّ عیسیٰ پر
فضیلت دیتے ہو۔ حالانکہ تم جن مریموں کو لئے بیٹھے ہو
وہ اس مریم کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی
تھیں۔ سب سے بہتر اور سب سے مقدس وہی مریم تھی
جو عیسیٰ کی ماں تھی۔

پھر فرماتا ہے يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ

وَاسْجُدِی وَارْکَعِی مَعَ الرَّاکِعِینَ (آل عمران ع۵)
رَاکِع اس شخص کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان خالص عطا کر دیا جائے۔ پس یَا مَرْیَمُ اقْنُتِی لِرَبِّکِ وَاسْجُدِی وَارْکَعِی مَعَ الرَّاکِعِینَ کے یہ معنے ہیں کہ اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار رہو۔ اُس کی عبادت بجالاؤ اور باقی مومنوں کے ساتھ مل کر اُس کی جماعت میں شامل رہو۔ گویا قرآن صاف طور پر اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ مریم اول درجہ کے ایمانداروں میں سے تھیں۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ وہ بدعورتیں جو مسیح کے سر پر تیل ملا کرتی تھیں وہ تو با ایمان تھیں اور جس نے اتنا بڑا معجزہ دیکھا وہ بے ایمان تھی۔

اب بظاہر یہ سب عام باتیں ہیں کوئی مخفی اور غیب کی باتیں نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس امر کا ذکر کرنے کے بعد کہ مریم خدا تعالےٰ کی فرمانبردار اور نماز گذار اور مومنوں کی جماعت میں شامل تھی فرماتا ہے ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ (آل عمران ع۵) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کے ذریعہ نازل کر رہے ہیں۔ یعنی یہ باتیں تمہیں بظاہر معمولی نظر آتی ہیں۔ لیکن انجیل اِن باتوں کو کھا گئی ہے اور اس لئے اب یہ غیب کی خبریں بن گئی ہیں۔ انجیل میں لکھا ہے کہ مریم کافرہ تھی۔ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ مسیح کو پاگل سمجھتی تھی۔ مگر ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ وہ ایماندار تھی، وہ فرمانبردار تھی اور وہ مسیح پر سچے دل سے ایمان لانے والوں میں شامل تھی۔ وہیری کہتا ہے کہ قرآن کو پتہ نہیں کہ صحیح واقعات کیا ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ ہم تمہیں وہ تاریخ بتا رہے ہیں جو بائیبل میں بھی درج نہیں۔ یہ کتنا عظیم الشان نشان ہے قرآن کی صداقت کا۔ کہ بائبل جو عیسائیوں کی کتاب ہے اور جس میں مسیح اور اس کی والدہ کے متعلق سچی باتیں ہونی چاہیئے تھیں وہ تو غلط باتیں لکھتی ہے اور قرآن اُن کے متعلق سچی تاریخ پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ۔ یہ باتیں انجیل میں نہیں لکھیں۔ یہ عیسائیوں نے چھپا دی تھیں اب ہم تم کو بتا رہے ہیں۔ کیونکہ اِن کے بغیر مسیح کی کہانی پوری نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انجیل کا بیان بتاتا ہے کہ اپنے قرب کو ظاہر کرنے کے لئے حواریوں نے خدا کی ماں پر الزام لگانے سے دریغ نہیں کیا محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا اور تھوما بڑے مقرب تھے مسیح کی والدہ پر انہوں نے انتہائی ظلم کیا کہ اُسے کافرہ اور بے ایمان قرار دیدیا۔ لیکن قرآن نے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا اور بتا دیا کہ مریم مومنہ تھی، مریم راستباز تھی اور انجیل میں جو باتیں اُن کے خلاف لکھی ہیں وہ سراسر جھوٹی اور مفتریانہ ہیں۔

وہیری نے الزام لگایا تھا کہ قرآن جھوٹا ہے لیکن قرآن نے تیرہ سو سال پہلے بتا دیا تھا کہ ہم اس میں وہ باتیں بیان کر رہے ہیں جو انجیل میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ کہ انجیل نے اُن کے متعلق جھوٹ بولا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآن سچا ہے اور انجیل جھوٹی۔

اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا مَکَانًا شَرْقِیًّا
حضرت مریم کا وطن جیسا کہ بائبل سے ثابت ہوتا ہے ناصرہ تھا اُن کا بھی اور اُن کے خاوند یوسف کا بھی۔ لیکن چونکہ عبادت گاہ یروشلم تھی قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے (بائبل سے نہیں) کہ بچپن میں انکو دینی تعلیم و تربیت کے لئے یوروشلم میں حضرت زکریا کے پاس چھوڑا گیا تھا

مگر جیسا کہ قرآن کریم سے ہی پتہ چلتا ہے حضرت مریم کی والدہ کا یہ منشا نہیں تھا کہ وہ کاہن یا نن بنیں۔ پس اِس لئے انہوں نے ہمیشہ وہاں نہیں رہنا تھا۔ چنانچہ حضرت مریم کے متعلق انہوں نے دعا کی تھی کہ الٰہی اس کی اولاد بھی پیدا ہو جو نیکی اور تقویٰ پر قائم رہنے والی ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں پس جب وہ جوان ہوئیں اور بالغ ہو گئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی والدہ انہیں ناصرہ اپنے وطن لے گئیں۔ پس اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا سے یروشلم اور اُس میں رہنے والے مراد نہیں۔ بلکہ اس سے اُن کے وہی اہل مراد لئے جائیں گے جو کہ ناصرہ میں تھے۔ اُن سے وہ ایک طرف ہو کر مکانِ شرقی میں چلی گئیں۔

یہ شرقی مکان کیا تھا؟ مفسرین کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ کسی مشرقی شہر کی طرف گئی تھیں۔ انجیل کہتی ہے کہ وہ ناصرہ میں تھیں جو اُن کا اور اُن کے خاوند کا وطن تھا (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۲۶ تا ۳۱) اور ناصرہ یوروشلم سے شمال کی طرف ہے نہ کہ مشرق کی طرف۔ پس یہ معنے نہیں لئے جاسکتے کہ حضرت مریم اُس وقت یروشلم سے ناصرہ کو چلی گئیں بلکہ اس جگہ ناصرہ کی رہائش کے زمانہ کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال جہاں تک بائبل کی تاریخ کا سوال ہے حضرت مریم مشرق کے مکان کی طرف نہیں گئیں بلکہ اپنے وطن میں رہیں اور یوروشلم کے لحاظ سے وہ شمال میں تھیں۔

بائبل کی تاریخ کوئی معتبر تاریخ تو ہے نہیں مگر بہرحال اس کی اپنے زمانہ کے متعلق باتیں بلا عقلی یا نقلی دلیلوں کے رد نہیں کی جاسکتیں کیونکہ وہ اس زمانہ کے قریب کی باتیں ہیں اور چونکہ شَرْقِيًّا کے معنے عربی زبان میں ایسے مکان کے بھی ہوتے ہیں جس کا منہ مشرق کی طرف ہو اور مشرق کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے مَكَانًا شَرْقِيًّا کے معنے ہوئے۔ مشرق کی جانب یا ایسے مکان میں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرآن کریم کی بناء پر بائبل کے بیان کو رد بھی نہیں کر سکتے اور آسانی سے یہ معنے کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسے مکان میں گئیں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم میں تو اہم باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ آخر یہ کوئی قصہ کہانی کی کتاب تو ہے نہیں کہ غیر ضروری تفصیلات بھی بیان کی جائیں اور بتایا جائے کہ فلاں نے اس رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کی پگڑی اس رنگ کی تھی۔ اس میں تو وہی باتیں بیان ہوتی ہیں جو اپنے اندر اہمیت رکھتی ہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ ایک مکانِ شرقی کی طرف گئیں۔ مکان شرقی کی کوئی خصوصیت ہونی چاہیئے جس کا مریم کے واقعہ سے تعلق ہو۔ ورنہ یہ ایک بے معنی بات بن جائے گی۔

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہود کے نزدیک مشرق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سب سے اول تورات میں لکھا ہے کہ

"خداوند خدا نے عدن میں پورب کی جانب
ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا
تھا وہاں رکھا" (پیدائش باب ۲ آیت ۸)

پورب کے معنے مشرق کے ہوتے ہیں یعنی خدا نے عدن میں مشرقی جانب جنت بنائی اور اُس میں آدم کو رکھا گیا۔ پس بائبل کے نزدیک جنت اور انسانی ابتداء کا تعلق مشرق سے ہے۔

بابلی لوگ جہاں یہودی قید ہو کر گئے تھے اور جن کے خیالات اور روایات سے وہ بہت ہی متاثر تھے وہ بھی مشرق کو بہت متبرک خیال کرتے تھے وہ مشرق کو

روشنی کا دروازہ سمجھتے تھے اور طوفانِ نوح سے بچانے والا جو ہیرو تھا (اُسے تم لیڈر کہہ لو یا پیغمبر کہو) اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ مشرق کا باشندہ تھا لیکن مغرب کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ وہ مُردوں کی دنیا ہے۔ غرض بابلی لوگ مشرق کو روشنی کا دروازہ اور مغرب کو مُردوں کی دنیا خیال کرتے تھے اور طوفانِ نوح سے بچانے والے ہیرو کو وہ مشرق کا باشندہ سمجھتے تھے۔

حزقیل نبی بھی چونکہ اسی علاقہ میں رہے اِس لئے وہ بھی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

"روح مجھ کو اُٹھا کے خداوند کے گھر کے
پوربی دروازہ پر جس کا رُخ پورب کی طرف
ہے لے گئی" (حزقیل باب ۱۱ آیت ۱)

یعنی جو ہیکل بنی ہوئی تھی اُس کا دروازہ پورب کی طرف تھا معلوم ہوتا ہے اس خیال سے کہ مشرق کی طرف سے روشنی آتی ہے وہ ہیکلوں میں بھی اس امر کو مدنظر رکھتے تھے کہ اُن کے دروازے مشرق کی طرف ہوں اور وہ اس کو برکت والا خیال کرتے تھے۔

متی باب ۲ آیت ۲ میں لکھا ہے کہ مجوسی آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے پورب میں اس کا ستارہ دیکھا اور اسے سجدہ کرنے کو آئے ہیں یعنی مسیح کی پیدائش پر انہوں نے مشرق میں ستارہ دیکھا اور انہوں نے سمجھا کہ وہ جس کے آنے کی صحیفوں میں خبر تھی پیدا ہو گیا ہے۔

گنتی باب ۲۴ آیت ۱۷ میں ہے

"یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلیگا۔"

اس میں ایک نبی کی خبر دی گئی تھی اور روایات اُسے مشرق کی طرف بتاتی تھیں۔ پس چونکہ پہلی کتابوں میں ایک ستارہ کے نکلنے کی خبر تھی اور یہودی روایات میں یہ بات پائی جاتی تھی کہ وہ ستارہ مشرق سے نکلے گا۔ اس لئے پورب سے جو لوگ آئے انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک ستارہ مشرق میں دیکھا ہے جس سے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نبی جس کے آنے کی پیشگوئی کی گئی تھی پیدا ہو گیا ہے۔

مکاشفات باب ۷ آیت ۲ میں لکھا ہے

"پھر میں نے ایک فرشتے کو پورب سے
اُٹھتے دیکھا جس کے پاس زندہ خدا کی مُہر تھی۔"

مکاشفات بے شک مسیح کے بعد کی کتاب ہے لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہود اور نصاریٰ میں مشرق کا خاص احترام تھا اور وہ عبادت گاہوں کے دروازے مشرق کی طرف بناتے تھے بلکہ بعض مشرق کی طرف مُنہ کر کے عبادت بھی کرتے تھے۔ اِس وجہ سے اِس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ مریم ایک عبادت گاہ میں جس کا مُنہ مشرق کی طرف تھا تاکہ جنّت اُونی اور بشارت عظیمہ سامنے رہیں عبادت کے لئے گئیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ عیسائیوں کی عبادت گاہ اور مسلمانوں کی عبادت گاہ میں فرق ہوتا ہے عیسائیوں کی عبادت گاہ میں جدھر امام کا مُنہ ہوتا ہے اُسی طرف مقتدیوں کا مُنہ نہیں ہوتا بلکہ اُن دونوں کے مُنہ آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو امام بھی قبلہ رُو کھڑا ہوتا ہے اور مقتدیوں کا مُنہ بھی قبلہ رو ہوتا ہے۔ مگر اُن میں عبادت گاہ کا دروازہ مشرق کی طرف ہوگا۔ امام اور مقتدی سب اس دروازہ کے داخل ہونگے مگر اندر داخل ہو کر امام اپنا مُنہ مشرق کی طرف کریگا اور مقتدی اپنا مُنہ مغرب کی طرف کرلیں گے یا یوں کہو کہ مقتدیوں کا مُنہ امام کی طرف ہوگا اور امام کا مُنہ مقتدیوں کی طرف ہوگا۔

غرض عیسائی اپنی عبادت گاہوں کا دروازہ مشرق کی طرف بناتے ہیں بلکہ بعض فرقوں کے متعلق یہ ثابت ہے کہ وہ عبادت بھی مشرق کی طرف ہی مُنہ کر کے کرتے ہیں۔ میں یہ تحقیق نہیں کر سکا کہ آیا سارے ایسا کرتے ہیں

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۚ فَاَرْسَلْنَآ

اور اپنے اور) اُن (یعنی رشتہ داروں) کے درمیان پردہ ڈال دیا (یعنی اُن سے تعلق قطع کرکے اپنے آپ کو چھپا دیا) اُس وقت ہم نے اس کی

اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ⑱

کی طرف اپنا کلام لانیوالا فرشتہ (یعنی جبرئیل) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک تندرست بشر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۴ ۵

یا صرف بعض فرقے ایسا کرتے ہیں۔ بہرحال بعض فرقوں کے متعلق میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ مشرق کی طرف منہ کرکے عبادت کرتے ہیں۔ پس مَكَانًا شَرْقِيًّا کے معنے یہ ہوئے کہ وہ مکان جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔ معلوم ہوتا ہے جب حضرت مریم جوان ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں دعا کا جوش پیدا کیا اور وہ گھر سے نکلیں اور ایک عبادت گاہ میں گئیں وہ عبادت گاہ ایسی تھی جس کا منہ مشرق کی طرف تھا اس یادگار میں کہ جنت اور انسانی ابتداء کا تعلق مشرق سے ہے۔

۱۴ حل لغات:۔ رُوْح کے معنے اُس چیز کے ہیں جس سے حیات نفس قائم ہے اور رُوح کے معنے نبوت کے بھی ہیں اور روح کے معنے جبریل کے بھی ہیں اور رُوح کے معنے وحی کے بھی ہیں۔ نبوت کو روح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی انسان کو ایک نئی روحانی زندگی بخشتی ہے اور جبریل کو بھی اسی لئے رُوح کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کلام لاتا ہے جو زندگی بخش ہوتا ہے۔ اسی طرح وحی کو بھی اسی لئے روح کہتے ہیں کہ وہ ایمان کو تازہ کرتی ہے غرض یہ ساری چیزیں روح کہلاتی ہیں۔

تفسیر:۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے دعا میں خلوت کے حصول کیلئے پردہ کھینچ لیا۔ موجودہ زمانہ میں مکانوں کے اندر دروازے بنائے جاتے ہیں جو آسانی کیساتھ بند کر لئے جاتے ہیں لیکن اُس زمانہ میں دروازوں کا رواج نہیں تھا صرف پردے کھینچ لئے جاتے تھے بلکہ بنو عباس کے زمانہ تک شاہی محلات کے اندر دروازے نہیں ہوتے تھے۔ شاہان مغلیہ کی عمارتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تخلیہ کے لئے پردے ڈال لیا کرتے تھے۔ پس فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کرنے کے لئے علیحدہ ہوئیں جس میں حجاب کی ضرورت تھی۔ بلکہ چونکہ وہ دعا اور عبادت کے لئے علیحدہ ہوئی تھیں اور اس کیلئے تخلیہ کی ضرورت تھی انہوں نے پردہ کھینچ لیا تاکہ لوگ اُن کو نہ دیکھیں اور وہ علیحدگی میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر سکیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی عبادت گاہ میں تھے جب انہیں الہام ہوا۔ اِسی طرح حضرت مریم بھی عبادت گاہ میں ہی تھیں جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ تخلیہ میں گئیں اور دعا میں مشغول ہوگئیں تو اَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا ہم نے اپنا فرشتہ اُن کی طرف بھیجا۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ اور وہ اُن کے لئے ایک مثالی جسم بن گیا جیسے خواب میں اگر کوئی شخص دیکھے کہ اُس نے بکرا ذبح کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار فوت ہو جائیگا۔ یا خواب میں چوہا دیکھے تو اُس سے مراد کوئی منافق ہوگا یا خواب میں دیکھے کہ میرے گھر میں چوپایا ہے

تو اس سے مراد داماد ہوگا۔ اب تعبیر بظاہر بالکل
بے جوڑ نظر آتی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا ہی
ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ تصویری زبان میں یہ واقعات
اُس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہاں بھی اِسی مثالی
وجود کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فَتَمَثَّلَ
لَهَا اُس نے اُن کے لئے ایک تمثیلی شکل اختیار کرلی۔
بَشَرًا سَوِيًّا ایک ایسے انسان کی صورت جو تندرست
تھا۔ گویا اُس وقت حضرت مریم پر جو کلام نازل ہوا ان
الفاظ میں اُس کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ وہ کس رنگ
میں نازل ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک
دفعہ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح
نازل ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا کبھی تو وہ گھنٹی کی
آواز کی طرح نازل ہوتی ہے یعنی یوں معلوم ہوتا ہے
کہ ایک گھنٹی بج رہی ہے اور اس کے بعد کلام الٰہی نازل
ہونے لگتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ
کا کوئی فرشتہ آتا ہے اور وہ مجھ سے بات کرتا ہے
اور کبھی وہ کوئی دوسری شکل اختیار کرلیتا ہے۔

یہاں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور
بتایا گیا ہے کہ وہ وحی ایسی نہیں تھی جو مریم کے کان
پر پڑی یا اس کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلکہ وہ ایک
خواب یا کشف کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ انہوں نے
کشف میں دیکھا کہ ایک فرشتہ سامنے آیا ہے جو
ایک تندرست انسان کی شکل میں ہے اور اس فرشتہ
نے انہیں خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچایا ہے۔ درحقیقت
اگر ہم گہرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ
کا کلام ہی ہے جو نزول کے وقت مختلف شکلیں
اختیار کرلیتا ہے اور کبھی وہ کسی شکل میں نازل ہوجاتا
ہے اور کبھی کسی شکل میں۔ حضرت مریم پر جب کلام الٰہی
نازل ہوا تو اس کلام نے اُس وقت ایک انسان کی
شکل اختیار کرلی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جبریل تھا
جو اُن کے سامنے ظاہر ہوا۔ حالانکہ اگر اُسے جبریل کہو
تب بھی حقیقت تو وہی ہے جو میں نے بتائی ہے کہ
خدا تعالےٰ کا کلام ہی مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے
مثلاً اگر کوئی شخص خواب میں بینگن دیکھتا ہے تو اس
کے معنے یہ ہوں گے کہ کلام نے بینگن کی شکل اختیار
کرلی۔ یا اگر کوئی شخص فرشتہ دیکھتا ہے تو اس کے
معنے یہ ہوں گے کہ کلام الٰہی نے اس وقت فرشتہ کی
شکل اختیار کرلی۔ بہرحال خدا تعالےٰ کا کلام نزول کے
وقت مختلف رنگ اختیار کرلیتا ہے۔

میں ابھی چھوٹا بچہ تھا کہ میں نے رویا میں دیکھا
کہ جس طرح کٹورہ بجائیں تو اس میں سے ٹن کی آواز
نکلتی ہے۔ اسی طرح کسی نے کٹورہ بجایا ہے اور اُس
میں سے ٹن کی آواز پیدا ہوئی ہے۔ پھر میں نے دیکھا
کہ وہ آواز پھیلنی شروع ہوئی اور پھیلتی چلی گئی جس
طرح دریا میں پتھر پھینکا جائے تو اس کے بعد پانی میں
ایک دائرہ سا بن جاتا ہے جو پھیلتا چلا جاتا ہے اسی طرح
وہ آواز جَو میں پھیلنی شروع ہوئی اور آخر
پھیلتے پھیلتے جَو کے عین وسط میں ایک خالی فریم پیدا
ہوگیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس فریم میں ایک تصویر بننی
شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اُس تصویر نے
انسان کی شکل اختیار کرلی۔ پھر یکدم اُس میں حرکت
پیدا ہوئی اور تصویر میں سے ایک آدمی کود کر نکلا۔
اور میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور اُس نے کہا میں
خدا کا فرشتہ ہوں۔ مجھے خدا نے تمہارے پاس اِس
لئے بھیجا ہے کہ میں تمہیں سورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھاؤں
میں نے کہا سکھاؤ۔ چنانچہ اس نے مجھے سورۂ فاتحہ کی
تفسیر سکھانی شروع کردی۔ جب وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ
وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تک پہنچا تو کہنے لگا کہ اب تک

جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں اسی آیت تک لکھی گئی ہیں اگر تم کہو تو تمہیں اس سے آگے بھی سکھاؤں۔ میں نے کہا ہاں آگے بھی سکھاؤ۔ چنانچہ اُس نے مجھے ساری سورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھادی۔

اب دیکھو اس رویا میں آواز پیدا ہوئی آواز فریم بن گئی۔ فریم میں تصویر ظاہر ہوئی اور تصویر آدمی کی شکل میں کُود کر میرے سامنے آگئی اور اُس نے مجھ سے بات کی۔ پس یہ ساری چیزیں اسی رنگ میں ہوتی ہیں کہ کلام الٰہی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ پس اس میں خاص بات کوئی نہیں جن لوگوں کو اس کوچہ کا علم نہیں وہ حیران ہوتے ہیں کہ نہ معلوم یہ کیا بات ہے مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت مریم سے پیش آیا اور کلام الٰہی ایک آدمی کی شکل بن کر اُن کے سامنے آگیا۔ اس سے حمل کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف کُنْ فَيَكُوْنُ کا ایک نشان تھا نہ کہ کسی فرشتے یا رُوح کا اُن کے اندر داخل ہو جانا۔

اس جگہ رُوْحَنَا کا جو لفظ آتا ہے اس سے مسیحی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تھا اور وہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن نے اُن کے عقیدۂ ابنیت کی تصدیق کر دی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں وہ ایک فرشتہ تھا جو اُن کے سامنے متمثل ہوا مگر چونکہ اس جگہ رُوْحَنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ہیں "ہماری روح" اس لئے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا کہہ رہا ہے کہ ہماری روح نے ایک تمثّل اختیار کیا تو اس کے صاف طور پر یہ معنے ہیں کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تھا اور اُن کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا یا خدا کا بیٹا تھا درست ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لوقا باب ۱ آیت ۳۵ میں ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریم سے کہا کہ

"روح القدس تجھ پر نازل ہوگا"

جب فرشتہ نے مریم سے یہ کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور قرآن کہتا ہے کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تو یہ انجیل کی تصدیق نہ ہوئی بلکہ تردید ہوئی کیونکہ انجیل تو یہ مانتی ہی نہیں کہ خدا اس کے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ صرف اتنا کہتی ہے کہ روح القدس اس پر نازل ہوا تھا۔

پھر متی باب ۱ آیت ۱۸ میں ہے

"وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی"۔

یہاں معاملہ اور بھی مشتبہ ہو گیا کیونکہ متی کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح القدس اُس پر نازل ہی نہیں ہوا بلکہ روح القدس اُس کے اندر داخل ہو گیا۔

اسی طرح متی باب ۱ آیت ۲۰ میں ہے

"جو اس کے رحم میں ہے سو روح القدس سے ہے"۔

اس میں روح القدس سے حاملہ ہونے کی تشریح کر دی کہ جو اس کے رحم میں ہے سو روح القدس کی ہے یعنی اس کے نطفہ سے ہے۔ یہاں اور بھی مشکل پیش آگئی۔ کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا مریم کے اندر داخل ہوا تھا یا روح القدس مریم کے پیٹ میں داخل ہوا تھا۔ کیونکہ متی یہ بتاتا ہے کہ روح القدس مریم سے ملا اور اس کے نطفہ سے آگے مسیح پیدا ہوا پس عیسائیوں کا یہ خیال کہ قرآن نے انجیل کی تصدیق کر دی ہے بالکل غلط ہے اوّل تو قرآن کہتا ہے کہ روح نے متمثل ہو کر اُسے خبر دی یہ نہیں کہتا کہ روح اُس کے

قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۹﴾

(مریم نے اس سے) کہا میں تجھ سے رحمٰن (خدا) کی پناہ مانگتی ہوں اگر تیرے اندر کچھ بھی تقویٰ ہے ؎۱۵

اندر چلی گئی اور انجیل خدا کی جگہ روح القدس کا حمل بتاتی ہے۔ گویا دونوں باتیں مسیحی عقیدہ کے خلاف ہیں۔ مسیحی عقیدہ جو مشہور ہے وہ یہ ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور قرآن یہ نہیں کہتا۔ اور انجیل کا مطلب یا تو یہ ہے کہ وہ روح القدس کا فرزند تھا یا یہ کہ خدا روح القدس تھا اور یہ دونوں باتیں مسیحی عقیدہ کے خلاف ہیں۔ قرآن صرف اتنا بتاتا ہے کہ ایک فرشتہ انکے سامنے متمثل ہوا اور اُس نے انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بیٹے کی خبر دی۔ پس رُوحنا نے عیسائیوں کا یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن انجیل کا مصدق ہی بالکل غلط ہے۔

؎۱۵ **تفسیر**:۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی طرف رحمٰن کا لفظ منسوب کیا ہے اور یقیناً خدا تعالیٰ کی بات ہی درست ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیت خدا تعالیٰ کی رحمانیت ہی کی منکر ہے اور عیسائیت کی بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ خدا رحمٰن نہیں۔ اگر وہ رحمٰن ہے تو پھر وہ گناہ بھی بخش سکتا ہے لیکن عیسائیت کہتی ہے کہ وہ کسی کو بخش نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے عدل کے خلاف ہے۔ گویا جو کام اس دنیا میں ہر انسان کرتا ہے اور جس کام کے کرنے پر انسان کی تعریف کی جاتی ہے نہ کہ مذمت وہ خدا نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا رحم تقاضا کرتا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو بخشے۔ پس اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور وہ لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں پھانسی پر لٹک گیا۔ اب چونکہ تمام گناہ خود اس نے اُٹھائے ہیں اور وہ لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں کفارہ ہو گیا ہے اس لئے لوگوں کو کسی

اور عمل کی ضرورت نہیں وہ مسیح پر ایمان لانے کے نتیجہ میں ہی نجات پا جائیں گے۔ غرض عیسائیت کی ساری بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ خدا رحمٰن نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ حضرت مریم نے جب یہ نظارہ دیکھا تو انہوں نے کہا اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کے معنے ہیں وہ ہستی جو بغیر کسی عمل کے انسان کو اپنی نعمتوں سے متمتع فرماتی ہے۔

یہ ایک رویا کا نظارہ تھا جو حضرت مریم نے دیکھا۔ اور رویا میں جب انسان کوئی خطرہ کی بات دیکھتا ہے۔ تو جس طرح مادی دنیا میں وہ گھبراتا ہے اسی طرح خواب میں بھی گھبراتا ہے۔ مثلاً اگر تم رویا میں دیکھو کہ تم اوپر سے گرنے لگے ہو تو تم ڈر جاؤ گے۔ اگر تم دیکھو کہ تم ڈوبنے لگے ہو تو تم گھبراؤ گے۔ اسی طرح خواب میں اگر کوئی دیکھے کہ وہ مرنے لگا ہے تو وہ خوش نہیں ہو گا۔ بلکہ غمزدہ ہو گا۔ پس بے شک یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو انہوں نے دیکھا۔ لیکن ظاہر ہے جو بات ناپسندیدہ ہو وہ اگر کشف میں پیش آئے تو انسان ناپسندیدگی کا ہی اظہار کرے گا۔ اسی وجہ سے حضرت مریم نے جب فرشتہ کو انسانی صورت میں اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو وہ گھبرا گئیں اور انہوں نے کہا کہ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ ان الفاظ میں اُن کے قلب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم اس نظارہ کو دیکھ کر اس قدر گھبرائیں کہ انہوں نے اُس سے کہا کہ اگر تجھ میں تقویٰ پایا جاتا ہے۔ تو میں خدائے رحمٰن سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے تیرے شر سے

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۲۰﴾

(اس پر اس فرشتہ نے) کہا میں تو صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں۔ تاکہ میں تجھے (وحی کے مطابق) ایک پاک لڑکا دوں (جو جوانی کی عمر تک پہنچیگا) ۱۶/۱۹

بچائے۔ رحمٰن کے معنے ہیں وہ ہستی جو بے محنت اور کوشش کے اپنا فضل نازل کرتی ہے۔ گویا وہ اس قدر گھبرا گئیں کہ انہوں نے کہا خدایا تو میرے عمل کو نہ دیکھ کر میں نے تیری رضا کے لئے کچھ کیا ہے یا نہیں میں تجھے رحمانیت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ۔ اگر اس میں رحیمیت کا واسطہ ہوتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ خدایا کچھ عمل میں نے بھی کئے ہوئے ہیں اُن کی جزاء کے طور پر میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھ پر رحم فرما لیکن وہ رحیمیت کا واسطہ نہیں دیتیں۔ وہ اپنے انتہائی درد اور کرب کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے رحمانیت کا واسطہ دیتی ہیں اور کہتی ہیں خدایا میرا کوئی عمل نہیں مجھ بے عمل پر ہی رحم کر دے اور یہ کرب و بلا کا وقت مجھ سے دور فرما دے۔

اِن الفاظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انسان انتہائی مشکلات میں مبتلا ہو اور کرب و بلا نے اُسے گھیرا ہُوا ہو تو اُس وقت وہ اللہ تعالےٰ سے اِسی طرح دعا کیا کرے کہ خدایا میرا کوئی عمل نہیں۔ لیکن میں بے عمل ہوتے ہوئے بھی تیری رحمانیت کا تجھے واسطہ دیتا ہوں اور تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر اپنا فضل نازل فرما۔

اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا انہوں نے اس لئے کہا کہ خدا کا واسطہ دینا بھی اُسی شخص پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے جس میں خدا کا ڈر اور خوف پایا جائے ورنہ قاتل جب قتل کرتے ہیں تو لوگ انہیں بار بار خدا کا واسطہ دیتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں ذرا بھی رحم پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل ہماری مخالفت میں بھی لوگوں کا یہی حال ہے۔ اُنہیں خدا کا لاکھ دفعہ خوف دلایا جائے اُن کو خدا کا خوف آتا ہی نہیں۔ حضرت مریم بھی جانتی تھیں کہ اگر یہ نیک نہیں تو اس کے سامنے خدا کا نام لینا بیکار ہے بلکہ ادب کے بھی خلاف ہے پس انہوں نے کہا کہ میں خدا کا واسطہ تو تجھے دیتی ہوں مگر ایسی شرط کے ساتھ کہ تو نیک ہو۔ اگر تو نیک نہیں تو پھر میں خدا سے کہوں گی کہ وہ آپ میری حفاظت کرے۔

۲۰ حل لغات:۔ غُلَامٌ کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بچہ، جوان اور ادھیڑ عمر والا تینوں کے لئے غلام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور زَكِيًّا کا لفظ زکوٰۃ سے ہے اور اس کے معنے ایسے شخص کے ہیں جس میں اندرونی پاکیزگی پائی جاتی ہو۔

(حاشیہ: ۲ غلام — ۳ زَكِيًّا)

تفسیر:۔ جب حضرت مریم نے کہا کہ اگر تم میں کچھ تقویٰ ہو اور تم خدا تعالےٰ سے ڈرتے ہو تو رحمٰن کے نام سے پناہ مانگتی ہوں۔ تو فرشتہ نے کہا گھبراؤ نہیں میں تو تمہارے رب کی طرف سے ایک پیغامبر کے طور پر آیا ہوں لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا تاکہ میں تم کو ایک زکی غلام دوں۔

رَسُوْلٌ کا لفظ بتاتا ہے کہ بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شخص درحقیقت حضرت مریم کا خاوند تھا یا خدا تعالےٰ کی طرف سے خاوند تجویز کیا گیا تھا یہ درست نہیں۔ کیونکہ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی کام کرنے آیا ہوں بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں خدا تعالےٰ کی طرف سے صرف ایک پیغامبر کے طور پر بھجوایا گیا ہوں۔ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ

(مریم نے) کہا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا حالانکہ اب تک مجھے کسی مرد نے

بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۱﴾

نہیں چھوا اور میں کبھی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوئی ہے[۱]

اَھَبَ کے متعلق بھی خیال ہو سکتا ہے کہ شاید اس کے معنے دینے کے ہوں اور مراد یہ ہو کہ وہ تعلقات رکھے لیکن یہ بھی درست نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ جو چیز یقینی اور قطعی ہو۔ وہ ایسے الفاظ میں میں بیان کرتا ہے جن میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو مثلاً مستقبل کی خبر بیان کی جاتی ہے تو اُسے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا جاتا ہے یہ بتانے کے لئے کہ تم اس بات کو ایسا ہی سمجھو جیسا کہ یہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح اس پیشگوئی پر زور دینے کے لئے کہ یہ پیشگوئی ضرور پوری ہوگی اُس نے اَھَبَ کہا جس کے معنے یہ ہیں کہ میں دینے آیا ہوں۔ یعنی اس بات کو ایسا ہی سمجھو کہ گویا بیٹا مل گیا ہے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ لڑکا خدا دیا کرتا ہے فرشتہ نہیں دیا کرتا۔ پس اَھَبَ لَكِ سے مراد صرف لڑکے کی خبر ہے نہ کہ لڑکا دینا۔ خدائی خبر چونکہ یقینی ہوتی ہے اس لئے اُسے گویا چیز کے مل جانے کے برابر ظاہر کیا اور اُس نے کہا کہ میں خدائی وحی کے مطابق تجھ کو ایک پاک لڑکا دینے آیا ہوں یعنی میں اس لئے آیا ہوں کہ تجھ کو ایک پاک لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر دوں اور یہ کشف قطعی اور یقینی ہے۔ اسے ایسا ہی سمجھو جیسا کہ لڑکا مل گیا ہے

[۱] **حل لغات**:- بَغِيٌّ کے معنے ہوتے ہیں جو تجاوز عن الاقتصاد کرے۔ یہ تجاوز اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ انسان عدل سے احسان کی طرف جائے گا تو اچھا ہوگا۔ اور حق سے باطل کی طرف تجاوز کرے گا تو بُرا ہوگا اور بَغَتِ الْمَرْاَةُ کے معنے ہوتے ہیں فَجَرَتْ اُس نے بدکاری کی لِتَجَاوُزِهَا اِلٰى مَا لَيْسَ لَهَا۔ کیونکہ جو حق تھا اس سے وہ آگے نکل گئی۔ (مفردات)

تفسیر:- حضرت مریم بھی زکریا کی طرح تعجب کا اظہار کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ میرے ہاں بچہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

اس جگہ غُلٰمٌ سے مراد بچہ ہی ہے بڑی عمر کا انسان مراد نہیں۔ یوں تو بڑی عمر کا آدمی بھی عربی زبان کے لحاظ سے غلام کہلاتا ہے۔ لیکن یہ چونکہ مریم کا کلام ہے اور اُن کیلئے حیرت کی بات بچہ پیدا ہونا ہی تھا اس لئے اس جگہ غلام کے معنے بچہ ہی کے لئے جائیں گے۔ بہر حال حضرت مریم کو تعجب پیدا ہوا کہ میرے ہاں کس طرح بچہ پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مجھے نہ تو کسی مرد نے چھوا ہے اور نہ میں باغیہ ہوں۔

اگر حضرت مریم کے اس استعجاب کو ظاہری حالات پر محمول کیا جائے اور خواب میں بھی اُن کے وہی حواس سمجھے جائیں جو جاگتے ہوئے ہوتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ چونکہ ظاہر میں ایسی بات ناممکن ہوتی ہے اس لئے رؤیا میں بھی انہوں نے وہی بات کہہ دی جو ظاہر میں کہی جاتی ہے۔ خواب میں دونوں قسم کی

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ

(فرشتہ نے) کہا (بات) اسی طرح (ہی) ہے جس طرح تو نے کہی (مگر) تیرے رب نے یہ کہا ہے کہ یہ (کام) مجھ پر آسان ہے اور (ہم اسلئے یہ لڑکا پیدا کرینگے)

کیفیات انسان پر وارد ہوتی ہیں۔ کبھی صرف نظارہ اور کلام تاثیر رویاء کے نیچے ہوتا ہے دلی جذبات تاثیر رویاء کے نیچے نہیں ہوتے۔ کبھی انسان دیکھتا ہے کہ بیٹا مارا گیا ہے اور وہ بڑا خوش ہے۔ حالانکہ بیٹے کے مرنے پر انسان کو خوشی نہیں ہو سکتی وہ ضرور روتا اور غمزدہ ہوتا ہے۔ پس جب رؤیاء میں وہ بیٹے کے مرنے پر خوش ہوتا ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ رویاء میں اس کے جذبات بھی تاثیر رویاء کے نیچے تھے۔ ورنہ بیٹے کے مارے جانے پر اُسے رونا چاہیئے تھا۔ اگر وہ خوش ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ اُس کے قلب کی کیفیت بھی رؤیا کے ماتحت تھی۔ لیکن بعض دفعہ دیکھے گا کہ بیٹا مارا گیا ہے اور میں رو رہا ہوں۔ اب جہاں تک بیٹے کے مارے جانے کا سوال ہے۔ اس کی تعبیر تو یہ ہوگی کہ اس کا بیٹا نیک ہوگا اور دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے گا اور اس تعبیر پر اُسے خوش ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ اس نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے اس سے ہم یہ کہیں گے کہ اس کا رونا رویاء کی تعبیر کے نیچے نہ تھا بلکہ ظاہری کیفیات کے تابع تھا۔ غرض کبھی تاثیر تعبیر رویاء کے نظارہ کے ماتحت ہوتی ہے اور کبھی رویاء کے نظارہ کے ماتحت نہیں ہوتی۔ ایک شخص خواب میں گنّا دیکھتا ہے اور بڑا خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ گنّے کی تعبیر غم ہے پس خواب میں اُس کا خوش ہونا بتاتا ہے کہ اُس وقت تعبیر اُس پر اثر نہیں کر رہی تھی بلکہ ظاہری حالات اثر کر رہے تھے۔ چونکہ ظاہر میں انسان گنّا ملنے پر خوش ہوتا ہے اس لئے خواب میں بھی وہ خوش ہو گیا۔ اور اگر وہ گنّا ملنے پر رو رہا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اُس وقت اس کے دل کی کیفیت بھی رویاء کی تعبیر کے نیچے تھی۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو صرف علمِ تعبیر الرویاء جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں دوسرے لوگ نہیں۔ پس اگر اس قول کو حضرت مریم کی تعبیر ظاہری مراد لی جائے تو اس سے صرف اتنا نکلے گا کہ چونکہ ظاہر میں ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے جب اس نے یہ بات کہی تو حضرت مریم نے کہا۔ ہائے ہائے تم کیسی باتیں کر رہے ہو کبھی مردوں کے بغیر بھی بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور اگر یہ الفاظ بھی تاثیر رویاء کے ماتحت سمجھے جائیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ چونکہ اُن کو بلا مرد کے ایک بچہ کی ولادت کی خبر دی جا رہی تھی اس لئے وہ حیرت ظاہر کر رہی ہیں کہ کیا خدا مجھ سے یہ سلوک کریگا۔

بہرحال اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ حضرت مریم نے یہی سمجھا تھا۔ کہ بغیر شادی کے اور شادی سے پہلے اولاد ہوگی۔ کیونکہ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بتاتا ہے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اولاد اس رویاء کے دن کے بعد شادی سے پہلے ہوگی ورنہ ماضی کے ذکر کی نفی کے معنے کیا ہوئے

دوسرے لَمْ اَكُ بَغِيًّا بھی یہی بتاتا ہے۔

پہلا حصہ جائز تعلق کی نفی کرتا ہے اور دوسرا ناجائز تعلق کی۔ آئندہ شادی کے ہونے یا نہ ہونے کا وہ ذکر تک نہیں کرتیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے اُس وقت یہ سوال نہیں تھا کہ مجھے وقف کیا ہوا ہے۔ اس لئے میرے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی بلکہ اُس وقت اُن کے سامنے اپنی ماضی کی حالت تھی جس میں اولاد ناممکن تھی۔ اگر آئندہ تعلقات کے نتیجہ میں وہ اولاد کا

اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَۃً مِّنَّا ۚ وَکَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا ﴿۲۲﴾

تاکہ اسے لوگوں کیلئے ایک نشان بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت (کا موجب بھی) بنائیں اور یہ (امر) ہماری تقدیر میں طے ہو چکا ہے ۲۲ ؎

وعدہ سمجھتیں تو وہ یا تو یہ کہتیں کہ میری تو شادی نہیں ہو سکتی پھر اولاد کیسی اور یا پھر شادی کا احتمال تھا تو وہ اس وعدہ پر تعجب نہ کرتیں۔

مَقۡضِیًّا

۲۲ ؎ حل لغات:۔ مَقۡضِیًّا۔ عربی زبان میں قضاء اور قدر دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مگر عام طور پر لوگ اِن دونوں لفظوں کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً یہ ہم معنے نہیں۔ مفردات میں لکھا ہے اَلۡقَضَاءُ فَصۡلُ الۡاَمۡرِ قَوۡلًا کَانَ ذٰلِکَ اَوۡ فِعۡلًا۔ قضاء کسی امر کے فیصلہ کرنے کا نام ہے خواہ وہ قولاً ہو یا فعلاً ہو وَ کُلٌّ وَاحِدٍ مِنۡھُمَا عَلٰی وَجۡھَیۡنِ اِلٰھِیٌّ وَبَشَرِیٌّ اور یہ قضاء الٰہی بھی ہوتی ہے اور بشری بھی۔ یعنی کبھی خدا کے متعلق قضاء کا لفظ استعمال ہو جاتا ہے اور کبھی بشر کے متعلق قضاء کا لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ وَالۡقَضَاءُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی اَخَصُّ مِنَ الۡقَدَرِ لِاَنَّہُ الۡفَصۡلُ بَیۡنَ التَّقۡدِیۡرِ فَالۡقَدَرُ ھُوَ التَّقۡدِیۡرُ وَالۡقَضَاءُ ھُوَ الۡفَصۡلُ وَالۡقَطۡعُ یعنی جب قضاء الٰہی کا ذکر کیا جائے تو وہ قدر سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ قدر صرف ایک معیار یا سکیم کے تجویز کرنے کو کہتے ہیں۔ اور قضاء کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس سکیم کے جاری کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے اور وہاں طاعون پڑ گئی۔ جو طاعونِ عمواس کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابو عبیدہؓ اور اسلامی لشکر نے آپ کا استقبال کیا تو اُس وقت صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ چونکہ اس وقت علاقہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے اس لئے آپ کو واپس تشریف لے جانا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے اُن کے مشورہ کو قبول کر کے فیصلہ کر لیا کہ آپ واپس لوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوعبیدہؓ ظاہر پر بڑا اصرار کرنے والے تھے انہیں جب اس فیصلہ کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اَ تَفِرُّ مِنَ الۡقَضَاءِ کیا آپ قضاء الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا اَفِرُّ مِنۡ قَضَاءِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ میں اللہ تعالیٰ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگ رہا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فیصلہ ہے اور ایک عام فیصلہ۔ یہ دونوں فیصلے اُسی کے ہیں کسی اَور کے نہیں۔ پس میں اس کے فیصلہ سے بھاگ نہیں رہا بلکہ اس کے ایک فیصلہ سے اس کے دوسرے فیصلہ کی طرف جا رہا ہوں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب طاعون کی خبر ملی اور آپ نے مشورہ کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ شام میں تو پہلے بھی طاعون پڑا کرتی ہے پھر لوگ ایسے موقعہ پر کیا کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ جب طاعون پھیلتی ہے تو لوگ بھاگ کر اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں اور طاعون کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی مشورہ کی طرف آپ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ایک عام قانون بھی بنایا ہوا ہے کہ جو شخص طاعون کے مقام سے بھاگ کر اِدھر اُدھر کھلی ہوا میں چلا جائے وہ بچ جاتا ہے۔ پس جبکہ یہ قانون بھی خدا تعالیٰ کا ہی بنایا ہوا ہے۔ تو میں اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ بلکہ اس کی قضاء سے قدر کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ یعنی خدا تعالیٰ کے خاص قانون کے مقابلہ میں اس کے عام قانون کی طرف جا رہا ہوں۔ پس تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں بھاگ رہا ہوں میں صرف ایک قانون سے

اُس کے دوسرے قانون کی طرف جا رہا ہوں۔ پس حضرت عمرؓ نے بھی قضاء اور قدر میں فرق کیا ہے اور مفردات والے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اس قول کا مفہوم یہی تھا۔ کہ اِنَّ الْقَدَرَ مَا لَمْ يَكُنْ قَضَاءً فَمَرْجُوٌّ اَنْ يَدْفَعَهُ اللّٰهُ یعنی جب تک قدر قضاء کا رنگ اختیار نہ کرے اُس وقت تک امید ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے ٹلا دے۔ گویا آپ نے بتایا کہ چونکہ میں ابھی اس ملک میں داخل نہیں ہوا اور خدا تعالیٰ نے ایک دوسرا قانون بھی بنایا ہوا ہے کہ جو لوگ طاعون زدہ مقام سے اِدھر اُدھر بھاگ جاتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں۔ اس لئے میں اُسی کے ایک دوسرے قانون سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ فَاِذَا قَضٰى فَلَا مَدْفَعَ لَهٗ لیکن جب وہ فیصلہ کر دے تو پھر اُس کے فیصلہ سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

تفسیر:۔ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے یہ معنے نہیں کہ اور لوگوں کے لئے تو یہ بات مشکل ہے اور میرے لئے آسان ہے۔ کیونکہ انسان کے لئے تو یہ چیز قطعی طور پر ناممکن ہے۔ یہاں صرف خدا تعالیٰ کے پہلو کو ہی مدّنظر رکھا گیا ہے متقابل بیان مدنظر نہیں اور مراد یہ ہے کہ جب میں کسی کام کا ارادہ کر لوں تو میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔

وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا

اس جگہ لام لام عاقبت ہے یعنی ہم ضرور ایسا کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہماری ایک آیت ہو جائے گا اور لوگوں کے لئے رحمت بن جائے گا۔ یعنی ہمارے اس فعل کے نتیجہ میں وہ لوگوں کے لئے ایک نشان بن جائے گا اور ہمارے اس فعل کے نتیجہ میں وہ لوگوں کیلئے رحمت بن جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ ہم جو اُسے بغیر باپ کے پیدا کریں گے تو یہ نشان ہوگا اس بات کا کہ اب بھی نُور اب ہم بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کرنے والے ہیں۔ وَرَحْمَةً مِّنَّا اور پھر اس کے ساتھ ہی ہم اُسے لوگوں کے لئے رحمت بنا دیں گے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مسیح لوگوں کے لئے رحمت کس طرح بنا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مسیح کے ظہور کے بعد اُس کی تعلیم سے یہود کی خشونت اور اُن کی درشتی میں جو کمی آنے والی تھی اُس کا رَحْمَةً مِّنَّا میں ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے یہود کی خشونت کو دُور کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ دنیا کو محبت اور پیار کی تعلیم دے گا اور رحم پر اپنا سارا زور صرف کرے گا۔ پس وہ لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ کی رحمت کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف نعمت نبوت منتقل ہونے کے نتیجہ میں ہی نبی آخر الزمان نے پیدا ہونا تھا پس چونکہ وہ ذریعہ بننے والا تھا رحمۃ للعالمین کے ظہور کا اور وہ رحمت کی تعلیم کا راستہ صاف کرنے والا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اُسے اپنی رحمت کے ماتحت نازل کیا ہے یعنی ہم نے اُس کو ذریعہ بنایا ہے اُس عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے کا جس کے نتیجہ میں نبی آخر الزمان نے پیدا ہونا ہے۔ گویا مسیح ایک کنجی تھا اس دروازہ کی جس کے کھلنے پر خدا تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت نے دنیا پر نازل ہونا تھا۔

یہ قرآن کریم کا کتنا بڑا کمال ہے کہ مسیح سردار تو عیسائیوں کے ہیں لیکن انجیل میں جہاں مسیح کی پیدائش کی پیشگوئی ہے وہاں یہ ذکر تک نہیں کیا گیا کہ مسیح دنیا کو محبت کی تعلیم دے گا۔ مگر قرآن مجید نے اُس کی پیدائش کی پیشگوئی میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اس کی پیدائش سے پہلے مریم کو بتادیا تھا کہ وہ محبت
کی تعلیم دے گا۔ یہ مضمون قرآن کریم کے انصاف
اور کمال پر دلالت کرتا ہے اور انجیل کے ناقص ہونے
کی دلیل ہے۔ مسیح کا سب سے بڑا کمال اس کی رحم کی
تعلیم تھی۔ مگر انجیل نے اس کی پیدائش کی پیشگوئی میں
اس کا ذکر تک نہیں کیا ہاں قرآن نے کیا ہے جو اس
کے کامل اور سچا ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تمام انبیاء اپنے
اپنے رنگ میں خدا تعالیٰ کی آیت ہوتے ہیں۔ مگر
عیسائیوں کی عادت ہے کہ وہ بعض الفاظ سے ناجائز
فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ
وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا حضرت مسیح کی
اہمیت پر دلالت کرتے ہیں اور ہم بھی اُن کی اہمیت کو
تسلیم کرتے ہیں۔ مگر عیسائی اس قسم کے الفاظ کو انہیں
غیر معمولی اہمیت دے دیتے ہیں ہمارا اُن سے یہ اختلاف
نہیں کہ ہم مسیح کو نعوذ باللہ ادنیٰ درجہ کا نبی سمجھتے ہیں
ہم بھی مسیح کو خدا تعالیٰ کا نبی اور رسول سمجھتے ہیں مگر
ہم یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں کوئی ایسی فوقیت حاصل تھی
جو دوسرے نبیوں کو حاصل نہیں تھی یا اُن میں رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ کمالات پائے جاتے تھے
بہرحال اس آیت میں حضرت مسیح کے متعلق جو آیت کا لفظ
آیا ہے۔ عیسائی اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انہیں
قرآن نے غیر معمولی اہمیت دی ہے مگر یہ درست نہیں۔
قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اس نے آیت کا لفظ
اور لوگوں کے متعلق بھی استعمال کیا ہے چنانچہ ایک
نبی کے متعلق آتا ہے وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ
(بقرہ ع۳۵) اس جگہ پہلے ایک نبی کی رؤیا بیان کی گئی
ہے اور پھر اس رؤیا کو بیان کر کے کہا گیا ہے کہ
اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تجھے لوگوں کیلئے آیت بنادینگے

یہ حزقیل نبی تھے جو موسیٰؑ اور داؤدؑ سے درجہ میں
چھوٹے تھے۔

پھر نبی تو الگ رہے اُونٹنی تک کو آیت کہا
گیا ہے۔ چنانچہ اعراف ع۱۰ میں آتا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ
اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً۔ یہ خدا کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے
آیت ہے۔ اگر اونٹنی آیت ہو سکتی ہے تو مسیح کے آیت
ہونے میں اس کی کونسی فضیلت رہی

پھر فرعون کے متعلق فرماتا ہے۔ فَالْيَوْمَ
نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ
اٰيَةً (یونس ع۹) ہم آج تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تو
اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک آیت بن جائے۔
گویا قرآن کریم میں مسیح کے علاوہ دوسرے رسولوں کو بھی
آیت کہا گیا ہے۔ جانوروں کو بھی آیت کہا گیا ہے بلکہ
ایک دشمن خدا اور کافر فرعون کو بھی آیت کہا گیا ہے۔
پس آیت کے اتنے ہی معنے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے
خدا تعالیٰ کی صداقت نظر آجاتی ہے۔ یہ معنے نہیں کہ
اُسے دوسروں سے کوئی بڑا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح یہ جو فرمایا کہ رَحْمَةً مِّنَّا۔ یہ بھی
کوئی خاص فضیلت کی بات نہیں۔ حضرت یحییٰ کے متعلق
اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا اور
حنان کا لفظ عربی زبان میں رحمت کے معنوں میں ہی
استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لغت والے لکھتے ہیں کہ
حنان اس اظہار محبت کو کہتے ہیں جس میں آواز ہو۔
جیسے ماں کو بعض دفعہ جوش آتا ہے تو وہ اپنے بچہ کو
پچکارنے لگ جاتی ہے اور زبان سے بھی محبت اور پیار
کے الفاظ دہراتی ہے۔ پس محبت کے کمال پر جبکہ زبان
سے بھی محبت کا اظہار ہونے لگے حنان کا لفظ استعمال
ہوتا ہے اور یہ محبت بغیر رحمت کے نہیں ہو سکتی جب
بھی اس قسم کا اظہار ہوگا پہلے رحمت آئے گی۔

پس حنان کا لفظ بھی رحمت کے مترادف ہے اور یہ حضرت یحییٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے کہ ہم نے اُسے حنان دی اور اُس میں رحمت پیدا کر دی۔ بلکہ مزید بات یہ ہے کہ یحییٰ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اُسے حنان یا رحمت اپنے پاس سے بخشی۔ لیکن مسیح کے لئے یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے اُسے رحمت بخشی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اُسے لوگوں پر رحمت کر کے اُتارا۔ گویا رحمت خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہے نہ کہ مسیح کی طرف۔ پس یحییٰ ایک مجسم رحمت تھے اور عیسیٰؑ صرف لوگوں کے لئے رحمت کا نشان بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ مجسم رحمت بڑی چیز ہے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت نہ صرف یہ کہا گیا کہ آپ رحمت تھے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ آپ رحمۃ للعالمین تھے فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ع ۷) اے ہمارے رسول ہم نے تجھے تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے گویا حضرت عیسیٰؑ کو رحمت بھی نہیں کہا صرف رحمت کا نشان کہا۔ حضرت یحییٰ کو رحمت کہا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ ہم نے اُن کو رحمت ہی نہیں بنایا بلکہ ایسی رحمت بنایا ہے جو مختص القوم اور مختص الزمان نہیں بلکہ سارے جہان کے لئے اور قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے ہے۔

گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو۔

(۱) ایک تو رحمت بنایا گیا نہ کہ صرف لوگوں پر رحمت کر کے بھجوایا گیا

(۲) دوسرے رحمت بھی مختص القوم و مختص الزمان نہیں بنایا گیا بلکہ رحمت للعالمین بنایا گیا۔

یہاں ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں آپ کو سارے جہان کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے کیونکہ مریم کی نسبت بھی تو کہا گیا ہے کہ اُسے عالمین کی عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ع ۵) مگر آپ لوگ وہاں نساء العالمین کے یہ معنے کرتے ہیں کہ مریم کو اپنی قوم کی عورتوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اگر وہاں عالمین سے صرف قوم کی عورتیں مراد ہو سکتی ہیں تو یہاں بھی یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں آپ کو اپنی قوم کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے نہ کہ سارے جہان کے لئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ الفاظ محدود معنے بھی رکھتے ہیں اور غیر محدود بھی۔ یہ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ کسی لفظ کے معنے محدود ہیں یا غیر محدود۔ سورۂ انبیاء میں غیر عرب قوموں کا ذکر کر کے اس فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً بنی اسرائیل کا ذکر کر کے۔ کیونکہ پہلے بتایا ہے اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ اور پھر یہ آیت آتی ہے۔ پس اس جگہ بنو اسرائیل کو شامل کر کے تمام انسانوں پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ وعدہ بہرحال وسیع ہے۔ اگر غیر قوموں کا ذکر نہ ہوتا تو تمہارا حق تھا کہ تم کہتے کہ جس طرح وہاں تمہارے نزدیک صرف بنی اسرائیل کی عورتوں پر مریم کی فضیلت کا ذکر ہے اسی طرح یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زمانہ کے عربوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مگر یہاں عربوں کا ذکر نہیں بلکہ غیر قوموں کا ذکر ہے۔ اور بنی اسرائیل کی نعمتیں اُن سے چھین کر مسلمانوں کو دئے جانے کا بیان ہے۔ پس سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ رحمۃ للعالمین میں غیر قومیں بھی شامل ہیں۔ لیکن مریم والا وعدہ صرف اپنی قوم کی عورتوں کے متعلق ہے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختص القوم و الزمان

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۳﴾

اس پر مریم نے (اپنے پیٹ میں) اُس (بچہ) کو اٹھالیا اور پھر اس کو لے کر ایک دور مکان کی طرف چلی گئی ۱۹ؔ

ہونے کے معنے نہیں لئے جاسکتے کیونکہ وہاں ایک غیر قوم کا ذکر ہے۔ ایسی قوم کا جو اپنے آپ کو ساری دنیا پر افضل سمجھتی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسکی نعمتیں چھین کر مسلمانوں کو دینے کا وعدہ کرتا ہے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا رحمت ہونا صرف قبائل عرب کے لئے نہیں بلکہ سب اقوام عالم کے لئے ہے۔

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ چونکہ پہلے خدا تعالیٰ نے یہ کہا تھا کہ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ یعنی خدا اگر کسی کو بغیر باپ کے پیدا کرنا چاہے تو اُس کے لئے یہ کوئی مشکل امر نہیں اس لئے اب یہ بتاتا ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کی قضاء تھی کہ مریم کے ہاں ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو بغیر باپ کے ہوگا اور اس طرح بنی اسرائیل سے سلسلۂ نبوت کا انقطاع ہوکر بنی اسمٰعیل میں منتقل ہو جائیگا۔ یہ وہ تقدیر نہیں تھی جو ٹل جاتی بلکہ خدا تعالےٰ کی طرف سے اس کے متعلق احکام جاری ہوچکے تھے۔

۱۹ؔ تفسیر:۔ حضرت مریم کس طرح حاملہ ہوئیں یہ ایک الٰہی راز ہے۔ جو قانونِ قدرت سے بالا ہے یا اگر قانونِ قدرت میں ہی شامل ہے تو یہ ایک ایسا حصہ ہے جس کا ابھی انسان کو علم نہیں ہوسکا۔ قانونِ قدرت کے بھی کئی راز ایسے ہیں جن کا ابھی انسان کو پتہ نہیں لگا جیسے ایٹم بم کا اس سے پہلے نسلِ انسانی کو کوئی علم نہیں تھا لیکن اب اس کا انکشاف ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کئی راز ایسے ہیں جن کو ابھی دنیا دریافت نہیں کرسکی اُنہی اسرار میں سے ایک بن باپ ولادت بھی ہے۔ بہرحال وہ خدا جس نے کُن سے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ وہ مادہ میں بھی نئے تغیر پیدا کرسکتا ہے لیکن اس کے علاوہ تاریخ میں ہمیں بعض ایسی شہادتیں بھی نظر آتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور بچے بھی بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً منچو خاندان جو چین پر حکمران تھا اور جو [illegible] یا [illegible] میں آکر تباہ ہوا اس کی بنیاد بھی اسی طرح پڑی کہ اس خاندان کی ایک پڑدادی بغیر نکاح کے حاملہ ہوگئی۔ لوگوں نے بڑا شور مچایا مگر اس نے کہا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ کسی گڈریا کی بیٹی تھی اُس نے کہا میں ایک دن اپنے جانور چرا رہی تھی کہ ایک فرشتہ نازل ہوا اور اس نے کہا کہ میں تجھ پر خدا کا نور ڈالتا ہوں تیرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس لڑکے کا لڑکا سارے چین کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ مجھے حمل ہوگیا ہے پس اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

لوگوں نے یہ بات سنی تو انہوں نے کہا یہ عورت ایک آئندہ کی خبر بتا رہی ہے انتظار کرو کہ کیا ہوتا ہے چنانچہ نو ماہ کے بعد اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس عورت کی پہلی بات تو سچی ہوگئی اب اگلی خبر کا انتظار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لڑکا جوان ہوا اور اٹھارہ بیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی۔ پھر جلدی ہی اس کے ہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہوگیا۔ وہ لڑکا پندرہ سولہ برس کا تھا کہ ملک میں فساد ہوگیا۔ چونکہ وہ بہادر تھا۔ اُس نے نوجوانوں کو اپنے ساتھ ملایا اور حملہ کرکے اردگرد کے دیہات پر قابض ہوگیا۔ اس کامیابی سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے آگے قدم بڑھایا۔ پھر وہاں کامیابی ہوئی تو اور آگے بڑھا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ چین کا بادشاہ بن گیا۔ اس واقعہ نے ثابت کردیا کہ ہو بہو

اُس عورت نے کہا تھا درست تھا۔ اور اُسے خدا نے ہی یہ خبر دی تھی۔ اِسی طرح چنگیز خاں جو ترکوں کی دوسری نسل کا سردار ہے اس کے متعلق بھی ایسا ہی واقعہ ہُوا۔ ترکوں کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ برلاس ہے جس میں سے ہم ہیں اور دوسری شاخ وہ ہے جس میں چنگیز خان۔ باتو خان اور جتلائی خان وغیرہ مشہور لوگ گذرے ہیں۔ چنگیز خاں کا باپ جب مر گیا اور اس کی ماں بیوہ ہو گئی۔ تو ملک کے رواج کے لحاظ سے اُسکی ماں ہی بادشاہ تسلیم کی گئی۔ ایک دن اس کی ماں نے درباریوں کو بلایا اور کہا کہ مجھے حمل ہو گیا ہے درباریوں نے شور مچایا کہ ہم تجھے قتل کر دیں گے۔ اُس نے کہا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک نور آیا ہے اور وہ میرے آر پار ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بتایا گیا کہ تیرے ہاں ایک لڑکا ہو گا جو دنیا کا بادشاہ ہو گا۔ چنانچہ اس کے بعد جب میں بیدار ہوئی تو مجھے حمل ہو چکا تھا انہوں نے یہ سُنکر صبر کر لیا اور فیصلہ کیا کہ ہمیں اس خبر کے پورا ہونے کا انتظار کرنا چاہئے چنانچہ اسی حمل سے چنگیز خاں پیدا ہُوا جس سے ساری دنیا میں بڑی بھاری تباہی آئی۔ اور وہ دنیا کا بادشاہ بنا۔

اِسی طرح اور بہت سے واقعات انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس قسم کے جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں اُن کے پیدا ہونے سے پہلے عورتوں کو کوئی نہ کوئی خواب بھی آئی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اُن پر الزام نہیں لگا سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ بولا۔ پس مسیحؑ کی بن باپ ولادت کوئی قابلِ تعجب نہیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی پیدائش کے علاوہ اس قسم کے اور بھی کئی واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں۔

فَحَمَلَتْهُ سے مراد وہی حمل ہے جو اس رویاء کے نتیجہ میں ہُوا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی بات تسلیم کی ہے۔ چنانچہ "مواھب الرحمٰن" میں آپ نے صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ بات ہمارے عقائد میں داخل ہے کہ مسیح بن باپ پیدا ہوئے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے لئے سوائے اِن دو صورتوں کے اور کوئی صورت ہی نہیں کہ یا تو ہم یہ کہیں کہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت پیدا ہوئے تھے اور یا یہ کہیں کہ اُن کی ولادت ناجائز تھی۔ غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا عقیدہ یہی بیان فرمایا ہے کہ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور یہی ہمارا عقیدہ ہے۔ میں نے زیادہ زور اس پر اس لئے دیا ہے کہ مولوی محمد علی صاحب امیر غیر مبایعین نے لکھا ہے کہ مسیح کا باپ تھا اور اُس کا نام یوسف تھا حالانکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انجیل کے رُو سے بھی یوسف نے اُس وقت تک مریم کے ساتھ تعلقات نہیں رکھے جب تک کہ مسیح پیدا نہیں ہو گئے۔

فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل کے ایام میں ایک وقت حضرت مریم پر ایسا بھی آیا جب انہیں کہیں دور جانا پڑا۔ اس کے متعلق جب ہم بائبل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں سے کچھ تفصیل ملتی ہے۔ وہ تفصیل یقیناً ایسی ہے کہ اگر اُس میں غلط بیانی کی کوئی وجہ ثابت نہ ہو تو اُسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

لوقا باب ۲ میں لکھا ہے کہ

"اُن دنوں میں ایسا ہُوا کہ قیصر اگسطس کی طرف سے یہ حکم جاری ہُوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورینس کے عہد میں ہوئی اور

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ

پس (جب وہ وہاں پہنچی) تو اُسے دردِ زہ (اُٹھی اور اُسے) مجبور کرکے ایک کھجور کے تنہ کی طرف لے گئی (جب مریم کو یقین ہو گیا کہ اَب

یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ﴿۲۴﴾

بچہ ہونیوالا ہی) تو اس نے (دنیا کی انگشت نمائی کا خیال کرکے) کہا اے کاش میں اِس سے پہلے مرجاتی اور میری یاد مٹادی جاتی ۔ ۲۵

سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے۔ پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے۔ اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا تاکہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے۔"

(انجیل لوقا باب ۲ آیت ۱ تا ۴)

انجیل کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ چونکہ قیصر اگسطس نے حکم دیا تھا کہ تمام شہروں اور گاؤں کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ اس لئے یوسف بھی جو حضرت مریم کے شوہر تھے ناصرہ سے بیت لحم گئے۔ کیونکہ وہ داؤد کی نسل میں سے تھے۔ اور بیت لحم اُس وقت قبیلہ داؤد کا ایک بڑا شہر تھا۔ اس سفر میں حضرت مریم بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ مگر آگے لکھا ہے کہ چونکہ بیت لحم میں بہت سے لوگ اپنے نام لکھوانے کے لئے آئے ہوئے تھے اس لئے انہیں سرائے میں جگہ نہ ملی اور وہ کہیں باہر ٹھہرے۔ وہیں حضرت مریم کو دردِ زہ شروع ہوا اور بچہ پیدا ہو گیا۔ (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۷)

بیت لحم یروشلم سے جنوب کی طرف پانچ میل کے فاصلہ پر ہے اور بہت زرخیز علاقہ ہے۔ ناصرہ سے بھی بیت لحم جنوب کی طرف ہے اور قریباً ستر میل دُور ہے۔ پس مَكَانًا قَصِيًّا میں اسی سفر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا انجیل میں ذکر آتا ہے۔ کہ وہ ناصرہ سے بیت لحم گئیں۔

۲۵ حل لغات:- مَخَاضٌ کے معنے شدت کے ساتھ دردِ زہ ہونے کے بھی ہیں اور مَخَاضٌ پیدائش کے وقت کے قریب آجانے کو بھی کہتے ہیں۔ اِس وقت کے قریب آجانے کی بڑی علامت بھی دردِ زہ ہی ہوا کرتی ہے۔

جِذْعٌ تنے کو بھی کہتے ہیں اور بڑی شاخ کو بھی کہتے ہیں۔

تفسیر:- کھجور کے تنہ کی طرف انسان تبھی جاتا ہے جب وہ گھر میں نہ ہو۔ اور جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے بائبل میں یہ ذکر آتا ہے کہ انہیں سرائے میں جگہ نہ ملی اور چونکہ وہ میدان میں ڈیرہ ڈالے پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر کوئی کھجور کا درخت ہوگا جس کے نیچے وہ اُس وقت آگئیں۔

ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ وہ درد کا سہارا لینے کے لئے وہاں گئی تھیں۔ لیکن درد کا سہارا لینے کی وجہ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا میرے نزدیک عیسائی روایتوں سے ڈر کر بنائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر درخت سایہ بھی دیتا ہے اور سہارا بھی دیتا ہے اور یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں اُس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پھر انہوں نے سہارا کیوں کہا سایہ کیوں نہ کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی روایات سے مطابقت رکھنے کا خیال ہمارے مفسرین کے ذہنوں پر غالب رہا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ

پس (فرشتہ نے) اس کو نچلی جانب کیطرف سے پکار کر کہا کہ (اے عورت) غم نہ کر اللہ (تعالیٰ) نے تیری

رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۵﴾ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ

نچلی جانب ایک چشمہ بہا دیا ہوا ہے (اسکے پاس جا اور اپنی اور بچہ کی صفائی کر) اور (وہ) کھجور (جو تیرے قریب ہوگی اس) کی ٹہنی کو

النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۶﴾

پکڑ کر اپنی طرف ہلا - وہ تجھ پر تازہ بتازہ پھل پھینکے گی - ۵۲

اور انہوں نے سایہ کی بجائے سہارا لینے کا ذکر کر دیا - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درد میں سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ جب شدید دردِ زہ ہو رہا ہو تو اُس وقت ہوشیار عورتیں اپنا ہاتھ زچہ کو پکڑا دیتی ہیں اور اُسے کہتی ہیں کہ ہمارے ہاتھ کو زور سے دباؤ - وہ زور سے دباتی ہے تو اُسے درد میں ایک قسم کا سہارا مل جاتا ہے اور بچہ آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے - پس اتنی بات تو درست ہے کہ درد میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک اس آیت کے متعلق مفسرین کی یہ توجیہ درست نہیں -

قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا - بعض لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ چونکہ بچہ جو پیدا ہونیوالا تھا بغیر باپ کے تھا اس لئے وہ گھبرائیں اور انہوں نے کہا کہ ہائے اب میں کیا کرونگی اور لوگوں کو کیا جواب دونگی - لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ پہلا بچہ ہمیشہ اتنی تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے کہ عورت بے اختیار ہو کر کہتی ہے کہ ہائے میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی - میں نے اپنے خاندان میں اپنی بیویوں اور بچیوں کو بھی دیکھا ہے - اُن میں سے ہر ایک اپنے پہلے بچہ کی ولادت پر یہی کہتی تھی کہ ہائے میں اس سے پہلے مر جاتی - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ بھی اپنی ذات میں غیر معمولی تھا کہ ایک کنواری کے ہاں لڑکا پیدا ہوا - مگر عام طور پر پہلوٹھے بچوں کی پیدائش کی تکلیف پر لڑکیاں اسی طرح کہا کرتی ہیں - پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں - لیکن اس کے ساتھ ہی میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں مخفی طور پر اُس حدیث کی تردید کی طرف بھی اشارہ ہو جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اُسے چھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ رونے لگتا ہے لیکن مسیح جب پیدا ہوا تو شیطان نے اُسے نہیں چھوا - پیدائش پر بچہ اس لئے روتا ہے کہ راستہ تنگ ہوتا ہے اور وہ نہایت تکلیف کے ساتھ رحمِ مادر میں سے باہر آتا ہے - اُدھر عورت چیختی ہے کیونکہ اسکی ہڈیاں ٹوٹتی ہیں - پس اللہ تعالےٰ نے یہ بتا کر کہ حضرت مریم کو اچھی خاصی درد ہوئی اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ جب مریم کو اتنی درد ہوئی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ عیسیٰ کو بھی ضرور درد ہوئی ہوگی اور وہ بھی تکلیف سے چیخا چلّایا ہوگا -

۵۲ حل لغات :- تَحْت کے معنے نیچے کے بھی ہوتے ہیں اور نشیب کے بھی ہوتے ہیں کیونکہ نشیب بھی نیچے کی طرف ہوتا ہے - اگر تم کسی پہاڑ پر جا رہے ہو تو وہ جگہ بھی نیچے کہلائے گی جس طرف پہاڑی اُتر رہی ہو اور وہ جگہ جو تمہارے پاؤں کے نیچے ہوگی وہ بھی تحت کہلائیگی -

سَرِیًّا سَرِیًّا سَرِیٌّ سے ہے جس کے معنے چلنے والی چیز کے ہیں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ سَرِیًّا سَرْوٌ سے ہے جس کے معنے بلندیٔ شان اور عظمت کے ہیں۔

هُزِّیْ هُزِّیْ کے معنے زور سے ہلانے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر:۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ سے مفسرین کا ذہن پاؤں کے نیچے والے معنوں کی طرف چلا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ چونکہ نیچے تھے اس لئے انہوں نے یہ آواز دی۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت مسیح نہیں بلکہ فرشتہ ہے جس نے پاؤں کی طرف سے کلام کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جگہ مراد فرشتہ ہی ہے۔ مگر یہ بالکل احمقانہ خیال ہے کہ فرشتہ نے جسم کے نیچے سے بات کی تَحْتِهَا سے مراد نشیب ہے کیونکہ جس جگہ پر اُن کے ہاں بچہ پیدا ہوا اُس کے پاس نشیب تھا اور نشیب کے نیچے چشمہ تھا۔ بائبل کی روایت سے پتہ لگتا ہے کہ بچہ بیت لحم میں پیدا ہوا۔ اور بیت لحم ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جو سمندر سے ۲۳۵۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کے ارد گرد سبز وادیاں ہیں جو سارے یہودا سے زیادہ سرسبز ہیں۔ اس پہاڑی کے اندر دو تین چشمے ہیں جن کو چشمۂ سلیمان کہتے ہیں۔ اور یہیں سے شہر میں پانی لایا جاتا ہے گویا شہر میں پانی نہیں بلکہ تالاب سلیمان سے نالیوں کے ذریعہ پانی لایا جاتا ہے۔ مگر شہر سے جنوب مشرق کی طرف آٹھ سو گز یعنی نصف میل پر اور وہ بھی نیچے ڈھلوان کی طرف چشمہ ہے (قاموس کتاب المقدس ترجمہ و تالیف ڈاکٹر جارج ای پوسٹ ایم ڈی) پس فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ سے یہ مراد ہے کہ انہیں چشمہ کی طرف سے آواز آئی۔ انسان آواز سے بھی اندازہ لگا لیتا ہے کہ جگہ کہاں ہے مثلاً اگر ہمیں کوئی شخص بائیں طرف سے آواز دے تو ہم اُس آواز سے فوراً قیاس کر لیں گے کہ یہ آواز ہمیں بائیں طرف سے آئی ہے دائیں طرف سے نہیں آئی۔ پس حضرت مریم کو جگہ بتانے کے لئے کہ تمہیں کہاں سے پانی ملے گا فرشتہ نے اُس نشیب سے انہیں آواز دی اور اس طرح بتایا کہ پہاڑی کا جو نشیب ہے یہاں سے تمہیں پانی مل جائے گا۔ یہ مراد نہیں کہ وہ اُن کی کمر کے نیچے سے بولا۔ جغرافیہ سے بھی ثابت ہے کہ وہاں چشمے پائے جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بائبل بتاتی ہے حضرت مریم جب بیت لحم گئیں تو انہیں ٹھہرنے کے لئے شہر میں جگہ نہیں ملی۔ پس وہ شہر سے باہر جا کر رہیں۔ اور بائبل بتاتی ہے کہ وہ اُس جگہ رہیں جہاں گڈریے اپنے جانور چرایا کرتے تھے (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۸) اور گڈریے اپنے جانور ہمیشہ شہر سے کچھ فاصلہ پر چرایا کرتے ہیں اسی وجہ سے لکھا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اُسے کھلیان میں ڈالا۔ پس شہر اور چشموں کے درمیان کسی جگہ پر جا کر وہ ٹھہر گئیں۔ شاید انہیں یہ بھی خیال ہو کہ اگر میں شہر میں رہی تو لوگ شور ڈالیں گے کہ یہ کس کا بچہ ہے اس لئے بہتر ہے کہ شہر سے کچھ فاصلہ پر جا کر رہوں چنانچہ انہوں نے شہر سے کچھ فاصلہ پر ڈیرہ لگا دیا۔ جہاں سے پانی نزدیک تھا مگر بوجہ اجنبی جگہ ہونے کے انہیں اس کا علم نہیں تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے انہیں الہاماً بتا دیا کہ اس طرف چشمہ بہ رہا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مسیح کو اس ذریعہ سے حضرت اسمٰعیل سے مشابہت دی گئی ہو۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی جب مکہ میں چھوڑے گئے تو اُن کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے آواز دی تھی کہ جا ہم نے تیرے بیٹے کے پاؤں تلے سے چشمہ پھوڑ دیا ہے۔ بہرحال یہ خدا تعالیٰ کا ایک نشان تھا کہ اس نے حضرت مریم کی گھبراہٹ کے وقت انہیں بتا دیا کہ فلاں جگہ پانی ہے

وہاں سے تم اپنی ضرورت پوری کر لو۔

ہمارے مفسرین تَحْتَكِ سَرِيًّا کے یہ معنے کرتے ہیں کہ خدا نے تیرے نیچے ایک شاندار وجود بنایا ہے یعنی تیرا بچہ بڑی شان والا ہو گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ حضرت مسیح کی شان کی بلندی اور اُن کی عظمت کے اظہار کے لئے بولا گیا ہے۔ درحقیقت ہمارے مفسرین کو شوق ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے حضرت مسیح کی تعریف کرتے رہیں اور اُن کی شان کی بلندی کے قصے بیان کرتے پھریں۔ اُن کے پیدا ہونے کا ذکر ہو تو کہتے ہیں کہ تمام دنیا میں سے صرف وہی مَسِّ شیطان سے پاک تھے اور موت کا ذکر ہو تو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے۔ پس یہ معنے اُن کی اِسی دیرینہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ حالانکہ بات سیدھی تھی بچہ پیدا ہوا تو ماں کو اپنی اور بچے کی صفائی کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔ خیال تھا کہ کپڑے دھونے اور بچے کو نہلانے کے لئے پانی کہاں سے آئیگا فرشتے نے کہا کہ نیچے پانی موجود ہے وہاں سے اپنی ضرورت پوری کر لو۔ اور جغرافیہ سے ثابت ہے۔ کہ بیت لحم میں پہاڑی کے نیچے چشمے موجود ہیں۔

اب اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا یعنی کھا اور پی اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر۔ کھجور کا ذکر چونکہ پہلے آ چکا ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ کھجوریں کھا اور پانی پی اور تجھے یہ جو فکر تھا کہ میں گند کا کیا علاج کروں گی اُس کو اب دُور کر دے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ یہ اگلی عبارت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں سَرِيًّا کے معنے رفعت کے نہیں بلکہ چشمہ کے ہیں۔ پہاڑی کے نشیب میں چشمہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے کہا کہ کھجوریں کھا۔ پانی پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔

اب اس مقام پر ایک بہت بڑی مشکل پیش آجاتی ہے جس کو حل کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ عیسائی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش ۲۵ دسمبر کو ہوئی اور لوقا کہتا ہے کہ قیصر اگسطس نے اُس وقت مردم شماری کا حکم دیا تھا جس کے لئے یوسف اور مریم ناصرہ سے بیت لحم گئے اور وہیں حضرت مسیح کی پیدائش ہوئی۔ گویا ۲۵ دسمبر کو۔ اُس زمانہ میں جب کہ قیصر اگسطس کے حکم کے ماتحت یہود کی پہلی مردم شماری ہوئی مسیح بیت لحم میں پیدا ہوئے۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ مسیح اس موسم میں پیدا ہوئے جس میں کھجور پھل دیتی ہے اور کھجور کے زیادہ پھل دینے کا زمانہ دسمبر نہیں ہوتا بلکہ جولائی اگست ہوتا ہے۔ اور پھر جب ہم یہ دیکھیں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک چشمے کا بھی پتہ بتایا جہاں وہ اپنے بچے کو نہلا سکتی تھیں اور اپنی بھی صفائی کر سکتی تھیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جولائی اگست کا مہینہ تھا ورنہ سخت سردی کے موسم میں چشمہ کے پانی سے نہانا اور بچے کو بھی غسل دینا خصوصاً ایک پہاڑ پر اور عرب کے شمال میں عقل کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن عیسائی تاریخ یہی کہتی ہے کہ حضرت مسیح دسمبر میں پیدا ہوئے۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت مسیح کی پیدائش دسمبر میں ہوئی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن تو حضرت مریم سے کہتا ہے کہ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا۔ تو کھجور کے تنہ کو ہلا تجھ پر تازہ کھجوریں گریں گی۔ حالانکہ کھجور اُس وقت بہت کم ہوتی ہے۔ کھجور زیادہ تر جولائی اگست میں ہوتی ہے اور مسیح کی پیدائش دسمبر میں ہوئی پس اگر یہ درست ہے کہ مسیح دسمبر میں پیدا ہوئے تو سوال پیدا ہوتا ہے

کہ قرآن نے کھجور کا کیوں ذکر کیا جبکہ کھجور اُس موسم میں
ہوتی ہی نہیں۔ اس اعتراض سے ڈر کر ہمارے مفسرین
نے یہ لکھ دیا ہے کہ حضرت مریم کھجور کے تنے کے پاس درد کا
سہارا لینے گئی تھیں۔ انہیں خیال آیا کہ مسیح کی پیدائش
دسمبر میں بتائی جاتی ہے اور دسمبر میں کھجور کے درخت پر
بہت کم پھل لگتا ہے۔ پھر وہ کھجور کے سوکھے درخت کے
پاس کیوں گئی تھیں۔ اس کا جواب انہوں نے یہ سوچا کہ وہ
درد کا سہارا لینے گئی تھیں۔ مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ
ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ کھا اور یہ بھی کہا ہے
کہ کھجور کے تنے کو ہلا تو تجھ پر تازہ کھجوریں گرینگی صرف اس
وجہ سے کہ عیسائی بیان اُن کے سامنے تھا کہ مسیح دسمبر
میں پیدا ہوئے اور دسمبر میں کھجور کو بہت کم پھل لگتا ہے
انہوں نے یہ معنے کر لئے کہ وہ سہارا لینے کے لئے کھجور
کے سوکھے درخت کے پاس گئی تھیں لیکن بعض مفسروں
کو فَكُلِي اور تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا کا
بھی خیال آیا ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ایک معجزہ
تھا۔ حضرت مریم کھجور کے سوکھے درخت کو ہلاتیں تو تازہ
بتازہ کھجوریں گرنی شروع ہو جاتی تھیں۔

دوسری مشکل ہمارے سامنے یہ پیش آتی ہے کہ یہ واقعہ
یہودیہ میں ہوا ہے۔ قرآن اس موقعہ پر کھجور کا ذکر کرتا ہے اور
بائبل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں زیتون بادام اور انگور
ہوتا تھا کھجور کا ذکر نہیں آتا اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ دسمبر میں
بادام بھی نہیں ہوتا انگور بھی نہیں ہوتا اور زیتون بھی نہیں ہوتا
گویا قرآن صرف کھجور کا ذکر کرتا ہے مگر دسمبر میں کھجور بہت کم ہوتی ہے
اور تاریخ بائبل یہودیہ میں زیتون۔ بادام اور انگور کا تو ذکر کرتی
ہے لیکن کھجور کا ذکر نہیں کرتی۔ اور پھر یہ تینوں چیزیں بھی
دسمبر میں نہیں ہوتیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس علاقہ میں جہیں
انجیل حضرت مسیح کی پیدائش بتاتی ہے کھجور ہوتی تھی یا نہیں۔

اس کے متعلق جب ہم بائبل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں
معلوم ہوتا ہے کہ خود بائبل اس بات پر گواہ ہے کہ اُس
علاقہ میں کھجور ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے

"تب موسیٰ کے سسر قینی کی اولاد کھجوروں
کے شہر سے بنی یہوداہ کے ساتھ یہوداہ
کے بیابان کو جو عراد کے دکھن کی طرف
ہے چڑھیں" (قاضیوں باب ۱ آیت ۱۶)

عراد جس کا اس حوالہ میں ذکر آتا ہے بیت لحم سے
کوئی سو میل کے فاصلہ پر ہے اور چونکہ اس سے شمال کی
طرف کھجوروں کا شہر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت لحم
کے قریب قریب یقیناً کھجوریں پائی جاتی تھیں پھر یہودیہ
کا علاقہ جس میں بیت لحم ہے چونکہ عرب سے ملتا ہے اس لئے
بھی اُس میں کھجوروں کا پایا جانا بالکل قرین قیاس ہے لیکن
اس تحقیق سے إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ تک تو بات
ٹھیک ہو گئی۔ پتہ لگ گیا کہ اُس علاقہ میں کھجور پائی جاتی
تھی۔ لیکن یہ سوال ابھی حل نہیں ہوا کہ قرآن کہتا ہے
کہ مسیح جس موسم میں پیدا ہوئے اُس وقت کھجوریں
درخت پر لگی ہوئی تھیں اور کھجوریں بھی پختہ تھیں اور کھانے
کے قابل تھیں۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیح دسمبر
میں پیدا ہوئے جبکہ کھجوریں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس سے
لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک حضرت مسیح
کی پیدائش اس موسم میں ہوئی ہے جس میں کھجور لگی ہوئی
ہوتی ہے۔ مسیحی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح ۲۵ دسمبر کو
پیدا ہوا۔ بعض اس کا وقت اپریل بتاتی ہیں مگر دسمبر
یا اپریل میں کھجور درخت پر بہت کم ہوتی ہے۔ پس ہمیں
اس مسئلہ کی مزید تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔
میں نے کہا تھا کہ لوقا نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر
اُس میں غلط بیانی کی کوئی وجہ نہیں تو ٹھیک ہے لیکن
اب اس قرآنی آیت نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ کہ ہم

وہ وجہ تلاش کریں جس کی بنا پر ان دونوں باتوں کا آپس میں جوڑ نظر نہیں آتا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اب ہم پھر تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لوقا کو مردم شماری کے بارہ میں غلطی لگی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یوسف اور مریم مردم شماری کی غرض سے ناصرہ سے بیت لحم گئے۔ لیکن جب ہم روما کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ مسیح کی پیدائش کے سن میں کوئی مردم شماری ہوئی ہی نہیں۔ جوزیفس جو مسیح کے زمانہ کا سب سے بڑا مورخ ہے وہ لکھتا ہے کہ پہلی مردم شماری سنہ بعد مسیح میں ہوئی ہے سات سال پہلے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ اور وہ لکھتا ہے کہ یہود کے لئے اتنی نئی چیز تھی کہ وہ حیران ہوتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ اس مردم شماری کی غرض کیا ہے۔ اگر سات سال پہلے بھی مردم شماری ہو چکی ہوتی تو یہود اتنے حیران کیوں ہوتے؟ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہیروڈ (HEROD) کی وفات کے وقت کونسٹیلس وارس گورنر تھا لوقا کا بیان کردہ کورنیس (QUIRINIUS) نہیں تھا۔ بلکہ رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے گورنر سینٹی نس (SENTINIS) اور (TITNIS) تھے۔ اول الذکر ۹ قبل مسیح سے ۶ قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرے کا ذکر تاریخ میں ۱۰ قبل مسیح میں آتا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ کرانیکل) اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسیح کی پیدائش سے دس سال قبل سے لے کر ہیروڈ کی وفات تک کورنیس نام کا کوئی گورنر تھا ہی نہیں۔ پس جبکہ دس سال قبل مسیح سے بعد وفات ہیروڈ تک کے گورنروں کے نام ہمیں معلوم ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی لوقا کا بیان کردہ کورنیس نہ تھا اور جوزیفس کے بیان کے مطابق اُس وقت کوئی مردم شماری ہوئی ہی نہ تھی تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لوقا کے ذہن میں واقعات مشوش ہو گئے ہیں۔ یا تو اُس نے مردم شماری کا ذکر سُن کر جو کئی سال بعد ہوئی تھی، یہ سمجھ لیا کہ وہ پہلے ہوئی تھی اور یوسف اس کے لئے باہر گئے تھے اور پھر پیدائش کا واقعہ اُس نے ساتھ ملا لیا۔ اور یا پھر اُس نے جان بوجھ کر اُن واقعات کو بدلا۔ اور یہی حقیقت ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ کس طرح قرآنی بات سچی ثابت ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ حضرت مریم بغیر خاوند کے حاملہ ہوئیں۔ خاوند نے شور مچایا کہ یہ میرا حمل نہیں۔ ادھر خاوند کو خواب آ گئی کہ مریم کو اپنے گھر میں لے آ، کیونکہ وہ جو کچھ کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے۔ مگر جس کو خواب آ گئی اُس کی تو تسلی ہو گئی کہ میری بیوی بدکار نہیں۔ لیکن شہر والے تو نہیں مان سکتے تھے جو بھی سُنیگا وہ کہیگا کہ حرام کا ہے۔ اور کوئی خاوند یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کو بدکار کہا جائے۔ پس چونکہ لوگوں میں بدنامی کا ڈر تھا، اس لئے تین چار مہینے جب تک کہ حمل چھپ سکتا تھا وہ اپنے گھر میں رہے اور جب دیکھا کہ پیٹ بڑا ہو رہا ہے اور حمل اب چھپ نہیں سکتا تو ایک دور کے علاقہ میں چلے گئے اور وہاں جا کر بچہ پیدا ہوا۔ اب لوقا کیلئے اس بات کے اظہار میں کیا مشکل تھی لوقا کیلئے یہ مشکل تھی کہ وہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ مریم کو خواب میں فرشتہ ملا اور اُس نے بتایا کہ تو حاملہ ہوگی بلکہ وہ ساتھ ہی معجزے بھی بیان کرنے شروع کر دیتا ہے کہ ادھر مریم حاملہ ہوئیں اور اُدھر خداوند کے ظہور کی وجہ سے معجزے ظاہر ہونے لگ گئے۔ چنانچہ مریم حضرت زکریا کی بیوی سے ملنے گئیں تو وہ کہنے لگیں کہ "میرے خداوند کی ماں میرے پاس آئی ہے" اور پھر کہا کہ "دیکھو تیرے سلام کی آواز جونہی میرے کان تک

پہنچی لڑکا میرے پیٹ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔" (لوقا باب ۱ آیت ۴۴ و ۴۱) اور یہ ظاہر بات ہے کہ جب اس حمل کے ساتھ ہی معجزات ظاہر ہونے لگ گئے تھے تو حمل کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اِدھر واقعات بتا رہے تھے کہ یوسف اور مریم ایک لمبے عرصہ تک باہر رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یوسف کو خواب آ چکی تھی کہ میری بیوی کا کوئی قصور نہیں۔ مگر صرف یوسف کی خواب سے کیا بنتا تھا۔ سوال لوگوں میں بدنامی کا تھا پس یوسف نے یہ تدبیر کی کہ جب تک حمل چھپ سکتا تھا انہیں اپنے گھر میں رکھا اور جب دیکھا کہ اب حمل چھپ نہیں سکتا تو وہ اُنہیں کسی دور مقام پر لے گیا تاکہ لوگوں میں بدنامی نہ ہو اور بچہ کہیں باہر ہی پیدا ہو جائے۔ لیکن لوقا کی غرض یہ تھی کہ مسیح کی خدائی ثابت کرے اس لئے اُس نے حمل کے ساتھ ہی مسیح کے معجزے بیان کرنے شروع کر دئے کہ ابھی وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہی تھا کہ زکریا کی بیوی حضرت مریم کو دیکھ کر کہہ اُٹھیں کہ میرے خداوند کی ماں میرے پاس آئی ہے بلکہ زکریا کی بیوی تو الگ رہی۔ یوحنا جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں تھا وہ بھی خوشی سے اُچھل پڑا اور پیٹ میں ہلنے لگ گیا۔ پس لوقا نے یہ سمجھا۔ کہ اگر حمل کی وجہ سے مریم کا باہر جانا ثابت ہو تو یہ خیال کیا جائے گا کہ گویا مریم اور اُس کے خاوند یوسف اللہ تعالیٰ کے اس قدر نشانات اور معجزات کے باوجود لوگوں کے اعتراض کی ڈرتے تھے۔ لیکن اِدھر وہ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یوسف اور مریم باہر گئے۔ پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب یہ حمل معجزانہ تھا اور جب حمل کے ساتھ ہی مسیح کے معجزات بھی ظاہر ہونے لگ گئے تھے تو پھر اس حمل کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اور جب نہیں تھی تو پھر یوسف اور مریم باہر کیوں گئے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے وہ سات سال بعد کی مردم شماری کے واقعہ کو پہلے بیان کرتا ہے تاکہ یوسف اور مریم کے باہر جانے کی ایک قانونی وجہ نکل آئے اور لوگوں کو بتایا جا سکے کہ وہ حمل کو چھپانے کے لئے باہر نہیں گئے بلکہ اس لئے گئے تھے کہ قیصر نے مردم شماری کا حکم دیا تھا اور اُن کا بیت لحم میں جانا ضروری تھا پس رومی تاریخ کے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوقا نے پردہ ڈالا۔ درحقیقت یہ مردم شماری اُس وقت نہیں ہوئی محض پیدائش کو چھپانے کے لئے یہ سفر تھا نہ کہ مردم شماری کے لئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ یوسف خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حضرت مریم کو اپنے گھر تو لے آیا مگر دیکھا کہ اگر میں مریم کو اپنے گھر میں ہی رکھوں تو میری ناک کٹتی ہے۔ پس اُس نے یہ تدبیر کی کہ جب حمل چھپ نہیں سکتا تھا تو وہ انہیں اپنے ساتھ لیکر کسی بہانہ سے سفر پر چلا گیا۔ اب سیدھی بات ہے کہ اگر وہ بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد ہی اپنے شہر میں واپس آ جاتے تو اعتراض قائم رہتا۔ کہ مریم کو تمہارے گھر آئے تو ابھی پانچ ماہ ہی ہوئے تھے یہ بچہ کہاں سے پیدا ہو گیا اگر وہ ٹھیک نو ماہ کے بعد بھی واپس آتے اور کہتے کہ یہ جائز حمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے تو بچہ کی شکل سے لوگ پہچان جاتے کہ یہ نوزائیدہ بچہ ہے یا اس کی پیدائش پر چار یا پانچ ماہ گذر چکے ہیں۔ اس بات کو چھپانے کا صرف ایک ہی طریق تھا کہ وہ کئی سال باہر رہتے چنانچہ بڑی عمر کا بچہ لے آؤ تو پھر کچھ پتہ نہیں لگ سکتا کہ وہ کب پیدا ہوا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اُن کو کئی سال باہر رہنا پڑا۔ میں تو یا سمجھتا ہوں کہ وہ آٹھ نو سال باہر رہے اور پھر واپس آئے۔ بہرحال چونکہ یوسف حضرت مریم کو اپنے گھر لے آئے تھے لیکن گھر لانے سے پہلے چند ماہ کا حمل تھا۔

اس لئے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر وہ چند سال باہر رہتے تو اس پر پردہ پڑ جاتا اور یہ سمجھا جاتا کہ عیسیٰ شادی کے بعد جائز حمل سے پیدا ہوئے ہیں لیکن اگر اُسی وقت لے آتے تو راز فاش ہو جاتا۔ فرض کرو یوسف حضرت مریم کو اپریل میں اپنے گھر لایا تو لوگ حمل کا وقت اپریل سے شروع کریں گے اور اس طرح اُن کے نزدیک دسمبر میں بچہ پیدا ہو جانا چاہیئے۔ اگر وہ اگست ستمبر میں پیدا ہو جاتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ یہ حرام کا بچہ ہے۔ کیونکہ خاوند تو اسے اپریل میں اپنے گھر لایا تھا اور بچہ اگست ستمبر میں پیدا ہو گیا۔ اگر وہ بچہ کہیں باہر جنوا لیتا ہے اور واپس اُس وقت آتا ہے جب شادی پر نو مہینے گذر جاتے ہیں تب بھی ہر شخص جو بچے کو دیکھیگا کہیگا کہ یہ تو ایک مہینے کا ہے ہی نہیں۔ وہ کہیگا کہ یہ دسمبر میں پیدا ہوا ہے اور لوگ کہیں گے کہ یہ تین چار ماہ کا معلوم ہوتا ہے۔ آخر کون شخص ہے جو تین مہینے اور ایک مہینہ کے بچہ میں فرق نہ کر سکے۔ پس اگر یوسف دسمبر میں ہی اپنے بچے کو لے آتے اور کہتے کہ یہ اِسی مہینہ میں پیدا ہوا ہے تو ہر شخص کہتا کہ یہ بالکل غلط بات ہے یہ تو پانچ چھ ماہ پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اِس پر پردہ اُسی صورت میں پڑ سکتا تھا جب وہ کئی سال باہر رہتے۔ چونکہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ حضرت مسیح اس موسم میں پیدا ہوئے جس موسم میں کھجور تیار ہوتی ہے اور کھجور زیادہ تر جولائی اگست میں ہوتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح جولائی یا اگست میں پیدا ہوئے اور حضرت مریم کو اکتوبر یا نومبر میں حمل ہوا۔ اگر وہ جولائی کے مہینہ میں یا اگست کے شروع میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت مریم کو اکتوبر میں حمل ہوا اور اگر وہ اگست کے وسط یا آخر میں پیدا ہوئے تو حضرت مریم کو نومبر میں حمل ہوا۔ بہرحال قرآن کریم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ۱۵ اکتوبر سے ۱۵ نومبر تک کسی تاریخ میں حمل ہوا ہے تبھی جا کر اُس موسم میں بچہ پیدا ہوتا ہے جس میں کھجور زیادہ تر پھل دیتی ہے۔ نومبر میں حمل ہوا تو مریم اپنی ماں سے تو نہیں چھپا سکتی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو ضرور بتایا ہوگا۔ اور پھر ماں نے اپنے رشتہ داروں کو بتایا ہوگا۔ اور وہ روئے پیٹے ہوں گے اور پھر یوسف کے پاس گئے ہوں گے کہ وہ کسی طرح مریم کو اپنے گھر لے آئے۔ اور یہ بات دب جائے۔ یوسف نے پہلے انکار کرنا چاہا مگر خدا تعالےٰ نے خواب میں اُسے حکم دیا کہ وہ انکار نہ کرے اور مریم کو اپنے گھر لے آئے۔ اب وہ خدا سے بھی ڈرتا تھا اور لوگوں سے بھی ڈرتا تھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مریم کو اپنے گھر میں لے آیا۔ فرض کرو فروری میں یا مارچ کے آخر میں وہ اُن کو اپنے گھر لایا اور مئی جون میں جب اس نے دیکھا کہ اب حمل پر پردہ نہیں پڑ سکتا تو وہ کوئی بہانہ بنا کر جنوب کی طرف سفر پر چلا گیا اور بیت لحم میں پہنچکر بچہ پیدا ہو گیا۔ اب اگر اُسی وقت وہ اپنے بچہ کو واپس لے آتے تو بڑے بیوقوف بنتے کیونکہ وہ تو نکلے ہی اس لئے تھے کہ لوگوں کو بچہ کی پیدائش کا علم نہ ہو اور وہ یہ نہ کہیں کہ مریم تو تمہارے گھر میں مارچ میں آئی تھیں جولائی یا اگست میں بچہ کس طرح پیدا ہو گیا۔ اگر وہ چھ مہینے کے بعد بھی واپس لاتے تب بھی بیوقوف بنتے۔ کیونکہ وہ یہ کہتے کہ ایک مہینہ ہوا ہمارے ہاں یہ بچہ ہوا ہے اور اس کی شکل چار پانچ مہینے کے بچے والی ہوتی اور چار پانچ مہینے کا فرق بڑا بھاری فرق ہوتا ہے۔ پس وہ کئی سال باہر رہے تاکہ اِس بات پر پردہ پڑ جائے اور لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل جائے اور جب وہ بچہ بڑا ہو گیا تو پھر اپنے وطن میں واپس آئے۔ متی سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ کئی سال

مصر میں رہے (انجیل متی باب ۲ آیت ۱۳) اب واقعات
تو یہ بتاتے ہیں کہ یوسف اور مریم لوگوں سے ڈر کر باہر
گئے۔ مگر لوقا بتاتا ہے کہ مسیح ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہی تھا
کہ اُس کے معجزے ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور
سب کو پتہ لگ گیا کہ مریم روح القدس کی وجہ سے
حاملہ ہے۔ اب جبکہ سب کو پتہ لگ گیا تھا اور مسیح کے
معجزے بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے تو اس حمل
کو چھپانے اور اُن کے باہر جانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر
دوسری طرف واقعات بتاتے ہیں کہ یوسف اور مریم
باہر گئے اور باہر ہی بچہ پیدا ہوا۔ پس سوال پیدا ہوتا
تھا کہ اگر سب کو علم تھا کہ مریم روح القدس سے
حاملہ ہے تو پھر یوسف اور مریم باہر کیوں گئے۔ اس
سوال کو حل کرنے کے لئے لوقا سات سال بعد کی
مردم شماری کو سات سال پہلے بیان کرتا ہے۔ اُس
نے خیال کیا کہ ستر اسی سال گذر چکے ہیں (کیونکہ لوقا
کی انجیل مسیح کے واقعہ صلیب کے بہت بعد لکھی گئی
ہے) کون یاد رکھے گا کہ مردم شماری کس سال میں ہوئی
آؤ ہم دنیا کے سامنے یہ وجہ پیش کر دیں کہ یوسف
اور مریم کسی اور غرض سے نہیں بلکہ مردم شماری کی
غرض سے ناصرہ سے بیت لحم گئے تھے لیکن قرآن
تو سچی بات بتاتا ہے۔ اُس نے وہ بات بتائی ہے جو
عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور اس سے واضح
ہوتا ہے کہ مسیح کی پیدائش دسمبر میں نہیں ہوئی جیسا کہ
عیسائی بتلاتے ہیں۔ بلکہ جولائی یا اگست میں ہوئی ہے
جبکہ کھجور کے درخت پر کثرت سے پھل تیار ہو جاتا ہے
عیسائیوں نے دسمبر کی پیدائش محض اس لئے بیان کی
ہے تا کہ اصل واقعہ پر پردہ پڑا رہے اور لوگ یہ سمجھیں
کہ حضرت مسیح شادی کے بعد جائز حمل سے پیدا
ہوئے ہیں۔

پھر انجیل میں مسیح کی پیدائش کا موقع بیان کرتے
ہوئے لکھا ہے

"اسی علاقہ میں چرواہے تھے جو رات کو میدان
میں رہ کر اپنے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے"
(لوقا باب ۲ آیت ۸)

ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم تھا نہ کہ شدید سردی کا۔ دسمبر
کا مہینہ تو علاوہ شدید سردی کے فلسطین میں سخت
بارش اور دھند کا ہوتا ہے۔ کون یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ
ایسے موسم میں کھلے میدان میں چرواہے اپنے گلوں کو لیکر
باہر نکل آئے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم
تھا چنانچہ پیکس تفسیر بائبل میں انجیل لوقا کے مفسر
پرنسپل اے۔ جے۔ گریو ایم۔ اے۔ ڈی ڈی کی طرف سے
لوقا کے اس بیان پر کہ حضرت مسیح کی پیدائش جس موسم
میں ہوئی تھی اُس وقت چرواہے گلوں کو باہر نکال کر
کھلے میدان میں راتیں بسر کرتے تھے مندرجہ ذیل تبصرہ
موجود ہے کہ یہ موسم ماہ دسمبر کا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا
کرسمس ڈے مقابلتہً بعد کی ایک روایت ہے جو کہ
پہلے پہل مغرب میں پائی گئی" اسی طرح بشپ بارنس
اپنی کتاب RISE OF CHRISTIANITY
میں تحریر کرتے ہیں

"اس تعین کے لئے کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے
کہ ۲۵ دسمبر ہی مسیح کی پیدائش کا دن تھا اگر
ہم لوقا کی بیان کردہ ولادت مسیح کی کہانی پر
یقین کریں کہ اس موسم میں گڈریے رات کے
وقت اپنی بھیڑوں کے گلہ کی نگرانی بیت لحم
کے قریب کھیتوں میں کرتے تھے تو اس سے
یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش موسم
سرما میں نہیں ہوئی جبکہ رات کو ٹمپریچر اتنا
گر جاتا ہے کہ یہودیہ کے پہاڑی علاقہ میں

برف باری ایک عام بات ہے۔ دیسا معلوم
ہوتا ہے کہ ہمارا کرسمس ڈے کافی بحث وتمحیص
کے بعد قریباً سنہ ۳۰۰ء میں متعین کیا گیا ہے" (ص ۹۵)

پس اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی پیدائش دسمبر
میں نہیں ہوئی

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
کہ جب حضرت مریم کو دردِ زہ ہوئی تو وہ ایک کھجور کے
نیچے گئیں اور کھجور اُس وقت موجود تھی۔ لیکن انجیل جس زمانہ
کی خبر دیتی ہے اُس وقت کھجور نہیں ہوتی۔ میں نے بتایا
ہے کہ درحقیقت انجیل کی غلط بیانی کی ایک وجہ موجود ہے
اور وہ یہ کہ لوقا بتاتا ہے کہ مسیح سے حاملہ ہونے پر
صرف مریم ہی کو خبر نہیں ہوئی بلکہ جب وہ اپنی بہن
الزبتھ کو ملنے گئیں جو زکریا کی بیوی تھیں تو اُن کے پیٹ
میں یحیٰی خوشی سے ہلا جس سے یہ بات دوسروں میں بھی
پھیل گئی کہ مریم حاملہ ہے۔ پھر قرآن تو خاموش ہے۔
لیکن انجیل بتاتی ہے کہ حضرت مریم کو جب فرشتہ نے
خبر دی کہ تُو حاملہ ہوگی تو انہوں نے صرف تعجب کا ہی
اظہار نہیں کیا کہ بغیر خاوند کے مجھے کس طرح حمل ہو سکتا
ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ

"دیکھ میں خداوند کی بندی ہوں میرے لئے
تیرے قول کے موافق ہو۔" (انجیل لوقا باب ۱ ۳۸)

اب اس جیسے کے ساتھ یہ بات ملتی نہیں کہ جب حمل
ہو چکا تھا اور لوگوں پر ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ بچہ
روح القدس سے ہے باپ سے نہیں۔ اور مریم کو
بھی فرشتے کی وجہ سے تسلی ہو گئی تھی اور وہ خوش
تھیں کہ مجھے ایسا حمل ہوا ہے تو پھر وہ اپنی جگہ سے
غائب کیوں ہوئیں۔ کیونکہ ساری انجیلیں اِس بات پر
متفق ہیں کہ بچہ کسی اور جگہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کسی اور
جگہ کیوں ہوا۔ اپنے وطن میں ہی کیوں نہ ہوا؟ اِس بات کو
چھپانے کے لئے کہ غائب ہونے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ
اپنا بچہ چھپانا چاہتی تھیں لوقا کہتا ہے کہ چونکہ وہ مردم شماری
کا وقت تھا اِس لئے وہ اپنے نام لکھوانے کیلئے وہاں
گئے تھے اور مردم شماری کا مہینہ دسمبر بتایا جاتا ہے۔
اِس سے اُن کی غرض یہ تھی کہ شہر والوں پر یہ ظاہر
کریں کہ مسیح دسمبر میں پیدا ہوا ہے اور اُس دن سے
نو مہینے پورے ہو جاتے ہیں جب یوسف اُسے اپنے گھر
میں لایا اور اس طرح حمل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن
قرآن نے تو اصل واقعہ بیان کرنا تھا۔ اِس لئے اُس نے
اُس وقت سے تاریخ بیان کی ہے جب وہ روح القدس
سے حاملہ ہوئی۔ اور بائبل نے اُس وقت سے تاریخ
بنانے کی کوشش کی ہے جب وہ یوسف کے گھر میں
آئی۔ تم یوں سمجھ لو کہ قرآنی بیان کے مطابق حضرت مریمؑ
نومبر میں حاملہ ہوئیں۔ اس لحاظ سے نو مہینے جولائی کے
آخر میں ختم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ بعض بچے ۸ ماہ بعد
بعض ۹ ماہ بعد اور بعض ساڑھے نو ماہ بعد پیدا ہوتے
ہیں۔ اِس لئے ہم اندازاً کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ
۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اگست تک کسی وقت میں پیدا
ہوئے اور اُس وقت کھجور بکثرت ہوتی ہے۔ لیکن انجیل
کہتی ہے کہ وہ ۲۵ر دسمبر کو پیدا ہوئے۔ اب ہم ۲۵ر دسمبر
سے اُلٹ حساب کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو
۲۵ر مارچ کو حمل ہوا۔ اور چونکہ عیسائیوں نے مسیح کی
پیدائش اُس وقت کی بتائی ہے جبکہ یوسف کے مریم کو
گھر لانے کے بعد نو ماہ ہوتے تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے
کہ مارچ میں کسی وقت یوسف اُن کو اپنے گھر میں لایا۔
نومبر میں وہ حاملہ ہوئی تھیں۔ فرض کرو ۱۵ر نومبر کو وہ
حاملہ ہوئیں۔ چوتھے مہینے جاکر حمل نمایاں ہو جاتا ہے
چوتھے مہینے جب بات کھلی تو یوسف خدا کے حکم سے
اُن کو اپنے گھر میں لے آیا۔ اب لوگوں کو یہ بتانے کے لئے

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ

بس ان کو کھاؤ اور (چشمہ سے پانی بھی) پیو اور (خود نہا کر اور بچہ کو نہلا کر) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر (اس عرصہ

مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ

میں) تو کسی مرد کو دیکھے تو کہہ دے میں نے رحمٰن (خدا) کے لئے

صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾

ایک روزے کی نذر کی ہوئی ہے پس آج میں کسی انسان سے بات نہیں کرونگی ۲۱ھ

کہ یہ حلال کا حمل ہے حرام کا نہیں عیسائیوں نے مارچ سے حساب لگایا اور اس کے ٹھیک ۹ ماہ بعد دسمبر میں اس کی پیدائش بتائی۔ پس عیسائی مجبور تھے کہ وہ انکی تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ہی بتاتے ورنہ لوگوں کو کیا جواب دیتے کہ خاوند کے گھر میں مارچ میں آئی اور بچہ پیدا ہو گیا جولائی اگست میں۔ ان کا ایک ہی طریق تھا کہ وہ اُن کی تاریخ پیدائش کو چھپا دیتے اور کسی بعد کے مہینہ میں اُن کی ولادت ظاہر کرتے۔

یوں سمجھ لو کہ نومبر میں مریم حاملہ ہوئیں مارچ میں پیٹ بڑا ہو گیا اور یوسف تک بات پہنچی اُس نے ارادہ کیا کہ میں طلاق دیدوں۔ مگر خدا تعالیٰ نے خواب میں بتلایا کہ یہ بدکار نہیں بلکہ اسے معجزانہ طور پر حمل ہوا ہے۔ چنانچہ مارچ میں وہ انہیں گھر لے آیا۔ ممکن ہے فروری میں ہی لے آیا ہو۔ مئی جون میں کوئی عذر کر کے وہ انکو ناصرہ سے باہر لے گیا۔ اب خاوند ساتھ تھا اور اُسے یقین تھا کہ یہ خدائی فعل ہے وہ انہیں شہر سے باہر لے گیا۔ جولائی کے آخر یا اگست میں حضرت مسیح پیدا ہوئے۔ چند سال یوسف باہر رہے جب واپس آئے تو پیدائش دسمبر کی بتائی۔ یا یوں کہو کہ یوسف نے تو پیدائش ٹھیک ہی بتائی انجیل نے انکی پیدائش دسمبر میں بتائی جو مارچ میں مریم کو گھر لانے کی صورت میں ۹ ماہ بعد کی تھی تاکہ لوگ سمجھیں کہ مسیح یوسف کی اولاد سے ہے۔ اس صورت میں کھجور کا معاملہ بھی صاف ہو جاتا ہے کیونکہ جولائی اگست میں کھجوریں بکثرت لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یوسف اس واقعہ سے شرماتا تھا اور جب وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا تو اسکے سوا کیا صورت تھی کہ وہ حمل اُس وقت سے ظاہر کرتا جب مریم اُنکے گھر آگئی تھیں اور اس صورت میں اس کے حمل کو چار پانچ ماہ بعد کا ظاہر کرنا ضروری تھا اور اسی طرح پیدائش بھی چار پانچ ماہ بعد کی ظاہر کرنی ضروری تھی۔ ممکن ہے سات سال کے بعد جو مردم شماری ہوئی وہ دسمبر میں ہوئی ہو اور اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوقا نے اُسے پیدائش کے سال پر چسپاں کر دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ لوقا نے ستر اسی سال بعد کتاب لکھی ہے اتنے عرصہ بعد کسی کو کیا یاد رہتا ہے کہ کب مردم شماری ہوئی تھی۔

اس تشریح سے جو نہایت اہم تشریح ہے اور جو رومن تاریخ کے واقعات سے مؤید ہے اور انجیل کی روایات کی روشنی اس کی تائید کرتی ہے قرآن میں پھل دار کھجور کے ذکر کا موقعہ صاف ہو جاتا ہے۔

۲۱ھ تفسیر:۔ خدا نے کہا کہ کھاؤ اور پیو۔ اور آنکھیں ٹھنڈی رکھو۔ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا۔ اور اگر تمہیں کوئی شخص نظر آئے۔ تو

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا یٰمَرۡیَمُ

اس کے بعد وہ اس کو لے کر اپنی قوم کے پاس اس کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہوئی آئی جنہوں نے کہا اے مریم

لَقَدۡ جِئۡتِ شَیۡئًا فَرِیًّا ﴿۲۸﴾

تو نے بہت بڑا کام کیا ہے ۵۲۲

فَقُوۡلِیۡۤ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُکَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا اُسے کہو کہ آج میں نے خدا کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے پس آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں روزہ سے مراد خاموشی کا روزہ ہے یعنی اُن کے لئے کلام کرنا بالکل ممنوع تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ دراصل حضرت مریم کو بھی حضرت زکریا کی طرح روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور حضرت زکریا کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ انہیں اونچی آواز سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے سے روک دیا گیا تھا لیکن آہستہ بولنا اُن کے لئے جائز تھا۔ یہاں بھی اِسی رنگ کا روزہ مراد ہے یعنی حضرت مریم کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ زیادہ باتیں نہیں کرنی۔ بلکہ اپنا وقت ذکر الٰہی میں بسر کرنا۔ پس روزہ سے مراد وہ روزہ نہیں جس میں کھانا پینا ترک کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت تو وہ نفاس کی حالت میں تھیں اور وہ روزہ اُس وقت ہوتا ہی نہیں۔ اور پھر خصوصاً اس لئے بھی وہ روزہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلِیۡ وَ اشۡرَبِیۡ کھاؤ اور پیو جس سے معلوم ہوا کہ کھانا پینا اُن کے لئے منع نہیں تھا۔ پس یہاں صوم سے مراد یہ ہے کہ زیادہ باتیں نہیں کرنی زیادہ باتیں میں اس لئے کہتا ہوں کہ ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے کہا ہے قُوۡلِیۡۤ کہو۔ اگر بات بالکل منع تھی تو وہ کہہ کس طرح سکتی تھیں کہ میں روزہ سے ہوں۔ یہ لفظ صاف بتاتا ہے کہ انہیں بات کرنا بالکل منع نہ تھا وہ ایک حد تک بات کر سکتی تھیں لیکن ساتھ ہی ہدایت تھی کہ اپنے وقت کو ذکر الٰہی میں بسر کریں۔ اِس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ابھی بچہ پیدا ہوا تھا اس لئے لازماً جو بھی ملتا وہ ضرور پوچھتا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آج ذکر الٰہی کرو اور اگر کوئی شخص تم سے کچھ پوچھنا چاہے تو اُسے بھی کہہ دو کہ آج میں نے ذکر الٰہی کرنا ہے اِس طرح بات ختم ہو جائیگی اور اگلی بات پیدا ہی نہیں ہوگی۔ پس صوم سے مراد کلام کی حد بندی ہے یعنی فضول اور لغو باتیں نہیں کرنی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ نفاس اور حیض کی حالت میں ذکر الٰہی منع نہیں۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حالت میں وہ ذکر الٰہی نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اگر ذکر الٰہی منع ہو جائے تو روحانیت بالکل مر جائے بلکہ بعض لوگ تو مُنہ سے بھی ذکر الٰہی کرنا جائز سمجھتے ہیں حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ عورت حیض کے دنوں میں بھی قرآن کو کسی کپڑے یا رومال سے پکڑ کر اور پھر صاف ستھرے کپڑے پر رکھ کر پڑھ سکتی ہے ہاتھ سے پکڑنا اس لئے منع ہے کہ ممکن ہے ہاتھ کو حیض کی نجاست لگی ہوئی ہو۔ چنانچہ جن عورتوں نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے قرآن پڑھا ہے وہ اب بھی حیض کے ایام میں کپڑے پر قرآن رکھکر پڑھ لیتی ہیں میرا یہ عقیدہ نہیں لیکن اگر کوئی پڑھے تو ہم اُسے کہتے کچھ نہیں۔ کیونکہ قرآن بہرحال خدا تعالیٰ کا کلام ہے اگر کسی کے نزدیک حیض کی حالت میں اُسے دیکھ کر پڑھنا جائز ہو تو کیا حرج ہے۔

۵۲۲ تفسیر:۔ مفسرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ

جب وہ وہاں سے فارغ ہوئیں اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو اپنی قوم کے پاس آئیں۔ بچہ اُن کی گود میں تھا انہوں نے اعتراض کیا کہ مریم تُو نے یہ کیا بلا ماری ہے حضرت مریم نے کہا مجھ سے کیا پوچھتے ہو اس بچہ سے پوچھ لو۔ چنانچہ حضرت مسیح اُس وقت بولے اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ گویا مسیح کا پہلا معجزہ ہی جھوٹا تھا۔ وہ نبی نہیں تھا مگر اُس نے کہا میں نبی ہوں۔ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا مگر اُس نے کہا خدا نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے حالانکہ وہ اُس وقت پوتڑوں میں پاخانہ پھرتا تھا۔ گویا مفسرین کے نزدیک حضرت مسیح ابھی اپنی ماں کی گود میں ہی تھے کہ انہوں نے جھوٹ بولنے کی مشق شروع کر دی اور جب اُن پر نماز فرض نہیں تھی کہنے لگے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور جب پوری طرح ہوش بھی نہیں تھا تو کہنے لگے کہ میں نبی ہو گیا ہوں اس بارہ میں اُن کا استدلال تَحْمِلُهٗ اور يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ سے ہے۔

اب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اِس بارہ میں کیا کہتی ہے۔ مرقس کہتا ہے کہ وہ یوحنا کے ظہور کے وقت ناصرہ میں تھا (انجیل مرقس باب ۱ آیت ۹) متی باب ۴ آیت ۱۳ میں بھی لکھا ہے کہ جب یوحنا گرفتار ہوا تو مسیح ناصرہ چھوڑ کر کفرناحوم ایک گلیلی شہر میں گیا گویا وہ یہ تو نہیں بتاتے کہ پیدائش کے بعد حضرت مسیح ناصرہ کب گئے مگر یہ بتاتے ہیں کہ جب یوحنا کا ظہور ہوا تو اُس وقت وہ ناصرہ میں تھے اور اس کی گرفتاری پر وہ کفرناحوم چلے گئے۔ اِس سے پتہ لگا کہ حضرت مسیح جب جوان ہوئے تو ناصرہ میں آتے جاتے تھے۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے کچھ دنوں بعد یوسف اور مریم ناصرہ چلے گئے اور وہیں مسیح پلا۔ (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۳۹) گویا یوحنا اِس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔ متی کچھ نہیں کہتا کہ وہ پیدا ہو کر کہاں گئے۔ مرقس کچھ نہیں کہتا کہ وہ پیدا ہو کر کہاں گئے۔ لیکن لوقا کہتا ہے کہ وہ ناصرہ گئے۔

لوقا باب ۱ آیت ۲۶ و ۲۷ میں لکھا ہے کہ خدا کا فرشتہ مریم پر ناصرہ میں ظاہر ہوا اور وہیں اُسے حاملہ ہونے کی خوشخبری دی۔ یہ حوالہ بتاتا ہے کہ حضرت مریم ناصرہ میں رہتی تھیں مردم شماری کے لئے بیت لحم گئیں اور پھر بچہ پیدا ہونے پر ناصرہ میں آ گئیں اور حضرت مسیح وہیں ناصرہ میں رہے یہاں تک کہ یوحنا نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

اِس روایت کے مطابق حضرت مریم ناصرہ کی رہنے والی تھیں اور وہیں وہ مسیح کو لے گئیں اور لیجانے کا وقت پیدائش کے معًا بعد کا ہے اگر یہ بیان درست ہے تو معلوم ہوا کہ مسیح کو اس کی والدہ پیدائش کے معًا بعد اپنے وطن لے گئی تھیں جس کا نام ناصرہ تھا۔ اس صورت میں اِن آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ مسیح نے پیدا ہوتے ہی کلام کیا۔ کیونکہ قرآنی الفاظ یہ ہیں کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا حضرت مریم اپنے رشتہ داروں اور تعلق والوں کے پاس اُن کو لائیں اور مسیح نے اُن سے کلام کیا۔ پس اگر یہ صحیح ہے کہ وہ ناصرہ کی رہنے والی تھیں اور ناصرہ میں ہی اپنے بچے کو لے گئیں اور پیدائش کے چند دن بعد لے گئیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح نے پیدائش کے چند دن بعد ہی یہ کلام کیا لیکن اب ہم تحقیق کرتے ہیں کہ کیا لوقا کا یہ بیان ٹھیک ہے کہ مریم ناصرہ کی تھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان درست نہیں۔

متی میں لکھا ہے کہ جب مسیح پیدا ہُوا تو اُس وقت مریم بیتِ لحم میں تھیں لیکن وہ اصل وطن کا ذکر نہیں کرتا بلکہ باب ۲ میں جو ذکر ہے اُس کو شبہ ہوتا ہے

کہ اُن کا وطن بیت لحم کے سوا کوئی اور تھا مگر وہ بیت لحم کے قریب ہی تھا۔ اس کے بعد اُس میں لکھا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہیرودیس کو شبہ تھا کہ یہ لڑکا جو پیدا ہوا ہے بڑا ہو کر حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرے گا کیونکہ مجوسی فقیروں نے اُسے بتایا تھا کہ ایسا لڑکا پیدا ہوا ہے اور ہم پورب میں اُس کا ستارہ دیکھ کر آئے ہیں اس لئے ہیرودیس نے انہیں کہا کہ جب تمہیں اُس کا پتہ ملے تو مجھے بھی بتانا۔ اُس کی غرض یہ تھی کہ میں اُسے مروا ڈالوں گا تا کہ حکومت کو نقصان نہ پہنچے مگر متی کہتا ہے جب مجوسی آئے اور انہوں نے حضرت مسیح کو دیکھ لیا تو رات کو فرشتہ نے انہیں کہا کہ اب ہیرودیس کے پاس نہیں جانا چنانچہ وہ کسی دوسرے راستہ سے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے۔ اُن کے جانے کے بعد یوسف پر فرشتہ ظاہر ہوا اور اُس نے کہا کہ بادشاہ اس بچہ کو مروانا چاہتا ہے تو اُٹھ اور بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر میں بھاگ جا۔ چنانچہ یوسف اور مریم بچے کو لے کر مصر چلے گئے۔ اِدھر جب بادشاہ نے دیکھا کہ مجوسی واپس نہیں آئے بلکہ کسی اور راہ سے اپنے ملک کو واپس چلے گئے ہیں تو اُسے سخت غصہ آیا اور اُس نے حکم دے دیا کہ بیت لحم اور اُس کے گردو نواح کے وہ تمام لڑکے جو دو سال یا اس سے چھوٹی عمر کے ہوں قتل کر دئے جائیں (یہ قصہ دراصل موسیٰ کی نقل میں بنایا گیا ہے) بہر حال یوسف خدا سے خبر پا کر مسیح کو مصر لے گیا اور خدا تعالیٰ نے کہا کہ تو اُس وقت تک مصر میں ہی رہ جب تک کہ میں دوبارہ تجھ کو کوئی خبر نہ دوں (متی باب ۲)

اب دیکھو یہ بیان لوقا سے کتنا مختلف ہے لوقا کہتا ہے کہ مریم پیدائش کے معاً بعد ناصرہ گئیں اور متی کہتا ہے کہ وہ مصر گئیں اور متی کہتا ہے۔ کہ یہ

قیاسی بات نہیں بلکہ الہاماً یوسف کو کہا گیا کہ تو نے وطن واپس نہیں جانا بلکہ مصر جانا ہے۔ اور پھر الہاماً کہا کہ تو نے مصر سے نہیں ہلنا جب تک کہ میں دوبارہ تجھ پر الہام نازل نہ کروں۔ چنانچہ وہ وہاں رہے یہاں تک کہ ہیرودیس مر گیا۔ پھر خدا نے اُس کو خبر دی کہ اب ہیرودیس مر گیا ہے تو واپس اسرائیل کے ملک میں چلا جا۔ لیکن جب یوسف واپس آیا اور اُسے معلوم ہوا کہ ارخلاؤس اپنے باپ کی جگہ پر بیٹھا ہے تو وہ ڈرا کہ اگر میں اسرائیل کے ملک یعنی یہودیہ میں گیا تو مجھے مار ڈالیں گے (اس سے معلوم ہوا کہ بائبل کی رُو سے وہ جوڑا یعنی یہودیہ کے کسی شہر کا باشندہ تھا) تب خدا سے اطلاع پا کر (گویا خدا تعالیٰ کو ارخلاؤس کا پہلے علم نہ تھا) وہ جلیل کے ایک شہر ناصرہ میں جا کر رہا تا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائیگا (انجیل متی باب ۲ آیت ۱ تا ۲۳)

اس حوالہ سے کتنی باتیں ظاہر ہوتی ہیں

۱۔ اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح بیت لحم میں پیدا ہوا۔
۲۔ پیدائش کے بعد یوسف خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت مریم اور بچہ کو لے کر مصر گیا۔
۳۔ مصر میں وہ ہیرودیس کی وفات تک رہا۔
۴۔ ہیرودیس کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے اُسے اپنے ملک میں واپس جانے کے لئے کہا۔
۵۔ مگر جب وہ وطن میں واپس جانے سے ڈرا تو خدا تعالیٰ سے علم پا کر وہ گلیل کے شہر ناصرہ میں گیا۔
۶۔ اور خدا نے کہا کہ تو ناصرہ میں اس لئے جا تا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔

اگر وہ ناصرہ کے رہنے والے ہوتے تو خدا کیوں کہتا کہ تو ناصرہ چلا جا تاکہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ یوسف ناصرہ کا رہنے والا نہیں تھا بلکہ اس کا وطن کوئی اور تھا۔ ناصرہ میں مصر سے واپس آنے کے بعد اس نے قیام کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسیح کا وطن ناصرہ نہ تھا۔ وہ ناصرہ پیدائش کے معاً بعد نہیں گیا بلکہ مصر سے واپسی پر گیا۔ اگر فوراً بھی گیا تو ناصرہ میں رشتہ داروں سے گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں اس کے کوئی رشتہ دار نہ تھے اور قرآن رشتہ داروں سے گفتگو کا ذکر کرتا ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا وہ اسے اپنے رشتہ داروں اور قوم کے لوگوں کے پاس لائی۔

اب ہمیں ان دونوں بیانوں سے پتہ لگ گیا کہ اگر لوقا کا بیان صحیح ہے کہ پیدائش کے کچھ دنوں کے بعد یوسف اور مریم ناصرہ چلے گئے تو متی کے حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ ناصرہ اُن کا وطن نہیں تھا پس اگر ماں حضرت مسیح کو ناصرہ لے گئی تھی تب بھی وہاں اُنکے بولنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن اُن کے بولنے کا وہاں ذکر کرتا ہے جہاں اُن کی قوم کے لوگ تھے اور اگر وہ مصر میں رہا اور پھر ناصرہ گیا جو اس کا وطن نہیں تھا تو بچپن میں بھی بولنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بائبل کے بیان کے مطابق یوحنا کے دعوے بلکہ اس کی گرفتاری تک وہ ناصرہ میں رہا۔ پس یہ کلام یوحنا کے دعویٰ تک کے زمانہ کا بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ اُس وقت تک وہ ناصرہ میں تھا۔

متی سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح یروشلم میں دو دفعہ گیا ہے جس کے اردگرد اُن کا وطن تھا۔ ایک دفعہ بارہ برس کی عمر میں اور ایک دفعہ بتیس[۳۲] سال کی عمر میں۔ بارہ سال کی عمر میں جب وہ یروشلم آیا تو اس وقت کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ وہ بزرگوں کی باتیں سنتا تھا اور کھیل کود میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ ۳۲ سال کی عمر میں دوبارہ یروشلم آیا اور اسی علاقہ میں اُس کے رشتہ دار ثابت ہوتے ہیں۔ پس اِن دو سفروں میں سے کسی ایک سفر میں ہی اس کا رشتہ داروں سے یہ مکالمہ ہو سکتا ہے اور غالباً یہ مکالمہ دوسرے سفر میں تھا جب وہ مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لئے یروشلم آیا جس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اس کی بعثت کے قریباً تیسرے سال میں ہوا تھا۔ جبکہ وہ دو سال سے اپنے دعویٰ کا اعلان کر چکا تھا۔ (انجیل متی باب ۲۱) اُس وقت اس کے منہ سے یہ کلمات جو قرآن کریم نے کہے ہیں بالکل درست ثابت ہوتے ہیں۔ پہلے سفر کے حالات جب وہ بچہ تھا اس پر چسپاں نہیں ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کہتا ہے کہ رشتہ داروں سے مسیحؑ نے باتیں کیں۔ انجیل کہتی ہے کہ پیدائش کے بعد مسیحؑ ناصرہ گیا وطن نہیں گیا۔ پس وطن کسی دوسرے وقت میں گیا اور دوسری جگہ یروشلم کا گردو نواح ہے جہاں اُس کا جانا دو دفعہ ثابت ہے۔ ایک دفعہ بچپن میں جب اُس کی ماں اور باپ اُس کے حالات سے ابھی ناآشنا تھے اور دوسری دفعہ جب وہ مدعی ہو کر گیا۔ پس یہ گفتگو اُسی وقت ہوئی۔ اس سے پتہ لگ گیا کہ اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ سے وہ زمانہ مراد ہے۔ جب مسیح ۳۳ سال کے ہو چکے تھے اور دعویٰ نبوت کر چکے تھے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تَحْمِلُهٗ سے کیا مراد ہے۔ بچہ کو تو ماں اُسی وقت اُٹھاتی ہے جب وہ

يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ

اے ہارون کی بہن! تیرا باپ تو بُرا آدمی نہیں تھا

چھوٹا ہوتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ بیشک اس کے
ایک معنے گود میں اٹھانے کے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ
مجازی طور پر یہ کسی کا ساتھ دینے اور اس کی تائید اور
نصرت کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
قرآن کریم میں آتا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا
التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا (جمعہ ع)
یعنی وہ لوگ جن پر تورات رکھی گئی تھی لیکن انہوں نے اُسکو
اُٹھایا نہیں۔ اب دیکھو یہاں حمل کا لفظ استعمال کیا گیا
ہے مگر حُمِّلُوا کے یہ معنے نہیں کہ تورات انکے سروں
پر لادھی گئی تھی بلکہ اُسکی تائید کرنے کا انکو حکم دیا گیا
تھا۔ اور جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ لَمْ يَحْمِلُوْهَا
تو اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ ہر یہودی نے تورات
اپنے ہاتھ سے پھینک دی تھی۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ انہوں
نے تورات کی تبلیغ اور تائید چھوڑ دی تھی۔ چنانچہ مفردات
امام راغب میں مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ
ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا کے معنے کرتے ہوئے لکھا
ہے کُلِّفُوْا اَنْ يَّقُوْمُوْا بِحَقِّهَا فَلَمْ يَحْمِلُوْهَا
یعنی یہودیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تورات کے واجبات
کو ادا کریں اُس کی ظاہری اور باطنی طور پر تائید
وحفاظت کریں اور اُس کے احکام پر خود بھی عامل
ہوں اور دوسروں کو بھی اسکی تبلیغ کریں لیکن انہوں نے
ایسا نہ کیا۔ گویا خدا تعالیٰ نے حُمِّلُوا کہا مگر اس کے
یہ معنے نہیں کہ ہر یہودی کے سر پر تورات رکھی گئی تھی اور
خدا تعالیٰ نے لَمْ يَحْمِلُوْهَا کہا مگر اس کے یہ
معنے نہیں کہ ہر یہودی نے تورات اُٹھا کر پھینک دی
تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا
کہ انہوں نے تورات نہیں اُٹھائی تو انہوں نے ظاہر
میں تورات اُٹھائی ہوئی تھی اور جب خدا تعالیٰ نے
کہا کہ تورات اُن پر رکھی گئی تو ظاہر میں اُن کے
سروں پر کوئی تورات نہیں تھی۔ پس حمل کے معنے
کبھی تائید اور نصرت اور ساتھ دینے کے بھی ہوتے
ہیں۔ انجیل کہتی ہے کہ مسیح پر اُن کی ماں ایمان نہیں
لائی لیکن قرآن کہتا ہے کہ اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا
تَحْمِلُهٗ جب انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ماں
اُن کے ساتھ اُن کی تصدیق کرتی اور اُن کے دعویٰ
کی تائید کرتی ہوئی آئی۔ اسی طرح تَحْمِلُهٗ کے
معنے حوصلہ دلانے اور ہمت بڑھانے کے بھی ہو سکتے
ہیں۔ پس اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کے یہ
معنے نہیں کہ حضرت مریم مسیح کو اُٹھائے ہوئے تھیں
بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ مسیح کی تعلیم پر عمل کرنے والی اور
اس کی تصدیق کرنے والی تھیں۔ گویا انجیل نے جو الزام
لگایا تھا کہ مریم حضرت مسیح کو نہیں مانتی تھی قرآن کریم
نے اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کے الفاظ میں
اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے
وہ تو مسیح کے ساتھ ساتھ آئی تھیں اور کہتی تھیں کہ میں
اس پر ایمان لاتی ہوں یہ سچا ہے۔ تم کہتے ہو یہ
حرام کا بچہ ہے کیا حرام کے بچے ایسے ہی ہوا کرتے
ہیں۔ تم اس سے بات کر کے تو دیکھو تمہیں پتہ لگ
جائے گا کہ یہ حلال زادہ ہے یا نہیں۔

قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا
فَرِيًّا۔ انہوں نے کہا اے مریم تو نے یہ کیا گند
پھیلایا ہے۔ پہلے تو نے ایک گندہ کام کیا اور آگے

وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۹﴾

اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی ۲۳ؔ

یہ بھی خدا پر جھوٹ بولنے لگ گیا۔ گویا انہوں نے یہ طعن کیا کہ چونکہ یہ حرام کا تھا اس لئے ایسی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

۲۳ؔ تفسیر: یعنی اے ہارون کی بہن۔ تیرا باپ تو بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی پھر یہ کیا اندھیر ہو گیا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت مریم کی دوسری والدہ سے ایک اور بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا۔ لیکن یہودی تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اِس لئے ایسی بے دلیل بات پیش نہیں کی جا سکتی۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم کو ہارون کی بہن اس لئے کہا کہ وہ انکی نسل میں سے تھیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ الزبتھ جو حضرت زکریا کی بیوی تھیں بائبل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہارون کے خاندان میں سے تھیں اور چونکہ یہ اُن کی رشتہ دار تھیں اس لئے قرآن نے اُن کو اُن کے قبیلہ کی زبان میں اُختِ ہارون کہہ دیا (دیکھو القرآن از جارج سیل زیر آیت یا اُختِ ہارون) یہ اُن عیسائیوں نے تشریح کی ہے جو منصف مزاج ہیں اور تعصب کا مادہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔ بعض عیسائیوں نے تو اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تاریخ سے ایسے ناواقف تھے کہ اُنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہارون حضرت مسیح سے چودہ سو سال پہلے گذرے ہیں لیکن بعض دوسرے عیسائیوں نے خود اس اعتراض کو ردّ کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ اور ہارون کے زمانہ کا خوب علم تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہی کئی جگہ ذکر آتا ہے کہ موسیٰ اور ہارون کے بعد فلاں فلاں نبی آئے پس یہ اعتراض صحیح نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ حضرت زکریا کی بیوی الزبتھ ہارون کے خاندان میں سے تھیں اور مریم اُن کی رشتہ دار تھیں اِس لئے انہوں نے حضرت مریم کو بھی ہارون کی بہن کہہ دیا۔

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک دفعہ یہ اعتراض پیش ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہود انبیاء و صلحاء کے نام پر اپنے خاندان کے مردوں اور عورتوں کے نام رکھ لیا کرتے تھے (تفسیر فتح البیان جلد ۶ صفحہ ۱۱ و تفسیر ابن جریر جلد ۱۶ صفحہ ۵۲) لیکن میرے نزدیک اس کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت مریم کو ہارون کی بہن طنز کے طور پر کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی ایک سوتیلی بہن تھی۔ جو ہارون کی سگی تھی یا بعض مورخوں کے نزدیک وہ حضرت موسیٰ کی سوتیلی بہن نہیں بلکہ سالی تھی اور اس کا نام بھی مریم تھا۔ گنتی باب ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مریم نے جو ہارون کی سگی بہن اور حضرت موسیٰؑ کی سوتیلی بہن تھی اور بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ کی سالی تھی۔ بہرحال ہارون سے اُس کا زیادہ رشتہ تھا اور موسیٰؑ سے کم۔ ہارون کے ساتھ مل کر ایک کوشی عورت سے شادی کرنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کئے تھے۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ یہ اعتراض اس حد تک تھا کہ گویا ناجائز تعلق قائم کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ

اس پر اُس نے اُس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لوگوں نے کہا ہم اُس سے کس طرح باتیں کریں

مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۳۰﴾

جو کہ کل تک پنگھوڑے میں بیٹھنے والا بچہ تھا ۵۲۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (احزاب ع)

یعنی اے ایمان والو تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی اور پھر خدا نے اُس کی بریت کی۔ معلوم ہوتا ہے یا تو اُن کا یہ اعتراض تھا کہ ایک بدکار عورت سے موسیٰ نے شادی کر لی ہے اور یا یہ تھا کہ کسی شادی شدہ عورت سے شادی کر لی ہے۔ بہرحال پتہ لگتا ہے کہ اُن پر ناجائز رشتہ کا الزام لگایا گیا تھا۔ بائبل میں لکھا ہے کہ اس جرم کی سزا میں مریم کو کوڑھی کر دیا گیا۔ مگر چونکہ بائبل ایک طرف یہ بتاتی ہے کہ ہارون اور مریم دونوں نے اعتراض کیا اور دوسری طرف بائبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف مریم کو سزا ملی ہارون کو سزا نہیں ملی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون کا نام بائبل میں حسب معمول انبیاء پر اعتراض کرنے کے شوق میں درج کیا گیا ہے ورنہ ایک ہی جرم میں دونوں کو سزا کیوں نہ ملتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ھارون نے اعتراض نہیں کیا۔ صرف مریم نے اعتراض کیا تھا۔ آخر ہارون کی سفارش پر حضرت موسیٰ نے خدا تعالیٰ سے دعا کی اور مریم کا قصور معاف کیا گیا اور صرف سات دن اُسے کوڑھی بن کر رہنا پڑا۔ لیکن اس جرم سے پہلے جس شان اور عظمت کے ساتھ اُس کا ذکر کیا جاتا تھا اُس شان اور عظمت سے بعد میں اُس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ بعض تو اس کی طرف اور بھی عیوب منسوب کرتے ہیں۔

پس میرے نزدیک يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ کہہ کر انہوں نے طعنہ دیا ہے کہ اے ہارون کی بہن۔ یعنی جس طرح اس مریم نے قہر مارا اور وہ کوڑھی ہو گئی تھی اسی طرح تُو نے بھی کوڑھیوں والا کام کیا ہے۔ پس ان الفاظ میں اُن کی طعنہ زنی تھی کہ اُس مریم نے بھی طوفان اٹھایا تھا تُو نے بھی طوفان اُٹھایا ہے۔ اس نے موسیٰ پر بدکاری کا الزام لگایا تھا اور تُو نے آپ بدکاری کی ہے حالانکہ تیرا باپ بُرا نہیں تھا اور تیری ماں بھی بُری نہیں تھی پس تُو نے یہ کیا گند اُچھالا ہے۔

۵۲۴ تفسیر:۔ جیسا کہ میں اُوپر بتا چکا ہوں ہمارے نزدیک حضرت مسیحؑ کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی تھی اور الٰہی نشان کے طور پر ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ فعل اس لئے کیا کہ حضرت موسیٰؑ کی نسل سے جو نبیوں کا سلسلہ چلا آرہا تھا خدا تعالیٰ اسکو ختم کرکے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ سلسلہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ بنو اسحاق کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نبوت اُن کے گھروں سے منتقل ہو کر اب کسی اَور قوم میں چلی جائے گی اس کے لئے ایک بڑی ٹھوکر کی ضرورت تھی اور وہ ٹھوکر حضرت مسیحؑ کی بن باپ پیدائش تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ مگر یہ معجزہ ایک ابتلاء کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

معجزے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معجزے

ہدایت دینے کے لئے اور لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے معجزے ہوتے ہیں جن کو دشمن سے بھی منوایا جا سکتا ہے۔ اگر منوایا نہ جا سکے تو وہ حجت کس طرح ہو سکتے ہیں۔ پس جو معجزے حجت کے لئے آتے ہیں وہ ایسی ہی شکل میں آتے ہیں جن کو منوایا جا سکے۔ مثلاً ایک پیشگوئی ہے جسے شائع کر دیا گیا۔ دشمن نے اُس پر بحث کی۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر جرح کی اور پھر وہ پیشگوئی پوری ہو گئی تو اُس کا کوئی دشمن انکار نہیں کر سکتا سوائے اُن کے جو ضدی طبیعت کے ہوں یا مثلاً قرآن کریم کا معجزہ ہے۔ یہ ایسا معجزہ ہے جو عیسائی سے بھی منوایا جا سکتا ہے ہم اُسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن سامنے پڑا ہے اگر ہمت ہے تو اس جیسی کتاب بنا لاؤ۔ یا عرفان الٰہی کا معجزہ ہے۔ فطرت کے باریک رازوں کو ظاہر کرنے کا معجزہ ہے۔ یہ ہر ایک سے منوایا جا سکتا ہے۔ تو جو معجزے ہدایت کے لئے آتے ہیں اُن کے لئے یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ ایسے ہی ہوں جن کو دشمن سے بھی منوایا جا سکے۔ اسی طرح بعض معجزات ایسے ہوتے ہیں۔ جو صرف تقویت ایمان کے لئے ہوتے ہیں اُن کا منوایا جانا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ صرف مومنوں کے ازدیادِ ایمان کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں اور ایسی شکل میں ظاہر کئے جاتے ہیں کہ مومن تو مان لیتا ہے اور کافر نہیں مانتا مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیانی سوراخوں سے ایک دفعہ پانی پھوٹ نکلا اور ایک لوٹا پانی بہت سے لوگوں کی ضروریات کے لئے پورا ہو گیا یا تھوڑا سا کھانا تھا مگر آپ کی دعا کی برکت سے بہت سے لوگوں نے کھانا کھا لیا اور وہ سیر ہو گئے یا مثلاً یہ معجزہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کُرتے پر سرخی کے چھینٹے پڑے۔ اب ایک مومن

اِن معجزات کو مان جائے گا۔ لیکن دوسرا کہے گا کہ اپنے مریدوں سے جھوٹ بلوا لیا ہے یا مثلاً میں نے ایک دفعہ کشفی حالت میں دیکھا کہ میرے مُنہ میں مشک ڈالا گیا ہے۔ جب میں جاگا تو میرے مُنہ سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اُس سے کہا کہ سونگھ کر دیکھو میرے مُنہ سے کسی چیز کی خوشبو آ رہی ہے یا نہیں۔ اُس نے سونگھا تو کہا کہ مشک کی خوشبو آ رہی ہے۔ اب یہ معجزہ میرے لئے تو تقویتِ ایمان کا موجب تھا میری بیوی کے لئے بھی تقویتِ ایمان کا موجب تھا مگر دوسروں کے لئے اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا اِسی طرح ایک دفعہ مجھے روزہ لگا اور بہت تکلیف ہوئی۔ اس حالت میں یکدم مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا ہے اور اُس نے میرے مُنہ میں پان ڈالا ہے جب میری آنکھ کھلی تو پیاس بالکل غائب تھی۔ تو ایک معجزے تقویت ایمان کے لئے ہوتے ہیں اور وہ مخصوص ہوتے ہیں مومنوں کے لئے۔ اور ایک آیت ہوتے ہیں یعنی دشمنوں پر حجت تمام کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ معجزے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دشمنوں کے سامنے کھلے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور کچھ معجزے ایسے ہوتے ہیں جو ابتلائی ہوتے ہیں اور اُن میں رنج اور کوفت کا پہلو پایا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی حکمت کے ماتحت اُن کو ظاہر فرماتا ہے۔ حضرت مسیح کی بن باپ ولادت بھی ایسے ہی ابتلائی معجزوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ یہود کو بتائے کہ اب نبوت تم میں ختم ہونیوالی ہے اور اس کے نشان کے طور پر اُس نے مسیح کو بن باپ پیدا کر دیا لیکن یہودی مذہب پر ایمان لانیوالوں کے لئے یہ بات ماننی کہ آئندہ ہماری قوم میں سے نبوت مٹ جائے گی اور ایک غیر قوم میں چلی جائیگی بالکل ناممکن تھا۔ اللہ تعالےٰ نے چاہا کہ وہ یہودی قوم کی توجہ

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرائے اور اُس نے ایک کنواری کے بطن سے حضرت مسیح کو پیدا کر دیا۔ بے شک یہ ایک معجزہ تھا لیکن یہود کے لئے یہ معجزہ نہیں تھا۔ وہ تو سنتے ہی کہتے تھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے یہ شخص (نعوذ باللہ) حرامزادہ ہے۔ خود مسیح کیلئے بھی یہ معجزہ تقویت ایمان کا موجب نہیں تھا بلکہ وہ شرمندگی سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو ابنِ آدم کہا کرتا تھا۔ قرآن کریم نے ابن مریم نام رکھ دیا۔ وہ اپنے آپ کو ابن آدم بھی اِسی لئے کہتے تھے کہ لوگ پوچھتے ہونگے کہ کس کے بیٹے ہو۔ وہ کہتے کہ میں ابنِ آدم ہوں۔ قرآن کریم نے ایک آسان ذریعہ اختیار کر لیا کہ اُن کی والدہ کی طرف انہیں منسوب کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ ابنِ مریم تھے پس یہ ایک معجزہ تو ہے مگر بنی اسرائیل کی ٹھوکر کیلئے۔ اور اُن کو ہوشیار کرنے کے لئے کہ جس مامور کے تم ماننے والے ہو اس کا باپ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا اس ذریعہ سے خدا تعالےٰ نے کانٹا بدل دیا اور ظاہر کر دیا کہ اب غیر قوم سے نبی آئے گا۔ گویا یہ ایک ٹھوکر تھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اور عیسائیوں کے لئے اسلام کا رستہ کھولنے کے لئے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ۔ حضرت مریم جب مسیحؑ کے ساتھ اپنی قوم میں آئیں تو انہوں نے کہا اے مریم! تُو نے یہ کیا بدکاری کی ہے تُو تو بڑے اچھے خاندان میں سے تھی فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ اس پر انہوں نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم جانتی تھیں کہ عیسیٰؑ نے جواب دینا ہے تبھی تو انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اس موقعہ پر معجزانہ کلام کیا یہ فقرہ اُن کی تردید کرتا ہے ورنہ مریم کو کس طرح پتہ تھا کہ یہ کلام کریگا۔ اَشَارَتْ اِلَيْهِ کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے بھی بولا کرتا تھا اور چونکہ بولا کرتا تھا اس لئے انہیں پتہ تھا کہ اب بھی بولیگا۔

اگر کہا جائے کہ سورۂ آل عمران سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (آل عمران ع ۵) یہ بچہ مہد و کہل میں باتیں کرے گا۔ اور چونکہ اُن کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ بچہ مہد میں باتیں کرے گا۔ اس لئے انہوں نے اسکی طرف اشارہ کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آل عمران میں جس الہام کا ذکر ہے اُس میں موقع نہیں بتایا گیا کہ کس موقع پر بات کریگا صرف اتنا کہا گیا ہے کہ بات کریگا پس سوال یہ ہے کہ اس موقع پر انہوں نے کیوں اشارہ کیا؟ یا تو الہام بتاتا کہ وہ ہمیشہ ہی دُودھ پیتے زمانہ میں باتیں کرے گا اور چونکہ وہ پہلے بھی باتیں کیا کرتا تھا اس لئے اس موقعہ پر بھی اُنہوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مگر اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں کہ اس سے پہلے بھی عیسیٰؑ بولا کرتے تھے اور بعد میں بھی بولا کرتے تھے اس لئے یہ الہام اس فعل کا محرک نہیں ہو سکتا۔ اُن کا حضرت مسیحؑ کی طرف اشارہ کرنا درحقیقت یہود کے اعتراض کا جواب تھا۔ انہوں نے اعتراض یہ کیا تھا کہ تُو نے ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہے اور اپنی قوم اور خاندان کو بدنام کیا ہے حضرت مریم نے اس اعتراض کا جواب اس رنگ میں دیا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ تم اس سے باتیں کر کے دیکھ لو کیا تمہیں یہ بدکاری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ میں نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے تو پھر بدکاری کے نتیجہ میں یہ عظیم الشان لڑکا کس طرح پیدا ہو گیا۔ تمہارے اصل کے مطابق تو خود یہ لڑکا تمہارے تمام شبہات اور وساوس کو دور کرنے والا اور میری بریت کو ثابت کرنے والا ہے۔

قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا. یہ آیت حضرت مسیحؑ کے بچپن میں کلام کرنے کے متعلق بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہم اس سے کس طرح کلام کریں جو کہ مہد میں ایک بچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ مہد کا لفظ تیاری کے زمانہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (مدثر ع۱) یعنی میں نے کافر کو مال دیا، روپیہ دیا اور اس کی ترقیات کے لئے بڑے بڑے سامان مہیا کئے۔ پس مہد کا لفظ محاورۃً اُس زمانہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو تیاری کا زمانہ ہو اور تیاری کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اُس زمانہ میں انسان آئندہ کے لئے اپنے اندر طاقتیں جمع کرتا ہے۔ یہاں بھی جوانی کے زمانہ کے لئے استعارۃً مہد کا لفظ بولا گیا ہے۔ اور قوم کے بڑے لوگ چھوٹی عمر کے نوجوانوں کا ذکر انہی الفاظ میں کیا کرتے ہیں مگر اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقعہ میں پنگھوڑے میں پڑے ہوتے ہیں بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ ہم سے بہت چھوٹے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو آپ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ بڑھاپا شروع ہو چکا تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار مکہ کی طرف سے ایک رئیس آپ سے گفتگو کرنے کے لئے آیا تو وہ بار بار کہتا کہ اے بچے میں تجھے کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔ حالانکہ آپ اُس وقت قریباً ساٹھ سال کی عمر کے تھے مگر پھر بھی وہ آپ کو بچہ کہتا تھا کیونکہ خود اسّی سال کا تھا۔ تو قوم کے بڑے لوگوں کا یہ کہہ دینا کہ اس سے ہم کیا گفتگو کریں یہ تو ابھی کل کا بچہ ہے کوئی قابل تعجب بات نہیں۔ مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی جب سخت غصہ میں آیا کرتے تو انجمن کے ممبروں سے کہا کرتے تھے کہ تم کل کے بچے۔ دودھ پیتے بچے میرے سامنے بات کرتے ہو۔ اب اگر کوئی اس بات کو سُنکر یہ کہنا شروع کر دے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چودہ ممبروں پر مشتمل ایک انجمن بنائی تھی جس میں صرف ایک جوان شخص تھا باقی سب دُودھ پیتے بچے تھے تو یہ کیسی ہنسی والی بات ہوگی۔ جس طرح مولوی سید محمد احسن صاحب کہتے تھے کہ تم کل کے بچے ہو اسی طرح یہودی کہتے کہ یہ جو ہمارے سامنے پوتڑوں میں کھیلا ہوا ہے کیا ہم اس سے بات کریں۔ یعنی ابھی تو **اس کے سیکھنے کے دن ہیں یہ ہمیں کیا بتائیگا کہ ہم اس سے بات کریں گویا ان الفاظ میں وہ اپنے علم و فضل اور اپنی عمر کی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔**

دیکھو سورۃ آل عمران میں بتایا گیا ہے کہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (ع۵) مسیح مہد اور کہل میں کلام کرے گا۔ اس سے مسلمان یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ایک پیشگوئی ہے۔ جس میں **بتایا گیا تھا کہ مسیح بچپن میں کلام کرے گا اور مہد سے** مراد حقیقی مہد ہے لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ کیونکہ سورۃ آل عمران میں مہد کے ساتھ کہل بھی لگایا گیا ہے اگر مہد میں بولنا معجزہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا کہولت میں بولنا بھی معجزہ ہوتا ہے۔ کیا ۳۳ سے پچاس سال تک کی عمر میں جو کہولت کا زمانہ ہوتا ہے لوگ بولا کرتے ہیں یا تینتیس سے پچاس سال تک کی عمر والا اگر بولے تو اُسے بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے؟ جب مہد کے ساتھ کہل کا لفظ بھی لگایا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں کسی عمر میں بولنے کا معجزہ مراد نہیں بلکہ بولنے کی نوعیت مراد ہے اگر کسی عمر میں بولنا مراد ہوتا تو ساتھ کہل کا لفظ کیوں ہوتا۔ اگر کہل میں بولنا معجزہ ہوتا ہے تو پھر مہد سے مراد بھی دودھ پیتے بچے کا کلام کرنا مراد ہو سکتا ہے اور اگر کہولت کا کلام عام بات ہے تو مہد کا زمانہ بھی وہی زمانہ لیا جائے گا جس میں عام بچے بولتے ہیں۔ اس پر سوال ہو سکتا ہے کہ پھر پیشگوئی کیوں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مہد کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کرنیکی

وہی ضرورت ہے جو کہولت کے زمانہ کے متعلق
پیشگوئی کرنے کی ہے۔ آخر کہولت کی عمر والے
باتیں کیا کرتے ہیں یا نہیں۔ جب کیا کرتے ہیں
تو پھر یہاں پیشگوئی کیوں کی؟ بہرحال کوئی نہ کوئی
غرض ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی
کی ہے اور ہمیں وہ غرض تلاش کرنی چاہیئے
سو یاد رکھنا چاہیئے کہ کلام اپنی ذات میں بھی معجزہ
ہوتا ہے قطع نظر عمر کے۔ یعنی ہے تو یہ معجزہ۔
اگر معجزہ نہ ہوتا تو پیشگوئی نہ ہوتی اور یہ نہ
کہا جاتا کہ ایسا ہو جائے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ
معجزہ آیا عمر کے لحاظ سے ہوتا ہے یا اُس میں
کوئی اَور بات ہوتی ہے؟ ہم مان لیتے ہیں کہ اگر
دو مہینے کا بچہ بول پڑے تو یہ بڑا معجزہ ہوگا
لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے۔ وہ
پچاس سال کی عمر میں بھی بولے گا۔ پچاس سال کی
عمر میں بولنا کس طرح معجزہ ہو سکتا ہے؟ اِس
کا جواب وہی ہے جو میں اُوپر دے چکا ہوں کہ
قطع نظر عمر کے کلام اپنی ذات میں بھی معجزہ
ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم ایک بڑا معجزہ ہے
مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ کس وقت
نازل ہونا شروع ہوا۔ جب آپ دو مہینے کے بچے
تھے یا چالیس سال کے تھے۔ چالیس سال کی عمر
سے قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا اور تریسٹھ
سال کی عمر تک نازل ہوتا چلا گیا۔ مگر ہم پھر
بھی اُس کو معجزہ کہتے ہیں۔ کیا اس لئے کہ آپ
دو مہینے کے تھے جب یہ نازل ہوا یا تین مہینے کے
تھے جب یہ نازل ہوا۔ بلکہ ہم اس کلام کو کلام کی
وجہ سے معجزہ کہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کلام
اِس شان کا ہے کہ دنیا اس کی مثال لانے سے
عاجز ہے۔ پس يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي
الْمَهْدِ وَكَهْلًا کے یہ معنے ہیں کہ حضرت مسیحؑ
اپنی تیاری اور جوانی کے زمانہ میں بھی اور کہل
کے زمانہ میں بھی ایسی باتیں کریں گے جو معجزانہ
ہوں گی۔ اور تمام انبیاء ایسی ہی باتیں کیا کرتے
ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور اسکی محبت
کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ خود رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے تریسٹھ سال تک وہ کلام کیا کہ مسیحؑ تو
مسیحؑ، موسیٰؑ کا کلام بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔
چنانچہ موسیٰ کی تورات اور عیسیٰ کی انجیل قرآن کے
مقابلہ میں حقیقت ہی کیا رکھتی ہیں۔ حالانکہ یہ کلام
چالیس سال کی عمر میں نازل ہونا شروع ہوا تھا۔
پس خدا ہی یہ بتا سکتا تھا کہ مسیح ایسا کلام کرے گا
جو معجزہ ہوگا۔ یہ معجزہ دو مہینے کے بچہ کے کلام کی
وجہ سے نہیں بلکہ خود اس کلام کی ذاتی خوبیوں اور
حُسن کی وجہ سے ہے۔ پس مہد کے معنے بچپن کے
کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر وہ جوانی میں بھی ایسی
باتیں کرتے تھے جو عام آدمی نہیں کر سکتے تھے تو وہ
معجزہ تھا۔ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
چالیس سال کی عمر میں بولے مگر اُن کا کلام پھر بھی
معجزہ تھا اور ایسا معجزہ کہ مسیح کو اس کا ہزارواں
حصہ بھی نصیب نہیں ہُوا پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اور موسیٰؑ وغیرہ کا کلام جس طرح بڑی عمر میں معجزہ تھا
اور خدا تعالیٰ ہی اس کے متعلق پہلے سے بتا سکتا تھا
اسی طرح مسیح کے متعلق تھا پس پیشگوئی کی ضرورت مہد میں
کلام کرنے کیلئے نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ کہل بھی لگا ہوا ہے
پیشگوئی کی ضرورت معجزانہ کلام کیوجہ سے تھی اور اسی وجہ سے
مہد کے ساتھ کہل لگایا گیا ہے کیونکہ کلام خاص جس طرح جوانی میں
معجزانہ ہوتا ہے اسی طرح کہولت اور بڑھاپے میں بھی معجزانہ ہوتا ہے

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۱﴾ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۲﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ ؗ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۳﴾

(یہ سُنکر ابن مریم نے) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب بخشی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے بابرکت (وجود) بنایا ہے۔ اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے۔ اور مجھے اپنی والدہ سے نیک سلوک کرنیوالا بنایا ہے اور مجھے ظالم اور بدبخت نہیں بنایا ۲۵

۲۵ تفسیر:- یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے۔ کہ اگر مہد سے مراد بچپن کا زمانہ ہی لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مسیح ابھی دُودھ پیتے بچے تھے کہ آپ نے یہ کلام کیا تو ان آیات میں جس قدر باتیں انہوں نے بیان کی ہیں وہ ساری کی ساری اُس وقت جھوٹی بنتی ہیں۔ اگر وہ دو مہینے کی عمر میں بولے تھے تو غور کرو وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ۔ عبداللہ کے معنے اس جگہ محض مخلوق کے نہیں ہو سکتے کیونکہ مخلوق ہونے کے لحاظ سے تو سب انسان برابر ہیں اور حضرت مسیح اپنی وہ خصوصیات بیان کر رہے ہیں جن میں انہیں دوسروں سے امتیاز حاصل ہے پس یہاں عبداللہ کے معنے ہیں خدا تعالےٰ کی کامل اطاعت کرنیوالا اور اُس کی صفات کو دنیا میں ظاہر کرنے والا۔ ایک دودھ پیتا بچہ کہتا ہے کہ میں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ میں اللہ تعالےٰ کی صفات اور اس کے اخلاق کو دنیا میں ظاہر کرنے والا ہوں۔ اب اگر دُودھ پیتا بچہ ایسا کہتا ہے تو وہ یقیناً جھوٹ بولتا ہے۔ کوئی معجزہ نہیں دکھاتا۔ بلکہ اُس کی اپنی حالت یہ تھی کہ ابھی اُس کو طہارت بھی اس کی ماں کرواتی تھی۔ وہ چوستا تھا ماں کا پستان اور کہتا تھا کہ میں عبداللہ ہوں۔ کیا عبداللہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی ماں کا پستان پکڑ کر چوسنا شروع کر دے۔ یہ عجیب نظارہ ہوگا کہ اِدھر وہ کہتا ہوگا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اور پھر ماں کی طرف مُنہ کرکے اس کا پستان چوسنے لگ جاتا ہوگا۔ گویا فعل کرتا ہے بچے والا اور دعویٰ کرتا ہے بڑے مقرب اور پاکیزہ انسانوں والا۔ اور پھر جو کچھ کہتا ہے محض جھوٹ ہے کہتا ہے میں اللہ کا عبد ہوں اور اس کی عبادت کرتا ہوں۔ حالانکہ وہ اُس وقت عبادت کرتا ہی نہیں تھا بلکہ اگر وہ اُس وقت اپنے اس دعویٰ کے مطابق نماز پڑھنی شروع کر دیتا تو اُس کی ماں اُسے پھینک کر چلی جاتی اور شاید وہ سارا دن پاخانہ میں لتھڑا رہتا۔

پھر کہتا ہے اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ اُس نے مجھے کتاب دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت خدا تعالےٰ نے اُسے کونسی کتاب دی تھی؟

پھر کہتا ہے وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ اُس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے حالانکہ یہ جھوٹ تھا۔

اِسی طرح کہتا ہے وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ۔ اُس نے مجھے برکت والا بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں۔ چلنا آتا نہیں ماں گود میں اُٹھائے پھرتی ہے اور کہتا ہے کہ اَیْنَمَا کُنْتُ جہاں کہیں بھی میں جاؤں خدا تعالےٰ کی برکت میرے ساتھ ہے۔

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ۔ اور اس نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ طہارت بھی کوئی دوسرا کراتا تھا۔ اور نماز پڑھنی آتی ہی نہیں تھی۔

وَالزَّکٰوۃِ۔ اور اس نے مجھے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے حالانکہ اس کے پوتڑے بھی اس کی ماں بناتی تھی اور کہتا یہ ہے کہ مجھے خدا نے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے۔

وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ۔ اور میں اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں۔ حالانکہ ماں کی کیا فرمانبرداری کرتی تھی ماں تو اُسے اپنا خون چوسا رہی تھی اور اپنی گودی میں اُٹھائے پھرتی تھی اور راتوں کو اُس کے لئے جاگتی تھی۔

وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا اور اس نے مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا۔ حالانکہ اُس وقت اُس نے جبار کیا ہونا تھا۔ چٹکی کاٹنے سے وہ رونے لگ جاتا تھا۔

غرض اگر یہ درست ہے کہ انہوں نے بچپن میں کلام کیا تو یہ جتنی باتیں ہیں سب کی سب جھوٹ بن جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آئندہ کی خبریں تھیں جو اُن کی زبان پر جاری ہوئیں۔ لیکن اگر اتنی باتوں کو آئندہ کی خبریں بنانا ہے تو صرف اِسی بات کو کہ وہ بچپن میں کلام کرے گا آئندہ کی خبر کیوں نہ کہا جائے۔ سارا سوال حل ہو جاتا ہے۔ پھر ہمیں سوچنا چاہیئے کہ آخر اس سے اللہ تعالےٰ کی غرض کیا تھی۔ وہ کہتے ہیں غرض یہ تھی کہ یہود کو معجزہ دکھایا جائے۔ حالانکہ اس معجزہ سے بجائے اس کے کہ وہ کچھ فائدہ اُٹھاتے وہ تو اَور زیادہ بگڑے ہونگے کہ یہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے کتاب دی حالانکہ اس کے پاس کوئی کتاب نہیں۔ کہتا ہے کہ اُس نے مجھے نبی بنایا ہے حالانکہ ابھی اُس کو طہارت بھی اس کی ماں کرواتی ہے کہتا ہے کہ اُس نے مجھے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے حالانکہ پاس پیسہ بھی نہیں۔ اور اگر کہو کہ دشمن پر صرف اُن کا بولنا حجت تھا گویا معجزہ کسی اَور بات میں نہیں تھا بلکہ معجزہ صرف اتنا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ بول پڑا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اتنے جھوٹ بلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک دو ماہ کا بچہ تھا اگر خالی اتنا ہی کہدیگا کہ "چچا جان کیا حال ہے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں خدا کا خوف کریں" تو بڑے بڑے جبہ پوش فقیہوں اور فریسیوں نے اُسی وقت بھاگ جانا تھا اتنے جھوٹ بلوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مریم کئی سال باہر رہیں۔ جب وہ تیس سال کے ہوگئے (انجیل لوقا باب ۳ آیت ۲۳) اور اللہ تعالےٰ نے اُن کو نبوت کے مقام پر فائز کر دیا تو حضرت مریم اُنکو ساتھ لے کر اپنی قوم میں واپس آئیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے دشمن رشتہ دار کھوج میں رہے یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دشمنوں نے راز کا پتہ لگا ہی لیا اور یا پھر خدا تعالےٰ نے اپنے نشان کو نمایاں کرنے کے لئے راز فاش کروا دیا

عربی کی کتابوں میں ایک لطیفہ لکھا ہے جو دراصل لطیفہ نہیں بلکہ کثیفہ ہے مگر اس لئے کہ یہاں چسپاں ہوتا ہے اُسے بیان کر دیتا ہوں۔

ہماری عربی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی مولوی صاحب

تھے جو بڑے بے وقوف اور بخیل تھے۔ جو بھی روپیہ آتا اُسے جمع کر لیتے اور بیوی کو صرف آنہ دو آنے خرچ کرنے کے لئے دے دیتے۔ تنگ آکر وہ طلاق لے لیتی دوسری آتی تو اُسے بھی اِسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا آخر ایک عورت آئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ میں اِس بخیل سے اس کا سارا روپیہ چھین لُوں گی چنانچہ اُس نے آتے ہی اپنے پاس سے خوب مزیدار چیزیں پکا پکا کر اُسے کھلانی شروع کر دیں اور کہتی یہ میرے بھائی نے بھیجی ہیں۔ یہ میرے چچا نے بھیجی ہیں یہ میرے فلاں رشتہ دار نے بھیجی ہیں۔ اِسی طرح اُس نے پیاز اور لہسن وغیرہ خوب کھلانے شروع کر دئے اُس نے یہ بھی پتہ لگا لیا کہ روپیہ کہاں رکھا ہے چنانچہ وہ رسّی کو موم لگا کر اس جگہ لٹکاتی جہاں روپیہ رکھا تھا اور ایک اشرفی نکال لیتی اور اُسی سے اُسے کھلانا پلانا شروع کر دیتی۔ جب وہ اشرفی ختم ہو جاتی تو ایک اور نکال لیتی۔ آخر نفاخ چیزیں کھا کھا کر اُس کا جگر خراب ہو گیا اور پیٹ پھولنا شروع ہو گیا۔ جب اُس کا پیٹ کچھ زیادہ بڑھ گیا تو عورت نے اس کا پیٹ ملنا شروع کیا اور پیٹ ملتے ملتے کہا کہ تمہیں تو حمل ہو گیا ہے۔ وہ گو مولوی تھا مگر بیوقوف تھا۔ سنتے ہی کہنے لگا خبردار کسی کو بتانا نہیں ورنہ میری بڑی بدنامی ہوگی۔ اُس نے کہا فکر نہ کرو مَیں کسی کو نہیں بتاتی۔ غرض اِسی طرح اس کا پیٹ پھولتا چلا گیا اور وہ یقین دلاتی چلی گئی کہ یہ حمل ہے۔ نو ماہ کے بعد اُس نے اپنی ایک ہمسائی سے جو اس کی سہیلی تھی مشورہ کیا اور دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ کسی کا بچہ اُٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے دکھا دیتے ہیں کہ یہ تیرے حمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کسی کا بچہ لے آئے اور انہوں نے اُس کا پیٹ خوب ملنا شروع کیا اور پھر ایک بچہ نکال کر دکھا دیا کہ لو یہ بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے منتیں کرنی شروع کیں کہ کسی کو بتانا نہیں۔ اور پھر کہا کہ اب بچہ تو پیدا ہو گیا ہے اس کے دُودھ کا کیا انتظام ہوگا۔ وہ کہنے لگی کہ دُودھ کا فکر نہ کرو۔ مَیں اس کا خود انتظام کر لوں گی۔ اِدھر اُس نے سارے شہر میں خبر مشہور کر دی کہ مُلّاجی کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا ہے اور سارے شہر کے لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ وہ اس قدر گھبرایا کہ شہر چھوڑ کر ہی بھاگ گیا اور پندرہ بیس سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر اُسے خیال آیا کہ اب تو بات بہت پرانی ہو چکی ہے سب لوگ اس قصہ کو بھول چکے ہوں گے آؤ اب وطن واپس چلوں چنانچہ بیس سال کے بعد وہ اپنے شہر میں واپس آیا۔ شہر کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ پُرانے لوگوں میں سے کئی مر چکے تھے اور بچے جوان ہو چکے تھے۔ ایک جگہ کچھ نوجوان کھیل رہے تھے۔ اُس نے ایک لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ کچھ جانتے ہو فلاں مکان کس گلی میں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے تو کچھ علم نہیں۔ وہ حیران ہوا اور اُس نے پوچھا کہ لڑکے تمہاری عمر کتنی ہے۔ اُس نے کہا عمر کا تو مجھے علم نہیں مگر جس سال قاضی کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا تھا اُسی سال مَیں پیدا ہوا تھا۔ ایسا ہی لطیفہ اس جگہ گذرا حضرت مریم تو بھاگیں مگر وہ رشتہ دار جو اُن کے شریک تھے انہوں نے اس واقعہ کو یاد رکھا اور جب آپ واپس پہنچیں اور انہوں نے دیکھا کہ وہی بچہ آگیا ہے جس کی خبر مشہور ہوئی تھی تو انہوں نے حضرت مریم کو طعنہ دیا

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ۔ اُن کے طعنہ پر حضرت مریم شرما گئیں اور انہوں نے حضرت مسیح کی طرف اشارہ کر دیا مگر وہ بچہ اب جوان ہو کر خدا تعالیٰ کا نبی بن چکا تھا

اُس نے کہا تم کیا بکواس کرتے ہو اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا میں خدا تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں ظاہر کرنیوالا ہوں۔ میں خدا تعالیٰ کے اخلاق کو دنیا میں قائم کرنے والا ہوں۔ خدا نے مجھے کتاب دی ہے اور خدا نے مجھے نبی بنایا ہے کیا ایسی اولاد حرام کی اولاد ہو سکتی ہے۔ وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ اور اُس نے مجھے مبارک بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ اور خدا نے مجھے نماز کا اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے مَادُمْتُ حَیًّا جب تک کہ میں زندہ رہوں۔

اگر یہ دودھ پیتے زمانہ کا معجزہ تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دودھ پیتے وقت چلتے پھرتے بھی تھے اور نمازیں بھی پڑھتے تھے اور زکوٰتیں بھی دیتے تھے حالانکہ اس بات کو نہ غیر احمدی مانتے ہیں اور نہ عیسائی مانتے ہیں۔ اگر کہو کہ یہ آئندہ کی پیشگوئیاں تھیں تو سوال یہ ہے کہ وہ بولا تو اس لئے تھا کہ لوگ ایمان لاتے مگر اِس سے تو اُن کے ایمان اور بھی خطرہ میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ کیسا جھوٹا ہے کہتا کیا ہے اور اس کی حالت کیا ہے۔ جب اس نے کہا ہوگا کہ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ مجھے اُس نے کتاب دی ہے تو وہ کہتے ہوں گے صریح جھوٹ ہے دکھاؤ کتاب کہاں ہے اور پھر اگر اُس نے کتاب دے دی تھی تو اُس کے اوّل منکر خود مسیح ہوئے کیونکہ اُس پر عمل نہیں کیا۔

اِسی طرح جب انہوں نے کہا ہوگا کہ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا اُس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ تو وہ کہتے ہوں گے کیسا جھوٹا ہے۔ تجھے نبی بنایا ہے تُو تو ابھی ماں کا پستان چوس رہا ہے۔

جب کہا ہوگا کہ وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ تو وہ کہتے ہوں کہ خوب! ماں کی گود سے تو اُتر نہیں سکتا اور کہتا یہ ہے کہ میں جہاں کہیں جاؤں خدا نے مجھے برکت والا بنایا ہے۔

جب کہا ہوگا وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مجھے اُس نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ تو انہوں نے کہا ہوگا کہ اچھا فرمائیے آپ نے کتنی نمازیں پڑھی ہیں اور پھر دھیلہ آپ کی جیب میں نہیں اور کہتے یہ ہیں کہ مجھے اُس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔

جب کہا ہوگا وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ میں اپنی ماں سے بڑا احسن سلوک کرنے والا ہوں۔ تو وہ کہتے ہوں گے کہ تُو ماں کے کپڑوں پر تو پیشاب کر رہا ہے اور ماں تجھے خوبی چوسا رہی ہے اور تُو کہتا ہے کہ میں اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں۔

اِسی طرح جب کہا ہوگا کہ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا مجھے اُس نے جبار اور شقی نہیں بنایا۔ میں ایسا نہیں ہوں کہ لوگوں پر ظلم کروں اور اُن کے حقوق تلف کروں۔ تو وہ کہتے ہوں گے کہ تُو نے ظلم کیا کرنا ہے تجھے تو خود بات بات میں دوسروں کی احتیاج ہے

لیکن اگر اِتنے جھوٹ بولنے کی بجائے وہ صرف اِتنا ہی کہہ دیتے کہ چچا جان آپ میری ماں پر کیسا ظلم کر رہے ہیں اور کیسی جھوٹی باتیں اُس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بات سے ہی اُن مولویوں اور پنڈتوں نے بھاگ جانا تھا۔ اِن دعووں کے ساتھ تو یہ معجزہ رہا ہی نہیں صریح جھوٹ بن گیا ہے جس کا دشمن پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب وہ جوان ہوئے اور تیس سال کی عمر میں یروشلم آئے اُس وقت حضرت مریم بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ رشتہ دار مجھے طعنہ دیں گے۔ پس جب انہوں نے طعنہ دیا اور کہا کہ یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا

تو انہوں نے کہا تم مجھے کیا طعنہ دیتے ہو اسی سے پوچھ لو
حضرت مسیحؑ نے کہا تم یہ کیا باتیں کر رہے ہو خدا نے مجھے
نبی بنایا ہے۔ خدا نے مجھے تقویٰ و طہارت عطا کیا ہے
خدا نے مجھے علم الکلام عطا کیا ہے۔ خدا نے مجھے اخلاقِ
فاضلہ سے متصف کیا ہے۔ وَ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ اگر ماں
میرے لئے ایسی ہی ٹھوکر کا موجب ہوتی تو میں اُس کا
اِتنا خدمتگزار کیوں ہوتا۔ خدا نے اس کی نیکی دیکھ کر
ہی اُسے چُن لیا اور مجھے اُس کے گھر میں پیدا کر دیا۔

پس یہاں مہد سے بچپن کا زمانہ نہیں بلکہ
بڑی عمر کا کلام مراد ہے یعنی تیس سال کی عمر کا جو کہولت
سے پہلے ہوتا ہے۔ کہولت کا زمانہ تیس سے پچاس تک
کا ہوتا ہے اس کے بعد بڑھاپا شروع ہوتا ہے۔
مسیح تیس سال کی عمر میں نبی ہوتے اور ۳۳ سال تک
اپنے ملک میں رہے۔ پس انہیں مہد و کہولت میں بولنے
کا موقع ملا۔ بڑھاپے میں بولنے کا موقع انہیں غیر ملکوں
میں جا کر ملا۔

اِن آیات کے متعلق اِس وقت تک میں نے یہ
مضمون بیان کیا ہے کہ قرآن کریم حضرت مسیحؑ کے متعلق
کیا نظریہ پیش کرتا ہے۔ آیا انہوں نے اس وقت
کلام کیا تھا جب وہ ابھی ماں کی گود میں تھے یا
اُس وقت کلام کیا تھا جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے
نبوت کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ مگر جیسا کہ ہر شخص
سمجھ سکتا ہے اِن آیات کا تعلق صرف مسلمانوں کے ساتھ
نہیں بلکہ عیسائیوں کے ساتھ بھی ہے اور اُن کی طرف
سے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ہمارے
لیڈر کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے۔ چنانچہ اب
میں اِسی سوال کی طرف آتا ہوں کہ آیا عیسائی بھی اِس
بات کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کہ مسیحؑ نے یہی کچھ بیان
کیا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ
اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔

عیسائی مفسر اور عیسائی مصنف جو اسلام کے
متعلق کتابیں لکھتے ہیں وہ اس موقع پر آپے سے باہر
ہو جاتے ہیں اور نہایت غصہ سے رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم پر حملہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ
نے اپنی بات منوانے کے لئے مسیح کے مُنہ میں جھوٹی باتیں
ڈالیں گویا علماء نے اپنے قول سے مسیح کی طرف تو ایک
معجزہ منسوب کیا لیکن اپنے آقا اور سردار محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کو عیسائیوں سے گالیاں دلوائیں اور
انہیں جھوٹا کہلوایا۔ وہ کہتے ہیں مسیح تو خدا تھا پھر اِنِّیْ
عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا
کہنے کے کیا معنے ہوئے۔ اُن کے نزدیک محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) اپنی بات سچی ثابت کرنے کیلئے
مسیحؑ کی زبان سے اس قسم کے فقرے کہلوائے ہیں۔
جو بالکل غلط ہیں اور جن کو مسیحؑ کی طرف کسی صورت میں
بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس موقع پر وہ اپنی
شدید نفرت کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں
کہ قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ کی طرف بالکل غلط دعاوی
منسوب کر دئے ہیں پس ہم اِن آیات سے اُس وقت
تک نہیں گذر سکتے جب تک ہم یہ بھی ثابت نہ کر دیں
کہ جو کچھ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ درست ہے
اور اناجیل سے بھی وہی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ جو
قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ یہ اسلامی تعلیم یا اسلامی
ہسٹری کا سوال نہیں کہ ہم خاموشی سے گذر جائیں اور
کہیں کہ کسی غیر کا اس سے کیا تعلق ہے۔ یہ ایسی باتیں
ہیں جو ایک قوم کے لیڈر کے متعلق کہی گئی ہیں اور
دعویٰ کیا گیا ہے کہ اُس نے یہ باتیں کہیں۔ پس اُس
لیڈر کے اتباع کا حق ہے کہ وہ کہیں کہ اِن باتوں کا
ثبوت لاؤ اور اگر واقعہ میں انجیل سے اِن باتوں کا کوئی

ثبوت نہ ملے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن انسانی
کتاب سمجھا جائے گا اور یہ خیال کیا جائیگا کہ نعوذ باللہ
قرآن کریم نے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی
ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جو کچھ قرآن کریم
نے بیان کیا ہے وہ درست ہے اور انجیل سے بھی یہی
باتیں ظاہر ہوں تو نہ صرف یہ سوال حل ہو جائیگا
کہ مسیح مہد میں نہیں بولا بلکہ یہ سوال بھی حل ہو جائیگا
کہ مسیح کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب کرنا غلط ہے
مسیح بھی ایک ویسا ہی انسان تھا جیسا کہ اور لوگ
اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے حضرت مسیح کی طرف جو باتیں
منسوب کی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے
کہا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اسی
طرح انہوں نے کہا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا
اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا
ہے۔ اب یہ باتیں اگر درست ہیں تو اس میں شبہ کی
کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مسیح نہ خدا تھا نہ خدا کا
بیٹا تھا بلکہ وہ خدا کا ایک نبی تھا۔ پس ان آیات پر
یقیناً عیسائیوں کو چڑنے کا حق ہے گو بدکلامی کا حق
نہیں۔ یہ تو انہیں حق حاصل ہے کہ وہ کہیں کہ قرآن کریم
نے مسیح کی طرف غلط دعاوی منسوب کر دیتے ہیں مگر
اُن کا یہ حق نہیں کہ وہ بدزبانی پر اُتر آئیں اور گالیوں
سے کام لیں۔ بہرحال جب ہم انجیل پر غور کرتے ہیں
تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی عقائد غلط فہمیوں
پر مبنی ہیں اور اسلام اور قرآن نے جو بات کہی ہے
وہی صحیح اور درست ہے۔

پہلی بات قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ مسیح نے کہا
اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ۔ اب اگر انجیل بھی یہی کہتی ہے کہ
مسیح اللہ کا بندہ تھا تو قرآن کریم کی بات سچی ثابت
ہو جائے گی۔ پس سب سے پہلے ہم اسی بات کو لیتے
ہیں اور قرآن کریم کے اس بیان کی تائید کے لئے
متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۱ کو پیش کرتے ہیں۔ اُس
میں لکھا ہے

"تب یسوع روح کے وسیلے بیابان میں لایا
گیا تا کہ شیطان اُسے آزمائے اور جب
چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا
آخر کو بھوکا ہؤا۔ تب آزمائش کرنے والے
نے اُس پاس آ کے کہا اگر تُو خدا کا بیٹا
ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جائیں۔ اُس
نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ انسان صرف
روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو
خدا کے مُنہ سے نکلتی جیتا ہے۔ تب شیطان
اُسے مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا
اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اس
سے کہا کہ اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں
نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے
اپنے فرشتوں کو فرمائے گا اور وے تجھے
ہاتھوں پر اُٹھا لیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے
پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے۔ یسوع نے
اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تُو خداوند
اپنے خدا کو مت آزما۔ پھر شیطان اُسے
ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا
کی ساری بادشاہتیں اور اُنکی شان و شوکت
اُسے دکھائیں اور اُس سے کہا اگر تُو گر کے
مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دیدونگا
تب یسوع نے اُسے کہا اے شیطان دور
ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو
سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر۔ یہ آیات

بتاتی ہیں کہ گو مسیح نے شیطان کو سجدہ
نہیں کیا مگر مسیحی قوم نے آخر شیطان کو سجدہ
کیا تبھی اُن کو دنیا کی بادشاہت مل گئی۔
کیونکہ انجیل بتاتی ہے کہ دنیا کی بادشاہت
شیطان کو سجدہ کرنے کے نتیجہ میں ملتی
ہے) تب شیطان اُسے چھوڑ گیا اور دیکھو
فرشتوں نے آکے اُسکی خدمت کی۔"

یہ بیان کس تفصیل سے مسیح کی انسانیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ شیطان اُسے آزمانے کے لئے آیا۔ اب کوئی عقلمند یہ نہیں مان سکتا کہ شیطان جس نے مسیح کو آزمانا چاہا وہ اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا صفات ہیں اور اس کے اندر کیا کیا طاقتیں پائی جاتی ہیں۔ بائبل میں جہاں بھی شیطان کا ذکر آتا ہے وہاں سے اتنا تو پتہ لگتا ہے کہ شیطان ایک باغی وجود تھا اور خدا تعالےٰ کی معرفت کاملہ اس کو حاصل نہیں تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا طاقتیں ہیں۔ پس شیطان کا مسیح کے پاس اُس کی آزمائش کے لئے آنا جبکہ وہ جانتا تھا کہ خدا تعالےٰ کو آزمایا نہیں جا سکتا صاف بتاتا ہے کہ شیطان یہ بھی جانتا تھا کہ مسیح خدا نہیں۔ ورنہ اگر وہ جانتا کہ یہ خدا ہے تو وہ اُسے آزمانے کے لئے کیوں آتا۔

پھر لکھا ہے جب وہ چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ رکھ چکا تو "آخر کو بھوکا ہوا"۔ اب چالیس دن اور چالیس رات کے روزہ کے اگر یہ معنے بھی لئے جائیں کہ اس نے چالیس دن رات کھانا نہیں کھایا تب بھی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ گاندھی جی نے تو ساٹھ ساٹھ دن کے بھی روزے رکھے ہیں۔ پھر یہاں صرف بھوکا رہنے کا ذکر ہے پیاسا رہنے کا ذکر نہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح گاندھی جی پھلوں کا رس اور سوڈا وغیرہ پی لیا کرتے تھے اسی طرح وہ بھی چالیس دن رات صرف پانی اور پھلوں کا رس وغیرہ پیتے رہے روٹی انہوں نے نہیں کھائی لیکن بہرحال جب چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ ختم ہوا تو انجیل بتاتی ہے کہ انہیں بھوک لگی اور جب وہ بھوکے ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ انسان تھے خدا نہیں تھے کیونکہ بھوک انسان کو ہی لگا کرتی ہے خدا کو نہیں۔

عیسائی اس موقع پر کہا کرتے ہیں کہ چونکہ مسیح انسانی جسم میں تھا اس لئے انسانی حوائج بھی اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ہمارا تو اعتقاد ہے کہ اُس کا جسم بھی انسانی تھا اور اس کی روح بھی انسانی تھی۔ لیکن بہرحال ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں کہ کم از کم تم نے مسیح کا انسانی جسم تو مان لیا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ اُس میں انسانی روح تھی یا خدائی۔ اس کا حل اگلی آیات سے ہو جاتا ہے۔

لکھا ہے شیطان نے اُس سے کہا کہ
" اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی
بن جائیں "
اس پر حضرت مسیحؑ نے کہا
" لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں
بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے مُنہ سے
نکلتی۔ جیتا ہے "

یعنی شیطان نے کہا کہ پتھر کو روٹی بنا دے۔ اب پتھر کو روٹی بنانا خدا کے اختیار میں ہے انسان کے اختیار میں نہیں پس چونکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں تھی۔ اس لئے شیطان نے کہا کہ جب تُو کہتا ہے کہ میں

خدا کا بیٹا ہوں اور لوگ بھی تجھے ایک فوق العادت وجود سمجھتے ہیں تو تُو پتھر کو روٹی بنادے مگر اُس نے ایسا نہ کیا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اُس میں خدائی طاقتیں نہیں تھیں۔

اِس موقع پر عیسائیوں کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ روٹی نہ بنانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس میں خدائی طاقتیں نہیں تھیں کیونکہ یہ امر اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ اگر اُس کا جی چاہتا تو وہ پتھر کو روٹی بنا سکتا تھا۔ مگر چونکہ اُس نے نہ چاہا کہ وہ ایسا کرے۔ اِس لئے پتھر روٹی نہ بن سکا۔ پس اگر مسیح نے یہ معجزہ نہیں دکھایا تو اِس سے اُس کے عجز کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اِتنا ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے جب شیطان کی گستاخی دیکھی تو اُس نے اُس کی بات کو ردّ کر دیا اور کہہ دیا کہ تم کون ہوتے ہو جو مجھ سے ایسا سوال کرو جاؤ مَیں پتھر کو روٹی نہیں بناتا۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ مسیحؑ نے پتھر کو روٹی کیوں نہ بنایا ہمیں اِس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ مسیحؑ نے اِس سوال کا جواب کیا دیا ہے؟ اگر تو مسیحؑ یہ جواب دیتا کہ میں پتھر کو روٹی نہیں بناتا یہ امر میری مرضی پر منحصر ہے تم کون ہو جو مجھے اِس امر پر مجبور کرو۔ تب تو یہ بات درست تسلیم کی جاسکتی تھی کہ مسیحؑ نے پتھر کو روٹی اِس لئے نہیں بنایا کہ وہ بنا نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اس لئے نہیں بنایا کہ وہ بنانا نہیں چاہتا تھا لیکن مسیح یہ جواب دیتا ہے کہ

"لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں
بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی
جیتا ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ وہاں کون سے دو وجود تھے جو باتیں کر رہے تھے۔ کیا روٹی کھانے والا وجود وہاں مسیحؑ کے علاوہ کوئی اَور بھی تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ شیطان روٹی کھانے والا نہیں تھا۔ روٹی کھانے والا وجود صرف مسیحؑ تھا اور مسیحؑ یہ جواب دیتے ہیں کہ آدمی روٹی کے بغیر بھی جیتا ہے گویا مسیحؑ نے اِس امر کا اقرار کیا کہ مَیں انسان ہوں اور روٹی کا محتاج ہوں۔ لیکن اگر خدا نے مجھے روٹی نہیں دی تو مجھے خدا کے کلام پر اعتبار کرنا چاہیئے اور ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں کہ پتھر روٹی بن جائیں۔

پھر اُس نے کہا کہ

"انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک
بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی۔ جیتا ہے"

یہ بھی وہ اپنے متعلق ہی کہتا ہے پس معلوم ہوا کہ مسیحؑ خدا کی باتوں سے جیتا تھا اور جو خدا کی باتوں سے جیتا ہے وہ خدا نہیں ہوسکتا۔

پھر لکھا ہے

"تب شیطان اُسے مقدس شہر میں اپنے
ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا
کر کے اُس سے کہا کہ اگر تُو خدا کا بیٹا ہے
تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے
کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائیگا
اور وَے تجھے ہاتھوں پر اُٹھا لیں گے۔
ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے"

یعنی شیطان نے کہا کہ تم ہیکل کے کنگرے سے اپنے آپکو نیچے گرا دو۔ اگر تم ایسا کروگے تو میں سمجھ لوں گا کہ تم خدا ہو کیونکہ خدا کو چوٹ نہیں لگ سکتی اِس پر مسیح نے کہا

"یہ بھی لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو مت آزما"

یعنی یہ کام بھی میں اِس لئے نہیں کرتا کہ میں اپنے خدا کو کس طرح آزماؤں۔ میں خدا کا ایک بندہ ہوں اور

بندوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے خدا کو مت آزمائیں۔

پھر شیطان اُسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور اُن کی شان و شوکت اُسے دکھائیں اور اُس سے کہا اگر تو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دُوں گا۔" یہ الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ مسیحؑ خدا نہیں تھا۔ کیونکہ خدا کی تو سب چیزیں ہیں۔ جب وہ مسیحؑ کو کہتا ہے کہ اگر تو مجھے سجدہ کرے تو میں سب کچھ تجھے دے دُوں گا۔ تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ شیطان جانتا تھا کہ یہ خدا نہیں ورنہ خدا کو کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں تجھے سب چیزیں دے دُوں گا۔ جو چیزیں ہیں ہی خدا کی وہ خدا کو دینے کے کیا معنے ہیں۔ پس اگر مسیحؑ شیطان کی نظر میں خدا ہوتا تو وہ اُسے یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اگر تُو مجھے سجدہ کردے تو میں دنیا کی سب نعمتیں تجھے دے دونگا اور پھر جب مسیحؑ نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ یہ سب چیزیں میری ہیں تو اس سے بھی پتہ لگا کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا کا بندہ ہی سمجھتا تھا۔ اگر مسیحؑ خدا ہوتا تو مسیحؑ کا جواب یہ ہونا چاہیئے تھا کہ میں تو خدا ہوں اور میری ہی یہ سب چیزیں ہیں تم میری ہی چیزیں مجھے دینے کا کیا وعدہ کرتے ہو۔ مگر مسیحؑ اس کا بھی یہ جواب دیتا ہے کہ "اے شیطان دُور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُس اکیلے کی بندگی کر"۔ گویا مسیحؑ نے اقرار کر لیا کہ مَیں صرف خدا کا ایک بندہ ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ مَیں اُسی کو سجدہ کروں اور اُسی کی عبادت بجا لاؤں۔

لوقا باب ۴ آیت ۱ تا ۱۳ میں بھی یہی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ صرف اس میں اتنی بات زائد ہے کہ متی نے تو یہ لکھا ہے کہ وہ چالیس دن اور چالیس رات بھوکا رہنے کے بعد آزمایا گیا اور یہاں یہ لکھا ہے کہ چالیس دن تک شیطان اُسے آزماتا رہا۔ ہمارے مولوی کہتے ہیں کہ مسیحؑ کو شیطان نے مس بھی نہیں کیا اور انجیل کہتی ہے کہ چالیس دن تک شیطان اُسے اپنے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور مختلف آزمائشوں میں سے اُسے گذرنا پڑا۔ گویا اُس کو خدا ماننے والے تو اُس کو مسِ شیطان سے پاک نہیں کہتے لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع باقی سب نبیوں کو مسِ شیطان سے آلودہ قرار دیتے ہیں صرف اُس نام نہاد خدا کے بیٹے کو جس کے متعلق اُس کی اُمت بھی کہتی ہے کہ چالیس دن تک شیطان کے ساتھ پھرتا رہا مسِ شیطان سے پاک قرار دیتی ہے۔ پھر لطیفہ یہ ہے کہ مسلمان مولوی تو یہ کہتے ہیں کہ پیدائش کے وقت جب وہ بچہ تھا اس وقت بھی اُسے شیطان نے نہیں چھوا۔ لیکن انجیل کہتی ہے کہ جب وہ بالغ اور عاقل تھا تب بھی وہ شیطان کے ساتھ ساتھ پھرتا تھا صرف ایک دو منٹ کے لئے نہیں بلکہ چالیس دن تک پھرتا رہا۔

پھر یوحنا باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے

"تم جسے نہیں جانتے اس کی پرستش کرتے ہو
ہم جسے جانتے ہیں اس کی پرستش کرتے
ہیں کیونکہ نجات یہودیوں میں سے ہے"۔

اِس حوالہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے آپ کو خدا کا ایک بندہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ فرماتے ہیں کہ مَیں اور باقی یہودی اُس خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کو ہم جانتے ہیں اور تم اس کی پرستش کرتے ہو جسے تم نہیں جانتے۔

پھر خدائی کی ایک بڑی علامت علم غیب ہوتا ہے۔ اگر کوئی خدائی کا دعویدار ہو تو ضروری ہے کہ علم غیب بھی اُسے حاصل ہو۔ مگر مسیحؑ کہتا ہے کہ

"اُس دن یا اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں

جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ۔"

(مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲)

اُس دن یا اُس گھڑی میں اختلاف ہو کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگ اس سے قیامت مراد لیتے ہیں اور بعض اس سے مسیح کی آمد ثانی مراد لیتے ہیں بہرحال قیامت مراد ہو یا مسیح کی آمد ثانی حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ اُس دن یا اُس گھڑی کو نہ میں جانتا ہوں نہ آسمان کے فرشتے جانتے ہیں صرف خدا جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ گویا علم غیب کے متعلق حضرت مسیحؑ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالےٰ کو حاصل ہو مجھے حاصل نہیں۔ اگر وہ خدا ہوتا تو اُسے بھی یہ علم غیب حاصل ہوتا۔

اسی طرح مرقس باب ۱۰ آیت ۱۷، ۱۸ میں لکھا ہے

"اور جب وہ باہر نکل کر راہ میں جا رہا تھا تو ایک شخص دوڑتا ہوا اُس کے پاس آیا اور اُس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اُس سے پوچھنے لگا کہ اے نیک اُستاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں یسوع نے اُس سے کہا تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔"

ان آیات میں حضرت مسیحؑ دو دعوے کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ نیک صرف خدا ہے۔ دوسرا یہ کہ مَیں نیک نہیں ہوں۔ اب اِس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں خدا نہیں تم منطقی صغریٰ کبریٰ بنا لو۔ اِس کے سوا کوئی اور نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ ایک طرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نیک صرف خدا ہے اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہو کہ مَیں نیک نہیں۔ ان دو دعووں کا سوائے اس کے اَور کوئی مفہوم نہیں کہ مَیں خدا نہیں۔ گویا حضرت مسیحؑ انسان ہونے کا اس جگہ اقرار کرتے ہیں۔

یہاں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض مسلمان بغیر حقیقت پر غور کرنے کے اس جگہ عیسائیوں سے بھی زیادہ جوش میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا مسیحؑ نیک نہیں تھا اگر کسی احمدی سے یہ سوال کیا جائے تو وہ کہے گا کہ تم عیسائیوں سے پوچھو اُن کی کتاب میں یہ لکھا ہے۔ پس اس کے جواب کی اصل ذمہ واری اُن پر ہے ہم پر نہیں لیکن اگر ہمیں ہی جواب دینا پڑے تو ہم یہ جواب دیں گے کہ عبد اللہ کی نیکی کسبی ہوتی ہے اور یہاں حضرت مسیحؑ کی مراد اُس نیکی سے ہے جو ذاتی ہوتی ہے۔ انسان کی نیکی کسبی ہوتی ہے اور خدا تعالےٰ کی نیکی ذاتی ہوتی ہے۔ اِسی لئے خدا قدوس کہلاتا ہو لیکن انسان قدوس نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اپنی ذات میں بے عیب ہے اور انسان بے عیب کوشش سے بنتا ہے۔ خدا تعالےٰ پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا جب وہ ناقص تھا اور پھر اُس نے کامل بننے کی کوشش کی۔ لیکن انسان پہلے ناقص ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ پہلے وہ بچہ ہوتا ہے پھر اُسے عقل آتی ہے تو وہ نماز شروع کرتا ہے اس کے بعد ایک دن کی نماز اُسے کچھ اَور آگے لے جاتی ہے۔ دو دن کی نماز اُسے اور آگے لے جاتی ہے۔ تین دن کی نماز اُسے اَور آگے لے جاتی ہے۔ لیکن خدا تعالےٰ جیسے آج سے اربوں ارب سال پہلے تھا اُسی طرح آج بھی ہو اسکی قدوسیت نہ پہلے کم تھی اور نہ آج زیادہ ہو لیکن انسان کی نیکی کسی وقت کم ہوتی ہے اور کسی وقت زیادہ ہوتی ہے چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ بچہ ہوتا ہے تو اُس کی نیکی ادنیٰ ہوتی ہے۔ جب وہ صداقتوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے تو اُس کی نیکی کا معیار اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے اور جب اُس پر شریعت یا الہام نازل ہونا شروع ہوتا ہے تو اُس کی روحانیت اور زیادہ ترقی کر جاتی ہے

پس جب مسیحؑ نے کہا کہ میں نیک نہیں تو اس کے صرف
اتنے معنے تھے کہ میرے اندر ذاتی نیکی نہیں کسبی نیکی ہے
اِسی طرح یوحنا میں لکھا ہے کہ ایک عورت کو
لوگ پکڑ کر آپ کے پاس لائے اور کہا کہ یہ عورت زنا
کی حالت میں پکڑی گئی ہے موسیٰؑ کی شریعت کے مطابق
زانیہ کی سزا سنگساری ہوتی ہے مگر ہم اسے آپ
کے پاس لائے ہیں آپ اس کے متعلق کیا فتویٰ دیتے
ہیں۔ مسیحؑ نے جواب دیا کہ جو شخص تم میں بے گناہ ہے
وہ آگے آئے اور سب سے پہلے اُس کو پتھر مارے۔
وہ لوگ یہ سُنکر بھاگ گئے۔ حضرت مسیحؑ نے اُس عورت
سے پوچھا کہ تجھ پر حکم لگانے والے لوگ کہاں چلے گئے
اُس نے کہا کہ بھاگ گئے۔ حضرت مسیحؑ نے کہا جا میں بھی
تجھ پر کوئی حکم نہیں لگاتا۔ اِس بارہ میں انجیل کے اصل
الفاظ یہ ہیں۔ لکھا ہے

" فقیہہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا
میں پکڑی گئی تھی اور اُسے بیچ میں کھڑا
کرکے یسوع سے کہا اَے اُستاد یہ
عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی
گئی ہے۔ توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم
دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں
پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے۔
انہوں نے اُسے آزمانے کے لئے یہ کہا تاکہ
اُس پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں۔
مگر یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے
لگا۔ جب وہ اُس سے سوال کرتے ہی رہے
تو اُس نے سیدھے ہو کر اُن سے کہا کہ جو
تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اُس کے پتھر
مارے اور پھر جھک کر زمین پر انگلی سے
لکھنے لگا۔ وہ یہ سُن کر بڑوں سے لے کر
چھوٹوں تک ایک ایک کرکے نکل گئے۔
اور یسوع اکیلا رہ گیا اور عورت وہیں بیچ
میں رہ گئی۔ یسوع نے سیدھے ہو کر اُس
سے کہا۔ اے عورت یہ لوگ کہاں گئے۔
کیا کسی نے تجھ پر حکم نہیں لگایا؟ اُس نے
کہا اے خداوند کسی نے نہیں یسوع نے
کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا۔ جا پھر
گناہ نہ کرنا" (انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۳ تا ۱۱)

اب دیکھو فقیہی اور فریسی کہتے ہیں کہ موسیٰ کی
شریعت میں ایسی عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔
حضرت مسیح کہتے ہیں کہ تم میں سے وہ شخص پہلے پتھر چلائے
جو بے گناہ ہو۔ مگر جب سب لوگ ایک ایک کرکے
غائب ہو گئے تو مسیح نے اُس عورت سے کہا کہ میں بھی
تجھ پر حکم نہیں لگاتا جس کے معنے یہ ہیں کہ میں بھی بے گناہ
نہیں ہوں۔ یہ حوالہ بھی بتاتا ہے کہ مسیح اپنے گنہگار ہونے
کا اقرار کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ
وہ بندہ ہونے کا اقرار کرتا ہے۔

دُوسری بات قرآن کریم نے حضرت مسیح کی طرف
یہ منسوب کی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا
اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ اُس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اِس
کے لئے دیکھو یوحنا باب ۸ آیت ۲۸۔ جہاں حضرت
مسیح کہتے ہیں کہ مَیں

" اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس طرح
باپ نے مجھے سکھایا اُسی طرح یہ باتیں
کہتا ہوں"

یہ حوالہ اس امر پر صراحتًا دلالت کرتا ہے کہ
حضرت مسیحؑ لوگوں کو جو کچھ تعلیم دیتے تھے وہ اپنی طرف
سے نہیں دیتے تھے بلکہ وہی کچھ بتاتے تھے جو خدا انہیں
بتاتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مَیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا

بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا ہے اور جس طرح اُس نے مجھے تعلیم دی ہے اُسی طرح میں لوگوں کو کہتا ہوں مجھے یہ اختیار حاصل نہیں کہ میں اپنی طرف سے اُنہیں کچھ کہوں۔

اسی طرح حضرت مسیح کہتے ہیں

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا ہوں۔منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو"

(انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷ - ۱۸)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح یہود کی طرف اس لئے مبعوث کئے گئے تھے کہ وہ تورات کو رائج کریں پس قرآن کریم نے جو اُن کے متعلق اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ بالکل صحیح اور درست ہیں۔ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ کے الفاظ اس لحاظ سے بھی استعمال ہوئے ہیں کہ ایک پہلے نبی کی کتاب پر عمل کرنے اور دوسروں سے عمل کروانے کا انہیں حکم تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ پہلی کتاب کی تفسیر انہیں الہاماً سکھائی جاتی تھی اور یہ دونوں باتیں انجیل سے ثابت ہیں حضرت مسیح نے یہ بھی کہا کہ میں تورات کو رائج کرنے اور اُس کے احکام پر عمل کروانے کے لئے آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں اپنی طرف سے کوئی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا مجھے سکھاتا ہے۔

تیسری بات قرآن کریم نے یہ بتائی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم کے سامنے نبوّت کا دعویٰ پیش کیا اور کہا کہ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا خدا تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے

اس کی صداقت بھی انجیل سے ثابت ہے۔یوحنا میں لکھا ہے حضرت مسیحؑ نے کہا

"جس نے مجھے بھیجا ہے وہ میرے ساتھ ہے (نبی اُسی کو کہتے ہیں جسے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا جائے) اُس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اُسے پسند آتے ہیں"

(انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۲۹)

یہ الفاظ ایک رنگ میں وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا کی ہی تفسیر ہیں اسی طرح لکھا ہے فریسیوں نے حضرت مسیحؑ کو کہا

"ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔یسوع نے اُن سے کہا اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں۔کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا بلکہ اُسی نے مجھے بھیجا"

(انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۴۱ - ۴۲)

یہاں بھی "اُسی نے مجھے بھیجا" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو حضرت مسیحؑ کی نبوت اور رسالت کے مقام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس حوالہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کا خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہنا اُنکی الوہیت پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ یہود بھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کہا کرتے تھے۔چنانچہ فریسیوں نے اُن کو کہا

"ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا"

معلوم ہوا کہ بیٹا ہونے میں مسیح کی خصوصیت نہیں یہ یہود میں عام محاورہ تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہا کرتے تھے اور اس قسم کے محاورہ کا اُن میں رائج ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔جن لوگوں کے دلوں میں محبت الٰہی پائی جاتی ہو اور جو صرف مادی چیزوں کے پیچھے جانیوالے نہ ہوں بلکہ روحانیت کی سچی تڑپ

اور خدا تعالےٰ کے وصال کی حقیقی خواہش رکھتے ہوں وہ جذبات محبت کے غلبہ کے وقت خدا تعالےٰ کو ماں اور باپ کی شکل میں ہی دیکھتے ہیں اور رؤیا اور کشوف میں بھی خدا تعالےٰ اپنے منتخب کردہ بندوں کو بعض دفعہ اپنا وجود ماں یا باپ کی شکل میں ہی دکھاتا ہے حضرت مسیح موعودؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اپنے باپ کی شکل میں خدا تعالیٰ کو دیکھا۔ اور میں نے ایک دفعہ خدا تعالےٰ کو حضرت اماں جانؓ کی شکل میں دیکھا تھا تو جہاں اخلاص اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں وہاں بندے اپنی محبت کے جوش کے وقت خدا تعالےٰ کو ماں یا باپ کی حیثیت میں ہی دیکھتے ہیں اور خدا تعالےٰ بھی رؤیا وکشوف کے ذریعہ جب اپنی محبت اُن پر ظاہر کرتا ہے تو بالعموم باپ یا ماں کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ آگے یہ ایک باریک روحانی نکتہ ہے کہ وہ کن حالات میں اپنے آپ کو باپ کی شکل میں دکھاتا ہے اور کن حالات میں اپنے آپ کو ماں کی شکل میں دکھاتا ہے۔ بہرحال یہ دونوں وجود محبت کا ایک نشان سمجھے جاتے ہیں۔ مگر دونوں کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ ماں کی محبت اَور رنگ کی ہوتی ہے۔ اور باپ کی محبت اَور رنگ کی ہوتی ہے۔ ماں کی ذمہ داریاں اَور قسم کی ہوتی ہیں اور باپ کی ذمہ واریاں اَور قسم کی ہوتی ہیں۔ جب خدا تعالےٰ ماں کی محبت اور ماں کی ذمہ واریوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ ماں کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور جب وہ باپ کی محبت اور باپ کی ذمہ واریوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے تو باپ کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ نبیوں کے پیرو اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ اُن کی زبان سے یہ باتیں سنتے رہتے ہیں کہ ہمارا خدا ہم سے ماں اور باپ کی طرح محبت کرتا ہے اس لئے وہ بھی اُن کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔ اِسی رنگ میں جب یہود میں خدا تعالےٰ کے انبیاء آئے اور انہوں نے خدا تعالےٰ کی محبت اور اس کے پیار کا بار بار ذکر کیا اور بتایا کہ ہم سے خدا نے یوں محبت کی ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے یا ماں اپنے بچے سے کرتی ہے تو وہ بھی خدا تعالےٰ کو باپ کہنے لگ گئے۔ اسی محاورہ کو حضرت مسیحؑ بھی استعمال کرتے اور خدا تعالےٰ کو اپنا باپ کہتے تھے۔

دوسرا مسئلہ اس حوالہ سے یہ نکلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کہتے ہیں

" اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں "

یعنی جس سے محبت ہوتی ہے اس کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُن چیزوں سے بھی محبت رکھی جائے جن سے محبوب محبت رکھتا ہو۔ اِس میں مدارج کا سوال نہیں ہوتا کہ فلاں چھوٹا ہے اور فلاں بڑا۔ بلکہ انسان صرف یہ دیکھتا ہے کہ خواہ میرا مقام بڑا ہی جب میرا محبوب اور پیارا فلاں سے محبت رکھتا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں اُس سے محبت کروں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ اُن سے ملنے کے لئے آیا وہ کھڑے ہوگئے اور بادشاہ سے ملے اور پھر بیٹھ گئے پھر وزیر ملنے کے لئے آیا تو وہ اُسی طرح بیٹھے رہے کھڑے نہیں ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہ کا پہریدار آیا تو پھر وہ کھڑے ہوگئے اور کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ گئے۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو کسی نے کہا آپ نے یہ کیا کیا کہ جب بادشاہ آیا تو آپ اُس کے اعزاز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ وزیر آیا تو کھڑے نہ ہوئے لیکن پہریدار

آیا تو پھر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے فرمایا بادشاہ کے
آنے پر میں اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ بادشاہ کی اطاعت
کا حکم ہے۔ وزیر کے آنے پر میں اس لئے کھڑا نہیں
ہوا کہ وزیر کی اطاعت کا حکم نہیں۔ اس کے بعد پہریدار
آیا تو میں پھر کھڑا ہوگیا مگر اس لئے کہ وہ حافظ قرآن
تھا۔ اب دیکھو پہریدار ایک ادنیٰ ملازم تھا لیکن چونکہ
شاہ ولی اللہ صاحب کے محبوب کا کلام اُس نے یاد
کیا ہوا تھا اس لئے باوجود چھوٹا ہونے کے آپ اُس کے
آنے پر کھڑے ہوگئے۔ یہی بات حضرت مسیح بیان فرماتے
ہیں کہ اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھے بھی عزیز سمجھتے
اور میری مخالفت نہ کرتے۔ اسی نقطۂ نگاہ کے ماتحت
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باوجود اس
کے کہ آپ کا رتبہ بہت بڑا تھا فرمایا کہ ؎

" خاکم نثارِ کوچۂ آلِ محمدؐ است "

ادھر آپ اپنا مقام حضرت امام حسینؓ سے بڑا بتاتے
ہیں اور فرماتے ہیں کہ اپنے علماء سے پوچھو کہ تمہارا مسیح
جس نے آسمان سے آنا ہے وہ امام حسینؓ سے بڑا ہوگا
یا چھوٹا۔ لیکن دوسری طرف امام حسینؓ ہی نہیں
امام حسین کی اولاد در اولاد پر اپنی جان قربان کرتے
ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے قابلِ احترام
وجود ہیں۔ کیونکہ وہ بہرحال محمد رسول اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ تو رتبہ اور مقام اَور چیز ہے
اور محبت کا تعلق اَور چیز ہے۔ پس حضرت مسیحؑ
کہتے ہیں کہ اگر واقعہ میں تمہارا اللہ تعالےٰ سے تعلق
ہوتا اور تم اُس کے بیٹے ہوتے تو تم مجھ سے محبت
کیوں نہ کرتے۔ تمہارا مجھے نہ چاہنا بتاتا ہے کہ تم
خدا تعالےٰ کے بیٹے نہیں۔" اس لئے کہ میں خدا میں
سے نکلا اور آیا ہوں"۔ یعنی اپنے محبوب کی طرف سے
آنیوالی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ پس تم جو مجھ سے
محبت نہیں رکھتے تو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں
اپنے محبوب کی بھی کوئی قدر نہیں۔

حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
ایک دفعہ کھڑے تھے کہ بادل آیا اور بارش ہوئی جب
اُس کے قطرات گرے تو آپ نے اپنی زبان باہر نکالی
اور بارش کا قطرہ اُس پر لے لیا۔ پھر آپ نے سمجھا کہ
ممکن ہے میرے ارد گرد کے لوگ یہ سمجھیں کہ میں نے
یہ خلاف مرتبت بات کی ہے اس لئے آپ نے فرمایا
یہ میرے رب کی تازہ نعمت آئی ہے۔ یہی مضمون حضرت
مسیح بیان فرماتے ہیں کہ "میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں"
یعنی میں خدا تعالےٰ کا ایک تازہ انعام ہوں۔ اگر تم
خدا تعالےٰ سے سچی محبت رکھنے والے ہوتے تو تم میری
قدر کیوں نہ کرتے

" کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا بلکہ اُسی نے مجھے بھیجا"

اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ نے جب اپنے آپ کو
بیٹا کہا تو صرف رسول ہونے کی حیثیت سے ہی کہا ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۴ آیت ۱۶ تا ۲۲ میں لکھا ہے
کہ حضرت مسیحؑ ایک دفعہ ناصرہ میں سبت کو عبادتخانہ
میں گئے تو وہاں اُن کو یسعیاہ نبی کی کتاب دی گئی کہ
اس میں سے وعظ کریں۔ انہوں نے کتاب کھول کر وہ
مقام نکالا جہاں لکھا تھا

" خداوند کا روح مجھ پر ہے اس لئے کہ
اُس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے
لئے مسح کیا۔ اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ
قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے
کی خبر سناؤں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد
کروں اور خداوند کے سال مقبول کی
منادی کروں"

اور پھر لوگوں کو وعظ و نصیحت کی۔ جب درس

دے چکے تو لکھا ہے

"جتنے عبادت خانہ میں تھے سب کی آنکھیں
اُس پر لگی تھیں۔ وہ اُن سے کہنے لگا کہ آج
یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے۔"

یعنی یسعیاہ نبی کی کتاب کا جو نوشتہ تھا وہ آج پورا ہو گیا ہے۔ اس نوشتہ کا یسعیاہ باب ۱۶ آیت ۱ تا ۳ میں تفصیلی طور پر ذکر آتا ہے حضرت یسعیاہ کہتے ہیں

"خداوند خدا کی روح مجھ پر ہے کیونکہ خداوند
نے مجھے مسح کیا تاکہ میں مصیبت زدوں کو
خوشخبریاں دُوں (یسعیاہ کہتے ہیں کہ خدا
نے مجھے مسح کیا ہے تاکہ میں مصیبت زدوں
کو خوش خبری سُناؤں۔ مگر عیسائی کہتے
ہیں کہ اس میں مسیح کے متعلق پیشگوئی کی گئی
ہے) اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں ٹوٹے دلوں
کو درست کروں اور قیدیوں کیلئے چھوٹنے
اور بند ھوؤں کے لئے قید سے نکلنے کی
منادی کروں کہ خداوند کے سالِ مقبول کا
اور ہمارے خدا کے انتقام کے روز کا
اشتہار دُوں اور اُن سب کو جو غمزدہ ہیں
تسلی بخشوں کہ صیہوں کے غمزدوں کے لئے
ٹھکانہ کر دوں کہ اُن کو راکھ کے بدلے گلشن
اور نوحے کی جگہ خوشی کا روغن اور اُداسی
کے بدلے ستائش کی خلعت بخشوں تاکہ
وہ صداقت کے درخت اور خداوند کے
لگائے ہوئے پودے کہلائیں کہ اُس کا
جلال ظاہر ہو" (یسعیاہ باب ۶۱ آیت ۱ تا ۳)

عیسائیوں کے نزدیک یسعیاہ نبی کی یہ پیشگوئی حضرت مسیحؑ پر چسپاں ہوتی ہے۔ اگر یہ درست ہے اور یہ پیشگوئی واقعہ میں حضرت مسیحؑ پر چسپاں ہوتی ہے تو پھر یہاں خدا کا ذکر نہیں بلکہ ایک انسان کے آنے کا ذکر ہے اور وہ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا کے ماتحت ہی آتا ہے کیونکہ لکھا ہے

"اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں ٹوٹے دلوں کو
درست کروں اور قیدیوں کے لئے چھوٹنے
اور بندھوؤں کے لئے قید سے نکلنے کی
منادی کروں۔"

"اُس نے مجھے بھیجا ہے" کا عربی میں یہی ترجمہ ہوگا کہ اَرْسَلَنِیْ اُس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یا جَعَلَنِیْ نَبِیًّا اُس نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اس پیشگوئی کے الفاظ مصلح موعود والی پیشگوئی کے الفاظ سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔ یعنی اُس پیشگوئی میں بھی اِسی قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس قسم کے الفاظ یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

پھر متی باب ۲۱ آیت ۱۰ و ۱۱ میں لکھا ہے

"اور جب وہ یروشلم میں داخل ہوا تو سارے
شہر میں ہلچل پڑ گئی اور لوگ کہنے لگے یہ
کون ہے؟ بھیڑ کے لوگوں نے کہا یہ گلیل
کے ناصرہ کا نبی یسوع ہے۔"

یہی بات قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے خدا نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

پھر یوحنا باب ۷ آیت ۱۴ تا ۱۶ میں لکھا ہے کہ یسوع ایک دن ہیکل میں جا کر تعلیم دینے لگا۔ اس پر یہودیوں نے متعجب ہو کر کہا کہ اس کو بغیر پڑھے کیونکر علم آ گیا۔

"یسوع نے جواب میں اُن سے کہا کہ میری
تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے
کی ہے۔"

گویا یہود نے جب تعجب کیا کہ اُسے بغیر پڑھے تورات
کا علم کس طرح آگیا تو حضرت مسیحؑ نے کہا یہ میری تعلیم
نہیں بلکہ اس خدا کی ہے جس نے مجھے بھیجا ہے پس
ان الفاظ میں بھی وہ اپنے رسول ہونے کا اعلان کرتے
ہیں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کا کمال ذاتی ہوتا ہے۔ اگر وہ
خدا یا خدا کے بیٹے ہوتے تو یہ کمال اُن کے اندر ذاتی
طور پر موجود ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ میرا
اس میں ذاتی کمال کوئی نہیں خدا نے مجھے بھیجا ہے اور اُسی
نے یہ تعلیم مجھے سکھائی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی
لکھا ہے کہ ؎

دگر استاد را نامے ندانم ۔ کہ خواندم در دبستانِ محمدؐ

یعنی میں کسی اور استاد کا نام نہیں جانتا کیونکہ میں
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سکول میں پڑھا ہوں
اس سے مراد یہ ہے کہ میرے علوم قرآنی علوم ہیں اور
گو آپ نے ادب کے طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا نام لیا ہے۔ لیکن آپ کا اشارہ قرآن کریم کی طرف
ہی ہے جو خدا تعالےٰ کا نازل کردہ ہے۔ پس آپ کا
یہ شعر وہی معنے رکھتا ہے جو حضرت مسیحؑ کے اِس فقرہ کے
ہیں کہ "میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے
کی ہے"

پھر وہ اسی باب کی سترھویں آیت میں کہتے ہیں

"اگر کوئی اُس کی مرضی پر چلنا چاہے تو وہ
اس کی تعلیم کی بابت جان لے گا کہ خدا کی
طرف سے ہے یا میں اپنی طرف سے کہتا ہوں"

یعنی وہ لوگ جو سچے دل سے تحقیق کرنا چاہیں وہ اگر تحقیق
کریں گے تو معلوم کر لیں گے کہ یہ تعلیم میری نہیں بلکہ
میرے خدا کی ہے۔ پہلی آیت میں انہوں نے یہ کہا
تھا کہ خدا نے مجھے بھیجا ہے اور اب اِس آیت میں
وہ اپنے اس دعویٰ پر اصرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
یہ تعلیم میں نے نہیں بنائی بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف
سے دی گئی ہے۔ پھر وہ اور زیادہ اس پر زور دیتے
ہیں اور کہتے ہیں

"جو اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے وہ اپنی عزت
چاہتا ہے لیکن جو اپنے بھیجنے والے کی عزت
چاہتا ہے وہ سچا ہے اور اس میں ناراستی نہیں" (آیت ۱۸)

اس میں وہ پھر اپنے رسول ہونے پر زور دیتے ہیں اور
کہتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ میں اپنے پاس سے علم دیتا
ہوں وہ جھوٹا ہے۔ لیکن وہ شخص جو یہ کہے کہ میں
خدا تعالےٰ سے علم حاصل کر کے دیتا ہوں وہ سچا ہے
گویا حضرت مسیحؑ عیسائیوں کو جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیحؑ
خدا تھا اور اپنے علم سے بولتا تھا جھوٹا قرار دیتے
ہیں اور مسلمانوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح خدا کا بندہ
تھا سچا قرار دیتے ہیں۔

پھر یوحنا باب ۸ آیت ۱۶ میں فرماتے ہیں

"اگر میں فیصلہ کروں بھی تو میرا فیصلہ
سچا ہے کیونکہ میں اکیلا نہیں بلکہ میں ہوں
اور باپ ہے جس نے مجھے بھیجا ہے"

گویا وہ پھر جَعَلَنِیْ نَبِیًّا پر زور دیتے ہیں اور
کہتے ہیں کہ مجھے میرے خدا نے بھیجا ہے۔

اسی طرح سترھویں آیت میں فرماتے ہیں

"تمہاری توریت میں بھی لکھا ہے (استثناء
باب ۱۷ آیت ۶ و باب ۱۹ آیت ۱۵) کہ دو آدمیوں
کی گواہی مل کر سچی ہوتی ہے ایک تو میں خود
اپنی گواہی دیتا ہوں اور ایک باپ جس
نے مجھے بھیجا میری گواہی دیتا ہے"

گویا وہ اپنی سچائی کی دو شہادتیں پیش کرتے ہیں ایک
یہ کہ میں اس لئے سچا ہوں کہ میں خود کہتا ہوں کہ میں سچا ہوں

اور دوسرے میں اسلئے سچا ہوں کہ خدا کہتا ہے مَیں سچا ہوں اور جب تمہاری شریعت میں یہ لکھا ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی سچی تسلیم کی جاتی ہے اور میری سچائی پر بھی دو شہادتیں موجود ہیں تو تم کیوں میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

دیکھو یہ جو مسیحؑ نے کہا ہے کہ "ایک تو مَیں خود اپنی گواہی دیتا ہوں"۔ یہ وہی دلیل ہے جو قرآن کریم نے اِن الفاظ میں پیش کی ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع) ورنہ گواہی دینے والا بعض دفعہ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں ہزاروں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ پس اس جگہ گواہی سے یہ مراد نہیں کہ چونکہ میں اپنے آپ کو سچا کہتا ہوں اس لئے مَیں سچا ہوں۔ بلکہ اس جگہ اپنی گواہی سے مراد آپ کی دعویٰ نبوت سے پہلے کی زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے اور حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ ایک تو میری سابقہ زندگی اِس بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں اور دوسرے خدا نے میری تائید میں جو نشانات دکھائے ہیں وہ اِس بات کا ثبوت ہیں کہ میرا دعویٰ سچا ہے اور درحقیقت نبیوں کی زندگی کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے باقی سب جھگڑے لغو اور فضول ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "دعوۃ الامیر" میں اسی دلیل کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

اگر کوئی پوچھے کہ آفتاب کے نکلنے کی کیا دلیل ہے تو ہم اُسے یہی کہیں گے کہ آفتاب کی دلیل خود آفتاب کا وجود ہے۔ اِسی طرح ایک شخص جس کی ساری زندگی ایک کھلے ورق کی طرح لوگوں کے سامنے ہے۔ جس کے متعلق اپنے اور بیگانے سب جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا خطرناک سے خطرناک اوقات میں بھی سچ سے کام لیتا ہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے متعلق کوئی بات کہے تو کوئی احمق اور بے وقوف ہی ہوگا جو اس کا انکار کرے اور کہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن اس شہادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ویسے شخص کا کیریکٹر اور چال چلن لوگوں کیلئے ایک کھلی کتاب کی طرح ہو۔ وہ شخص جس کی زندگی کے حالات لوگوں کو معلوم نہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری پہلی زندگی اِس بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہماری جماعت میں سے ایک شخص جو اچھا مخلص اور سمجھدار تھا مگر بعد میں غیر مبایعین میں شامل ہوگیا اس کے بعد پھر خدا تعالیٰ نے اُس پر فضل کیا اور وہ ہماری جماعت میں شامل ہوگیا۔ ایک دفعہ کسی جھگڑے کے موقعہ پر دوسرے سے کہنے لگا کہ میرا اپنا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اُس وقت بچہ تھا مگر مجھے یہ سُنکر ہنسی آئی کہ اس کا وجود بھلا لوگوں کے لئے کس طرح صداقت کا نشان ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی کے تو حالات ہی لوگوں کو معلوم نہیں۔ پس اِس آیت کو وہی شخص اپنی ذات پر چسپاں کر سکتا ہے جس نے لوگوں کے سامنے چیلنج کے طور پر اپنی زندگی کو پیش کیا ہو اور لوگوں نے بھی کرید کرید کر اُس کے حالاتِ زندگی کو دیکھا ہوا ہو۔ ایک عام آدمی کی زندگی تو ہوتی ہی پردے میں ہے وہ اِس دلیل کو پیش کس طرح کر سکتا ہے۔ اِسی طرح انبیاء کی صداقت کے جو اَور دلائل ہیں اُن کے متعلق بھی لوگ غلطی کرتے ہیں اور بعض دفعہ ایک ایسی بات اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر دیتے ہیں جو موقع اور محل کے لحاظ سے وہاں چسپاں ہی نہیں ہوتی۔

سید احمد نور صاحب کابلی جو (۱۹۶۵ء سے
پہلے) فوت ہو چکے ہیں نبوت کا دعویٰ کیا کرتے تھے ایک
دفعہ ایک دوست اُن کے پاس گئے تو واپس آ کر مجھے کہنے
لگے کہ اُن کی اور باتوں کا جواب تو مجھے آ گیا ہے لیکن
ایک دلیل کو میں رد نہیں کر سکا اور وہ یہ کہ انہوں نے
کہا تم لوگ مجھے پاگل کہتے ہو حالانکہ قرآن میں یہ لکھا
ہے کہ جتنے نبی اور رسول آتے سب کو لوگ پاگل کہا کرتے
تھے ۔ پس تمہارا مجھے پاگل کہنا میری صداقت کی
دلیل ہے میرے جھوٹے ہونے کی دلیل نہیں ۔ میں نے
اُن سے کہا کہ یہ تو بالکل سیدھی بات تھی نبی کو اُس کے
دعویٰ کے بعد محض اُس کے دعوے کی وجہ سے لوگ پاگل
کہتے ہیں لیکن سید احمد نور صاحب سے کہئے کہ آپ
نے تو ابھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا کہ ہم آپ کو رسیوں سے
باندھا کرتے تھے ۔ پس ایک پاگل کا اپنے آپ کو نبی
کہنا اور چیز ہے اور نبی کو لوگوں کا پاگل کہنا بالکل
اور چیز ہے ۔ اگر تو نبوت کے دعویٰ کے بعد لوگ
انہیں پاگل کہنے لگ جاتے پہلے وہ دماغی لحاظ سے
بالکل ٹھیک ہوتے تو کچھ دلیل بھی تھی لیکن انہیں تو
دعویٰ سے پہلے ہی کئی دفعہ جنون کی وجہ سے رسیوں سے
باندھا جا چکا ہے ۔ تو یہ دلیل بھی غلط استعمال ہونے
لگ گئی ہے ۔ اسی طرح ایک نبی کی صداقت کی دلیل
یہ ہوتی ہے کہ اُس کی سابق زندگی اتنی شاندار ہوتی
ہے کہ ہر قسم کے حالات میں سے گذرنے کے باوجود
لوگ اس کی زندگی کو بالکل بے عیب پاتے ہیں ۔ اردگرد
کے لوگ اُسے لوٹتے ہیں ۔ ایسے حالات اس پر گذرتے
ہیں جب جھوٹ کے بغیر اس کی نجات کی کوئی صورت
نہیں ہوتی مگر پھر بھی وہ جھوٹ نہیں بولتا اور لوگوں
پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شخص نیک اور راستباز انسان
ہے ۔ لیکن عام آدمیوں کی زندگیاں نمایاں نہیں ہوتیں
بیسیوں چور ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ
وہ چور ہیں ۔ بیسیوں جھوٹے ہوتے ہیں مگر چونکہ اُن کے
حالات لوگوں کے سامنے نہیں آتے اس لئے وہ مخفی رہتے
ہیں ۔ پس یہ آیت صرف انبیاء ہی اپنے اوپر چسپاں
کر سکتے ہیں ۔ وہ لوگوں کو چیلنج دیتے ہیں کہ تم نے ہماری
زندگیوں کو دیکھا ۔ تم نے ہمارے حالات کو دیکھا ۔ تم نے
ہمارے اخلاق اور عادات کی جستجو کی ۔ مگر تم نے یہی دیکھا
کہ ہم جھوٹ بولنے والے نہیں پس جب ہم انسانوں پر
جھوٹ نہیں بولتے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم خدا
پر جھوٹ بولنے لگ جائیں ۔ یہی دلیل حضرت مسیح پیش
کرتے ہیں ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

" تمہاری توریت میں بھی لکھا ہے کہ دو آدمیوں
کی گواہی مل کر سچی ہوتی ہے ۔ ایک تو میں خود
اپنی گواہی دیتا ہوں اور ایک باپ جس
نے مجھے بھیجا میری گواہی دیتا ہے "

اب اگر اپنی گواہی سے صرف اتنی ہی مراد ہو کہ چونکہ میں
کہہ رہا ہوں اس لئے میری بات سچی ہے تو اس طرح
تو دنیا میں تباہی مچ جائے ۔ کیا عدالت میں مقدمہ پیش
ہو تو ملزم کہہ سکتا ہے کہ ایک تو اس واقعہ کا میں گواہ
ہوں اور ایک خدا گواہ ہے ۔ اگر وہ ایسا کہے تو سب
ہنسنے لگ جائیں گے ۔ پس اس جگہ مسیح نے درحقیقت
وہی دلیل پیش کی ہے کہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

وہ اپنے یسوع ہونے کی حیثیت کو پیش نہیں کرتا بلکہ
دعویٰ نبوت سے پہلے کی زندگی کو متحدیانہ طور پر پیش
کرتا ہے ۔ مگر بہرحال اس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ
بندہ تھا ۔ رسول تھا ۔ خدائی کا دعویدار نہیں تھا ۔

پھر متی باب ۲۱ آیت ۹ میں لکھا ہے

" اور بھیڑ جو اس کے آگے آگے جاتی

اور پیچھے پیچھے چلی آتی تھی پکار پکار کر
کہتی تھی ابن داؤد کو ہوشعنا۔ مبارک
ہے وہ جو خدا کے نام سے آتا ہے عالم بالا
پر ہوشعنا"
یہ ایک پیشگوئی تھی جس میں مسیح کی آمد کی خبر دی گئی تھی پس جب یہ پیشگوئی پوری ہوئی تو لوگ خوش ہوئے کہ وہ شخص جس کے آنے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آگیا ہے۔ بہرحال یہاں حضرت مسیح کو ابن داؤد کہا گیا ہے گویا انہیں بنی اسرائیل کا ہی ایک فرد قرار دیا گیا ہے خدا نہیں کہا گیا۔

پھر مرقس باب ۶ آیت ۲ تا ۵ میں لکھا ہے کہ

"جب سبت کے دن مسیح عبادت خانہ میں
تعلیم دینے لگا تو لوگ سنکر حیران ہوئے
کہ یہ کیا حکمت ہے جو اسے بخشی گئی ہے۔ کیا
یہ وہی نہیں جو مریم کا بیٹا اور یعقوب اور
یوسیس اور یہوداہ اور شمعون کا بھائی ہے
اور کیا اس کی بہنیں یہاں ہمارے ہاں نہیں"

یعنی اس کے بھائی اور بہنیں تو سب مذہب میں ہمارے ساتھ متفق ہیں اس کے ساتھ نہیں پھر یہ باتیں اسے کیسے آگئیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے کہا

"نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور
اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا"
(مرقس باب ۶ آیت ۵)

گویا وہ صاف طور پر اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔

یوحنا باب ۴ آیت ۴۴ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے لکھا ہے کہ

"یسوع نے خود گواہی دی کہ نبی اپنے وطن
میں عزت نہیں پاتا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے کچھ رشتہ دار اس کے ضرور مخالف تھے۔

یوحنا باب ۵ آیت ۳۷ میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں

"باپ نے مجھے بھیجا ہے اور باپ جس نے
مجھے بھیجا ہے اسی نے میری گواہی دی ہے"

گویا ایک ہی آیت میں دو دفعہ انہوں نے اپنے آپکو رسول کہا ہے۔

پھر یوحنا باب ۴ آیت ۱۹ میں لکھا ہے
"عورت نے اُس سے کہا اے خداوند مجھے
معلوم ہوتا ہے کہ تُو نبی ہے"

گویا لوگ بھی اس کو نبی کہتے تھے اور وہ بھی اپنے آپ کو نبی کہتے تھے۔ مگر آج کل کے عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا تھے۔

غرض عیسائیوں نے قرآن کریم کے اس بیان پر جو گالیاں دی ہیں۔ وہ درحقیقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیں بلکہ اپنے مسیح کو گالیاں دی ہیں جس نے خود یہ دعوے کئے ہیں۔

چوتھی بات قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ وَجَعَلَنِیْ مُبَارَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ۔ یہ الفاظ بھی اس کے انسان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا اپنی ذات میں مبارک ہے اور انسان اس سے برکت حاصل کرتا ہے۔ خدا مبارِک ہوتا ہے اور انسان مبارَک ہوتا ہے میرے ایک بچے کا نام مبارَک ہے۔ کوئی غلطی سے اُسے مبارِک کہہ دیتا ہے تو میں کہتا ہوں یہ مبارِک نہیں مبارَک ہے۔ اِسے برکت دی گئی ہے۔ برکت دینے والا خدا ہے پس حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ مجھے خدا نے برکت دیا گیا بنایا ہے۔ اور جو مبارَک ہے وہ یقیناً انسان ہے۔ کیونکہ خدا کو کوئی برکت نہیں دے سکتا خدا تعالیٰ کے اندر ساری طاقتیں ذاتی ہیں وہ کسی سے کوئی طاقت نہیں لیتا

پس اگر یہ ثابت ہو جاتے کہ مسیح مبارک ہے وہ برکت نہیں دیتا بلکہ برکت مانگتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ ایک انسان تھا اس کے لئے دیکھو یوحنا باب ۸ آیت ۲۹ جہاں وہ کہتا ہے

"اور جس نے مجھے بھیجا ہے میرے ساتھ ہے۔ باپ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا گویا وہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مدد کا محتاج ہے اور یہ بھی کہ خدا نے اس کی مدد کی ہے) کیونکہ میں ہمیشہ ایسے کام کرتا ہوں جو اُسے خوش آتے ہیں"

پھر مرقس باب ۶ آیت ۳۹ تا ۴۱ میں لکھا ہے

"تب اُس نے انہیں حکم کیا کہ اُن سب کو ہری گھاس پر بانٹ بانٹ کر کے بٹھاؤ وے سو سو اور پچاس پچاس بانٹ میں بیٹھے۔ تب اُس نے وہ پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں لے کے آسمان کی طرف دیکھ کے برکت چاہی"

یعنی مسیح کے پاس ایک دفعہ بہت سے لوگ آگئے آپ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ان کو کھانا کھلانے کے لئے قطاروں میں بٹھا دو۔ پھر مسیح نے پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں اپنے ہاتھ میں لیں اور آسمان کی طرف دیکھا اور خدا تعالےٰ سے برکت چاہی جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سمجھتا تھا کہ برکت صرف خدا تعالےٰ ہی دے سکتا ہے۔

پھر لکھا ہے کہ اُس نے

"روٹیاں توڑیں اور اپنے شاگردوں کو دیں کہ ان کے آگے رکھیں اور اُس نے وے دو مچھلیاں اُن سب میں بانٹیں وے سب کھا کے سیر ہوئے"

(آیت ۴۱-۴۲)

یعنی پھر برکت آ بھی گئی۔ پہلے مسیح نے خدا سے برکت مانگی اور پھر خدا نے اُسے برکت دے بھی دی پس مرقس تسلیم کرتا ہے کہ خدا مبارک ہے اور مسیح مبارک ہے۔ خدا برکت دینے والا ہے اور مسیح برکت لینے والا ہے۔

پھر یہی مضمون مرقس باب ۸ آیت ۶ تا ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔ لکھا ہے

"پھر اُس نے بھیڑ کو حکم کیا کہ زمین پر بیٹھ جائیں اور اُس نے وہی سات روٹیاں لیں اور شکر کر کے توڑیں (یعنی روٹی ملنے پر اُس نے خدا تعالےٰ کا شکریہ ادا کیا) اور اپنے شاگردوں کو دیں کہ اُنکے آگے رکھیں اور انہوں نے لوگوں کے آگے رکھ دیں اور اُن کے پاس کئی ایک چھوٹی مچھلیاں تھیں سو اُس نے برکت مانگ کے حکم کیا کہ انہیں بھی اُنکے آگے دھریں چنانچہ انہوں نے کھایا اور سیر ہوئے"

اس جگہ پھر برکت مانگنے کا ذکر ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پھر وہ برکت اللہ تعالےٰ کی طرف سے آ بھی گئی۔ یہ کہ یہ کیا معجزہ ہے اس جگہ ہمیں اس تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہمارا مقصد یہاں حالیہ ہی صرف اس قدر ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ اور بائبل بھی یہی کہتی ہے کہ اُس نے خدا تعالےٰ سے برکت مانگی اور خدا تعالےٰ نے اُسے برکت دی پس قرآن کریم کا دعویٰ بالکل درست ہے اگر قرآن نے غلط دعویٰ کیا ہے تو پھر بائبل بھی غلط اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

حدیثوں میں بھی اس قسم کے بعض واقعات آتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے غلّہ خریدا جو چلتا چلا گیا اور ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آخر مجھے خیال آیا کہ دیکھیں تو سہی کہ ہے کتنا جب اُس کو تولا تو ختم ہو گیا۔ بے شک بعض دفعہ انسان اپنی تدبیر اور حکمت عملی سے بھی تھوڑی چیز میں گذارہ کر لیتا ہے لیکن بعض دفعہ انسانی ہاتھ کا کوئی دخل نظر نہیں آتا اور برکت چلتی چلی جاتی ہے یہ ایک ایسا راز ہے جس کو انسان بیان نہیں کر سکتا۔ میرے گھر کے بہت سے افراد ہیں۔ چار بیویاں ہیں۔ بائیس بچے ہیں اور پھر بچوں کی اولادیں ہیں۔ کئی ایسے ہیں جو ابھی کوئی کام نہیں کرتے اور کئی ایسے ہیں جو کام تو کرتے ہیں لیکن بوجہ دینی خدمت کرنے کے جو رقم اُن کو ملتی ہے اُس میں اُن کا گذارہ نہیں ہوتا اور ہمیشہ اُن کے اخراجات کا کچھ حصہ مجھے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب بھی میں حساب کرنے لگوں تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اخراجات کے پورا ہونے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ مگر حساب نہ کروں۔ تو روپیہ آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب ضرورتوں کو پورا کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ میں دریا پر سیر کرنے کے لئے گیا ہوا تھا کہ ایک دن ہم نے صرف ایک چوزہ اور ایک چھوٹی سی مرغابی تیار کروائی یہ کھانا ہمارے لئے کافی تھا۔ مگر ہم مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھے تو اردگرد کے علاقہ کے تیس چالیس آدمی آگئے۔ اُن میں سے ایک دو تو احمدی تھے اور باقی اُن کے غیر احمدی رشتہ دار تھے۔ مگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے جائیں گے مگر وہ اتنی دیر بیٹھے کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آخر میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگوں کے آنے کی کیا غرض ہے؟ کہنے لگے ہم نے ایک نکاح پڑھوانا ہے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ میں نے نکاح پڑھ دیا۔ مگر وہ نکاح پڑھوانے کے بعد پھر بیٹھ گئے۔ غالباً وہ اسی نیت سے آئے تھے کہ ہم کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ پہلے تو میرے دل میں تخیل پیدا ہوا کہ ہم کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں شاید یہ چلے جائیں۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تو میں نے اُمّ طاہر مرحومہؓ کو رقعہ لکھا کہ اس طرح مہمان آگئے ہیں۔ چالیس کے قریب یہ ہیں چھ سات گھر کے افراد ہیں اور بیس بائیس دفتر کے آدمی اور بعض دوسرے لوگ ہیں۔ ان ستر آدمیوں کے کھانے کا کیا انتظام ہو گا۔ انہوں نے مجھے کہلا بھجا کہ ہم تو آپکا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے باورچی سے اِس بارہ میں بات کر لی ہے آپ بےفکر رہیں چنانچہ اس کے بعد سب کو کھانے کے لئے بٹھا دیا گیا اور وہ دسترخوان پر سے سیر ہو کر اُٹھے۔ جب میں باہر سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں نے اُمّ طاہرؓ سے کہا کہ آج تم کو تو کھانا نہیں ملا ہو گا۔ انہوں نے کہا ملا کیوں نہیں، میں نے بھی کھا لیا ہے اور کچھ کھانا بچ بھی گیا ہے۔ اب اس میں کچھ باورچی کا بھی کمال ہو گا مگر کچھ خدا تعالیٰ کا بھی فضل تھا کہ ستر آدمی ڈیڑھ دو چوزوں پر بیٹھ گئے اور سیر ہو کر اُٹھے تو خدا تعالیٰ کی برکتیں کئی رنگوں میں ظاہر ہوتی ہیں لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس میں اخفاء کا بھی پہلو ہوتا ہے۔ جیسے میں نے اپنے متعلق ہی بتایا ہے کہ حساب کرنے بیٹھوں تو

دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور طبیعت سخت کوفت محسوس کرتی ہے لیکن حساب نہ کروں تو سب کام خود بخود ہو جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی اسی رنگ میں اللہ تعالیٰ نے سلوک کیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی حدیثوں میں اس قسم کے کئی واقعات آتے ہیں۔

پھر متی باب ۲۶ آیت ۲۶ تا ۲۸ میں بھی یہی لکھا ہے کہ

" اُن کے کھاتے وقت یسوع نے روٹی لی اور برکت مانگ کے توڑی پھر شاگردوں کو دے کر کہا لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دے کر کہا تم سب اس میں سے پیو کیونکہ یہ میرا لہو ہے یعنی نئے عہد کا لہو جو بہتوں کے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے "

یہاں بھی یہی ذکر ہے کہ مسیح نے برکت مانگ کر روٹی توڑی اور شاگردوں سے کہا کہ کھاؤ یہ میرا بدن ہے اور پانی دے کر کہا کہ پیؤ یہ میرا خون ہے۔ عیسائیوں میں عشاء ربانی کی جو عبادت پائی جاتی ہے اُس کی بنیاد اسی واقعہ پر ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۱ آیت ۴۱-۴۲ میں لکھا ہے کہ جب مریم حاملہ ہوئیں اور یحییٰ کی ماں سے ملنے کے لئے گئیں تو اس نے حضرت مریم سے کہا کہ

" تُو عورتوں میں مبارک اور تیرے پیٹ کا پھل مبارک ہے "

گویا اس جگہ وہی مضمون ہے جو جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر لوقا باب ۱۱ آیت ۲۷-۲۸ میں لکھا ہے

" جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ بھیڑ میں سے ایک عورت نے پکار کر اُس سے کہا مبارک ہے وہ پیٹ جس میں تو رہا اور وہ چھاتیاں جو تُو نے چوسیں اُس نے کہا ہاں مگر زیادہ مبارک وہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اُسے مانتے ہیں "

غرض جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا کے ثبوت میں انسانوں کی شہادتیں بھی انجیل میں موجود ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی شہادتیں بھی انجیل میں موجود ہیں۔

پانچویں بات قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت مسیح نے کہا وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ خدا تعالیٰ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی انسان ہی کی صفت ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو کوئی حکم دینے والا نہیں ہوتا اور پھر اس کے لئے نماز کا بھی کوئی سوال نہیں۔ اس کے لئے دیکھو لوقا باب ۹ آیت ۱۸ جہاں لکھا ہے۔

" جب وہ تنہائی میں دعا کر رہا تھا اور شاگرد اُس کے پاس تھے تو ایسا ہوا کہ اُس نے اُن سے پوچھا کہ لوگ مجھے کیا کہتے ہیں "

اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح دعائیں کرنے کا عادی تھا اور دعائیں بھی وہ زیادہ تر اپنی ترقی اور دعویٰ کی کامیابی کے لئے کرتا تھا کیونکہ اُس کا یہ کہنا کہ لوگ مجھے کیا کہتے ہیں بتاتا ہے کہ اُس کے دماغ پر یہ امر حاوی تھا کہ لوگوں کے متعلق اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ آیا وہ اُسے سچا سمجھتے ہیں یا جھوٹا سمجھتے ہیں۔ یہ فقرہ بتاتا ہے کہ وہ دعا اپنے سلسلہ کی ترقی اور دعویٰ کی کامیابی کے لئے کرتا تھا۔

پھر لوقا باب ۱۱ آیت ۱ میں لکھا ہے

" اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگتا تھا جب مانگ چکا ایک نے اُس کے شاگردوں میں سے اس کو کہا اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا

جیسا کہ یوحنا نے اپنے شاگردوں کو سکھایا
اُس نے اُن سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو
اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔
تیرے نام کی تقدیس ہو تیری بادشاہت
آوے تیری مراد جیسی آسمان پر زمین پر بھی
آوے۔ ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے
اور ہمارے گناہوں کو بخش کیونکہ ہم بھی
ہر ایک کو جو ہمارا قرضدار ہے بخشتے ہیں۔
اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ ہم کو
بُرائی سے چھڑا۔"

یہاں سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ وہ دعا کا عادی تھا یہ الفاظ کہ "ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگتا تھا" بتاتے ہیں کہ خلوت میں کوئی جگہ ہوگی جہاں حضرت مسیح دعا مانگتے ہوں گے۔ اُن کے ساتھیوں پر بھی اس دعا اور گریہ وزاری کا اثر ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں بھی بتائیے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کیا مانگا کریں۔ اس پر حضرت مسیح نے اُن کو یہ دعا سکھلائی۔ یہ دعا عیسائیوں کی سورۂ فاتحہ ہے لیکن غور کر کے دیکھو قرآن کریم کی سورۂ فاتحہ میں اور انجیل کی اس دعا میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ فاتحہ شروع ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت مانگتے ہوئے جو بے مانگے دینے والا اور ہمارے کاموں کے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کرنے والا ہے اس کے حضور یہ دعا کرتا ہوں۔ گویا سورۃ فاتحہ جو دعا ہے اس کی قبولیت کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک دعا سکھلائی ہے یعنی پیشتر اس کے کہ وہ دعا مانگی جائے اُس دعا کو صحتِ نیت کے ساتھ مانگنے کے لئے اور اُن سامانوں کے حصول کے لئے جن سے کام لے کر دنیا میں ترقی حاصل ہوتی ہے اور جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور اسی طرح اُن پیدا کردہ سامانوں سے صحیح طور پر کام لینے کے لئے اور اُن کے اعلیٰ درجہ کے نتائج کے حصول کے لئے جو انسان کو مزید انعامات کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اُن صفات کو جوش میں لاتا ہے جن کا دعا کی قبولیت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ یہ کیسی کامل دعا ہے کہ ابھی دعا شروع بھی نہیں کی گئی کہ اس کی قبولیت کے لئے اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی استعانت طلب کی جاتی ہے اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا واسطہ دے کر التجاء کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مدد انسان کے شاملِ حال رکھے اور اس کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا فرمائے اور نہ صرف سامان مہیا فرمائے بلکہ اُن کے اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج بھی پیدا فرمائے۔ پھر وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ گویا وہ خدا تعالیٰ کی چار صفات بیان کرتا ہے اور یہ چاروں اصولی صفات ہیں جن کے اردگرد باقی تمام صفات چکر کھاتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسیح کہتا ہے۔

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے
نام کی تقدیس ہو۔"

گویا وہ محض اُس کو قدوس کہتا ہے حالانکہ قدوس اُن صفات میں سے ایک صفت ہے جو اس کے گرد چکر کھا رہی ہیں۔

پھر سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کا اسمِ ذات بیان کیا گیا ہے مگر مسیح کہتا ہے "اے ہمارے باپ" حالانکہ باپ کا لفظ اس کی صرف ایک صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی یہ لفظ صرف اتنا بتاتا ہے کہ

اُس کے اندر باپ کی سی شفقت اور رحم پایا جاتا ہے حالانکہ صرف باپ ہی رحم کرنے والا نہیں ہوتا ماں بھی رحم کرنے والی ہوتی ہے۔ بھائی بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ اُستاد بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ بادشاہ بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ اور سب اپنے اپنے دائرہ میں محبت اور احسان کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اِن ساری صفات کو جمع کر کے اُس کا اسم ذات بیان کیا۔ یعنی اللہ جس میں ساری صفات جمع ہیں۔ بے شک باپ بھی مہربان ہوتا ہے مگر وہ اللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ میں باپ والی محبت بھی شامل ہے، ماں والی محبت بھی شامل ہے، بیٹے والی محبت بھی شامل ہے، بھائی والی محبت بھی شامل ہے، استاد والی محبت بھی شامل ہے، محلّہ کی پنچایت والی محبت بھی شامل ہے، بادشاہ والی محبت بھی شامل ہے لیکن باپ میں اِن محبتوں میں سے کوئی محبت بھی شامل نہیں ہوتی۔ پس قرآنی دعا کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ اِس دعا میں خدا تعالیٰ کے اسم ذات کو پیش کرتا ہے جس میں تمام قسم کے کمالات اور خوبیاں جمع ہیں۔ اس کے بعد اس نے صفات کی تقسیم شروع کی اور کہا کہ وہ رب ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، مالک یوم الدین ہے۔ لیکن انجیل نے صرف اتنا کہا کہ

"تیرے نام کی تقدیس ہو"

حالانکہ تقدیس جھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور سچی بھی۔ بعض کو لوگ قدوس کہتے ہیں لیکن وہ مقدس نہیں ہو جاتے۔ پھر انجیل نے یہ بھی نہیں کہا کہ تُو مقدس ہے بلکہ کہا ہے کہ "تیرے نام کی تقدیس ہو" یعنی لوگ تجھے مقدس کہا کریں حالانکہ مقدس کہنے والے جھوٹے بھی ہو سکتے ہیں اور سچے بھی ہو سکتے ہیں۔

پھر لکھا ہے "تیری بادشاہت آوے" مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ مالک یوم الدین ہے اُس کی بادشاہت نے آنا کیا ہے وہ تو ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے پھر وہ تو یہ کہتا ہے کہ "تیری بادشاہت آوے" اور قرآن کہتا ہے کہ خالی بادشاہت کچھ چیز نہیں بادشاہتیں قائم ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں تیری بادشاہت وہ ہے جو انجام تک ممتد ہوتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے گویا خدا تعالیٰ کو وہ بادشاہت حاصل ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں جس کی طرف مالک یوم الدین میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر انجیل کہتی ہے کہ

"تیری مراد جیسی آسمان پر زمین پر بھی آوے"

یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی شان کے بالکل خلاف ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جو دوسروں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔ مگر اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین پر بھی تیری مرادیں پوری ہوں گویا جس طرح فقیروں کو خیرات ڈال دی جاتی تو وہ خوش ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ تیری مرادیں پوری کرے اسی طرح خدا تعالیٰ کو بھی دعا دی گئی ہے کہ تیری مرادیں پوری ہوں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کو یہ کہنا کہ تیری مرادیں پوری ہو جائیں اس سے زیادہ ہتک آمیز بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

اِس کے بعد قرآن کریم نے ایک فقرہ استعمال کیا ہے جس کا انجیل میں ذکر تک نہیں۔ قرآن کریم نے صفاتِ الٰہیہ کے بعد انسان کو یہ سکھایا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں گویا ان الفاظ میں انسان خدائی طاقتوں کا اقرار اور اپنی

عبودیت کا اظہار کرتا ہے لیکن انجیل نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

پھر قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی اے خدا دنیا کے بھی کام ہیں اور دین کے بھی کام ہیں۔ زمین کے بھی کام ہیں اور آسمان کے بھی کام ہیں۔ اگر میں باپ ہوں تو مجھ پر باپ کی ذمہ واریاں ہیں۔ ماں ہوں تو مجھ پر ماں کی ذمہ واریاں ہیں۔ خاوند ہوں تو مجھ پر خاوند ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ بیوی ہوں تو مجھ پر بیوی ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ سپاہی ہوں تو مجھ پر سپاہی ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ کرنیل ہوں تو مجھ پر کرنیل ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ جرنیل ہوں تو مجھ پر جرنیل ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ بادشاہ ہوں تو مجھ پر بادشاہ ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ فلاسفر ہوں تو مجھ پر فلاسفر ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ صنّاع ہوں تو مجھ پر صنّاع ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ غرض مجھ پر کئی قسم کی ذمہ واریاں ہیں۔ تُو میرے ہر کام میں کامیابی کا قریب ترین رستہ مجھے دکھا۔ مگر مسیح کہتا ہے کہ

”ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے۔“

گویا جس طرح کھانا کھاتے وقت بلی پاس آ بیٹھتی ہے یا طوطا اور کوّا آ بیٹھتا ہے اور روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ہم اُسے بھی ڈال دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی گئی ہے کہ ”ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے۔“

پھر کہا گیا ہے کہ

”ہمارے گناہوں کو بخش کیونکہ ہم بھی
ہر ایک کو جو ہمارا قرضدار ہے بخشتے ہیں۔“

لیکن قرآن کریم نے سورۂ فاتحہ میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہہ کر بتایا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک گناہ POSITIVE ہوتا ہے اور ایک گناہ NEGATIVE ہوتا ہے یعنی ایک گناہ مثبت ہوتا ہے اور ایک گناہ منفی ہوتا ہے۔ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو نواہی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو نیکیوں کے نہ کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ انجیل کی دعا میں صرف POSITIVE گناہوں کا ذکر ہے۔ NEGATIVE گناہوں کا ذکر نہیں۔ یعنی یہ تو دعا کی گئی ہے کہ جو گناہ ہم کر بیٹھے ہیں وہ ہمیں بخش دے لیکن اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ جو نیکیاں ہم نے نہیں کیں اُن کے بدنتائج سے ہمیں محفوظ رکھ۔

اس کے مقابلہ میں قرآن کریم نے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ میں POSITIVE گناہوں کا ذکر کیا ہے اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں NEGATIVE گناہوں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی جو نیکیاں ہمیں کرنی چاہئیے تھیں لیکن ہم نے نہیں کیں اُن کے بدنتائج سے بھی ہمیں بچا۔ اور اسی طرح ہم کو اس بات سے بھی بچا کہ جو کام کرنے والے ہیں وہ ہم نہ کریں اور نیکی کے رستہ سے بھٹک جائیں۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ

”ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ ہم کو بُرائی
سے چھڑا۔“

یہ فقرہ اس پہلے فقرہ کا ہی نتیجہ ہے کہ ”ہمارے گناہوں کو بخش“۔ اس میں کوئی زائد بات نہیں بیان کی گئی۔ لیکن قرآن کریم نے اس دعا کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے ماتحت جب ہمیں اُن لوگوں کا راستہ دکھایا جائیگا جو منعم علیہ گروہ میں شامل تھے تو ہم آزمائش میں پڑیں گے ہی نہیں۔

بہرحال اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسیح دعا مانگا کرتا تھا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ قرآنی دعا اور مسیح کی دعا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۵ آیت ۱۶ میں لکھا ہے

"پر وہ بیابان میں الگ جا کے رہا اور دعا مانگتا تھا"

یعنی وہ ایک دفعہ جنگل میں جا کے رہا تاکہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ یہ اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ کی صداقت کا کیسا واضح اور کھلا ثبوت ہے اَوْصَاہُ بِکَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَہِدَ اِلَیْہِ یعنی مستقل طور پر کام کرنے کی تاکید کی۔ حکم محض اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ ہم فلاں بات کا تقاضا کرتے ہیں اور وصیت کے مفہوم میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ ہم مستقل طور پر زور سے اس کام کو جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ پس اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ کے یہ معنے ہیں کہ اس نے مجھے دعائیں کرنے کی بڑے زور سے تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ تم ہمیشہ دعائیں کرتے رہو۔ اور جو حوالے میں نے بتائے ہیں اُن سے یہی امر ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح مستقل طور پر دعائیں کرنے کا عادی تھا

پھر لوقا باب ۲۲ آیت ۳۲ میں آتا ہے

"لیکن میں نے تیرے لئے دعا مانگی کہ تیرا ایمان جاتا نہ رہے۔"

یہاں بھی دعا کا ذکر ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۲۲ آیت ۴۱ میں ہے

"اور اُس نے اُن سے تیر کے ایک ٹپے پر بڑھ کے گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی۔"

یعنی اتنی دور جتنے فاصلہ پر تیر گرتا ہے گویا اندازاً سو ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلہ پر تشہد کی طرح گھٹنے ٹیک کر اُس نے دعا کی۔

پھر اسی باب کی آیت ۴۴ میں لکھا ہے

"اور وہ جان کنی میں پھنس کے بہت گڑگڑا کے دعا مانگتا تھا اور اس کا پسینہ لہو کی بوند کی مانند ہو کر زمین پر گرتا تھا"

یعنی حضرت مسیح اس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے کہ یوں معلوم ہوتا تھا اُن کے پسینہ کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔

اسی طرح آیت ۴۵ میں لکھا ہے

"اور دعا سے اُٹھ کر اپنے شاگردوں کے پاس آیا اور انہیں غم سے سوتا پایا"

اپنی تعریف بھی کتنی کرتے ہیں کہ دعا کی نہیں اور غفلت کی حالت میں سو گئے۔ لیکن بتایا یہ جاتا ہے کہ اُنہیں اتنا غم پہنچا کہ وہ سو گئے۔ حضرت مسیح پھر اُن کے پاس آئے اور کہا کہ

"تم کیوں سوتے ہو اُٹھ کر دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو"

دوسری چیز زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ انبیاء کا کام یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ اُنہیں دیتا ہے وہ آگے لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پس نبیوں کا زکوٰۃ دینا درحقیقت اُنکا اپنے مریدوں کو اس کی تلقین کرنا ہوتا ہے۔

متی باب ۲۲ میں آتا ہے کہ فریسی حضرت مسیح کے پاس آئے اور آکر کہا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آیا قیصر کو ہم اُس کا ٹیکس ادا کریں یا نہ کریں۔ انکی غرض یہ تھی کہ اگر یہ جواب دیں گے کہ ادا کرو تو ہم قوم کو اُکسائیں گے اور کہیں گے کہ یہ حکومت کا خوشامدی ہے یہ لوگوں کو تعلیم دیتا ہے کہ قیصر کو جزیہ ادا کرنا چاہیئے اور اگر یہ جواب دیں گے کہ نہ دو تو ہم شور مچا دیں گے کہ یہ حکومت کا باغی ہے۔ یہ وہی مولویوں والی چال تھی جو آج کل ہمارے خلاف چلی جاتی ہے۔ حضرت مسیح نے

اُن کی اس شرارت کو بھانپ لیا چنانچہ لکھا ہے
"یسوع نے اُن کی شرارت سمجھ کے کہا اے
ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو۔ جزیہ کا سکہ
مجھے دکھلاؤ۔ وے ایک دینار اُس پاس
لائے۔ تب اُس نے اُن سے کہا یہ صورت
اور سکہ کس کا ہے۔ انہوں نے کہا قیصر کا
پھر اس نے کہا پس جو چیزیں قیصر کی
ہیں قیصر کو اور جو خدا کی ہیں خدا کو دو۔
انہوں نے یہ سنکر تعجب کیا اور اُسے
چھوڑکر چلے گئے۔"
(انجیل متی باب ۲۲ آیت ۱۸ تا ۲۲)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے اموال میں
سے خدا تعالیٰ کا حصہ دینے کا قانون تسلیم کیا ہے اور
یہی چیز ہے جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے
پھر متی باب ۱۵ میں لکھا ہے
"تب یسوع نے اپنے شاگردوں کو اپنے
پاس بلا کے کہا کہ مجھے اس جماعت پر رحم
آتا ہے کہ تین دن میرے ساتھ رہی اور
اُن کے پاس کچھ کھانے کو نہیں۔ اور میں
نہیں چاہتا کہ انہیں فاقے سے رخصت
کروں ایسا نہ ہو کہ راہ میں کہیں ناطاقت
ہو جائیں۔ اس کے شاگردوں نے اُس
سے کہا کہ اس ویرانہ میں ہم اتنی روٹیاں
کہاں سے پاویں کہ ایسی جماعت کو
آسودہ کریں۔ تب یسوع نے انہیں کہا
کہ تمہارے پاس کتنی روٹیاں ہیں وے
بولے سات اور کئی ایک چھوٹی مچھلی۔
تب اُس نے جماعتوں کو حکم کیا کہ زمین پر
بیٹھ جاویں۔ پھر اُن سات روٹیوں اور
مچھلیوں کو لے کر شکر کیا اور توڑ کر اپنے
شاگردوں کو دیا اور شاگردوں نے لوگوں
کو۔ اور سب کھاکے آسودہ ہوئے اور
ٹکڑوں سے جو بچ رہے تھے انہوں نے
سات ٹوکریاں بھر کر اٹھائیں اور کھانے
والے سوا عورتوں اور لڑکوں کے چار ہزار
مرد تھے اور جماعتوں کو رخصت کر کے
کشتی پر چڑھا اور مگدلا کی اطراف میں
آیا۔" (انجیل متی باب ۱۵ آیت ۳۲ تا ۳۹)
بائبل کے بیان میں ہمیشہ مبالغہ ہوتا ہے ممکن
ہے چار پانچ ہی آدمی ہوں جنہیں چار ہزار کہہ دیا گیا ہو
جیسے سکھوں کی عادت ہے کہ ایک آدمی بھی آجائے
اور وہ دروازہ کھٹکھٹائے۔ تو اندر والا پوچھتا ہے۔
باہر کون ہے؟ اس پر باہر والا جواب دیتا ہے "فوجاں"
وہ پوچھتا ہے کتنی؟ وہ جواب دیتا ہے سوا لاکھ۔
جس طرح سکھ ایک آدمی کو سوا لاکھ کہہ دیتے ہیں۔
اسی طرح بائبل کے لکھنے والے بھی تعداد میں خوب مبالغہ
کرتے ہیں۔ موسیٰ کی قوم کی تعداد بتائی گئی ہے تو اس
میں اتنا مبالغہ کیا گیا ہے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ حالانکہ
وہ کوئی بڑی قوم نہیں تھی۔ اسی طرح اس واقعہ میں بھی
خوب مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مگر بہرحال اس
سے ظاہر ہے کہ بھوکوں کو روٹی کھلانے کا جذبہ
اس کے اندر موجود تھا اور وہ غریبوں اور بھوکوں کو
کھانا کھلایا کرتا تھا۔ یہی واقعہ دوسری جگہوں میں بھی
آتا ہے۔
پھر حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ
خدا تعالیٰ نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک
کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ذکر لوقا باب ۲ آیت ۵۱
میں آتا ہے۔ وہاں لکھا ہے۔

"اور وہ اُن کے ساتھ روانہ ہو کر ناصرت
میں آیا اور اُن کے تابع رہا اور اس کی ماں نے
یہ سب باتیں اپنے دل میں رکھیں۔"

یعنی مسیح اپنی ماں کی اطاعت کرتا تھا لیکن جہاں لوقا نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنی ماں کا تابع رہا وہاں باقی سب انجیل نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ عملاً اپنی ماں کے احکام کو توڑتا رہا۔ کسی جگہ اس نے سختی سے اپنی ماں کو ڈانٹا کسی جگہ یہ کہا کہ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو کسی جگہ یہ کہا کہ تم چلے جاؤ میں تمہارے پیچھے آنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن قرآن ہر جگہ یہی بتاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا فرمانبردار تھا اور اس نے ہمیشہ اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

پھر فرماتا ہے وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا اُس نے مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا۔ جبار کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ یعنی اس کے ایک معنے ٹوٹے ہوئے کی اصلاح کرنے والے کے ہیں اور اس کے ایک معنے دوسرے کا حق مار کر اور اس کو ذلیل کر کے اپنے آپ کو اونچا کرنے والے کے ہیں۔ گویا ایک شخص تو ایسا ہوتا ہے جو جائز طور پر بڑائی حاصل کر کے بڑا بنتا ہے اور ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو دوسرے کو گرا کر اور اُس کا حق مار کر اس کے اوپر چڑھتا ہے۔ پس جبار کے ایک معنے ہیں دوسرے کو گرا کر اور اُسے ذلیل کر کے اپنی بڑائی اور بلندی چاہنے والا۔ اور اس کے دوسرے معنے ہیں ٹوٹے ہوئے کی اصلاح کرنے والا۔ جبار کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں ٹوٹے کام بنانے والا اور جب انسانوں کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں دوسروں کو گرا کر اپنی ترقی چاہنے والا۔ گویا جبار کا لفظ ایسا ہے جس کے مقابلہ میں نرم دل اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کے الفاظ آئیں گے۔ پس جب حضرت مسیح نے کہا کہ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا تو اس کے معنے یہ تھے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے جو اخلاق بخشے ہیں اُن کے لحاظ سے اُس نے مجھے جبار نہیں بنایا یعنی اس نے مجھے نرم دل اور لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والا وجود بنایا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل اس بارہ میں کیا کہتی ہے۔ اس کیلئے متی باب ۱۱ آیت ۲۹ میں ہمیں حضرت مسیح کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ

"میرا جُوا اپنے اوپر لے لو اور مجھ سے سیکھو
کیونکہ میں حلیم اور دل سے خاکسار ہوں تو
تم اپنے جیوں میں آرام پاؤ گے کیونکہ میرا
جُوا ملائم اور میرا بوجھ ہلکا ہے۔"

اس حوالہ میں وہ اپنے آپ کو دل کا حلیم اور خاکسار کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میں لوگوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اُن کا حق نہیں چھینتا۔ بلکہ اگر کوئی حکم بھی دیتا ہوں تو اس لئے کہ لوگوں کا فائدہ ہو۔ محض اپنی حکومت جتانے کے لئے میں کوئی حکم نہیں دیتا۔

اسی طرح متی باب ۲۱ آیت ۵ میں آتا ہے

"صیہون کی بیٹی سے کہو۔ دیکھ تیرا بادشاہ
فروتنی سے گدھی پر بلکہ گدھی کے بچہ پر سوار
ہو کے تجھ پاس آتا ہے۔"

اس حوالہ سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو فروتن کہتا ہے یعنی بجائے اِس کے کہ لوگوں کو گرا کر اور اُن کو کمزور کر کے وہ اپنی برتری کی کوشش کرتا وہ اپنے آپ کو لوگوں کا خادم بتاتا ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے وہ صورت نہایت مضحکہ خیز استعمال کرتا ہے۔ یعنی کسی غیر شخص کی گدھی کے بچہ پر سوار ہو کر شہر میں آتا ہے۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے۔

"اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور

زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے
تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا
کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ۔ وہاں
پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اُس
کے ساتھ بچہ پاؤ گے انہیں کھول کر میرے
پاس لے آؤ۔ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو
کہنا کہ خداوند کو ان کی ضرورت ہے۔"
(انجیل متی باب ۲۱ آیت ۱ تا ۳)

جبار کے ساتھ دوسرا لفظ شقی استعمال کیا گیا ہے
شقی عربی زبان کا لفظ ہے جو سعادت کے مقابل میں
استعمال ہوتا ہے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے
معانی اپنی ذات میں بیان ہو سکتے ہیں لیکن بعض الفاظ
ایسے ہوتے ہیں جن کے معنے صرف نسبت سے سمجھے
جا سکتے ہیں۔ عربی زبان میں شقی اور سعید بھی ایسے ہی
الفاظ ہیں جن کے معانی نسبت سے سمجھے جاتے ہیں ورنہ
یوں لغت میں دیکھو کہ سعید کے کیا معنے ہیں تو وہاں
لکھا ہوگا اَلسَّعِیْدُ مَنْ لَّمْ یَکُنْ شَقِیًّا۔ سعید
وہ ہے جو شقی نہ ہو اور شقی کے معنے دیکھیں تو لکھا ہوگا
اَلشَّقِیُّ مَنْ لَّمْ یَکُنْ سَعِیْدًا۔ شقی وہ ہے جو سعید
نہ ہو۔ پس یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متضاد
ہیں اور لُغت دیکھنے والا حیران ہوتا ہے کہ میں ان کے معنے
کہاں سے نکالوں مگر جب وہ لغت کی وضع کی طرف
جاتا ہے تو اُس پر اس لفظ کے معنے کُھل جاتے ہیں۔
درحقیقت سعید کے معنے ہوتے ہیں وہ شخص جو کسی دوسرے
کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرے۔ اور یہ لفظ خدا تعالیٰ
کے لئے نہیں بولا جاتا۔ کیونکہ سعید کے لئے ضروری ہوتا
ہے کہ اُسے کوئی دوسری طاقت کامیاب کروائے اور
شقی وہ ہوتا ہے جس کی مدد سے کوئی دوسری طاقت انکار
کر دے پس شقی کے معنے ہوں گے جو شخص جائز مددگار
اور جائز نصرت کرنے والے کی مدد سے محروم ہو اور
اُس کی تائید حاصل نہ کر سکے۔ اس کے لئے دیکھو
یوحنا باب ۱۶ آیت ۳۳ جہاں حضرت مسیح فرماتے ہیں:۔

" میں نے تمہیں یہ باتیں کہیں تاکہ تم مجھ میں
اطمینان پاؤ۔ تم دنیا میں مصیبت اُٹھاؤ گے
لیکن خاطر جمع رکھو کہ میں نے دنیا کو جیتا ہے۔"

یعنی تم پر مصیبتیں آئیں گی اور لوگ تمہیں کچلنا چاہیں گے
لیکن تم یقین رکھو کہ آخر مجھے فتح حاصل ہوگی۔ ہر نبی جو
دنیا میں آیا اُس نے لوگوں کے سامنے یہی دعویٰ کیا
ہے کہ مجھے فتح حاصل ہوگی اور میرے مقابل میں کھڑے
ہونے والے لوگ ناکام ہوں گے۔ مگر تعجب ہے آج ہم
پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ ہم
فتح پائیں گے۔ حالانکہ اگر کوئی جھوٹے طور پر دعوے
کرے تو وہ بھی یہی کہا کرتا ہے کہ میں فتح پاؤں گا اور
جس کو خدا تعالیٰ کہے کہ میں تجھے کامیاب کروں گا
وہ اگر یہ نہ کہے کہ میں کامیاب ہوں گا تو اور کیا کہے۔
مسیح بھی یہی کہتا ہے کہ " میں نے دنیا کو جیتا ہے"۔ اس
کے یہی معنے ہیں کہ لَمْ یَجْعَلْنِیْ شَقِیًّا۔ میں شقی
نہیں ہوں میں دنیا کو جیتنے والا ہوں۔

اسی طرح لوقا باب ۱۰ آیت ۹ میں لکھا ہے کہ حضرت
مسیح نے اپنے حواریوں سے کہا کہ جب تم تبلیغ کیلئے کسی
شہر میں جاؤ تو " وہاں کے بیماروں کو چنگا کرو اور اُن سے
کہو کہ خدا کی بادشاہت تمہارے نزدیک آئی ہے"
یعنی تم تسلی رکھو کہ تم جلدی فتح پاؤ گے اور کامیابی
تمہیں حاصل ہو جائے گی۔

غرض وہ ساری باتیں جو قرآن کریم نے بیان کی
ہیں انجیل میں بھی موجود ہیں۔ پس عیسائیوں کا یہ کہنا کہ
اپنی طرف سے باتیں بنا کر مسیح کے مُنہ میں ڈال دی گئی ہیں یا تو اُنکے
جھوٹ پر اور یا پھر اُنکی اپنی کتب سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ

اور جس دن میں پیدا ہوا تھا اس دن بھی مجھ پر سلامتی نازل ہوئی تھی اور جب میں مرونگا اور جب مجھے زندہ

وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۴﴾

کر کے اٹھایا جائیگا اُس وقت بھی مجھ پر سلامتی نازل کی جائیگی۔ ؎۲۶

؎۲۶ تفسیر: حضرت یحیٰی علیہ السلام کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے یہی کہا ہے کہ وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا (مریم ع) یعنی وہاں خود اللہ تعالیٰ نے حضرت یحیٰی کے متعلق کہا ہے کہ جس دن وہ پیدا ہوگا اُس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی۔ جس دن مریگا اُس دن بھی اُس پر سلامتی ہوگی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اُس دن بھی اُس پر سلامتی ہوگی۔ اور یہاں حضرت مسیح نے اپنی زبان سے کہا ہے کہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا اس آیت سے دو نہایت غلط استدلال کئے جاتے ہیں۔ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ سے تو یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کو شیطان نے نہیں چھوا اور یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ کہ حضرت مسیح کو صلیب پر نہیں لٹکایا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اگر اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کہ حضرت مسیح کو شیطان نے نہیں چھوا تو یہی الفاظ حضرت یحیٰی کے متعلق بھی استعمال ہوئے ہیں اُن کے متعلق یہ کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا کہ وہ مس شیطان سے پاک تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ اُن کی عصمت پر دلالت نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیدائش سے ہی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بابرکت بنایا ہے اور اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ موسیٰؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور دوسرے ہزاروں ہزار انبیاء سب اپنی پیدائش کے وقت سے ہی بابرکت تھے۔ اور یَوْمَ اَمُوْتُ سے جو یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں لٹکا یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ صلیب پر لٹکنا سلامتی کے خلاف نہیں بلکہ صلیب پر لٹک کر مر جانا سلامتی کے خلاف ہے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ

"جسے پھانسی ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملعون ہے۔" (استثناء باب ۲۱ آیت ۲۳)

پس یَوْمَ اَمُوْتُ کے یہ معنے ہیں کہ میری موت ایسی نہیں ہوگی جس کو لعنتی کہا جاسکے بلکہ میری موت خدا تعالیٰ کی رضاء میں ہوگی اور میرا رفع خدا تعالیٰ کی طرف ہوگا۔ پس یَوْمَ اَمُوْتُ میں صلیب کی موت کی تو نفی پائی جاتی ہے مگر اس سے صلیب پر لٹکائے جانے کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ حضرت یحیٰیؑ شہید نہیں ہوئے۔ کیونکہ دشمن کے ہاتھوں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونا سلامتی کے خلاف نہیں ہوتا۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا پہلے یہی عقیدہ تھا کہ حضرت یحیٰی شہید نہیں ہوئے مگر جب آپ کے سامنے کثرت کے ساتھ حوالجات پیش کئے گئے جن سے حضرت یحیٰی کی شہادت ثابت ہوتی تھی تو آپ نے اپنے اس عقیدہ سے رجوع فرمالیا آپ بھی شروع میں حضرت یحیٰی کی شہادت کے خلاف

یہی دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ اُن کے متعلق فرماتا ہے وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔ حالانکہ موت سلامتی کے خلاف نہیں ہوتی خواہ وہ طبعی موت ہو یا تلوار کے ذریعہ ہو۔ اگر موت سلامتی کے خلاف ہوتی تب تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا لیکن جب موت سلامتی کے خلاف ہی نہیں تو چاہے کسی کو بخار نے مار دیا ہو یا تلوار نے مار دیا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن صلیب پر لٹک کر مرنا یقیناً سلامتی کے خلاف ہے۔ اور حضرت یحییٰ کی موت صلیب پر نہیں ہوئی اِس لئے اِن الفاظ سے اُن کے قتل ہونے کا رد نہیں ہوتا لیکن يَوْمَ اَمُوْتُ سے حضرت مسیح کے صلیب پر لٹک کر مارے جانے کی ضرور نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ بائبل کے بیان کے مطابق وہ لعنتی موت تھی۔ اس آیت سے بظاہر تو مسیح کی بڑی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسیح انسان تھا خدا نہیں تھا۔ کیونکہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ دلالت کرتا ہے کہ سلامتی کہیں اَور سے آئی ہے اور کسی پر نازل ہوئی ہے۔ سلامتی دینے والا کوئی اَور وجود ہے اور جس پر سلامتی نازل ہوئی ہے وہ اَور وجود ہے۔

خدا تعالےٰ کا ایک نام جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے اَلسَّلَامُ بھی ہے۔ اب اگر ہم اس نام کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے بچوں کا نام رکھیں گے تو عبدالسلام نام رکھیں گے یا کسی پر سلامتی پہنچانا چاہیں گے تو سَلَامٌ عَلَيْهِ یا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہیں گے۔ لیکن اس کے کبھی یہ معنے نہیں ہوں گے کہ تم قتل نہیں کئے جاؤ گے یا صلیب پر نہیں لٹکائے جاؤ گے۔ اِسی طرح ہم نمازوں میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ۔ لیکن ہم یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ سوائے اِس کے کہ کبھی استعارہ کے طور پر کوئی شخص اس لفظ کا استعمال کرے۔ مثلاً کوئی شخص خدا تعالےٰ کا تصوّر اپنے ذہن میں لاتے اور اس کی محبت میں محو ہو کر ایک ارلودگی کی کیفیت میں اُسے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کہہ دے۔ اگر وہ ایسا کہے تو وہ محض ایک استعارہ ہوگا۔ اِسے حقیقت پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ بہرحال جب ہم کسی کے متعلق سلامتی کا لفظ استعمال کریں گے تو یہی مراد لیں گے کہ وہ شخص انسان ہے اور سلامتی کا محتاج ہے۔ اور ہمارے ذہن میں اُس وقت یہ مضمون بھی ہوگا کہ سلامتی دینے والا صرف خدا ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ میں حضرت مسیح اپنی پیدائش اور موت دونوں وقتوں کے متعلق کہتے ہیں کہ مجھ پر سلامتی نازل کی گئی ہے ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو سلام ہے وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا۔ اسی طرح جب میں زندہ کیا جاؤں گا تو اُس دن بھی مجھ پر سلامتی نازل ہوگی اُبْعَثُ حَيًّا کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ سلامتی بخشنے والا کوئی اور وجود ہے اور سلامتی حاصل کرنے والا کوئی اَور ہے۔

بظاہر تو اس آیت میں حضرت مسیح کی بڑی شان نظر آتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ حضرت مسیح کا مقام کتنا بلند تھا کہ اُن کی پیدائش پر بھی اور موت پر بھی اور دوبارہ حیات پر بھی سلامتی نازل کی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت اصل مفہوم اس آیت کا یہی ہے کہ مسیح انسان تھا، خدا نہیں تھا اور جبکہ یہ الفاظ مسیح کی انسانیت پر دلالت کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ انسان تھا خدا نہیں تھا تو طبعی طور پر عیسائیوں کے دلوں میں اعتراض پیدا ہوگا کہ ہمارے خدا کو

انسان ثابت کرنے کے لئے جھوٹے کلمے اُس کے مُنہ میں ڈال دیئے گئے ہیں پس چونکہ اس آیت سے بھی عیسائیوں کے لئے اعتراض کا موقع پیدا ہوتا ہے اِس لئے ضروری ہے کہ ہم انجیل کو دیکھیں اور غور کریں کہ وہ اِس بارہ میں کیا کہتی ہے۔

یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے دو معنے ہوں گے۔ ایک ہمارے نقطہ نگاہ سے اور ایک عیسائیوں کے نقطہ نگاہ سے کیونکہ ہمارے اور اُن کے نقطہ نگاہ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ ہمارے نزدیک مسیح صلیب پر مرا نہیں بلکہ وہ صلیب پر لٹک کر کانپتا تھا۔ پس ہمارے نزدیک یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا سے مراد وہ وقت ہوگا جب مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا اور اُس پر ایک رنگ میں موت طاری ہوئی لیکن پھر وہ اُس موت سے بچا لیا گیا لیکن عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح صلیب پر سچ مچ مر گیا تھا اور تین دن کے بعد خدا نے اُسے پھر زندہ کر دیا۔ پس عیسائی نقطہ نگاہ سے یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا سے مراد وہ وقت ہوگا جب وہ صلیبی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوا۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک وہ بھی بعث ہے جب انسان اپنی حقیقی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائیگا لیکن اُس سلامتی کا ہم دوسرے کو کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے اور اُبْعَثُ حَیًّا کے جو معنے میں نے کئے ہیں اس کا ثبوت ہم ہر عیسائی کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انجیل سے ظاہر ہے کہ خدا نے اُسے موت کی شکل سے نجات دی اور صلیب سے بچا لیا۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں پر اُن کے نقطہ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس طرح حجت تمام کر سکتے ہیں کہ تم خود مانتے ہو کہ مسیح مر گیا تھا اور پھر وہ زندہ ہو گیا۔ گویا اسے سلامتی حاصل ہوئی۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ اگلے جہان میں مسیح پر سلامتی نازل ہوگی تو اس سلامتی کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی حالانکہ وہ چیزیں جن کو دشمن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اُن کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے پاس دلائل ہوں ورنہ دشمن اُن کو مان نہیں سکتا۔

بے شک بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اُن کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی مگر وہ صرف ایسی ہی ہوتی ہیں جن کا عقائد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے تو ایک غیر مومن کے لئے ہمارا اتنا ثابت کر دینا کافی ہے۔ آگے یہ کہ کیا کیا نعماء ہیں جو اُسے جنت میں دی جائیں گی اور وہ نعمتیں کس شکل اور صورت میں ہوں گی۔ اس کے لئے ہمیں کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ صرف ہمارے ایمان میں شامل ہے۔ اس کا تعلق اُن اعتقادات کے ساتھ نہیں جن کو دوسروں سے منوانے کے لئے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمارے پاس آئے اور کہے کہ ثابت کرو کہ جنت میں انسان جو کچھ خواہش کریگا وہ پوری ہو جائے گی۔ تو ہم اُسے کہیں گے کہ تمہارا یہ مطالبہ فضول ہے تمہارے ساتھ جو تعلق رکھنے والی چیز ہے وہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ باقی یہ کہ زندہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ یہ اُن باتوں میں سے نہیں جن کو ثابت کرنا ہمارے لئے ضروری ہو۔ بعض لوگوں نے ایسی باتوں کو ذوقیات قرار دیا ہے اور بعض نے انہیں ایمانیات کا حصہ قرار دیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر خوش ہوتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگلے جہان میں اُن کیلئے

بڑی بڑی نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں۔ بہرحال ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہم دلیل دے کر اپنے دشمن سے بھی اِن باتوں کو منوانے کی کوشش کریں لیکن اس جگہ ایک دعویٰ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مسیح کی ولادت پر بھی اس کیلئے سلامتی نازل ہوئی اور بعد میں بھی وہ ہمیشہ سلامتی کا مورد رہا۔ پس ضروری ہے کہ ہمارے پاس اس سلامتی کے دلائل موجود ہوں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس سلامتی کا انجیل میں کہیں ذکر آتا ہے۔ اس کے لئے جب ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی جب پیدائش ہوئی تو وہ گڈریے جو شہر سے باہر اپنے جانور چرایا کرتے تھے اور جن کے قریب ہی جنگل میں حضرت مسیح پیدا ہوئے تھے انہوں نے کشفی حالت میں دیکھا کہ فرشتے کہہ رہے ہیں کہ

"خدا کو آسمان پر تعریف اور زمین پر سلامتی
اور آدمیوں سے رضامندی ہووے"

(انجیل لوقا باب ۲ آیت ۱۴)

اس فقرہ میں تین باتیں کہی گئی ہیں اوّل خدا تعالیٰ کی آسمان پر تعریف ہو۔ دوم خدا تعالیٰ کی زمین پر سلامتی ہو۔ سوم خدا تعالیٰ کی آدمیوں سے رضامندی ہو۔

اس فقرہ کا پہلا حصہ تو ہے ہی خدا تعالیٰ کے متعلق کہ آسمان پر اس کی تعریف ہو۔ اس لئے اِس حصہ کے متعلق تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی زمین پر سلامتی ہو۔ یہ فقرہ خدا تعالیٰ کے متعلق کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ خود سلامتی والا ہے اور اس کے لئے ہر جگہ سلامتی ہے اُس کے سلامت نہ رہنے کے متعلق کوئی خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ دعا مانگی جائے کہ اُسے زمین پر سلامتی ہو۔ زمین پر سلامتی کے محتاج انسان ہوا کرتے ہیں اور انہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی عطا کی جاتی ہے۔ تیسرا حصہ یہ ہے کہ اُسے آدمیوں سے رضامندی ہو۔ یہ فقرہ تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلیں اور انہیں اس کی رضاء حاصل ہو۔ بہرحال پہلے حصہ میں خدا تعالیٰ کا ذکر آگیا کہ اُس کے لئے آسمان پر تعریف ہو۔ تیسرے حصہ میں تمام بنی نوع انسان کا ذکر آگیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو۔ باقی رہ گیا دوسرا حصہ جو زمین پر سلامتی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے سو ظاہر ہے کہ جب یہ کشف مسیح کی پیدائش پر دکھایا گیا تو لازماً "زمین پر سلامتی" کے الفاظ بھی حضرت مسیح کے ساتھ ہی تعلق رکھتے ہیں ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کو آسمان پر تو سلامتی حاصل ہے لیکن زمین پر سلامتی حاصل نہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی سلامتی کو نہ پہلے کبھی کوئی خطرہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پس "زمین پر سلامتی" کے الفاظ کا یہی مفہوم ہے کہ مسیح کی پیدائش سلامتی کا موجب ہے گویا انجیل نے بھی بتا دیا کہ مسیح کی پیدائش کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے لئے سلامتی نازل کی گئی تھی۔

پھر یوحنا باب ۱۶ آیت ۳۲ میں حضرت مسیح کہتے ہیں

"تو بھی میں اکیلا نہیں کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے"

آپ فرماتے ہیں اگر تم مجھ کو چھوڑنا چاہو تو بے شک چھوڑ دو۔ تمہارے متعلق مجھے زیادہ سے زیادہ یہی خطرہ ہو سکتا ہے کہ اگر فتنے پیدا ہوئے اور مصائب کا دَور آیا تو تم مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم ایسا کرو تب بھی مجھے کوئی پروا نہیں کیونکہ میں اکیلا نہیں خدا میرے ساتھ ہے۔ تمہارے ساتھ ہونے سے

مجھے کوئی تقویت نہیں پہنچتی اور تمہارے علیحدہ ہونے سے مجھے کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ گویا انجیل میں اُن کی ولادت پر بھی سلامتی کا ذکر آتا ہے اور پھر زندگی میں بھی ہمیشہ اُن کے سلامت رہنے کا ذکر موجود ہے۔

پھر واقعہ صلیب کے وقت بھی جو یہودیوں اور مسیحیوں کے نزدیک اُن کی حقیقی موت کا وقت تھا اور ہمارے نزدیک اُس وقت موت کی صرف ایک شکل ظاہر ہوئی اُن پر سلامتی نازل ہوئی اور خدا نے انہیں نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اعمال میں لکھا ہے

"خدا نے یسوع ناصری کو روح القدس اور قدرت سے ممسوح کیا۔ وہ نیکی کرتا اور اُن سب کو جو شیطان کے ہاتھ سے ظلم اُٹھاتے تھے چنگا کرتا پھرا کیونکہ خدا اس کے ساتھ تھا" (اعمال باب ۱۰ آیت ۳۸)

پھر وہ وقت جب انسان پر حقیقی موت آتی ہے اُس میں بھی مسیح پر سلامتی نازل ہونے کا ذکر ہے چنانچہ اعمال میں لکھا ہے

"میں آسمان کو کھلا اور ابن آدم کو خدا کے داہنے ہاتھ کھڑے دیکھتا ہوں۔"

(اعمال باب ۷ آیت ۵۶)

اسی طرح لوقا باب ۲۲ آیت ۶۹ میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں

"اب سے ابن آدم خدا کی قدرت کے داہنے ہاتھ بیٹھا رہے گا۔"

یعنی واقعہ صلیب کو دیکھ کر دشمن یہ خیال کرے گا کہ اُس نے مجھے تباہ کر دیا ہے مگر میں خدا کے داہنے ہاتھ جا بیٹھوں گا اور اس کا فضل میرے شامل حال ہوگا۔

یہ وہ سلامتی کے دعوے ہیں جو انجیل میں موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ مسیح انسان تھا خدا نہیں تھا۔ کیونکہ اُن کی سلامتی کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ خدا اُن کے ساتھ ہے پس معلوم ہوا کہ انہیں سلامتی خدا کی طرف سے آتی تھی۔ اگر وہ خود خدا ہوتے تو انہیں کہنا چاہیئے تھا کہ میں تو خدا ہوں اور خدا مر ہی نہیں سکتا۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کہا۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں بالقوہ سلامتی رکھتا ہوں بلکہ کہا کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وہ انسان تھے خدا نہیں تھے۔

اس جگہ ایک اور امر بھی یاد رکھنے والا ہے اور وہ یہ کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ذکر کو اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی اس لئے ملایا تھا کہ یہ بتائے کہ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ارہاص کے طور پر آئے تھے مگر آگے اُن دونوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ بھی آپس میں اتنی ملتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں وجود ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے تھے مثلاً

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم نے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا گویا وہاں بھی نبوت اور جوان عمر میں نبوۃ اور کتاب ملنے کا ذکر ہے اور یہاں بھی نبوت اور کتاب ملنے کا ذکر ہے۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا اور حضرت یحییٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ

بَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا

اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔

یہ تمام الفاظ آپس میں بہت ہی مشابہ ہیں اور معانی کے لحاظ سے بھی ان میں اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً حضرت مسیح کے متعلق کہا گیا ہے وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ اور اَوْصَاهُ بِكَذَا اور وَصَّاهُ بِكَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَهِدَ اِلَيْهِ یعنی اس کے متعلق اس کو پختہ وصیت کی۔ ایسی وصیت جو عہد کی حد تک جا پہنچتی ہے اور اُدھر حضرت یحییٰؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔ یہ الفاظ بھی زور اور شدت پر دلالت کرتے ہیں۔

پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا گیا کہ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ جبّار نہ تھے اور نہ گنہگار۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُن کو خدا نے جبّار نہیں بنایا اور ناکام نہیں بنایا۔ گویا اس جگہ حضرت یحییٰ کی ذاتی خوبیوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ گنہگار نہ ہونا یہ ذاتی خوبی پر دلالت کرتا ہے۔ اور لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا میں شقی نہ ہونے پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور شقی نہ ہونا ایک قومی خوبی ہے کسی روحانی لیڈر اور نبی کی کامیابی کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کی جماعت دنیا پر غالب آجائے اور پھیل جائے پس مسیح کی قومی خوبی بیان کی گئی ہے اور یحییٰ کی ذاتی خوبی بیان کی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ ان کی قوم بحیثیت قوم دنیا میں باقی نہیں رہے گی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بتایا تھا کہ اُن پر ایمان لانیوالے لوگ بحیثیت جماعت دنیا میں قائم رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام درمیانی نبیوں میں سے ایک نبی تھے جن کی حیثیت ایک مجدّد کی سی تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلسلہ موسویہ کی آخری کڑی تھے اور خدائی سُنّت یہ ہے کہ سلسلہ کی ابتدائی اور آخری کڑی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور اُن کے نام اور کام اور سلسلہ کو باقی رکھا جاتا ہے لیکن درمیان میں آنے والے لوگوں کے کام بانی سلسلہ کے کام میں مدغم ہو جاتے ہیں اور اُن کی کوئی علیحدہ حیثیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت داؤد علیہ السلام ایک بڑے نبی تھے لیکن اُن کا کام موسیٰ کے کام میں مدغم ہو گیا حضرت یسعیاہؑ ایک بڑے نبی تھے۔ یرمیاہؑ ایک بڑے نبی تھے۔ حزقیلؑ ایک بڑے نبی تھے عزیرؑ ایک بڑے نبی تھے لیکن اُن سب کے کام موسیٰؑ کے کام میں مدغم ہو گئے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کام کو ایک علیحدہ حیثیت دی گئی۔ کیونکہ وہ سلسلۂ موسویہ کی آخری کڑی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محی الدین صاحب ابن عربی لکھتے ہیں کہ آنیوالا مسیحؑ قیامت کے دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے ایک اور چھوٹا سا جھنڈا لے کر کھڑا ہوگا۔ یعنی اُس کا نام علیحدہ طور پر جماعتی لحاظ سے قائم رکھا جائے گا جبکہ باقی لوگوں کے کام کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کام میں مدغم

کر دیا جائے گا گویا اُس کی تصویر کو ایک چھوٹے پیمانہ میں الگ بھی دکھایا جائے گا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اُس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری میں اتنی اعلیٰ شان حاصل کی ہے کہ اس کو ایک مخصوص حیثیت بھی حاصل ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اُن کے متعلق خدا کہتا ہے کہ اُن پر سلامتی ہوگی اور حضرت مسیح اپنے متعلق خود کہتے ہیں کہ مجھ پر سلامتی ہوگی۔ یہ دونوں قول ایک ایک رنگ میں ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُسے تو اِس رنگ میں برتری حاصل ہے کہ خدا کہہ رہا ہے کہ اُن پر سلامتی ہوگی اور خدا کا کہنا ایک بڑی بات ہے لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کے قول کو اِس رنگ میں برتری حاصل ہے کہ آخر کسی کو اپنی سلامتی کا اسی طرح پتہ چل سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسے خبر ملے کہ تو سلامت رہے گا۔ پس گو زبان سے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے خدا نے کہا ہے کہ مجھ پر سلامتی ہوگی لیکن بہرحال یہ امر ظاہر ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ نے ہی بتایا ہوگا تبھی انہوں نے لوگوں سے یہ بات کہی مگر انہوں نے اس سلامتی کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اُن میں کُن فیکون والی طاقت پائی جاتی تھی کہ میرے اوپر سلامتی ہوگی اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سلامتی سے محروم نہیں کر سکیگی۔

اس تقابل سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی سلامتی والی بتائی گئی ہے اور حضرت مسیح کی پیدائش بھی سلامتی والی بتائی گئی ہے۔ اب اگر اس کے صرف اتنے ہی معنے ہوں کہ یحییٰ بھی بچ جائیں گے اور مسیح بھی بچ جائیگا تو اس میں یحییٰ اور مسیح کی کوئی خاص خصوصیت نظر نہیں آتی اس طرح تو جتنے بچے زندہ رہتے ہیں وہ سب خدا تعالےٰ کی سلامتی کے نتیجہ میں ہی زندہ رہتے ہیں۔ درحقیقت اِن الفاظ سے بتانا یہ مدنظر ہے کہ اِن دونوں کی پیدائش اپنے ساتھ الٰہی نشان رکھنے والی ہوگی۔ گویا سلامتی یہ نہیں کہ ان کو جسمانی لحاظ سے سلامتی حاصل ہوگی اور یہ زندہ رہیں گے۔ وہ تو جو بچہ بھی زندہ رہتا ہے خدا تعالےٰ کی سلامتی کی وجہ سے ہی زندہ رہتا ہے۔ اِن دونوں کے متعلق خصوصیت سے یہ کہنا کہ اُن کی پیدائش سلامتی والی ہوگی بتاتا تھا کہ ان کے ذریعہ دنیا پر سلامتی نازل ہوگی یہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ایسے نشانات لے کر آئینگے کہ اِن کی پیدائش دنیا کو کفر سے نجات دینے والی ہوگی' اِن کی پیدائش دنیا کو بے ایمانی سے نجات دینے والی ہوگی۔ جو بھی یحییٰ کی معجزانہ پیدائش اور اسکے کارناموں کو دیکھے گا اور جو بھی عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش اور اسکے حیرت انگیز کاموں کا مشاہدہ کرے گا اور اُس تغیر کو دیکھیگا جو انہوں نے دنیا میں پیدا کیا اور ان نشانات کو دیکھیگا جو اُن کے ذریعہ ظاہر ہوئے اس کا ایمان تازہ ہوگا۔ اس کا کفر دور ہوگا۔ اس کی بے ایمانی اس سے جاتی رہے گی شکوک و شبہات اور وساوس کی تاریکیاں دور ہو جائینگی خدا کا نور اس کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور وہ سمجھیگا کہ ہمارا خدا بڑا قادر خدا ہے۔ پس ایک تو یحییٰؑ اور مسیح کی پیدائش کو خدا تعالےٰ نے سلامتی والا قرار دیا

پھر فرمایا کہ یحییٰ کی موت بھی سلامتی والی ہوگی اور مسیح کی موت بھی سلامتی والی ہوگی۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اُن کی موت انسانی دخل سے پاک ہوگی جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اس جگہ سلامتی کا لفظ آتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے۔ حالانکہ کوئی شخص شہادت حاصل کرے

باطبعی طور پر وفات پائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب اُس نے مرنا ہی ہے تو پھر وہ کسی طرح مرجائے بات ایک ہی ہوگی۔ یا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ موت سے محفوظ رہیں گے اور اگر انہوں نے موت سے ہی محفوظ رہنا تھا تو پھر اَمُوْتُ کا لفظ نہیں آنا چاہیئے تھا یہ کہنا چاہیئے تھا کہ وہ ساری عمر موت سے محفوظ رہیں گے لیکن جب خدا تعالےٰ نے یہ کہا کہ اُس کی موت کے وقت بھی سلامتی ہوگی تو اِس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالےٰ فنا ہونے کی نفی نہیں کر رہا اور جب اُس نے فنا ہونے کی نفی نہیں کی تو پھر موت خواہ کسی آدمی کے ہاتھ سے ہو یا فرشتہ کے ہاتھ سے بات ایک ہی ہے۔ پس اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کوئی ایسا مطلب ہونا چاہیئے کہ موت کے باوجود یحییٰؑ اور مسیحؑ پر خدا تعالےٰ کی طرف سے سلامتی ہو اور وہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ جس مقصد کو لے کر وہ دنیا میں کھڑے ہوئے تھے اور جس مدعا کے حصول کیلئے انکی دنیا میں بعثت ہوئی تھی اُس مقصد اور مدعا کے راستہ میں اُن کی موت حائل نہیں ہوگی۔ وہ مرجائیں گے مگر اُن کا نام زندہ رہے گا۔ وہ مرجائیں گے مگر اُن کا کام زندہ رہے گا اور اس طرح انکی موت بھی سلامتی والی موت ہوگی اور اِس میں کیا شبہ ہے کہ اگر موت کے باوجود کسی شخص کا پیغام رُکا نہیں۔ اگر موت نے اس کے کام کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور کے ساتھ جاری ہوگیا ہے تو یقیناً اس کی موت سلامتی والی ہے اور اگر موت کے ساتھ ہی اس کا کام بھی فنا ہوگیا ہے اور اس کا نام بھی مٹ گیا ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ اس کی موت ہلاکت اور بربادی والی موت ہے۔ لیکن اگر موت کے بعد بھی کسی کا کام جاری رہے تو ہم اسکو مردہ نہیں کہہ سکتے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مامون نے اپنے دو بیٹوں کو فرّاء کے پاس جو ایک مشہور نحوی گذرے ہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھایا۔ ایک دن فرّاء کسی کام کے لئے اُٹھا تو دونوں شہزادے دوڑ پڑے تاکہ اُستاد کے سامنے اس کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھیں مگر چونکہ دونوں اکٹھے پہنچے تھے اس لئے اُن کا آپس میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ ایک کہتا تھا میں اُن کے آگے جوتیاں رکھوں گا اور دوسرا کہتا تھا میں رکھوں گا۔ آخر دونوں نے ایک ایک جوتی اُٹھا کر اُسکے سامنے رکھ دی۔ جب مامون کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے فرّاء سے کہا کہ مَا هَلَكَ مَنْ خَلَّفَ مِثْلَكَ۔ جس شخص کے ایسے شاگرد باقی رہ جائیں جو اس کا اِتنا ادب اور احترام کرنے والے ہوں وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اِسی طرح جس شخص کی جماعت دنیا میں قائم رہے جس کے نام لیوا دنیا میں موجود ہوں جو اس کے نام اور کام کو زندہ رکھنے والے ہوں اُس کی موت سلامتی والی موت کہلائیگی۔ کیونکہ موت تو آئی مگر موت نے اُس کے کاموں میں تعطّل پیدا نہیں کیا۔ پس جب ہم یہ کہیں گے کہ فلاں کی موت سلامتی والی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ کسی انسان کے ہاتھ سے مر نہیں سکتا۔ کیونکہ جب انسان مرگیا تو چاہے کسی طرح مرا اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ سلامتی والی موت وہ کہلاتی ہے۔ جس موت کے بعد بھی انسان کا نام زندہ رہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے چنانچہ دیکھ لو حضرت یحییٰ علیہ السلام مر گئے۔ اُن کی جماعت کا وجود تک باقی نہیں رہا مگر آج سارے مسلمان کہتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام سو فرقان میں جب بھی یہ پڑھتے ہیں وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا تو حضرت یحییٰ کا

ذکر تازہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی زندگی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور محبت اور احترام کے جذبات اُن کے متعلق پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس باوجود موت کے وہ زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ یہی حال حضرت مسیحؑ کا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیحؑ کے ماننے والے دنیا میں موجود ہیں لیکن حقیقتاً وہ اب اُن کے ذریعہ زندہ نہیں۔ کیونکہ وہ مسیحؑ کو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اصل میں مسیح اگر زندہ ہے تو اسلام کے ذریعہ سے۔ مسیحؑ زندہ ہے قرآن کے ذریعہ سے۔ مسیحؑ زندہ ہے ہماری جماعت کے ذریعہ سے۔ کیونکہ اسلام اور قرآن ہی ہیں جو حقیقی مسیحؑ کو دنیا میں پیش کر رہے ہیں۔ پس اس سلامتی سے مراد یہ ہے کہ یحییٰؑ اور مسیحؑ کا نام دنیا میں زندہ رہے گا۔ اُن کی سچی تعلیم دنیا میں قائم رہے گی۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے اور پھر قرآن اور اسلام کے ذریعہ ایک دائمی حیات کے وارث ہوں گے۔

آگے حضرت یحییٰؑ کے متعلق آتا ہے کہ اُن پر اُس دن بھی سلامتی ہوگی یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا اور حضرت مسیحؑ بھی کہتے ہیں کہ وَالسَّلَامُ عَلَیَّ ..... یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سلامتی کا ثبوت کیا ہے اور کون جاکر دیکھیگا کہ اُس دن اُن پر سلامتی نازل ہوتی ہے یا نہیں۔ اس طرح تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ جب میں مرنے کے بعد اُٹھوں گا تو مجھے یہ یہ مدارج ملیں گے اور ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم تحقیق کرکے فیصلہ کرسکیں کہ کہنے والے کی بات صحیح ہے یا غلط۔

اِس سوال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ کہنے والے کی ہر بات کو اس کی سابق اور گذشتہ باتوں پر قیاس کیا جاتا ہے اور پھر ایک نتیجہ نکال لیا جاتا ہے یہ قانون دنیا میں ہر جگہ جاری ہے اور قرآن کریم نے بھی بعث بعد الموت کے ثبوت میں اِسے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے کہا ہے کہ تم اُن پیشگوئیوں پر غور کرو جو تمہاری تباہی اور اسلام کی ترقی کے متعلق کی گئی ہیں اور جن کے ساتھ اگلے جہان سے تعلق رکھنے والے بعض وعدے وابستہ کردیئے گئے ہیں۔ ان دنیوی ترقیات کے ساتھ تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں پر غور کرکے تم سمجھ سکتے ہو کہ جب وہ باتیں پوری ہوری ہیں جن کے متعلق کوئی عقل تسلیم نہیں کرسکتی تھی کہ پوری ہوجائیں گی۔ تو اسی پر قیاس کرکے تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ آخرت کے متعلق ہماری طرف سے جو خبریں دیگئی ہیں وہ بھی ایک دن پوری ہو کر رہیں گی۔ یہی دلیل اس مقام پر دی گئی ہے اور تیسری بات کے ذکر سے پہلے دو اور باتیں بیان کی گئی ہیں جو اس دنیا کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور پھر انکی شہادت پیش کرتے ہوئے تیسری بات بیان کی گئی ہے۔ تاکہ کسی شخص کو اس تیسری بات کے تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ نہ ہو اور وہ سمجھ لے کہ جب پہلی دو باتیں سخت مخالف حالات کے باوجود پوری ہوگئی ہیں تو یہ تیسری بات کیوں پوری نہ ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص دنیا میں آکر اپنی قربانی اور ایثار سے اور اپنی نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی سے کام لے کر ایسا تغیر پیدا کرتا ہے جس کی دنیا میں کوئی شخص بھی امید نہیں کرسکتا تھا اور وہ اِن باتوں کی پہلے سے خبر دے دیتا ہے تو یقیناً یہ انقلاب اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اگلے جہان کے متعلق جو اُس نے خبر دی ہے وہ بھی ضرور سچی ہوگی

چنانچہ دیکھ لو حضرت یحییٰ آور حضرت مسیح پیدا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی بزرگی اور تقدیس ظاہر ہوگی اور ہم دنیا میں نیکی کا بیج قائم کر دیں گے اور کفر اور شیطنت کو دنیا سے نابود کر دیں گے۔ لوگوں نے اُن کی مخالفت کی۔ حکومتوں نے اُن کو کچلنا چاہا مگر باوجود اس کے کہ مخالفین نے انہیں مارا پیٹا۔ یہاں تک کہ ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا اور باوجود اس کے کہ اُن کے راستہ میں ہر قسم کی روکیں پیدا کی گئیں، پھر بھی جو تعلیم وہ لائے تھے وہ دنیا میں پھیل گئی۔ وہ لوگ جو بڑی بڑی طاقتیں رکھنے والے تھے تباہ ہوگئے یہاں تک کہ حکومتیں مٹ گئیں اور یحییٰ اور مسیح کامیاب ہوئے۔ جب آدھی بات اتنے مخالف حالات میں پوری ہو گئی ہے تو ہر شخص کہیگا کہ دوسری بات بھی ضرور سچی ہوگی۔ اگر حضرت مسیح صرف اتنا کہتے کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا تو ایک مخالف کے لئے شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی اور وہ کہہ سکتا تھا کہ میں اِس بات کو کس طرح مان لوں کہ جب مسیح زندہ ہوگا تو اُس پر سلامتی ہوگی۔ مگر خدا نے اسے تیسری جگہ رکھا ہے اس سے پہلے یہ دو باتیں بیان کی ہیں کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ گویا بتایا کہ تین سلامتیاں آئیں گی۔ ایک پیدائش پر سلامتی ہوگی، ایک موت پر سلامتی ہوگی اور ایک دوبارہ حیات پر سلامتی ہوگی۔ اب غور کر کے دیکھ لو حضرت زکریاؑ کے گھر میں پیدا ہونے والے یحییٰ کے متعلق انکے بچپن میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا انسان بنیگا اور دنیا کی نجات کا باعث ہوگا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہوگا۔ اور مخالف حالات میں ترقی کی انتہائی منازل طے کر جائیگا

یقیناً کوئی انسان اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ دوسرے کے مستقبل سے ناواقف ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی پیدائش سے بھی پہلے اس قسم کی خبریں دیں اور پھر ویسا ہی ہوگیا جیسے خدا نے کہا تھا۔ یہ پیدائش سے قبل خدا تعالیٰ کا خبریں دینا اور پھر ویسا ہی وقوع میں آجانا بتاتا ہے۔ کہ انکی پیدائش یقیناً معجزانہ تھی اور جو کچھ خدا نے کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ہم بے شک مر جائیں گے۔ مگر ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے وہ ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ جیسے سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گورنر پنجاب کی طرف سے مجھے ۱۹۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو نوٹس ملا اور ڈی۔ ایس۔ پی مجھے وہ نوٹس دینے کے لئے آیا تو میں نے اُس سے کہا کہ میری گردن تمہارے گورنر کے ہاتھ میں ہے لیکن تمہارے گورنر کی گردن میرے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے گورنر نے میرے ساتھ جو کرنا تھا وہ کر لیا اب میرا خدا اپنا ہاتھ دکھلائے گا۔ جب وہ اُٹھنے لگا تو میں نے پھر اُسے کہا کہ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے جوش کی حالت میں نہیں کہا یہ ایک حقیقت ہے جو پوری ہو کر رہے گی اور جب میری یہ بات پوری ہوگی تو اُس وقت میں تمہیں یاد دلاؤں گا کہ میں نے گورنر کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب اس گورنر کو پنجاب سے رخصت کیا گیا تو میں نے اپنا آدمی اُس کی طرف بھیجا اور کہا کہ تمہیں یاد رہے میں نے اُس روز تمہیں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا مجھے خوب یاد ہے بلکہ میں دوسرے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتا رہا ہوں۔ پھر ایک شخص کے سامنے اُس نے یہ بھی کہا کہ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری گردن پر بھی اپنا ہاتھ ڈالا ہوا ہے۔ تو مرنے کو انسان مر جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا نام زندہ

رہتا ہے، اُس کا کام زندہ رہتا ہے، اس کی تعلیم زندہ رہتی ہے، تو وہ مرتا نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ یہی حقیقت حضرت مسیح بیان فرماتے ہیں کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ ۔ زندگی میں ہی نہیں میری موت کے بعد بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی سلامتی حاصل ہوگی۔ موت کے بعد انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی میں تو دوسرے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بڑا چالاک تھا، بڑا ہوشیار اور فریبی تھا، اس نے اپنی چالاکی کی وجہ سے دنیا کو فتح کر لیا۔ لیکن مرنے کے بعد چالاکی بھی ختم ہو جاتی ہے، دھوکا بازی بھی ختم ہو جاتی ہے، رسوخ اور اقتدار بھی ختم ہو جاتا ہے، خدمتِ خلق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر تو خدا ہی کسی کا نام زندہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھو حضرت یحییٰ بھی مر گئے، حضرت مسیح بھی مر گئے، مگر اُن کے نام دنیا میں آج تک زندہ ہیں۔ جب یہ دو باتیں پوری ہو چکی ہیں تو اب تیسری بات میں کیا شبہ رہا۔ جب دو غیر ممکن باتیں ممکن ہو گئی ہیں تو تیسری بات کے سچا ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ پس بے شک وہ زندگی نظر نہیں آتی مگر ان دو دعووں کو جو ویسے ہی ناممکن تھے خدا تعالیٰ نے اس کے ساتھ ملا دیا اور اس طرح بتا دیا کہ جب یہ باتیں پوری ہو گئی ہیں تو وہ بات بھی ضرور پوری ہو کر رہیگی۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ علاوہ اُس بعث کے جو مرنے کے بعد مقدر ہے ہر نبی کی ایک دوسری بعثت اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور ہر نبی اپنے بعد میں آنے والے ایک اور نبی کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ ہر سچے نبی کے بعد ایک اور نبی مبعوث ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ فلاں نبی سچا تھا اور اس طرح اُس پہلے نبی کی سچائی دنیا میں دوبارہ قائم کی جاتی ہے اور اُس کی شہادت کے ذریعہ اُسے دوبارہ سلامتی ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئے اور عظیم الشان کارنامے انہوں نے سرانجام دیئے۔ مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ جب ایک لمبا زمانہ آپ کی بعثت پر گذر گیا تو لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ پتہ نہیں موسیٰ سچا بھی تھا یا نہیں تب خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیح آیا اور اُس نے اعلان کیا کہ موسیٰ سچا تھا۔ پس موسیٰ کو دوبارہ زندگی مسیح ناصری کے ذریعہ سے ملی۔ اور یحییٰ اور مسیح کو دوبارہ زندگی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ہود ع ۲) فرماتا ہے کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ کے ہزاروں نشانات جمع ہیں اور پھر موسیٰ کی خبریں اس کے متعلق پہلے سے موجود ہیں اور اس کی وفات کے بعد ہم ایک اور مامور بھیجیں گے جو اس امر کی تصدیق کرے گا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے تھے گویا اس کا ماضی وہی علامت یہ ہے اور مستقبل یہ ہے کہ ہم خود آسمان سے ایسے آدمی بھیجتے رہینگے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دینگے اور گواہی دینگے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کا سچا رسول ہے گویا یہ دوبارہ بعثت ہوگی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس لئے

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي

(دیکھو) یہ (حقیقی) عیسیٰ ابن مریم ہے اور یہ (اس کا) (اصل) سچا واقعہ ہے جس میں

فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿۳۵﴾

وہ (لوگ) اختلاف کر رہے ہیں ۵۲۷

سورۂ جمعہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آخرین میں مبعوث ہونے کا نام بھی بعثت ہی رکھا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (سورہ جمعہ ع ۱) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتیں مقدر ہیں آپ کی ایک بعثت اوّلین میں ہوئی ہے اور آپ کی دوسری بعثت آخرین میں ہوگی۔ يَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا میں وہی بعثت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو سورۂ جمعہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی محاورہ میں بعث کا لفظ اس موقعہ پر بھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی نبی آئے اور وہ اپنے وجود کے ذریعہ کسی پہلے آنے والے نبی کو دوبارہ زندہ کر دے اور اُس کی صداقت کو دنیا پر ظاہر کر دے۔

پس وَالسَّلَامُ عَلَيَّ ...... يَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا کے یہ معنے ہیں کہ جب کوئی دوسرا نبی اور مامور آئیگا اور وہ میری تصدیق کرے گا تو تم اُس وقت سمجھ لوگے کہ جو باتیں مَیں کہہ رہا ہوں وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ وہ ایک غیر ملک میں آئے گا اور غیر قوم میں سے آئے گا لیکن وہ کہیگا کہ میں سچا ہوں چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تصدیق کر دی اور وہ بات پوری ہوگئی جو انہوں نے کہی تھی کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بھی تصدیق کر دی اور وہ بات پوری ہوگئی جو خدا تعالےٰ نے اُن کے متعلق کہی تھی کہ وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔ اِن معنوں کی رُو سے اس آیت کو قیامت پر چسپاں کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اِسی دنیا میں اُن کی دوبارہ بعثت پر خدا تعالیٰ کی سلامتی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۲۷ حل لغات:۔ اِمْتِرَاء اختلاف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جس میں ایک شخص دوسرے کی بات کو رَدّ کرتا ہے اور دوسرا شخص اپنے مدمقابل کی بات کی تردید کرتا ہے۔ اِس کو تردّد ہوتا ہے اُس کی باتیں ماننے میں اور اُس کو تردّد ہوتا ہے اِسکی باتوں کے ماننے میں۔

تفسیر:۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق خود عیسائیوں میں اور پھر عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف عقائد رکھتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے

کہ حق اُن کے پاس نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مسیح کی ماں
بھی خدا تھی اور کوئی کہتا ہے کہ وہ خدا نہیں تھی۔
کوئی کہتا ہے کہ مسیح واقعہ میں خدا کا ایک حصہ تھا
اور کوئی کہتا ہے کہ ایک روح پیدا کی گئی تھی جس
پر خدا تعالیٰ نے اپنا فضل نازل کر دیا۔ حتیٰ کہ
صلیب کے واقعہ کے متعلق بھی یہودیوں اور عیسائیوں
میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بلکہ خود عیسائیوں کا بھی
آپس میں اتفاق نہیں۔

شاید دنیا میں سوائے مسیح کے اور کوئی
شخص ایسا نہیں جس کے متعلق اس قدر اختلاف
پایا جاتا ہو مسلمانوں کو دیکھا جائے تو پھر اُن میں بھی
مسیح کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم کہتے
ہیں کہ مسیح مر چکا ہے اور مسلمان کہتے ہیں کہ مسیح مرا
نہیں بلکہ وہ آسمان پر زندہ ہے۔ اسی طرح واقعہ
صلیب کو لیا جائے تو اس میں بھی اختلاف پایا
جاتا ہے مسلمان کہتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں لٹکا
ہم کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر تو لٹکایا گیا تھا مگر مرا
نہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور
مر گیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر لٹکایا گیا
اور مرا لیکن پھر زندہ ہو گیا۔ گویا دنیا کی چار بڑی
جماعتیں صرف واقعہ صلیب کے بارہ میں ہی شدید
اختلاف رکھتی ہیں۔ غیر احمدی کہتے ہیں کہ وہ صلیب
پر لٹکائے ہی نہیں گئے۔ ہم کہتے ہیں وہ لٹکائے تو
گئے مگر صلیب پر فوت نہیں ہوئے۔ یہودی کہتے
ہیں وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مر گیا۔ عیسائی کہتے
ہیں وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مر گیا لیکن پھر زندہ
ہو گیا۔ غرض عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں میں
مسیح کے متعلق بڑا بھاری اختلاف پایا جاتا ہے۔
پھر آگے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا
آپس میں اختلاف ہے۔ اسی طرح مسیح کی پیدائش
لے لو تو اس میں جھگڑا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے
انہیں اپنی قدرت کاملہ سے معجزانہ طور پر بغیر باپ
کے پیدا کر دیا۔ غیر مبایعین کہتے ہیں کہ وہ یوسف
کے نطفہ سے تھے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا کا نطفہ
تھا۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ حرام کا نطفہ تھا۔ غرض
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ۔

یہ بھی درحقیقت ایک چوٹ ہے جو عیسائیوں
پر کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ کے وجود سے زیادہ سچی اور
یقینی کوئی چیز نہیں۔ مگر مسیح کے متعلق ایک
بات بھی قطعی طور پر ثابت نہیں۔ پس ذٰلِكَ عِيسَى
ابْنُ مَرْيَمَ کہہ کر چوٹ کی گئی ہے کہ عیسائی حضرت
مسیح کو خدا بنائے پھرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اُن کی
کسی بات کے متعلق بھی یقین حاصل نہیں۔ آؤ ہم
تمہیں یقینی بات بتاتے ہیں کہ وہ کون تھا۔ وہ ہمارا
ایک رسول تھا جو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا۔

یہاں حضرت مسیح کو عیسیٰ بن مریم کہا گیا ہے۔
عیسائی مصنف اس پر بھی چڑتے ہیں کہ ہمارے مسیح
کو ابن مریم کیوں کہا گیا ہے وہ تو خدا کا بیٹا تھا۔
اسے ابن مریم محض ہمیں چڑانے اور دُکھ دینے کیلئے
اور دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ خدا نہیں تھا
کہا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انجیل میں بھی
حضرت مسیح کو ابن مریم کہا گیا ہے۔

مرقس باب ۶ آیت ۳ میں آتا ہے:۔

"کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں اور یعقوب
اور یوسیس اور یہوداہ اور شمعون کا بھائی
نہیں اور کیا اس کی بہنیں ہمارے پاس
یہاں نہیں ہیں اور انہوں نے اس کو ٹھوکر کھائی۔"

یعنی لوگوں نے جب مسیح کو دیکھا تو کہا کہ یہ جو بڑے بڑے دعوے کرتا پھرتا ہے کہ میرے ساتھ خدا تعالیٰ کے یوں وعدے ہیں اور اس طرح مجھے اُس نے اپنے فضلوں اور انعامات کا مورد بنایا ہے کیا یہ وہی مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں جو ہماری چارپائیاں اور میزیں درست کیا کرتا تھا اور آج ایسے دعوے کر رہا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا لہجہ بڑا عمدہ تھا۔ آواز بڑی بلند تھی اور اُن کی تقریر میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ مَیں اگرچہ بچہ تھا مگر مجھے خوب یاد ہے جب وہ اس مضمون پر پہنچتے تو بڑے جوش سے کہا کرتے تھے کہ کیا چیز ہے جو عیسائی ہمارے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی بلند شان ہے۔ آپ کا ایک نائب اس زمانہ میں احیاء اسلام کے لئے آیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بڑے اچھے خاندان میں سے ہے۔ شاہی نسل میں سے ہے ہزاروں سال کی تاریخ اس کے خاندان کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں میرے کانوں میں پہلے مسیح کی ابھی تک یہ آواز گونج رہی ہے کہ کسی نے چارپائیاں ٹھیک کروانی ہوں تو کروالے کسی نے ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کروانی ہو تو کروالے۔ انجیل کے اِس حوالہ میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ کہ لوگوں نے کہا کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کیا یہ یوسف نجار کا بیٹا نہیں۔ بلکہ کہا کہ کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ مسیح نے اپنے طور پر بھی بڑھئی کا کام کیا ہے۔ مسیح بے شک انجیل میں اکثر جگہ اپنے آپ کو ابن آدم کہتا ہے لیکن ابن آدم ہونے میں تو تمام بنی نوع انسان اس کے شریک ہیں۔ اِس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک ایسا نام دیتا ہے جس سے مسیح کی آسانی کے ساتھ شناخت ہو سکتی ہے۔ اگر قرآن کریم عیسیٰ ابن آدم کہتا تب بھی مشکل پیش آتی۔ کیونکہ ہزاروں لوگوں کے نام عیسیٰ ہیں اور وہ بھی ابن آدم ہی ہیں۔ اگر خالی ابن آدم کہا جاتا تو اس لحاظ سے اور بھی دقت پیش آتی۔ کیونکہ سارے انسان ابن آدم ہیں پھر وہ پہچانا کس طرح جاتا۔

مسیحی اُسے خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایسا لفظ ہے جو بائبل میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پس یہ بھی مسیح کی شناخت کا کوئی قطعی ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ بائبل کے رُو سے سب نیک لوگ خدا کے بیٹے ہیں اور اگر وہ خدا کے بیٹے سے ظاہری بیٹا مراد لیں تو پھر خدا تعالیٰ کا ظاہری بیٹا ہونے کے کوئی ظاہری ثبوت بھی ہونے چاہئیں جو نہیں ہیں۔

درحقیقت حضرت مسیح کی صحیح شناخت اُسی نام سے ہوتی ہے۔ جو خدا نے اس کے لئے تجویز کیا ہے یعنی "ابن مریم"۔ اگر ہم اس کو صرف عیسیٰ کہیں تو ہر ضلع میں بیسیوں لوگ ایسے نکل آئیں گے جن کا نام عیسیٰ ہوگا۔ ہماری جماعت میں بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا نام عیسیٰ ہے۔ گو اب یہ نام کم رکھا جاتا ہے کیونکہ عیسیٰ کی نسبت محمدؐ اور احمدؐ کی محبت لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہے اور وہ محمدؐ اور احمدؐ کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایسے کئی لوگ ہماری جماعت میں نکل آئیں گے جن کا نام عیسیٰ ہوگا اور پرانے غیر احمدیوں میں تو سینکڑوں لوگ اس نام کے موجود ہیں۔ پس اگر صرف عیسے

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا

خدا (تعالیٰ) کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنالے وہ اس بات سے پاک ہے ۔ وہ جب کبھی

قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۳۶﴾

کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے (ایسا) ہو جا تو ویسا ہی ہونے لگتا ہے پھر اُسے ولد کیلئے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے

کہا جاتا تو یہ حضرت مسیحؑ کی شناخت کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں تھا ۔ اگر عیسیٰ ابن آدم نام رکھا جاتا تب بھی مشکل پیش آتی کیونکہ ہر عیسیٰ آدم کا بیٹا ہے اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ اگر خدا کا بیٹا کہا جاتا تو سب لوگ کہتے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے ۔ ان مشکلات کو دور کرتے ہوئے قرآن نے مسیح کو عیسیٰ بن مریم کہہ دیا جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ سب کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے اور مسیح کی شناخت کا ایک بڑا عمدہ ذریعہ ہے ۔

پس قابلِ اعتراض انجیلوں اور مسیحیوں کا قول ہے نہ کہ قرآن کا ۔

۵۲ حل لغات :- عربی زبان میں جب مَا كَانَ لَهٗ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو اس سے دوسرے شخص کی قابلیت یا اُس کی شان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے چنانچہ مَا كَانَ لَهٗ اَنْ يَّفْعَلَ كَذَا کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ کہاں اس قابل ہُوا کہ ایسا کرے یا اس کی شانِ اعلیٰ کے خلاف تھا کہ وہ ایسا کرتا ۔ گویا یا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کی شان اتنی اعلیٰ ہے کہ ایسا ادنیٰ کام اس کی طرف منسوب ہی نہیں ہو سکتا اور یا پھر یہ معنے ہوں گے کہ یہ کام اتنا اعلیٰ ہے کہ اُس میں یہ قابلیت ہی نہیں کہ وہ اس کو سر انجام دے سکے ۔

تفسیر :- اُوپر جو تشریح کی جا چکی ہے اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معنے تو یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے یعنی یہ معنے کرنے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی شان کہاں کہ اس کا بیٹا ہو ۔ یہ تو قطعی طور پر غلط ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے ۔ عورتیں تو کہہ دیتی ہیں کہ ہماری قسمت ایسی کہاں کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہو ۔ لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ایسی شان کہاں کہ اُس کے ہاں بیٹا ہو ۔ اس جگہ صرف دوسرے معنے ہی چسپاں ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت بالا ہے کہ ایسی ذلیل اور ادنیٰ بات اس کی طرف منسوب کی جائے اور کہا جائے کہ اس نے بیٹا بنا لیا ہے ۔ یہاں يَتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ کہا گیا ہے ۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اس کا بیٹا ہو ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں میں اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ بیٹا ہونا اور بیٹا بنا لینا یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ عیسائیوں میں سے بعض بیٹا بنا لینے کی تھیوری کے قائل ہیں اور بعض بیٹا ہونے کی تھیوری کے قائل ہیں بعض کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ کہیں گے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے تو لوگ اِس بات کو مانیں گے نہیں اور کہیں گے کہ کیا کوئی ایسی عورت تھی جس سے خدا نے تعلق پیدا کیا اور اُس سے خدا تعالیٰ کا بیٹا پیدا ہُوا ۔ اِس لئے وہ بیٹا ہونے کی بجائے بیٹا بنا لینے کی تھیوری کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان

اور اُس کی عظمت نے پسند کیا کہ اپنے لئے ایک بیٹا تجویز کرے۔ سو اُس نے مسیح کو اپنا بیٹا بنا لیا پس چونکہ عیسائیوں میں اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہ الفاظ استعمال کئے جو دونوں قسم کے لوگوں پر چسپاں ہو جاتے ہیں اور آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ کوئی اُس کا اپنا بیٹا ہے اور چاہے یہ کہا جائے کہ کسی کو اُس نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اب یہ صاف بات ہے کہ جب کسی غیر کو اپنا بیٹا بنا لینا بھی اسکی شان کے خلاف ہے تو اس کا کوئی اپنا بیٹا ہونا تو اس کی شان اور عظمت کے بالکل منافی ہوگا۔

اس جگہ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص کسی امر کا مدعی ہوتا ہے ہمیشہ اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کرنا اُس کے ذمہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص کے دو سینگ ہیں اور جواب میں وہ شخص کہے کہ نہیں تم غلط کہتے ہو تو اس پر اگر پہلا آدمی یہ کہے کہ اچھا اگر تمہارے سر پر سینگ نہیں تو اس کا ثبوت دو۔ تو ہر شخص اُسے پاگل قرار دے گا اور کہے گا کہ ثبوت پیش کرنا تمہارا کام ہے کیونکہ دعوٰے تم کر رہے ہو اُس کا کام نہیں کہ وہ ثبوت پیش کرے۔

حضرت مسیحؑ کے متعلق چونکہ عیسائی اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اس لئے اُن کے ابن اللہ ہونیکا ثبوت پیش کرنا عیسائیوں کے ذمے ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ یہی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اس لئے ہم بھی انہیں خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں۔ پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم انجیل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا اُس میں خدا تعالیٰ کے بیٹے کے وہی معنے پائے جاتے ہیں جو عیسائی پیش کرتے ہیں۔

لوقا باب ۲۰ آیت ۳۵-۳۶ میں لکھا ہے

"جو لوگ اُس جہان کے اور قیامت کے
شریک ہونے کے لائق ٹھہرتے نہ بیاہ
کرتے ہیں اور نہ بیاہے جاتے۔ پھر
نہیں مرنے کے کیونکہ وے فرشتوں کی مانند
ہیں اور قیامت کے بیٹے ہو کے خدا کے
بیٹے ہیں"

حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگیاں خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتے ہیں ایسے لوگوں پر روحانی موت نہیں آتی اور وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلاتے ہیں گویا مسیح تمام نیک اور پاک لوگوں کے لئے "خدا تعالیٰ کے بیٹے" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

پھر یرمیاہ باب ۳۱ آیت ۹ میں خدا تعالیٰ حضرت یرمیاہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے

"میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم
میرا پلوٹھا ہے"

اس حوالہ میں سارے بنی اسرائیل کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا گیا ہے اور افرائیم جو بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ تھا اُسے اپنا پلوٹھا قرار دیا گیا ہے۔

پھر متی باب ۵ آیت ۱۶ میں لکھا ہے۔

"تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے
تاکہ وے تمہارے نیک کاموں کو دیکھیں
اور تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے
ستائش کریں"

اس میں حضرت مسیحؑ نے اپنے سب مخاطبین کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے۔

پھر متی باب ۶ آیت ۸ میں لکھا ہے
" تمہارا باپ تمہارے مانگنے کے پہلے
جانتا ہے کہ تمہیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے"
پھر حضرت مسیحؑ نے اپنے متبعین کو جو دعا سکھلائی
ہے اس میں بھی یہی کہا ہے کہ خدا باپ ہے چنانچہ
آپ فرماتے ہیں جب تم دعا مانگو تو اس طرح مانگو کہ
" اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے
نام کی تقدیس ہو" (انجیل متی باب ۶ آیت ۹)
پھر متی باب ۶ آیت ۱۴ میں ہے
" اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشو گے تو تمہارا
باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہیں بھی بخشیگا"
پھر متی باب ۶ آیت ۱۸ میں ہے
" تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ
ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو
پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے
بدلہ دے"
اس سے پہلے آپ یہ مضمون بیان فرماتے ہیں کہ لوگ
روزہ رکھتے ہیں تو لوگوں پر اپنے روزہ کا اظہار کرتے
ہیں۔ ایسے لوگ چونکہ ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔
اس لئے وہ کسی بدلہ کے مستحق نہیں لیکن اگر تم محض
خدا کے لئے روزہ رکھو تو تمہارا باپ جو تمہارے
دل کے حالات سے واقف ہے وہ تمہیں بدلہ دیگا۔
متی باب ۱۰ آیت ۲۸ تا ۳۰ میں آتا ہے
" جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل
نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو بلکہ اُسی سے
ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں
ہلاک کر سکتا ہے۔ کیا پیسے کی دو چڑیاں
نہیں بکتیں اور اُن میں سے ایک بھی تمہارے
باپ کی مرضی بغیر زمین پر نہیں گر سکتی۔ بلکہ
تمہارے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے
ہیں پس ڈرو نہیں"
پھر مرقس باب ۱۱ آیت ۲۶ میں لکھا ہے
" اگر تم معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ
جو آسمان پر ہے تمہارے قصور بھی معاف
نہ کرے گا"
اس جگہ سارے انسانوں کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار
دیا گیا ہے۔
پھر لوقا باب ۶ آیت ۳۶ میں لکھا ہے
"جیسا تمہارا باپ رحیم ہے تم رحیم ہو"
لوقا باب ۱۲ آیت ۳۰ میں لکھا ہے
" تمہارا باپ جانتا ہے کہ تم اُن کے
محتاج ہو"
لوقا باب ۱۲ آیت ۳۲ میں لکھا ہے
" تمہارے باپ کو پسند آیا کہ بادشاہت
تمہیں دے"
پھر یوحنا باب ۸ آیت ۴۱ میں لکھا ہے کہ
یہود نے کہا
" ہمارا باپ ایک ہے یعنی خدا"
اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یہودیوں میں یہ
محاورہ رائج تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا
بیٹا کہا کرتے تھے۔ اسی طرح بائبل خود یہودیوں کو
کہتی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ہو اور حضرت مسیح
سب لوگوں کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں
اور فرماتے ہیں کہ اگر تم دعا کرو تو اس طرح کیا کرو کہ
" اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔
تیرے نام کی تقدیس ہو"
اسی طرح ہم حواریوں کے خطوط کو دیکھتے ہیں
تو اُن میں بھی ہمیں یہی مضمون نظر آتا ہے۔ چنانچہ

افسیوں باب ۴ آیت ۶ میں لکھا ہے
"ایک خدا جو سب کا باپ کہ سب کے اوپر
اور سب کے درمیان اور تم سب میں ہے۔"
یعنی خدا تمام انسانوں کا باپ ہے اور بندے اس کے بیٹے ہیں۔
اسی طرح خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے
"اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے"
غرض تمام بائبل کیا عہد نامۂ قدیم اور کیا عہد نامۂ جدید اس قسم کے حوالجات سے بھری پڑی ہے کہ تمام بنی نوع انسان خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ خصوصاً نیک۔ خصوصاً مسیح کے حواری یا بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہتے ہیں اور خدا انہیں اپنا بیٹا کہتا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح بھی یہی تلقین فرماتے ہیں کہ تم اس محاورہ کو استعمال کیا کرو اور خدا تعالیٰ کو "اے ہمارے باپ" کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ پس اگر انجیل میں مسیح کے متعلق بھی کسی جگہ یہ الفاظ آ گئے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے تو ہمیں اس کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو بائبل کے دوسرے مقامات سے ثابت ہیں۔ اس کے خلاف ہمارے لئے کوئی اور معنے کرنے جائز نہیں ہوں گے۔ اور نہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ محض ان الفاظ کی وجہ سے انہیں خدا قرار دے دیں۔

غرض خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ۔ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا قرار دے۔ ایک ہوتا ہے کسی کو بمنزلہ ولد قرار دینا۔ یہ چیز بالکل الگ ہے۔ اس کے معنے محض اتنے ہوتے ہیں کہ اُس شخص کو خدا تعالیٰ نے اپنا پیارا قرار دیا ہے لیکن ولد کے یہ معنے ہیں کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا حقیقی بیٹا کہا جائے۔ اور حقیقی بیٹے کا درجہ خدا تعالیٰ کسی کو نہیں دیتا۔ حقیقی بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کسی کو اپنا وارث بنا دے۔ کیونکہ اُس نے مرنا نہیں یا اپنی صفات اُس کو دیدے۔ بیٹا اپنے باپ سے ورثہ کے طور پر اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان منہ اور دوسرے تمام اعضاء لیتا ہے لیکن کوئی بندہ خدا تعالیٰ سے ورثہ میں اُس کی صفات نہیں لے سکتا۔ صفاتِ الٰہیہ کا اپنے اندر پیدا کر لینا اور چیز ہے اور ورثہ کے طور پر کسی چیز کا حاصل کرنا اور چیز ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنا کسب کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جیسا کہ شاگرد اپنے اُستاد سے جو کچھ حاصل کرتا ہے کسب کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ یہ چیز خدا تعالیٰ کے متعلق بھی جائز ہے مگر بیٹا اپنے باپ سے کئی چیزیں ورثہ کے طور پر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے کوئی چیز ورثہ کے طور پر نہیں لی جاتی اُس سے اگر کوئی شخص لے گا تو کسباً یا عطیتہً ہی لے گا۔ مثلاً انگریزوں کا رنگ گورا ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں جب بھی کوئی بچہ پیدا ہو گا اس کا رنگ گورا ہو گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ بچہ پیدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنے لڑکے کو بلائیں اور کہیں کہ آؤ ہم تمہیں اپنے رنگ میں سے تھوڑا سا رنگ دے دیں۔ اسی طرح حبشیوں کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا تو سیاہ رنگ کا ہی پیدا ہو گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ باپ اپنے بیٹے کو بلائے اور کہے کہ آؤ۔ میں تم کو اپنے بالوں میں سے کچھ بال دے دوں۔ اپنے رنگ میں سے کچھ رنگ دے دوں یا تمہیں ناک، کان اور منہ وغیرہ دوں۔ یہ سب چیزیں وہ ورثہ میں پیدائش کے ساتھ ہی لیکر آتا ہے

اس رنگ میں نہ خدا تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں۔ باقی رہا یہ کہ کسی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے محبت اور پیار کے طور پر یا اس سے اپنے تعلق کے اظہار کے لئے بیٹا کہہ دیا جائے تو اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ انجیل بتاتی ہے کہ سب لوگ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں یہاں تک کہ وہ گنہگاروں کو بھی اُس کا بیٹا قرار دیتی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے کیا اس کی شہادت بھی بائبل سے ملتی ہے یا نہیں ملتی۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں اُس ہستی کا نام جو تمام صفاتِ حسنہ سے متصف اور تمام دنیا کی خالق اور مالک ہے اللہ استعمال ہوا ہے جو خدا تعالیٰ کا اسم ذات ہے۔ سوائے عربی زبان کے اور کسی زبان میں بھی خدا تعالیٰ کا اسم ذات نہیں۔ بائبل میں یہوا کا لفظ اس رنگ میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اسم ذات ہوتا ہے لیکن حقیقتاً یہوا اسم ذات نہیں۔ اصل میں عربی اور عبرانی یہ دونوں زبانیں آپس میں بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے جو عرب کا ہی ایک حصہ ہے۔ پھر آپ عراق سے ہجرت کر کے کنعان چلے گئے اور وہاں سے اُن کی قوم آگے مصر کو نکل گئی مگر آپ کنعان میں ہی رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کنعان میں رہتے تھے تو اُن کا ایک بیٹا جس کا نام اسماعیل تھا بچپن میں الٰہی حکمت کے ماتحت مکہ پہنچا دیا گیا۔ اُن کا دوسرا بیٹا اسحاق تھا جو اُن کے ساتھ رہا۔ اِس وجہ سے اُن کی زبانیں آپس میں ملتی جلتی تھیں اور عبرانی اور عربی میں بہت معمولی فرق تھا۔ یہوا کا لفظ بھی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور جو بائبل میں استعمال ہوا ہے درحقیقت عربی زبان کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔ بہرحال بائبل میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہوا کے لفظ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۸ میں لکھا ہے:-

"یہوا مَیں ہوں یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا۔"

یہ بالکل وہی مضمون ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے۔ اس جگہ بھی کہا گیا ہے کہ "یہوا" میرا نام ہے اور میں اپنی شوکت کسی دوسرے کو نہ دوں گا۔ یعنی کوئی اور وجود ایسا نہیں جو میری عظمت اور میری قدرت اور میری شوکت میں شریک ہو سکے۔

یہ "یہوا" کا لفظ درحقیقت یَا هُوَ سے بنایا گیا ہے۔ یَا هُوَ کے معنے ہیں اے وہ ہستی جو غائب ہے اور نظر نہیں آتی۔ پس یہ بھی ایک صفاتی نام ہے ذاتی نام نہیں۔ اور صرف خدا تعالیٰ کے موجود ہونے اور اُس کے آنکھوں سے غائب ہونے پر دلالت کرتا ہے یا خدا تعالیٰ کے موجود ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ یا حرف ندا ہے اور اُس چیز پر دلالت کرتا ہے جو موجود ہو۔ اور هُوَ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہے تو موجود مگر نظروں سے غائب ہے۔

پس یہ بھی اسمِ ذات نہیں اور ہوا کے معنے یہ ہیں کہ اے وہ ہستی جو ہے تو سہی مگر چونکہ آنکھوں کو نظر نہیں آتی اس لئے ھُوَ کہلا سکتی ہے اَنْتَ نہیں کہلا سکتی۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عربی اور عبرانی آپس میں کس حد تک ملتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد اس زبان میں بہت تبدیلی پیدا ہو گئی لیکن باوجود اس زبان کے بدل جانے کے حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں بھی جو یہود کا آخری زمانہ تھا اور جس کے بعد وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے عبرانی زبان عربی زبان سے اتنی ملتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ عبرانی عربی کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے چنانچہ حضرت مسیحؑ نے جو آخری فقرہ صلیب پر کہا اور جس کے بعد انہیں ہوش نہیں رہا اور جو ایک ہی فقرہ ہے جس کے متعلق تمام محققین اسبات پر متفق ہیں کہ وہ یقیناً حضرت مسیحؑ کا ہی فقرہ ہے وہ یہ تھا کہ

ایلی ایلی لما سبقتانی

یہ ایلی ایلی درحقیقت عربی زبان کا اِیلی اِیلی ہے عبرانی میں خدا تعالیٰ کو ایل کہتے ہیں اور عربی میں خدا تعالیٰ کو اِیل کہتے ہیں۔ عبرانی والے کہیں گے جبرائیل اور عربی والے کہیں گے جبرایل۔ وہ اسرافیل اور عربی والے کہیں گے اسرافیل پس ایلی ایلی کو اگر ہم عربی لہجہ میں ادا کریں گے تو کہیں گے

اِیلِیْ اِیلِیْ

یعنی اے میرے خدا۔ اے میرے خدا آگے ہے "لِمَا" یہ وہی عربی کا لِمَ ہے۔ یعنی کس لئے یا کیوں؟ "سبقتانی" یہ بھی عربی کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔ عربی میں کہیں گے سَبَقْتَنِیْ اور عبرانی میں کہینگے سبقتانی پس

اِیلی اِیلی لِمَ سَبَقْتَنِیْ

کے یہ معنے ہوئے کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تُو مجھے کیوں چھوڑ کر آگے چلا گیا سَبَقَ کے معنے ہوتے ہیں آگے نکل گیا۔ پس حضرت مسیحؑ دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تُو مجھ سے کیوں آگے نکل گیا اور میں پیچھے رہ گیا اگر تُو میرے پاس ہوتا تو میری مدد کرتا۔

یہ کتنا عربی زبان سے ملتا جلتا فقرہ ہے۔ صرف اِیلی اِیلی کی جگہ ایلی ایلی اور لِم کی جگہ لما اور سبقتنی کی جگہ سبقتانی کر دیا گیا ہے اور یہ ایک ہی فقرہ ہے جو حضرت مسیحؑ کا انجیل میں موجود ہے۔ باقی الفاظ کے متعلق کوئی یقینی شہادتیں نہیں لیکن اس فقرہ کے متعلق بائبل کے تمام مفسرین متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ یہ فقرہ یقینی طور پر وہی ہے جو حضرت مسیحؑ نے کہا۔ پس عبرانی کوئی الگ زبان نہیں۔ عربی زبان کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ذرا عبرانی کو چست کر دو تو عربی بن جائے گی۔ بہرحال اُن کے ہاں ایل کا لفظ خدا تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کے لئے "ایلوہیم" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیم جمع کی ضمیر ہے۔ عربی میں جمع کے لئے ھُمْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عبرانی میں اسے ہیم بنا دیا گیا ہے۔ بہرحال ایلوہیم کے لفظی معنے یہ ہیں کہ کئی خدا۔ مگر اس لفظ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بڑا خدا یا شاندار خدا۔

پہلے زمانہ میں جب کسی شخص سے مخاطب ہو کر کوئی بات کہی جاتی تھی تو عرب لوگ اُسے اَنْتَ کہا کرتے تھے مگر آج کل اَنْتَ کی بجائے اَنْتُمْ کا

لفظ استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب لوگ ہمیشہ اَنْتَ اَنْتَ کہا کرتے تھے مگر اب معمولی رئیس یا اُستاد یا افسر یا ڈپٹی کمشنر یا گورنر سے بھی ملاقات ہو تو اُسے اَنْتَ کی بجائے اَنْتُمْ کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عبرانی زبان میں تمدن اور تہذیب کا دَور آجانے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے اعزاز کے لئے ایلوہیم کا لفظ استعمال ہوتا تھا جو جمع کا صیغہ ہے جس طرح غیر متمدن اقوام میں گفتگو کے وقت تُو کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن تمدن آجائے تو وہ تم کہنے لگ جاتے ہیں پھر اور زیادہ تمدنی شان پیدا ہو جائے تو آپ کہنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے ادب اور اس کے اعزاز کے لئے وہ ایلوہیم کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے جس کے معنے الٰہوں اور معبودوں کے ہیں۔ یہ ایلوہیم بھی عربی زبان کے لفظ اٰلِھَۃ کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ گویا جسے عربی میں اِلٰہ کہتے ہیں عبرانی میں اُسے ایلوہیم کہتے ہیں۔ جسے عربی میں اِلٰہ کہتے ہیں عبرانی میں اُسے ایلواہ کہتے ہیں اور جسے عربی میں اِیل کہتے ہیں عبرانی میں اُسے ایل کہتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے ان میں سے کوئی بھی خدا تعالیٰ کا اسمِ ذات نہیں۔ یہ تمام نام خدا تعالیٰ کے صفاتی اسماء ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ گو بائبل میں خدا تعالیٰ کے لئے اللہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن پھر بھی پرانے عہد نامہ میں خدا تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ استثناء باب ۶ آیت ۴ میں لکھا ہے

"سُن اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے"۔

"اکیلا خداوند" ہونے کے یہی معنے ہیں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور جب وہ وحدہٗ لاشریک ہوا تو یہ بات بھی سچی ثابت ہوئی کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ

پھر یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۸ میں ہے

"یہوواہ میں ہوں یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا"

اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا یہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ میرا بیٹا نہیں بلکہ میں کسی کو اپنا بیٹا بنانے والا بھی نہیں۔ گویا تم اگر یہ کہو کہ میں نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے اور اپنی طاقتیں اس کو دے دی ہیں تو یہ بھی غلط ہو گا۔ میں اپنی صفات کسی اور کو نہیں دیتا۔

اب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں جس پر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اُس میں بھی ہمیں یہی تعلیم نظر آتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ چنانچہ مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹ میں لکھا ہے کہ ایک شخص حضرت مسیح کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ آپ مجھے وہ سب سے بڑا حکم بتائیں جس پر عمل کرنا میرے لئے سب سے زیادہ ضروری ہو۔ حضرت مسیح نے اُسے فرمایا

"سب حکموں میں اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سُن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے"

(انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹)

پھر مسیح کے حواریوں نے جو خطوط لکھے ہیں اُن میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ رومیوں میں لکھا ہے

"اُسی واحد دانا خدا کو یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ حمد پہنچا کرے"۔ (رومیوں باب ۱۶ آیت ۲۷)

گویا مسیح کا ذکر کر کے اس کے مقابلہ میں ایک خدا کو پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اُسی واحد دانا یعنی علیم خدا کو یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ حمد پہنچا کرے۔

پھر ایک حواری کہتا ہے

"لیکن مجھ پر اس لئے رحم ہوا کہ یسوع مسیح مجھ بڑے گنہگار پر کمال صبر ظاہر کرے تا کہ میں اُن کے واسطے جو اس پر ہمیشگی کی زندگی کے لئے ایمان لائیں گے نمونہ بنوں۔ اب ازلی بادشاہ۔ غیر فانی۔ نادیدنی۔ واحد حکیم خدا کی عزت اور جلال ابدالاباد ہووے۔"

(۱۔ تمطاؤس باب ۱ آیت ۱۶ و ۱۷)

اس میں خدا تعالیٰ کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔ بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ غیر فانی قرار دیا گیا ہے۔ نادیدنی قرار دیا گیا ہے یعنی جو نظر نہیں آتا لیکن مسیح تو نظر آتا تھا۔ واحد قرار دیا گیا ہے۔ حکیم قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان صفات کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے خدا کی ضرورت نہیں ہو سکتی

پھر یہوداہ کے خط میں لکھا ہے

"جو خدائے واحد حکیم ہمارا بچانے والا ہے۔" (یہوداہ کا عام خط باب ۱ آیت ۲۵)

غرض ایک طرف پرانا عہد نامہ خدا تعالیٰ کو "خدائے واحد" قرار دیتا ہے اور دوسری طرف نیا عہد نامہ بھی اُسے "خدائے واحد" قرار دیتا ہے پس مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ میں بائبل اور انجیل دونوں قرآن کریم کے ساتھ متفق ہیں جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہی تورات نے کہا ہے اور وہی انجیل نے تعلیم دی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تعلیم کے باوجود یہود اور نصاریٰ دونوں نے شرک کی کئی باتیں پیدا کر لیں اور وہ صداقت سے منحرف ہو گئے۔ یہود کی طرف جو انبیاء مبعوث ہوئے بائبل سے معلوم ہوتا ہے وہ یہی کہا کرتے تھے کہ ہم تمہیں کیا سمجھائیں۔ ہم ہمیشہ تمہیں سمجھاتے رہے مگر تم پھر شرک کرنے لگ جاتے ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کی دلیل بیان فرماتا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے۔ فرماتا ہے ہم اپنی توحید کا ذکر صرف بائبل کی نقل کی وجہ سے نہیں کر رہے بلکہ اس لئے کر رہے ہیں کہ اس مسئلہ کی دلیل پر بنیاد ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے۔

بیٹا دنیا میں کیوں ہُوا کرتا ہے؟ تمام دنیا پر غور کر کے دیکھ لو بیٹے کا قانون صرف اُنہی چیزوں میں جاری ہے جو اپنے کام کے ختم ہونے سے پہلے فنا ہو جاتی ہیں۔ انسان کا کام دنیا میں موجود ہے۔ لیکن وہ مر رہا ہے۔ اس لئے اُسے بیٹے کی ضرورت ہے۔ بکروں کی ضرورت دنیا میں موجود ہے لیکن بکرے مر رہے ہیں اس لئے بکروں کی نسل کی ضرورت ہے پہاڑوں کی ضرورت دنیا میں موجود ہے لیکن پہاڑ بھی موجود ہیں وہ فنا نہیں ہو رہے اس لئے پہاڑوں کے لئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں۔ سورج کی ضرورت موجود ہے لیکن سورج بھی موجود ہے اس لئے سورج کیلئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں۔ چاند اور ستاروں کی دنیا کو ضرورت ہے پہلے بھی ضرورت تھی اور اب بھی ہے لیکن چاند اور ستارے بھی موجود ہیں۔ وہ فنا نہیں ہو رہے اس لئے چاند اور ستاروں کے لئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں پس تناسل کا سلسلہ انہی چیزوں کے ساتھ چلتا ہے جو اپنی ضرورت سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں اپنی ضرورت تک جاری رہتی ہیں

فنا نہیں ہوتیں اُن میں تناسل کا سلسلہ بھی جاری نہیں۔ اللہ تعالےٰ اسی دلیل کا اس جگہ ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے سُبْحٰنَہٗ۔ اگر تم سوچنا شروع کرو کہ بیٹے کی کیا وجہ ہوا کرتی ہے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ بیٹا ہونے کی تین وجوہات ہوا کرتی ہیں۔

اوّل شہوتِ نفسانی۔ یعنی انسان کے اندر بعض مادے ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ رُکے رہیں تو صحت کو نقصان پہنچانے کا موجب بن جاتے ہیں اس لئے اُن کا نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ پس یا تو وہ اپنی بیوی کے ذریعہ نکلیں گے اور یا وہ رویاء شہوانی کے ماتحت نکل جائیں گے۔ بہرحال نکل ضرور جائیں گے۔

دوسرے ہر انسان کو ایک مونس اور غمگسار کی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر مونس اور غمگسار ساتھی کے وہ آرام محسوس نہیں کرتا۔ بائبل میں لکھا ہے کہ ہر قسم کے آراموں کے باوجود آدم افسردہ اور حیران پھرتا تھا تب خدا نے کہا کہ یہ بیوی کا محتاج ہے آؤ ہم اس کی بیوی پیدا کریں۔ چنانچہ خدا نے آدم کے لئے حوا پیدا کی اور اس کی پریشانی اور افسردگی دور ہوئی۔ پس جب انسان اپنی ذات میں خوش نہ رہ سکے اور اُسے اطمینان حاصل نہ ہو تو اُس کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تیسرے۔ اسی طرح جب اپنے کام کے ختم ہونے سے پہلے کوئی فنا ہو جائے گا تو لازماً اُسے ضرورت ہوگی کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جو اس کے کام کے تسلسل کو جاری رکھے اور اس کے فنا ہونے کی وجہ سے کام کو نقصان نہ پہنچے۔

یہ تین چیزیں ہیں جو بیٹے کی ضرورت کا بنیادی باعث ہوتی ہیں۔

(۱) انسان کے اندر ایسے مادوں کا جمع ہو جانا جو اس کی صحت کو نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں

(۲) انسان کے اندر ایسے ساتھی کی خواہش کا پایا جانا جس کے بغیر اُسے اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) انسان کا اپنی ضرورت سے پہلے فنا ہو جانا اور یہ تینوں چیزیں نقص پر دلالت کرتی ہیں۔

یہ ماننا کہ خدا تعالےٰ کے اندر ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جس کا نکالنا ضروری ہوتا ہے اگر وہ نہ نکالے تو اس کی صحت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہی نقص پر دلالت کرتا ہے۔

یہ ماننا کہ خدا تعالےٰ کو اپنے کسی مونس اور غمگسار کے بغیر اطمینان حاصل نہیں ہوتا اور وہ افسردہ رہتا ہے نقص پر دلالت کرتا ہے۔

یہ ماننا کہ خدا وقت سے پہلے مر جائیگا اور اس لئے ضروری ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا ہو نقص پر دلالت کرتا ہے۔ پس فرماتا ہے مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ۔ اگر تم غور کرو کہ بیٹا کیوں ہوا کرتا ہے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ بعض زائد مادوں کا انسانی جسم میں جمع ہو جانا۔ ساتھی کی خواہش اور موت۔ یہ تین وجوہ ہیں جن کی بناء پر بیٹے کا تقاضا کیا جاتا ہے اور یہ تینوں نقص پر دلالت کرتی ہیں۔ نہ کسی کامل ذات میں ایسے مادے جمع ہو سکتے ہیں جو اس کی صحت کو خراب کرنے والے ہوں۔ نہ کسی کامل ذات کو اپنے لئے کسی مونس اور غمگسار ساتھی کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ کسی کامل ذات پر موت آ سکتی ہے۔ حالانکہ بیٹے کیلئے یہ تینوں باتیں ضروری ہیں۔

اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

كُنْ فَيَكُوْنُ ممکن ہے کوئی کہہ دے کہ بیٹے کی
ضرورت اُسے مددگار کے طور پر ہے۔ سو اس شبہ
کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا۔ اس بات
کو بھی سوچ لو کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا
ہے تو فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ وہ صرف
اتنا کہہ دیتا ہے کہ کُنْ ایسا ہو جائے فَيَكُوْنُ
پس وہ چیز عالمِ وجود میں آجاتی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ
کُنْ کس کو کہتا ہے۔ اُن کے نزدیک کُنْ کا لفظ
اسباب پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے کوئی مادہ موجود ہوتا
ہے جسے اللہ تعالیٰ کُن کہتا ہے۔ سو یاد رہے کہ کُنْ
کا لفظ عربی زبان میں کسی کو کہنے کے لئے بھی بولا جاتا
ہے اور محض اظہار خواہش کے لئے بھی بولا جاتا ہے
چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب شام کی
طرف لشکر کشی کی تو ابو خیثمہؓ ایک صحابی تھے جن پر
آپ کو بڑا اعتماد تھا اور آپ اُن سے بڑی محبت رکھتے
تھے اور آپ سمجھتے تھے کہ اپنے فرض کے ادا کرنے
میں یہ شخص غفلت سے کام نہیں لے سکتا۔ لیکن جب
آپ لشکر کے ساتھ شہر سے کچھ فاصلہ پر جا پہنچے
اور آپ نے اپنے صحابہؓ کا جائزہ لیا تو آپ کو ابو خیثمہؓ
نظر نہ آئے جس پر آپ کو بہت افسوس ہُوا کہ
مجھے اُس پر اتنی حُسن ظنّی تھی اور وہ اس جہاد سے
پیچھے رہ گیا ہے۔ جب آپ چلے تو کسی نے کہا حضور
کوئی شخص پیچھے سے آ رہا ہے۔ آپ نے اس طرف
دیکھا اور فرمایا كُنْ اَبَا خَيْثَمَه۔ جب گرد ہٹی اور
وہ شخص قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا۔ کہ وہ
ابو خیثمہؓ ہی تھا۔ اس پر آپ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف
کی کہ اُس نے آپ کی خواہش کو اتنی جلدی پورا
فرما دیا (غزوۂ تبوک سیرۃ حلبیہ) اب كُنْ اَبَا خَيْثَمَه
کے یہ معنے نہیں تھے کہ آ تو کوئی اَور رہا تھا۔ مگر
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ابو خیثمہ
بن جائے بلکہ كُنْ اَبَا خَيْثَمَه کے یہ معنے تھے کہ خدا
کرے کہ یہ آنے والا شخص ابو خیثمہ ہی ہو۔ تو عربی زبان
میں یہ ایک محاورہ ہے کہ بعض دفعہ خواہش کے اظہار
کے لئے بھی کُنْ کا لفظ بول لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ
جنس تبدیل کرنا مدنظر ہو اور اس کے لئے کُنْ کا لفظ
استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ
ہمارا یہ ارادہ ہے اور پھر وہ اسی طرح ہو جاتا ہے جس
طرح خدا تعالیٰ کا منشاء ہوتا ہے پس یہ اعتراض
کیا جاتا ہے کہ كُنْ فَيَكُوْنُ سے معلوم ہوتا ہے
کہ روح اور مادہ ازلی ہیں خدا تعالیٰ روح اور مادہ
کو حکم دیتا ہے اور وہ ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں
یہ عربی زبان کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ بے شک کُنْ کسی
چیز کو مخاطب کر کے بھی کہا جاتا ہے مگر محاورہ
میں بغیر کسی کو مخاطب کرنے کے بھی اس لفظ کا استعمال
کر لیا جاتا ہے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے كُنْ اَبَا خَيْثَمَه فرمایا۔ اس کے یہ معنے نہیں تھے
کہ اے زید تُو بکر کی شکل بدل لے بلکہ اس کے
صرف اتنے معنے تھے کہ اے کاش یہ آنے والا
ابو خیثمہؓ ہی ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ ایسا
ہو جائے اور وہ چیز کسی شکل میں موجود ہو جاتی ہے
ہاں خدا تعالیٰ کے لئے اے کاش کے الفاظ استعمال
نہیں ہو سکتے بندے بیشک خواہش کا اظہار کرینگے
تو اسی رنگ میں کریں گے کہ اے کاش فلاں بات اس
طرح ہو جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ صرف اس قدر اظہار
کرتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور وہ بات وقوع میں
آجاتی ہے یہاں بھی كُنْ فَيَكُوْنُ کے یہی معنے
ہیں کہ خدا تعالیٰ جب کسی خواہش کا اظہار کرتا ہے

یا کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی وہ خواہش اور وہ ارادہ فوراً پورا ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس میں الفاظ وہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو خود اپنے مقتضیٰ پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے" یا کہیں گے کہ "جب وہ کسی بات کو چاہتا ہے تو ویسی ہی ہو جاتی ہے۔" حالانکہ "چیز" اور "بات" حقیقت پر دلالت نہیں کرتے۔ دو چار دن ہوئے مجھے ایک شامی دوست کا خط آیا جس میں ایک فقرہ اُس نے یہ لکھا کہ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِشَیْءٍ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے۔ مجھے اُس وقت خیال آیا کہ اپنی طرف سے تو اس نے بڑا عمدہ فقرہ لکھا ہے لیکن عربی زبان کے لحاظ سے شَیْءٌ کے لفظ میں بھی ارادہ شامل ہوتا ہے چنانچہ شَیْءٌ کے معنے عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز جس کو چاہا جائے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے۔ کیا وہ اپنی موت پر بھی قادر ہے حالانکہ شَیْءٌ کے معنے بات کے ہیں ہی نہیں۔ شَیْءٌ کے معنے مشیّت کے ہیں پس اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے یہ معنے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ قَدِیْرٌ عَلٰی کُلِّ مَشِیَّتِہٖ اب کیا یہ خدا کی مشیّت ہو گی کہ وہ اپنے آپ کو مار ڈالے اگر یہ خدا کی مشیّت نہیں ہو سکتی تو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا اُردو زبان کے لحاظ سے اس کا یہ ترجمہ ہو گا کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے۔ لیکن عربی کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ جب وہ کسی ایسی چیز کا ارادہ کرے جس کا اُس نے حکم دیا ہے۔ گویا امر کا لفظ مامور پر دلالت کرتا ہے اور شَیْءٌ کا لفظ مشیّت پر دلالت کرتا ہے۔ پس یہ الفاظ ہی ایسے ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا میں امر کے معنے مامور کے ہیں یعنی وہ چیز جس کا حکم دے۔ اور اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں یہ مضمون نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہر بات جس کو وہ چاہے اُس پر وہ قادر ہے۔ پس اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا کے معنے یہ ہیں کہ جب وہ کسی ایسی چیز کا فیصلہ کرے جو اس کے احکام میں شامل ہو اور اسکی شان کے مطابق ہو تو فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ وہ صرف کُن کہہ دیتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

غرض امر کے معنے جہاں بات کے ہیں وہاں عربی زبان کے لحاظ سے اس میں سِرّ یہ ہے کہ بات وہ ہو جس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ جسے پسند کر لیا گیا ہو اور جو اس کی شان کے مطابق ہو۔ یہ نہیں کہ ہر لغو بات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دی جائے اور کہنا شروع کر دیا جائے کہ کیا خدا ایسا نہیں کر سکتا۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ چوری کا ارادہ کرے تو کیا چوری کرے گا۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی اپنے آپ کو یہ حکم دیا کرتا ہے کہ جا اور چوری کر۔ اور کیا چوری اُن چیزوں میں سے ہے جو خدا تعالیٰ کی پسندیدہ ہیں۔ پس یہ سوال ہی احمقانہ ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ بیٹے کی اُسے ضرورت ہوتی ہے جو خود کام نہ کر سکے اور جسے اپنی مدد کے لئے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہو۔ جب خدا تعالیٰ کو کسی مددگار کی ضرورت ہی نہیں اور جب وہ سارے کام

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ هٰذَا
اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اسی کی عبادت کرو یہی

صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۷﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ
سیدھا راستہ ہے ۲۹ مگر مختلف گروہوں نے آپس میں اختلاف

مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ
کیا (اور سچائی کو چھوڑ دیا) پس جن لوگوں نے ایک بڑے دن میں حاضر ہونے کا

مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۸﴾
انکار کیا اُن پر عذاب نازل ہوگا ۔ ۳۰

خود کر لیتا ہے تو اس کے متعلق بیٹے اور روح القدس کا وجود کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

۲۹ تفسیر :- فرماتا ہے یقیناً اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے فَاعْبُدُوْهُ پس تم اُسی کی عبادت کرو۔ جب خدا باپ کے متعلق تم بھی سمجھتے ہو کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ قادر مطلق ہے تو قادر مطلق کو چھوڑ کر کسی اور کو خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی۔ وہ تمہارا بھی مالک ہے اور میرا بھی جھگڑا کیسا اور رقابتیں کیسی۔ ان جھگڑوں کو چھوڑ دو اور سمجھ لو کہ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ یہ سیدھا راستہ ہے۔ تم اُن چیزوں کی طرف چلے گئے ہو جن کی عدم ضرورت کو تم بھی تسلیم کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ پر موت نہیں آسکتی کہ اُسے بیٹے کی ضرورت ہو۔ تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کو بیوی کی ضرورت نہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اُس کے اندر ایسے مادے جمع نہیں ہوتے جو بیٹوں کی پیدائش کا موجب بنتے ہیں۔ پھر جب تم بھی ان باتوں کو تسلیم کرتے ہو تو آؤ اور سیدھے راستہ پر چلتے ہوئے خدائے واحد کی عبادت کرو۔ صراط مستقیم کو چھوڑ کر تم ٹیڑھے راستہ کو کیوں اختیار کر رہے ہو۔

۳۰ تفسیر :- احزاب حزب کی جمع ہے اس کے عام معنے تو اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ کے ہوتے ہیں یعنی انسانوں کی کوئی جماعت۔ لیکن لغت والے لکھتے ہیں کہ اس سے مراد خالی گروہ نہیں ہوتا بلکہ کُلُّ قَوْمٍ تَشَاکَلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَهُمْ اَحْزَابٌ۔ وہ تمام قومیں جن کے افراد کے قلوب میں ہم رنگی پیدا ہو چکی ہو اور اُن کے اعمال میں بھی ہم رنگی ہو احزاب کہتے ہیں یوں تو پچاس ساٹھ یا سو آدمی کہیں کھڑے ہوں تو انہیں حزب کہہ دیں گے ان معنوں میں کہ یہ ایک طائفہ یا گروہ ہے۔ لیکن استعمال میں آہستہ آہستہ اس لفظ کو یہ خصوصیت دے دی گئی ہے کہ صرف ایسے لوگوں کو حزب قرار دیا جائیگا جو ایک خیال اور ایک عقیدہ کے ہوں۔ اگر کسی جگہ

بہت سے لوگ جمع ہوں جن میں عیسائی بھی ہوں، یہودی بھی ہوں، مسلمان بھی ہوں، دہریہ بھی ہوں، سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے بھی ہوں۔ تو محاورہ کے لحاظ سے ہم انہیں حزب نہیں کہیں گے۔ حزب اُس وقت کہیں گے جب اُن کے مذہبی اور تمدنی اور سیاسی خیالات اور اعمال ایک رنگ کے ہوں تو فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ میں اگر لوگوں کی عام جماعت مراد لی جائے تو یہ معنے درست نہیں ہوں گے۔ کیونکہ جن لوگوں کو مسیحؑ کے متعلق کوئی دلچسپی ہی نہیں انہوں نے اختلاف کیوں کرنا ہے۔ اختلاف کرنے والے وہی ہو سکتے ہیں جن کی دلچسپی مسیحؑ کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر حِزْبٌ کے معنے اُن لوگوں کے کئے جائیں جن کے قلوب اور اعمال میں مشارکت پائی جاتی ہو تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ایک رنگ اور خیالات کے ہوں اور جن کے اعمال میں بھی یکجہتی پائی جاتی ہو انہوں نے اختلاف کیا کرنا ہے یہ بھی تضاد رکھنے والی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو انہیں یک رنگ کہا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اختلاف کیا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اختلاف درحقیقت پیدا ہی یکرنگی کے بعد ہوتا ہے۔ جیسے میں نے بتایا ہے کہ اگر کسی امر کے متعلق لوگوں کو دلچسپی ہی نہ ہو تو انہوں نے اختلاف کیوں کرنا ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی اُسی وقت اہمیت رکھتا ہے جب خیالات اور اعمال میں مشارکت پائی جاتی ہو اور پھر اختلاف بھی نظر آ رہا ہو۔ مثلاً اگر مسلمانوں میں قرآن کریم کے بارہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اختلاف بڑی اہمیت رکھیگا کہ مسلمان ایک طرف قرآن کو بھی مانتے ہیں اور دوسری طرف اسی قرآن کے بارہ میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگر عیسائیوں میں قرآن کریم کے بارہ میں اختلاف ہو تو اُن کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھے گا۔ کیونکہ ہر شخص کہیگا کہ یہ تو قرآن کو مانتے ہی نہیں۔ ان کا اختلاف کونسی اہمیت رکھتا ہے۔ تو اختلاف وہی اہمیت رکھتا ہے جو ایک عقیدہ اور ایک خیال رکھنے والے لوگوں کے اندر پایا جاتا ہو مِنْۢ بَيْنِهِمْ کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ یہاں حزب کے معنے اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ کے نہیں بلکہ ہم خیال اور ہم عقیدہ لوگ مراد ہیں اور یہی قابلِ تعجب ہوا کرتا ہے کہ ایک کتاب پر ایمان رکھنے والے لوگ ہوں ایک رسول پر ایمان لانے والے لوگ ہوں۔ ایک مقصد اور ایک مدعا اپنے سامنے رکھنے والے لوگ ہوں اور پھر اُن میں اختلاف پیدا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ۔ یہ لوگ جو مسیح کو ماننے والے اور اُس کے ساتھ عقیدت رکھنے والے ہیں انکی کتاب ایک تھی۔ ان کے عقائد ایک تھے۔ ان کے اعمال ایک تھے مگر کتنی بدقسمتی ہے کہ پھر انہوں نے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا کہ مریم ایک بشر تھی جو خدا تعالیٰ کا بیٹا جنی اور کسی نے کہا کہ مریم خدا تعالیٰ کی بیوی تھی اور وہ خدائی صفات اپنے اندر رکھتی تھی۔ چنانچہ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے پوپ نے اعلان کیا تھا کہ یہ عقیدہ کہ مریم خدا تعالیٰ کی بیوی اور خدائی صفات اپنے اندر رکھتی تھی یہی رومن کیتھولکس کا آفیشل عقیدہ سمجھا جائے گا۔ پھر بعض نے کہا کہ خدا ایک ہے مسیح اپنے اندر صرف خدائی صفات رکھتے تھے اور وہ انسان کی صورت میں اس دنیا میں ظاہر ہوئے۔ بعض نے کہا کہ نہیں

مسیح خدا تھا اور مسیح کا خدا ہونا بطور ایک مادی وجود
کے تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ تین شخصیتیں ماننی ضروری ہیں۔
اور بعض کہتے ہیں کہ تین شخصیتیں ماننی ضروری نہیں
صرف اتنا ماننا ضروری ہے کہ ان تینوں میں خدائی
حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ اُس مسیح کو جو دنیا میں
ظاہر ہوا انسان ہی سمجھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ خدا
بیٹا الگ تھا جس کا اس مسیح کے ساتھ جو دنیا میں
ظاہر ہوا تعلق ہو گیا۔ یہ لوگ تین شخصیتوں کے
نہیں بلکہ تین حیثیتوں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک
حیثیت سے خدا باپ ہے ایک حیثیت سے خدا بیٹا ہے اور ایک حیثیت سے
خدا روح القدس ہے۔ مگر جو تین شخصیتیں مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ
خدا باپ اپنی ذات میں الگ وجود ہے خدا بیٹا اپنی ذات میں الگ وجود
ہے اور خدا روح القدس اپنی ذات میں الگ وجود ہے اسی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ
مِنْ بَيْنِهِمْ خود انہی میں سے یہ گروہ جو عیسیٰ کو ماننے والا
ہے باوجود اتحاد مذہب اور اتحاد عقیدہ اور اتحاد عمل کے
اختلاف کا شکار ہو گیا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ
يَوْمٍ عَظِيمٍ۔ اس اختلاف کے نتیجہ میں لازماً
ایک گروہ کے متعلق یہ ماننا پڑیگا کہ وہ حق پر ہے اور ایک
کے متعلق یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ضلالت پر ہے
چاہے دس گروہ ہو جائیں۔ مگر بہرحال اختلاف کے
نتیجہ میں دو فریق بن جائیں گے۔ ایک حق پر ہوگا اور
ایک باطل پر۔ وہ لوگ جو باطل عقائد میں مبتلا ہو گئے
ہیں اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَيْلٌ
خدائے واحد نے اپنا ایک بندہ توحید کے
قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا مگر ان لوگوں نے اُسی کو
خدا بنا لیا۔ یہ بہت بڑا جرم ہے جو اُن سے سرزد ہوا
پس اُن پر عذاب اور لعنت ہے۔ وَیلٌ کے معنے
عذاب کے بھی ہوتے ہیں اور وَیلٌ کے معنے لعنت
کے بھی ہوتے ہیں پس فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا
مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ کے یہ معنے ہیں کہ
وہ لوگ جنہوں نے ایک بڑے دن میں حاضر ہونے کا
انکار کر دیا اُن پر ہمارا عذاب نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ
کی طرف سے انہیں دُوری کا پیغام دیا جائے گا۔
یوم عظیم کی انسان تمنا کیا کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے
کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس دن بدلے
ملیں گے اور وہ کہتا ہے کاش اُس دن مجھے بھی خدا
نظر آجائے لیکن اگر وہ اس طرح نظر آئے کہ انسان
اس کے سامنے مجرم کی طرح پیش ہو تو اس سے
زیادہ ذلت اور بدقسمتی کی بات اور کیا ہوگی۔

حضرت ضرارؓ ایک جنگ میں شامل تھے قیصر کی
فوجوں کے ساتھ لڑائی ہو رہی تھی کہ اس کی طرف سے
ایک جرنیل نکلا جس نے بہت سے مسلمان سپاہی مار ڈالے
حضرت ابو عبیدہؓ جو اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف تھے
انہوں نے ضرارؓ کو بلایا اور کہا۔ اب تم اس جرنیل کے
مقابلہ کے لئے جاؤ۔ وہ نکلے اور جرنیل کے مقابلہ کیلئے
کھڑے ہوئے۔ مگر یکدم انہوں نے اپنی پیٹھ موڑی
اور خیمہ کی طرف بھاگ پڑے۔ اُن کا بھاگنا تھا۔ کہ
اسلامی لشکر میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور
عیسائیوں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا کہ اتنا بڑا آدمی
ہمارے جرنیل کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان سے بھاگ
نکلا ہے۔ حضرت ضرار جب واپس بھاگے تو کمانڈر انچیف
نے ایک شخص کو حکم دیا کہ جاؤ ضرار سے پتہ لو کہ کیا ہوا ہے
اور وہ کیوں میدان سے بھاگا ہے؟ وہ شخص اُنکے پاس
پہنچا تو اُس وقت ضرار اپنے خیمہ میں سے باہر نکل رہے تھے
اُس شخص نے کہا۔ ضرار آج تم نے سب مسلمانوں کو ذلیل
کر دیا ہے اور سب میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ

جس دن وہ ہمارے حضور حاضر ہونگے انکی قوتِ شنوائی بہت تیز ہوگی اور نظریں بھی بہت تیز ہونگی۔ لیکن

الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۹﴾

وہ ظالم آج بہت بھاری گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۳۱

کیونکہ تم اس جرنیل کے مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے بتاؤ تمہیں کیا ہوا تھا اور تم کیوں بھاگے؟ اُس نے کہا بات یہ ہے کہ جب میں اُس جرنیل کے مقابلہ کے لئے نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہوا تو یکدم مجھے یاد آیا کہ میں نے زرہ بکتر پہنی ہوئی ہے۔ زرہ پہننے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تلوار بھی جسم پر اثر نہ کرے اور نیزہ بھی جسم پر اثر نہ کرے۔ وہ لوہے کی ایک صدری ہوتی ہے اور اگر اچھی مضبوط زرہ ہو تو تلوار نہ صرف اُسے کاٹ نہیں سکتی بلکہ زرہ پر لگنے کی وجہ سے خود خراب ہوجاتی ہے۔ تو انہوں نے کہا آج صبح میں نے زرہ پہن لی تھی جو اُس وقت بھی میں نے پہنی ہوئی تھی۔ جب میں اس کے سامنے ہوا تو چونکہ یہ جرنیل نیزہ زنی اور تلوار چلانے کا بڑا مشاق ہے اس لئے میرے دل نے کہا اے ضرار کیا تجھے خدا تعالیٰ کی ملاقات سے اتنی نفرت ہے کہ اس بہادر جرنیل کے سامنے تو زرہ پہن کر کھڑا ہوا ہے تاکہ تو مارا نہ جائے۔ اُس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اگر آج میں مارا گیا تو میرے لئے جہنم کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ کیونکہ خدا کہے گا کہ تجھے میرے ملنے کی خواہش نہیں تھی اگر خواہش ہوتی تو تُو زرہ پہن کر کیوں لڑتا۔ چنانچہ میں دوڑا اور اپنے خیمہ میں آیا تاکہ میں زرہ اُتار دوں اور اگر اس لڑائی میں مارا جاؤں تو اللہ تعالیٰ سے خوشی اور بشاشت کے ساتھ ملوں

تو یوم عظیم وہی ہے جس میں خدا تعالیٰ کی ملاقات ہو اور خدا تعالیٰ کی ملاقات وہی ہے جس سے خوشی اور سکون حاصل ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ کتنی بدقسمتی ہے، کتنی بڑی لعنت کی بات ہے کہ ایک شخص خدا سے ملے مگر بجائے خوش ہونے کے اس کا دل چاہے کہ میں یہاں سے دُور بھاگوں۔ یہ ذلت اور رسوائی ان لوگوں کو اس لئے پہنچے گی کہ جس سے ان کو تعلق جوڑنا چاہیئے تھا اُس سے انہوں نے اپنا تعلق توڑا اور وہ شخص جو خدا تعالیٰ کا ایک بندہ اور ادنیٰ غلام تھا اُسے انہوں نے خدا کی جگہ پر بٹھا دیا۔

۱۳۱ تفسیر:- اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے اور عام طور پر ہمارے صرفی اور نحوی اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ "وہ کیا ہی خوب سننے والے اور دیکھنے والے ہوں گے" لیکن بعض نحویوں نے کہا ہے کہ اَسْمِعْ وَاَبْصِرْ کلمہ تعجب کے طور پر نہیں بلکہ حقیقی امر کے طور پر استعمال ہوا ہے پس ان کے نزدیک اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ان لوگوں کو سناؤ اور انہیں اُن کی حالت دکھاؤ۔ یعنی ان لوگوں کی جو کیفیت ہے وہ ان پر اچھی طرح واضح کرو۔ لیکن عربی محاورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے پہلے معنے ہی قابلِ ترجیح ہیں کہ "وہ کیا ہی خوب

سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہونگے۔

یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا۔ جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ کیونکہ اُس روز تمام باتیں کھل جائیں گی۔ ہر قسم کے پیچ جو مذہبی مسائل میں پیدا ہوچکے ہیں دور ہو جائیں گے۔ پادریوں، پنڈتوں اور مولویوں کی جھوٹی روایتوں کی وجہ سے انسانی عقلوں پر جو پردہ پڑ گیا ہے وہ اُٹھ جائے گا۔ کان اُس روز حقیقت کو سُن رہے ہوں گے۔ اور آنکھیں اُس روز حقیقت کو دیکھ رہی ہوں گی لیکن اِس حقیقت کے کھلنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ایک مومن پر جب حقیقت کھلے گی تو چونکہ چیز وہی ہوگی جس کو وہ اِس دنیا میں مان رہا ہوگا۔ اِس لئے وہ خوش ہوگا۔ کیونکہ اس کے سامنے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی بلکہ وہی ہوگی جس کو وہ اِس دنیا میں مان رہا تھا۔ ایک مومن جس نے خدا تعالےٰ کے متعلق یہ ایمان رکھا کہ وہ حمید ہے' وہ مجید ہے' وہ غفار ہے، وہ ستار ہے' وہ مہیمن ہے، وہ شکور ہے، وہ غفور ہے، وہ رب ہے، وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، وہ مالک یوم الدین ہے۔ قیامت کے دن جب حقیقت کھلے گی اور وہ خدا تعالےٰ کے سامنے پیش ہوگا تو اُسے رحمانیت کے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے۔ رحیمیت کے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے۔ مالک یوم الدین کے بڑے وسیع معنے معلوم ہونگے۔ اِسی طرح خدا تعالےٰ کی باقی تمام صفات کے اُسے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے لیکن اس کے باوجود وہ خوش ہوگا کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔ جیسے کوئی شخص دور سے سبزہ دیکھتا ہے تو اُس کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ اور جب قریب آکر دیکھتا ہے تو اس کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس وقت اُسے ہر چیز نظر آنے لگ جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ اُس کی کیفیات میں فرق ہوتا ہے۔ سبزہ کے قریب پہنچکر اس کی خوشی بڑھ جاتی ہے کم نہیں ہوتی لیکن ایک اور شخص ایسا ہوتا ہے جو دُور سے اژدہا دیکھتا ہے اور نظر کی کمزوری کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ وہ کوئی ٹیلہ ہے اور اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے تاکہ رات کے وقت وہاں قیام کرے اور شیر اور چیتے کے حملہ سے محفوظ رہے۔ لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ ٹیلہ نہیں بلکہ اژدہا ہے اور اس کا دل حسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح قیامت کے دن جب کفار پر حقیقت کھلیگی تو وہ حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ یہ کیا نکلا؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔

لٰکِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ کے بعد ضلالت ملتی ہے۔ کیونکہ جب آنکھیں کھل جائیں اور کان کھل جائیں تو اس کے بعد ہدایت ملتی ہے ضلالت نہیں ملتی۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پتہ تو لگ جائے گا کہ جو کچھ وہ مان رہے تھے وہ بالکل غلط تھا۔ مگر اُس وقت وہی چیز انسان کے کام آسکتی ہے جس کو پہلے مانتا ہو۔ وہ عقیدہ کام نہیں آسکتا جو اس روز انسان پر روشن ہُوا ہو۔ ایک عیسائی جسے خدائے واحد نظر آجائے گا اس کے دیکھنے سے وہ شرک سے پاک نہیں ہو جائے گا۔ اگر وہ پاک ہو جاتا تو دوزخ میں کیوں جاتا۔ پس اس کے یہ معنے نہیں

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ

اور اُن کو اس دن سے ڈرا جس دن (افسوس اور) مایوسی چھائی ہوئی ہوگی (یعنی قیامت کے دن ہی) جب سب

وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِنَّا نَحْنُ

معاملات کا فیصلہ ہو جائیگا۔ اور (اب تو) یہ لوگ غفلت میں (پڑے ہوئے) ہیں اور ایمان نہیں لاتے ۳۲ھ ہم یقیناً (ساری) زمین

نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۱﴾

کے بھی وارث ہونگے اور ان لوگوں کے بھی جو اس پر رہتے ہیں اور (آخرکار) سب لوگ ہماری طرف ہی لوٹائے جائینگے ۳۳ھ

کہ اُس دن اُن کو گمراہی ملے گی بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اُس دن اُن کو گمراہی کا علم حاصل ہوگا۔

۳۲ھ تفسیر:۔ "حسرت کا دن" اس لئے کہا کہ اُس روز حقیقت کھل جائے گی۔ مگر چونکہ اُن کے دلوں میں ایمان نہیں ہوگا اور سامنے کچھ اور نظر آرہا ہوگا اِس لئے انہیں اپنے عقائد کی غلطی معلوم کر کے افسوس ہوگا اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ جس دن حقیقت کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا یا جس دن امرِ الٰہی کا اعلان کر دیا جائے گا اور یہ فیصلہ اور امر الٰہی کا اعلان سچائی کی تائید میں ہوگا جھوٹ کی تائید میں نہیں۔ پس جب اعلان ہوگا تو اُن کے دلوں میں حسرت ہوگی کہ کاش ہم اس سے پہلے ایمان لا چکے ہوتے۔ وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ مگر تمام حقائق کو سمجھ لینے کے باوجود پھر بھی وہ غفلت میں مبتلا رہیں گے اور ایمان لانے کے لئے اپنے قدم نہیں بڑھائیں گے۔

یہاں سے یہ ایک عجیب حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ صداقت کو دیکھ کر بھی دل کبھی یکدم نہیں بدلا کرتے۔ اَسْمِعْ وَاَبْصِرْ میں بتایا تھا کہ وہ دیکھ بھی رہے ہوں گے اور وہ سُن بھی رہے ہوں گے اور پھر يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا وہ ہمارے پاس بھی پہنچ چکے ہونگے

لیکن وَهُمْ فِىْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ پھر بھی بوجہ سابق کفر اور بد اعمالیوں کے اُن کا دل اتنا ملوّث ہوگا کہ حقیقت کو دیکھنے کے باوجود اُس کے اندر صفائی پیدا نہیں ہوگی اور وہ دوزخ میں داخل کئے جائینگے جس کے معنے یہ ہیں کہ حقیقت کھل جانے کے بعد بھی بوجہ اپنی پُرانی عادت کے انسان اپنے طریق کو نہیں چھوڑ سکتا اور پھر بھی اُسے تاریکی اور ظلمت ہی پسند آتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو ہر قسم کے نشانات دیکھنے کے باوجود کفار پھر بھی اعتراض ہی کرتے رہتے ہیں اُن کے دلوں میں اتنی صفائی پیدا نہیں ہوتی کہ خدا تعالےٰ کا نور اُن میں جذب ہو سکے۔ وہ نشانات دیکھتے ہیں مگر پھر بھی ہدایت سے دُور رہتے ہیں۔

۳۳ھ تفسیر: گذشتہ آیات میں عیسائیوں کا ذکر کر کے بتایا گیا تھا کہ ایک دن اُن پر حقیقت کھل جائیگی اور اُنہیں پتہ لگ جائے گا کہ خدا تعالےٰ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ کسی اَور دین کے ساتھ ہے لیکن باوجود اس علم کے وہ سچائی کو قبول کرنے سے اعراض کریں گے۔ اب فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ۔ ان لوگوں کو انسانوں اور مالوں پر حکومت حاصل ہوگی لیکن فیصلہ کے دن

انسانوں اور مالوں کی بادشاہت مومنوں اور سچائی پر قائم ہونے والوں کو دے دی جائے گی اور اِن لوگوں سے چھین لی جائے گی۔ گویا اِس میں اسلام اور احمدیت کی ترقی کی طرف بھی اشارہ ہے اور اِس طرف بھی کہ عیسائیت کا اُس وقت ساری دنیا پر غلبہ ہوگا۔ جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں اُس وقت عیسائیت کے پاس بے شک حکومت تھی مگر اُن کی حکومت بہت ہی محدود تھی۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ ایک زمانہ میں ساری دنیا کی حکومت اُن سے چھین لی جائے گی جس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے ساری دنیا کی حکومت اُنکے قبضہ میں چلی جائے گی اور پھر وہ حکومت اُن سے چھینی جائے گی۔ کیونکہ کوئی چیز تبھی چھینی جا سکتی ہے جب وہ دوسرے کے پاس موجود ہو۔ پس یہ کہنا کہ دنیا کی حکومت اُن سے چھین لی جائیگی اس میں دو پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ ساری دنیا کی حکومت انکو ملے گی اور دوسری یہ کہ دنیا کی حکومت اُن سے چھین لی جائے گی۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم کسی غریب آدمی کے متعلق کہیں کہ ایک سال کے بعد ہم ایک کروڑ روپیہ اُس سے چھین لینگے۔ اب اِس فقرہ میں یہ بھی مفہوم پایا جاتا ہے کہ ایک کروڑ روپیہ اُس غریب آدمی کے قبضہ میں آجائے گا اور یہ بھی کہ وہ کروڑ روپیہ اُس سے چھین لیا جائے گا۔ اِسی طرح اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ میں بھی دو پیشگوئیاں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ عیسائی ایک زمانہ میں ساری دنیا پر چھا جائیں گے اور ساری دنیا کے وارث ہو جائیں گے اور تمام بنی نوع انسان اُن کے ماتحت ہو جائیں گے اور پھر یہ کہ ہم ہی اُسکے وارث ہو جائینگے یعنی ہم وہ زمین اُن سے چھین لیں گے اور اپنے نیک بندوں کو دے دیں گے۔ وَ مَنْ عَلَيْهَا اور پھر زمین پر جتنے لوگ ہوں گے اُن کے بھی ہم ہی وارث ہو جائیں گے یعنی نہ صرف عیسائی اس وقت دنیا کے بادشاہ ہوں گے بلکہ لوگ بھی کثرت کے ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ میں بتایا کہ اُنہیں دنیوی شان و شوکت حاصل ہوگی۔ اور مَنْ عَلَيْهَا میں بتایا کہ تعداد بھی اُنکی زیادہ ہوگی۔ چنانچہ اس کے بعد امریکہ دریافت ہوا جو عیسائیوں کے قبضہ میں ہے۔ اب اگر امریکہ چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا کیونکہ وہاں انہی کا غلبہ ہے۔ اگر فلپائن چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا۔ اگر چین کے بہت سے علاقے چھینے جائیں تو عیسائیوں سے ہی چھینے جائیں گے۔ کیونکہ وہاں کئی کروڑ عیسائی پائے جاتے ہیں۔ اگر آسٹریلیا چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا۔ اگر روس چھینا جائے تو گو وہ دہریہ ملک ہے مگر بہرحال عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا۔ اگر یورپ چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا اگر افریقہ چھینا جائے تو چونکہ اُس کا اکثر حصہ عیسائی ہے اس لئے وہ بھی عیسائیوں سے ہی چھینا جائیگا۔ اگر جزائر چھینے جائیں تو عیسائیوں سے ہی چھینے جائینگے غرض فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا ہم وارث ہو جائیں گے زمین کے بھی اور اُن کے بھی جو اُس زمین پر رہتے ہیں اور اُن کو اپنی ماتحتی میں لے آئیں گے۔ ماتحتی کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگ خدائے واحد کی بادشاہت کو قبول کریں گے۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ عیسائیت بحیثیت قوم ایمان نہیں لائیگی۔ اب بتاتا ہے کہ عیسائیت تو قیامت تک باقی رہے گی لیکن جہاں تک اکثریت کا سوال ہے زمین بھی اُن سے چھین لی جائے گی۔ اور اُن کی اکثریت بھی اُن سے چھین لی جائیگی اور زمین خدا کی ہو جائے گی یعنی اُن لوگوں کی ہو جائیگی

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۲﴾

اور تو قرآن کریم کے رو سے ابراہیم کا ذکر کر۔ وہ یقیناً بڑا راستباز تھا اور نبی تھا۔ ۴۳

جو خدائے واحد کے پرستار ہیں اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی موحدین کے ماتحت آجائیں گے۔ گویا اس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ احمدیت دنیا کے اکثر افراد کو اپنے اندر جذب کرلے گی اور عیسائیت اُسکے مقابلہ میں شکست کھا جائے گی۔

وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ اور عیسائی لوگ جو آج خدائے واحد سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں اور ایک خدا کے بندے کی پرستش کر رہے ہیں مسیح کے گرد ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے یعنی اُن میں تبلیغ اسلام کی جائے گی اور وہ اسلام کو قبول کرکے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی طرف لوٹیں گے اور شرک کو چھوڑ کر خدا تعالےٰ کی توحید کے قائل ہو جائیں گے۔

۴۳ تفسیر: یوں تو الکتاب ایک عام لفظ ہے جو کسی جگہ قرآن کریم کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کسی جگہ بائبل کے لئے مگر اس جگہ الکتاب سے مراد قرآن کریم ہی ہے اور اس آیت کے یہ معنے ہیں۔ کہ تو قرآن کریم کے رُو سے ابراہیم کا ذکر کر یعنی تو ابراہیم کو اُس شکل میں پیش کر جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے نہ کہ اُس شکل میں جو بائبل میں بیان کی گئی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بائبل میں ابراہیم کو صدّیق نہیں بنایا گیا بلکہ اُس کی طرف یہ جھوٹ منسوب کیا گیا ہے کہ اُس نے بادشاہ سے ڈر کر اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا چنانچہ اس بارہ میں بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ

"ابراہام وہاں سے جنوب کے ملک کی طرف چلا اور قادس اور شور کے درمیان ٹھہرا اور جرار میں قیام کیا اور ابراہام نے اپنی بیوی سارہ کے حق میں کہا کہ وہ میری بہن ہے۔ اور جرار کے بادشاہ ابی ملک نے سارہ کو بلوا لیا۔ لیکن رات کو خدا ابی ملک کے پاس خواب میں آیا اور اُسے کہا کہ دیکھ تو اِس عورت کے سبب سے جسے تُو نے لیا ہے ہلاک ہوگا کیونکہ وہ شوہر والی ہے۔ پر ابی ملک نے اس سے صحبت نہیں کی تھی۔ سو اُس نے کہا اے خداوند کیا تو صادق قوم کو بھی مارے گا۔ کیا اُس نے خود مجھ سے نہیں کہا کہ یہ میری بہن ہے اور وہ آپ بھی یہی کہتی تھی کہ وہ میرا بھائی ہے۔ میں نے تو اپنے سچے دل اور پاکیزہ ہاتھوں سے یہ کیا اور خدا نے اُسے خواب میں کہا ہاں میں جانتا ہوں کہ تُو نے اپنے سچے دل کر یہ کیا اور میں نے بھی تجھے روکا کہ تُو میرا گناہ نہ کرے۔ اسی لئے میں نے تجھے اسکو چھونے نہ دیا۔ اب تُو اس مرد کی بیوی کو واپس کردے کیونکہ وہ نبی ہے اور وہ تیرے لئے دعا کرے گا اور تُو جیتا رہے گا۔ پر اگر تُو اسے واپس نہ کرے تو جان لے کہ تُو بھی اور جتنے تیرے ہیں سب ضرور ہلاک ہونگے تب ابی ملک نے صبح سویرے اُٹھ کر اپنے سب نوکروں کو بُلایا اور اُن کو یہ سب باتیں کہہ سنائیں۔ تب وہ لوگ بہت ڈر گئے اور ابی ملک نے ابراہام کو بُلا کر اُس سے کہا

کہ تُو نے ہم سے یہ کیا کیا اور مجھ سے تیرا کیا قصور ہُوا کہ تُو مجھ پر اور میری بادشاہی پر ایک گناہ عظیم لایا۔ تُو نے مجھ سے وہ کام کئے جن کا کرنا مناسب نہ تھا ابی ملک نے ابراہام سے یہ بھی کہا کہ تُو نے کیا سمجھ کر یہ بات کی۔ ابراہام نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ خدا کا خوف تو اس جگہ ہرگز نہ ہوگا اور وہ مجھے میری بیوی کے سبب سے مار ڈالیں گے اور فی الحقیقت وہ میری بہن بھی ہے۔ کیونکہ وہ میرے باپ کی بیٹی ہے اگرچہ میری ماں کی بیٹی نہیں۔ پھر وہ میری بیوی ہوئی اور جب خدا نے میرے باپ کے گھر سے مجھے آوارہ کیا تو میں نے اس سے کہا کہ تجھ پر یہ تیری مہربانی ہوگی کہ جہاں کہیں ہم جائیں تو میرے حق میں یہی کہنا کہ یہ میرا بھائی ہے۔"

(پیدائش باب ۲۰ آیت ۱ تا ۱۳)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ بائبل ابراہیم کو جھوٹا قرار دیتی ہے۔ پس چونکہ بائبل میں ابراہیم کو صدیق نہیں بتایا گیا بلکہ اس کی طرف یہ جھوٹ منسوب کیا گیا ہے کہ اُس نے بادشاہ سے ڈر کر اپنی بیوی کو بہن کہا اور اپنی بیوی سے بھی یہی کہا کہ تُو مجھے اپنا بھائی کہنا۔ اِس لئے فرماتا ہے کہ تو ابراہیم کو اس شکل میں پیش کر جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے نہ کہ اُس شکل میں جو بائبل میں بیان کی گئی ہے۔ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ بیان بالکل غلط ہے اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ابراہیم صدیق بھی تھا اور نبی بھی تھا۔

صدیق کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ ایک معنے صدیق کے یہ ہیں کہ مَنْ كَثُرَ مِنْهُ الصِّدْقُ جو شخص زیادہ سچ بولے۔ کبھی کبھار بے احتیاطی ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ اپنی طرف سے وہ سچ بولنے کی کوشش کرے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ لَا يَكْذِبُ قَطُّ جس کے مُنہ سے کسی صورت میں بھی جھوٹ نہ نکلے گویا وہ بہت زیادہ احتیاط سے اپنی زبان سے الفاظ نکالنے کا عادی ہو اور غلطی سے بھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ لَا يَتَأَتّٰى مِنْهُ الْكَذِبُ لِتَعَوُّدِهِ الصِّدْقَ۔ جو شخص سچ کا اتنا عادی ہو کہ جھوٹ اس کے مُنہ سے نکل ہی نہ سکے گویا دوسرے معنے تو یہ تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا لیکن تیسرے معنے یہ ہیں کہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ سچائی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ صَدَقَ بِقَوْلِهٖ وَاعْتِقَادِهٖ وَحَقَّقَ صِدْقَهٗ بِفِعْلِهٖ جو شخص اپنے قول اور اعتقاد سے دونوں باتوں میں سچائی بیان کرے یعنی اس کی بات بھی سچی ہو اور اُس کا عقیدہ بھی سچا ہو۔ مثلاً ایک عیسائی دیکھتا ہے کہ اس کے بیٹے نے زید کو مار ڈالا ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور اُسے گواہی کیلئے بلایا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ واقعہ میں میرے بیٹے نے اُس شخص کو مارا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی جان کی پروا نہیں کرتا اور سچ بولتا ہے۔ اب ایسے شخص کو ہم صادق تو کہیں گے لیکن اُسے صدیق نہیں کہیں گے۔ کیونکہ صدیق میں یہ شرط ہے کہ مَنْ صَدَقَ بِقَوْلِهٖ وَاعْتِقَادِهٖ۔ وہ اپنے قول میں بھی سچا ہو اور اپنے اعتقاد میں بھی سچا ہو۔ اُس نے بے شک سچ بولا مگر اعتقادی لحاظ سے وہ سچائی پر قائم نہیں تھا پس وہ صادق تو ہے مگر صدیق نہیں۔ وَحَقَّقَ صِدْقَهٗ بِفِعْلِهٖ"

اور پھر اس کا عمل بھی اس کی قولی اور اعتقادی سچائی کی تائید کر رہا ہو۔ یہ گویا کمالِ صدیقیت ہوتا ہے۔

پھر لکھا ہے اَلصِّدِّيْقُوْنَ هُمْ قَوْمٌ دُوْنَ الْاَنْبِيَاءِ فِي الْفَضِيْلَةِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے انعامات جو انبیاء کو حاصل ہوتے ہیں وہاں سے نیچے اتر کر صدیقین کو حاصل ہوتے ہیں۔ (مفردات)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت یہ لفظ بولا ہے۔ اس لئے لازماً ہمیں اس کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو شانِ ابراہیمی کے مطابق ہوں اور وہ تیسرے اور چوتھے معنے ہی ہو سکتے ہیں یعنی سچ کی اُسے اتنی علوت تھی کہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ سچ اُس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا یا وہ ایسا راستباز تھا کہ اس کی بات بھی سچی تھی اس کا اعتقاد بھی سچا تھا اور اُس کا عمل بھی سچا تھا۔

اس جگہ ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیق نچلا درجہ ہے اور نبوت اس سے بڑا مقام ہے۔ جب کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ نبی ہے تو صدیقیت کے معنے اجمالی طور پر اُسی میں آجاتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صِدِّيْقًا نَّبِيًّا کیوں کہا۔ کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ صدیق ہو کر نبی ہو گیا۔ یا وہ صدیق اور نبی ایک وقت میں تھا؟

اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ نہ صرف صدیق کا لفظ بلکہ درحقیقت تمام صفاتِ حسنہ اپنے اندر دو معنے اور دو استعمال رکھتی ہیں۔ ایک استعمال بطور صفت کے ہوتا ہے۔ اور ایک استعمال بطور درجہ کے ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ کاذب ہے۔ تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جھوٹ اور کذب بیانی کی صفت اس میں پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کاذب کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص نے جھوٹ اور کذب بیانی کی اتنی علوت ڈال لی ہے کہ کاذب اس کا ایک درجہ اور مقام ہو گیا ہے۔ غرض جتنے بھی صفاتی الفاظ آتے ہیں وہ سب دو رنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔ کبھی وہ صفاتی الفاظ صدورِ فعل پر دلالت کرتے ہیں اور کبھی حصولِ مقام پر دلالت کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بھی فعل صادر ہو جائے تو وہ لفظ اس شخص کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز اُسے مقام کے طور پر حاصل ہے۔ یا وہ اس چیز کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ یہ اس کی حیثیت ذاتیہ بن گئی ہے۔ جب اس قسم کے الفاظ صفات کے طور پر استعمال ہوں تو ہر بڑے درجہ کے لئے چھوٹا درجہ استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہر نبی مومن بھی ہے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (یونس ع) مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ اور مقام مومن کا تھا۔ پس صالح شہید اور صدیق کے الفاظ بطور صفات بھی استعمال ہوتے ہیں اور بطور درجہ بھی۔ جب صفات کے طور پر استعمال ہوں تو ہر بڑے درجہ کے لئے چھوٹا درجہ استعمال ہو سکتا ہے مثلاً ہر شہید صالح ہے، ہر صدیق صالح اور شہید ہے اور ہر نبی صدیق، شہید اور صالح ہے۔ لیکن جب درجہ کے معنوں میں استعمال ہو تو پھر ہر لفظ اپنے درجہ کے لئے بولا جائے گا دوسرے کیلئے نہیں۔ کیونکہ درجہ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ یہی خصوصیت مسلّمہ اُس میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص صدیق کے درجہ کو حاصل کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ

اُس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی کہ اُس نے صدیقیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں شہید کا لفظ اُس کے ساتھ درجہ اور مقام کے بیان کیلئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ یا نبی کی اہم حیثیت چونکہ نبوت کی ہوتی ہے اور یہی اُس کا مقام ہوتا ہے۔ اس لئے جب اس کے مقام کا اظہار کیا جائے گا تو صرف نبی کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ نبی کے ساتھ صدیق کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبوت کا درجہ صدیقیت کے مقام پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس جب کسی بڑے درجہ کے ساتھ چھوٹا درجہ استعمال کیا جاتے تو وہ درجہ اور مقام کے بیان کرنے کیلئے نہیں ہوتا بلکہ صفت بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس جگہ بھی صدیق کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ مقام صدیقیت حاصل کرنے والا تھا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ہمارا نبی تھا جس کی صفات میں سے ایک اہم صفت یہ تھی کہ وہ سچ بولنے میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھا۔ پس یہاں صدیق سے مراد درجہ نہیں بلکہ راستبازی کا اعلیٰ نمونہ مراد ہے۔

ابراہیمؑ کون شخص تھا اور کیوں یہاں ابراہیمؑ کا ذکر کیا گیا؟ یہ ایک سوال ہے جو طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سورۃ میں پہلے زکریاؑ کا ذکر کیا گیا۔ پھر یحییٰؑ کا ذکر کیا گیا۔ پھر مسیحؑ کا ذکر کیا گیا اور مسیحؑ کے بعد اب ابراہیمؑ کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ ابراہیمؑ کے بعد اسحاقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان انبیاء کا آگے پیچھے ذکر اس لئے کیا ہے کہ انہیں پتہ نہیں تھا کہ پہلے کون نبی ہوا ہے اور بعد میں کون نبی آیا تھا۔ چنانچہ اسی لئے انہوں نے مسیحؑ کے بعد ابراہیمؑ کا ذکر کر دیا۔ حالانکہ حضرت ابراہیمؑ بہت پہلے گذرے تھے اور موسیٰؑ کے بعد اسمٰعیلؑ کا ذکر کر دیا حالانکہ موسیٰؑ بعد میں ہوئے ہیں اور اسمٰعیل پہلے گذر چکے تھے۔ پس اُن کے نزدیک اس آگے پیچھے ذکر کی وجہ یہ ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ کونسا نبی پہلے گذرا ہے اور کونسا نبی بعد میں آیا ہے۔ حالانکہ جس ترتیب سے انبیاء گذرے ہیں قرآن کریم نے اُس ترتیب کے ساتھ ہی اُن کو بیان کیا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کو نبیوں کی تاریخ کا علم تھا۔ بلکہ خود بعض یورپین مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ انبیاء کس ترتیب سے آئے ہیں غلط ہے۔ قرآن کریم نے اُس ترتیب سے بھی انبیاء کا ذکر کیا ہے جس ترتیب کے ساتھ وہ آئے ہیں۔ پس اگر کسی جگہ قرآن کریم نے اس ترتیب سے اختلاف کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اور وجہ ہوگی۔ گویا عیسائیوں کے اعتراض کو انہوں نے خود ہی رد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ جہاں قرآن کریم انبیاء کا تاریخی طور پر ذکر کرتا ہے وہاں اُسی ترتیب سے ذکر کرتا ہے جس ترتیب سے وہ دنیا میں آئے ہیں اور جہاں اُس نے آگے پیچھے ذکر کیا ہے وہاں اُس کا کوئی اور مقصد ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نبیوں کی تاریخ کا علم نہیں تھا۔

میرے نزدیک حضرت مسیحؑ کے ذکر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسیحیت اپنے آپ کو شاخ قرار دیتی ہے موسویت کی اور موسویت اپنے آپ کو کڑی قرار دیتی ہے ابراہیمی سلسلہ کی۔ گویا مسیحؑ کا تعلق آخر ابراہیمؑ سے جا کر ثابت ہوتا ہے اور یہی بات ہمیں انجیل بتاتی ہے چنانچہ انجیل میں کہیں ابراہیمی تخت کا حضرت مسیحؑ کو وارث بتایا گیا ہے اور

کہیں داؤدی تخت کا اُس کو وارث بتایا گیا ہے پس مسیحؑ کی صداقت جب بھی زیر بحث آئے گی ابراہیم کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ کیونکہ جب مسیحیت ابراہیمی سلسلہ کی ایک شاخ ہے اور جڑ یہ ثابت کرتی ہو کہ خدا ایک ہے اور شاخ یہ کہتی ہو کہ خدا دو یا تین ہیں تو لازماً ہمیں ماننا پڑے گا کہ شاخ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ غلط ہے جب بانیٔ سلسلۂ موسویہ یا بانیٔ سلسلۂ اسرائیلی شرک کا دشمن تھا تو اس کی نسل کا ایک فرد شرک کو قائم کرنے والا کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے زکریا کا ذکر کیا جو یحییٰؑ کے والد تھے۔ پھر یحییٰ کا ذکر کیا جو مسیحؑ کے لئے ارہاص کے طور پر آئے تھے۔ پھر مسیح کا ذکر کیا اور اس بات کے دلائل دئے کہ وہ ہمارا موحد بندہ تھا۔ اس نے شرک کی تعلیم نہیں دی بلکہ ہمیشہ خدائے واحد کی پرستش کی تاکید کی ہے۔ اب فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ مسیحؑ کے اندر خدائی پائی جاتی تھی اور مسیح دنیا کا آخری نجات دہندہ تھا، اس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ ہم تمہیں ابراہیم کی طرف لے چلتے ہیں اور تمہیں بتلاتے ہیں کہ وہ ایک خدا مانتا تھا اور شرک کا شدید ترین دشمن تھا اور تم سمجھ سکتے ہو کہ جب جڑ ایک بات کا انکار کرتی ہو تو شاخ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ میرے اندر وہ بات پائی جاتی ہے۔ پس یہ ایک طبعی ترتیب ہے جس کے تحت خدا تعالیٰ نے مسیح کا ذکر کرنے کے بعد ابراہیم کا ذکر کیا اور عیسائی قوم کو اس طرف توجہ دلائی کہ تم سوچو کہ ابراہیم کیا کہتا ہے۔ ابراہیم کا کام بائبل میں دیکھو اس نے جو تعلیم دی ہے اس کو پڑھو اور پھر غور کرو کہ وہ باتیں جو تم کہتے ہو کہ مسیحؑ نے کہی ہیں کیا وہ ابراہیم کی باتوں سے ملتی ہیں یا وہ اُس کے خلاف ہیں اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو معلوم ہوا کہ وہی باتیں مسیحؑ کے متعلق سچ ہیں جو ہم مسیح کے متعلق کہتے ہیں۔ پس مسیح کے بعد ابراہیم کا ذکر قابلِ اعتراض نہیں۔ بلکہ طبعی ترتیب یہی تھی۔ کہ ابراہیم کا ذکر کیا جاتا۔ اور یہ ترتیب دو وجوہ سے اختیار کی گئی ہے۔

اوّل یہ بتلانے کے لئے کہ بانیٔ سلسلہ موسویہ یا اسرائیلی شرک کا دشمن تھا۔ پھر اُس کی نسل کا ایک فرد شرک کا قائم کرنے والا کس طرح ہو سکتا ہے۔

دوم یہ بتلانے کے لئے کہ ابراہیمؑ نے دو بیٹوں کے متعلق خبر دی تھی۔ ایک اسحاق کی جس میں سے موسیٰؑ نے سلسلہ کی بنیاد رکھی دوسرے اسمٰعیل کی۔ موسوی سلسلہ کو کبھی ختم ہونا چاہیئے تھا تاکہ اسمٰعیلی سلسلہ کے وعدے شروع ہوتے۔ پس مسیح کی آمد سے جو بغیر باپ کے تھا اسرائیلی سلسلہ ختم ہوا تاکہ اسمٰعیلی سلسلہ شروع ہو۔ اسی وجہ سے اس سورۃ میں پہلے زکریا کا ذکر کیا جو مسیح کے لئے بطور ارہاص آنے والے وجود کے والد تھے۔ پھر حضرت یحییٰ کا ذکر کیا کیونکہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص آئے تھے۔ پھر مسیح کا ذکر کیا اور اسبات کے دلائل دیئے کہ وہ خدا تعالیٰ کی توحید کے قائل تھے۔ اس کے بعد ابراہیم کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب مسیحیت ایک شاخ ہے ابراہیمی سلسلہ کی تو تم سوچو کہ کیا یہ شرک کی تعلیم جڑ میں بھی پائی جاتی تھی یا نہیں جب ابراہیمؑ جس کی تم ایک شاخ ہو موحد تھا تو اس کی نسل کا ایک فرد شرک کو قائم کرنے والا کس طرح ہو گیا۔ اس کے بعد اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ وعدے جو اسحاق کے ساتھ کئے گئے تھے پورے ہو گئے اور تمہارا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہم تمہیں اُن وعدوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کے متعلق کئے گئے تھے اور تمہیں بتلاتے ہیں

کہ اُنہی وعدوں کے مطابق اسمٰعیل کی نسل میں سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آگئے ہیں پھر تمہیں اُن پر کیا اعتراض ہے۔ اگر اُوپر کا مضمون مدنظر نہ ہوتا تو اس ترتیب کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ کیونکہ مسیحؑ کے بعد ابراہیمؑ نہ تھے اور موسیٰؑ کے بعد اسمٰعیل نہ تھے۔ پس مسیح کے بعد ابراہیم پھر موسیٰ اور پھر اسمٰعیل کی طرف چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ اس جگہ وہی مضمون مراد ہے جو میں نے بیان کیا ہے دوسرا کوئی مضمون اس جگہ مراد نہیں۔ انبیاء کی ترتیب کے بارہ میں یہ وہ علم ہے جو خدا تعالےٰ نے صرف مجھے ہی عطا فرمایا ہے چنانچہ تیرہ سو سال میں جس قدر تفاسیر لکھی گئی ہیں اُن میں سے کسی تفسیر میں بھی یہ مضمون بیان نہیں کیا گیا اور کوئی نہیں بتاتا کہ نبیوں کا ذکر کرتے وقت یہ عجیب ترتیب کیوں اختیار کی گئی ہے۔ صرف مجھ پر خدا تعالیٰ نے اِس نکتہ کو کھولا ہے جس سے اس ترتیب کی حکمت اور اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

بائیبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ابرام آتا ہے اور لکھا ہے کہ

"جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔ تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا۔ تب ابرام مُنہ کے بل گرا اور خدا اُس سے ہمکلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تُو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا۔ کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱ تا ۵)

انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں لکھا ہے کہ ابراہام کے کوئی معنے نہیں۔ صرف ضلع جگت کے طور پر ابرام کو ابراہام کہہ دیا گیا ہے۔ ضلع جگت کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک لفظ سُنکر اُسی کے مشابہ کوئی اور لفظ اُس سے نکال لیا جائے۔ مثلاً تاش کا ایک پتّہ اینٹ ہوتا ہے اور ایک پتّے کا نام پان ہوتا ہے۔ فرض کرو دو شخص آپس میں تاش کھیل رہے ہیں اور ایک اینٹ کا پتہ پھینکتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے "گلوری کھائیں گے" اور یہ کہہ کر وہ پان کا پتہ پھینک دیتا ہے اِس کو ضلع جگت کہیں گے یعنی لفظ سے لفظ کی طرف اشارہ کرنا۔ یعنی وہ پان کے پتہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اِسی کے مشابہ ایک اور لفظ اس سے نکال لیتا ہے اور کہتا ہے "گلوری کھائیں گے"۔ اِسی طرح انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا والا لکھتا ہے کہ ابرام سے ابراہام بھی ضلع جگت کے طور پر کر دیا گیا ہے پہلے ابرام نام تھا پھر کہہ دیا کہ اب چونکہ تُو بڑا ہوگیا ہے اِس لئے تُو ابرام نہیں بلکہ ابراہام ہوگا ورنہ اس کے معنے کوئی نہیں مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی اور عبرانی زبانیں آپس میں بہت حد تک ملتی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ عبرانی زبان کئی سو سال تک بولی نہیں گئی اور بوجہ اس کے کہ وہ بولی نہیں گئی لوگ اس زبان کی باریکیاں بھول گئے ہیں۔ لیکن عربی زبان ہمیشہ بولی جاتی رہی ہے اور اس وجہ سے عربی زبان کے الفاظ کی باریکیاں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اگر لوگ عبرانی کو نہ بھولتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ عبرانی زبان عربی میں سے ہی نکلی ہوئی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو کہ عبرانی زبان عربی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مثلاً حضرت مسیحؑ کا یہ فقرہ کہ ایلی ایلی لما سبقتانی۔ یہ عربی سے کتنا مشابہ ہے سبقتنی عربی زبان کا لفظ ہے جسے عبرانی میں

ذرا لمبا کر کے سبقتانی بنا دیا گیا ہے اور ایل بھی عربی زبان کا ہی لفظ ہے جو خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ہلمّا دراصل لِمَ ہے۔ پس جبکہ عربی اور عبرانی آپس میں اتنی ملتی ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ آیا عربی زبان میں بھی اس کے کوئی معنے پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں اَبْرَمَ کے معنے بات کو پکا کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اَبْرَمَ الْكَلَامَ کے معنے ہوتے ہیں اَحْكَمَهٗ اُس نے کلام کو خوب پکا کیا۔ اور اَبْرَمَ عَلَيْهِ فِي الْجِدَالِ کے معنے ہوتے ہیں اَنَّهٗ قَاصِدًا اِفْحَامَهٗ اس نے بات کو خوب پکا کیا اور نہایت عمدگی سے بحث کی۔ جس میں اُس نے غرض یہ رکھی کہ دوسرا سمجھ جائے یعنی اُس کا مقصد اسکاتِ خصم نہیں تھا بلکہ اُسے سمجھانا مراد تھا۔ پس ابرام کے معنے ہوئے ایسی عمدہ بات کرنے والا اور ایسی اچھی بحث کرنے والا جو دوسرے کو اپنا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھا دے اور اُسے ساکت کر دے۔

اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے انبیاء کے جو نام رکھے جاتے ہیں۔ وہ اُن کی آئندہ زندگی کے کاموں کی طرف اشارہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نام رکھنے والے مومن نہیں ہوتے جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھا بلکہ آپ کے دادا نے رکھا اور آپ کی والدہ نے اس نام کو پسند کیا۔ لیکن اُن کی زبانوں پر اللہ تعالےٰ نے تصرف کیا۔ اور اُس نے اُن سے وہی نام رکھوایا جو پیشگوئیوں میں موجود تھا۔ یہی حال دوسرے نبیوں کے ناموں کا ہے۔ مثلاً اسحاق ضحک سے ہے اِس میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ بڑا ہنسوڑ اور خوش مزاج ہوگا۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو "سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے۔" (پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۲)
یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس نام کا ہنسنے کے ساتھ تعلق ہے لیکن چونکہ بائبل کے لکھنے والے لغت کے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے اضحاک کی بجائے اضحاق لکھ دیا لیکن عربی میں وہی معرّب کر کے استعمال ہو گیا۔

اِسی طرح اسمٰعیل سَمِعَ سے ہے۔ اِس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا اُس کی دعا کو سُنیگا۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل نے پَیر مارے اور چشمہ پھوٹ پڑا۔ اب بظاہر یہ ویسے ہی نام تھے جیسے اور لوگوں کے نام ہوتے ہیں مگر یہ وہ نام تھے جو الہاماً رکھے گئے اور خاص مقصد اور مدعا کے ماتحت رکھے گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بے شک الہام سے نہیں رکھا گیا۔ ماں باپ نے آپ کا نام رکھا تھا۔ مگر اُن کی زبانوں پر خدا نے تصرف کیا اور اُس نے اُن سے وہی نام رکھوایا جس کا پیشگوئیوں میں ذکر آتا تھا۔ اِسی طرح ابراہیم کا باپ یا چچا بے شک مشرک تھا مگر جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نام الٰہی تصرف کے ماتحت رکھا گیا اسی طرح خدا تعالےٰ نے ابراہیم کے باپ کی زبان پر بھی تصرف کیا اور اس نے وہی نام رکھا جو انکی آئندہ زندگی کا ایک اجمالی نقشہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں پیدا ہوئے تھے جو عرب کا ایک حصہ ہے اور وہاں عربی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ عبرانی تو عربی سے بگڑ کر بنی ہے۔ پس خدا نے آپ کا نام آپکے باپ سے ابرام رکھوایا جس میں یہ پیشگوئی مخفی تھی۔ کہ

اللہ تعالیٰ اس شخص کو بڑی اچھی بحث کرنے کی توفیق دے گا اور صداقت کے اظہار کے لئے یہ اپنے مدمقابل کے سامنے اس عمدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرے گا کہ وہ ساکت اور لاجواب ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو واقعات بتلائے گئے ہیں اُن سے ابراہیم کی یہی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک موقعہ پر آپ نے بادشاہ سے بحث کی اور سورج کے طلوع و غروب سے استدلال کیا تو قرآن کریم کہتا ہے کہ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (بقرۃ ع۳۵) وہ کافر بادشاہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور آپ کے دلائل کا کچھ بھی جواب نہ دے سکا۔ اسی طرح ستاروں۔ چاند اور سورج کے نظام سے آپ نے خدائے قادر کی ذات پر استدلال کیا اور مشرکین کے سامنے دلیلیں دیں تو وہ گھبرا اُٹھے۔ بُت توڑے تو ایسی دلیلیں دیں کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس شخص نے ہمارے مذہب کا ستیاناس کر دیا ہے۔

یہودی روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن سے ہی بڑی عمدہ بحث کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ انہی روایات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ باپ نے انہیں دوکان پر بٹھا دیا کہ اگر کوئی بُت خریدنے کے لئے آئے تو اُسے بُت دے دینا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ایک بڈھا شخص آیا اور اُس نے کہا کہ میں کوئی بُت خریدنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کونسا بُت لیں گے۔ اس نے ایک بُت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ فلاں بُت مجھے چاہیئے۔ وہ اُٹھے اور بُت لا کر اس کے سامنے رکھ دیا اور پھر پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے اُس نے کہا میری عمر ستر سال کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا یہ بُت تو ابھی کل ہی بن کر آیا ہے اور آپ ستر سال کے ہو چکے ہیں کیا اتنی بڑی عمر کے ہو کر آپ کو شرم نہیں آئے گی کہ اس بُت کے آگے سر جھکائیں جو ابھی کل ہی بن کر آیا ہے۔ اُس بڈھے پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اس بُت کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جب اُن کے بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے باپ سے شکایت کی کہ یہ تو ہمارے کاروبار کو خراب کرتا ہے۔ باپ نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے یہ بُت تو ابھی کل بن کر آیا تھا۔ کیا وہ بڈھا اس بت کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اچھا لگ سکتا تھا؟ تو صداقت کی تائید کے لئے دلائل پیش کرنا اور اپنے مخالف سے نہایت عمدہ بحث کرنا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا ایک نمایاں وصف ہے۔ قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور بائبل پڑھ کر دیکھ لو تو اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ اعلیٰ درجہ کی بحث کرنے والا تھا اور وہ اپنے مخالف کو چُپ کرا دیتا تھا۔ پس ابراہیم بے معنی نام نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بڑی عمدہ بحث کرنے والا ہو گا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے دلائل پیش کرنے والا ہو گا اور ایسی باتیں کریگا جن سے دوسرا شخص حقیقت کو سمجھ جائے گا جیسے اُس بڈھے سے آپ نے گفتگو کی تو پھر وہ ٹھہرا نہیں بلکہ اسی وقت بُت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور اُس نے سمجھ لیا کہ میرا اس کے آگے سر جھکانا درست نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عبرانی زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہوں گے اور خدا تعالیٰ نے ابرام اسی لئے اُن کا نام رکھوایا تاکہ یہ بتائے کہ یہ بڑی بحث کرنے والا ہو گا۔ مگر عبرانی زبان کا علم کم ہو جانے کی وجہ سے اسرائیلی علماء کو دھوکا لگا اور انہوں نے خیال کر لیا کہ یہ بے معنی لفظ ہے حالانکہ ابرام سے ابراہام میں تبدیلی کی وجہ خود بائبل نے بھی بتا دی ہے

کہ چونکہ تُو "بہت قوموں کا باپ" ہوگا۔ اِس لئے آئندہ تیرا نام ابرام ایک فرد نہیں ہوگا بلکہ ابراہام ہوگا اور یہ عبرانی کا قاعدہ ہے کہ ھا لگانے سے جمع بن جاتی ہے۔ گویا وہ ایک فرد نہ رہا بلکہ بہت سے افراد کا مجموعہ ہو گیا۔ قرآن کریم نے بھی فرمایا ہے کہ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً (النحل ع ۱۶) ابراہیم ایک اُمّت تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ وہ ابرام سے ابراہام بن گیا تھا۔ گویا جو بات قرآن کریم نے بیان کی ہے وہی بات بائبل بھی بیان کرتی ہے۔ مگر یہ جاہل لوگ جن کی زبان مٹ چکی ہے کہتے ہیں کہ ابرام کو ابراہام محض قافیہ بندی کے طور پر کہہ دیا گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ذو معانی لفظ ہے اور بہت بڑی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ تو ایک مشرک نے نام رکھا تھا یہ کوئی دلیل نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خدا نے نہیں رکھا۔ لیکن اُس نے نام رکھنے والوں کی زبانوں پر تصرّف کر دیا۔ اور جب کوئی سچے مذہب کو نہ مانے اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ ہر چیز خدا تعالےٰ کے تصرّف کے ماتحت ہے۔ اگر درخت خدا تعالےٰ کے تصرّف کے نیچے ہیں۔ اگر آم کی گٹھلی خدا تعالےٰ کے تصرّف کے نیچے ہے۔ اگر خربوزہ کی بیل خدا تعالےٰ کے تصرّف کے نیچے ہے تو ابراہیمؑ کا باپ کیوں خدا تعالےٰ کے تصرّف کے نیچے نہیں تھا اور کیوں وہ اُس سے ایسا نام نہیں رکھوا سکتا تھا جس میں ابراہیم کی آئندہ زندگی کے کارناموں کی طرف اشارہ ہوتا۔ پھر ابرام سے ابراہام اس لئے بنا کہ عبرانی زبان کا قاعدہ ہے کہ ھا لگانے سے جمع بنتی ہے اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ھا میں بھی اس کے مشابہ خصوصیت ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ھُمْ جمع کے لئے آتا ہے۔ پس یہ خیال کہ اس لفظ کے کوئی معنے نہیں اور ابرام کو ابراہام صرف ضلع جگت کے طور پر کہہ دیا گیا ہے حقیقت لغت کے نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ابراہیمؑ اُور کے رہنے والے تھے جو چلڈیا کا ایک شہر تھا یعنی وہ عراق میں پیدا ہوئے۔ اُن کی قوم ستارہ پرست تھی۔ اُن کے والد کا نام تارہ تھا۔ قرآن کریم نے سورۃ انعام ع ۹ میں اُن کا نام آزر بتایا ہے۔ لیکن یہ تعجب کی بات نہیں۔ ابراہام کو ابراہیم۔ یسوع کو عیسیٰ۔ حنوک کو ادریس اور یوحنا کو یحییٰ لکھنا اگر اعتراض کی بات نہیں تو تارہ کو آزر کہنا بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہو سکتی یہ صرف اُن کے ناموں کو عربی بنانے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ وہی نام استعمال کرتا ہے جو عربوں کی زبان سے آسانی کے ساتھ ادا ہو سکیں اور یا پھر قرآن مجید اصل نام کا ترجمہ کر لیتا ہے۔ جیسے حنوک کے جو معنے ہیں وہی معنے ادریس کے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ تارہ سے قرآن نے آزر بنا لیا ہو کیونکہ ت' ز سے بدل جاتی ہے اور قلب کے ذریعہ الف پہلے آ جاتا ہے اور اس طرح آزر بن جاتا ہے۔ ہ ادب کے لئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی زبان پر تارہ نہیں چڑھتا تھا۔ انہوں نے تارہ کو زارَ کہنا شروع کر دیا اور زارَ سے آزر بن گیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آزر اُن کے کسی اور عزیز کا نام ہو۔ بہرحال قرآن کریم چونکہ معرّب نام استعمال کرتا ہے اس لئے تارہ کی بجائے آزر ہونا کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تارہ اور آزر آپس میں معنوی اشتراک رکھتے ہوں۔ ہمیں چونکہ تارہ کے معنے معلوم نہیں اس لئے ہم اِس بارہ میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ممکن ہے اگر تحقیق کی جائے تو تارہ اور آزر آپس میں

معنوی اشتراک بھی رکھتے ہوں۔ بہرحال آزر ایک معرب
نام ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ
اُن کو اپنے والد سے اختلاف ہوا تو وہ اُسے چھوڑ کر مصر چلے گئے
اور وہاں سے پھر واپس کنعان آگئے حضرت خلیفہ اول
رضی اللہ عنہ کو اصرار تھا کہ آزر اُن کے باپ کا نہیں
بلکہ چچا کا نام تھا اور باپ فوت ہو چکا تھا۔ بعض
یہودی روایات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ
یتیم تھے۔ اَبْ کے متعلق آپ قرآن کریم سے استدلال
کرتے تھے کہ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ
ابناء یعقوب کے متعلق سورۃ بقرہ میں آتا ہے کہ جب
اُن سے پوچھا گیا کہ تم کس کی عبادت کرو گے تو انہوں
نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (بقرہ ع ۱۶)
اس میں اسمٰعیل کو بھی انہوں نے اپنا اَبْ قرار دیا ہے
حالانکہ وہ اُن کے چچا تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
عربی زبان میں اَبْ کا لفظ چچا کے لئے بھی استعمال
ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ درست ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہے؟ حضرت خلیفہ اولؓ
کے اس خیال کی بڑی بنیاد یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ
اتنا بڑا مشرک ابراہیم کا باپ کس طرح ہو گیا۔ یہ ایک
ذوقی بات ہے۔ ہو تو حرج نہیں، نہ ہو تو حرج نہیں۔
اصل میں ہمیں تاریخ پر بنیاد رکھنی چاہیئے۔ جو اس
بارہ میں زیادہ تر اُس شخص کے باپ ہونے پر ہی
دلالت کرتی ہے۔ باقی رہا نام کا سوال سو قرآن عربی
شکل میں نام دیتا ہے یا معنوں کا ترجمہ کرتا ہے پس
بائبل کے تارہ اور قرآن کے آزر کا فرق قرآن کے بیان
کو غلط نہیں بناتا کہ ہمیں ان دو کو الگ الگ ہستیاں
ثابت کرنے کی ضرورت ہو۔

ابراہیم روحانی عالم کا باپ تھا اور آئندہ اصلاح
اُس کی ذرّیت کے ساتھ خواہ جسمانی ہو خواہ روحانی
مخصوص کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ
فرماتا ہے وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ
جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ (عنکبوت ع۳)
یعنی ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کئے اور اس کی
ذرّیت میں ہم نے نبوت اور کتاب رکھ دی۔ گویا یہ وعدہ
کیا کہ آئندہ نبی ابراہیم کی اولاد میں سے آئینگے۔ بائبل
میں بھی اسحاق کے متعلق پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۵ تا ۱۸
میں وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کی نسل کو ترقی دی جائیگی۔
اور زمین کی سب قومیں اُس سے برکت پائیں گی اسی
طرح اسمٰعیل کے متعلق پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۳ و ۱۸
میں لکھا ہے۔

"اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم
پیدا کروں گا اس لئے کہ وہ تیری نسل
ہے" (آیت ۱۳)

اسی طرح لکھا ہے

"خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا
اور اُس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا
مت ڈر کیونکہ خدا نے اُس جگہ سے جہاں
لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سُن لی ہے۔
اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ
سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی
قوم بناؤں گا" (آیت ۱۸)

اس سے پتہ لگتا ہے کہ عہد صرف ایک بیٹے کے متعلق
نہیں تھا بلکہ دونوں کے متعلق تھا۔

اسی طرح پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹ تا ۲۱ میں لکھا ہے

"تب خدا نے فرمایا کہ بے شک تیری بیوی
سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا تو اُس کا نام

اضحاق رکھنا اور میں اس سے اور پھر اس کی اولاد سے اپنا عہد جو ابدی عہد ہے باندھوں گا اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سنی۔ دیکھو میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا اور اُسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اُسے بڑی قوم بناؤں گا۔ لیکن میں اپنا عہد اضحاق سے باندھوں گا جو اگلے سال اسی وقتِ معیّن پر سارہ سے پیدا ہوگا اور جب خدا ابراہام سے باتیں کر چکا تو اس کے پاس سے اوپر چلا گیا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں کے متعلق یہ عہد تھا کہ انہیں برکت دی جائے گی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا عہد پہلے اسحاق کے ذریعہ سے پورا ہوگا اور پھر اسمٰعیل کے ذریعہ سے۔

پیدائش باب ۱۷ آیت ۷، ۸ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عہد دونوں بیٹوں کے لئے تھا۔ چنانچہ لکھا ہے

"میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان اُن کی سب پشتوں کے لئے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں ان کا خدا ہوں گا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عہد صرف بنو اسحاق کے ساتھ نہیں تھا بلکہ ابراہیم کی ساری نسل اور اُن کی سب پشتوں کے ساتھ تھا۔ صرف اس قدر تصریح کر دی گئی تھی کہ اس کے وعدے پہلے بنو اسحاق کے ساتھ پورے ہوں گے اور پھر بنو اسمٰعیل کے ساتھ۔ پس موسٰی کا سلسلہ کبھی ختم ہونا چاہیئے تھا۔ تاکہ بنو اسمٰعیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے تھے وہ بھی پورے ہوتے۔

اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں تجھکو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا ملک دوں گا۔ اگر کنعان کی حکومت کبھی مسلمانوں کے پاس نہ آئی ہوتی تو عیسائی کہہ سکتے تھے کہ اسحاق کی نسل کو تو کنعان کی حکومت ملی لیکن مسلمان اس سے محروم رہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کنعان جتنا عرصہ مسلمانوں کے پاس رہا ہے۔ اُس سے کم عرصہ یہود کے پاس رہا ہے۔ فلسطین پر یہود کا موجودہ قبضہ ۱۳۶۷ھ میں ہوا ہے سلسلہ ہجری میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تھا اور اُسوقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمان اس پر قابض رہے ہیں۔ صرف حروب صلیبیہ کے زمانہ میں باون سال عیسائی پھر اُس پر قابض ہو گئے تھے بہرحال دو سو آٹھ سال اگر نکال بھی دیئے جائیں تو ۱۲۵۹ سال مسلمان کنعان پر قابض رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں موسٰیؑ سے مسیحؑ تک کا زمانہ بھی تیرہ سو سال ہے۔ لیکن اس عرصہ میں یہود دو سو سال بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ کنعان کی حکومت سے محروم رہے ہیں۔ ۷۲۳ قبل مسیح میں اسورین حکومت نے فلسطین کو فتح کیا اور یہود کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ اس کے بعد ۶۰۸ قبل مسیح میں ایک مصری بادشاہ "نیکو" نے اسوریوں کو شکست دی اور یہود اسوریوں کی بجائے مصریوں کے باجگذار بن گئے۔

۵۸۷ قبل مسیح میں شاہ بابل بنوکدنضر نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اُس نے یہود کو جلاوطن کر دیا۔ یہی عرصہ ایک سو چھیالیس سال بن جاتا ہے۔ پھر ستر سال کے قریب وہ عرصہ ہے جس میں یہود جلاوطن رہے اور جس کے بعد میڈ اور فارس کے بادشاہ نے انہیں واپس یروشلم جانے کی اجازت دی گویا یہود ۱۴۰۸ سال کنعان پر قابض رہے اور مسلمان ۱۲۹۵ سال قابض رہے۔ پس جہاں تک اس پیشگوئی کا تعلق ہے اس نے بھی بتا دیا کہ وہ ابراہیمی عہد جو اسحاق کی نسل سے پورا ہونا تھا اب ختم ہو چکا ہے اور کنعان بنو اسحاق کی بجائے خدا تعالےٰ کے سچے دین کے پیرووں کو دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ پہلے ابراہیمی دَور میں موسیٰؑ سے مسیحؑ تک وہ اس سے تھوڑا عرصہ یہود کے پاس رہا جتنا دوسرے ابراہیمی دور میں وہ مسلمانوں کے پاس رہا اور اب جو واپس ہوگا تو پھر کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مسیحؑ ابراہیمی وعدوں میں سے ایک وعدہ کی آخری کڑی تھا اور ابراہیم موحد تھا پس مسیحؑ کے ذکر کے بعد مورثِ اعلیٰ کا ذکر کیا تا بتائے کہ اس منبع سے دو دریا نکلنے تھے۔ ایک کا آخری حصہ مسیحؑ تھا۔ اس کے بعد لازماً دوسرے دریا نے اپنا بہاؤ مکمل کرنا تھا۔ پس واپس ابراہیم کا ذکر لا کر اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر کیا تا کہ بنی اسرائیل کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرے۔

میں بتا چکا ہوں کہ بائبل کے رُو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اُور میں جو چلڈیا کا ایک شہر تھا پیدا ہوئے یعنی عراق میں اُن کی پیدائش ہوئی تھی اور اُن کی قوم ستارہ پرست تھی۔ قرآن کریم کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اَب یا والد مشرک تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شرک کی بُرائی قرآن کریم کی رو سے اپنے باپ کی زندگی میں ہی ظاہر ہو گئی تھی اور وہ اُن کو نصیحت کرتے رہتے تھے نصیحت پر وہ خفا ہو گئے اور اُن کو دھمکی دی اور غصّہ کی شدت دیکھتے ہوئے نصیحت کی کہ کچھ مدت تک کہیں باہر چلے جاؤ اور میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ تا کہ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے ورنہ ممکن ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا دوں۔ اُن کی اس شدید ناراضگی کو دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس ملک سے ہجرت کر گئے۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ لُوط بھی اُن کے ساتھ گئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ جاتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ یہ وعدہ کر گئے کہ مَیں آپ کے لئے دعا کروں گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مشرک کے لئے زندگی میں دعا کرنا جائز ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ایسے مشرک کے لئے دعا کرنا جائز ہے جس پر اتمام حجت کی سند نہ ملے۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ حضرت آمنہ کو مشرکہ قرار دیا ہے لیکن آپ نے اُن کے لئے دعا بھی کی۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۵۵) وہاں سے جانے کے بعد اُن کے گھر میں اولاد پیدا ہوئی۔ پہلے اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ بائبل کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد آزر کلدی سے ہجرت کر کے اور ابراہیم اور لوط کو ساتھ لے کر حران نامی جگہ چلے گئے تھے۔ گویا قرآن کریم تو یہ بتاتا ہے کہ جہاں اُن کے والد تھے وہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے چلے آئے۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ اُن کے والد نے ہی وہ ملک چھوڑ دیا تھا اور اُن کا ارادہ کنعان آنے کا تھا۔ لیکن حران پہنچ کر وہ ٹھہر گئے اور وہیں مر گئے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۳۱ و ۳۲)

اِس کے بعد پیدائش باب ۱۲ میں لکھا ہے
کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم سے کہا کہ وہ اپنے باپ
اور قرابتیوں کو چھوڑ کر نکل چلے تاکہ خدا تعالیٰ تجھے
وہ ملک دکھائے جس میں تجھے رہنا ہے چنانچہ لکھا
ہے کہ حضرت ابراہیمؑ لوطؑ کو اور اپنی بیوی کو اور
نوکروں چاکروں کو لے کر وہاں سے نکلے اور کنعان
گئے جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے بتایا کہ یہاں آپ
نے رہنا ہے۔ اس کے بعد ملک میں قحط پڑا تو قحط کی
تکلیف سے بچنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ مصر چلے گئے
جہاں بعض ایسے واقعات گذرے جن کے نتیجہ میں حضرت
ہاجرہ جو آپ کی دوسری بیوی بنیں وہیں سے آپکو
ملیں اور آپ پھر واپس کنعان آ گئے۔

بائبل اپنے اس بیان میں خاموش ہے۔ کہ
ابراہیم کے والد کلدیا سے کیوں نکلے تھے؟ قرآنی بیان
سے تو پتہ لگتا ہے کہ صرف ابراہیم نکلے اور اس لئے
نکلے کہ اُن کا اپنے باپ کے مذہب اور اپنی قوم کے
مذہب سے اختلاف تھا اور یہ ایک طبعی بات ہے
سوال یہ ہے کہ ابراہیم کے والد کیوں نکلے۔ آخر ہر
کام کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ مگر بائبل یہ نہیں بتاتی
کہ ابراہیمؑ کے ساتھ اُن کے والد نے بھی کلدیہ کو
کیوں چھوڑ دیا

پھر بائبل اس پر بھی خاموش ہے کہ ابراہیمؑ
کے والد کنعان کیوں جانا چاہتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ
تو کنعان میں اس لئے گئے کہ وہ اُن کے لئے اور اُن کی
آئندہ نسل کے لئے موعود تھا۔ لیکن سوال یہ ہے
کہ وہ ملک جس کا ابراہیمؑ کے لئے وعدہ تھا اس کا
اُن کے باپ کو کیوں خیال پیدا ہوا اور وہ وہاں کس
لئے جانا چاہتے تھے؟

پھر بائبل اس بارہ میں بھی خاموش ہے
کہ جب اُن کے باپ کنعان جانے کے ارادہ سے نکلے
تھے تو حران میں کیوں ٹھہر گئے۔

پھر بائبل کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ
سے کہا کہ تُو اپنے باپ اور قبیلے کو چھوڑ کر نکل چل۔
سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ کیوں حکم
دیا؟ بائبل بھی یہی کہتی ہے کہ ماں باپ سے حسن سلوک
کرنا چاہیئے اور قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے۔ اس
میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اُنکے
والد مشرک تھے لیکن بائبل انہیں مشرک قرار نہیں
دیتی اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ
نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اپنے باپ اور قبیلے کو
چھوڑ کر نکل چل۔

پھر بائبل یہ تو کہتی ہے کہ اپنے قبیلے کو چھوڑ کر
نکل چل۔ لیکن یہ نہیں بتاتی کہ وہ قبیلہ تھا کونسا؟
بائبل کی کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ اُور کلدی
سے تارہ صرف ابراہیم اس کی بیوی اور لوط ہی کو لیکر
نکلا تھا۔ قرآنی بیان کے مطابق حضرت ابراہیم، اُنکی
بیوی اور لوط اس ہجرت میں شریک تھے اُنکا باپ
اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر سوال یہ
ہے کہ وہ قبیلہ کونسا تھا جس کو چھوڑنے کا خدا تعالیٰ
نے حکم دیا۔ قبیلہ صرف ابراہیم۔ لوط اور سارہ تھے
اور یہ کنعان جاتے وقت بھی ابراہیم کے ساتھ تھے
پھر وہ کس کو چھوڑ کر نکلا۔

پس بائبل اول تو یہی نہیں بتاتی کہ باپ جس
سے شریعت نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اُسے
خدا تعالیٰ نے چھوڑنے کا کیوں حکم دیا۔ پھر یہ نہیں بتاتی
کہ وہ قبیلہ کونسا تھا جسے چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔
صرف چار آدمی تھے جو اُور سے نکلے۔ باپ حران میں
پہنچ کر فوت ہو گیا تھا۔ پھر وہ کونسے رشتہ دار تھے

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ

(اور تو اُسوقت کو بھی یاد کر اور لوگوں کے سامنے بیان کر) جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ اے میرے باپ تو کیوں اُن (بے جان چیزوں) کی پرستش کرتا ہے جو نہ سنتی ہیں

جنہیں وہ چھوڑ کر نکلا۔

غرض بائبل کا بیان بہت مبہم ہے اور اُس کے اندر ایسی کئی باتیں پائی جاتی ہیں جو خلافِ عقل نظر آتی ہیں۔

حران شہر کلدی علاقہ اور شام کے درمیان میں تھا۔ جب چلڈیا سے چلیں تو فلسطین کی طرف راستہ میں یہ شہر آتا ہے۔ یہ بڑا بھاری شہر تھا۔ تمام تجارتی قافلے یہاں ٹھہرا کرتے تھے اور اسے تجارتی دروازہ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مذہبی سنٹر بھی تھا اور یہاں ایک بہت بڑا مندر چاند دیوتا کا تھا۔ وہ لوگ جو چاند کے پرستار تھے وہ اِس جگہ آتے اور نذرانے وغیرہ چڑھاتے تھے۔

طالمودی روایات یعنی وہ احادیث جو یہود میں پائی جاتی ہیں وہ بھی قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہیں چنانچہ طالمودی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ ابراہیمؑ کا باپ مشرک تھا۔ بلکہ طالمودی روایات بتاتی ہیں کہ وہ اتنا مشرک تھا کہ مشرکانہ عبادت گاہوں کا متولی بھی تھا۔ اسی طرح طالمودی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بُت بھی فروخت کیا کرتا تھا اور اُن سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اُس ملک کا بادشاہ بھی بُت پرست تھا اور وہ ابراہیم کو جلانے کے لئے تیار ہو گیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں تین قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل قرآنی روایات دوم بائبل کی روایات۔ سوم طالمودی روایات بائبل کی روایات اتنی مجروح اور غیر معقول ہیں کہ کوئی بات بھی یقین کے ساتھ درست نہیں کہی جاسکتی بائبل اتنا تو بتا دیتی ہے۔ کہ ابراہیم کے باپ نے بھی اپنا ملک چھوڑ دیا مگر کوئی وجہ نہیں بتاتی کہ آخر انہوں نے اپنا ملک کیوں چھوڑا۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ ابراہیمؑ نے ہجرت کی اور اس لئے کی کہ اُس کا باپ مشرک تھا۔ اس کی قوم ستارہ پرست تھی۔ اور یہ اختلاف اس قدر ترقی کر گیا کہ آخر حضرت ابراہیم ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ پھر بائبل کہتی ہے کہ تارہ نے بھی کنعان جانا چاہا۔ مگر یہ نہیں بتاتی کہ کنعان جانے کا اُسے کیوں خیال پیدا ہوا۔ پھر یہ نہیں بتاتی کہ جب کنعان جانے کے ارادہ سے نکلے تھے تو حران میں کیوں ٹھہر گئے۔ اس کے بعد یہ نہیں بتاتی کہ خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم سے جو یہ کہا کہ تو اپنے باپ اور قبیلہ کو چھوڑ کر نکل چل، تو وہ کونسا قبیلہ تھا جسے انہوں نے چھوڑا۔ لوط اور سارہ تو اُن کے ساتھ ہی رہے ہیں اور ان کے علاوہ اَور رشتہ دار ساتھ تھا نہیں۔ پھر وہ قبیلہ کونسا تھا جسے چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح بائبل یہ بھی نہیں بتاتی کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ کیوں حکم دیا کہ تو اپنے باپ کو چھوڑ دے جبکہ بائبل یہ بھی نہیں بتاتی کہ اُن کا باپ مشرک تھا۔

غرض قرآنی بیان زیادہ صحیح ہے گو اُس کا بائبل کی روایت سے اختلاف ہے۔

وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ﴿۴۳﴾

نہ دیکھتی ہیں اور نہ تیری کسی تکلیف کو دُور کرنے پر قادر ہیں ۵۳۵

۵۳۵ تفسیر:۔ فرماتا ہے ابراہیم کے ان واقعات کو یاد کرو جبکہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ تو کیوں اُس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سُنتا ہے نہ دیکھتا ہے اور نہ تیرے لئے کسی چیز کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

یٰٓاَبَتِ منادیٰ کے طور پر آتا ہے اور تاء ی کے قائم مقام ہوتی ہے گویا اَبَتِ اَبِیْ کا قائم مقام ہے۔ عرب لوگ یہ دونوں لفظ استعمال کر لیتے ہیں یعنی اَبِیْ بھی کہہ دیتے ہیں اور اَبَتِ بھی کہہ دیتے ہیں مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ۔ جو نہیں سُنتا اور نہیں دیکھتا۔

اس سے پتہ لگتا ہے کہ الٰہی صفات میں سے اہم صفات اُس کا سُننا اور دیکھنا ہے۔ باقی ساری صفات اس کے تابع ہیں۔ اگر سننے اور دیکھنے کی صفت اُس میں نہ پائی جائے تو کوئی مشاہدہ والی دلیل خدا تعالےٰ کی ہستی کے متعلق نہیں رہ جاتی۔ سب سے بڑی دلیل خدا تعالےٰ کی ہستی کے متعلق یہی ہوتی ہے کہ ہم نے خدا تعالےٰ سے دعا کی کہ خدایا ہمارا فلاں کام ہو جائے اور وہ کام ہو گیا جس سے پتہ لگ گیا کہ خدا موجود ہے۔ اگر اُس کا سننا اور دیکھنا ثابت نہ ہو تو پھر بنی نوع انسان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ کسی غیر سے دو ہی ذریعہ سے تعلق ہو سکتا ہے یا کانوں کے ذریعہ اور یا پھر آنکھوں کے ذریعہ۔ یا تو انسان دوسرے کی آواز سن کر پتہ لگا لیتا ہے کہ اُسے کوئی ضرورت درپیش ہے اور وہ اُس کی مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے اور یا پھر آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ فلاں شخص مصیبت میں گرفتار ہے اور وہ اس کی مدد کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے پس ایک تعلق رکھنے والا خدا تبھی ہو سکتا ہے جب اُس میں سننے اور دیکھنے کی صفت موجود ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو بتوں کے ناقابل پرستش ہونے کی یہی دلیل دیتے ہیں کہ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ۔ اے میرے باپ تُو کیوں اُس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سُنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ جب یہ دونوں صفات اس میں نہیں پائی جاتیں تو اس کی عبادت کرنے کا فائدہ کیا؟ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا اور نہ وہ کسی بات میں کفایت کرتا ہے مَا اَغْنٰی فُلَانٌ شَيْئًا کے معنے ہوتے ہیں لَمْ يَنْفَعْ فِيْ مُهِمٍّ وَلَمْ يَكْفِ مَؤُوْنَةً۔ کسی کام میں اُس نے نفع نہ پہنچایا اور کسی ضرورت کے موقعہ پر اس نے کفایت نہ کی۔ مثلاً اگر کسی پر قرضہ ہو اور دوسرا شخص وہ قرض اتار دے یا کوئی بیمار ہو اور دوسرا اس کے علاج کے لئے جدوجہد کرے تو وہ اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا موجب بن جاتا ہے مگر فرمایا لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا۔ یہ بُت تو وہ ہیں جو تیرے لئے کسی قسم کا بوجھ بٹانے کا موجب نہیں ہو سکتے۔ پھر ان کی عبادت کا فائدہ کیا؟

یہ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا دراصل دلیل کا ایک ٹکڑا ہے جو لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ کے ساتھ مل کر مکمل ہوتی ہے اگر کسی شخص کے کان ہوں اور وہ دوسرے کی آواز بھی سُن لے کر دوڑ وا اور مہیری

مدد کے لئے پہنچو۔ لیکن لُولا لنگڑا ہو تو خالی سُن لینا دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یا کسی نے دیکھ تو لیا کہ فلاں شخص کنوئیں میں گرنے لگا ہے۔ لیکن اتنی ہمت نہیں کہ دوڑ کر اسے بچا سکے تو اس کے دیکھنے کا کیا فائدہ۔ سننا اور دیکھنا تبھی فائدہ پہنچا سکتا ہے جب دوسرے کی مدد کرنے کی طاقت بھی موجود ہو۔ پس لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ والی دلیل لَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا کے ساتھ مل کر مکمل ہوتی ہے کیونکہ کسی کی تکلیف معلوم کرنے کے دو ہی ذرائع ہوتے ہیں۔ یا تو انسان سُن کر پتہ لگاتا ہے یا دیکھ کر پتہ لگاتا ہے۔ لیکن دیکھنا اور سُننا کافی نہیں ہوتا جتک ایسی طاقت بھی موجود نہ ہو کہ دوسرے کی مدد کا ارادہ انسان پورا کر سکے۔ جب وہ ایسا کرے تو اسکی ہستی کی زنجیر مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر فرمایا یہ بُت تو ایسے ہیں کہ نہ یہ تمہاری آواز سنتے ہیں نہ تمہاری تکلیف کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ کسی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں پھر ان کی عبادت کرنا کتنی بڑی حماقت کی بات ہے۔

یہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ کیوں نہیں سنتے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ سنتے ہیں۔ کیوں نہیں دیکھتے ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ دیکھتے ہیں۔ اگر یہ بُت دیکھنے اور سننے نہیں تو تمہارے خدا کے دیکھنے اور سننے کا کیا ثبوت ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے خدا کے سُننے کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اُسے پکارتے ہیں تو وہ ہمیں جواب دیتا ہے اور اس کے دیکھنے کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ ہماری مدد کرتا ہے پس اس کا ہماری مدد کرنا اور ضروریات کو پورا کرنا ثبوت ہے۔ اس کے سمع اور بصر کا۔ لیکن بُت چونکہ کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے اور وہ کسی تکلیف کے موقعہ پر انسان کی مدد نہیں کرتے۔ اس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ سمع اور بصر نہیں رکھتے۔ ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ اُن کے کانوں تک بات پہنچے۔ وہ اپنی آنکھوں سے کوئی نظارہ دیکھیں اور پھر مدد نہ کریں۔

حدیثوں میں آتا ہے ایک صحابی کہتے ہیں۔ میرے مسلمان ہونے کی وجہ ہی یہ ہوئی کہ ہم جاہلیت کے زمانہ میں بتوں کے اس قدر شائق ہُوا کرتے تھے کہ جب ہم گھر سے باہر کسی سفر پر جاتے تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی بُت بھی رکھ لیتے تھے تاکہ اس کی برکت سے بلائیں اور مصیبتیں ہم سے دُور رہیں۔ ایک دفعہ میں سفر پر گیا اور بُت اپنے ساتھ لے لیا۔ راستہ میں اتفاقاً مجھے کوئی کام یاد آگیا اور مَیں نے کہیں جانا چاہا۔ مگر اسباب میرے پاس بہت تھا اور کسی دوسری جگہ اُسے اُٹھا کر لے جانا میرے لئے مشکل تھا۔ مَیں نے وہیں جنگل میں اسباب رکھا۔ بُت کو پاس بٹھایا اور اُسے کہا حضور والا آپ ذرا میرے اسباب کا خیال رکھیں مَیں ایک ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں۔ چنانچہ میں اطمینان کے ساتھ خوش خوش چلا گیا کہ مَیں اپنا اسباب اللہ میاں کے سپرد کر آیا ہوں۔ واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گیدڑ ٹانگ اُٹھا کر اس بُت پر پیشاب کر رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت غصہ آیا اور مَیں نے آتے ہی اس بُت کو اٹھا کر پرے پھینک دیا اور کہا کمبخت گیدڑ کے پیشاب سے تو تُو اپنے آپکو بچا نہیں سکتا میرے اسباب کو کیا بچائیگا اُسوقت مجھے خیال آیا کہ مسلمان جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہے اور مَیں واپس آکر مسلمان ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور صحابی کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ سفر پر گئے تو میں نے خیال کیا کہ پتھر کا بُت

يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ

اے میرے باپ مجھے ایک خاص علم عطا کیا گیا ہے جو تجھے نہیں ملا

فَٱتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَٰطًا سَوِيًّا ﴿۴۴﴾

پس (باوجود اسکے کہ میں تیرا بیٹا ہوں) تو میری اتباع کر میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا ۳۶ھ

اُٹھانا تو مشکل ہوگا اسباب بھی زیادہ ہے۔ آٹے کا بُت بنا کر ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے آٹے کا بُت بنایا اور ساتھ رکھ لیا۔ اتفاقاً راستہ میں آٹا ختم ہوگیا اور کھانے کے لئے کوئی چیز نہ رہی جب سخت بھوک لگی تو اُسی بُت کو کوٹ کر ہم نے آٹا گوندھا اور روٹی پکا کر کھالی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جس خدا کو میں کھا گیا ہوں اور وہ مجھے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکا وہ کیسا خدا ہے اور میں مسلمان ہوگیا یہی حقیقت لَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا میں بیان کی گئی ہے کہ وہ کسی قسم کا تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

کوئی شخص اس پر بھی اعتراض کرسکتا ہے کہ لوگوں کی کئی خواہشات اتفاقی طور پر بھی پوری ہوجاتی ہیں پھر یہ خدا تعالےٰ کی ہستی کا ثبوت کس طرح ہُوا۔ مثلاً بعض لوگوں کے ہاں بیٹا ہوجائے تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں پیر کی قبر پر سجدہ کرنے کی وجہ سے ہُوا ہے یا فلاں جگہ چڑھاوا چڑھایا تھا تو اس کی وجہ سے یہ کام ہُوا ہے۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں اور یہ تینوں باتیں آپس میں جوڑ رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر دلیل بنتی ہیں یعنی سمع اور بصر اور اغنا۔ جب یہ تینوں چیزیں ملتی ہیں تب دلیل مکمل ہوتی ہے اور جب یہ زنجیر مکمل ہوجائے تو اس کے بعد کوئی کام نہ اتفاقی قرار پا سکتا ہے اور نہ کسی بُت وغیرہ کی طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کام کے متعلق دعائیں کی گئی ہیں اور پھر کوئی نتیجہ برآمد ہُوا ہے تو ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ کام خدا نے کیا ہے۔ لیکن اگر دعائیں نہیں کی گئیں اور وہ کوئی غیر معمولی کام بھی نہیں تو وہ خدا تعالےٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دنیا میں کچھ نہ کچھ کام اتفاقی بھی ہُوا کرتے ہیں۔

۳۶ھ حل لغات:۔ سَوِيًّا کے معنے اَلْاِسْتِوَاءُ وَالْاِنْصَافُ کے بھی ہیں یعنی کسی چیز کا توازن ٹھیک ہونا۔ اور اس کے معنے مستوی کے بھی ہیں یعنی جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔

تفسیر:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا۔ اے میرے باپ مجھے یقیناً خدا تعالےٰ کی طرف سے اُس قسم کا علم ملا ہے جو تجھ کو نہیں ملا پس تُو میری اتباع کر میں تجھے ایک ایسا رستہ دکھاؤں گا جس میں نہ زیادتی پائی جاتی ہے نہ کمی۔ نہ افراط ہے نہ تفریط۔

میں سمجھتا ہوں سب سے بڑا ابتلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہی تھا کہ باپ کہہ لو یا چچا کہہ لو جو بھی وجود تھا بہرحال وہ اُن کو پالنے والا تھا اُسے جا کر آپ کو یہ کہنا پڑا کہ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ اور دعویٰ کرنا پڑا کہ

يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ

اے میرے باپ شیطان کی عبادت نہ کر۔ شیطان یقیناً

كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۵﴾

(خدائے) رحمٰن کا نافرمان ہے ۵۳۷

مجھے وہ علم حاصل ہے جو آپ کو حاصل نہیں۔ اپنے بڑوں کے سامنے بات کرنی بڑی دوبھر ہوتی ہے پس میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بڑے ابتلاؤں میں سے ایک ابتلاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے زمانہ میں مبعوث کیا جب انکو پالنے والا باپ جننے والا باپ موجود تھا اور اُسے بتانا پڑا کہ تمہاری غلطی ہے اور کہنا پڑا کہ

فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔

آج سے میں تمہارا روحانی باپ ہوں اور تم میری روحانی اولاد ہو۔ بچے تو بعض دفعہ بیوقوفی سے ایسی بات کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ میرے نواسے کبھی میرے پاس آجائیں تو میں پیار سے اپنی لڑکی کو پکڑ کر اُن سے کہتا ہوں یہ میری بیٹی ہے۔ اس پر وہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کہہ دیتے ہیں یہ میری بیٹی ہے۔ پس بچے تو بعض دفعہ بیوقوفی سے ایسی بات کہہ دیتے ہیں لیکن ایک جوان اور بالغ مرد کا جا کر کہنا کہ والد صاحب آج سے آپ والد نہیں رہے ہیں میں آپ کا والد بن گیا ہوں آپ کی تربیت کا وقت گذر چکا۔ اب میں آپ کی غلطیاں نکالوں گا آپ میری غلطیاں نہیں نکال سکتے۔ یہ زبان سے کہنا بڑا مشکل کام ہے۔

۵۳۷ حل لغات:۔ لَا تَعْبُدْ نہی کا صیغہ ہے جو عَبَدَ سے بنا ہے اور عَبَدَ اللّٰہَ کے معنے ہیں طَاعَ لَهٗ وَخَضَعَ وَذَلَّ۔ وَخَدَمَهٗ یعنی اللہ کی اطاعت کی، اس کی فرمانبرداری کی (اقرب) پس لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ کے معنے ہونگے تو شیطان کی فرمانبرداری نہ کر۔

تفسیر:۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ۔ تو شیطان کی عبادت نہ کر۔ حالانکہ شیطان کی عبادت دنیا میں کوئی نہیں کرتا۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ عبادت خالی سجدہ کرنے کا نام نہیں بلکہ کسی کی بات کو بلا دلیل پورے طور پر ماننا بھی عبادت ہی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے بُرے ساتھیوں کی بات اس طرح مانتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتا تو وہ بھی مشرک ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے نفس کی بات اس طرح مانتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتا تو وہ بھی مشرک ہے ابراہیمؑ کا باپ آخر شیطان کو نہیں پوجتا تھا۔ بلکہ بتوں کو پوجتا تھا۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ جنکی تو پوجا کرتا ہے یہ شیطان ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی کی اگر خلافِ عقل اتباع ہو تو وہ بھی شیطان کی ہی عبادت ہوتی ہے۔ خواہ یہ شیطان نفس کی صورت میں ہو خواہ بُرے ساتھیوں کی صورت میں ہو اور خواہ بدارواح کی صورت میں ہو۔ شیطان انسان کا نفس بھی ہوتا ہے اور شیطان انسان کے بُرے ساتھی اور دوست بھی ہوتے ہیں اور شیطان وہ بدروحیں بھی ہوتی ہیں جو بدی کا عادی ہو جانے کے بعد انسان پر غالب آجاتی ہیں۔ اور اُسے بُری باتیں سکھاتی ہیں۔ جس وقت انسان

يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ

اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے (خدائے) رحمٰن کی طرف سے (نافرمانی کی وجہ سے)

الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ۝٤٦

کوئی عذاب نہ پہنچے جس کے نتیجہ میں تو شیطان کا دوست ہو جائے ۵۳۸

اپنے نفس کے بُرے مشوروں پر جرح کرنا چھوڑ دے، جس وقت انسان اپنے دوستوں کی بری باتوں پر تنقید کرنا چھوڑ دے جس وقت انسان اپنی بداعمالی سے ایسے گند میں جا پڑے کہ شیطانی روحوں کا اس کے ساتھ واسطہ ہو جائے تو اس وقت قرآنی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان کی عبادت کر رہا ہے۔ درحقیقت بلا وجہ تنقید چھوڑ دینا اور بُری باتوں کو قبول کرتے جانا بھی ایک رنگ کی عبادت ہی ہے پس لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَٰنَ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے بُری باتیں آتی ہیں اور وہ اُن پر تنقید نہیں کرتا مُان پر جرح قدح نہیں کرتا اور بغیر جرح اور بغیر غور اور بغیر فکر کے اُن کو قبول کر لیتا ہے تو درحقیقت وہ اُنکو خدا کا مقام دیتا ہے کیونکہ خدا کا مقام ہی ایسا ہے جس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال جب یہ ثابت ہو جائے کہ خدا ہے تو بلا چون و چرا اُس کی بات ماننی ضروری ہوتی ہے لیکن جب کوئی ہستی خدا ثابت نہ ہو یا خدا کی قائمقام ثابت نہ ہو تو اس وقت ہر بات جرح کرکے ماننی چاہیئے۔

إِنَّ الشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ اس جگہ بُت مراد نہیں۔ کیا تم نے کبھی پتھروں کو دیکھا کہ وہ خدا تعالےٰ کی رحمانیت کا انکار کر رہے ہوں پتھروں نے خدا تعالےٰ کی رحمانیت کا کیا انکار کرنا ہے وہ تو بے جان چیزیں ہیں پس یہ الفاظ بھی اِسبات کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ یہاں بُت مراد نہیں۔ فرماتا ہے شیطان رحمٰن کی نافرمانی ہی کیا کرتا ہے۔

عَصِيًّا کے معنے عاصی اور گنہگار کے ہیں۔ عَصٰی کا فاعل عَاصِیْ بھی آجاتا ہے اور بعض دفعہ فَعِيْلٌ کے وزن پر عَصِيًّ بھی آجاتا ہے۔

اگر بُت مراد لئے جائیں تو اس آیت کا یہ ترجمہ ہوگا کہ بُت خدا تعالیٰ کے نافرمان ہیں حالانکہ بُت نافرمان ہیں ہی نہیں۔ وہ بے جان چیزیں ہیں انہیں تو اتنا بھی پتہ نہیں کہ انہیں کسی نے پاخانہ میں ڈال دیا ہے یا کوئی شخص اُن کے آگے جھک کر سجدہ کر رہا ہے پس عَصِيًّا نے اس بات کو حل کر دیا کہ تَعْبُدِ الشَّيْطَٰنَ سے بلا دیل بات مان لینا مراد ہے بُت مراد نہیں۔

۵۳۸ تفسیر:- اس جگہ اللہ تعالےٰ نے عذاب کے لئے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ عذاب نازل کرنا خدائے رحمٰن کا کام نہیں۔ عذاب نازل کرنیوالی خدا تعالےٰ کی بعض اور صفات ہیں مثلاً جبار خدا عذاب نازل کرتا ہے۔ قہار خدا عذاب نازل کرتا ہے ذوالانتقام خدا عذاب نازل کرتا ہے۔ اسی طرح بعض اور نام ہیں جو خدا تعالےٰ کی صفتِ عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور رحمٰن کے ماتحت اس کی نافرمانی

کرنے والوں پر عذاب نازل ہوتا ہے مگر یہاں رحمٰن کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ میں ڈرتا ہوں کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھے عذاب نہ پہنچ جائے۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر عذاب کی صفت کسی نہ کسی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی رحیمیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی مالکیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی صفتِ حیاؔ کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی صفتِ اِغنا کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ غرض عذاب کی صفات مستقل نہیں۔ یعنی آپ ہی آپ بلا وجہ عذاب کی صفت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ کسی نیک صفت کے انکار یا اس کے ردّ کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر عذاب کی صفت کو ہم مستقل سمجھیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہمارا خدا نعوذ باللہ ظالم ہے اور آپ ہی آپ اس کا دل چاہتا ہے کہ میں لوگوں کو پیس ڈالوں، ان پر عذاب نازل کروں اور انہیں تباہ اور برباد کردوں اور یہ جابرانہ اور ظالمانہ طریق ہے جو خدا تعالیٰ جیسی رحیم و کریم ہستی کے بالکل منافی ہے۔ پس جبکہ اسکی سزا والی صفات صفاتِ مستقلہ نہیں بلکہ کسی دوسری صفت کی مناسبت سے ظاہر ہوتی ہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کی صفتِ عذاب کبھی رحمانیت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی رحیمیت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی غفاریت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی ستاریت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی خدا تعالیٰ کی صفتِ ستار ایک انسان کے عیبوں کو چھپاتی چلی جاتی ہے مگر وہ پھر بھی باز نہیں آتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ اب اس پر عذاب تو آیا مگر خدا تعالیٰ کی صفتِ ستاری کی وجہ سے۔ کبھی وہ ایک شخص کو رزق دیتا چلا جاتا ہے۔ مگر باوجود کثرتِ رزق کے وہ نافرمانی میں بڑھتا چلا جاتا ہے جب خدا تعالیٰ اُسکی متواتر نافرمانیوں کو دیکھتا ہے تو اُس پر عذاب نازل کرتا ہے۔ اب اس پر عذاب تو آیا مگر صفتِ رزاقی کی وجہ سے۔ جب اس نے خدا تعالیٰ کی اس صفت کی ہتک کی تو اُس پر عذاب آ گیا۔ پس اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ کے یہ معنے ہیں کہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر وہ عذاب نازل نہ ہو جو رحمانیت کی صفت کی وجہ سے نازل ہوتا ہے۔ تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا پتھروں کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا آگ کا۔ تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا ہوا کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا پانی کا، اور یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمانیت کی وجہ سے تم کو دیں۔ مگر انہی چیزوں کو تم نے اس کا شریک بنا لیا۔

دنیا میں جس قدر بُت پائے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے رحمانیت کے ماتحت آتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے بھیجا اور اس لئے بھیجا کہ وہ اُس کے بندوں کی خدمت کریں۔ مگر لوگوں نے انہی کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ تو شرک ہمیشہ رحمانیت کی صفت کے انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے ہندو اور عیسائی خدا تعالیٰ کو رحمٰن نہیں مانتے۔ ہندوؤں نے جب اپنی تعلیم پر غور کیا تو انہیں ماننا پڑا کہ خدا روح اور مادہ کا خالق نہیں۔ اگر وہ اسے خالق مانیں تو ساتھ ہی اُسے رحمٰن بھی ماننا پڑے گا اور رحمان

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ

اس پر (ابراہیم کے باپ نے) کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے متنفر ہو رہا ہے؟

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۷﴾

اے ابراہیم اگر تو باز نہ آئیگا تو میں تجھے ضرور سنگسار کردونگا اور (بہتر ہے کہ) تو کچھ دیر کیلئے میری نظروں سے اوجھل ہو جا (تاکہ غصہ میں آکر ...)

ماننے سے ہندو مذہب ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عیسائی خدا تعالےٰ کو رحمٰن مانیں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ اُس کی طرف سے ہدایت آئے اور جب شریعت لعنت نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے انسان نجات پا سکتا ہے تو کفارہ کا انکار کرنا پڑا۔ کفارہ کے انکار سے مسیح کی الوہیت ختم ہوگئی اور جب مسیح کی ابنیت ختم ہوگئی تو عیسائیت بھی فنا ہوگئی۔ پس شرک میں سب سے بڑا انکار خدا تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کا ہی کرنا پڑتا ہے اس لئے جو قومیں شرک کرتی ہیں اُنکے متعلق خدا تعالےٰ کی رحمانیت کی صفت کہتی ہے کہ میری ہتک انتہاء تک پہنچ چکی ہے اب ان پر عذاب نازل ہونا چاہیئے پس اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّکَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ کا یہ مطلب نہیں کہ رحمانیت عذاب نازل کرتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رحمانیت کی صفت اُس عذاب کا موجب ہو جاتی ہے۔

فَتَکُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا۔ پس تو شیطان کا دوست ہو جائے۔ یہ الفاظ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں شیطان سے بُت مراد نہیں کیونکر بتوں سے تو وہ پہلے ہی دوستی کر رہا تھا۔

میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ شیطان کے ساتھ تین ذرائع سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اول نفس کے ذریعہ سے یعنی نفس انسان کو گمراہ کرتا ہے اور اُس کا شیطان سے تعلق ہو جاتا ہے۔ دوسرے بُرے ساتھیوں کے ذریعہ سے اور تیسرے جب شیطان کے ساتھ براہِ راست تعلق ہو جائے تو بدارواح اس کے نفس پر پرتو ڈالتی ہیں اور اُسے گمراہی میں بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔

پہلے یہ کہا تھا کہ تو شیطان کی عبادت نہ کر۔ کیونکہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے اس کے بعد یہ کہا کہ اگر تم عبادتِ شیطان سے باز نہ آؤ گے تو خدا تعالےٰ کی رحمانیت کی صفت تم پر عذاب لانے کا موجب بن جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم شیطان کے دوست ہو جاؤ گے۔ گویا عبادتِ شیطان سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ انسان شیطان کا دوست بن جائے۔ کیونکہ پہلے صرف اتنی بات تھی کہ یہ اپنے نفس کے گمراہ کن خیالات کی وجہ سے شیطان کی بات مانتا تھا یا اپنے بُرے دوستوں کی وجہ سے شیطان کی بات مانتا تھا۔ مگر پھر ترقی کر کے اس کا شیطان سے براہِ راست تعلق ہو جاتا ہے۔ جس طرح مومنوں کا نیکیوں میں ترقی کرتے کرتے فرشتوں سے براہِ راست تعلق ہو جاتا ہے۔

۵۳۹ حل لغات:۔ رَغِبَ عَنْہُ کے معنے ہوتے ہیں اعراض کرنا یا نفرت کرنا جس طرح رَغِبَ اِلَیْہِ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف رغبت اور شوق کے ساتھ جانا۔ گویا نفرت اور اعراض کیلئے

رَغِبَ عَنْهُ کے الفاظ آتے ہیں اور کسی کی طرف شوق اور محبت کے ساتھ جانے کے لئے رَغِبَ اِلَیْہِ کے الفاظ آتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے جب یہ بات سُنی تو انہوں نے کہا کہ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰاِبْرٰهِیْمُ۔ اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ اگر تُو اس طریق سے باز نہیں آئے گا تو میں تجھے رجم کروں گا۔

رَجَمَهٗ کے معنے ہوتے ہیں (۱) رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ اُس کو پتھر مار مار کر مار دیا (۲) قَتَلَهٗ اسکو قتل کردیا۔ (۳) قَذَفَهٗ اسکو الزام یا تہمت لگائی (۴) لَعَنَهٗ اس کو لعنت کی اور اس کے لئے بددعائیں کیں۔ (۵) شَتَمَهٗ اسکو گالیاں دیں (۶) هَجَرَهٗ اس کو قطع تعلق کر لیا (۷) طَرَدَهٗ اس کو دور کر دیا (اقرب) پس لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ کے یہ معنے ہوئے کہ اگر تُو باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کر دوں گا۔ اگر تُو باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔ اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے سب میں بدنام کر دوں گا کہ یہ اپنی قوم کا مذہب نہیں مانتا۔ یا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں لوگوں کے سامنے تجھ سے نفرت کا اظہار کروں گا یا اگر تُو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے گالیاں دوں گا یا اگر تُو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا اور اپنے گھر سے نکال دوں گا۔

وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا۔ لیکن پھر بھی میں تیرا باپ ہوں۔ میرے نفس کی حالت یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے تجھے سنگسار کر دوں۔ میرا دل چاہتا ہے تجھے قتل کر دوں۔ میرا دل چاہتا ہے تجھے بدنام کروں میرا دل چاہتا ہے تجھ پر لعنتیں ڈالوں کہ معبود تجھے تباہ کر دیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھے خوب پیٹ بھر کر گالیاں دوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھے اپنے گھر سے نکال دوں۔ مگر پھر میری باپ والی محبت جوش میں آجاتی ہے۔ اس لئے میں تجھے کہتا ہوں کہ کچھ مدت کے لئے میرے سامنے سے ہٹ جا۔ تاکہ میرا غصہ دور ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ میں کوئی حرکت کر بیٹھوں اور تجھے نقصان پہنچ جائے۔

تفسیر:۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ جب کوئی شخص غلطی سے یا اپنے ماں باپ کی سنی سُنائی باتوں کی وجہ سے کوئی ایسی بات ماننے لگ جائے جو خلافِ حقیقت ہوتی ہے تو اس کے انکار پر بھی اُسے غیرت آجاتی ہے۔ لیکن جب انکار دلیل اور عقل کے ماتحت ہوتا ہے۔ تو غیرت بھی دلیل اور عقل کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور جب غصہ دلیل اور عقل کے ماتحت نہیں ہوتا تو سلوک بھی دلیل اور عقل کے ماتحت نہیں ہوتا۔ چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آپ کے مخالف آتے اور کہتے تھے کہ ہم آپ کی بات نہیں مانتے۔ خود ابوجہل آپ کا قریبی رشتہ دار تھا جو آپ کا شدید ترین دشمن تھا۔ اسی طرح آپ کے بعض دوست تھے جو آپ پر ایمان نہیں لائے حکیم بن حزام آپ کا ایک بڑا گہرا دوست تھا جو مشرک تھا اور بہت بعد میں ایمان لایا۔ وہ آپ سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ ایک دفعہ وہ تجارت کے لئے شام گیا تو اُس نے ایک اعلیٰ درجے کا کوٹ دیکھا باوجود اس کے کہ وہ کافر تھا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس وقت مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے تھے پھر بھی اُس نے کہا یہ کوٹ اتنا اچھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کے جسم پر نہیں سج سکتا۔ چنانچہ وہ کوٹ خرید کر مکہ میں لایا اور پھر مکہ سے تین سو میل کا سفر کر کے مدینہ پہنچا اور آپ کی خدمت میں اُس نے

وہ کوٹ پیش کیا اور کہا کہ مجھے یہ کوٹ اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے سمجھا سوائے آپ کے اور کسی کو یہ سج نہیں سکتا۔ چنانچہ اب میں یہ کوٹ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا اِس کی کیا قیمت ہے؟ اُس نے کہا قیمت کیسی! مَیں تو محض دوستی کی خاطر لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا تمہاری دوستی کی میرے دل میں قدر تو بہت ہی مگر مَیں نے عہد کیا ہُوا ہے کہ مَیں کسی مشرک کا تحفہ قبول نہیں کروں گا۔ اب چاہو تو یہ واپس لے جاؤ اور چاہو تو قیمت لے لو۔ اس کو صدمہ تو بہت ہُوا مگر اُس نے کہا مَیں اِتنی دور سے یہ چیز آپ کے لئے خرید کر لایا تھا اور دوستی کے طور پر لایا تھا مگر آپ واپس کرتے ہیں مَیں یہ تو پسند نہیں کرتا کہ کوئی اور شخص اس کوٹ کو پہنے، آپ قیمت ہی دینا چاہتے ہیں تو دیدیں چنانچہ اُس نے قیمت لے لی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ کوٹ رکھ لیا۔ اب دیکھو دشمن آپ کے بھی تھے بلکہ ایسے ایسے دشمن تھے کہ حضرت عمرو بن العاص کہتے ہیں مَیں جن دنوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مخالف تھا اُن دنوں میرے دل میں آپ کا اتنا بغض تھا اور آپ سے مجھے اتنی شدید نفرت تھی کہ مَیں اُس بغض اور نفرت کی وجہ سے آپ کی شکل تک نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس ساری مخالفت کے باوجود جب طائف میں آپ پر پتھر پڑے تو آپ نے غصہ میں دشمن سے یہ نہیں کہا کہ لَاَ رْجُمَنَّكَ بلکہ اُس وقت جب دشمن پتھر مار رہا تھا خدا تعالےٰ کا ایک فرشتہ ظاہر ہُوا اور اُس نے کہا خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں اِس قوم پر عذاب نازل کروں۔ سامنے پہاڑی تھی فرشتہ نے اس پہاڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا خدا نے مجھے کہا ہے کہ مَیں یہ پہاڑی اِن پر اُلٹا دُوں اور زلزلہ سے انہیں تباہ کر دُوں۔ آپ نے فرمایا۔ نہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اگر تم اِن لوگوں کو تباہ کر دوگے تو مجھ پر ایمان کون لائے گا۔ پھر آپ نے دعا کی اور فرمایا اے میرے خدا میری قوم جانتی نہیں کہ مَیں کون ہوں اس لئے میرا انکار کر رہی ہے تُو اِن کی خطاؤں کو معاف فرما اور ان کی غلطیوں سے درگذر کر۔

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جس عقیدہ پر قائم تھے چونکہ اس کی دلیل آپ کے پاس موجود تھی اس لئے آپ کو اگر غصہ بھی آتا تھا تو اس کی بھی دلیل ہوتی تھی اور اگر درگذر فرماتے تھے تو اس کی بھی دلیل ہوتی تھی۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے پاس چونکہ دلیل تھی اُن کا غصہ بھی دلیل کے ماتحت تھا اور ابراہیمؑ کے باپ کے پاس چونکہ دلیل نہیں تھی اس لئے اس کا غصہ بھی بے دلیل تھا۔ آخر ابراہیمؑ نے اُسے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا کہ یہ باتیں اچھی نہیں بُری ہیں۔ آخر کسی بات کو بلا دلیل آپ کیوں مانتے ہیں۔ جس چیز کو بھی مانیں اس پر ماننے سے پہلے جرح کریں، تنقید کریں، غور و فکر کریں اور پھر اُسے قبول کریں۔ یہ تو شرک ہی کہ انسان بغیر کسی دلیل کے دوسرے کی بات مان لے۔ اس پر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کل کا بچہ مجھے آج سمجھانے لگا ہے مگر اس کے طیش کی یہ حالت ہے کہ وہ کہتا ہے۔ مَیں تجھے مار ڈالوں گا۔ مَیں تجھ پر پتھراؤ کروں گا۔ مَیں تجھ پر لعنتیں ڈالوں گا۔ مَیں تجھے گالیاں دُوں گا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ

(اس پر ابراہیم نے) کہا اچھا میری طرف سے تجھ پر ہمیشہ سلامتی کی دعا پہنچتی رہے (یعنی میں تجھ سے الگ ہو جاتا ہوں) میں اپنے رب سے

اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۸﴾

تیرے لئے ضرور مغفرت کی دعا کروں گا وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے ۵۴۰

میں تجھے لوگوں میں بدنام کروں گا، میں تجھ سے قطع تعلق کروں گا، میں تجھے اپنے گھر سے نکال دُوں گا۔ مگر اس قدر طیش اور غضب کے باوجود وہ آج کل کے مولویوں سے پھر بھی اچھا تھا کیونکہ غصہ آیا تو ساتھ ہی یہ بھی خیال آگیا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور اُسے کہا کہ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جا ایسا نہ ہو کہ میں تجھے کوئی نقصان پہنچا دُوں۔ لیکن پنجاب کی ۱۹۵۳ء والی شورش میں مولویوں نے احمدیوں کو تلاش کر کر کے مارا ہے۔ ابراہیمؑ کا باپ مشرک تھا جس کے لئے خدا تعالیٰ نے دعا سے بھی منع کر دیا۔ مگر وہ کہتا ہے مجھے غصہ آگیا ہے۔ میرا نفس اس وقت قابو میں نہیں تُو تھوڑی دیر کیلئے میرے سامنے سے ہٹ جا۔ لیکن اس فتنہ و فساد کے دنوں میں مولویوں نے لوگوں سے یہ کہا کہ احمدیوں کی عورتوں کو بے شک پکڑ کر لے جاؤ تم پر کوئی گناہ نہیں

غرض ابراہیم کے باپ نے تو غصہ کی حالت میں ذرا سوچنے کی مہلت چاہی مگر بعض بڑے علماء نے ۱۹۵۳ء میں سوچنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔

مَلِيًّا کے معنے عربی زبان میں لمبے زمانہ کے ہوتے ہیں مگر لمبے زمانہ کو مراد صدی دو صدی نہیں کیونکہ عربی کا محاورہ ہے کہتے ہیں مَرَّ مَلِیٌّ مِّنَ الَّیْلِ۔ رات میں سے ایک ملی گذر گئی ہے۔ گویا اگر بارہ گھنٹے کی رات ہو اور چھ سات گھنٹے گذر جائیں تو کہیں گے کہ ایک ملی گذر گئی ہے پس وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا کے یہ معنے نہیں کہ سالوں کے لئے مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ بلکہ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ دو چار گھنٹہ کے لئے میری آنکھوں سے پرے ہو جاؤ تاکہ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔

۵۴۰ تفسیر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے کہا کہ آپ کو تو اس بات پر غصہ آیا ہوا ہے کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا لیکن میں اس بات کو دیکھ کر بھی کہ آپ میرے سچے معبود کو نہیں مانتے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ مجھے اس لئے رجم کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ مجھے اس لئے قتل کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھے اس لئے لوگوں میں بدنام کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھ پر اس لئے لعنتیں ڈالنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ مجھے اس لئے گالیاں دینا چاہتے ہیں کہ میں

آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ
مجھے اس لئے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں کہ میں
آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ
مجھے اس لئے گھر سے نکال دینا چاہتے ہیں کہ میں
آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا لیکن
اے میرے باپ آپ میرے سچے معبود کو نہیں
مانتے اور پھر بھی میں یہی کہتا ہوں کہ خدا آپ پر
رحم کرے۔ گناہ آپ نے کیا ہے لیکن میرا رب
اب بھی معاف کرنے والا ہے۔ میں آپ کیلئے
اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا۔

اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا کے معنے
ہوتے ہیں۔ اَلْعَالِمُ يَتَعَلَّمُ الشَّيْءَ
بِاسْتِقْصَاءٍ ایسا شخص جو کوشش اور جدو
جہد کے ساتھ کوئی بات نکالتا ہے اور حَفِیٌّ کے
معنے اَلْمُبَالِغُ فِي الْاِكْرَامِ وَالْبِرِّ وَالْمُظْهِرُ
السُّرُوْرِ وَالْفَرَحِ وَالْمُكْثِرُ السُّؤَالِ عَنْ
حَالِ الرَّجُلِ کے بھی ہیں یعنی ایسا شخص جو دوسرے
کی عزت اور اس کا احترام کرنے میں اور اس کے
ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنے میں کمال کر دے
اور اس کو دیکھ کر انتہا درجہ کی خوشی اور فرحت
کا اظہار کرے اور کثرت کے ساتھ پوچھے کہ آپ
کا کیا حال ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا
ہوں۔ یعنی لوگوں کی خیر خواہی میں جو شخص
انتہائی درجہ رکھتا ہو۔ اُسے حَفِیٌّ کہتے ہیں پس
اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا کے یہ معنے ہوئے کہ میرا
رب میرے اعزاز اور اکرام کے لئے بے انتہا
کوشش کرتا ہے وہ میری کامیابی کو دیکھ کر
بڑا خوش ہوتا ہے اور ہر وقت میرا حال پوچھتا رہتا
ہے اور اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ بے تاب
ہو جاتا ہے۔ جب میں اپنے اس محسن خدا کو دیکھتا
ہوں اور اس کے متعلق میرے دل میں محبت پیدا
ہوتی ہے تو ساتھ ہی مجھے خیال آتا ہے کہ اس
محبت اور حُسنِ سلوک کا ایک چھوٹا سا
نمونہ میرے ماں باپ بھی ہیں۔ پس میرا فرض
ہے کہ میں اُن سے بھی محبت کروں اور اُن سے بھی
عزت اور احترام کے ساتھ پیش آؤں۔ گویا
اس وجہ سے کہ ماں باپ مجھ سے حسن سلوک کرتے
ہیں یا ماں باپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ میرے
دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ
جب میں اپنے خدا کو دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے اتنی
محبت کرتا ہے اور میری ضروریات کا اتنا
خیال رکھتا ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہ اسی قسم کی
محبت کا ایک نمونہ میرے ماں باپ بھی ہیں پس
خدا کی محبت تقاضا کرتی ہے کہ میں اپنے ماں
باپ سے بھی محبت کروں۔ یہ تقوٰی کا کیا ہی لطیف
معیار ہے۔ بعض لوگ نیکیوں میں نیچے سے اُوپر
جاتے ہیں اور بعض اوپر سے نیچے کی طرف آتے
ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اوپر سے نیچے کی
طرف آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں میں اپنے ماں باپ
کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ
خدا تعالیٰ کے الطافِ کریمانہ کو دیکھ کر کہتا ہوں
کہ میں اپنے ماں باپ سے بھی پیار کروں۔ پس
اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے
کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کا پیار اور اس کا
حسن سلوک دیکھنے کی وجہ سے میرا دل کہتا ہے
کہ جب میرا محسن اور مربّی خدا مجھ سے اتنا پیار
کرتا ہے تو اُسی کی رحمت کا ایک نمونہ میرے ماں
باپ بھی ہیں۔ پس میرا فرض ہے کہ میں اپنے والدین

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا

اور (اے باپ) میں تم کو اور جن (وجودوں) کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو سب کو چھوڑ دونگا اور صرف اپنے رب کے حضور

رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۹﴾

دعائیں مانگونگا (اور) یقیناً میں اپنے رب کے حضور دعا کرنے کی وجہ سے بدنصیب نہیں بنوں گا ۴۱

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ

اور پھر جب (ابراہیم) اُن یعنی اپنے لوگوں سے بھی اور جن کی وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے (اُن سے بھی) جدا ہو گیا

وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۵۰﴾

تو ہم نے اُسے اسحاق اور (اس کے بعد) یعقوب عطا فرمائے - اور اُن سب کو ہم نے نبی بنایا ۴۲

سے بھی حسن سلوک کروں۔ اسی لئے میں آپکا اعزاز کرتا ہوں اور آپ کے لئے اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کا گناہ معاف کرے اور آپ پر اپنا رحم نازل فرمائے۔

۴۱ تفسیر:- آپ نے کہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ میرا گذارہ آپ کے ساتھ مشکل ہے۔ آپ نے بتوں کو پوجا ہے اور میں نے خدا کو پوجا ہے۔ آپ کو خدا کی پرستش پر غصہ آتا ہے اور مجھے بتوں کی پرستش پر غصہ آتا ہے۔

اَعْتَزِلُكُمْ کے یہ معنے نہیں کہ میں آئندہ بُت نہیں پوجوں گا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ اَعْتَزِلُكُمْ کے معنے یہ ہیں کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں گا۔ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور اُن بتوں کو بھی چھوڑ دوں گا جن کی آپ پرستش کرتے ہیں۔ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ اور میں ایسی جگہ چلا جاؤنگا جہاں خدا ہی خدا نظر آئے گا۔ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا۔ اس طرح بظاہر میں اپنے اوپر موت وارد کر لوں گا کیونکہ میرا ملک مجھ سے چھوٹ جائے گا۔ میری قوم مجھ سے الگ ہو جائے گی۔ میرا قبیلہ مجھ سے جدا ہو جائے گا میرے دوست اور ساتھی میرے ساتھ نہیں رہینگے مگر میں امید کرتا ہوں کہ جب میں اپنے محبت کرنے والے خدا کو پکاروں گا تو اپنے مقاصد کو پالوں گا۔ مجھے دوست بھی مل جائیں گے مجھے ساتھی بھی مل جائیں گے۔ مجھے ہمدرد بھی مل جائیں گے اور مجھے قوم بھی مل جائے گی۔

۴۲ تفسیر:- جب اُس نے انکو چھوڑ دیا اور ان کو بھی چھوڑ دیا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے تھے تو ہم نے اُسے اسحاق دیا اور یعقوب دیا وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا اور پھر ہم نے اُن سب کو نبی بنا دیا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ کُلًّا کا لفظ دو پر بھی بولا جا سکتا ہے چنانچہ

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ

اور ہم نے اُن کو اپنی رحمت میں سے ایک (وافر) حصہ عطا فرمایا اور ہم نے اُن کے لئے

لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۱﴾

ہمیشہ قائم رہنے والا اعلیٰ درجہ کا ذکرِ خیر مقرر فرمایا ۵۳

ع ۱۰ ۳ ۶

بعض اور مقامات پر بھی کُلًّا کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر مراد صرف دو ہی ہیں۔ اس جگہ اسحاق اور یعقوب کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے نبی ہو چکے تھے۔ پس یہاں کُلًّا سے بھی دو نبی مراد ہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ۔

۵۴۳ تفسیر:۔ قرآنی محاورہ میں رحمت سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ اوّل وہ چیزیں جو خدا تعالیٰ کی رحمتِ عام کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے کہ خدایا مجھے رحم کر کے بیٹا دیجئے اور اُسے بیٹا مل جاتا ہے۔ اب اُسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ بیٹا ملا۔ یا ایک شخص دعا کرتا ہے کہ خدایا تُو اپنے رحم سے مجھے مقدمہ میں فتح دیجیو اور اُسے مقدمہ میں کامیابی ہو جاتی ہے اُسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ اُسے رحم کی وجہ سے مقدمہ میں کامیابی ملی۔ یا ایک اور شخص دعا کرتا ہے کہ خدایا رحم کر کے میری تنگی دور کیجئے اور اُسکی مالی تنگی دور ہو جاتی ہے تو اُسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ رزق کی کشائش ملی اور اس کی تنگی دور ہوئی۔ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا عام ظہور ہے۔ اور یہ سلوک کافر کے ساتھ بھی ہوتا ہے منافق کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور مومن کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ مگر بعض انعامات ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور عام لوگ اُن میں شریک نہیں ہوتے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص سلوک کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ہم نے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے ساتھ عام سلوک نہیں کیا بلکہ اپنی رحمت ہی اُن کے حوالے کر دی۔ یہاں موہوب چیز بیٹا نہیں، موہوب چیز روپیہ نہیں۔ موہوب چیز کوئی عہدہ اور رتبہ نہیں بلکہ خود رحمت ہی۔ فرماتا ہے وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا ہم نے اپنی رحمت ہی اُن کے قبضہ میں دے دی اور کہہ دیا جو بھی مانگو گے تمہیں مل جائیگا۔ جیسے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مَیں نے حج کیا اور مجھے پہلی دفعہ خانہ کعبہ نظر آیا تو مجھے یاد آیا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ خانہ کعبہ جب پہلی دفعہ نظر آئے تو اُس وقت جو دعا بھی کی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اُس وقت میں نے سوچنا شروع کیا کہ میں کونسی دعا مانگوں آخر مجھے خیال آیا کہ اگر آج مَیں کوئی دعا مانگوں اور وہ قبول بھی ہو جائے تو ممکن ہے کل مجھے کوئی اَور ضرورت پیش آجائے اس لئے کیوں نہ کوئی ایسی دعا کروں جو اپنی ذات میں میری ساری ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو۔ چنانچہ میں نے دعا کی کہ الٰہی جو بھی دعا میں تجھ سے مانگا کروں۔

وہ قبول ہو جایا کرے۔ میں نے بھی حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی اتباع میں خانہ کعبہ کو دیکھ کر یہی دعا کی تھی کہ الٰہی جو بھی دعائیں تجھ سے کروں اُسے تُو اپنے فضل سے قبول فرما لیا کر۔

تو فرماتا ہے وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا ہم نے اپنی رحمت ہی اُن کے حوالے کر دی۔ ہم نے کہا ایک ایک چیز کیا دینی ہے چلو ہم اپنی رحمت ہی تمہارے حوالے کرتے ہیں۔ گویا انہیں عمر عیار کی زنبیل مل گئی کہ جس چیز کی ضرورت ہوئی ہاتھ ڈالا اور نکل آئی۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا صدق کی طرف جب کسی شئے کو اضافت دی جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَادِقٌ وَمَرْضِيٌّ یعنی ایسی چیز جو اپنے مفہوم میں کامل اور پسندیدہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ آم صادق ہے تو اِس کے معنے یہ ہوں گے کہ آم کی جس قدر خصوصیات ہوتی ہیں وہ اُس میں کامل طور پر پائی جاتی ہیں اور وہ نہایت ہی پسندیدہ اور مرغوب الطبع ہے یا اگر کہا جائے کہ خربوزہ صادق ہے تو اسکے معنے یہ ہوں گے کہ ایک اچھے خربوزہ میں جو لذت اور خوشبو اور ذائقہ پایا جانا چاہیئے وہ اُس میں کامل طور پر پایا جاتا ہے اور اس کے کھانے سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ پس وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ کے یہ معنے ہوئے کہ اُنؑ کو وہ زبان ملی جو اپنی جگہ کامل اور پسندیدہ تھی یعنی خدا تعالےٰ نے اُن کو ایسی توفیق دی کہ ان کی باتیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہُوا کرتی تھیں۔ اُن میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ بُغض اور کینہ کا اظہار نہیں ہوتا تھا اور پُر حکمت والا کلام ہوتا تھا۔ ہر شخص جو انکی باتیں سُنتا تھا کہتا تھا کہ یہ کیا ہی اچھی باتیں ہیں۔ لیکن لسان کے معنے جس طرح اُن کی اپنی زبان کے ہیں اِسی طرح اُن کے متعلق دوسروں کی زبان کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اِس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے اُنؑ کو ایسی جماعتیں دیں یا اُنکو ایسے افراد عطا فرمائے جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کرتے تھے جو بڑی اچھی ہوتی تھیں۔ بڑی پسندیدہ اور قابلِ تعریف ہوتی تھیں۔ گویا خود اُن کا کلام بھی بڑا اعلیٰ درجے کا تھا اور اُن کو ایسے مطیع اور فرمانبردار لوگ بھی ملے جو اُن کی سچی، کامل اور پسندیدہ تعریفیں کرنے والے تھے۔

پھر صدق کی طرف اضافت کسی چیز کے قائم رہنے پر بھی دلالت کرتی ہے یعنی صدق کی طرف جب کسی شئے کو اضافت دی جائے تو اسکے معنے دائمی کے بھی ہوتے ہیں۔

اس صورت میں وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ سے یہ مراد ہوگا کہ ان کو ایسی باتیں ملیں جو ہمیشہ قائم رکھی جائیں گی۔ اور اگر دوسرے معنے لیں یعنی لسان سے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ و یعقوبؑ کی زبان نہ ہو بلکہ دوسروں کی زبان ہو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہمیشہ ہی اُن کی تعریف کرنیوالے لوگ دنیا میں موجود رہیں گے جو کہیں گے کہ ابراہیمؑ بڑا اچھا تھا۔ اسحاقؑ بڑا اچھا تھا۔ یعقوبؑ بڑا اچھا تھا۔ گویا خدا تعالےٰ ہمیشہ دنیا میں ایسے لوگ پیدا کرتا رہے گا جو اُن کے نیک ذکر کو قائم رکھیں گے اور اُن کی پُر حکمت اور اعلیٰ درجہ کی باتیں لوگوں میں پھیلاتے رہیں گے۔

عَلِيًّا لسان کی صفت ہے اور اس کے تین معنے ہیں اوّل: اَلْمُرْتَفِعُ یعنی بلند

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۲

اور تو قرآن کے مطابق موسےٰ کا بھی ذکر کر وہ ہمارا منتخب بندہ تھا اور رسول (اور) نبی تھا ۵۴۲

دوم: اَلشَّرِيْفُ سوم:- اَلشَّدِيْدُ

ان معنوں کے لحاظ سے وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے بن جائیں گے:-

اوّل: اُن کو بلند[۱] زبان ملی۔ یعنی وہ بڑی اعلیٰ درجہ کی باتیں کرتے تھے۔ نہایت پُرحکمت، ہر قسم کے بُغض اور کینہ سے پاک، دلوں میں نورِ ایمان پیدا کرنے والی اور اخلاق اور پاکیزگی کو ترقی دینے والی یا اُن کو بلند تعریف[۲] ملی یعنی لوگ اُنکی تعریف کرتے تھے تو وہ بڑی بلند تعریف ہوتی تھی۔ جیسے اُمتِ محمدیہ کو بھی یہ دعا سکھائی گئی کہ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

گویا زبان بھی ملی تو بلند ملی اور تعریف بھی ملی تو بلند ملی۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے ہوں گے کہ اُن کو شریف[۳] زبان دی گئی یعنی اُن کی زبان بڑی شستہ تھی۔ اُن کی باتوں میں گند نہیں تھا۔ اُن کی باتوں میں کینہ، کپٹ اور بُغض نہیں تھا نہایت پاکیزہ اور شائستہ گفتگو کے وہ عادی تھے اور یا پھر اسکے یہ معنے ہونگے کہ ہماری طرف سے انکو شریف تعریف ملی یعنی لوگ انکی تعریف کرتے تھے تو کہتے تھے کہ اُن کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں بڑے بزرگ اور مقدس انسان ہیں۔

عَلِيًّا کے تیسرے معنے شدید کے ہیں اس لحاظ سے وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے انکو شدید[۹] زبان دی یعنی ایسی زبان جو صداقت کے اظہار کیلئے بڑی دلیر تھی۔ اگر کوئی مشرک یا خدا تعالیٰ کی ہتک کرنیوالا اُنکے سامنے آتا تو وہ اُسے صاف کہدیتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے۔ تمہارا راستہ الگ ہے اور ہمارا الگ۔ اور یا پھر اسکے یہ معنے ہونگے کہ ہماری طرف سے انکو شدید[۱۰] تعریف ملی یعنی انکو ایسے تعریف کرنیوالے لوگ ملے کہ اگر انکی گردنوں پر چھریاں بھی رکھدی جائیں تو وہی کہینگے کہ ابراہیمؑ بڑا اچھا تھا۔ اسحاقؑ بڑا اچھا تھا یعقوبؑ بڑا اچھا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمان جب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسحاق علیہ السلام یا حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام لیتے ہیں تو ہمیشہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر نماز کے آخر میں اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر اور اسکی اولاد پر بڑی سلامتی نازل کی تھی اور اسکو بہت برکت دی تھی۔ گویا اس زمانہ میں یہ پیشگوئی صرف مسلمانوں کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔

غرض لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے دس[۱۰] معنے ہو گئے ٭

۵۴۲ تفسیر:- حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے ذکر

کے بعد اب اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کا ذکر فرماتا ہے۔ درحقیقت حضرت اسحاقؑ اور
یعقوبؑ کا ذکر صرف ضمناً کیا گیا تھا اصل مقصود
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر تھا جس کی طرف
وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ کے الفاظ بھی
اشارہ کرتے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر
عہد ابراہیمی کے صرف اس حصہ کی طرف اشارہ کرنے
کے لئے کیا تھا جس کا تعلق بنو اسحاق کے ساتھ تھا
اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسوی سلسلہ کو لے لیا
اور اس طرف اشارہ کیا کہ ابراہیمی نسل کے ساتھ
اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا اور جس کا ایک ظہور اسحٰق
اور اس کی اولاد کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس میں
ایک خاص روحانی مقام کی طرف اشارہ کیا گیا
تھا جو موسوی مقام ہے۔ کیونکہ اس عہد کا ایک
نشان جیسا کہ بائبل میں ذکر آتا ہے کنعان پر قبضہ
قرار دیا گیا تھا اور یہ قبضہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے زمانہ میں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے
ذریعہ ہی تشریعی نبوت کی بنیاد بنی اسرائیل میں
پڑی۔ غرض عیسوی سلسلہ کے سمجھنے کے لئے پہلے
ابراہیمؑ کی طرف توجہ دلائی۔ پھر اس طرف توجہ
دلائی کہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے اسحاقؑ کے ساتھ
اللہ تعالیٰ کے جو وعدے تھے وہ پورے ہونے
شروع ہوئے اور پھر انہی وعدوں کے سلسلہ
میں موسیٰؑ آ گئے۔ اس مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے
ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے ذکر کے بعد
موسیٰؑ کا ذکر فرمایا ہے۔

فرماتا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى
تو کتاب میں موسیٰ کو بھی یاد کر۔ اِنَّهٗ كَانَ
مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وہ ہمارا ایک
مخلَص بندہ اور ہمارا رسول اور نبی تھا۔

اَخلَصَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو
خالص کر لینا اور تمام قسم کی ملونیوں اور خرابیوں
سے بچا لینا۔

ایک ہوتا ہے مُخلِص اور ایک ہوتا ہے مخلَص۔
کہتے ہیں فلاں شخص بڑا مخلِص ہے۔ مخلِص وہ ہوتا
ہے جو اپنے تعلقات کے سلسلہ میں ہر قسم کی مداہنت
اور نفاق کو اپنے دل سے دور کر دے۔ اور مخلَص
وہ ہوتا ہے جسے خدا تعالیٰ ہر قسم کے بدخیالوں،
وہموں اور قسم قسم کے شبہات اور وساوس سے
خود باہر نکال لے۔ گویا مخلَص وہ ہوتا ہے۔ جسے
خدا تعالیٰ مخلص اپنے لئے انسانوں میں سے منتخب
کر لیتا ہے اور اُسے ہر قسم کی گندگی سے پاک کر دیتا
ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جیسے عورتیں آٹا پسوانے لگتی ہیں
تو وہ آٹا پسوانے سے پہلے گندم کو صاف کرتی اور
اس میں سے مٹی وغیرہ نکالتی ہیں یا جب گوشت
پکانے لگتی ہیں تو اس کے چھیچھڑے وغیرہ دور
کرتی ہیں۔ اب جہاں تک گندم کا سوال ہے وہ اُن
کے گھر میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ گوشت بھی
صبح سے آیا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ کسی خاص مقصد
کے لئے ان چیزوں کو استعمال کرنے لگتی ہیں۔ تو
اُن کی صفائی کے لئے خاص توجہ سے کام لیتی ہیں۔
گندم پڑی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب پسوانے لگیں
تو کنکر اور تنکے وغیرہ اُس میں سے نکال دیتی ہیں یا
جب آٹا پکانے لگتی ہیں تو اُس وقت اُسے چھانتی
ہیں۔ اسی طرح گوشت پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر
جب گوشت پکانے کا وقت آئے تو اُس وقت عورت
اس کے چھیچھڑے وغیرہ دور کرتی ہے یا مثلاً ترکاری
گھر میں پڑی ہوئی ہوتی ہے اور اس پر مٹی وغیرہ

لگی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر جب ترکاری پکانے کا وقت آتا ہے تو پھر عورتیں اُسے پانی سے دھوتی اور چھیلتی ہیں اور اس کی مٹی وغیرہ دُور کرتی ہیں۔ تو مخلَص ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کسی چیز کے استعمال کا وقت آجائے۔ یُوں اچھی چیز ہمیشہ اچھی ہی ہوتی ہے۔ جو طیّب ہے وہ طیب ہی ہوگی مگر اُس کی پوری صفائی اس وقت کی جاتی ہے جب اُس کے استعمال کا وقت آئے۔ پس کَانَ مُخۡلَصًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسے وقت میں پیدا ہوا جب خدا نے اُسے انسانوں میں سے الگ کر لیا اور اُسے اچھی طرح پاک کر لیا تاکہ وہ کام جو خدا تعالےٰ کی طرف سے اس کے سپرد ہونے والا تھا اُسے عمدگی کے ساتھ سر انجام دے سکے اس سے معلوم ہوا کہ نبی آپ ہی آپ اتفاقاً نہیں ہو جاتا بلکہ الٰہی انتخاب سے ایک روح کو اس کے لئے الگ کیا جاتا ہے گویا مخلَص کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی خدمت کے لئے اُسے مامور کرنا چاہتا تھا۔

وَ كَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا پہلے مخلَص بن گیا اور پھر کام کیا سپرد کیا؟ کام صالحیت کا بھی سپرد ہو سکتا تھا۔ شہادت کا بھی سپرد ہو سکتا تھا۔ صدّیقیت کا بھی سپرد ہو سکتا تھا مگر ہم نے اُسے چنا اور پھر رسالت اور نبوت کے مقام پر فائز کر دیا۔

عام طور پر ہمارے مفسرین بھی یہی لکھتے ہیں اور ہمارے متکلمین بھی یہی لکھتے ہیں کہ رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب لاتا ہے اور نبی وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا۔ لیکن وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی تفسیر اُٹھا کر دیکھ لو اُس میں یہی لکھا ہوگا کہ رسول وہ ہوتا ہے جو مامور ہو اور کتاب لائے۔ اب اگر رسول کے یہی معنے ہیں تو نَبِيًّا کے کیا معنے ہوئے نبی اُن کے نزدیک وہ ہوتا ہے جو مامور ہو مگر کتاب نہ لائے۔ اب جو مامور ہؤا اور کتاب لایا وہ جب رسول ہوگیا تو نبی تو آپ ہی آپ ہوگیا پھر رَسُوۡلًا کہنے کے بعد نَبِيًّا کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کے نزدیک نبی ہونے کے بعد رسول ہونا ضروری نہیں مگر رسول ہونے کے ساتھ تو نبی ہونا ضروری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص مامور بھی ہو اور کتاب بھی لائے اور نبی نہ ہو۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک شخص کے متعلق لفظِ نبی بولیں مگر اس کے پاس کتاب نہ ہو مگر قرآن نے رَسُوۡلًا کو پہلے رکھا ہے اور نَبِيًّا کو پیچھے رکھا ہے۔ اگر وہ درجہ مراد ہوتا تو اللہ تعالےٰ کہتا کہ كَانَ نَبِيًّا رَّسُوۡلًا وہ نبی بھی تھا اور پھر ہم نے اُسے کتاب بھی دی مگر وہ پہلے اسے رسول کہتا ہے اور پھر نبی کہتا ہے پس اگر رسول اور نبی کی وہی تعریف ہے جو عام مسلمان کرتے ہیں تو پھر اس کا مطلب کیا ہؤا۔ یہ تو جاہل آدمی کا طریق ہے کہ وہ کہے کہ صاحب یہ چالیس سال کے ہیں اور یہ دس سال کے بھی تھے۔ ہاں اگر کوئی کہنا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی عمر دس سال ہے اور مجھے خدا نے بتایا ہے کہ یہ چالیس سال کی عمر تک زندہ رہیں گے۔ قرآن تو ایک حکیم اور علیم ہستی کا کلام ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے کلام میں یہ بات آجائے کہ فلاں شخص رسول بھی ہے اور نبی بھی۔ جبکہ رسالت میں ہی نبوت بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص مامور ہو اور کتاب بھی لائے مگر وہ نبی نہ ہو۔

پس معلوم ہوا کہ یہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہوسکتے یہاں بہرحال کوئی اَور معنے کرنے پڑیں گے اور وہ معنے وہی ہیں جو ہماری جماعت کیا کرتی ہے کہ رسول کے معنے ہوتے ہیں بھیجا ہؤا۔ اور نبی کے معنے ہوتے ہیں خبر دینے والا۔ اور یہ بالکل صحیح بات ہے کہ پہلے انسان رسول ہوگا اور پھر نبی ہوگا۔ پہلے خدا اُسے بھیجیگا اور پھر وہ لوگوں کو خدا کی باتیں بتائے گا پس رسالت پہلا مقام ہے اور نبوت اس کے بعد کا۔ کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلے رسول نہ ہو۔ مثلاً جب خدا نے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں تجھے دنیا کی اصلاح کے لئے بھجواتا ہوں تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے رسول بن گئے اور جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ اے مکہ والو! میں تمہیں خدا کی طرف سے یہ خبر دیتا ہوں تو وہ نبی بن گئے۔ جب خدا نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ میں تجھ کو بنی نوع انسان کی طرف بھیجتا ہوں تو عیسیٰ رسول بن گئے اور جب عیسیٰ نے یہ کہا کہ اے لوگو میں تمہیں خدا تعالےٰ کی طرف سے یہ پیغام دیتا ہوں تو وہ نبی بن گئے۔ کیونکہ رسول کے معنے ہیں بات سننے والا اور نبی کے معنے ہیں بات بتانے والا۔ پہلے وہ سُنیگا تو پھر لوگوں کو کچھ بتلائے گا۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ سُنے بعد میں اور پہنچائے پہلے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں بھی بیان کیا ہے رسول کا لفظ پہلے رکھا ہے اور نبی کا بعد میں۔ سورۂ احزاب میں ہی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (احزاب ع ۵) اسی طرح سورۂ اعراف میں فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف ع ۱۹) پھر اسی سورۂ اعراف میں دوسری جگہ آتا ہے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (ع ۲۰)

غرض ہر جگہ رسول کا لفظ پہلے رکھا ہے اور نبی کا لفظ پیچھے۔ آگے چل کر انہی آیات میں حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق آتا ہے کہ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ حالانکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق سب لوگ مانتے ہیں کہ انہیں کوئی کتاب نہیں ملی۔ وہ اسی شریعت پر چلتے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی اور حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والے صرف اسمٰعیلؑ اسحاقؑ۔ لوطؑ اور اُن کے چند خادم ہی تھے اگر حضرت ابراہیمؑ کے معاً بعد حضرت اسمٰعیلؑ کو الگ کتاب مل گئی تھی تو اُن کی شریعت پر عمل کس نے کیا۔ پس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق جو یہ الفاظ آئے ہیں یہ بھی غیر احمدیوں کے خیالات کی تردید کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول اور نبی ایک ہی چیز ہے۔ کیونکہ رسول کے معنے MESSENGER کے ہوتے ہیں اور نبی کے معنے بہت خبریں دینے والے کے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو خدا تعالےٰ MESSENGER بنا کر بھیجیگا لازماً اُسے کوئی پیغام بھی دے گا۔ اور جو شخص لوگوں پر امورِ غیبیہ کو ظاہر کرے گا وہ لازماً خدا تعالےٰ کا بھیجا ہؤا ہوگا۔ پس درحقیقت ایک مامور من اللہ کا وہ نقطہ جو خدا سے ملتا ہے اس کے لحاظ سے اُسے رسول کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کا بھیجا ہؤا ہے۔ لیکن اس کا وہ نقطہ

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ
اور ہم نے موسیٰ کو طور کی دائیں جانب سے پکارا

وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۳﴾
اور اسکو اپنے اسرار بتاتے ہوئے اپنے قریب کر لیا ۵۲ کے

جو بندوں سے ملتا ہے اس کے لحاظ سے وہ خدا کا نبی کہلاتا ہے یعنی اُن کو خدا کی خبریں دیتا ہے پس جو رسول ہو وہ نبی بھی ضرور ہو گا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بغیر پیغام کے کسی کو نہیں بھیج سکتا۔ اور جو نبی ہو وہ ضرور رسول بھی ہو گا۔ کیونکہ اگر خدا نے اُسے نہیں بھیجا تو وہ جھوٹا ہوگا اور مامور من اللہ جھوٹے نہیں ہوتے۔

۵۲۵ حل لغات:۔ جَانِب کے معنے پہلو اور کنارا کے ہیں۔

طُوْر ایک خاص پہاڑ کا بھی نام ہے۔ جو سینا میں ہے اور طُور کے معنے عربی زبان میں صرف پہاڑ کے بھی ہوتے ہیں۔

اَلْاَیْمَن کے معنے اَلْیَمِیْن یعنی دائیں کے بھی ہیں اور ذُوالْیُمْن یعنی برکت والے کے بھی ہیں۔

اَیْمَن کا لفظ اس جگہ جانب کی بھی صفت ہو سکتا ہے اور طور کی بھی۔ اگر ایمن کے معنے دائیں کے کئے جائیں تو جانب کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے طور پہاڑ کی دائیں جانب سے پکارا اور طور کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ طور سے جو اس کے دائیں جانب تھا ہم نے اُسے آواز دی۔ مگر چونکہ اس میں کوئی خاص حکمت نظر نہیں آتی اس لئے مبارک کے معنے زیادہ درست ہیں اس صورت میں اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے طور پہاڑ کی برکت والی جانب سے اُسے پکارا۔ یعنی جہاں اللہ تعالیٰ کے الہامات پہلے نازل ہو چکے تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ ہم نے بابرکت طور سے اُسے پکارا۔

تفسیر:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی کلام جس جگہ نازل ہوتا ہے وہ جگہ بھی بابرکت ہو جاتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ جب ہماری جماعت میں نئے نئے داخل ہوتے ہیں اور وہ جماعت کے دوستوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ میرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا ہاتھوں کو بوسہ دینا شرک تو نہیں؟ خصوصاً اہل حدیث میں سے جو لوگ ہماری جماعت میں داخل ہوتے ہیں وہ بعض دفعہ اس قسم کا سوال کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حدیثوں سے صاف ثابت ہے کہ صحابہؓ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چوما کرتے تھے۔ وہ اہل حدیث کہلاتے ہیں مگر اس قسم کی حدیثوں کو بھول جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بے جان چیز بھی اگر کسی بابرکت وجود سے وابستہ ہو جائے۔ تو وہ برکت والی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا کلام جب کسی جگہ پر نازل ہوتا ہے تو وہ جگہ بھی بابرکت ہو جاتی ہے۔

گذشتہ فسادات کے دنوں میں میرے پاس گورنمنٹ کے بعض افسر پیغامات وغیرہ دینے یا چٹھیاں وغیرہ پہنچانے کے لئے آتے رہے ہیں وہ جب بھی میرے پاس آتے ہمیشہ معذرت کرتے کہ ہم مجبور ہو کر آپ کی خدمت میں آتے ہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ نے ہمیں بھیجا ہے۔ ہم شرمندہ بھی ہیں مگر کیا کریں گورنمنٹ نے یہ نازک ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی ہے اور اب ہم مجبور ہیں کہ اُسی طرح کریں۔ ایک دفعہ ایک افسر نے جب اسی قسم کے الفاظ میں معذرت کی تو میں نے اُسے کہا کہ بتایئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جوتی برکت والی تھی یا نہیں؟ اس نے کہا کیوں نہیں وہ بڑی برکت والی تھی کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں تھی۔ میں نے کہا اب بتایئے کیا ابوجہل کی جوتی منحوس تھی یا نہیں؟ اس نے کہا یقیناً منحوس تھی کیونکہ وہ ابوجہل کے پاؤں میں تھی۔ میں نے کہا اُس جوتی کی اس میں کیا خوبی تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں تھی اور اُس جوتی کا اس میں کیا قصور تھا جو ابوجہل کے پاؤں میں تھی۔ کہ ایک جوتی کو ہم نے برکت والی بنا دیا اور دوسری جوتی کو ہم نے منحوس کہہ دیا! میں نے کہا بغیر کسی ارادہ کے بھی اگر کسی اچھے آدمی کا انسان ہتھیار بن جائے تو اچھا ہو جاتا ہے اور کسی بُرے آدمی کا ہتھیار بن جائے تو بُرا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح خدا تعالےٰ کا الہام جب اُس پہاڑ پر نازل ہُوا۔ تو وہ پہاڑ بھی بابرکت ہو گیا۔ جیسے خانہ کعبہ میں کیا خصوصیت ہے کہ اُسے برکت والا کہا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ میں یہی خصوصیت ہے کہ وہاں اللہ تعالےٰ کا الہام نازل ہُوا اور خدا تعالےٰ کے نبیوں نے وہاں عبادتیں کیں اور دعائیں کیں او پر اُس کے انعامات نازل ہوئے۔ اسی طرح جس مقام پر بھی اللہ تعالےٰ کی برکت نازل ہو جائے وہ برکت ہمیشہ کے لئے چلتی چلی جاتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں ایک دفعہ بتا چکا ہوں انسان کی برکت بدل سکتی ہے کیونکہ انسان جب نیکی کا راستہ ترک کر کے گنہگار ہو جاتا ہے تو خدا تعالےٰ کی برکت اُٹھ جاتی ہو لیکن بے جان چیز چونکہ گناہ نہیں کرتی اس لئے جب وہ ایک دفعہ بابرکت ہو جاتی ہے تو ہمیشہ کے لئے مبارک رہتی ہے اور کبھی بھی اس کی برکت اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ضمنی طور پر اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ طور کی وحی موسٰی اور اس کی قوم کے لئے بڑی مبارک تھی۔

نَجِيًّا کے تین معنے ہوتے ہیں۔

اوّل جس سے مخفی بات کی جائے۔

دوم جس سے بات کی جائے۔

سوم نَجِيًّا کے ایک معنے اَلسَّرِيْعُ کے بھی ہیں اَلنَّاقَةُ النَّجِيَّةُ تیز چلنے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔

یہ تینوں معنے اس آیت پر چسپاں ہو جاتے ہیں یعنی (۱) ہم نے اُس کو قریب کیا اس کے ساتھ اسرار کی بات کرتے ہوئے۔ یعنی علومِ روحانیہ اور عرفانیہ اُس پر ظاہر کئے۔ شریعت چونکہ لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی جاتی ہے اس لئے اگر اس کے معنے مخفی بات کے کئے جائیں گے تو تورات مراد نہیں ہو گی کیونکہ وہ کوئی مخفی چیز نہیں تھی بلکہ وہ تو نازل ہی اسی لئے کی گئی تھی کہ اُسے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ پس نَجِيًّا سے صرف وہ پیغام مراد ہے جس میں موسٰیؑ کے علاوہ دوسرے لوگ شریک نہیں تھے اور عقلاً بھی وہی بات مخفی کہلا سکتی ہے جس میں دوسرے

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۴﴾

اور ہم نے اس (یعنی موسیٰ) کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بنا کر (مددگار کے طور پر) دیا ﴿۵۴﴾

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ زاِنَّهٗ كَانَ

اور تو قرآن کے مطابق اسمٰعیل کا بھی ذکر کر۔ وہ بھی یقیناً

شریک نہ ہوں۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے موسیٰ کو قریب کیا اور اس سے وہ باتیں کیں جن میں دوسرے لوگ شریک نہیں تھے۔ اس پر ہم نے اپنے علومِ روحانیہ نازل کئے۔ اس سے محبت اور پیار کی باتیں کیں اور اُسے اپنے خاص اسرار بتائے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جن لوگوں پر اپنی شریعت یا روحانیت کے راز کھولتا ہے اُن کو اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔

(۲) نَجِيًّا کے دوسرے معنے بات کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے اس کو قریب کیا بات کرتے ہوئے چنانچہ تورات نازل ہوئی جس سے دو ہزار سال تک لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔

(۳) نَجِيًّا کے تیسرے معنے سَرِيْعًا کے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا کہ كَانَ مُخْلَصًا موسیٰ کو ہم نے انسانوں میں سے چُن لیا اور اب فرماتا ہے کہ جب بات کرنے کا وقت آیا تو قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ہم نے کہا موسیٰ آہستہ آہستہ نہیں تیز قدم کے ساتھ چل کر ہماری طرف آؤ۔ چنانچہ موسیٰ دوڑتے ہوئے ہماری طرف آیا۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ہی ذکر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (طٰہٰ ع۴) یعنی اے میرے رب میں اس لئے تیرے پاس جلدی جلدی آیا ہوں تا کہ تو میرے اس فعل سے خوش ہو جائے۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو قریب کیا جبکہ ہم سرعت کے ساتھ اس کی طرف چل رہے تھے یعنی موسیٰ کو بھی ہم نے کہا کہ تیز تیز ہماری طرف آ اور ہم نے بھی اس کی طرف محبت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ گویا اس میں وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو ایک حدیث میں آتا ہے کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی طرف چل کر جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ اُدھر سے موسیٰ خدا کی طرف دوڑا اور اِدھر سے خدا موسیٰ کی طرف دوڑا اور دونوں آپس میں مل گئے۔

۵۴ حل لغات:۔ اَخَاهُ۔ وَهَبْنَا کا مفعول ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو اس کا بھائی بخشا۔

تفسیر:۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ سورۂ طٰہٰ میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (طٰہٰ ع۲) میرے اہل میں سے مجھے ایک مددگار عطا فرمایا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ دعا سنی اور حضرت ہارونؑ کو بھی نبوت کے مقام پر فائز کر دیا۔ اس جگہ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اور انبیاء کا مقامِ نبوت ایک الگ رنگ رکھتا ہے اور ہارون کا مقامِ نبوت اور رنگ رکھتا ہے

صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ﴿٥٥﴾

سچے وعدوں والا تھا اور رسول (اور) نبی تھا ۵۵؎

ہارون ہم نے موسیٰ کو اپنی رحمت سے عطا کیا تھا۔
گویا وہ نبی تو تھا مگر موسیٰ کا ایک خادم اور آپ کے
ماتحت کے طور پر تھا۔

۵۵؎ **تفسیر:-** اب اللہ تعالیٰ اس تمام
ذکر کو پھر اسمٰعیلؑ کی طرف واپس لوٹاتا ہے کیونکہ
اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ عیسوی سلسلہ
کوئی الگ سلسلہ نہیں بلکہ موسوی سلسلہ کی ایک
کڑی ہے اور موسوی سلسلہ کا تعلق حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے ساتھ ہے جن کے دو بیٹے تھے
اسمٰعیل اور اسحاق۔ اسحاق کے متعلق بھی وعدہ
تھا کہ خدا اُسے اور اس کی نسل کو ترقی دے گا۔
اور اپنا عہد اس کے ذریعہ سے پورا کرے گا۔
اور اسمٰعیل کے متعلق بھی وعدہ تھا کہ خدا اُسے
برکت دے گا۔ اُسے بڑھائے گا اور اُسے ایک
بڑی قوم بنائے گا۔ لیکن بائبل سے یہ بھی ظاہر
ہوتا تھا کہ عہدِ ابراہیمی گو اسحاق کے ذریعہ شروع
ہونا تھا مگر پورا اُن کے دونوں بیٹوں کے ذریعہ سے
ہونا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِسی حکمت کے
ماتحت پہلے ابراہیم اور اسحاق کا ذکر کیا اور پھر
موسیٰ کا ذکر کر کے بتایا کہ عیسیٰ تو نسلِ ابراہیمی کے
دو سلسلوں میں سے صرف ایک سلسلہ کی آخری کڑی
ہے اُسے تم نے آسمان پر کیوں چڑھا رکھا ہے
اور کیوں یہ سمجھتے ہو کہ دنیا کا جو آخری نجات دہندہ
آنا تھا وہ مسیح کی شکل میں آچکا۔ تم جانتے ہو کہ
ہم نے ابراہیم سے اسحاق کے متعلق بھی وعدہ کیا
تھا اور اسمٰعیل کے متعلق بھی وعدہ کیا تھا۔ اسحاق
اور اس کی نسل کے ساتھ ہمارا جو وعدہ تھا وہ پورا
ہُوا جس کی آخری کڑی کے طور پر مسیح دنیا میں آیا۔
اب تم ابراہیم کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کو بھی
یاد کرو۔ اس کے متعلق ہم نے ابراہیم سے جو
وعدے کئے تھے وہ وعدے بھی ہم نے پورے
کرنے تھے یا نہیں۔ ہم نے بنو اسحاق کے ساتھ اپنے
عہد کو پورا کرتے ہوئے موسیٰ جیسا عظیم الشان نبی
اُن میں پیدا کر دیا۔ اب اسمٰعیلی وعدوں کے پورا
ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اس کی نسل میں سے
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر دیا۔

غرض اسمٰعیل کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمی عہد
کے دوسرے ظہور کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کیا ہے
اور عیسائیوں کو بتلایا ہے کہ جس قسم کا درجہ تم عیسیٰؑ
کو دیتے ہو اگر وہ درست ہے تو اس کے معنے یہ ہیں
کہ اسمٰعیل کے متعلق جو وعدے کئے گئے تھے وہ بھی
ختم ہو گئے ہیں اور ابراہیمی دعائیں بھی ضائع ہو گئی
ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ
دو وعدے کئے گئے تھے۔ ایک اسحاق کے متعلق
اور ایک اسمٰعیل کے متعلق۔ گویا بتایا گیا تھا کہ نسلِ
ابراہیمی سے برکتوں کے دو سلسلے جاری ہوں گے
ایک سلسلہ اسحاق کے ذریعہ چلیگا اور ایک سلسلہ
اسمٰعیل کے ذریعہ چلیگا۔ اسمٰعیل اگرچہ بڑا لڑکا تھا
مگر خدا نے فرمایا کہ میں اپنا عہد اسحاق سے شروع
کروں گا چنانچہ وہ سلسلہ شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ
نے دو ہزار سال تک بنو اسحاق کو نبوت اور حکومت
عطا فرمائی۔ اب اگر مسیح پر آ کر یہ تمام سلسلہ ختم ہو جانا تھا

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ

اور اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا رہتا تھا

وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۶﴾

اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ وجود تھا ۵۴۸

تو اس کے معنے یہ تھے کہ اسمٰعیل کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا۔ پس اللہ تعالےٰ نے عیسائیوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ تمہارا یہ کہنا کہ عیسٰی ایسے مقام پر تھا کہ جس کے بعد عہد ابراہیمی ختم ہو گیا بائبل کے صریح خلاف ہے۔ تمہیں اب اُس دوسرے سلسلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جو ہم نے ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کی نسل میں سے جاری کیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ ان الفاظ میں عیسائیوں اور یہودیوں پر ایک سخت چوٹ کی گئی ہے فرماتا ہے۔ اسمٰعیل بڑے سچے وعدے کرنے والا تھا مگر تمہارے نزدیک میں ہی جھوٹے وعدے کرنے والا ہوں۔ وہ ہمارے لئے اپنی جان تک دینے کے لئے تیار رہتا تھا۔ خود بائبل میں لکھا ہے کہ

"اُس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہیگا۔"

(پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲)

یعنی اس کی زندگی ہمیشہ تلواروں کے سایہ تلے گذرے گی اور وہ دین کے لئے ہمیشہ اپنے بھائیوں سے نبرد آزما رہے گا۔

اسی طرح بائبل میں حضرت اسمٰعیل کے متعلق آتا ہے کہ

"خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا"

(پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰)

گویا بائبل کی شہادت بھی اس امر پر موجود ہے کہ حضرت اسمٰعیل خطرناک حالات میں سے بھی گذرے مگر پھر بھی انہوں نے خدا کو نہ چھوڑا۔ جب وہ دین کے لئے اس قدر فدائیت کی روح اپنے اندر رکھتا تھا اور خدا تعالےٰ کی خاطر خطرناک سے خطرناک حالات میں اپنے آپ کو ڈال لینے کے لئے تیار رہتا تھا تو اے عیسٰی کے ماننے والو! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اُسے چھوڑ دوں اور اُن خبروں کو پورا نہ کروں جو اس کی آئندہ نسل کے متعلق میں نے دی تھیں۔ حالانکہ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا اُسے میں نے دنیا کی طرف بھیجا تھا اور پھر میں نے اُسے خبریں بھی دی تھیں۔ گویا میں نے اسمٰعیل کے متعلق دوہری خبریں دیں۔ ایک دفعہ میں نے ابراہیم کے ذریعہ اسمٰعیل اور اس کی نسل کی ترقی کی خبر دی اور دوسری دفعہ خود اسمٰعیل کو میں نے اس بارہ میں الہامات کئے اور اسمٰعیل وہ تھا جو بڑے سچے وعدے کرنے والا تھا۔ مگر اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں ابراہیم کو بھی جھوٹا ثابت کروں اور اسمٰعیل جو بڑا راستباز انسان تھا اس کو بھی جھوٹا ثابت کروں اور خود بھی جھوٹا بنوں۔

۵۴۸ تفسیر:۔ فرماتا ہے جب میں نے اُسکو کہا

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ

اور تو قرآن (کریم) کے رُو سے ادریس کا بھی ذکر کر وہ بھی

صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۷﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۸﴾

صدیق نبی تھا اور ہم نے اُسے نہایت اعلیٰ مقام تک پہنچایا تھا ؎۹۹

کہ مَیں آئندہ تیری نسل میں سے ہدایت اور رُشد کا ایک سلسلہ جاری کرنے والا ہوں تو اس نے اس اُمید میں تہیہ کر لیا کہ اب میں اپنی اولاد کو ہمیشہ نیکی کی باتیں سکھلاؤں گا تاکہ خدائی وعدہ کے پورا ہونے میں آسانی ہو۔ چنانچہ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ نمازوں اور دعاؤں کی تاکید کیا کرتا تھا اور زکوٰۃ دیا کرتا تھا اور خدا نے جو کام اُس کے سپرد کیا تھا اس کو وہ پورا کرنے والا تھا اور خدا اس سے بڑا خوش تھا۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود تم کہتے ہو کہ خدا نے حضرت مسیحؑ کو اپنا بیٹا بنا کر بھیجدیا اور اب دنیا کی نجات کیلئے آئندہ کوئی نیا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ عقل کی بات ہے کہ اتنے عرصہ سے ہماری پیشگوئیاں چلی آرہی ہوں اور پھر وہ پوری نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے اس حکمت کو نہیں سمجھا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے یہاں اسمٰعیل کا ذکر کیا ہے کیوں اس سے پہلے موسیٰ اور ہارون کا ذکر کیا ہے پھر موسیٰ اور ہارون کے ذکر سے پہلے کیوں اسحاق اور یعقوب کا ذکر کیا ہے اور اسحاق اور یعقوب کے ذکر سے پہلے کیوں ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ وہ صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ برسبیل تذکرہ ابراہیم کا ذکر آگیا۔ برسبیل تذکرہ موسیٰ کا ذکر آگیا۔ برسبیل تذکرہ اسمٰعیل کا ذکر آگیا۔ گویا جس طرح ہم بعض دفعہ غلطی سے دوسروں کا آگے پیچھے ذکر کر دیتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ سے بھی نعوذ باللہ غلطی ہوگئی ہے کہ اس نے ترتیب سے ذکر کرنے کی بجائے ان نبیوں کا آگے پیچھے ذکر کر دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک نبی کا ذکر اپنے مقام پر ہے کسی ایک نبی کا ذکر بھی آگے پیچھے نہیں۔ پہلے زکریاؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ پھر یحیٰیؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ پھر مسیحؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا پھر ابراہیمؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا پھر اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا پھر موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا اور پھر اسمٰعیل کا ہی ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ ایک سلسلہ تو مکمل ہوگیا۔ اب دوسرے سلسلہ کی طرف چلو۔ جس خدا نے اتنا بڑا سلسلہ چلایا ہے کیا وہ دوسرا سلسلہ نہیں چلائے گا؟

؎۹۹ **تفسیر:** اس آیت کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ادریسؑ کون تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ادریسؑ کا ذکر اس جگہ کیوں آیا؟

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ادریس، حنوک کا نام تھا اور حنوک حضرت آدم علیہ السلام کے پڑپوتے اور حضرت نوح علیہ السلام کے دادا تھے انگریزی میں حنوک کو (ENOCH) لکھتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہاہے کہ یہ الیاس ہیں اور اُن کے الیاس لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ الیاس کے متعلق بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ دوسرے حضرت مسیح کے متعلق یہ خبر تھی کہ اُن کے آنے سے پہلے ایلیاہ نبی آسمان سے دوبارہ آئے گا۔ پس انہوں نے اس خیال سے کہ مسیحؑ کے ساتھ الیاس کی مشابہت ہی یہ قیاس کیاہے کہ اس جگہ ادریس سے الیاس ہی مراد ہی۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں اور یوں بھی یہ خیال اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کریم میں الیاس کا نام آتاہے۔ پس الیاس کا ہی کسی دوسرے نام سے ذکر کرنا غیر معقول تھا۔ یا تو عرب لوگ الیاس کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہوتے تب بے شک کہا جاسکتا تھا کہ اس جگہ ادریس سے الیاس مراد ہی مگر جب الیاس کا نام قرآن کریم نے استعمال کیاہے تو ادریس سے الیاس مراد لینا یقیناً غلط ہے اور اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ حنوک کے معنے اور ادریس کے معنے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ حنوک کے معنے عبرانی زبان میں DEDICATION یا INSTRUCTION کے ہیں یعنی سکھانا یا کسی چیز کی طرف منسوب کر دینا (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا) اور ادریس کے معنے بھی اسی رنگ کے ہیں۔ دَرَسَ کے معنے ہیں پڑھا اور دَرَّسَ کے معنے ہیں پڑھایا۔ پس ادریس کے معنے ہوئے بڑا پڑھنے والا یا بڑا پڑھانے والا۔ گویا INSTRUCTION کے معنے بھی اس میں آجاتے ہیں اور DEDICATION کے معنے بھی اس میں آجاتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی کام میں لگا رہتاہے وہ اس میں ماہر ہوجاتا ہی اور اُسی کام کے لئے وقف ہوجاتا ہے۔ پس ادریس کے معنوں میں بھی یہ پایا جاتا ہے کہ "بڑی مہارت رکھنے والا اور فن کے لئے وقف ہو جانے والا" گویا جو معنے عبرانی میں حنوک کے پائے جاتے ہیں وہی ادریس کے عربی میں پائے جاتے ہیں۔

اقرب الموارد والا لکھتاہے کہ یہ لفظ عَلَم عجمی ہے یعنی عجمی نام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ غیر منصرف ہے اور غیر منصرف اگر عَلَم ہو تو اُس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ عجمی ہو۔ چونکہ ادریس غیر منصرف ہے اس لئے بوجہ عَلَم ہونے کے یہ عجمی لفظ بھی ہے ورنہ یہ غیر منصرف نہ ہوتا۔

ابن السکیت کا خیال ہے کہ یہ غیر منصرف ہی اور عربی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ادریس کے معنے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں جیسے اَبْلَسَ سے اِبلیس ہے اسی طرح اَدْرَسَ سے اِدْرِیْس ہے پس یہ لفظ عربی ہے۔ اور انہوں نے اس پر اصرار کیا ہی اور کہاہے کہ جیسے یَعْقُوْب عَقَبَ سے اور اسرائیل اسرال سے نکلا ہے اسی طرح ادریس اَدْرَسَ سے نکلا ہے ہو گو انہوں نے یہ نہیں لکھا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اور نام بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو عربی زبان سے نکلے ہیں۔ مثلاً اضحاق ضحک سے ہی اسمٰعیل سَمِعَ سے ہے۔ پس اُن کے نزدیک ادریس عربی لفظ ہی ہے۔ لیکن جو دوسرے ماہرین زبان ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ ناقابل قبول بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ عربی ہوتا تو غیر منصرف نہیں ہوسکتا تھا اس صورت میں یہ عربی عَلَم قرار دیا جائیگا اور عربی عَلَم غیر منصرف نہیں ہوتا۔ پس انہوں نے اس کو ناجائز قرار دیاہے اور کہاہے کہ اس لفظ کو

عربی قرار دینے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ عَلم ہو اور دوسری یہ کہ غیر منصرف نہ ہو۔

اصمعی نے اور قرطبی نے اور صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جس زبان کا یہ لفظ ہے اس زبان میں قریباً قریباً انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہو جن معنوں میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ابن السکیت کو غلطی لگ گئی ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ یہ عربی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ یہ عربی نہیں اگر عربی ہوتا تو غیر منصرف نہ ہوتا۔ لیکن ہم یہ سمجھیں گے کہ اس زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہوں گے۔ اس وجہ سے ابن السکیت کو دھوکا لگ گیا۔ مگر میرے نزدیک دونوں فریق کو دھوکا لگا ہے۔ ابن السکیت نے جو یہ کہا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یہ غلط ہے۔ اگر قاعدہ کی رو سے یہ عربی ہوتا تو غیر منصرف نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جو دوسرے علماء نے کہا ہے کہ عجمی لفظ ہے اور عجمی لفظ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہو گیا ہے انہوں نے بھی حقیقت کو پورے طور پر نہیں سمجھا۔ اس لئے کہ وہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا نام حنوک تھا اور جب اس کا نام حنوک تھا تو پھر ادریس اس کا ترجمہ ہوا۔ اور جب یہ ترجمہ ہوا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس میں عَلمیت نہ رہی اور اس کے غیر منصرف ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ رہی۔ کیونکہ غیر منصرف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اگر عَلم ہو تو وہ عجمی ہو۔ اگر ادریس ترجمہ ہے حنوک کا تو پھر عَلمیت نکل گئی۔ اور اگر یہ عَلم ہے تو پھر ادریس حنوک کا نہیں بلکہ کسی اور ہی کا نام ہو گا۔ اور اگر وہ حنوک ہی ہو تو ادریس اُس کا ترجمہ ہُوا۔ اور جب یہ ترجمہ ثابت ہو گیا تو عَلمیت سے بھی نکل گیا۔ پس جن لوگوں نے اسے غیر منصرف قرار دیا ہے انہیں بہر حال غلطی لگی ہے ورنہ اسے غیر منصرف قرار دینے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اب ہم اسباب پر غور کرتے ہیں کہ جب ادریس حنوک کا ترجمہ ہے تو پھر عربوں نے اسے غیر منصرف کیوں قرار دے دیا۔ آخر عربوں میں ادریس کا نام پہلے بھی پایا جاتا تھا اور وہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے ہی اس کے غیر منصرف ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے پس جب نزول قرآن سے پہلے ہی وہ اسے غیر منصرف قرار دے چکے تھے تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ اُن کو یہ غلطی کیوں لگی اور وہ اس دھوکا میں کس طرح مبتلا ہو گئے کہ یہ غیر منصرف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کو یہ دھوکا رہا ہے کہ وہ عربی زبان کے بھی بڑے ماہر ہیں اور غیر زبانوں کا بھی بڑا مطالعہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ عربی زبان کے تو بے شک ماہر ہوں گے مگر غیر زبانوں کے متعلق اُن کا مطالعہ بہت ہی محدود تھا اور نہ صرف غیر زبانوں کے متعلق بلکہ غیر مذاہب کے متعلق بھی اُن کے معلومات نہایت سطحی تھے۔ ہم جب تفاسیر پڑھتے ہیں اور اُن میں بائبل کے حوالے آتے ہیں تو ہمیں اُن حوالوں کو پڑھ کر شرم آجاتی ہے کیونکہ وہ اتنے غلط اور خلاف واقعہ ہوتے ہیں کہ تورات اور انجیل سے اُنہیں کوئی دور کی بھی نسبت نہیں ہوتی۔ بالکل غلط اور سراسر غلط حوالہ جات اُن تفسیروں میں آجاتے ہیں اور لکھا ہوتا ہے کہ یہ بات تورات میں ہے یہ بات انجیل میں ہے حالانکہ وہ بات نہ توراۃ میں موجود ہوتی ہے نہ انجیل میں موجود ہوتی ہے اس کی

وجہ یہ ہے کہ وہ محض یہودیوں سے بات سنکر اپنی کتابوں میں درج کر لیتے تھے اور یہودی اُن سے کھیل کھیلتے تھے۔ وہ بالکل جھوٹی باتیں اپنی طرف سے بنا کر انہیں بتا دیتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ یہودی بڑے دیانتدار ہیں۔ جب انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق ایک بات بتائی ہے تو وہ ضرور سچی ہوگی۔ چنانچہ جب بھی انہیں بائبل کے متعلق کوئی بات دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ یہودی علماء کے پاس چلے جاتے اور وہ انہیں بالکل من گھڑت قصے اور واقعات بتا دیتے اور یہ اُن قصوں کو اپنی تفسیروں میں درج کر لیتے جب یہودیوں کو اس کا علم ہوتا تو وہ اور زیادہ ہنسی اُڑاتے کہ دیکھو ہم نے تو ان سے مذاق کیا تھا اور انہوں نے اس کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا اب یہ لوگوں کی نگاہ میں خوب رسوا ہونگے۔ اس سے بے شک ہمارے علماء کی دیانتداری اور نیکی تو ثابت ہوتی ہے مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ غیر مذاہب کے متعلق اُن کا علم بہت محدود اور ناقص تھا۔ اگر خدا تعالیٰ کسی وقت مسلمانوں کو توفیق دے اور وہ تفاسیر میں سے تورات اور انجیل کا باب نکال دیں تو گو یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی مگر اس کے نتیجہ میں انہیں غیر مذاہب والوں کے سامنے وہ ذلت محسوس نہیں ہوگی جو اب محسوس ہوتی ہے۔ اتنی غلط باتیں تورات اور انجیل کے متعلق تفسیروں میں پائی جاتی ہیں کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے کسی نے پوچھا کہ فلاں بات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا میں پھر بتاؤں گا۔ چنانچہ وہ شخص چلا گیا۔ اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے مجھے بلایا اور کہا کہ فلاں یہودی کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ تمہاری کتابوں میں اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔ اُس نے ایک نہایت ہی لغو اور فضول اور بیہودہ قصہ بیان کر دیا۔ دوسرے دن وہ شخص آیا تو راوی کہتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اُسے وہی لغو اور بیہودہ قصہ بتا دیا جو اس یہودی نے بتایا تھا۔ اب اس میں حضرت ابن عباسؓ کا قصور نہیں قصور اس یہودی کا ہی ہے مگر حضرت ابن عباس کا اتنا قصور ضرور ہے کہ انہوں نے مومنانہ طور پر یہ یقین کر لیا کہ وہ خبیث اور بے ایمان یہودی جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ حضرت ابن عباس نے جو کچھ کیا اپنی سادگی اور نیکی کے نتیجہ میں کیا، پھر بھی ہماری کتابوں میں ان باتوں کا موجود ہونا ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔ آج کل ہم بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ مگر اس تحقیق میں ہم عربی کی کتابوں سے مدد لیتے ہیں۔ عبرانی اور یونانی کتابیں دیکھتے ہیں۔ لغت کو مدنظر رکھتے ہیں تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر کوئی بات پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی وقت ہماری تحقیق میں بھی کوئی غلطی ثابت ہو جائے۔ مگر بہرحال ہماری باتیں سچ کے گرد چکر لگا رہی ہیں۔ کیونکہ ہماری بنیاد حقیقت لُغت اور اسرارِ لغت اور تاریخی واقعات پر ہے۔ اور بعض مفسرین کی بنیاد محض جھوٹے واقعات اور جھوٹے قصوں پر ہے۔ اور ان دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ ان مفسرین میں سے بعض کا یہ طریق تھا کہ وہ یہودیوں کے پاس جاتے اور اُن سے دریافت کرتے کہ فلاں بات کس طرح ہے اور یہودی اُن سے مذاق کر دیتے تھے۔ مثلاً رعد کا لفظ

آیا تو وہ کسی یہودی عالم کے پاس چلے گئے اور اُس سے پوچھا کہ بتلایئے رعد کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو آسمان پر ہوتا ہے۔ اس کے اتنے پَر ہوتے ہیں وہ اس طرح پَر ہلاتا ہے تو اس سے سیٹیوں کی آواز پیدا ہوتی ہے سیٹیوں کی آواز سے مور پیدا ہوتے ہیں۔ مور کے پَروں سے آگ نکلتی ہے اور آگ سے کڑک اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس شخص نے تو ایک مذاق کیا تھا مگر انہوں نے اپنی سادگی سے یہ سمجھ لیا کہ اُس نے جو کچھ بتوا اس کیلے ہے وہ بالکل درست ہے اور یہی رعد کی تفسیر ہے۔ اس چیز نے اُن تفاسیر کے علمی پایہ کو بہت گرا دیا ہے۔ بہرحال یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ادریس کا نام اسلام سے پہلے عربوں میں پایا جاتا تھا اور حنوک کا مفہوم ادریس سے ملتا جلتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس کا نام حنوک تھا اُسے ادریس کیوں کہتے تھے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بعض لوگوں کے دو نام بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کو بعض دفعہ دوسرے ناموں سے بھی بلایا جاتا ہے اور جب پوچھا جائے کہ یہ کیا؟ تو لوگ کہتے ہیں کہ ان کا فلاں نام بھی ہے۔ پس ہو سکتا تھا کہ یہ توجیہ کر لی جاتی کہ حنوک کا ادریس بھی نام تھا۔ مگر اس میں ہمارے لئے دقت یہ ہے کہ یہودی لٹریچر میں کہیں بھی ادریس کا نام نہیں آتا۔ یہودی نیم مسلمہ عہد نامہ قدیم یعنی ایپوکریفا میں ایک ایڈ راس ESDRAS نام آتا ہے مگر اس کی باتیں حنوک پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ جو باتیں قرآن کریم نے حضرت ادریس کے متعلق بیان کی ہیں وہ حنوک پر ہی چسپاں ہوتی ہیں ایڈ راس (ESDRAS) پر نہیں۔ پس اس مسئلہ کو ہم اس طرح بھی حل نہیں کر سکتے کہ ادریس حنوک کا دوسرا نام تھا۔

میرے نزدیک اس کا ایک اَور حل ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض دفعہ دوسری قوم کے لوگ سمجھانے کے لئے نام کا ترجمہ کر دیتے ہیں یہی طریق حنوک کے بارہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی یہودی نے اپنے کسی عرب دوست کے سامنے حنوک کا نام لیا تو وہ حیران ہُوا کہ یہ حنوک کیا چیز ہے۔ وہ یہودی کوئی ذہین شخص تھا اور عربی بھی جانتا تھا۔ خود مدینہ میں بھی یہود آباد تھے۔ اس نے حنوک کا عربی میں ترجمہ کر کے بتا دیا کہ حنوک کو تم ادریس سمجھ لو۔ یوں حنوک کا نام بھی عربی میں موجود ہے مگر ایک اَور شکل میں۔ چنانچہ عربی زبان میں حنک کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس سے حنوک کا سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ مگر چونکہ یہ لفظ عربی میں اس شکل میں نہیں پایا جاتا اس لئے اُس کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ بہرحال اُس یہودی عالم نے عربوں کو سمجھانے کے لئے حنوک کا ترجمہ ادریس کر دیا۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب ایک عرب اس نام کو سنیگا تو وہ خیال کریگا کہ یہ عَلم بھی ہے اور عجمی بھی ہے کیونکہ اُس کا بتانے والا عجمی ہوگا۔ پس میرے نزدیک اِس کو غیر منصرف اس لئے کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے کسی زمانہ میں اسلام سے پہلے عربوں کو یہ بتانے کے لئے کہ حنوک کیا چیز ہے۔ ایسے الفاظ میں جو اہل عرب کے لئے قریب الی الفہم تھے۔ اس کا ترجمہ کر کے ادریس بتا دیا۔ جیسے اس شخص کو جو بڑے عزم اور ارادے والا ہو انگریزی میں

ولیم (WILLIAM) کہتے ہیں۔ ولیم مجموعہ ہے WILL اور HELM کا۔ اور WILL کے معنے ارادہ اور HELM کے ایک معنے HELMET کے ہیں اور HELMET کے معنے لوہے کی خود کے ہوتے ہیں۔ پس ولیم کے معنے ہوئے زرہ جیسی یا خود جیسی نیت اور عزم رکھنے والا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کریں گے تو اولوالعزم کہہ دیں گے۔ اب اگر کسی انگریز کے سامنے ہم اس کا ذکر کریں اور وہ ہم سے پوچھے کہ اولوالعزم کیا ہوتا ہے؟ تو ہم کہیں گے ولیم۔ گویا اس کو سمجھانے کے لئے ہم اُسی کی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیں گے اور یہ طریق نہ صرف دنیا میں رائج ہے بلکہ خدا تعالیٰ بھی اسی طرح کرتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں انگلستان گیا ہوں اور ایک فاتح جرنیل کی طرح اُس میں داخل ہوا ہوں اور میں اس وقت سمجھتا ہوں کہ میں ولیم دی کنکرر ہوں (یہ رؤیا تفصیل کے ساتھ الفضل ۲۴ ؍جون ۱۹۴۴ء میں چھپا ہوا ہے) چونکہ الہاموں میں میرا ایک نام اولوالعزم بھی آیا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے مجھے اس کا ترجمہ کر کے دکھا دیا۔ تو اصل حقیقت یہ ہے کہ عربوں کو حنوک کا ترجمہ کر کے ادریس بتایا گیا۔ اور چونکہ اُن کے سامنے اِسے نام کے طور پر پیش کیا گیا۔ اِس لئے انہوں نے سمجھا کہ یہ عَلَم ہے۔ اور چونکہ بتلانے والا عجمی تھا انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ عجمی ہے۔ اصل میں عربی اور عبرانی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں مگر رفتہ رفتہ عرب بھی اس بات کو بھول گئے اور یہودی بھی بھول گئے کہ عربی اور عبرانی تو ایک ہی چیز ہیں

اِس وجہ سے انہوں نے عبرانی کو بالکل غیر زبان سمجھ لیا۔ یہودیوں کے نزدیک عربی غیر زبان تھی اور عربوں کے نزدیک عبرانی غیر زبان تھی حالانکہ عربی زبان اصل تھی اور عبرانی ایک قبیلہ کی زبان تھی۔ باقی رہا عربی اور عبرانی کا اختلاف سو یہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ زبان ایک ہی ہوتی ہے مگر ایک علاقہ والا اَور طرح بولتا ہے اور دوسرے علاقہ والا اور طرح بولتا ہے

میں جب حج کے لئے گیا تو سیٹھ ابوبکر صاحب کے ہاں جدّہ میں ٹھہرا۔ اُن کا ایک یمنی نوکر تھا۔ میں اُس سے عربی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ میری باتوں کو خوب سمجھتا تھا مگر کسی کسی بات پر وہ حیران ہو کر میرا مُنہ دیکھنے لگ جاتا اور اُسے پتہ نہ لگتا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ آخر میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ بات کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ یمنیوں اور حجازیوں کے بعض الفاظ میں بڑا بھاری فرق ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ وہ آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ پھر اس نے لطیفہ سُنایا کہ مکہ میں ایک امیر عورت تھی جس کا ایک یمنی ملازم تھا یمن کے لوگ اکثر مکہ میں علم حاصل کرنے کے لئے آجاتے ہیں اور چونکہ اُن کی معاش کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے وہ گھروں میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے مکہ میں یمنی نوکر بڑی کثرت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ بہرحال وہ اس عورت کے ہاں ملازم تھا۔ وہ عورت حُقّہ پینے کی عادی تھی۔ یوں بھی مکہ والے حقہ پینے کے بڑے شائق ہوتے ہیں وہ بڑے بڑے خوبصورت حقے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سَو سَو روپیہ میں خریدتے ہیں اور حقہ کے نیچے جو

پانی والا برتن ہوتا ہے وہ بھی مٹی کا نہیں بلکہ
شیشے کا ہوتا ہے۔ ہمارا ملک چونکہ غریب ہے
اس لئے یہاں لوگ معمولی حقہ پر گذارہ کر لیتے
ہیں اور حقے کا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے
وہ بھی مٹی کا ہی ہوتا ہے مگر اُن کے بڑے بڑے
نفیس حقے ہوتے ہیں۔ شیشے کا برتن ہوتا ہے
جس میں سے پانی اُوپر کو اُٹھتا ہُوا نظر آتا ہے
اور لمبے لمبے نیچوان ہوتے ہیں جن میں پانچ پانچ
چھ چھ گز کا چکر پڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایک دن جبکہ
اُس عورت نے حقہ کا پانی بدلنا چاہا تو اس نے
اپنے نوکر کو بلایا اور کہا غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ۔ شیشہ
کا پانی بدل دو۔ لفظی لحاظ سے تو اس کے اتنے ہی
معنے ہیں کہ شیشہ بدل دو۔ مگر محاورہ میں اِسکے
یہ معنے ہوتے ہیں کہ شیشہ کا پانی بدل دو۔ لیکن
یمنی زبان میں غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ کے یہ معنے ہوتے
ہیں کہ شیشے کا برتن توڑ دو۔ جب اُس عورت نے
نوکر سے کہا کہ غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ۔ تو وہ حیران ہوکر
کہنے لگا کہ سِتِّیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ آقا یہ تو بڑی
اچھی چیز ہے۔ سِتِّیْ، سَیِّدَتِیْ سے بگڑا
ہُوا ہے۔ اُسے غصہ آیا کہ میں کہہ رہی ہوں پانی بدل
دے اور یہ کہتا ہے کہ یہ تو بڑا اچھا ہے۔ چنانچہ
وہ اسے ناراض ہوئی کہ قُلْتُ لَکَ غَیِّرِ الشِّیْشَۃَ
میں جو تجھ سے کہتی ہوں کہ شیشے کا پانی بدل دے
پھر تُو کیوں نہیں بدلتا۔ اُس نے پھر ڈرتے ڈرتے
کہا سِتِّیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ بیگم صاحبہ! یہ تو بڑا
اچھا ہے۔ اِس پر عورت نے اُسے ڈانٹ کر کہا
کہ جب میں تمہیں بار بار ایک بات کہہ رہی ہوں
تو تم کیوں نہیں مانتے۔ اِس پر اُس نے شیشے کا
برتن اٹھایا اور زور سے دیوار کے ساتھ مار کر
اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ عورت نے شور مچا دیا۔
کہ کمبخت تُو نے یہ کیا کر دیا۔ اتنا قیمتی برتن تُو نے
ضائع کر دیا ہے۔ اس نے کہا میں تو پہلے ہی کہہ رہا
تھا کہ یہ برتن بڑا اچھا ہے اِسے ضائع مت کریں
مگر آپ ماننے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ اب میں نے
آپ کے حکم کو مان کر اسے توڑ دیا ہے تو آپ خفا
ہو رہی ہیں۔ اس پر عورت اَور زیادہ خفا ہوئی مگر
آخر کسی یمنی زبان کے واقف نے اُسے بتایا کہ اس
میں نوکر کا کوئی قصور نہیں۔ یمن میں تغییر کے معنے
تکسیر یعنی توڑ دینے کے ہی ہوتے ہیں۔

تو زبان میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے ہی
بڑے بڑے تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ عربی
اور عبرانی میں بھی اسی وجہ سے فرق نظر آتا ہے
ورنہ اسمٰعیل اور اسحاق دونوں ابراہیم کی اولاد میں
سے ہی تھے۔ مگر چونکہ اسمٰعیل اور جگہ رہے اور
اسحاق اور جگہ۔ اس لئے عربی اور عبرانی میں فرق
پیدا ہو گیا۔ لیکن اس فرق کے باوجود کوئی لفظ نکال
لو وہ عربی سے ضرور ملتا جلتا ہوگا۔ مجھے تو بہت ہی
کم کوئی ایسا لفظ نظر آیا ہے جو عربی سے نہ ملتا ہو
حنوک کو ہی دیکھ لو۔ عبرانی میں حنوک کہا جاتا ہے
اور عربی میں حنک کا لفظ موجود ہے یا مثلاً حضرت
مسیحؑ نے صلیب کے وقت کہا کہ ایلی ایلی لما
سبقتانی۔ یہ سبقتانی عربی کا سبقتنی
ہی ہے صرف عبرانی میں ت کو لمبا کر دیا گیا ہے۔
یا مثلاً اسمٰعیل جو سَمِعَ اور ایل سے مرکب ہے
اسے عبرانی میں یشمائیل کہتے ہیں۔ پس عربی اور
عبرانی دراصل ایک ہی زبانیں ہیں۔ مگر سوال یہ نہیں
کہ حقیقت کیا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ عرب والے
کیا سمجھتے ہیں۔ عرب والے عبرانی کو غیر زبان سمجھتے ہیں

اور عبرانی زبان والے عربی کو غیر زبان سمجھتے ہیں پس چونکہ وہ شخص جس نے حنوک کا عربوں کو نام بتایا اور جس نے اُن کی آسانی کے لئے اس کا عربی میں ترجمہ کر دیا وہ ایک ہیبرو تھا۔ اس لئے عربوں نے اس کو غیر منصرف بنالیا اور سمجھ لیا کہ یہ عَلَم عجمی ہے۔ بہرحال جس وجہ سے اسے غیر منصرف بنایا گیا وہ یہی تھی ورنہ ادریس ایک عربی لفظ ہے جو دَرَسَ سے نکلا ہے۔ ابن السکیت نے تو صرف چند مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ یعقوب عقب سے اور اسرائیل اسرال سے نکلا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی اور عبرانی کے سارے ہی الفاظ آپس میں ملتے ہیں۔ درحقیقت عربی اور عبرانی دو بہنیں ہیں یا یوں کہو کہ عربی ماں ہے اور عبرانی بیٹی۔ یوں تو سنسکرت وغیرہ بھی عربی زبان ہی کی بیٹی ہیں۔ مگر وہ زبانیں ایسی ہیں جیسے پڑپوتی ہوتی ہے۔ اور عبرانی وہ زبان ہے جو عربی کے پیٹ میں سے نکلی ہوئی ہے۔ پس چونکہ عبرانیوں نے حنوک کا ادریس کی شکل میں ترجمہ کر کے عربوں کو بتایا۔ اس لئے عربوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ عَلَم بھی ہے اور عجمی بھی۔ اصمعی۔ قرطبی اور صاحب کشاف کا یہ کہنا کہ وہ لوگ جو ادریس کو عربی لفظ قرار دیتے ہیں جاہل ہیں، یہ دراصل اُن کی اپنی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یعقوب بھی عَقَب سے نکلا ہے۔ اسمٰعیل بھی سَمِعَ ایل سے نکلا ہے۔ ادریس بھی دَرَسَ سے نکلا ہے یسوع بھی سَاعَ یَسُوْعُ سے نکلا ہے۔ جس کے معنے ہلاکت اور زوال کے ہیں۔ چونکہ حضرت مسیح کے لئے صلیب مقدر تھی اس لئے پہلے سے ہی آپ کا یہ نام رکھ دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوگا جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام خدا تعالےٰ نے آپ کی والدہ اور دادا سے محمدؐ رکھوایا اور آپ کی کامیابی اور اعلیٰ درجہ کی زندگی کی طرف اِس نام میں ہی اشارہ کر دیا۔

غرض یہ ساری غلطی عربی اور عبرانی کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کو عجمی قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ادریس کے کوئی معنے نہیں۔ جیسے اُن کے نزدیک اسمٰعیل کے بھی کوئی معنے نہیں۔ اضحاق کے بھی کوئی معنے نہیں حالانکہ ادریس کے بھی معنے ہیں۔ اسمٰعیل کے بھی معنے ہیں۔ اضحاق کے بھی معنے ہیں اور اسرائیل کے بھی معنے ہیں۔ ابن السکیت نے لکھا ہے کہ اسرائیل اسرال سے نکلا ہے مگر یہ درست نہیں۔ اسرائیل کا عبرانی تلفظ یسرائیل ہے جو یسر اور ایل سے مرکب ہے۔ یسر کے معنے جنگجو اور بہادر سپاہی کے ہیں اور ایل کے معنے خدا کے ہیں۔ پس اسرائیل کے معنے ہیں خدا کا بہادر سپاہی حنوک جسے انگریزی میں اینوخ لکھتے ہیں اس کے معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے خوب سکھانے والے کے ہیں اور ادریس کے معنے خوب پڑھانے والے کے ہیں۔ خوب پڑھانے والا اور سکھانے والا ہم معنے الفاظ ہیں۔ پس ادریس یقیناً حنوک کا عربی ترجمہ ہے۔ مگر عربوں کو جب حنوک کے معنے بتائے گئے تو انہوں نے ادریس کو نام سمجھا۔ اور چونکہ انہوں نے یہ یہودیوں سے سُنا تھا اس لئے انہوں نے اس کو عجمی نام سمجھا اور اس کو غیر منصرف قرار دے دیا۔

حنوک یعنی ادریس کا ذکر بائبل میں کتاب پیدائش میں آتا ہے۔ چنانچہ پیدائش باب ۴ میں اسے قائن کی نسل سے لکھا ہے (قائن وہی ہے جسے

عربی میں قابیل کہتے ہیں اور جو ہابیل کا قاتل تھا) گویا ایک حنوک قائن کا بیٹا تھا۔ اُس کا بیٹا عیراد۔ اُس کا بیٹا محویا ایل اُس کا بیٹا مقوسا ایل۔ اُس کا بیٹا لمک۔ اُس کے بیٹے یابل یوبل ایک بیوی سے اور دوسری سے توبلقائین۔

باب ۵ میں لکھا ہے کہ جب ہابیل مارے گئے تو آدم کو اللہ تعالےٰ نے اُن کی جگہ سیت بیٹا دیا۔ یہ سیت وہی ہیں جن کو ہمارے مفسر شیثؑ کہتے ہیں۔ سیت سے انوس۔ انوس سے قینان قینان سے محلل ایل اور محلل ایل سے یارد اور یارد سے حنوک اور حنوک سے متوشلح۔ متوسلح سے لمک پیدا ہوا اور لمک سے نوح پیدا ہوا۔

(پیدائش باب ۵ آیت ۳ تا ۲۹)

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی حنوک کا نام مقبول ہو گیا تھا چنانچہ آدم کی پانچ سات پشتوں میں ہی دو آدمیوں کا نام حنوک رکھا گیا۔ ایک قائن کا بیٹا تھا اور ایک سیت نبی کا پانچویں پشت میں پوتا تھا اور یہی حنوک ہر جسے ادریسؑ کہا گیا ہے۔ جو حضرت نوحؑ کے دادا تھے۔ اسلامی روایات کے مطابق آدمؑ کے نسب نامہ میں پہلے نبی آدم تھے جو باپ تھے۔ دوسرا نبی شیث تھا جو آدم کا بیٹا تھا۔ تیسرا نبی حنوک تھا جو آدم کا پانچواں پڑپوتا تھا اور چوتھا نبی نوح تھا جو پانچویں پڑپوتے کا پوتا تھا۔

حنوک کے حالات بائبل کی کتاب پیدائش باب ۵ آیت ۲۱ تا ۲۴ میں لکھا ہے کہ حنوک تین سو پینسٹھ سال تک زندہ رہا اور متوسلح کی پیدائش پر جو اس کا پہلا بیٹا تھا اور پینسٹھ سال کی عمر میں پیدا ہوا حنوک خدا کا مقرب بنا اور تین سو سال تک اس مقام پر قائم رہا۔ بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ تین سو سال تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ (یعنی خدا تعالیٰ کی معیت اُسے حاصل ہوئی) پھر لکھا ہے کہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہی وہ غائب ہو گیا اس لئے کہ خدا نے اُسے لے لیا۔

اِس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ حنوک یعنی ادریس موت تک نیکی پر قائم رہا۔ اور ایسی حالت میں اُس پر موت آئی مگر الفاظ پرستی کا بُرا ہو بعض یہود اور مسلمانوں نے عجوبہ پرستی سے کام لے کر اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ گویا خدا تعالیٰ نے اُسے آسمان پر اٹھا لیا۔ (ایسے مسلمانوں کے نزدیک وہ آسمان پر اُٹھائے جانیوالوں کی فہرست میں شامل ہے جن میں الیاس اور مسیح ناصری کا وجود بھی ہے)

بائبل کہتی ہے وہ خدا تعالےٰ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اگر "لے لیا" کے معنے لفظی کئے جائیں تو "ساتھ ساتھ چلتا تھا" کے معنے بھی لفظی کرنے ہونگے اور اس صورت میں یا تو اِن آیات کا یہ ترجمہ کرنا ہوگا کہ ادریس آسمان میں ساری عمر رہا اور وہاں خدا اور وہ ساری عمر چہل قدمی کرتے رہے اور یا یہ معنے کرنے ہوں گے کہ حنوک کے پینسٹھ سال کی عمر کو پہنچنے پر خدا تعالےٰ زمین پر آ گیا اور حنوک کے ساتھ رہتا رہا۔ بہرحال تین سو پینسٹھ سال کی عمر میں آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ یہاں سے نہیں نکلتا۔ یا یہ ثابت ہوتا ہے کہ پینسٹھ سال کی عمر میں حنوک آسمان پر چلا گیا اور اس کی بیوی بھی وہیں چلی گئی اور آسمان پر اس کے کئی بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئیں (باب ۵ آیت ۲۳) کیونکہ اُسی وقت سے اس کے خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کا بھی ذکر ہے۔

اور اس کے بیٹے بیٹیاں پیدا ہونے کا بھی ذکر ہے اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ حنوک یا ادریس آسمان پر گیا ہی نہیں بلکہ خدا آسمان سے زمین پر اُتر کر اُس کے پاس آگیا۔ اور چونکہ خدا کا پھر آسمان پر جانا بائبل سے ثابت نہیں اس لئے یہی کہنا پڑے گا کہ خدا پھر زمین پر ہی رہا۔

خلاصہ یہ کہ غیر طبعی اور خلاف سُنّت الٰہیہ بائبل کی آیتوں کے معنے کر کے ایسا تمسخرانہ مضمون خدا تعالےٰ کی طرف اور بائبل کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے جسے کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ سیدھی سادی بات تھی کہ حنوک آخری دم تک خدا تعالےٰ کا مقرب رہا اور خدا تعالیٰ کا قرب اُسے زندگی میں بھی حاصل رہا اور مرنے کے بعد بھی وہ اس کے مقربوں میں شمار ہوا۔

یہی محاورہ خدا تعالےٰ کے ساتھ چلنے کا اور جگہوں میں بھی بائبل میں آیا ہے لیکن وہاں اس کے معنے آسمان پر جانے کے کوئی نہیں کرتا مثلاً نوح علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے۔

"نوح خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا"

(پیدائش باب ۶ آیت ۹)

پھر حضرت ابراہیم کے بارہ میں آتا ہے

"تُو میرے حضور میں چل اور کامل ہو"

(پیدائش باب ۱۷ آیت ۱)

اسی طرح تمام بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے آتا ہے کہ اے انسان خدا تجھ سے کیا چاہتا ہے یہی کہ

"اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے"

(میکاہ باب ۶ آیت ۸)

اب کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تمام بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اپنا سر نیچا کر کے خدا کے ساتھ ٹہلا کرو۔

پس خدا کے ساتھ چلنے کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ خدا تعالےٰ کسی مقام پر ہے جہاں انسان اُس کے ساتھ چلتا ہے اور نہ اُٹھا لینے کے معنے مقام بدلنے کے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے بھی صرف نیک انجام پانے اور موت کے بعد خدا تعالیٰ کا مقرب ہونے کے ہیں۔

نئے عہد نامہ میں بھی حنوک یا ادریس کا ذکر ہے مگر وہاں اپنی علمیت جتانے کے لئے ک کو ق سے بدل کر لکھا گیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے مَیں بتا چکا ہوں کہ عربی میں بھی حنک کا لفظ موجود ہے پس اس کا تلفظ حنوک ہی ہے حنوق نہیں۔ بہرحال عبرانیوں باب ۱۱ آیت ۵ میں لکھا ہے

"ایمان کے سبب سے حنوق اٹھا لیا گیا تاکہ موت کو نہ دیکھے اور نہ ملا اس لئے کہ خدا نے اُسے اُٹھا لیا تھا"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ پولوس یہود کے اس عام عقیدہ سے متاثر تھا کہ حنوک بوجہ نیک ہونے کے موت سے بچ گیا اور آسمان پر اٹھا لیا گیا حالانکہ یہ عقیدہ مسیحی عقیدہ کے خلاف ہے مسیحی عقیدہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ موت گناہ سے ہے اور گناہ ورثہ سے ہے اور آدم کے گناہ کی وجہ سے تمام بنو آدم گنہگار ہیں۔ انہیں مسیح نے کفارہ کے ذریعہ ورثہ کے گناہ سے نجات دی لیکن پولوس نے یہ نہ سوچا کہ حنوک مسیح کے بغیر موت سے نجات پا گیا اور نیک ہو گیا اور مسیح بلکہ حواری بھی باوجود کفارہ پر ایمان لانے کے موت سے نجات نہ پا سکے یا دوسرے لفظوں میں نیک نہ ہو سکے پس جب مسیح

کفارہ پر ایمان لانے کے باوجود موت سے نہیں بچے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ گناہوں سے پاک نہیں ہوئے اور حنوک مسیح پر ایمان لائے بغیر موت سے بچ گیا اور نیک ہو گیا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفارہ کی ساری تھیوری ہی باطل ہے۔

بائبل کے بعض ماہرین حزقیل باب ۱۴ آیت ۱۴ اور حزقیل باب ۲۸ آیت ۳ میں جو دانی ایل کا نام آتا ہے اُسے درحقیقت حنوک یعنی ادریس قرار دیتے ہیں۔

حزقیل باب ۱۴ آیت ۱۴ میں لکھا ہے

"ہرچند یہ تین شخص نوح اور دانی ایل اور
ایوب اس میں موجود ہوتے تو خداوند یہوواہ
کہتا ہے کہ وے اپنی صداقت سے فقط
اپنی ہی جانوں کو بچاتے۔"

یعنی یہود آج کل اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اگر نوح اور دانی ایل اور ایوب بھی ان میں موجود ہوتے تب بھی خدا اُن کی وجہ سے یہود کو اپنے عذاب سے نہ بچاتا وہ صرف اپنی ہی جانوں کو بچا سکتے تھے یہود اُن کی وجہ سے خدا تعالےٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے تھے۔ اِن الفاظ پر بائبل کے عالم ھیلی وے (HELEVY) نے اور بعد میں شینی (CHEYNE) نے انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کی جلد ۲ میں یہ ثابت کیا ہے کہ دانی ایل اس جگہ پر غلط لکھ دیا گیا ہے۔ اصل میں اس جگہ پر حنوک (یعنی ادریس) مراد ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حزقیل کا زمانہ مسیح سے قریباً پونے چھ سو سال سے چھ سو سال قبل تھا اور یہی زمانہ دانی ایل کا بھی ہے۔ پس ان علماء کا خیال ہے کہ چونکہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس جگہ پر سابق انبیاء کا ذکر ہے اس لئے دانی ایل کا نام غلطی سے لکھا گیا ہے۔ درحقیقت اس جگہ پر حنوک کا ذکر ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں دانی ایل کا نام ہے یا حنوک کا۔ ہم اس بحث سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہودی علماء تسلیم کرتے ہیں کہ بائبل میں غلط باتیں لکھی گئی ہیں چنانچہ ایک معین غلطی یہ ہے کہ بائبل میں دانی ایل کا نام لکھا ہے۔ لیکن یہودی اور عیسائی علماء کہتے ہیں کہ یہاں دانی ایل غلط لکھا گیا ہے اصل میں حنوک کا نام چاہیئے۔

اسی طرح حزقیل کی کتاب کے باب ۲۸ کی آیت ۳ میں لکھا ہے۔

"دیکھ تُو دانی ایل سے زیادہ دانشمند ہے"

یہاں بھی دانی ایل غلط لکھا گیا ہے اور اس جگہ بھی درحقیقت حنوک کا لفظ تھا۔ اگر یہ استدلال درست ہے اور بظاہر حالات اس کی تائید میں ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کے انبیاء کی زبانوں پر حنوک کا نام اپنی دانائی اور اپنے تقویٰ میں بطور ایک ضرب المثل کے جاری رہتا تھا۔ یعنی علاوہ اس نتیجہ کے کہ بائبل میں دانی ایل کا نام آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد دانی ایل نہیں بلکہ حنوک ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ بائبل میں دیدہ و دانستہ یا جہالت سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ایک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جب بائبل دانی ایل کو دانشمندی میں نمونہ قرار دیتی ہے اور بائبل کے علماء کہتے ہیں کہ اس سے حنوک مراد ہے تو بائبل کے اصل الفاظ یہ ہوئے کہ

"دیکھ تُو حنوک سے زیادہ دانشمند ہے"

گویا حنوک کا نام اپنی دانائی کی وجہ سے قدیم انبیاء کی زبانوں پر بطور ایک ضرب المثل کے جاری رہتا تھا۔

حنوک کا ذکر یہودی اور مسیحی احادیث و لٹریچر میں

یہودیوں کی مشہور مذہبی کتاب ٹارگم (TARGUM) میں جو اُن کی احادیث کا مجموعہ ہے جیسے ہمارے ہاں مشکوٰۃ ہے لکھا ہے کہ حنوک خدا کا نیک بندہ تھا اور اس کو متاترن (METATRON) اور سفرا ربہ (SAFRA RABBA) یعنی بڑے عالم یا مذہبی علوم کے عالم کا خطاب دیکر خدا نے آسمان پر اٹھا لیا۔

سفر کے معنے عربی زبان میں کتاب کے ہوتے ہیں اور اسفار اس کی جمع ہے۔ پس سفرا کے معنے ہوئے کتابیں اور سفرا ربہ کے معنے ہوئے خدائی علوم والا۔ متاترن کے متعلق میں نے تحقیقات نہیں کی لیکن اس کے معنے بھی بڑے عالم کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال ٹارگم میں لکھا ہے کہ حنوک کو خدا تعالےٰ نے متاترن اور سفرا ربہ کا خطاب دے کر آسمان پر اُٹھا لیا۔ لیکن بعض یہودی کتابوں میں لکھا ہے کہ حنوک آخری عمر میں نیکی کے رستہ سے ہٹ گیا تھا اور خدا نے اُسے اس لئے اٹھا لیا تاکہ وہ بدکار ہو کر بُرا انجام نہ دیکھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ آسمان پر نہیں اٹھایا گیا بلکہ طاعون سے مر گیا تھا (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۸) یہودی کتب میں یہ بھی آتا ہے کہ لکھنے کا علم حنوک نے ایجاد کیا تھا۔ اسی طرح علم ہیئت اور حساب بھی اُسی نے ایجاد کیا تھا (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ بحوالہ سفر یوہاسین SEFER YUHASIN) مسلمانوں میں بھی اسی قسم کی روایات آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہودی کتب سے ہی یہ باتیں نقل کی ہیں۔

یہودیوں کی ابتدائی تاریخ میں حنوک کا نام قریباً مٹ گیا تھا لیکن کچھ صدیوں کے بعد حنوک کا ذکر اُن کی کتابوں میں آنے لگا۔ چنانچہ بعد میں ایک الہامی کتاب حنوک کی کتاب کے نام سے اُن میں شائع ہوتی رہی۔ سفر حنوک (یعنی کتاب حنوک) میں لکھا ہے کہ لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے زمین کو چھوڑ دیا اور حنوک کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ اور آسمانی خزانوں کا اس کو نگران مقرر کر دیا۔ اور فرشتوں کا سردار مقرر کر دیا اور خدا کے تخت کے سامنے خاص مصاحب کے طور پر وہ مقرر کیا گیا۔ اس کو سب راز معلوم ہیں اور فرشتے اس کی پشت پر ہیں اور وہ خدا کا مُنہ ہے اور وہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتا ہے وہ روحانی علوم سکھاتا ہے وہ آرام کی جگہ پر روحوں کو لیجاتا ہے اور خدا کے مُنہ کا شہزادہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح اس کا نام تورات کا شہزادہ، دانائی کا شہزادہ، عقل کا شہزادہ اور شان و شوکت کا شہزادہ بھی ہے۔ موسیٰؑ پر خدا کا پیغام لانےوالا وہی تھا۔ (گویا ایک طرح اُسے جبریل کا عہدہ دیا گیا تھا)

سفر حکالوت (SEFER HEKALOT یعنی تذکرۂ انبیاء و اولیاء) میں لکھا ہے کہ جب ایلیا آسمان پر گیا تو وہ ساتویں آسمان پر جا کے ادریس کو ملا جس کو متاترن کا عہدہ دیا گیا ہے وہاں حنوک نے اپنے اُٹھائے جانے کا قصّہ مندرجہ ذیل الفاظ میں اس سے بیان کیا۔

زمین کی بدی کی وجہ سے جو شمہازائی
(SHAMAZAI) اور عزائیل AZAEL
نے پیدا کی حنوک کو خدا نے آسمان پر اٹھایا تاکہ
وہ دیکھ لے کہ خدا ظالم نہیں۔
یہ عزائیل وہی ہے جسے عربی میں عزازیل
کہتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جب شیطان نے دنیا میں
شرارتیں شروع کیں اور لوگوں نے خدائی احکام
کو نہ مانا تو اللہ تعالےٰ نے دیکھا کہ حنوک کو یہ بُرا
لگا ہے۔ چنانچہ اُس نے حنوک کو آسمان پر اٹھا لیا
وہاں اُسے مناترن کا عہدہ دیا گیا اور دانائی کے
سب دروازے اس کے لئے کھولے گئے اور
سب فرشتوں کا اُسے سردار مقرر کیا گیا اور اس
کے مادی جسم کو نورانی جسم میں تبدیل کر دیا گیا۔
حیّ حنوک (HAYYE HANOK)
نامی کتاب جسے عربی میں حیاۃ حُنک کہیں گے
یعنی حنوک کی زندگی کے حالات (حُنک عربی میں
اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے مختلف کاموں سے
تجربات حاصل کرلے گویا صاحب تجربہ آدمی)
اس پہلی کتاب سے بعد میں لکھی گئی ہے۔ اس میں
لکھا ہے کہ حنوک ایک نیک راہب تھا اُسے
آسمانی آواز نے دنیا کے لوگوں کی طرف بھیجا اور
پھر اس نے اُن کو آکر توبہ کی تعلیم دی بہت کر
شاگرد اس کے گرد جمع ہو گئے اور دانائی میں
ترقی کرتے کرتے وہ بادشاہ منتخب کیا گیا
۲۴۳ سال تک اُس نے دنیا میں امن قائم رکھا
لیکن آخر اُس نے خلوت کی خواہش کی اور اپنا
تخت چھوڑ دیا۔ مگر کبھی کبھی لوگوں کو تعلیم دینے
کے لئے ظاہر ہو جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد
خدا تعالےٰ نے اُسے زمین چھوڑنے کا حکم دیا اور
آسمان پر خدا کے بیٹوں کی حکومت اُس کے سپرد
کی (خدا کے بیٹوں سے یہودیوں کے نزدیک خدا
کے فرشتے مراد ہیں) وہ آسمان پر ایک گھوڑے پر سوار
ہو کر گیا جس طرح ایلیاہ نبی آسمان پر گیا تھا بہت
سے لوگ اُس کو آسمان پر چڑھتے ہوئے دیکھنے کے
لئے جمع ہوئے اور اُنھوں نے اُس کی سخت منتیں
کیں کہ وہ آسمان پر نہ جائے اور اُن میں رہے
لیکن اُس نے اُن کی نہ سُنی اور آسمان پر چلا گیا۔
بعض یہودیوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ
اُس نے موسوی قانون کے نازل ہونے پر اُسے
اختیار کر لیا۔ گو قانوناً وہ صرف نوح کی شریعت
کا پابند تھا جس میں صرف سات احکام تھے۔
یہ ایسی ہی روایت ہے جیسے ہمارے ہاں
کہتے ہیں کہ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا
اَلا یا ایّہا الساقی اَدِر کأساً وّ ناوِلہا

یعنی سعدی نے زلیخا میں کیا ہی اچھا کہا ہے کہ ؎

اَلا یا ایّہا الساقی اَدِر کأساً وّ ناوِلہا

حالانکہ زلیخا سعدیؒ نے نہیں لکھی بلکہ مُلّا جامیؒ نے
لکھی ہے اور پھر جو بات بیان کی ہے وہ نہ سعدی
نے کہی ہے نہ مُلّا جامی نے بلکہ حافظ شیرازی
نے کہی ہے۔ اسی طرح اس روایت میں کہا گیا ہے
کہ وہ نوحؑ کی شریعت کا پابند تھا حالانکہ نوحؑ اس
کا پوتا تھا۔ عیسائی لٹریچر میں سے کتاب عبرانیوں
کا حوالہ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ
عیسائیوں میں حنوک کے متعلق دو کتابیں پائی جاتی
ہیں جن کو الہامی صحیفے قرار دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ یہ مسیح سے پہلے لکھی گئی تھیں مگر اُن کا وجود
صرف سیحیوں میں ملتا ہے۔ اِس لئے اسے مسیحی لٹریچر کا

حصہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک صحیفۂ حنوک مطابق حبشی کلیسیاء کے ہے اور ایک صحیفۂ حنوک مطابق روسی کلیسیاء (SLAVONIC) کے ہے حبشی کتاب تو مختلف روایتوں کے ٹکڑوں کا مجموعہ ہے لیکن SLAVONIC یعنی روسی کتاب حنوک ایک زیادہ تفصیلی کتاب ہے۔ ان دونوں کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حنوک اپنی زندگی میں ہی آسمان پر چلا گیا اور وہ خدا کے فرشتوں کے ساتھ آسمان اور زمین میں چلتا پھرتا تھا۔ پھر وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس آیا اور اُس نے اُن کو وہ باتیں بتائیں جو اس نے آسمان پر دیکھی تھیں اور پھر آخر میں وہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ اپنے آسمانی سفر میں (۱) اُس نے آسمان اور زمین کے راز معلوم کئے اور (۲) طبیعیات کے تمام قانون اُس پر کھولے گئے (۳) اس نے خدا کے بیٹوں یعنی فرشتوں کو بھی دیکھا جن کو کہ انسان کی بیٹیوں سے بدکاری کرنے کے جرم میں سزا دی گئی تھی (۴) اُس نے ان سزا یافتہ فرشتوں کی سفارش کی۔

حنوک کی کتاب کا ذکر یہودی اور عیسائی لٹریچر میں عام طور پر پایا جاتا ہے گو کسی معیّن شکل میں اِس کا ذکر نہیں تیسری صدی عیسوی میں عیسائی علماء نے اِس کتاب کو غلط قرار دینا شروع کیا۔ نویں صدی عیسوی کے بعد اس کا ذکر بالکل ہی عیسائیت کے لٹریچر سے اُڑ گیا لیکن ۱۷۷۳ء میں بروس (BRUCE) نامی سیاح نے ایبے سینیا میں اس کے دو نسخے دریافت کئے اور انیسویں صدی میں اس کے کئی اڈیشن شائع کئے گئے۔ ان نسخوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشی نسخہ اصل میں عبرانی میں لکھا گیا تھا اور پھر اس کا یونانی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس یونانی نسخہ سے حبشی زبان میں اور پھر لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ ۸۷-۱۸۸۶ء میں یونانی نسخہ کے بھی کچھ ٹکڑے مل گئے اور وہ چھاپے گئے۔ یہ کتاب عیسائی لٹریچر میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس کتاب سے قبل از مسیح یہودی مذہبی تاریخ پر اور مذہبی خیالات پر اہم روشنی پڑتی ہے۔

(جیوئش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۱)

سلافی زبان یعنی روسی زبان میں ایک کتاب حنوک کے رازوں کی کتاب کے نام سے ملتی ہے اس کتاب کا وجود صرف سلافی زبان میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس کے جرمنی اور انگریزی میں ترجمے ہو گئے ہیں۔ اس میں زیادہ تفصیل کے ساتھ حنوک کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور مختلف ٹکڑوں کو ایک ترتیب دے دی گئی ہے۔ یہ کتاب اصل میں یونانی میں لکھی گئی تھی اس کے بعد سلافی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ کچھ حصے عبرانی سے ترجمہ کئے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ بائبل کے مشہور عالم چارلس (CHARLES) کا خیال ہے کہ اس کتاب کا اکثر حصہ ایک ہی مصنف کا لکھا ہوا ہے اور غالباً وہ مصر کا رہنے والا تھا کیونکہ مصری خیالات کا پرتو اُس میں نظر آتا ہے۔ یہ کتاب علماء کے نزدیک پچاس سے ستر سال قبل مسیح لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ایک نئے خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی دوزخ کو بھی آسمان پر ہی قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ دوزخ تیسرے آسمان پر ہے اور گنہگار فرشتے دوسرے آسمان پر رکھے گئے ہیں۔

حنوک کے متعلق جو واقعات اوپر بیان ہوئے ہیں یہ مختلف انبیاء کے واقعات سے مشابہت رکھتے ہیں بلکہ مختلف قوموں کے بزرگوں کے واقعات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً الیاس کے واقعات سے اسی طرح ہرقیول (HERCULES) گینی میڈ (GENYMEDE) سیمی رامیس (SEMIRAMIS) زی سوتھروس (XISUTHRUS) اور بادشاہ اناکوس (ANNACUS) کے واقعات بھی اسی قسم کے بتائے جاتے ہیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۹) بابل کے بادشاہ ایمی دورانکی EMMEDURANKI کے حالات بھی جو بابل کے ابتدائی بادشاہوں میں سے ساتواں تھا اسی طرح کے بتائے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حنوک اصل میں سورج دیوتا کا نام ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ایک انسان کا نام قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ اس کی عمر ۳۶۵ سال بتائی گئی ہے اور ۳۶۵ دن سورج کے سال کے ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کہ مسیحی مصنفوں کو ۳۶۵ سال کی بناء پر حنوک کو سورج دیوتا قرار دینے کا خیال تو آ گیا لیکن یہ خیال نہ آیا کہ حنوک کے بیٹوں بیٹیوں اور دادوں پڑدادوں کی عمریں نوسو اور دس سو اسی بائبل میں بیان کی گئی ہیں۔ پس بجائے اس کے کہ ۳۶۵ کی بناء پر آدمی کو خیالی قرار دیا جائے دوسری لمبی عمروں کو دیکھتے ہوئے آدمیوں کی بجائے عمروں کو کیوں نہ خیالی قرار دیا جائے۔ اگر ۳۶۵ کا ایک عدد حنوک کو خیالی قرار دینے کیلئے کافی ہے تو وہ دس بارہ عمریں جو آٹھ سو۔ نوسو اور ہزار سال کی بیان کی گئی ہیں اُن کی بناء پر ان افراد کو ہی کیوں نہ خیالی قرار دے دیا جائے؟

اسلامی لٹریچر میں حنوک کا ذکر ادریس کے نام سے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ادریس اور حنوک کے معنے ایک ہی ہیں۔ اس لئے مفسرین قرآن کا یہ نظریہ کہ ادریس سے مراد حنوک ہی ہے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ادریس کے حالات کی طرف جو اشارہ قرآن کریم میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔

احادیث میں ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادریس کو اپنے معراج میں چوتھے آسمان پر دیکھا (ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۲۲۰) تفاسیر میں اسرائیلی روایتوں کے ذریعہ سے یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ ادریسؑ اپنے ایک دوست فرشتہ کے ذریعہ سے چوتھے آسمان پر گئے اور وہاں عزرائیل نے انکی جان نکالی۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ ادریسؑ کی جان نہیں نکالی گئی۔ چنانچہ مجاہد کا قول ہے کہ ادریسؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا گیا اور وہ مرے نہیں جس طرح کہ عیسیٰؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اُن کو چھٹے آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ حسنؓ کی روایت ہے کہ اُن کو جنت کی طرف لیجایا گیا۔ یہ تمام روایات اسرائیلی ہیں یعنی کوئی بھی روایت ایسی نہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو سوائے معراج کی حدیث کے جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انہوں نے چوتھے آسمان پر ادریسؑ کو دیکھا۔ پس جہانتک اسلامی روایتی لٹریچر کا سوال ہے بہت سی وہ لغو باتیں جو اسرائیلی لٹریچر میں پائی جاتی ہیں مسلمانوں نے بھی نقل کی ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلامی مذہبی لٹریچر کا سوال ہے حدیثوں میں

صرف ادریس کے چوتھے آسمان پر ہونے کا ذکر ہے اور قرآن کریم میں صرف یہ ذکر ہے کہ وہ راستباز تھے اور نبی تھے اور ان کو بلند مقام پر خدا تعالےٰ نے اُٹھایا۔ اور حقیقتاً حنوک کے اتنے ہی حالات ہیں جن کو سچا کہا جا سکتا ہے اور کتاب پیدائش سے بھی اتنا ہی پتہ لگتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چلتا تھا یعنی راستباز تھا اور یہ کہ خدا نے اس کو ایک بلند مقام پر اٹھا لیا یعنی اس کا انجام بخیر ہُوا۔ اور اللہ تعالےٰ نے اُس کو مرنے کے بعد بھی اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

ادریسؑ کے متعلق یہ جو ذکر آتا ہے کہ آسمان سے اُن کے لئے گھوڑا آیا اور اس پر وہ چڑھ کر گئے بعینہٖ ایسا ہی ذکر مسلمانوں کی معراج کی روایتوں میں بھی ہے۔ مسلمانوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سواری آسمان سے لائی گئی جس کا نام بُراق تھا اور آپ اس پر چڑھ کر آسمانوں پر گئے۔ در حقیقت یہ آسمان پر جانا ایک اعلیٰ درجہ کا کشف ہے۔ انسان نورانی جسم کے ذریعہ سے آسمانوں پر بھی جاتا ہے اور خدا تعالےٰ کو بھی دیکھتا ہے لیکن یہ مادی جسم ان کاموں کے قابل نہیں ہے۔ نہ یہ آسمانوں پر جاتا ہے نہ یہ خدا کو دیکھتا ہے۔ عجوبہ پرست لوگ ان باتوں کو مادیات کی طرف لے جاتے ہیں اور غیر معقول باتیں بنانے لگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے اور وہ سائنس اور مذہب کے اختلاف کی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں۔ کاش کہ یہ لوگ حقیقت کو اس کی حد تک رکھتے اور مذہب کو کھیل اور تمسخر نہ بنا لیتے۔

حنوک کا خدا کے ساتھ چلنا حنوک کے متعلق جو یہ آتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اس کے مشابہ الفاظ حضرت اسمٰعیل کے متعلق بھی آتے ہیں لکھا ہے کہ

" خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا"

(پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰)

بلکہ در حقیقت یہ الفاظ خدا کے ساتھ چلنے سے بھی زیادہ زوردار ہیں۔ کیونکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ تھا خواہ وہ چلتا تھا یا لیٹتا تھا یا سوتا تھا۔ یہی مشابہت ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم میں اسمٰعیل اور ادریس کا ذکر اکٹھا آتا ہے۔ قرآن کریم میں دو جگہ پر ادریسؑ کا ذکر ہے۔ ایک اِسی جگہ سورۂ مریم میں اور دوسرا سورۂ انبیاء میں۔ سورۂ انبیاء میں ان الفاظ میں ذکر ہے وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (انبیاء ع ۶) اور اس سورۃ میں حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر کے معاً بعد حضرت ادریسؑ کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ یہ آیات یوں ہیں:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ (مریم ع ۴)

ان آیات میں اسمٰعیلؑ کو صادق الوعد اور ادریسؑ کو صدیق۔ اسمٰعیل کو بھی نبی اور ادریس کو بھی نبی قرار دیا گیا ہے۔

غرض چونکہ الٰہی صحیفوں میں ان دونوں نبیوں کے لئے "خدا کے ساتھ" کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔

اس مشابہت کی وجہ سے قرآن کریم میں اُن کا اکٹھا ذکر آتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ کا ذکر تو اُن کی باہمی مشابہت کی وجہ سے اکٹھا ہو گیا۔ یہاں جس مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے اُس کے لحاظ سے ادریسؑ کی طرف توجہ دلانے میں کیا حکمت ہے؟ ذکر یہ تھا کہ حضرت زکریا نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بیٹا عطا فرمائے۔ چنانچہ اس دعا کے نتیجہ میں حضرت یحییٰ پیدا ہوئے جن کا مسیح سے پہلے ارہاص کے طور پر آنا ضروری تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسیح کا ذکر کیا جو اصل مقصود تھا اور بتایا کہ مسیح کے متعلق عیسائی دنیا کے جو عقائد ہیں وہ غلط ہیں۔ مسیح خدا یا خدا کا بیٹا نہیں تھا بلکہ موسوی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ پھر بتایا کہ موسوی سلسلہ پیدا ہوا تھا ابراہیمؑ کی دعا سے۔ اور ابراہیم کے ساتھ دو وعدے تھے۔ ایک وہ جو اسمٰعیلؑ اور اس کی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے تھے اور دوسرے وہ جو اسحاقؑ اور اس کی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ کے ذکر کے بعد پہلے ابراہیم کا ذکر کیا پھر اسحاق اور یعقوب کا ذکر کیا اور پھر موسیٰؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ بنو اسحاق کی ترقی کے متعلق جتنے ابراہیم کے ساتھ جو وعدے کئے تھے وہ پورے ہو گئے۔ اس کے بعد اسمٰعیل کا ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ خیال کر لو کہ جس خدا نے اتنی دیر تک بنو اسحاق کے ساتھ اپنے وعدے پورے کئے ہیں کیا وہ اسمٰعیل کے وعدوں کو پورا نہیں کرے گا جو بڑا راستباز اور صادق الوعد تھا اور جس کے کاموں کی وجہ سے خدا اس سے بڑا خوش تھا جس شخص نے ہمارے ساتھ اتنی وفاداری کی کیا ہم اس کے ساتھ بے وفائی کریں گے اور اس کے متعلق اپنے وعدوں کو جھوٹا ہونے دیں گے۔ چنانچہ اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے ذکر کے بعد اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ ابراہیمی وعدوں کی ایک کڑی تو مسیحؑ پر آ کر ختم ہو گئی مگر اُس کا ایک دوسرا وعدہ بھی ہے تم اس کو بھی یاد کرو۔ چنانچہ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے وہ اسمٰعیل والا وعدہ یاد دلا دیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا کیونکہ آپ اسی اسمٰعیلی وعدہ میں آ جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسمٰعیل کے ذکر کے بعد ادریسؑ کا ذکر کیوں کیا گیا اور اس میں کیا حکمت مدنظر ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیح کے متعلق وہ خیال جس پر اس کی خدائی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اُس کا آسمان پر چلے جانا ہے اور یہ ایک ایسا خیال ہے جس میں بدقسمتی سے مسلمان بھی عیسائیوں کے ساتھ متفق ہیں اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ زندہ ہیں اور آسمان پر بیٹھے ہیں۔ عیسائی مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی خدائی کا استدلال نہیں کرتے۔ خود عیسائیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ یوسف کا بیٹا تھا اور اس میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں اگر مریم کا بیٹا ہونے سے اس کی خدائی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا تو یوسف کا بیٹا ہونے سے اُسکی خدائی میں کیا نقص واقع ہو سکتا ہے۔ پس وہ اس کی خدائی کی بنیاد واقعہ پیدائش پر نہیں بلکہ آسمان پر زندہ چلے جانے کے عقیدہ پر رکھتے ہیں اور یہ ایک ایسا نقطۂ نگاہ ہے جس کی ابھی تک تردید نہیں کی گئی تھی۔ عیسائیوں کے باقی سب اعتراضات کی

تردید کی جاچکی ہے مگر اُن کے اِس خیال کی تردید ابھی باقی تھی کہ مسیحؑ آسمان پر زندہ چلا گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ادریسؑ کا ذکر فرمایا اور اِس طرف اشارہ کیا کہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے متعلق جو الفاظ پائے جاتے ہیں ویسے ہی الفاظ بلکہ اُن سے بھی زیادہ شاندار الفاظ حضرت ادریس یا حنوک کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ مسیحؑ کے متعلق تو صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ

"وہ انہیں برکت دے رہا تھا کہ ایسا ہُوا کہ اُن سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اُٹھایا گیا۔" (لوقا باب ۲۴ آیت ۵۱)

مگر ادریسؑ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

"خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور وہ غائب ہو گیا۔ کیونکہ خدا نے اُسے اُٹھا لیا۔"

(پیدائش باب ۵ آیت ۲۴)

پس اگر مسیحؑ آسمان پر جانے کی وجہ سے خدا یا خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے تو ادریسؑ کی الوہیت کا بھی مسیحی دنیا کو اقرار کرنا چاہیئے کیونکہ بائبل کی رُو سے وہ بھی آسمان پر اٹھایا گیا تھا۔

بہرحال ادریس ایک ایسا وجود ہے جس کے ذریعہ مسیحی دنیا کے اُس خیال کی تردید ہوتی ہے جس پر مسیحؑ کی الوہیت کی بنیاد رکھی گئی ہے یعنی مسیحؑ کا آسمان پر زندہ چلے جانا۔ اور صرف یہی ایک حصہ تھا جس کی ابھی تک تردید نہیں ہوئی تھی۔ باقی سب باتوں کی خدا تعالیٰ نے تردید کر دی تھی مگر عیسائیوں کے اِس خیال کی ابھی تردید باقی تھی کہ مسیحؑ آسمان پر چلا گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات تھی جو پہلے کسی نبی میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ نہ زکریاؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ یحییٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ ابراہیمؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ موسیٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ ہارونؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسمٰعیلؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے۔ صرف ادریس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر گئے۔ اور روایات کے مطابق جس شان سے ادریسؑ کا آسمان پر جانا بتایا گیا ہے اُس شان سے مسیحؑ کا بھی آسمان پر جانا ثابت نہیں۔ پس وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا میں بتایا کہ مسیحؑ کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ آسمان پر گیا۔ ہم تمہارے سامنے ادریسؑ کو پیش کرتے ہیں۔ ادریسؑ کے حالات مسیحؑ کے حالات سے بہت زیادہ شاندار ہیں۔ پس اگر اُن حالات کی وجہ سے جو مسیح کو پیش آئے وہ الوہیت میں شریک ہو سکتا ہے تو ادریس اِس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی الوہیت میں شریک قرار دیا جائے۔

قرآن کریم میں بھی مسیحؑ کے متعلق تو صرف اِتنا ہی آتا ہے کہ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (نساء ع۲۲) خدا نے اُسے اپنی طرف اٹھا لیا۔ مگر ادریسؑ کے متعلق فرماتا ہے کہ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ہم نے اُسے ایک بلند مقام پر اٹھا لیا۔ چنانچہ معراج کی حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیحؑ کو دوسرے آسمان پر اور ادریسؑ کو چوتھے آسمان پر دیکھا۔ گویا وہ مسیح سے بھی اونچا اُٹھایا گیا۔ پس اگر ان الفاظ پر بنیاد رکھتے ہوئے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ

یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن پر خدا (تعالیٰ) نے نبیوں میں سے انعام کیا تھا

مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّ

اُن (نبیوں) میں سے جو آدم کی اولاد تھے اور جو ان لوگوں کی اولاد تھے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں بچایا

مِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ

اور ابراہیم اور یعقوب کی (اولاد سے تھے) اور اُن (لوگوں) میں

هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ

سے تھے جنکو ہم نے ہدایت دی اور اپنے لئے منتخب کرلیا جب اُن کے اوپر (خدائے) رحمٰن کا

الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٩﴾ السجدة

کلام پڑھا جاتا تھا تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے ۵۹

تم مسیح کو خدا قرار دیتے ہو تو ادریس کو کیوں خدا قرار نہیں دیتے۔

۵۹ تفسیر:۔ اب اوپر کی بحث کا اللہ تعالیٰ ایک نتیجہ نکالتا ہے اور فرماتا ہے کہ باوجود اُن انعامات کے جو زکریاؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو یحییٰ پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو عیسیٰ پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو ابراہیم پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو اسحاق پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو یعقوب پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو موسیٰ پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو ہارون پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو اسمٰعیل پر نازل ہوئے۔ باوجود اُن انعامات کے جو ادریس پر نازل ہوئے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ یہ سارے کے سارے انسان ہی تھے۔ بیشک یہ خدا کے نبی تھے مگر خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے اگر تم مسیحؑ کی زندگی کے حالات اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کے حالات پر غور کرو تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ یہ ذریتِ آدم میں سے تھے اور اُن لوگوں میں سے تھے جنکو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا اور ابراہیم کی اولاد میں سے تھے اور اسرائیل کی اولاد میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور انہیں برگزیدہ بنا لیا۔ اِن لوگوں پر جب خدائے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو یہ لوگ خدا تعالیٰ کے حضور میں گر جاتے تھے سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے کیونکہ وہ خدا کو ہی اپنا رب سمجھتے تھے۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا
پھر اُن کے بعد ایک ایسی نسل آئی جنہوں نے نماز کو
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ
ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے پس وہ عنقریب گمراہی کے

مفسرین کہتے ہیں کہ ذریۃ آدمؑ سے ادریسؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور مِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ سے ابراہیمؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ذریۃ ابراہیم سے اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ اسرائیل سے پہلے وَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ کو محذوف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذریۃ اسرائیل سے موسیٰؑ اور ہارونؑ اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے گویا ان الفاظ میں پچھلے انبیاء کی ایک لسٹ بیان کر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب ہمارے بندے تھے وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَاجۡتَبَيۡنَا اور اُن لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور جنہیں اپنے قرب کے لئے مخصوص کر لیا۔

اِس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مِمَّنۡ کا عطف کس پر ہے۔ سو میرے نزدیک یہ مِنَ النَّبِيّٖنَ پر ہے۔ یعنی وہ نبی ایسے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور انہیں برگزیدہ بنا لیا۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ کیا نبی ہدایت یافتہ نہیں ہوتے جب خدا تعالیٰ نے انہیں نبی کہہ دیا تھا تو اُن کا مہدی اور مجتبیٰ ہونا تو اسی میں آگیا تھا پھر اس کا علیحدہ ذکر کیوں کیا گیا؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ کبھی صفت ایک خاص خیال کے دُور کرنے کے لئے بھی بیان کر دی

جاتی ہے۔ اسرائیلی اور مسیحی مذہب ہیں نبیوں کو عام طور پر گنہگار اور خطا کار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ بائبل پڑھ کر دیکھ لو۔ یہود نے حضرت نوحؑ پر بھی الزام لگائے۔ حضرت لوطؑ کی طرف بھی گندے خیال منسوب کئے۔ حضرت داؤدؑ کو بھی گنہگار ٹھہرایا۔ حضرت ہارونؑ کو بھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا قرار دیا۔ غرض کوئی نبی ایسا نہیں جسے انہوں نے گنہگار نہ کہا ہو۔ اسی طرح عیسائی اللہ تعالیٰ کے سب انبیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں بلکہ انجیل میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا

"جتنے مجھ سے آگے آئے چور اور بٹمار ہیں"

(یوحنا باب ۱۰ آیت ۸)

گویا عیسائی اور یہودی دونوں قومیں انبیاء کو گنہگار قرار دیتی ہیں۔ یہودی تو اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اُن کی طرف گناہ منسوب کرتے ہیں اور عیسائی اس لئے اُن کو گنہگار قرار دیتے ہیں تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ چونکہ وہ گنہگار تھے اس لئے نجات کا موجب نہیں ہو سکتے۔ نجات صرف مسیح پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ ہے۔ غرض انبیاء کو گنہگار ثابت کرنے کے لئے ایک ایک غرض ان دونوں قوموں کے مدنظر ہے۔ ایک غرض یہودیوں کے سامنے ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے

غَيًّا ﴿٦٠﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

مقام تک پہنچ جائینگے۔ سوائے اسکے جو توبہ کرے گا۔ اور ایمان لائیگا اور نیک عمل کرے گا

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

یہ (لوگ) جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں

شَيْـًٔا ﴿٦١﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ

کیا جائے گا۔ (یعنی اُن جنتوں میں) جو ہمیشہ رہنے والی ہیں اور جن کا (خدائے) رحمٰن نے

عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿٦٢﴾

اپنے بندوں سے ایسے وقت میں وعدہ کیا ہے جبکہ وہ انکی نظروں سے ابھی پوشیدہ ہیں یقیناً خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے ۵۵

تمام انبیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں اور ایک غرض عیسائیوں کے سامنے ہے جس کی وجہ سے وہ سب انبیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا میں یہودیوں اور مسیحیوں کے انہی خیالات کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اُن کو ہماری طرف سے صرف لفظی طور پر ہی کا نام نہیں دیا گیا بلکہ وہ فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے اور برگزیدہ بھی تھے۔ تم کہتے ہو کہ وہ خدا کے نافرمان تھے حالانکہ اُن کی حالت یہ تھی کہ جب رحمٰن خدا کی نشانیاں اُن پر پڑھی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے خدا تعالیٰ کے حضور گر جاتے تھے۔

۵۵ حل لغات:۔ غَیّ کے معنے ہیں (۱) اَلضَّلَالُ۔ گمراہی (۲) اَلْخَيْبَةُ ناکامی (۳) اَلْاِنْهِمَاكُ فِي الْجَهْلِ۔ جہالت کی باتوں میں انہماک (۴) اَلْهَلَاكُ۔ ہلاکت (اقرب الموارد) مفردات میں لکھا ہے اَلْغَيُّ جَهْلٌ مِنَ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ۔ غَیّ اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے۔

تفسیر:۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انکی اُمتیں بگڑتے بگڑتے ایسی حالت پر پہنچ گئیں کہ نمازوں کی پابندی انہوں نے ترک کر دی یا دعاؤں کی رغبت ان کے دلوں میں سے جاتی رہی اور انہوں نے شہوات کی پیروی کی۔ شہوات سے لازماً بدکاری مراد نہیں ہوتی۔ بے شک بعض جگہ بدکاری بھی معنے ہوتے ہیں اور ہمیں اُن معنوں کا انکار نہیں مگر یہاں اِس کے یہ معنے نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے غلط اجتہادات کے تابع ہو گئے اور کلام الٰہی کی وہ غلط تاویلات جو انہوں نے اپنی نفسانیت کے ماتحت کی تھیں اُن کے پیچھے چل پڑے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان خدا تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر خود اس کتاب کے ذریعہ نہیں کرتا بلکہ اپنے اجتہادات سے کام لینا شروع کر دیتا ہے تو اس کا قدم غلط تاویلات کی طرف اٹھنا شروع

ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہلاک
ہو جاتا ہے کیونکہ ہدایت اور کامیابی اور علم اور نجات
کا دروازہ صرف اس کتاب نے کھولا ہوتا ہے۔
اب کتاب خواہ موجود ہو لیکن انسان اپنی عقل اور
اپنے اجتہاد سے اُس میں نئی نئی باتیں داخل کرنا
شروع کر دے تو خدا تعالیٰ کی ہدایت مشتبہ
ہو جائے گی اور بوجہ اس کے کہ وہ اپنے نفس کے
پیچھے چل رہا ہوگا ہلاکت اور بربادی اس کا احاطہ
کرلے گی۔

انہماک فی الجہل کی ایک یہ بھی قسم ہے کہ انسان
اُن باتوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے جن کا روحانیت
کی اصلاح یا خدا تعالیٰ کے قرب کے ساتھ کوئی
تعلق نہیں ہوتا۔ محض نئے نئے لطیفے نکالنا اس کا کام
رہ جاتا ہے۔ حقیقت اور معرفت سے وہ زیادہ سے
زیادہ دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے پاس
ایک دفعہ ایک مولوی صاحب آئے اور کہنے لگے۔
مولوی صاحب مَیں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں
کہ میرا کام لوگوں میں وعظ کرنا ہے اور وعظ
کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک
المبکیات کی اور ایک المضحکات کی۔ یعنی ایک اُن
باتوں کی جو لوگوں کو رُلانے والی ہوں اور ایک اُن
باتوں کی جو لوگوں کو ہنسانے والی ہوں۔ آپ نے
چونکہ بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ اس لئے
آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں کچھ
رُلانے والی باتیں ہوں اور کچھ ہنسانے والی باتیں
ہوں تاکہ میں اس سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کو
رُلا یا ہنسا سکوں۔

غرض انسان جب گرتا ہے تو پھر ایسی ہی
لغو باتوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ
کی کتاب پر غور کرنے کی عادت نہیں رہے گی۔ تو
عجیب و غریب قصوں کی طرف توجہ ہو جائے گی اور
اُنہی قصوں کو خدا تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر سمجھ
لیا جائے گا۔

مَیں نے بعض پُرانے مفسرین کو دیکھا ہے
ایسے ایسے لغو قصے وہ اپنی تفسیروں میں لاتے ہیں
کہ یوں معلوم ہوتا ہے اُنہیں قرآن کریم پر غور کرنے
کی عادت ہی نہیں۔ اُن کا انہماک محض انہماک فی الجہل
ہوتا ہے الانہماک فی الحکمۃ نہیں ہوتا۔ مثلاً
ایک نے لکھ دیا کہ فرشتے کے دس پر ہوتے ہیں
اس پر دوسرا تلاش کرتا ہے کہ کوئی پندرہ پروں والی
بھی روایت ہے یا نہیں۔ جب کوئی یہودی بتا دیتا کہ
ہاں پندرہ پروں والی بھی ایک روایت ہے تو وہ لکھتا
کہ فرشتے کے دس نہیں پندرہ پر ہوتے ہیں اور
فلاں روایت سے ثابت ہے۔ پھر کوئی اور یہودی
کہہ دیتا کہ فرشتے کے سَو پر بھی ہوتے ہیں اس پر وہ
سَو پروں والا قصہ لے بیٹھتے ہیں مگر پھر اس پر بھی
تسلّی نہیں ہوتی اور پوچھتے ہیں کہ کیا ہزار پروں والی
بھی کوئی روایت ہے۔ اس پر یہودی پھر ایک روایت
گھڑ کر بتا دیتے اور ہمارے مفسر بڑے خوش
ہوتے کہ اب ہزار پر ثابت ہو گئے ہیں۔ اور لوگ
ہیں کہ مزے لے رہے ہیں اور کہتے ہیں سبحان اللہ
فلاں مولوی صاحب تو بڑے علامہ ہیں انہوں نے
ایک ہزار پروں والی روایت بیان کی ہے۔ غرض
حقیقت کو چھوڑ کر لغویات کے پیچھے پڑ گئے حالانکہ
ان لغویات کا نہ مذہب سے تعلق ہے نہ ایمان سے
تعلق ہے نہ خدا سے تعلق ہے۔ محض جاہلانہ اور
احمقانہ باتیں ہیں۔ اگر مسلمان قرآن پر غور کرتے

جیسے یہودی اگر تورات پر غور کرتے۔ عیسائی اگر انجیل
پر غور کرتے تو خواہ تورات اور انجیل اب بگڑی ہوئی
حالت میں ہیں پھر بھی وہ اس جہالت سے بچ جاتے
مگر چونکہ مسلمانوں نے قرآن پر غور کرنا ترک کر دیا
اور عیسائیوں اور یہودیوں نے تورات اور انجیل پر
غور نہ کیا۔ اس لئے خدا کی کتاب اُن کے لئے ہدایت
کا موجب نہ ہوئی اور وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

مفردات والوں نے بھی غیّ کی لطیف تفسیر
کی ہے کہ اَلْغَیُّ جَھْلٌ مِّنْ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ
یعنی جب انسان جھوٹے اعتقادات اور غلط روایات
خدا تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے دین کی طرف منسوب
کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں جو جہالت پیدا ہوتی
ہے اس کو غیّ کہتے ہیں۔ اگر یہ لوگ نمازیں پڑھتے
اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے۔ دعاؤں
اور انابت سے کام لیتے اور اپنے غلط اجتہادات کے
پیچھے چلنے کی بجائے خدا تعالیٰ کے الہام اور اس
کے کلام سے راہنمائی حاصل کرتے تو اُن کا یہ انجام
نہ ہوتا۔ مگر چونکہ انہوں نے دونوں باتیں چھوڑ دیں
اس لئے ان حالات کا نتیجہ گمراہی اور ناکامی اور جہالت
دینی اور ہلاکت ہی پیدا ہونا تھا جو ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نمازوں میں سستی کی وجہ سے
خدا تعالیٰ کا وصال ہاتھ سے جاتا ہے اور اس کی
صفات کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔ پس
اس کے نتیجہ میں ضلال پیدا ہوتا ہے۔ دعا کی کمی
کی وجہ سے ناکامی آتی ہے۔ اتباع شہوات سے
علم اور دلیل سے رغبت کم ہو کر جہالت میں انہماک
پیدا ہوتا ہے اور ان سب چیزوں کے جمع ہونے
کی وجہ سے ہلاکت پیدا ہوتی ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا
سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان
لائے اور مناسب حال عمل کئے۔

صالح کے معنے نیک عمل کے نہیں بلکہ مناسب حال
عمل کے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جہاد کے وقت
نماز پڑھنے لگ جائے تو وہ بے شک عمل نیک کر رہا
ہو گا مگر وہ عمل صالح نہیں ہو گا۔ اگر کوئی نماز کے
وقت وعظ شروع کر دے تو گو وعظ ایک عمل نیک
ہے مگر وہ عمل صالح نہیں کہلائے گا۔ اگر ایک شخص
عید کے دن کھانے سے پرہیز کرتا ہے (روزہ تو
عید کے دن شیطان رکھتا ہے) یا نہانے دھونے
کی طرف توجہ نہیں کرتا تو بے شک یہ تو کہا جائیگا
کہ اس شخص کے اندر زہد پایا جاتا ہے مگر اس کا یہ عمل
عمل صالح نہیں کہلائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم
جہاں بھی زور دیتا ہے خالی نیک عمل پر زور نہیں
دیتا بلکہ ایسے عمل پر زور دیتا ہے جو مناسب حال
ہو۔ وہ کہتا ہے چندے کا موقع ہو تو چندہ دو۔ نماز
کا موقع ہو تو نماز پڑھو۔ رازداری سے کام لینے
کا موقع ہو تو رازداری سے کام لو۔ جہاد کا موقع
ہو تو جہاد کرو۔ ذکر الٰہی کا موقع ہو تو ذکر الٰہی کرو
فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ
شَیْئًا۔ یہ لوگ ہیں جو جنت میں داخل کئے جائینگے
اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جَنّٰتُ
عَدْنٍ۔ وہ کیا ہے جنت؟ وہ جنتیں ہیں عدن والی
یعنی ہمیشہ رہنے والی۔ عدن سے وہ عدن مراد
نہیں جو عرب کا ایک حصہ ہے اور اس کے جنوب
مغرب میں واقعہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ایسی جنتیں
ہوں گی جو ہمیشہ رہنے والی ہوں گی۔

عدن کے معنے عربی زبان میں قائم رہنے کے
ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں عَدَنَ بِالْمَکَانِ اَقَامَ بِہٖ

وَالْبَلَدَ تَوَطَّنَهٗ وَقِيْلَ مِنْهُ جَنّٰتُ عَدْنٍ
اَیْ جَنّٰتُ اِقَامَةٍ لِمَكَانِ الْخُلُوْدِ (اقرب)
یعنی عَدَنَ بِالْمَکَانِ کے معنے کسی جگہ مستقل رہائش
اختیار کر لینے کے ہوتے ہیں اور عَدَنَ الْبَلَدَ کے
معنے شہر کو اپنا وطن بنا لینے کے ہوتے ہیں اور
اور کہا جاتا ہے کہ جنّاتِ عدن بھی اسی لئے کہتے ہیں
کہ جنّت مستقل رہائش گاہ کا نام ہو گا اور اس میں
انسان دائمی طور پر رہے گا۔ پھر فرماتا ہے اَلَّتِیْ
وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ یہ وہ جنّتیں
ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے غیب
کے ساتھ یا غیب کے مطابق وعدہ کیا ہے۔

بالغیب سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے
اُس وقت اُن سے اِن جنّتوں کا وعدہ کیا جبکہ
وہ نظر نہیں آتی تھیں یعنی بظاہر اِن جنّتوں
کے ملنے کے کوئی آثار نہیں تھے مگر پھر بھی وہ مل
گئیں۔ یہ جنّتیں دنیا میں بھی مسلمانوں کو ملی ہیں
اور آخرت میں بھی خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ
جنّتیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جب دنیا میں وہ
جنّتیں مل گئیں جن کے کوئی آثار نہیں تھے تو یہ
ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
جو دعویٰ کیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے
اور جس طرح ایک وعدہ پورا ہو گیا ہے اِسی طرح
اُس کا دوسرا وعدہ بھی ضرور پورا ہو گا۔

لیکن بالغیب کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے
ہیں کہ اُن کے ایمان بالغیب کی وجہ سے
خدائے رحمان نے یہ وعدہ کیا ہے یعنی انہوں نے
خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا تھا۔ دلائل سُنے تو کہا خدا
ہے اور اس پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے فرشتے
نہیں دیکھے تھے دلائل سُنے تو کہا فرشتے ہیں اور
اُن پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے حیات بعد الموت
کو نہیں دیکھا تھا۔ دلائل سُنے تو کہا کہ مرنے کے
بعد بھی ایک زندگی ہے اور ایمان لے آئے۔ پس
فرماتا ہے چونکہ ایک غیب انہوں نے دکھایا ہے
یعنی جو چیزیں اُن کی نظروں سے پوشیدہ تھیں
اُن پر وہ ہماری خاطر ایمان لے آئے اِس لئے
ہم نے بھی اُن کو وہ جنّتیں دیں جو اُن کے وہم و گمان
میں بھی نہیں آ سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے اپنی زندگیوں
میں غیب کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ ہم نے کہا
اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ اور یہ لوگ ایمان
لے آئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو انہوں نے نہیں
دیکھا تھا۔ ہم نے کہا فرشتوں پر ایمان لے آؤ
اور یہ لوگ ایمان لے آئے حالانکہ فرشتے انہوں
نے نہیں دیکھے تھے۔ ہم نے کہا جنّت پر ایمان
لے آؤ اور یہ لوگ ایمان لے آئے حالانکہ جنّت
انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ پس چونکہ انہوں نے
خدا تعالیٰ کی اُن باتوں پر یقین کیا جو نظر نہیں
آتی تھیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی اُن کو وہ جنّتیں دیں
جو انہیں نظر نہیں آتی تھیں۔

اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا حقیقت تو
یہ ہے کہ اُس کا وعدہ نظروں کے سامنے لا کے
چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مَاْتِيًّا کے معنے ہوتے ہیں
"لایا گیا" اور مراد یہ ہے کہ وہ وعدہ یعنی جنّت
ایسا ہے کہ اس کے پاس یہ لوگ لائے جائیں گے
گویا جنّت انہیں جبراً دی جائے گی۔ یعنی وہ لوگ
تو صرف خدا کے وصال کے بھوکے ہوں گے جنّت
کی خواہش اُن کے دلوں میں نہیں ہو گی مگر چونکہ
خدا نے وعدہ کیا تھا اس لئے خدا نے کہا کہ تمہیں
بہرحال جنّت لینی پڑے گی پس اس کا وعدہ سامنے

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ

وہ اُن (جنتوں) میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے بلکہ صرف سلامتی (اور امن کی باتیں سنیں گے) اور اُن (جنتوں) میں

رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۳﴾ تِلْكَ

اُن کو صبح اور شام رزق ملے گا یہ وہ

الْجَنَّةُ الَّتِىْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ

جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے انکو کرینگے

كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۴﴾

جو متقی ہوں گے ؁۵۱

لایا گیا اور اُنہیں جنت میں داخل کر دیا گیا۔

یہ کلام احسان کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُن میں جنت لینے سے انکار کرنے کی طاقت ہی نہیں ہوگی۔

؁۵۱ تفسیر:- اِلَّا سَلٰمًا استثنا متصل بھی ہوسکتا ہے اور استثناء منقطع بھی۔ استثنائِ متصل کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہاں کا زائد کلام بھی اگر ہوگا تو وُہ بھی سلامتی ہی ہوگا۔ لغو کے معنے ہوتے ہیں۔ ایسا کام جو فضول ہو۔ مثلاً اگر کوئی بات مَیں ایک منٹ میں کرسکتا ہوں لیکن اُس پر میں ڈیڑھ منٹ خرچ کر دیتا ہوں تو ایک منٹ کی گفتگو لغو سمجھی جائے گی۔ مَیں نے دیکھا ہے بعض لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ جس مقصد کے لئے وہ آئے ہیں اُس کے متعلق گفتگو شروع کریں وہ آتے ہی ایک لغو اور بیہودہ قصہ شروع کر دیں گے جس کا اُن کے مقصد کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہوگا۔ کہیں گے ہم میرٹھ گئے تھے۔ وہاں ہمارے فلاں شخص کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ اُس سے ایک روز میں ملنے کے لئے چلا گیا اور اس نے مجھ سے یہ یہ باتیں کیں پھر میرا فلاں شخص سے جھگڑا شروع ہوگیا اُسی سلسلہ میں مجھے لاہور آنا پڑا۔ یہاں آکر فلاں سے ملا۔ پھر فلاں سے ملنے چلا گیا۔ اِس کے بعد ایک ضرورت پیش آئی اور مَیں نے چاہا کہ آپ سے بھی ملاقات کرلوں۔ غرض اس طرح ایک لمبا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا اُن کی بات کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ تو انسان جب باتیں کرتا ہے تو خواہ وہ ضروری ہی ہوں اُن کے ساتھ بعض زائد باتیں بھی لگا لیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا۔ وہ اُس میں کوئی بات ایسی نہیں سنیں گے جو لغو ہو۔ کوئی کہے فرض کرو کوئی لغو بات ہو جائے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اگر ایسا فرض بھی کرلیا جائے

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ

اور فرشتے اُن سے کہیں گے کہ ہم تو صرف تمہارے ربّ کے حکم سے اُترتے ہیں - اور جو کچھ ہمارے

اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا

آگے ہے اور ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان دونوں (جہات) کے درمیان میں ہے

تو وہ بھی اچھی بات ہی ہوگی بُری بات نہیں ہوگی گویا اگر کوئی زائد لفظ بھی اُن کی زبان سے نکلے گا تو وہ خیر کا ہی ہوگا شر کا نہیں ہوگا یا یوں کہو کہ وہاں ضرورت سے زیادہ اگر کوئی شئے ہوگی تو سلامتی ہی ہوگی اور سلام ہی وہاں کا زائد کلام ہوگا۔

استثناء منقطع کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ لغو تو اُن کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا ہاں سلامتی کی باتیں ہر جگہ ہونگی کیونکہ خدائے سلام کے پاس ہوں گے۔ دارالسلام میں ہونگے اور فرشتے سلام کہہ رہے ہوں گے۔

اس آیت میں ایک اور نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس جگہ لغو کام کرنا نہیں کہا بلکہ لغو باتیں سُننا فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی نسبت تو حسن ظنی سے کام لیتا ہے لیکن دوسرے کی نسبت عیب کو جلد سُنتا اور مشہور کرتا ہے مگر وہاں لوگوں کی نیکی اس قدر ترقی یافتہ ہوگی کہ کوئی شخص دوسرے پر بدظنی نہیں کرے گا اور جس مقام پر کوئی شخص دوسرے کی نسبت ادنیٰ سے ادنیٰ بُری بات بھی نہ سُنے وہ جگہ یقیناً نیکی کا ایک اعلیٰ مقام ہوگی۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا

اور اُن کے لئے اُس میں رزق ہوگا صبح بھی اور شام بھی۔ بعض نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ چونکہ خدا تعالےٰ نے رزق کے متعلق اسراف منع کیا ہے اس لئے انہیں صرف دو وقت کھانا ملے گا ایک صبح کو اور ایک شام کو۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ بکرہ اور عشیا دونوں وسیع لفظ ہیں۔ بُكْرَةً کے معنے صرف صبح کے نہیں بلکہ اوّل النہار یعنی دن کے ابتدائی حصے کے بھی ہیں اور عَشِيًّا صرف شام کو نہیں کہتے بلکہ زوالِ شمس سے صبح تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ پس بُكْرَةً وَّعَشِيًّا سے یہ مراد ہے کہ ہر وقت اُن کو رزق ملے گا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ ہر وقت کوئی کس طرح کھا سکتا ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق کے معنے ہیں "دی جانے والی چیز" اور وہ چیز جو انہیں وہاں ہر وقت ملے گی وہ دیدارِ الٰہی، کلامِ الٰہی اور خدا تعالےٰ کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے اور کلامِ الٰہی یا دیدارِ الٰہی کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے کسی کو بدہضمی ہونے کا ڈر ہو۔ پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ خدا تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وَلَهُمُ الرِّزْقُ بلکہ فرمایا ہے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ اُن کو وہ رزق ملیگا جو اُن کے مناسبِ حال ہوگا۔ پس تم اس سے صرف روٹی مراد نہ لو۔ خدا تعالےٰ اُن کے مناسبِ حال انہیں رزق عطا فرمائیگا اور وہ رزق صرف صبح شام نہیں دے گا بلکہ ہر وقت دے گا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٥﴾

سب کچھ خدا کا ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ۵۵۲

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا - یہ وہ جنت ہے جس کا ہم اپنے اُن بندوں کو وارث کر دیں گے جو کہ متقی ہیں۔

۵۵۲ تفسیر:- ہمارے مفسرین اس جگہ یہ معنے کرتے ہیں کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ جب اصحاب کہف اور ذوالقرنین اور روح کے متعلق لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے اُن سوالات کے جلد جواب دینے کا وعدہ کیا مگر جبرائیل کے آنے میں دیر ہوئی جس سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ جب کچھ مدت کے بعد وہ پھر آیا تو آپ نے اُس سے شکایت کی کہ ارے میاں تم نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا؟ اُس نے کہا ہم اپنی مرضی سے تھوڑا آتے ہیں ہمیں خدا بھیجتا ہے تو ہم آجاتے ہیں نہیں بھیجتا تو ہم نہیں آتے۔

قطع نظر اس سے کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں سوال یہ ہے کہ اس گفتگو کے ذکر کا یہ موقع کونسا ہے؟ ذکر یہ تھا کہ عیسیٰؑ ہمارا ایک پیارا بندہ تھا مگر وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں تھا۔ اُسی جیسی خوبیاں رکھنے والے اور بھی کئی انبیاء دنیا میں آئے۔ اور پھر عیسیٰؑ تو محض ایک کڑی تھا اس سلسلہ کی جو نسلِ اسحاق سے شروع ہوا اُسے تم آخری نجات دہندہ کس طرح قرار دے سکتے ہو۔ اگر وہ آخری وجود تھا تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اسمٰعیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کئے تھے وہ سب کے سب جھوٹے ہو گئے پھر بتایا کہ ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور موسیٰ اور ہارون اور اسمٰعیل اور ادریس یہ سب کے سب ہمارے نیک اور برگزیدہ بندے تھے اور ہماری جنت کے محتاج تھے اسی طرح عیسےٰ بھی ہماری جنت کا محتاج ہے مگر اس کے بعد یہیں بتایا یہ جاتا ہے کہ فرشتوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تو خدا کے حکم سے نازل ہوئے ہیں وہ اگر ہمیں نازل نہ کرے تو ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔ حالانکہ اس کا پہلے مضمون سے کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ اگر وہ قرآن کریم پر غور کرتے۔ اللہ تعالےٰ کے حضور دعائیں کرتے اور قصے کہانیوں کے پیچھے نہ چلتے تو خدا اُن کی راہنمائی کرتا اور ایسی خطرناک غلطیوں سے انہیں بچا لیتا۔ مگر مصیبت یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم پر غور کرنے کی بجائے قصوں اور کہانیوں کو اختیار کر لیا اور حقیقت سے دُور ہوتے چلے گئے۔

مَیں جب سورۂ کہف کا درس دینے لگا اور مَیں نے اس سورۃ پر غور کیا تو اور سورۃ تو سب حل ہو گئی مگر ایک آیت کی مجھے سمجھ نہ آئی مَیں نے بہت سوچا اور غور کیا مگر وہ آیت مجھے بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی تھی۔ آخر مَیں نے درس دینا شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ آیت قریب آتی جائے میری گھبراہٹ بڑھتی چلی جائے کہ اب اُس آیت کے متعلق کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ صرف دو یا تین آیتیں رہ گئیں مگر پھر بھی وہ میری سمجھ میں نہ آئی اُس وقت میری گھبراہٹ بہت زیادہ ہو گئی۔ مگر جس وقت مَیں اُس سے پہلی آیت پر پہنچا تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ وہ آیت تو بالکل حل شدہ ہے اور اس کے نہایت صاف اور سیدھے معنے ہیں جن میں کسی قسم کی اُلجھن نہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اگر

قرآن کریم کی ترتیب کو مدنظر رکھا جائے اور اس پر غور اور تدبر کرنے کی عادت ڈالی جائے تو اُس کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ مگر جو شخص قصّوں اور کہانیوں کے پیچھے چل پڑتا ہے اور تدبر فی القرآن کو ترک کر دیتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف بھی ایسی باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کی شان کے منافی ہوتی ہیں۔

اب مَیں بتاتا ہوں کہ یہ کتنا سیدھا سادہ مضمون ہے جس کو ہمارے مفسرین نے اتنا بے جوڑ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیات میں بیان فرمایا تھا کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا یعنی لغو تو جنتیوں کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا ہاں سلام ہر جگہ ہو گا۔ یہ سلام کیا ہوتا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ السلام علیکم کو سلام کہا جاتا ہے پس لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا کے یہ معنے تھے کہ انہیں کثرت کے ساتھ سلام پہنچایا جائیگا مگر یہاں یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا سلام ہو گا۔ اس کے لئے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کو دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں اُس کی تشریح نظر آتی ہے۔ سورۂ فرقان میں آتا ہے يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا (فرقان ع ۶) جنتیوں کو تحیہ اور سلام پہنچایا جائے گا۔ گویا وہی مضمون جو اس جگہ بیان کیا گیا ہے اُسی کو ایک دوسرے پیرایہ میں سورۂ فرقان میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ رعد میں آتا ہے وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ع ۳) یعنی وہاں ہر دروازے سے ملائکہ جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں کہیں گے کہ تم نے دنیا میں جو خدا تعالیٰ کے لئے صبر کیا تھا اُس کے بدلہ میں ہم تمہیں سلامتی پہنچاتے ہیں اور یہ آخری گھر جو تم کو ملا ہے کیا ہی اچھا گھر ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے جنتیوں کے پاس آئیں گے اور انہیں سلام پہنچائیں گے اب جہاں تک یہ سوال تھا کہ سلام کون پہنچائے گا یہ تو حل ہو گیا اور پتہ لگ گیا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے مومنوں کو سلام پہنچائیں گے۔ مگر یہاں ایک نئی بات پیدا کر دی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا۔ یہ وہ جنتیں ہیں جن کا ہم اپنے متقی بندوں کو وارث بنائیں گے۔ اور وارث ہمیشہ بیٹا ہوتا ہے کوئی غیر نہیں ہوتا۔ پس درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ بتایا ہے کہ ہر متقی خدا کا بیٹا ہے اور جنت خدا کا گھر ہے جس میں اُن متقیوں کو اُتارا جائیگا گویا یہاں ایک نیا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ پہلے سلام کا ذکر کیا اور پھر بتایا کہ ہمارا مومن اور متقی بندہ مہمان کے طور پر جنت میں نہیں جائیگا۔ دوست کے طور پر جنت میں نہیں جائے گا۔ سائل کے طور پر جنت میں نہیں جائے گا۔ بلکہ ہم اُسے اپنا بیٹا قرار دے کر اور وارث بنا کر جنت میں داخل کریں گے اور کہیں گے کہ جاؤ اور اس میں ہمیشہ کے لئے رہو۔

اس میں ایک طرف تو مسیح کے بیٹے ہونے کی خصوصیت کو ردّ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر مومن خدا تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ دوسرے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جنت کی جو نعمتیں ملیں گی وہ بطور حق اور اکرام کے ہوں گی۔ ورنہ عطاء تو فقیر کو بھی ملتی ہے۔ پس یہ عطاء اپنے اندر صدقہ کا رنگ نہیں رکھیگی

بلکہ یہ عطاءِ میراث ہوگی اور اس کے لینے والے پر
ظاہر کیا جائے گا کہ یہ تمہارا حق ہے۔ جس طرح اولاد
کا باپ کے مال پر حق ہوتا ہے۔ صرف یہ فرق ہوگا
کہ وہ اپنے باپ کی زندگی میں ہی وارث ہوں گے۔
پس چونکہ اس جگہ نُوْرِثُ کہہ کر ہر مومن کو
خدا تعالیٰ کا بیٹا اور جنت کو عطاءِ میراث قرار دیا
گیا تھا اس لئے جب خدا تعالیٰ نے یہ بتایا کہ وہاں
مومنوں کو سلام پہنچایا جائے گا تو طبعًا ہر مومن کے
دل میں یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ جب میں بیٹا بن گیا تو
یہ سلام تو باپ کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ سو اس طبعی خیال
کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اُن سلام پہنچانے والے
ملائکہ کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وَمَا نَتَنَزَّلُ
اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ اے مومن ہم یہ سلام تیرے
باپ کی طرف سے ہی تجھے پہنچا رہے ہیں، ہم اپنی طرف
سے نہیں کر رہے۔ بے شک جنت میں سلام ہم
پہنچائیں گے مگر ہوگا تمہارے باپ کی طرف سے ہی۔
کیونکہ ہم فرشتے تو خود کوئی بات کر ہی نہیں سکتے پس
تم نُوْرِثُ پر گھبرا کر یہ خیال نہ کرو کہ جب خدا ہمارا
باپ بن گیا اور ہم اس کے بیٹے بن گئے تو پھر فرشتے
یہ سلام کیوں پہنچا رہے ہیں۔ یہ سلام تو ہمارے
باپ کی طرف سے آنا چاہیئے، یہ سلام تمہارے باپ
کی طرف سے ہی ہے ہم تو صرف اس کا سلام پہنچانے
والے ہیں۔ یہ مضمون ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا
ہے۔ یہاں اس ذکر کا کوئی موقع ہی نہیں کہ جبریل
کچھ عرصہ نہ اُترا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
گھبرا گئے اور اس پر آپ کو یہ الہام ہُوا۔ یہ بالکل
بے جوڑ بات ہے۔ اصل مضمون یہی ہے کہ جب فرشتے
سلام ملائیں گے تو مومنوں کے دلوں میں خیال پیدا
ہوگا کہ یہ کیسا سلام ہے۔ آیا یہ ہمارے باپ
کی طرف سے ہے یا کسی اَور کی طرف سے۔ اس کا
فرشتے یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ سلام تمہارے روحانی
باپ نے ہی بھیجا ہے ہم تو صرف ایک پیغامبر ہیں۔
لَهُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا
بَيْنَ ذٰلِكَ۔ اور یہ اتنا قیمتی تحفہ اس کی طرف
سے آیا ہے کہ اُس نے اس کی حفاظت کیلئے ہمارے
آگے اور پیچھے پہریدار مقرر کر دئے ہیں تا کہ یہ ضائع
نہ ہو جائے۔
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا اور یہ کس طرح
ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنی روحانی اولاد کو اپنے
گھر میں اُتارے اور اس کو سلام بھجوانا بھول جائے
جس طرح تم نے خدا سے محبت کی اور اُسے نہیں بھلایا
اسی طرح اُس نے بھی تم کو یاد رکھا اور اپنے فرشتوں
کو بھیجا کہ جاؤ اور میری طرف سے سلام پہنچا آؤ۔
لیکن اس مضمون کے علاوہ ایک اور بھی مضمون
ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے
اور وہ یہ کہ سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
سے لے کر اُن کی اولاد تک کے انبیاء کا ذکر ہے
جن میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل ہیں جن کی کتاب میں
علاوہ اپنی وحی کے حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کے
کوائف بھی درج ہیں۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے دعویٰ فرمایا تو عیسائیوں اور یہودیوں نے اعتراض
کیا۔ کہ نبی تو بنی اسرائیل میں سے آنا چاہیئے اور
یعقوب کی نسل میں سے ہونا چاہیئے۔ یہ نبی عربوں میں
سے کس طرح آ گیا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے
فرشتوں کی زبانی دیا کہ ہم تو اپنے ربّ کے حکم سے
نازل ہوتے ہیں۔ اُس نے عرب کی طرف ہم کو بھیجا ہم
اُن کی طرف آ گئے۔ وہ اسرائیل کی طرف بھیجتا تھا تو
ہم اُدھر چلے جاتے تھے۔ پس یہ اعتراض کیا ہے؟

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

(وہ) آسمانوں کا (بھی) ربّ (ہے) اور زمین کا بھی (ربّ) اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٦﴾ ع ١٥ ٤

پس (اے مسلمان) اسکی عبادت کر اور اسکی عبادت پر ہمیشہ قائم رہ - کیا تو اس کا کوئی ہم صفت جانتا ہے ٥٥٣

یہ اعتراض تو ہو سکتا تھا کہ نبیوں والی باتیں اس میں نہیں پائی جاتیں لیکن یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ ایک عرب پر کلام کیسے نازل ہو گیا - کیونکہ کلام خدا کے حکم سے اترتا ہے اور جن پر خدا کا کلام اترتا ہے ان کو جنّاتِ ارضی و اخروی عطا کی جاتی ہیں - چنانچہ حضرت موسیٰ کو کنعان ملا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سارا عرب بھی ملا فلسطین بھی ملا اور ساری دنیا بھی ملی۔

اس کے آگے فرمایا "تیرا رب بھولنے والا نہیں" یعنی اس نے موسیٰ کے ذریعہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے بھی یعنی بنو اسمٰعیل میں سے ایک نبی بھیجا جائے گا اور یسعیاہ نبی کے ذریعہ اس نے کہا تھا کہ عرب میں بھی خدا کا کلام اترے گا - پھر یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا کی دونوں باتیں جھوٹی ہوتیں - خدا تعالےٰ بھولتا نہیں - عیسائی اور یہودی بے شک بھول جائیں مگر خدا تعالےٰ نہیں - بھولا کہ اس نے موسیٰ سے کیا کہا تھا - جب اس نے کہا تھا کہ "میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہیگا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہیگا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا" (استثناء باب ١٨ آیت ١٨ و ١٩)

تو وہ اس کو کس طرح بھول سکتا تھا - اسی طرح وہ اس وحی کو نہیں بھول سکتا تھا جو یسعیاہ نبی پر نازل ہوئی کہ عرب میں بھی الہامی کلام اتریگا (یسعیاہ باب ٢١ آیت ١٣ تا ١٧ و باب ٩ آیت ٦ و ٧)

اسی طرح وہ اس وحی کو بھی نہیں بھول سکتا تھا جو اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو کی اور جس کے مطابق انہوں نے اپنے حواریوں سے کہا کہ

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا - اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنیگا وہی کہیگا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگا" (یوحنا باب ١٦ آیت ١٢ و ١٣)

پس اس نبی کا آنا ضروری تھا جو سب روحانی رازدنیا کو بتلاوے۔

٥٥٣ تفسیر:- عربی زبان میں اِصْطَبِرْ عَلَيْهِ ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر مضبوطی سے قائم رہنا اور اس کے متعلق جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا - مگر یہاں وَاصْطَبِرْ عَلٰى عِبَادَتِهٖ نہیں کہا کہ عبادت پر مضبوطی سے قائم رہ بلکہ یہ کہا ہے کہ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ تو اس کی عبادت کیلئے ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کر - اس میں بتایا گیا ہے کہ لوگ تجھے عبادتِ خالص نہیں کرنے دینگے - پس تُو

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ

اور انسان ہمیشہ یہ کہتا رہے گا کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو پھر زندہ

اُخْرَجُ حَيًّا ۝۶۷ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا

کرکے اٹھایا جاؤں گا - کیا انسان کو یہ بات یاد نہیں کہ ہم نے

خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝۶۸

اس کو اس سے پہلے پیدا کیا تھا اور (اس وقت) وہ کوئی چیز نہیں تھا ۵۷

مخالفت کی پروا نہ کر۔ بلکہ بہادری اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم رہ۔ اور پھر لِعِبَادَتِہٖ کہہ کر یہ بتایا کہ اِن اوصاف کا مظاہرہ محض عبادت کی خاطر کر۔ عبادت پر قائم تو انسان اور کئی وجوہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کی خاطر جرأت اور عبادت کی خاطر بہادری اور عبادت کی خاطر استقلال دکھا۔ گویا عبادت کو دوسری اشیاء کیلئے نہیں بلکہ دوسری اشیاء کو عبادت کے لئے پسند کر۔ اور عبادت تیرے لئے ذریعہ کا کام نہ دے بلکہ تیرا مقصود اور مدعا بن جائے۔ پس وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ کے یہ معنے ہوئے کہ تُو عبادت کی خاطر جرأت اور بہادری سے کام لے۔ یہ نہیں کہ عبادت پر قائم رہنے کے لئے جرأت دکھا بلکہ عبادت کی خاطر جرأت دکھا۔ عبادت کی خاطر دلیری دکھا۔ عبادت کی خاطر استقلال دکھا تاکہ تیری عبادت زیادہ اعلیٰ بھی جائے اور عبادت تیرے لئے ایک ذریعہ نہ بنے بلکہ عبادت ہی تیرا مقصود بن جائے۔

اسی طرح رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اب خدا رب العالمین کی حیثیت سے کلام کریگا صرف بنی اسرائیل کو مخاطب نہیں کرے گا۔

۵۷ تفسیر:- مرنے کے بعد کی زندگی ہمیشہ ہی لوگوں کے لئے شبہات اور تردد کا موجب رہی ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتی اور مرنے والے لوگوں سے سوائے اس کے کہ کوئی اعلیٰ درجہ کے روحانی انسان ہوں کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس لئے خواہ کسی قوم اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق اُن کے دلوں میں ہمیشہ شبہات قائم رہتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جہاں سب سے زیادہ شبہ اس زندگی پر کیا جاتا ہے وہاں سب سے زیادہ یقین بھی اسی زندگی کے متعلق پایا جاتا ہے چنانچہ عام طور پر لوگ مُردوں کے نام پر کھانا کھلاتے ہیں۔ مُردوں کے نام پر کپڑے تقسیم کرتے ہیں اور مُردوں سے ملنے کی خواہش اُن کے دلوں میں پائی جاتی ہے اُن کی اپنی زندگی دیکھو تو انہیں حیات بعد الموت پر کوئی یقین نہیں ہوتا کیونکہ اس زندگی پر ایمان رکھنے کا کوئی اثر اُن کے اعمال میں نظر نہیں آتا جب انسان کو سچے دل سے یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد اُس نے خدا تعالےٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہے تو لازماً اس کی زندگی پر اس کا اثر پڑنا چاہیئے

اس کے اعمال میں اصلاح ہونی چاہیئے۔ اس کے
خیالات میں درستی ہونی چاہیئے۔ لیکن جہاں انکی اپنی
زندگی پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا وہاں مرنے والوں
کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے وہ کئی قسم کے کام
کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ مُردوں کیلئے
غرباء کو روٹی کھلادی یا ان کے ثواب کی خاطر کپڑے
تقسیم کر دیئے۔ یہ عجیب قسم کا متضاد مقام ہے۔ جو
انسانی عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور درحقیقت انسان
کی یہ شبہ والی حالت ایسی ہے کہ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں
کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتا اور
نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یقین رکھتا ہے۔ جب ہم اس
کی اپنی زندگی کو دیکھتے ہیں تو مابعد الموت زندگی کا
جو اثر اس کے اعمال پر پڑنا چاہیئے وہ ہمیں نظر نہیں
آتا۔ لیکن جب ہم مرنے والوں کے متعلق اس کے
جذبات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے
مرنے والے رشتہ داروں کے متعلق اس کے دل
میں اس قسم کی تڑپ اور تمنا پائی جاتی ہے کہ وہ
زندہ ہوں تو میں اُن سے ملوں۔ لیکن ایک طبقہ دنیا
کا ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مرنے کے بعد ہم نے
نہیں جینا۔ اور ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم نے
جینا ہے۔ مگر جو طبقہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے مرنے کے
بعد جینا ہے۔ اس کی زندگی کے حالات میں کبھی کبھی
اس خیال کی بھی جھلک آجاتی ہے کہ ہم نے نہیں جینا
اور جو طبقہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے نہیں جینا۔ اس کی
زندگی کے حالات میں کبھی کبھی اِس خیال کی بھی
جھلک آجاتی ہے کہ ہم نے جینا ہے۔ گویا جو ہاں کہتا
ہے اس پر نہ کا زمانہ آتا رہتا ہے اور جو نہ کہتا
ہے اس پر ہاں کا زمانہ آتا رہتا ہے۔ لیکن عام طور
پر جہاں تک انسان کی اپنی زندگی کا سوال ہوتا ہے
وہ اُسے اگلی زندگی کے خیالات سے متاثر کرنے کے
لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک مرنے والوں کے
متعلق اپنے جذبات کے اظہار کا سوال ہوتا ہے وہ
اُن کے لئے قربانی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے کیونکہ
اُن کے لئے اُسے جو قربانی کرنی پڑتی ہے وہ اتنی زیادہ
نہیں ہوتی صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کوئی مرگیا تو اُس
کے نام پر غرباء کو روٹی کھلادی یا کپڑے تقسیم کر دیئے
یا خیرات دے دی لیکن اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا
کرنے کے لئے بہت بڑا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے
مثلاً سچ بولنا پڑتا ہے۔ جھوٹ اور فریب سے بچنا پڑتا
ہے۔ نفسانی خواہشات کو ترک کرنا پڑتا ہے۔
خدا تعالیٰ کے احکام کو ماننا پڑتا ہے اور یہ کام ایسے
ہیں جو قربانی چاہتے ہیں۔ پس وہ ان کے لئے تیار نہیں
ہوتا۔ لیکن روٹی یا کپڑا دے دینا چونکہ اتنا بڑا کام
نہیں ہوتا اس لئے وہ ان کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ
اُخْرَجُ حَيًّا میں جس انسان کا ذکر کیا گیا ہے اس کے
متعلق بھی خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ وہ کہتا ہے میں
نے مرنے کے بعد زندہ نہیں ہونا بلکہ ءَ اِذَا مَا مِتُّ
لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا میں استفہامیہ رنگ اختیار
کیا گیا ہے اور اس پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ
نہیں کہ وہ مرنے کے بعد زندہ نہ ہونے پر یقین رکھ
بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق وہ متردد ہے۔
اور کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو ضرور زندہ
کیا جاؤں گا۔ گویا اس کی شبہ والی کیفیت کو پیش
کیا گیا ہے۔ اس سے یہ مضمون نہیں نکلتا کہ وہ لازماً
قیامت کا منکر ہے۔

اوپر کی تمہید میں نے اسی لئے بیان کی تھی کہ
دنیا کے عقائد دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد کی

زندگی کا کلی انکار بہت کم پایا جاتا ہے لیکن یقینی اقرار بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔ لوگوں کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ خواہ بعث بعد الموت کو وہ مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں اُن کی حالت ہمیشہ تردّد والی رہتی ہے کہ ایسا ہونا ہے یا نہیں ہونا۔

عیسائیوں میں مذہبًا یہ بات پائی جاتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی انسان کو حاصل ہوگی چنانچہ حضرت مسیحؑ نے ایک دفعہ یہودیوں سے اِس کے متعلق بحث بھی کی۔ یہودیوں میں دو گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک وہ جن کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد زندگی ہوتی ہے اور دوسرے وہ جن کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد زندگی نہیں ہوتی۔ وہ گروہ جس کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں اس کے بعض افراد حضرت مسیحؑ کے پاس آئے اور اِس بارہ میں سوال کیا تو آپ نے انہیں فرمایا کیا تم نے تورات (خروج باب ۳ آیت ۶) میں نہیں پڑھا کہ خداوند کو ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا کہا گیا ہے اور تم جانتے ہو کہ "خدا مُردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا ہے کیونکہ اس کے نزدیک سب زندہ ہیں" (لوقا باب ۲۰ آیت ۳۸ و متی باب ۲۲ آیت ۳۲)

یعنی تمہیں بائبل سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی روحیں زندہ ہیں اور اُن کے باپ دادا کی روحیں بھی زندہ ہیں۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارا خدا زندوں کا نہیں بلکہ مُردوں کا خدا ہے۔

اِسی طرح فرماتے ہیں

"قیامت میں بیاہ شادی نہ ہوگی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہوں گے۔"

(متی باب ۲۲ آیت ۳۰)

پھر پولوس لکھتا ہے

"ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیمہ کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملیگی جو ہاتھ کا بنا ہوا گھر نہیں بلکہ ابدی ہے۔" (۲۔کرنتھیوں باب ۵ آیت ۱)

اسی طرح لوقا میں ایک غریب اور دولتمند کا قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ مرنے کے بعد کی زندگی کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ایک دولت مند تھا جو ارغوانی اور مہین کپڑے پہنتا اور ہر روز خوشی مناتا اور شان و شوکت سے رہتا تھا اور لعزر نام ایک غریب ناسوروں سے بھرا ہوا اس کے دروازہ پر ڈالا گیا تھا۔ اُسے آرزو تھی کہ دولت مند کی میز سے گرے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرے بلکہ کتّے بھی آکر اُس کے ناسور چاٹتے تھے اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مرگیا اور فرشتوں نے اُسے لے جاکر ابراہام کی گود میں پہنچا دیا اور دولت مند بھی مُوا اور دفن ہوا اس نے عالمِ ارواح کے درمیان عذاب میں مبتلا ہو کر اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور ابراہام کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو۔ اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ ابراہام مجھ پر رحم کر کے لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی میں بھگو کر میری زبان تر کرے کیونکہ میں اس آگ میں تڑپتا ہوں۔ ابراہام نے کہا بیٹا یاد کر کہ تُو اپنی زندگی میں اپنی اچھی چیزیں لے چکا

اور اسی طرح لعزر بُری چیزیں لیکن اب
وہ یہاں تسلی پاتا ہے اور تُو تڑپتا ہے
اور ان سب باتوں کے سوا ہمارے
تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا واقعہ
ہے ایسا کہ جو یہاں سے تمہاری طرف پار
جانا چاہیں نہ جا سکیں اور نہ کوئی اُدھر کی
ہماری طرف آسکے۔ اس نے کہا پس اے
باپ مَیں تیری منت کرتا ہوں کہ تُو
اسے میرے باپ کے گھر بھیج کیونکہ میرے
پانچ بھائی ہیں۔ تاکہ وہ اُن کے سامنے
ان باتوں کی گواہی دے۔ ایسا نہ ہو کہ
وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آئیں۔ ابراہام
نے اس سے کہا۔ اُن کے پاس موسیٰ
اور انبیاء تو ہیں ان کی سُنیں۔ اس
نے کہا نہیں اے باپ ابراہام ہاں
اگر کوئی مُردوں میں سے اُن کے پاس
جائے تو وہ توبہ کریں گے۔ اُس نے
اُس سے کہا کہ جب وہ موسیٰ اور نبیوں
ہی کی نہیں سنتے تو اگر مُردوں میں سے
کوئی جی اُٹھے تو اس کی بھی نہ مانیں گے۔"
(لوقا باب ۱۶ آیت ۱۹ تا ۳۱)

"مکاشفہ" میں بھی لکھا ہے۔
"پھر میں نے آسمان میں سے یہ آواز
سُنی کہ لکھ۔ مبارک ہیں وہ مُردے
جو اب سے خداوند میں مرتے ہیں۔ روح
فرماتا ہے بے شک کیونکہ وہ اپنی محنتوں
سے آرام پائیں گے اور ان کے اعمال
اُن کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں"
(مکاشفہ باب ۱۴ آیت ۱۳)

غرض حضرت مسیح نے بعث بعد الموت کی تائید
کی ہے اور عیسائی لٹریچر بھی سارے کا سارا اس
تعلیم سے بھرا پڑا ہے کہ مرنے کے بعد ہر انسان کو
ایک نئی زندگی حاصل ہو گی۔ صرف اس قدر فرق ہے
کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح کے دوبارہ
آنے پر اسی دنیا میں ساری روحیں آجائیں گی۔ اور
یہیں ان کو جزا و سزا دی جائے گی چنانچہ متی میں
لکھا ہے۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم
نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر
بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو
بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں
کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں
یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں
یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا
ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی
کا وارث ہو گا" (متی باب ۱۹ آیت ۲۹)

اسی طرح مکاشفہ میں لکھا ہے کہ وہ لوگ
"جنہوں نے نہ اُس حیوان کی پرستش کی
تھی نہ اس کے بُت کی اور نہ اس کی چھاپ
اپنے ہاتھوں اور ماتھے پر لی تھی وہ زندہ
ہو کر ہزار برس تک مسیح کے ساتھ
بادشاہی کرتے رہے اور جب تک یہ ہزار
برس پورے نہ ہو لئے باقی مُردے زندہ
نہ ہوئے۔ پہلی قیامت یہی ہے"
(مکاشفہ باب ۲۰ آیت ۴ تا ۶)

مگر باوجود اس کے کہ ہر مذہب نے اُخروی حیات
کو تسلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں سب سے بڑا انکار
بعث بعد الموت کا ہی کیا جاتا ہے اور اس زندگی کے متعلق

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ

پس تیرے رب کی قسم۔ ہم (جو تیرے رب ہیں) اُن لوگوں کو (پھر ایک دفعہ) اٹھائینگے اور شیطانوں کو بھی (اٹھائینگے اور) پھر اُن

لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۹﴾

سب کو جہنم کے گرد ایسی صورت میں حاضر کرینگے کہ وہ زانوؤں کے بل گرے ہوئے ہونگے ۵۵

ایک قسم کے تذبذب اور شک والی کیفیت لوگوں کے قلوب میں پائی جاتی ہے پس 'الانسان' سے مراد عام انسان نہیں کیونکہ اُن میں تو وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو اس زندگی پر کامل یقین ہے۔ اس جگہ 'الانسان' سے وہی انسان مراد ہے جو اخروی حیات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا واقعہ میں مَیں نے مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے اور یا پھر 'الانسان' سے مراد جنسِ انسان ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ شخص جو جنسِ انسان سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ بات کہتا ہے اور یہ سخت قابلِ تعجب ہے۔ کیونکہ انسان تو دو اُنسوں سے مرکب ہے اور اس کی فطرت بعث مابعد الموت پر دلالت کرتی ہے۔ پھر انسان ہو کر وہ یہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ کیا واقعہ میں مَیں نے مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ جب ہم 'کیا' کا لفظ بولیں تو اُس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں یعنی نہ معلوم ایسا ہونا ہے یا نہیں ہونا۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا۔ فرماتا ہے کیا یہ انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اس سے پہلے ہم نے اس کو پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا لَمْ يَكُ شَيْئًا سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جو قابلِ ذکر ہو جیسے دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (الدھرع) پس لَمْ يَكُ شَيْئًا سے یہ مراد ہے کہ وہ کسی ایسی حیثیت میں نہیں تھا جو قابلِ ذکر ہو یا جس کو کوئی اہمیت دی جاسکے یعنی وہ نطفہ کی حالت میں تھا یا جمادات اور نباتات کی حالت میں تھا۔ گویا اس وقت ایک شَے تو تھی مگر شَيْئًا مذکورًا نہیں تھی۔ شَيْئًا مذکورًا وہ چیز ہوتی ہے جو اہمیت رکھتی ہو اور توجہ کے قابل ہو اگر ایک ذلیل اور حقیر اور ناقابلِ ذکر چیز کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ نے انسان بنا دیا تو وہی انسان اگر مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے تو اس مٹی سے دوبارہ انسان بنا دینا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتی۔

۵۵ حل لغات:۔ جِثِيًّا۔ جَثَا الرَّجُلُ يَجْثُوْ کے معنے ہوتے ہیں جَلَسَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اَوْ قَامَ عَلٰى اَطْرَافِ اَصَابِعِهٖ یا اپنے پاؤں کی انگلیوں پر کھڑا ہوا جَثَا سے اسم فاعل جَاثٍ آتا ہے۔ یعنی اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھنے والا۔ جِثِيٌّ۔ جَاثٍ سے جمع کا صیغہ ہے (اقرب) مفردات میں ہے کہ یہ مصدر بھی ہوسکتا ہے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے ہم تیرے ہی رب کی قسم کھا کر کہتے ہیں لَنَحْشُرَنَّهُمْ کہ ہم ضرور انکو اکٹھا کریں گے۔ وَالشَّيٰطِيْنَ اور اُن شیطانوں کو بھی اکٹھا کریں گے جو اُن کو ورغلا رہے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ انسان سے مراد وہی انسان ہے جس کا پہلے

جِثِيًّا

ذکر ہے ورنہ اگر اعلیٰ درجہ کے مومن اور صدیق اور شہداء اور انبیاء وغیرہ مراد ہوتے تو شیطانوں کا یہاں کیا ذکر تھا؟ شیاطین کا ذکر کرنا صاف بتاتا ہے کہ 'الانسان' سے وہی انسان مراد ہیں جو حیات بعد الموت پر پورا ایمان نہیں رکھتے۔ فرماتا ہے ہم اُن کو بھی اکٹھا کریں گے اور شیاطین کو بھی اکٹھا کریں گے یعنی وہ فلسفی لوگ جو حیات بعد الموت کے متعلق ان کو شبہات میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔ اُن سب کو اکٹھا کرکے لائیں گے ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا۔ پھر ہم اُن سب کو جہنم کے گرد حاضر کریں گے اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔

جہنم کے متعلق تمام مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ عجمی لفظ ہے۔ عربی زبان میں اس کا کوئی مادہ نہیں پایا جاتا اور عجمی زبانوں کے ماہرین کا خیال ہے۔ کہ یہ ارمیک (ARAMAIC) لفظ ہے جو "مقامِ سزا بعد الموت" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عبرانی زبان میں یہ لفظ جِهِنَّہ (GEHENNA) استعمال ہوتا ہے جو ارمیک زبان میں اصل میں ھِنُّوم (HINNOM) تھا مگر پھر اسے جِھِنُّوم (GE-HINNOM) بنا لیا گیا۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ھِنُّوم کسی لمبے لفظ کا ٹکڑا ہے اور اس کے معنے "وادیٔ خونریزی" یا "قتلِ عام" کے سمجھے جاتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا زیر لفظ ھِنُّوم و بلی کالم ۲۰۷۰)

جہاں تک میرا خیال ہے یہ جھنّوم (GEHINNOM) عربی زبان کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔ عربی میں "ھنم" کے معنے چیتے کے ہوتے ہیں اور "ذُو ھِنَم" کے معنے ہوتے ہیں چیتوں والی جگہ۔ ارمیک والوں نے بھی کہا ہے کہ یہ کسی لمبے لفظ کا ٹکڑہ ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے معنے "وادیٔ خونریزی" یا "قتلِ عام" کے ہیں پس میرے نزدیک یہ اصل میں "ذو ھنم" تھا یعنی وہ جگہ جہاں چیتے رہتے ہیں اور لوگوں کو پھاڑتے اور زخمی کرتے ہیں۔ عجمی لوگ چونکہ عربی کی ذال کو عموماً جیم سے بدل دیا کرتے ہیں اس لئے ارمیک والوں نے "ذو ھنم" کو "جھنّوم" بنا لیا اور عربی والوں نے پھر اس لفظ کو عجمیوں سے لے کر جہنّم بنا لیا۔ اس قسم کی مثالیں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ایک زبان سے بعض دفعہ دوسری زبان میں کوئی لفظ گیا اور اس نے بگڑ کر کوئی اور شکل اختیار کرلی۔ پھر اُس بگڑی ہوئی شکل کو اصل زبان والوں نے واپس لیکر ایک اور لفظ کا جامہ پہنا لیا۔ یہ لفظ بھی اصل میں "ذو ھنم" تھا یعنی چیتوں والی جگہ اور یہ عربی زبان کا لفظ تھا۔ عربوں سے عجمیوں نے یہ لفظ لیا اور اسکو "جھنّوم" بنا لیا۔ پھر عربوں نے عجمیوں سے "جھنّوم" کا لفظ لے کر جہنّم بنا لیا۔

اس کے علاوہ میرے نزدیک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنّم کا لفظ دو ثلاثی لفظوں کو ملا کر بنایا گیا ہو۔ یعنی جھن اور جہم کو۔ جھن کے معنے عربی زبان میں قریب ہونے کے ہیں اور جہم کے معنے بُرا مُنہ بنا کر ملنے کے ہیں۔ پس جہنم اصل میں جھن جہم ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ چیز جس کی طرف انسان کھینچا چلا جاتا ہے مگر جب پاس جاتا ہے تو منہ بناتا ہے۔ درحقیقت اس نام میں ہی جہنم کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ انسان پہلے دوزخ میں لیجانے والے افعال کا ارتکاب اُن کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے مگر اُن افعال کی وجہ سے جب وہ دوزخ کے قریب پہنچتا ہے

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ
پھر ہم ہر ایک گروہ میں سے ایسے لوگوں کو الگ کر لیں گے جو
أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٧٠﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ
(خدائے) رحمان کے سخت دشمن تھے - اور ہم
أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧١﴾
خوب جانتے ہیں کہ اُن میں سے کون دوزخ میں جانے کے زیادہ قابل ہے ۵۵۶

تو مُنہ بنانے لگ جاتا ہے کہ یہ تو بڑا بُرا مقام ہے گویا اُس کیفیت کے اظہار کے لئے جو دوزخ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اُن کاموں کی وجہ سے جن کو بظاہر انسان اچھا سمجھتا ہے مگر وہ اُسے دوزخ کے قریب کرتے چلے جاتے ہیں اس مقام کا نام جہنم رکھا گیا ہے۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اِسی رنگ میں ایک لفظ کی تشریح کی ہے - آپ "اسلامی اصول کی فلاسفی" میں تحریر فرماتے ہیں کہ خنزیر کا لفظ دراصل خنز اور اَر سے مرکب ہے خنز کے معنے ہیں "بہت بُرا" اور اَر کے معنے ہیں "دیکھتا ہوں"۔ پس خنزیر کے معنے یہ ہیں کہ میں اسکو بہت بُرا۔ فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ یعنی اس جانور کے اندر بعض ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو اس کی گندگی اور خرابی ظاہر کرنے والی ہیں۔ اس شکل میں میں سمجھتا ہوں کہ جہنم بھی جہن اور جہم سے مرکب ہے۔ یعنی جہنم ایک ایسی چیز ہے جس کے قریب جانے کی انسان کوشش کرتا ہے یعنی وہ ایسے افعال پسند کرتا ہے جو اُسے جہنم کے قریب لے جانے کا موجب ہوتے ہیں۔ مگر جب جہنم اُسے نظر آتا ہے تو اسکی بُری شکل ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے اوہو یہ تو بہت بُرا مقام ہے

حل لغات: اَلشِّيعَةُ — ثُمَّ

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے جِثِیًّا یَجْثُوْ کے معنے ہوتے ہیں گھٹنوں کے بل گر جانا یا انگلیوں کے بل کھڑا ہو جانا یعنی انسان جب کسی چیز کو اپنی ایڑیاں اُٹھا کر اور انگلیوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس حالت کو جِثِیًّا کہتے ہیں اور جب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے جیسے تشہد کی حالت میں بیٹھتے ہیں تو اس حالت کو بھی جِثِیًّا کہتے ہیں۔ اس جگہ یہ دونوں معنے چسپاں ہو جاتے ہیں کیونکہ جہنم کا ذکر ہے اور انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو پہلے وہ اُسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور انگلیوں کے بل کھڑے ہو کر جھانکتا ہے کہ کیا چیز آ رہی ہے یا کونسی مصیبت ہے جس میں مَیں گرفتار ہونے والا ہوں۔ مگر جب وہ مصیبت کو دیکھ لیتا ہے تو اس کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور وہ گھٹنوں کے بل گر جاتا ہے -

۵۵۶ حل لغات:- اَلشِّيعَةُ کے معنے ہیں اَلْفِرْقَةُ۔ گروہ (اقرب)
ثُمَّ۔ حَرْفُ عَطْفٍ يَدُلُّ عَلَى التَّرْتِيبِ وَالتَّرَاخِي یعنی ثُمَّ حرف عطف ہے جو کبھی ترتیب کے بیان کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی یہ بتانے کیلئے

کہ یہ کام دیر سے ہوا ہے (اقرب)

صِلِیًّا: صَلِیَ النَّارَ کے معنے ہوتے ہیں قَاسٰی حَرَّھَا وَ احْتَرَقَ بِھَا وَ دَخَلَ فِیْھَا کہ آگ کی گرمی برداشت کی اور اس میں جلا اور اس میں داخل ہوا (اقرب) صِلِیًّا مصدر ہے گویا اس کے معنے ہوں گے۔ آگ میں جلنا یا اس کی گرمی برداشت کرنا۔

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ہر گروہ کفار میں سے اُن کے سرکردہ لوگوں کو خاص سزا دینے کیلئے الگ کر لیا جائے گا اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا میں عَلٰی کے معنے خلاف کے ہیں یعنی وہ لوگ جو خدائے رحمٰن کے خلاف سب سے زیادہ سرکشی اور تمرد اختیار کرنے والے ہوں گے۔

اس کے بعد فرمایا۔ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا۔ اور ہم اُن لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو آگ کے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان آیات میں پہلا ثُمَّ ترتیب کے لحاظ سے ہے اور دوسرا ثُمَّ خالص عطف پر دلالت کرتا ہے اور یہ پہلے مضمون کی تشریح ہے کہ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا یہ ثُمَّ ایسا ہی ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ "اور بات یہ ہے"۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلی بات کے بعد یہ بات ہوئی بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بات کے ساتھ ہی ایک یہ بات بھی ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا ایک یہ بات بھی ہے کہ ہم سب سے زیادہ اُن لوگوں کو جانتے ہیں جو اس آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

غرض پہلا ثُمَّ یعنی ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ میں جو ثُمَّ آیا ہے وہ ترتیب کے لحاظ سے ہے یعنی پہلے واقعہ کے بعد یہ ہوگا لیکن ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ میں درجہ مراد ہے کیونکہ ثُمَّ کا لفظ عربی زبان میں زمانہ اور مکان اور وضع کی ترتیب کے لئے بھی آتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اُن کے مدارج کفر کیا ہیں اور کون کس مقام پر رکھے جانے کے قابل ہے۔ کیونکہ علم الٰہی نزوع کے بعد نہیں آتا بلکہ وقت کے لحاظ سے علم عمل سے پہلے ہوتا ہے پس یہاں ثُمَّ سے مراد بعد نہیں ہو سکتا کیونکہ فرماتا ہے ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ۔ پس یہ جاننا درجہ کے لحاظ سے ہے وقت کے لحاظ سے نہیں۔ پہلے فرمایا کہ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ کُلِّ شِیْعَۃٍ اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا۔ ہم کفار کے ہر گروہ میں سے اُن کے بڑے بڑے لیڈروں کو نکال لیں گے۔ پھر کہا کہ بات تو یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کون اس عذاب کا زیادہ مستحق ہے اور جاننا ہمیشہ کام سے پہلے ہوتا ہے۔ تم پہلے ایک بات کو جانتے ہو اور پھر کام کرتے ہو۔ تم نے لاہور جانا ہے تو پہلے تمہارے دل میں لاہور جانے کا خیال آئے گا اور پھر تم لاہور جاؤ گے۔ تم نے مدرسہ جانا ہے تو پہلے مدرسہ جانے کا خیال آئے گا اور پھر تم مدرسہ جاؤ گے۔ تم نے کھانا کھانا ہے تو پہلے تمہارے دل میں کھانا کھانے کا خیال آئیگا اور پھر کھانا کھاؤ گے۔ تو جب بھی انسان کوئی کام کرنے لگیگا علم پہلے ہوگا اور کام بعد میں ہوگا مگر یہاں علم سے پہلے ثُمَّ کا لفظ ہے اور چونکہ علم ہمیشہ پہلے ہوتا ہے اور کام بعد میں ہوتا ہے اس لئے پتہ لگ گیا کہ یہ ثُمَّ درجہ کے لحاظ سے ہے

صِلِیًّا

یعنی ہم اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ کون کس عذاب
کا مستحق ہے۔ پس یہاں یہ مراد نہیں کہ یہ بات پہلے
فصل کے بعد ہوگی بلکہ یہ مراد ہے کہ جو لوگ درجۂ
کفر میں بڑھے ہیں اُن کو پہچاننا تو ہمارے علم کا
حصہ ہے۔

اَیُّهُمْ اَشَدُّ کے متعلق مفسرین نے
بحث کی ہے کہ یہاں اَیَّهُمْ چاہیئے تھا لیکن آیا
اَیُّهُمْ ہے۔ اس کے متعلق خلیل کہتا ہے کہ یہ
رفع حکایت کی وجہ سے آیا ہے اور مراد یہ ہے کہ
ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ الَّذِیْنَ یُقَالُ فِیْهِمْ اَیُّهُمْ
اَشَدُّ یعنی ہم ایسے لوگوں کو جن کے متعلق یہ کہا
جائے گا کہ وہ سب سے زیادہ سرکش اور متمرد ہیں
دوسروں سے علیحدہ کر لیں گے۔ لیکن بعض نے کہا ہے
کہ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ کُلِّ شِیْعَةٍ میں نَنْزِعَنَّ
کا مفعول مِنْ کُلِّ شِیْعَةٍ آچکا ہے اور اَیُّهُمْ
اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا ایک زائد مستقل
جملہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ پوچھنے والا پوچھتا ہے
"وہ کون ہیں" تو اس کا جواب ملتا ہے اَیُّهُمْ اَشَدُّ
عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا یعنی جب خدا تعالیٰ نے کہا
کہ ہم ہر گروہ کفار میں سے ایک جماعت کو الگ
کر لیں گے تو پوچھنے والا پوچھتا ہے وہ کون لوگ
ہیں اس پر وہ کہتا ہے اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ
عِتِیًّا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی ایک قرأت اَیَّهُمْ
بھی آئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ میں سے جو
خدا کے زیادہ منکر ہیں انکو نکال لیا جائے گا۔

صِلِیًّا کے معنے صرف آگ میں جل جانے کے
نہیں بلکہ جو شخص آگ کی گرمی سے متاثر ہو اس کے
لئے بھی یہ لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے چنانچہ کہتے
ہیں صَلِیَ النَّارَ وَبِهَا۔ قَاسٰی حَرَّهَا اَوِ
احْتَرَقَ یعنی صَلِیَ النَّارَ وَبِهَا کے یہ معنے ہوتے
ہوتے ہیں کہ اُس نے آگ کی گرمی محسوس کی یا اس سے
جل گیا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ
نے اَوْلٰی بِهَا صِلِیًّا کیوں کہا؟ اَوْلٰی بِهَا
صِلِیًّا کے یہاں دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ
یہ لوگ دوسروں سے زیادہ مستحق ہیں آگ میں پڑنے
کے اور دوسرے یہ کہ بہ نسبت دوسری چیزوں کے
یہ لوگ آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں یعنی اَوْلٰی
بِالنَّارِ صِلِیًّا یا اَوْلَی النَّاسِ بِالنَّارِ۔
بہ نسبت اور چیزوں کے یہ آگ میں پڑنے کے زیادہ
مستحق ہیں یا بہ نسبت اور لوگوں کے یہ آگ کے عذاب
کے زیادہ مستحق ہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ
دوسرے کون ہیں جن کے مقابل پر یہ آگ کے زیادہ
مستحق ہیں یا دوسری کونسی عذاب کی اقسام ہیں جن
کے مقابل پر یہ آگ کے زیادہ مستحق ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ اصحابِ تثلیث کا
ذکر ہے اور قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اصحابِ
تثلیث کی ترقی کا زیادہ تر تعلق آلاتِ نار سے ہوگا
اور وہ اپنے مخالفوں کو بھی زیادہ تر آلاتِ نار سے ہی
ڈرائیں گے۔ مثلاً بندوق ہے، توپ ہے، بم ہے،
یا اب ایٹم بم نکل آیا ہے۔ اِن سب میں آگ سے کام
لیا جاتا ہے۔ اِس سے پہلے لوگ لوہے سے کام لیتے تھے
مثلاً تلوار تھی، نیزہ تھا، ہتھوڑے تھے، گُرز تھے
اور یا پھر پتھر اور غلیل وغیرہ سے کام لیتے تھے۔
لیکن یاجوج ماجوج کا زمانہ آیا تو انہوں نے آگ سے
کام لینا شروع کر دیا۔ اِن کے ناموں میں بھی اس
طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں لفظ اج سے

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ

اور تم میں سے ہر شخص اس (یعنی دوزخ) میں جانیوالا ہے یہ خدا (تعالیٰ) کا ایسا

حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا

پکا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ اور ہم متقیوں کو بچا لیں گے

نکلے ہیں جس کے معنے آگ کے ہیں گویا یاجوج و ماجوج ان کا اس لئے نام رکھا گیا تھا کہ انہوں نے آگ سے زیادہ کام لینا تھا اور آتشین اسلحہ کے استعمال سے ہی انہوں نے دنیا پر غلبہ پانا تھا چنانچہ دیکھ لو پستول۔ ریوالور۔ بندوق۔ رائفل۔ بم اور پھر ایٹم بم یہ سارے کے سارے آگ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو مغلوب کرنے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ ہے مسلمانوں کو بھی انہوں نے انہی آلاتِ حرب سے مغلوب کیا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہ چیزیں استعمال نہ کیں۔ کیونکہ ان کے مولویوں نے ان کو خراب کیا اور کہا کہ آگ سے کسی کو عذاب دینا سوائے خدا تعالیٰ کے اور کسی کیلئے جائز نہیں۔ یا کہہ دیا کہ یہ کوئی جادو ہے جس کے زور سے یکدم بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں۔ ورنہ ہتھیار ہوتا تو اس کے استعمال سے ایک ایک آدمی مرتا۔ پس چونکہ یہ جادو ہے اور جادو سیکھنے سے شیطان کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے اس لئے اِن آلات کا استعمال جائز نہیں۔ پس مسلمانوں پر جو تباہی آئی اس کی زیادہ تر وجہ یا مولویوں کے فتوے ہیں اور یا پھر مغربی اقوام کے آتشین اسلحہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس دن جب ہماری سزا کا وقت آئے گا تو یہ لوگ دوسروں سے زیادہ آگ کے مستحق ہوں گے۔ کیونکہ باقی لوگوں نے آگ سے اتنا کام نہیں لیا جتنا اِن لوگوں نے لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر باقی ساری دنیا کے آلاتِ حرب جمع کر لئے جائیں تو وہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سے چھوٹی حکومت کے اسلحہ سے بھی کم ہوں گے۔ اگر ہندوستان، پاکستان اور چین کی حکومتوں کے پاس جس قدر سامانِ حرب ہے وہ جمع کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ جتنی بندوقیں اور گولیاں اِن تینوں ممالک کے پاس مجموعی طور پر ہوں گی وہ شاید فرانس کے برابر بھی نہیں ہوں گی پس چونکہ اِن لوگوں نے سب سے زیادہ آگ کی کھیل کھیلی ہوگی اس لئے ہم بھی سب سے زیادہ انہی لوگوں کو آگ کا عذاب دیں گے اور اس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ آگ کے عذاب کے یہ لوگ زیادہ مستحق ہیں یا دوسرے۔

عذاب کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کئی قسم کے عذاب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پانی کا بھی عذاب ہو سکتا ہے۔ بیماریوں کا بھی عذاب ہو سکتا ہے۔ سردی کا بھی عذاب ہو سکتا ہے اور خوفناک نظاروں کا بھی عذاب ہو سکتا ہے۔ مگر انہوں نے چونکہ لوگوں کو آگ کا عذاب دیا ہوگا اس لئے آگ کا عذاب ہی اُن کے زیادہ مناسب ہوگا یعنی اُن پر ایسے عذاب نازل ہوں گے جن میں سوزش اور جلن اور آگ پائی جاتی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (۷۳)

اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے ۵۵

سوزش کا عذاب ان لوگوں کے لئے مقدر ہے۔

۵۵ تفسیر :- وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے لفظی معنے یہ ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص نہیں مگر وہ اس آگ میں داخل ہونے والا ہے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ ہر انسان دوزخ میں ڈالا جائے گا مگر یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ یہاں ذکر ہی کافروں کا ہے مومنوں کا ذکر نہیں۔ چنانچہ فرمایا تھا وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا انسان کہے گا کہ کیا جب میں مرجاؤنگا تو پھر زندہ کرکے اٹھایا جاؤنگا اب کیا یہ مومن کہا کرتے ہیں کہ ہم مرکر نہیں اٹھنا۔ اس میں ہر حال اُنہی لوگوں کا ذکر ہے جو کہتے ہیں کہ ہم نے مرکر نہیں اٹھنا یا اس زندگی کے متعلق ان کے دلوں میں شبہ والی کیفیت پائی جاتی ہے اسی طرح فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ میں بھی کفار کا ذکر ہے ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا میں بھی انہی کا ذکر ہے۔ پس جبکہ اس جگہ پر ذکر ہی کفار کا ہے تو اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے بھی کفار ہی مراد ہوں گے اور انہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۔ یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جو ضرور پورا ہونے والا ہے۔ حَتْمًا مَّقْضِيًّا کے معنے ہیں وَعْدًا وَاجِبًا مَقْضِيًّا ایسا وعدہ جو واجبی ہے اور لازمی ہے اور ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے عام تفسیری معنے قبول کئے ہیں اور آئینہ کمالات اسلام (صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴) میں تحریر فرمایا ہے کہ اِنْ مِّنْكُمْ سے سب انسان مراد ہیں اور ہر انسان دوزخ میں جائے گا لیکن معنے یہ کئے ہیں کہ دوزخ دو قسم کی ہے ایک اس دنیا کی اور ایک اگلے جہان کی۔ کفار تو اگلے جہان کی دوزخ میں گرائے جائیں گے مگر مومنوں کو اگلے جہان کی دوزخ میں نہیں گرایا جائے گا۔ بلکہ اسی دنیا میں اُن کو خدا تعالےٰ کی راہ میں جو تکالیف پہنچتی ہیں وہ اس دوزخ کا قائم مقام ہو جائیں گی۔ گویا آپ نے اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کو پچھلی آیات کے ساتھ ملا کر اس کے معنے نہیں کئے بلکہ مستقل طور پر اس آیت سے ایک نتیجہ نکالا ہے اور فرمایا ہے کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے یہ معنے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص اس دوزخ میں داخل ہونے والا ہے۔ مگر کفار تو اگلے جہان کی دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور مومنوں کو اس دنیا میں جو تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں وہ اس جہنم کا قائم مقام ہو جائیں گی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ معنے بھی درست ہیں۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومنوں کو کافروں سے بہت زیادہ دنیا کی تکالیف پہنچتی ہیں بلکہ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خدا تعالےٰ کا کوئی شخص جتنا زیادہ پیارا ہوتا ہے اُتنی ہی زیادہ اُسے دنیا کی تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ پس یہ معنے بھی صحیح ہیں۔

احادیث میں بھی اس آیت پر بحث آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معنے میں نے کئے ہیں

اور جو معنے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئے ہیں وہ دونوں احادیث سے ثابت ہیں چنانچہ حضرت حفصہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بدر اور حدیبیہ کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص دوزخ میں نہیں جائے گا۔ حضرت حفصہؓ کہتی ہیں میں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَاَیْنَ قَوْلُ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا۔ یعنی اگر یہ بات درست ہے تو پھر خدا تعالیٰ کا یہ قول کہاں گیا کہ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا۔ یعنی اس میں تو یہ ذکر ہے کہ سب لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا مَہْ یعنی بس بس جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ چپ بھی کر وہ آیت کہاں گئی کہ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا (مسلم بحوالہ جامع البیان) اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہاں ثُمَّ کے معنے اَور کے ہیں۔ ورنہ حضرت حفصہؓ کی بات کی تردید نہیں ہوتی بلکہ اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ پھر ہم متقیوں کو نجات دیں گے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ متقی بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے گویا وہی بات ثابت ہو جاتی ہے جو حضرت حفصہؓ نے کہی تھی مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کی بات کی تردید فرماتے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے یہاں ثُمَّ کے معنے اَور کے کئے ہیں اور اسے ایک الگ جملہ قرار دیا ہے گویا نجات پانے والے وہ ہیں جو جہنم میں نہیں جائیں گے۔ اگر یہ الگ جملہ نہ ہو تو حضرت حفصہؓ کی بات ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا کو ایک الگ قول قرار دیا ہے اور یہ مراد لی ہے کہ ہم دوزخیوں کو دوزخ میں ڈالیں گے اور مومن کو دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں لے جائیں گے۔

زجاج کہتے ہیں کہ ایک دوسری آیت بھی اس مضمون کی تائید کرتی ہے کہ مومن دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں داخل کئے جائیں گے اور وہ آیت یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْھَا مُبْعَدُوْنَ (انبیاء ع) یعنی وہ لوگ جن کے متعلق ہماری طرف سے یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا وہ دوزخ کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو نہ صرف یہ کہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ دوزخ کے قریب بھی نہیں جائے گا۔ پس زجاج کہتے ہیں کہ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا سے یہی مراد ہے کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ایک الگ قول ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم مومنوں کو دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں لے جائیں گے زجاج کے علاوہ مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے اس کی تصدیق بھی حدیثوں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بخار کے متعلق بتایا کہ یہ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ھِیَ نَارِیْ اُسَلِّطُھَا عَلٰی عَبْدِیَ الْمُؤْمِنِ لِتَکُوْنَ حَظَّہٗ مِنَ النَّارِ۔ یہ میری آگ ہی ہو میں اپنے مومن بندہ پر اس لئے مسلط کرتا ہوں کہ اگلے جہان کی دوزخ کا حصہ اس کو یہیں مل جائے۔ یہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ مومن کو اس دنیا میں جو تکلیفیں پہنچتی ہیں وہ درحقیقت اگلے

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ

اور جب انہیں ہماری کھلی کھلی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں

كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ

سے کہتے ہیں (بتاؤ تو) ہم دونوں فریق میں سے کونسا

جہان کی دوزخ کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْحُمّٰی حَظُّ الْمُؤْمِنِ مِنَ النَّارِ۔ بخار دوزخ میں سے مومن کا حصہ ہے یعنی مومن اگلے جہان کی دوزخ میں تو نہیں ڈالا جاتا لیکن جب یہاں اُسے بخار چڑھ جاتا ہے یا اور بیماریاں آجاتی ہیں تو اُسے بھی اس آگ سے ایک حصہ مل جاتا ہے۔ گویا کافر اگلے جہان میں مرنے کے بعد آگ کے عذاب میں مبتلا کیا جائیگا اور مومن اسی دنیا میں مختلف تکالیف کے حصے لیکر جو درحقیقت دوزخ کا ہی ایک حصہ ہیں اگلے جہان میں جنت میں چلا جائیگا۔ یہ دونوں حدیثیں قرطبی نے تہذیب التہذیب اور طبری کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ اور یہ جو میں نے معنے کئے ہیں کہ یہاں اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے کافر مراد ہیں اور جو درحقیقت حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے حدیثوں سے بھی یہ معنے ثابت ہیں اور حضرت ابن عباس رضؓ بھی اسی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ هٰذَا خِطَابٌ لِّلْكُفَّارِ (قرطبی) اس سے مومن مراد نہیں بلکہ کافر مراد ہیں۔ اور وہ اس آیت کی تشریح اِنْ مِّنْكُمْ کی جگہ اِنْ مِّنْهُمْ پڑھکر کیا کرتے تھے (قرطبی) یعنی وہ کافر جن کا پہلے ذکر ہے اُن میں سے ہر شخص دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ عکرمہ اور ایک اور تابعین کی جماعت بھی اس قرأت کو جائز قرار دیتی تھی کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی جگہ اِنْ مِّنْهُمْ اِلَّا وَارِدُهَا پڑھا جائے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مِنْكُمْ ہو مگر ضمیر غائب مراد ہو جیسے قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (الدھر ع) یہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اور پلائیگا انکو ان کا رب ایک پاک کرنیوالا شربت۔ مگر آگے فرماتا ہے اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا یہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء ہے اور تمہاری کوششوں کی قدر کی گئی ہے۔ اس جگہ پہلے سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ کہکر غائب کی ضمیر استعمال کی گئی ہے اور پھر ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً یہ تمہارے لئے جزاء ہے وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا اور تمہاری سعی کی قدر کی گئی ہے۔ اس مثال کو پیش کرکے علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا میں بھی غائب ضمیر کی طرف مِنْكُمْ کہکر اشارہ کیا گیا ہے اور مراد کافر ہی ہیں مومن نہیں۔

غرض دونوں معنے جو میں نے اُوپر کئے ہیں وہ حدیثوں سے بھی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضؓ کے اقوال سے بھی ثابت ہیں۔

خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

فریقین درجہ کے لحاظ سے اور ہم جلیسوں کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے ۵۸

۵۸ حل لغات:۔ اَلنَّدِیُّ کے معنے ہیں اَلنَّادِیْ۔ مجلس (اقرب)

تفسیر:۔ وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ کا لوگ عموماً غلط ترجمہ کرتے ہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ کہ "جب پڑھی جاتی ہیں اوپر ان کے نشانیاں ہماری ظاہر" حالانکہ یہ نہ اُردو ہے اور نہ اس کے کوئی معنے ہیں تَلَا عَلَیْهِ کے معنے ہوتے ہیں " اُس کو پڑھ کر سنایا" جب انسان ایسی طرز پر پڑھے کہ اس کی غرض یہ ہو کہ دوسرا بھی سن سکے تو اس کے لئے عربی زبان میں تَلَا عَلَیْهِ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ پس وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ کا ترجمہ یہ ہوگا۔ کہ جب ہماری آیات انکو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جو بیّنات بھی ہوتی ہیں۔

عربی زبان اور قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ جو الفاظ وہ کسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے اُن میں نہ صرف اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ اس مضمون کی وضاحت بھی انہی الفاظ میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً اُردو میں عام طور پر نشاناتِ الٰہیہ کے متعلق معجزہ یا نشان وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اِن میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو معجزات کی غرض و غایت اور ان کے حقیقی مقصد کو واضح کرنے والا ہو معجزہ بھی یوں تو عربی زبان کا ہی لفظ ہے مگر قرآن کریم نے اس لفظ کو کہیں استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح حدیث میں بھی یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ لوگوں نے خود وضع کیا ہے۔ مگر یہ بھی اس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جس کیلئے اسے تجویز کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کیلئے آیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آیت کے معنے علامت اور نشان کے ہوتے ہیں۔ اسی سے نشان کا لفظ بنایا گیا ہے۔ مگر نشان کا لفظ بھی وہ مضمون ادا نہیں کرتا جو آیت کا لفظ ادا کرتا ہے آیت کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی طرف اشارہ کرتی اور اس کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو نشان ظاہر کئے جاتے ہیں وہ بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوتے۔ کوئی نہ کوئی مقصد اور کوئی نہ کوئی غرض اُن کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ معجزہ کا لفظ صرف ایک طاقت کا اظہار کرتا ہے جیسے کسی کو ڈنڈا مارا جائے اور وہ بھاگ جائے تو اس سے ڈنڈا مارنے والے کی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت یہ بتاتی ہے کہ کسی خاص مقصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور اس مقصد کو واضح کرنے اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے اُسے ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں اُن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب لوگوں کے سامنے بعض ایسی چیزیں بھی پیش کرتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔ اور چونکہ وہ پوشیدہ ہوتی ہیں اُن کے ثبوت کے لئے بعض دوسری دلیلیں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ ان میں سے بعض دلیلیں تو خالص عقلی ہوتی ہیں۔ اور بعض دلیلیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ اللہ تعالےٰ کی

طاقت اور اس کی قدرت اور اس کے علمِ غیب کا بھی ثبوت رکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کا سمجھنا لوگوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مثلاً انبیاء کی نبوت کا مسئلہ ہے۔ آج تک دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا کہ آسمان سے فرشتہ آیا ہو اور اُس نے کسی نبی سے باتیں کی ہوں۔ پس چونکہ یہ ایک مخفی چیز ہے اس لئے اس کی تصدیق آیات سے کی جاتی ہے جو اسبات کی علامت ہوتی ہیں کہ یہ نبی جو کچھ کہہ رہا ہے اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہہ رہا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا وجود آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ پس اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے بعض دلائل دئے جاتے ہیں جن سے وہ وجود ہماری آنکھوں کے قریب آجاتا ہے اور عقل قبول کرلیتی ہے کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور اس کے اندر یہ یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ایسی دلیلیں قرآن کریم کی رو سے آیات کہلاتی ہیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے علمِ غیب یا اس کی قدرت یا اس کے حیّ و قیوم ہونے کے ثبوت کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک نبی غیب کی خبر دیتا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یہ خبر بتائی ہے۔ اب ہر شخص جانتا ہے کہ انسان میں غیب معلوم کرنے کی طاقت نہیں۔ اگر ہو تو یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اس طاقت کو اپنی طرف منسوب نہ کرے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی شہرت کے لئے دوسروں کی خوبیاں بھی اپنی طرف منسوب کرلیتے ہیں۔ کتاب پڑھیں گے اور اس کے مضامین اپنے نام پر شائع کرنے شروع کردیں گے مصنف کہیں بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس کی محنت اپنی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی اچھا کام ہو لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اُسے اپنی طرف منسوب کرلیں۔

ہمارے سکول کی ٹیم ایک دفعہ امرتسر کھیلنے کے لئے گئی۔ میں اس وقت اگرچہ تعلیم سے فارغ ہوچکا تھا لیکن میرا مدرسہ سے ابھی تعلق قائم تھا کیونکہ میں نیا نیا نکلا تھا اِس لئے میں بھی ساتھ چلا گیا۔ وہاں خالصہ کالج والوں سے میچ مقرر تھا۔ وہ دوست جنہوں نے کھیل میں حصہ لینا تھا وہ تو وہیں رہے اور مَیں لاہور چلا آیا۔ جب واپس گیا تو بعض دوست جو مجھ سے زیادہ تعلق رکھنے والے تھے وہ میرے استقبال کے لئے سٹیشن پر آگئے۔ اُن میں سے ایک نے بتایا کہ ہمارا میچ بڑا شاندار رہا۔ لوگوں نے خوب داد دی اور ہم نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس خبر سے مجھے طبعاً خوشی ہوئی اور میں نے کہا الحمدللہ۔ پھر وہ کہنے لگا یوں تو سب کی ہی تعریف ہوئی مگر ہمارے کیپٹن کی لوگوں نے اس قدر تعریف کی کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ مجھے اس سے اَور زیادہ خوشی ہوئی۔ کیپٹن میاں بشیر احمد صاحب کے سالے تھے اور وہ واقعہ میں بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ مگر اس کے بعد کہنے لگا ایک عجیب بات آپکو یہ بتاؤں کہ ٹیم کا کیپٹن سب لوگ مجھے سمجھتے تھے۔ گویا جسقدر کیپٹن کی تعریف ہوئی وہ سب اس نے اپنی طرف منسوب کرلی۔ تو دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی کی اچھی چیز لوگوں کو نظر آئے تو اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اُسے اپنی طرف منسوب کرلیں۔ لوگ شاعروں کے شعر چُرا کر اپنے نام سے شائع کروا دیتے ہیں۔ مگر ایسا کون بیوقوف ہوگا۔ جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہو بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنیوالا ہو اور پھر وہ اپنے شعر کے متعلق کہے کہ یہ میرا نہیں بلکہ فلاں شاعر کا ہے۔ ہاں ادنیٰ درجہ کے لوگ ایسا

کر لیتے ہیں کہ خود شعر بنایا اور لوگوں کی تعریف
حاصل کرنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ انوری کا ہے یا
خاقانی کا ہے یا سعدی کا ہے یا حافظ کا ہے۔
غرض یہ تو ہو جاتا ہے کہ دوسروں سے
تعریف کروانے کے لئے بعض دفعہ اپنی چیز لوگ
مشہور آدمیوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں مثلاً
حدیث خود بنائی اور کہہ دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایسا فرمایا ہے۔ لیکن یہ مثال کہیں نظر نہیں آئیگی
کہ کوئی قادر الکلام انسان اپنا کلام دوسرے کی
طرف منسوب کر دے۔ خود اعلیٰ درجہ کا شعر کہے اور
منسوب اُسے کسی اَور کی طرف کر دے کیونکہ کوئی
شخص ایسی بات دوسرے کی طرف منسوب کرنے کے
لئے تیار نہیں ہو سکتا جس سے اس کی اپنی شہرت
میں اضافہ ہوتا ہو۔

اب اِسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے غور
کرو کہ ایک نبی جب دنیا میں آتا ہے اور غیب کی
خبریں لوگوں کو بتاتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ مَیں
ایسا کہتا ہوں۔ بلکہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یہ بات
کہی ہے۔ اگر اُسے ذاتی طور پر غیب کا علم حاصل ہو
تو غیب کی خبریں اُسے خدا تعالیٰ کی منسوب کرنے
کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اِسی لئے ان خبروں کو خدا تعالیٰ
کی طرف منسوب کرتا ہے کہ اُسے کامل یقین ہوتا ہے
کہ خدا نے ہی اُسے یہ خبریں بتائی ہیں ورنہ وہ اپنی
خوبی کسی اور کی طرف کیوں منسوب کرے۔ پھر ہم دیکھتے
ہیں کہ وہ غیب کی خبریں پوری بھی ہو جاتی ہیں اور اس
طرح جہاں اس کی اپنی نبوت کی سچائی دنیا پر ظاہر
ہو جاتی ہے اور پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا خدا تعالیٰ
کے ساتھ تعلق ہے وہاں یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ ایک
ایسی ہستی موجود ہے جو عِلم غیب جانتی ہے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کا حیّ و قیّوم ہونا ہے۔ ایک
بیمار مرنے لگتا ہے۔ اس کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں کہ
خدا تعالیٰ کا ایک بندہ اُسے ہاتھ لگاتا ہے اور اُس میں
زندگی کے آثار از سرِ نو ظاہر ہونے شروع ہو جاتے
ہیں اُس کا سانس درست ہو جاتا ہے۔ اُس کے حواس
قائم ہو جاتے ہیں اور اس کی کھوئی ہوئی طاقت پھر
واپس آ جاتی ہے۔ دیکھنے والا دیکھتا ہے اور اس
بات پر ایمان لاتا ہے کہ ہمارا خدا حیّ و قیّوم ہے۔
کیونکہ اس شخص میں طاقت نہیں تھی کہ اُسے اچھا کرتا۔
لیکن اس کی دعا اور توجہ سے ایک مُردہ جسم میں بھی
جان پڑ گئی۔ جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا خدا
حیّ و قیّوم ہے یا مثلاً ایک شخص کے ہاں اولاد نہیں ہوتی
تھی۔ سالہا سال گذر گئے اور اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا
نہ ہُوا۔ خدا تعالیٰ کے ایک نبی یا اس کے کسی برگزیدہ
بندہ نے اس کے لئے دعا کی اور اس کے ہاں بچہ
پیدا ہو گیا۔ یہ نشان اس بات کا ثبوت ہو گا کہ ہمارا
خدا خالق ہے۔ پس آیات اُن نشانات کو کہتے ہیں جو
کسی اعلیٰ نتیجے کے ثبوت کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔
مثلاً خدا تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت کیلئے یا نبوت انبیاء
وغیرہ کے سمجھانے کے لئے گویا کوئی اہم مقصد
اُن کے سامنے ہوتا ہے۔ بے موقع اور لغو طور پر وہ
ظاہر نہیں ہوتے۔ جیسے لوگوں میں مشہور ہے کہ مکہ میں
گدھوں والے جب مکہ سے باہر جاتے ہیں تو گدھوں
پر پتھر لاد کر لے آتے ہیں مگر جب مکہ میں پہنچتے ہیں
تو وہ پتھر تربوز بن جاتے ہیں۔ اب پتھروں اور تربوز
کا آپس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا اور نہ اس نشان
کی کوئی ضرورت نظر آتی ہے لیکن اس نشان میں
ہمیں ضرور جوڑ نظر آتا ہے کہ خدا نے کہا کہ خانہ کعبہ
محفوظ رہے گا۔ ابرہہ آیا اور وہ اپنی ساری طاقت

اور قوت کے باوجود شکست کھا گیا یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں جبکہ کوئی بھی آپ کے ساتھ نہیں تھا خبر دی کہ میں جیت جاؤنگا اور پھر مکہ والوں کی سر توڑ مخالفت کے باوجود آپ جیت گئے اور آپ کے دشمن ناکام و نامراد رہے۔ یہ آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ خدا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں اور ایک طاقتور ہستی ان کی مدد کر رہی ہے۔

پھر آیتیں دنیا میں ایسی بھی ہوتی ہیں جو نشان تو ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی غرض و غایت بیان نہیں کرتیں۔ لیکن فرماتا ہے یہ وہ آیات ہیں جو بیّنات ہیں یعنی نہ صرف کسی مقصد کو اپنے سامنے رکھتی ہیں بلکہ اس مقصد کو کھول کر بیان بھی کرتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ وہ نشان اپنی ذات میں کیوں ظاہر ہوگا۔ گویا وہ کوئی بے معنی کام نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بھی نشان آتا ہے وہ نہ صرف خدا اور اس کے انبیاء وغیرہ کے لئے ثبوت ہوتا ہے بلکہ خود اپنی ذات میں بھی موقع کے مناسب اور برمحل ہوتا ہے۔ پس آیتِ بیّنہ وہ ہے جو

(۱) کسی اعلیٰ شئے کو دکھانے اور قریب کرنے کے لئے ظاہر ہو۔ اور

(۲) وہ بے معنی نہ ہو بلکہ موقع کے مناسب ہو اور کسی مفید مقصد کے لئے ظاہر ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ لدھیانہ تشریف لے گئے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے خسر صوفی احمد جان صاحب جو ایک مشہور پیر اور بزرگ انسان تھے اور جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب "براہین احمدیہ" بھی پڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو بڑے خوش ہوئے اور اپنے ایک مُرید سے جو کابل کے شہزادوں میں سے تھے آپ کی دعوت کروائی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن کے مکان پر تشریف لے گئے اور جب کھانے سے فارغ ہوئے تو صوفی صاحب آپ کو مکان تک پہنچانے کے لئے آپ کے ساتھ ہی چل پڑے۔ صوفی احمد جان صاحب رتڑ چھتڑ والوں کے مرید تھے (رتڑ چھتڑ گورداسپور کے علاقہ میں ہے) حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے راستہ میں دریافت فرمایا۔ کہ صوفی صاحب سُنا ہے رتڑ چھتڑ والوں کی آپ نے بارہ سال تک خدمت کی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اُن کی صحبت سے کیا فیض حاصل کیا؟ انہوں نے کہا حضور! وہ بڑے بزرگ اور باخدا انسان تھے۔ مَیں بارہ سال اُن کی صحبت میں رہا اور بڑا فائدہ حاصل کیا۔ پھر انہوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو اُن کے پیچھے آرہا تھا اور کہا حضور! اُن کی برکت سے اب مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو چکی ہے کہ اگر میں اس شخص کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھوں تو فوراً زمین پر گر پڑے اور تڑپنے لگ جائے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر اس سوٹی کو جو آپ کے ہاتھ میں تھی زمین پر رگڑتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میاں صاحب پھر اس کا آپ کو کیا فائدہ پہنچا اور اگر ایسا ہو جائے۔ تو اُس شخص کو کیا فائدہ پہنچیگا؟ وہ چونکہ اہل اللہ میں سے تھے اس لئے آپ نے ابھی اتنا ہی فقرہ کہا تھا کہ وہ فوراً سمجھ گئے اور کہنے لگے حضور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسا نہیں کروں گا میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے۔ اس کا دین اور روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اب بظاہر

یہ ایک آیت تو تھی کیونکہ طاقت ظاہر ہوئی۔ اور ایک چلتے ہوئے آدمی کو گرا لیا مگر اس کا نیکی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کسی کو مُکّا مار کر گرا لیا جائے۔ کیونکہ جس طرح مُکّا مارنے سے دوسرا گر جاتا ہے اسی طرح ایک مسمریزم کی مشق رکھنے والا آدمی دوسرے پر نظر ڈال کر اُسے گرا سکتا ہے۔ پس اس سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ جس نے نظر ڈالی ہے اُس میں بڑی طاقت ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس نے نظر سے دوسرے کو گرا لیا ہے اس کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہے پس یہ ایک آیت تو تھی مگر بیّنہ نہیں تھی۔ بیّنہ وہ آیت ہوتی ہے جو اپنی غرض بھی بیان کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ اُس نشان کا مقصد کیا ہے۔

زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ الٰہی معجزات خالی آیت نہیں ہوتے۔ بلکہ ساتھ ہی وہ بیّنات بھی ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اُن کی غرض کیا ہے۔ اُن سے کو نسا فائدہ مدّ نظر ہے اور دنیا کو کیا نفع پہنچانا مقصود ہے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اعلان فرمایا کہ پنجاب میں طاعون آئے گی۔ اب یہ ایک آیت تو تھی مگر ساتھ ہی بیّنہ بھی تھی۔ کیونکہ آپ نے تشریح کر دی کہ چونکہ اِن لوگوں نے الٰہی تعلیم کو چھوڑ کر دوزخ کی طرف اپنا قدم بڑھا لیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اِن پر دنیا میں ہی اپنا عذاب نازل کرے گا تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اگر اس کی بجائے آپ صرف یہ کہہ دیتے کہ طاعون آئے گی جس سے دشمن کے آدمی بھی مر جائیں گے اور کچھ میرے آدمی بھی مریں گے تو یہ ایک آیت تو ہوتی مگر بیّنہ نہ ہوتی۔

غرض اِن دو الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی معجزات کی حقیقت بیان کر دی ہے اور بتایا ہے کہ الٰہی آیات کسی اہم مقصد کے لئے ظاہر ہوتی ہیں۔ اُس مقصد کو خوب کھول کر بیان کرتی ہیں اور پھر وہ آیات موقع کے مناسب اور برمحل ہوتی ہیں۔

اب بتاتا ہے کہ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا جب ہماری آیات اُن کو پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں۔ تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ "نو نقد نہ تیرہ ادھار" تم خبریں دے رہے ہو "تیرہ ادھار" کی اور ہم خبریں دے رہے ہیں "نو نقد" کی تم کہتے ہو کہ اگر ہمارے پیچھے چلوگے تو تمہیں جنت ملے گی۔ تمہیں بڑے بڑے انعامات ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور ہم کہتے ہیں کہ جوتیاں تمہاری ٹوٹی ہوئی ہیں۔ کپڑے تمہارے پھٹے ہوئے ہیں کھانے کو تمہارے پاس کچھ نہیں اور ہم میں سے ہر ایک کے پاس دس دس نوکر اور غلام ہیں۔ گھروں میں دولت بھری ہوئی ہے۔ عزت ہماری زیادہ ہے۔ اختیارات ہمارے زیادہ ہیں۔ تعداد ہماری زیادہ ہے۔ تم اِن باتوں میں ہمارا مقابلہ کر کے دیکھو۔ آئندہ کے متعلق تم کیا وعدے کرتے ہو۔ یہ دلیل یقیناً ایسی ہے کہ اگر اس کا کوئی توڑ نہ ہو تو دوسرے کو ساکت اور لاجواب کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں تم اَور باتوں کو جانے دو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا گھر اچھا ہے یا ہمارا؟ تمہارے پاس سامان زیادہ اچھا ہے یا ہمارے پاس؟ معزز لوگ ہماری مجلسوں میں آتے ہیں یا تمہاری مجلسوں میں؟ مدد حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۵﴾

اور ہم نے اِن سے پہلے بہت سے زمانوں کے لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو سامانوں کے لحاظ سے اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے (ان لوگوں سے) اچھے تھے ۵۹

پاس آتے ہیں یا تمہارے پاس۔ اگر مال ہمارے پاس زیادہ ہے، دولت ہمارے پاس زیادہ ہے، اختیارات ہمارے پاس زیادہ ہیں، تعداد میں ہم زیادہ ہیں، معزز لوگ ہمارے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، مدد حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں، بڑے بڑے عہدے ہمارے پاس زیادہ ہیں، ہر قسم کا ساز و سامان ہمارے پاس موجود ہے۔ تو ہم اچھے ہوئے یا تم اچھے ہوئے۔

اَلْاَثَاثُ

۵۹ حل لغات:۔ اَلْاَثَاثُ کے معنے ہیں مَتَاعُ الْبَيْتِ۔ گھر کا سامان۔ وَقِيْلَ هُوَ مَا يُتَّخَذُ لِلْاِسْتِعْمَالِ وَالْمَتَاعِ۔ اور بعض اہل زبان یہ کہتے ہیں کہ اثاث اس سامان کو کہتے ہیں جو استعمال میں آتا ہے وَقِيْلَ اَلْمَالُ كُلُّهٗ اور بعض اہل زبان کہتے ہیں کہ سارے گھر کے سامان کو خواہ وہ کیسا ہو اثاث کہتے ہیں۔ (اقرب)

اَلرِّءْيُ

اَلرِّءْيُ کے معنے ہیں اَلْمَنْظَرُ۔ منظر (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اگر تو دولت موجودہ کا تمہارے پاس ہونا اِس بات کا ثبوت ہے کہ آئندہ یہ حالات بدلیں گے نہیں تو پھر تو یہ دلیل ٹھیک ہے اور ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ چیزیں تمہارے پاس ہیں، ہمارے پاس نہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ۔ کبھی تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم تم سے پہلے کتنے قرن ہلاک کر چکے ہیں۔

قرن کے معنے ایک صدی کے بھی ہوتے ہیں اور صدی کے قریب زمانہ یعنی اسّی نوّے سال کو بھی قرن کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ یا ایک نسل کے لوگوں کو بھی قرن کہتے ہیں۔ زمانہ کے دَور کو بھی قرن کہتے ہیں اور ہر ایسی قوم جو تمام کی تمام ہلاک ہو گئی اور اس میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اُسے بھی قرن کہتے ہیں۔ (اقرب)

رِءْيًا کے معنے منظر یا اچھے منظر کے ہوتے ہیں۔

فرماتا ہے اگر وہ غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ کتنے ہی قرن ایسے گذرے ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ یعنی دنیا میں اب تک کتنی ہی قومیں ایسی گذر چکی ہیں جو تمام کی تمام ہلاک ہو گئیں اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اُن کے پاس اِن سے زیادہ اچھے سامان تھے اور ان کی مجلسوں میں اِن سے زیادہ قیمتی سامان ہوا کرتے تھے۔ گویا ان کی طاقت اِن سے زیادہ تھی۔ اُن کی شوکت اِن سے زیادہ تھی۔ اُن کا دبدبہ اور رعب ان سے زیادہ تھا مگر پھر بھی وہ ہلاک ہو گئیں۔ جب اُن سے زیادہ سامان اور زیادہ طاقت اور زیادہ شوکت رکھنے والی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں تو کم سے کم یہ لوگ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہلاک نہیں ہو سکتے۔ یہاں الگ سوال ہے کہ انہوں نے ہلاک ہونا ہی یا نہیں ہونا مگر بہرحال ہلاک نہ ہو سکنے والی

بات غلط ہو گئی۔ کیونکہ ان سے زیادہ طاقتور اور شاندار قومیں اس سے پہلے ہلاک ہو چکی ہیں۔

اس جگہ چونکہ عیسائیوں کا ذکر ہے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو زیادہ سامان رکھنے والے اور عیسائیوں سے زیادہ شان و شوکت کے مالک اور کون لوگ ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سامان ان کے پاس ہیں اور جو طاقتیں اور قوتیں ان کو حاصل ہیں۔ نہ یہ سامان پہلی حکومتوں کے پاس تھے اور نہ ایسی طاقتیں اور قوتیں اُن کو حاصل تھیں۔ پھر وہ کون لوگ ہیں جنہیں زیادہ ساز و سامان والا اور زیادہ شان و شوکت رکھنے والا قرار دیا گیا ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ طاقت اور قوت بھی ایک نسبتی امر ہے۔ مثلاً ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ہزار روپیہ ہے اور اس کے مخالف کے پاس دو سو روپیہ ہے۔ اور ایک اور شخص ایسا ہے جس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے اور اس کے مخالف کے پاس ننانوے لاکھ ننانوے ہزار روپیہ ہے۔ اب گو اس کے پاس ہزار روپے والے سے بہت زیادہ روپیہ ہے مگر نسبتی طور پر یہ اس سے طاقت میں کمزور ہے کیونکہ جس دشمن سے ہزار روپے والے کا مقابلہ ہے اس سے وہ پانچ گنا طاقتور ہے اور جس دشمن سے اس کا مقابلہ ہے اس سے صرف ایک ہزار روپیہ اس کے پاس زیادہ ہے۔ پس گو اس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے اور دوسرے کے پاس ایک ہزار مگر دشمن کی طاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسبتی لحاظ سے جس کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے وہ زیادہ طاقتور ہے اور جس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے وہ کم طاقتور ہے۔ پس طاقتوں کا مقابلہ ہمیشہ نسبتی طور پر ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ کسی کے پاس روپیہ کی کتنی مقدار ہے۔ بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے دشمن کے پاس کتنا روپیہ ہے اور پھر نسبت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں فرعون کو طاقت حاصل تھی اس زمانہ میں دنیا میں اور کوئی بادشاہ ایسا نہیں تھا جو فرعون کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکتا۔ جس زمانہ میں سکندر کو طاقت حاصل تھی اس زمانہ میں ساری دنیا میں کسی کو سکندر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی جس زمانہ میں چنگیز خان کو طاقت حاصل تھی۔ اُس زمانہ میں ساری دنیا میں اور کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو چنگیز خان کا مقابلہ کر سکتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک نقدی اور سامانوں کا سوال ہے یا جہاں تک فوج کی تنظیم کا سوال ہے آج امریکہ یقیناً چنگیز اور سکندر اور نپولین سے ہزاروں گنا زیادہ طاقتور ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں امریکہ کے دشمن کو جو طاقت حاصل ہے وہ بھی سکندر اور چنگیز اور نپولین کے دشمنوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ سکندر یونان سے اٹھا اور چار ہزار میل کا سفر کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور کوئی حکومت اس کا مقابلہ نہ کر سکی مگر یہاں امریکہ والے کوریا میں ہی گئے تو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آج چین اور روس کی طاقت بھی امریکہ کے برابر برابر ہو چکی ہے۔ پس امریکہ آج سارے ساز و سامان کے باوجود نسبتی طور پر سکندر سے کمزور ہے۔ نسبتی طور پر وہ چنگیز سے بھی کمزور ہے۔ کیونکہ چنگیز اور سکندر کا مد مقابل امریکہ کے مد مقابل سے بہت زیادہ کمزور تھا۔ اسی طرح مید اور فارس کے بادشاہوں کو لے لو۔ بخت نصر کو لے لو۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ

تو کہہ دے کہ جو شخص گمراہی میں (پڑا) ہو (خدائے) رحمٰن اُسے ایک عرصہ

الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ

تک ڈھیل دیتا جاتا ہے یہاں تک کہ جب ایسے لوگوں کے سامنے وہ عذاب

إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ

آجائیگا جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا (یعنی) یا دنیوی عذاب یا (قومی) کامل تباہی - اُس وقت وہ جان لیں گے

مَنْ هُوَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٦﴾

کہ کون شخص مکان کے لحاظ سے بدتر ہے اور دوستوں کے لحاظ سے کمزور ہے ۵۶

ہزاروں میل تک ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جس طرف بھی یہ اپنی فوجوں کو بڑھا دیتے تھے لوگ ان کے مقابلہ میں ہتھیار ڈالتے چلے جاتے تھے مگر اب امریکہ ذرا قدم بڑھاتا ہے تو چین سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کچھ اور قدم بڑھاتا ہے تو روس نکل آتا ہے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایسا توازن قائم رہتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے یہ برابر کی ٹکر ہیں یا اگر کچھ فرق بھی ہے تو دو اور پونے دو کا۔ لیکن پہلے زمانہ میں دو اور پونے دو کا فرق نہیں تھا۔ بلکہ دو اور ½ کا تھا۔ پس بے شک ظاہری شان و شوکت ان میں زیادہ پائی جاتی ہے مگر نسبتی لحاظ سے یہ پہلوں کے مقابلہ میں کمزور ہیں۔ سکندر ساری دنیا میں نکل جاتا تو کوئی اس کے مقابلہ میں نہیں اٹھتا تھا اور اگر کوئی مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا تو شکست کھاتا۔ مگر امریکہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔ پس فرماتا ہے جب تم سے زیادہ شان و شوکت رکھنے والی حکومتیں ہم نے تباہ کر دیں جب تم سے زیادہ سازو سامان رکھنے والی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں تو تم کس طرح یہ خیال کر سکتے ہو کہ تم تباہ نہیں ہو گے۔

۵۶ تفسیر:۔ فرماتا ہے دنیا میں قائم رہنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سیدھے راستہ پر چل رہا ہو۔ اگر وہ سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔ تو ہر عقلمند سمجھ لیتا ہے کہ یہ آج گرا یا کل۔ کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص غلط راستے پر چل رہا ہو۔ تباہی اور ہلاکت کی طرف جا رہا ہو اور پھر تباہی اور ہلاکت کے گڑھے میں نہ گرے۔ اگر کوئی شخص غلط راستے پر چل رہا ہے اور پھر بھی یہ امید رکھتا ہے کہ وہ کامیاب ہوگا تو اس کی ایسی ہی مثال ہوگی جیسے کہتے ہیں کہ شیخ چلی ایک درخت پر چڑھ کر اُسی شاخ کو کاٹنے لگ گیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ کوئی شخص نیچے سے گذرا تو اس نے کہا میاں یہ کیا کر رہے ہو کہ جس شاخ پر تم بیٹھے ہو اُسی شاخ کو تم کاٹ رہے ہو تم تو نیچے گر پڑو گے۔ اُس نے کہا جاؤ جاؤ بڑا نبی بن کر آیا ہے۔ تمہیں کیا پتہ کہ میں نیچے گروں گا یا نہیں۔

وہ کہنے لگا صاف نظر آرہا ہے کہ جب تم اُسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر بیٹھے ہو تو جب شاخ کٹی تو تم بھی نیچے آگرو گے۔ کہنے لگا جاؤ اور اپنا کام کرو ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہوئے ہیں جو اس قسم کے دعوے کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ چلا گیا۔ اب یہ سیدھی بات تھی کہ اس نے بہر حال نیچے گرنا تھا چنانچہ جب شاخ کٹ گئی تو وہ نیچے آپڑا۔ اب وہ اُس شخص کی طرف بھاگا جس نے کہا تھا کہ ایسا مت کرو ورنہ گر جاؤ گے اور اُسے کہنے لگا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے تمہاری بات نہ مانی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے نبی ہو۔ اس نے کہا میں بالکل نبی نہیں۔ میں نے تو اپنی عقل سے ایک قیاس کیا تھا کہ جب تم اُسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر بیٹھے ہو تو ضرور گرو گے۔ کہنے لگا نہیں تم ضرور نبی ہو۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں کب مروں گا۔ اس نے کہا مجھے کیا پتہ کہ تم کب مرو گے۔ مگر وہ پیچھے پڑ گیا کہ مجھے ضرور بتاؤ۔ آخر اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا کہ جس دن تمہارے مُنہ سے خون آیا اُس دن تم مر جاؤ گے۔ وہ یہ سنکر واپس آگیا۔ وہ جُلاہا تھا۔ ایک دن تانی تن رہا تھا کہ سرخ تاگا اس کے دانتوں میں پھنس گیا جس کا رنگ دانتوں پر لگ گیا اور اس نے یہ سمجھا کہ میرے مُنہ سے خون آگیا ہے چنانچہ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ میں اب مرنے لگا ہوں میرے کفن دفن کی تیاری کرو۔ ایسی ہی جہالت ان لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ جب واقعات نظر آتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ یہ لوگ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو یہ کہنا کہ اس غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ کس طرح نکلے گا اور ہم ہلاک اور برباد کس طرح ہو سکتے ہیں بالکل شیخ چلّی والی بات ہے۔ ایک طرف روس کی طاقت دیکھی جائے اور دوسری طرف امریکہ کی طاقت دیکھی جائے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ دونوں مقابل کی طاقتیں ہیں اور جب ان میں ٹکر ہوئی تو یہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گی جس طرح گزشتہ جنگ میں جرمنی تباہ ہوا۔ اٹلی برباد ہوا۔ فرانس ختم ہوا۔ اسی طرح اب جنگ ہوئی تو روس اور امریکہ ختم ہو جائیں گے اسی مضمون کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ جس کی گمراہی ثابت ہو چکی ہو اُس کے انجام کے متعلق کوئی دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ تم یہ دیکھو کہ تم میں ضلالت پائی جاتی ہے یا نہیں اور اگر تم میں ضلالت پائی جاتی ہے تو پھر ہم ٹھیک کہتے ہیں کہ خواہ تمہاری کتنی بھی طاقت ہو تم ایک دن ختم ہو جاؤ گے کیونکہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو۔

فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا۔ یہ امر کا صیغہ ہے یعنی چاہیئے کہ رحمٰن اس کو اور مہلت دے۔ مگر مراد یہ ہے کہ رحمٰن اس کو اور مہلت دے گا۔ یعنی امر اس جگہ خبر کے معنوں میں زور دینے کے لئے استعمال ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔ عربی زبان کا طریق ہے کہ اُس میں بعض دفعہ امر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد زور دینا ہوتا ہے۔ اس جگہ بھی امر کا صیغہ استعمال کرنے میں یہی حکمت مدّنظر ہے یعنی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے ضرور مہلت دے گا اور پھر اُسے سزا دیگا تاکہ دنیا بڑی دیر تک اس کی شان و شوکت دیکھنے کے بعد اس کی عبرتناک تباہی کو دیکھے اور اس نشان کی اہمیت کی قائل ہو۔ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا کے معنے یہ ہیں کہ چاہیئے کہ رحمٰن اُس کو اور مہلت دے مگر مراد یہ ہے کہ شانِ معجزہ اسی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ خدائے رحمٰن ابھی اس کو اور ڈھیل دے۔ گویا بظاہر تو اس قوم کے حالات کو دیکھ کر یہ کہنا چاہیئے کہ خدا اس قوم کو غارت کرے

خدا اس قوم کو تباہ اور برباد کرے۔ مگر اس نشان کی عظمت اور اہمیت اتنی عظیم الشان ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ خدا اس قوم کو غارت کرے ایک عقلمند اور روحانی انسان یہ کہیگا کہ یہ قوم ابھی اور اونچی ہو کیونکہ یہ جتنی زیادہ اونچی ہوگی اُتنا ہی اس کا گرنا زیادہ عظیم الشان ہوگا۔

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے وہ چیز جس کا اُن سے وعدہ کیا جارہا ہے یا عذاب کا اور یا پھر ساعت کا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ کسی شک کا اظہار کیا جارہا ہے کہ معلوم نہیں کیا چیز دیکھیں گے؟ عذاب دیکھیں گے یا ساعت دیکھیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ مختلف قوموں اور حکومتوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آیا کرتے ہیں وہ خدائی سنت کے مطابق سب کے لئے ایک وقت میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ پہلے ایک قوم پر عذاب آتا ہے پھر کچھ وقفہ کے بعد دوسری قوم پر آتا ہے پھر کچھ وقفہ کے بعد تیسری قوم پر آتا ہے اور بعض قومیں ایسی ہوتی ہیں جن پر عذاب نہیں بلکہ ساعت کی گھڑی آجاتی ہے اور یہ دونوں سلسلے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ پچھلی لڑائی قیصر جرمنی کے لئے ساعت تھی مگر فرانس اور انگلستان کے لئے عذاب تھی یہ دونوں بچ گئے۔ مگر کمزور بھی ہو گئے۔ پس اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ کے یہ معنے نہیں کہ یا عذاب آئے گا اور یا پھر ساعت آئے گی بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے ہمارا عذاب نازل ہوگا اور کسی قوم پر ساعت آجائے گی۔ اور یہی دنیا میں ہوتا چلا آیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم ہوئی تو اس میں قیصر جرمنی ختم ہوگیا۔ زار روس ختم ہوگیا۔ بادشاہ ٹرکی ختم ہوگیا اور انگلستان، فرانس اور بلجیم پر عذاب آیا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم ہوئی

تو اس میں ہٹلر اور مسولینی پر ساعت آگئی اور وہ تباہ ہو گئے۔ لیکن فرانس اور انگلستان کے لئے عذاب آگیا اور وہ کمزور ہو گئے۔ پس فرماتا ہے جس دن ہمارے وعدہ کی گھڑی آپہنچی اُس دن کسی کیلئے عذاب کا وعدہ پورا ہو جائے گا اور کسی کے لئے ساعت کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ ساعت کے معنے ہمیشہ قیامت یا آخری فیصلہ کے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں قیامت مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ عذاب کے ساتھ متبادل نہیں۔ یہاں مراد قومی فیصلہ ہی ہے جو عذاب سے متبادل شئے ہے۔ کیونکہ سب قوموں کا ایک وقت میں فیصلہ نہیں ہوتا بعض ایک وقت میں عذاب دیکھیں گی اور بعض بالکل ختم ہو جائیں گی۔ اس طرح باری باری سب کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دنیا کی باقی سب قوموں سے ہوتا چلا آیا ہے اسی طرح مسیحیوں سے بھی ہوگا اور بعض پر اس کی طرف سے عذاب نازل ہوگا اور بعض کی ساعت آجائیگی۔

فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا۔ اُس وقت اُنکو معلوم ہو جائیگا کہ کس کا مقام رہائش بُرا ہے اور کون اپنے لشکر وں کے لحاظ سے زیادہ کمزور ہے۔ یعنی اس وقت جب وہ مومنوں کے حق میں خدا تعالیٰ کی تائیدات دیکھیں گے تو یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوں گے کہ گو یہ کمزور تھے مگر ان میں ترقی کرنے کا مادہ پایا جاتا تھا اور گو ہم طاقتور تھے مگر ہمارے اندر ہلاکت اور بربادی کا مادہ پایا جاتا تھا۔ ایک درخت ایسا ہوتا ہے جو بظاہر بڑا پھیلا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ سَو سال کا بڈھا ہوتا ہے اور اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک گٹھلی ہوتی ہے جس میں سے ایک کونپل نکل رہی ہوتی ہے۔ بظاہر وہ کونپل ایک حقیر سی چیز

وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ۚ

اور اللہ (تعالیٰ) ہدایت یافتہ لوگوں کو ہدایت میں بڑھاتا جائے گا

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ

اور باقی رہنے والے (یعنی) نیک اعمال خدا کی نظر میں سب سے بہتر شئے ہیں

ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَرَدًّا ﴿٧٧﴾

جزا کے لحاظ سے بھی اور انجام کے لحاظ سے بھی ۵۶

نظر آتی ہے اور درخت بڑا مضبوط دکھائی دیتا ہے مگر ہر عقلمند جانتا ہے کہ اب آئندہ یہ کونپل ہی ترقی کرے گی۔ کیونکہ ابھی سارا مستقبل اس کے سامنے پڑا ہے اور وہ درخت جو سو سال کا بڈھا اور اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے وہ آج نہیں تو کل گر جائے گا پس اس دن جب نتائج ظاہر ہوں گے تو یہ لوگ اقرار کریں گے کہ ہم تو مرنے والے تھے بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ تو انہی لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ اسی طرح فرماتا ہے اُس دن اُن پر یہ حقیقت بھی کھل جائیگی کہ کس کا لشکر کمزور تھا۔ آیا خدا کا لشکر کمزور تھا یا اُن کا لشکر کمزور تھا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اعلیٰ درجہ کے تمدن اور بڑے بڑے لشکروں پر ناز ہوگا۔ مومنوں کی طاقت اس وقت نظر نہیں آئے گی۔ وہ مشرقیوں کو اچھی رہائش نہ ہونے کا طعنہ دیں گے اور ساتھ ہی کہیں گے کہ ہمارے پاس بڑے بڑے لشکر ہیں اور ہماری طاقت تم سے بہت زیادہ ہے۔ مگر آخر اُن کی یہ دولت بھی چھن جائیگی کیونکہ خدا مومنوں کے ابھارنے اور کافروں کے مٹانے کا فیصلہ کر چکا ہوگا۔ پس یہ دن بدن اونچے ہوتے چلے جائیں گے اور وہ دن بدن نیچے ہوتے چلے جائینگے اور آخر ایک دن دنیا یہ تسلیم کرلے گی کہ یہ لوگ ترقی کی طرف جا رہے تھے اور وہ تنزل کی طرف جا رہے تھے۔

۵۶ تفسیر:۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ جوں جوں حالات میں تغیر پیدا ہوتا ہے مومن کا ایمان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے گویا کوئی تغیر اس کے قدم کو سست اور اس کے ایمان کو کمزور نہیں کرتا بلکہ ہر نیا تغیر اُس کی طاقت اور قوت کو بڑھانے والا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جماعت میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی تغیر پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں ہمیشہ جماعت نے ترقی کی ہے۔ کتنا بڑا صدمہ تھا جو قادیان سے نکلنے پر جماعت کو پہنچا۔ پہلے تو قادیان کے متعلق ہماری جماعت میں ایک قسم کا شرک پایا جاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے قادیان سے کبھی نہیں نکلنا۔ اس شرک کے ٹوٹنے پر جماعت کو ایک بڑا دھکا لگا اور کئی کمزور ایمان والے متزلزل ہو گئے بعض لوگ بے شرمی سے اپنے منہ سے تو یہ کہتے تھے کہ احمدیت سچی ہے لیکن اُن کے دل کہتے تھے کہ اگر احمدیت سچی ہوتی تو ہم قادیان سے کیوں نکلتے۔ مگر اب دیکھو قادیان سے نکل کر ہماری جماعت کو کتنی بڑی طاقت

حاصل ہوئی ہے۔ قادیان میں سالوں بعد کبھی کوئی غیر ملکی
آیا کرتا تھا مگر قادیان سے ہجرت کے بعد متواتر کئی
ممالک سے لوگوں نے یہاں تعلیم کے لئے آنا شروع
کر دیا۔ اب بھی دس بارہ غیر ممالک کے لوگ یہاں تعلیم
حاصل کر رہے ہیں اور ابھی کئی لوگوں کی چٹھیاں آتی
رہتی ہیں کہ ہمیں بھی وہاں آنے کی اجازت دی جائے
مگر بوجہ مالی تنگی کے اُن کی درخواستوں کو رد کرنا پڑتا
ہے۔ ابھی قادیان میں ہمارے بہت تھوڑے مشن
تھے۔ مگر اب کئی نئے ممالک میں مبلغین بھجوائے
جا چکے ہیں اور کثرت سے لوگ احمدیت سے روشناس
ہو رہے ہیں۔ اسی طرح قادیان کے بجٹ سے اب ہمارا
یہاں کا بجٹ بھی بڑھ گیا ہے۔ غرض سلسلہ کے تمام
کاموں میں جس قدر ترقی اور زیادتی ہوئی ہے وہ
حیرت انگیز ہے۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اِس
آیت میں بیان فرمائی ہے کہ ہم مومنوں کو ترقی دیتے
چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ انہیں صدمات نہیں پہنچے
صدمات ان کو بھی پہنچیں گے مگر جس وقت مخالفت
کے بادل چھٹیں گے دشمنِ صداقت کمزور نظر آئے گا اور
مومن پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا۔ اور باقی رہنے والی نیک
باتیں ہی تیرے رب کے نزدیک سب سے اچھی ہیں۔
یعنی انسان کے وہ اعمال جو خدا تعالیٰ کے حضور مقبول
ہو جائیں وہی اس کا حقیقی سرمایہ ہیں یا یوں سمجھ لو
کہ باقیات الصالحات وہ چیزیں ہیں جو خدا تعالیٰ
کے خزانہ میں چلی گئیں۔ حضرت مسیحؑ نے کہا ہے کہ

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں
کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں
چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ بلکہ
اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں
نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ
وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔"
(متی باب ۶ آیت ۱۹-۲۰)

پس چونکہ حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ
اپنے لئے زمین پر مال جمع نہ کرو بلکہ آسمان پر مال جمع
کرو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو اس امر کی
طرف توجہ دلاتا ہے کہ تم اپنی جس قدر طاقتیں
پیش کرتے ہو وہ اسی زمین سے تعلق رکھنے والی ہیں۔
تمہارا ایٹم بم بھی اسی دنیا کا ہے۔ تمہاری توپیں بھی
اسی دنیا کی ہیں۔ تمہارے گولے بھی اسی دنیا کے ہیں
تمہاری تجارتیں بھی اسی دنیا کی ہیں۔ تمہارے جتھے بھی
اسی دنیا کے ہیں۔ مگر مومن جن کے متعلق تم کہتے ہو کہ
وہ کمزور اور ناطاقت ہیں اُن کا بینک آسمان پر
کھلا ہُوا ہے۔ کیا مسیحؑ کی بات تمہیں یاد نہیں رہی کہ جو
چیز آسمان پر ہے وہی محفوظ ہے اور جو زمین پر
ہے وہ غیر محفوظ ہے۔ ان کی باقیات الصالحات
خدا کے بینک میں ہیں جس کا دیوالہ نہیں نکل سکتا۔
اور وہ بہت بہتر ہیں ثواب کے لحاظ سے بھی اور
پھر واپسی کے لحاظ سے بھی۔ یعنی اصل مال بھی
انہیں وہیں سے ملے گا اور ثواب بھی وہیں سے ملیگا۔
یا یوں کہو کہ مُول بھی وہیں سے ملیگا اور بیاج بھی
وہیں سے ملے گا۔ ثواب بیاج ہوگیا اور خَيْرٌ مَّرَدًّا
مُول ہوگیا۔ گویا اس طرف اشارہ کیا کہ تمہیں اپنے
بنکوں پر بڑا ناز ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارا روپیہ بنکوں میں
ضرور ہونا چاہئے کیونکہ تمہیں انٹرسٹ ملیگا لیکن تم اس حقیقت
کو بھول گئے کہ اصل مال وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے
بنک میں محفوظ ہے اور اسی کا دیا ہُوا انٹرسٹ
حقیقی انٹرسٹ ہے۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ

کیا تُو نے اس شخص کی حالت پر کبھی غور نہیں کیا جس نے ہمارے نشانوں کا انکار کیا اور کہا کہ

لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۸﴾ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ

مجھے یقیناً بہت سا مال اور بہت سے بیٹے دئے جائیں گے ۔ کیا اس نے غیب کا حال معلوم

أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۹﴾

کر لیا ہے یا (خدائے) رحمان سے کوئی وعدہ لے لیا ہے ۶۳

۶۳ تفسیر:۔ فرماتا ہے ذرا بتاؤ تو سہی وہ شخص جو ہماری آیتوں کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے مال کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے بدلہ میں مجھے اور مال ملے گا۔ میں اُسے تجارت پر لگاؤں گا اور اپنے مال میں اضافہ کرتا چلا جاؤں گا اور میرے بیٹوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ میرا خاندان اور میری نسلیں ترقی کریں گی۔ گویا افزائشِ نسل کے لئے جس قدر سامانوں کی ضرورت ہے وہ میرے پاس ہیں تمہارے پاس نہیں۔ فرماتا ہے اَطَّلَعَ الْغَیْبَ تم بتاؤ کہ کیا اس نے غیب دیکھ لیا ہے۔ کیا پہلے لوگوں کے پاس مال نہیں تھا اور پھر وہ تباہ نہیں ہو گئے۔ کیا پہلے لوگوں کے پاس اولادیں نہیں تھیں اور کیا وہ اولادیں اُن کے کام آئیں؟ عاد کے پاس کتنی بڑی طاقت تھی سارے عرب اور عراق اور فلسطین اور شام پر اُن کی حکومت تھی۔ مگر اب زمینیں کھود کھود کر عاد قوم کے آثار تلاش کئے جاتے ہیں اور اگر کسی کو کوئی نشان مل جاتا ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے کہ میں نے ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اسی طرح فراعنہ کو دیکھ لو۔ ان کی کتنی بڑی طاقت تھی لوگ اُن کا نام سنکر لرزتے تھے اور خود انکی یہ حالت تھی کہ اگر وہ دربار میں آتے تو اپنے مُنہ پر نقاب ڈال لیتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اتنی بڑی شان کے مالک ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمارا چہرہ دیکھ لے گا تو وہ کوڑھی ہو جائے گا۔ مگر اب اُن کی لاشیں نکال نکال کر عجائب گھروں میں رکھی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں فرعون کی لاش ہے اور یہ فلاں فرعون کی لاش ہے۔ مَیں نے خود مصر کے عجائب گھر میں ایسی لاشیں دیکھی ہیں۔ فرانس کے عجائب گھر میں بھی لاشیں ہیں۔ اور اب امریکہ والے کوشش کر رہے ہیں کہ وہ بھی کسی فرعون کی لاش لے جائیں گویا فراعنۂ مصر کی لاشوں کی اب ایسی ہی حیثیت رہ گئی ہے جیسے پُرانے برتنوں کی ہوتی ہے کہ لوگ انہیں تماشہ کے طور پر عجائب گھروں میں رکھ دیتے ہیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ میں ہماری لاشوں کے ساتھ یہ سلوک ہونے والا ہے۔ پس فرماتا ہے تم جو دعوے کرتے ہو کہ ہم تباہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاس مال ہے اور ہماری نسلیں خوب ترقی کر رہی ہیں کیا تمہیں غیب کا علم حاصل ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا خدا نے تم سے کوئی عہد کیا ہُوا ہے کہ وہ تمہیں ہلاک نہیں کرے گا۔ یہی دو باتیں ہیں جن پر تم

كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهٗ

ایسا ہرگز نہیں ہوگا ہم اس کے اس قول کو محفوظ رکھیں گے اور اس کے

مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٨٠﴾

عذاب کو لمبا کر دیں گے ۵۹۳

اپنے اس دعویٰ کی بنیاد رکھ سکتے ہو لیکن اگر تمہیں غیب کا علم حاصل نہیں اور خدا نے تمہارے ساتھ کوئی عہد بھی نہیں کیا۔ تو صرف اموال اور اولاد کا تمہارے پاس ہونا تمہیں تباہی سے نہیں بچا سکتا کیونکہ دنیوی لحاظ سے بڑی بڑی طاقتیں آج تک تباہ ہو چکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غیب کی خبریں یا تو نجومی، رمّال اور ارڈ پوپو وغیرہ بتایا کرتے ہیں اور یا پھر اللہ تعالیٰ کے انبیاء بتایا کرتے ہیں۔ یوں تو بعض دفعہ بچے بھی ضد میں آکر کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں فلاں چیز کا پتہ ہے حالانکہ انہیں پتہ نہیں ہوتا۔ مگر بچوں کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ توجہ یا تو نجومیوں اور ارڈ پوپوں کی بات کی طرف کی جاتی ہے اور یا پھر اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی طرف کی جاتی ہے۔ پس چونکہ انہی دو ذرائع سے لوگ غیب کی خبریں حاصل کیا کرتے ہیں۔ اس لئے اس جگہ بھی انہی دونوں باتوں کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ نجومیوں اور ارڈ پوپوں کی پیشگوئی ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا خدا تعالیٰ کے کسی نبی نے ایسا کہا ہے؟

۳۶۵ **حل لغات**:۔ مفردات میں لکھا ہے کہ کَلَّا رَدْعٌ وَّزَجْرٌ وَّاِبْطَالٌ لِّقَوْلِ الْقَائِلِ کے لئے آتا ہے یعنی اس کے معنے دھتکارنے کے بھی ہوتے ہیں۔ زجر کے بھی ہوتے ہیں اور یہ پہلے قول کو رد کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ گویا جہاں کَلَّا کا لفظ استعمال ہوگا وہاں مراد یہ ہوگی کہ پہلے جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے یہ بالکل غلط بات ہے نہ انہیں غیب کا علم حاصل ہے اور نہ خدا نے اُن سے کوئی عہد کیا ہوا ہے سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ ہم ضرور وہ بات لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہے ہیں۔ اور وہ کہتے یہ ہیں کہ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا۔ ہمیں مال بھی ملے گا اور ہمیں اولاد بھی ملے گی۔ اُن کا یہ قول معاف نہیں ہوگا بلکہ ان کا حساب لینے کے لئے اُسے یاد رکھا جائے گا۔ اور ہم اس بات کو کبھی بھولیں گے نہیں کہ انہوں نے ہمارے بندوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بندوں کے سامنے ہی انکو جھوٹا ثابت کریں۔

وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا۔ اور جس طرح ہم نے اُن کے آرام کی مدت لمبی کر دی۔ اور انہوں نے مومنوں کو طعنہ دیا کہ ہمیں طاقت اور شوکت حاصل ہے اور تم ہمارے مقابلہ میں بالکل کمزور اور ذلیل ہو۔ اسی طرح اب ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم ان کے عذاب کو بھی لمبا کریں۔ ہم نے انہیں ایک لمبی مہلت دے کر اپنے مومن بندوں کو لمبے عرصہ تک

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۱﴾

اور جس (چیز) پر وہ فخر کر رہا ہے اس کے ہم وارث ہو جائیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا ہی آئے گا ۱۲۵

شرمندہ کروایا اور وہ کمزوروں اور ناطاقتوں کی طرح اُن کے سامنے کھڑے رہے۔ پس چونکہ ہم نے ان لوگوں کو مہلت دے کر اپنے مومن بندوں کو شرمندہ کروایا تھا اور اسلام پر لوگوں کے لئے اعتراض کا موقع پیدا ہوا تھا اس لئے اب ہمارا ہی فرض ہے کہ ہم اس کے بدلہ میں اُن کے عذاب کو بھی لمبا کریں تاکہ مومن کو یہ تسلی ہو کہ میرا بھی کوئی ہمدرد اور نگران ہے۔

۱۲۵ **تفسیر**:۔ مَا يَقُوْلُ کی تشریح پہلی آیت میں موجود ہے فرماتا ہے وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے مال بھی ملے گا اور اولاد بھی ملے گی۔ یہ دعویٰ تھا جو اس نے لوگوں کے سامنے کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ یعنی نَرِثُ مِنْهُ مَا يَقُوْلُ جو کچھ وہ کہا کرتا تھا اس کے ہم وارث ہو جائیں گے یعنی وہ مال جو اس کو حاصل ہے اور وہ اولاد جس کی وجہ سے وہ دعوے کر رہا ہے ہم یہ دونوں چیزیں اُس سے چھین لیں گے۔

اسی طرح پہلی آیات میں یہ گذر چکا ہے کہ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا یعنی کافر مومنوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہمیں بتاؤ کہ مال اور دولت اور عزت اور رتبہ کس کو حاصل ہے۔ اگر یہ چیزیں ہمیں حاصل ہیں تمہیں حاصل نہیں تو ہم دونوں میں سے کون اچھا ہوا پس مَا يَقُوْلُ سے مراد مال اور عزت اور رتبہ اور اولاد ہے۔

فرماتا ہے ہم ان چیزوں میں اُس کے وارث ہو جائیں گے یعنی اُن سے مال بھی چھین لیں گے۔ اُن کی دولت بھی چھین لیں گے۔ اُن کی عزت بھی چھین لیں گے۔ اُن کا رتبہ بھی چھین لیں گے۔ ان کی اولادیں بھی چھین لیں گے۔ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا۔ اور وہ ایک فرد کی حیثیت میں ہمارے پاس آئیں گے۔

يَاْتِيْنَا فَرْدًا میں مال کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صرف اس کی ذاتی حیثیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کیونکہ انسان کے دو قسم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو رشتہ داری کی وجہ سے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں جیسے ماں باپ ہوئے یا اولاد ہوئی۔ یا بہن بھائی ہوئے یا بیوی ہوئی۔ اور ایک وہ ہوتے ہیں جو حصولِ فائدہ کے خیال سے جو مال اور رتبہ کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے انسان کے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ دولت اور عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ یا شہرت کے خواہشمند ہوتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ کسی کے پاس مال ہے اور وہ بڑا صاحبِ رسوخ انسان ہے تو مختلف قسم کے فوائد کے حصول کے لئے وہ اُس کی خوشامدیں کرنے لگ جاتے ہیں اور اس کے ساتھی اور دوست بن جاتے ہیں۔ مگر فرمایا جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو وہ صرف ایک فرد کی حیثیت میں ہو گا۔ کسی قسم کے ساتھی اس کے ساتھ نہیں ہونگے۔

پہلے فرمایا تھا کہ ہم مال اور اولاد دونوں کے وارث ہو جائیں گے۔ اب بتاتا ہے کہ چونکہ ہم اُن کی اولاد بھی چھین لیں گے اس لئے وہ اکیلے رہ جائیں گے اور چونکہ ہم مال بھی لے لیں گے۔ اس لئے وہ لوگ جو مال کی

وجہ سے اُن کے اِرد گرد اکٹھے تھے اور جو رات دن
خوشامدیں کرتے رہتے تھے وہ بھی بھاگ جائیں گے
غرض یَاْتِیْنَا فَرْدًا میں اللہ تعالیٰ نے اِسبات
کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم اُن کے مال اور اولاد
دونوں لے لیں گے۔ فَرْدًا میں اولاد اور خدم و مصاحب
سب کی نفی کر دی اور جو حصولِ فائدہ کے لئے ساتھ
ہوتے ہیں ان کی نفی میں مال و دولت کی نفی خود بخود
آ گئی کیونکہ وہ لوگ تبھی ساتھ چھوڑتے ہیں جبکہ مال
اور رُتبہ نہ رہے۔

کفارِ مکہ کو ہی دیکھ لو۔ اِن لوگوں کو اپنی اولادوں
پر کتنا بڑا ناز تھا۔ مگر پھر وہی اولادیں خدا تعالیٰ
نے اُن سے چھین کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کے قدموں میں ڈال دیں اور سردارانِ کفار ذلیل
ہو کر رہ گئے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب
بنو مصطلق پر لشکر کشی کی تو وہاں انصار اور مہاجرین
میں کنوئیں سے پانی نکالنے پر جھگڑا ہو گیا اور اس
جھگڑے نے اِس قدر طول کھینچا کہ انصار اور مہاجرین
نے تلواریں نکال لیں اور وہ ایک دوسرے سے لڑائی پر
آمادہ ہو گئے۔ عبد اللہ بن ابی ابن سلول نے اس موقعہ
کو غنیمت سمجھا چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اُس نے
کہا۔ اے انصار! یہ تمہاری ہی غلطیوں کا نتیجہ ہے
کہ آج تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ میں تمہیں پہلے ہی سمجھاتا
تھا کہ تم ان مہاجرین کو اپنے سر نہ چڑھاؤ ورنہ کسی دن
تکلیف اُٹھاؤ گے مگر تم نے میری بات نہ مانی۔ اب
خدا کا شکر ہے کہ تمہیں بھی اس حقیقت کا احساس ہوا۔
مگر گھبراؤ نہیں اور مجھے مدینہ پہنچ لینے دو۔ پھر
دیکھو گے کہ مدینہ کا سب سے معزز انسان یعنی وہ کمبخت خود۔
مدینہ کے سب سے زیادہ ذلیل انسان یعنی نعوذ باللہ
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال دیگا
اور یہ فتنہ پھر کبھی سر نہیں اُٹھائے گا جب اُس
نے الفاظ کہے تو انصار اور مہاجرین دونوں سمجھ گئے
کہ ہمارے جوش سے اِس نے ناجائز فائدہ اٹھانا
چاہا ہے چنانچہ وہ سنبھل گئے اور انہوں نے آپس
میں صلح کر لی مگر اس دوران میں کسی نے دوڑ کر
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی کہ
یا رسول اللہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول نے آج اِس
اِس طرح کہا ہے۔ آپ نے عبد اللہ بن ابی ابن سلول
اور اس کے دوستوں کو بلایا اور فرمایا کہ کیا بات ہوئی
ہے انہوں نے اس واقعہ سے بالکل انکار کر دیا اور
کہا کہ یہ بالکل غلط بات ہے ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی
نہیں لیکن بات سچی تھی پھیلنی شروع ہوئی اور
عبد اللہ کے بیٹے تک بھی یہ بات جا پہنچی کہ آج اُسکے
باپ نے ایک جھگڑے کے موقع پر یہ کہا ہے کہ مجھے
مدینہ پہنچ لینے دو پھر وہاں کا معزز ترین انسان یعنی
وہ خود۔ مدینہ کے ذلیل ترین انسان یعنی نعوذ باللہ
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال کر
رہے گا۔ وہ ایک مخلص نوجوان تھا وہ یہ سنتے ہی بیتاب
ہو گیا اور اُسی وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں نے
سُنا ہے کہ آج میرے باپ نے یہ الفاظ کہے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں میرے
پاس بھی رپورٹ پہنچ چکی ہے۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ
اس جرم کی سزا سوائے اِس کے اور کیا ہو سکتی ہے
کہ آپ میرے باپ کو قتل کرنے کا حکم دے دیں اور
یہ بالکل جائز اور درست سزا ہے مگر یا رسول اللہ
میں یہ درخواست کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ اگر
آپ میرے باپ کے قتل کا حکم نافذ فرمائیں تو

کسی اور کو قتل کرنے کا حکم نہ دیں بلکہ مجھے حکم دیں۔ کہ میں اپنے باپ کو قتل کروں۔ کیونکہ اگر آپ نے کسی اور مسلمان کو حکم دیا اور اُس نے میرے باپ کو قتل کر دیا تو ممکن ہے کہ شیطان کسی وقت مجھے ورغلا دے کہ یہ میرے باپ کا قاتل ہے اور میں جوش میں اس پر حملہ کر بیٹھوں۔ اِس لئے آپ کسی اور کو حکم دینے کی بجائے مجھے ہی یہ حکم دیں کہ میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم اُسے کوئی سزا دینا نہیں چاہتے۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس وقت اُسے کوئی سزا دینا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر پھر کسی وقت اُسے سزا دینا مناسب سمجھیں تو میری درخواست ہے کہ آپ رحم فرما کر مجھے ہی حکم دیں کہ میں اپنے باپ کو قتل کر دوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ ہمارا اُسے سزا دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم تمہارے باپ کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا ہی سلوک کریں گے۔ وہ وہاں سے اُٹھا اور خاموشی کے ساتھ چلا آیا مگر اُس کا دل اِن الفاظ کی وجہ سے جل رہا تھا اور اُسے کسی پہلو قرار اور اطمینان نہیں آتا تھا۔ جب لشکر مدینہ کی طرف واپس لوٹا اور عبد اللہ بن ابی ابن سلول اندر داخل ہونے لگا تو اس کا بیٹا اپنی سواری سے کود کر اپنے باپ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تلوار اپنی میان سے نکال لی اور باپ سے کہا۔ تمہیں یاد ہے تم نے وہاں کیا الفاظ کہے تھے تم نے کہا تھا کہ مدینہ کا معزز ترین انسان میں ہوں اور مدینہ کا ذلیل ترین انسان نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ خدا کی قسم میں تمہیں اُس وقت تک مدینہ میں داخل نہیں ہونے دونگا جب تک

تم میرے سامنے یہ اقرار نہ کرو کہ مدینہ کا ذلیل ترین انسان میں ہوں اور مدینہ کا معزز ترین انسان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہے ورنہ میں اسی تلوار سے تمہارا سر اڑا دوں گا۔ عبد اللہ نے جب یہ نظارہ دیکھا کہ اس کا بیٹا اس کے سامنے تلوار لے کر کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کہو میں مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کے معزز ترین انسان ہیں تو اس کا دل لرز گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ اگر آج میں نے یہ الفاظ نہ کہے تو میرے بیٹے کی تلوار میرا خاتمہ کئے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے جن میں وہ اپنی بڑائی کے گیت گایا کرتا تھا اقرار کیا کہ میں مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کے معزز ترین انسان ہیں اور پھر اس نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کے لئے رستہ دیا۔

اِس سے زیادہ بھلا یَأْتِیْنَا فَرْدًا کی صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ بیٹے جن پر وہ ناز کیا کرتے تھے وہ اُن سے چھینے گئے اور ان کے بیٹے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بیٹے بن گئے اسی طرح ابو جہل کا بیٹا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا بنا۔ عاص کا بیٹا (عمرو بن العاص) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیٹا بنا۔ ولید کا بیٹا خالد آپ کا بیٹا بنا۔ ابو سفیان کا بیٹا معاویہ آپ کا بیٹا بنا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی اولادوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اپنے مال اور دولت پر فخر کیا کرتے تھے۔ مگر خدا تعالیٰ نے اُن کا مال بھی اُن سے لے لیا اور اُن کی اولادیں بھی اُن سے لے لیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۲﴾

اور ان لوگوں نے اللہ (تعالیٰ) کے سوا بہت سے معبود بنا چھوڑے ہیں اس امید پر کہ وہ ان لوگوں کیلئے عزت کا موجب بنیں (گے)

اسی طرح فرماتا ہے آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۔ نہ مال اُن کے پاس رہیں گے نہ اولادیں اُن کے کام آئیں گی نہ خوشامدی اُن کے ارد گرد رہیں گے۔ یہ ساری چیزیں ہم لیکر اپنے مومن بندوں کو دے دیں گے اور یہ لوگ لنڈورے کے لنڈورے رہ جائیں گے۔

۵۶۵ حل لغات:۔ اَلْعِزُّ۔ خِلَافُ الذُّلِّ (اقرب الموارد) عزت کا لفظ ہمیشہ ذلت کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ پس ذلت کے مقابل جو چیز ہے اُسے عزت کہا جائے گا۔

تفسیر:۔ بُت پرستوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بُت بنانے کی ایک بڑی وجہ لوگوں میں عزت اور شہرت حاصل کرنے کی تمنا ہوا کرتی تھی۔ وہ لوگ بڑے بڑے بُت بناتے تھے جیسے مصریوں نے ابوالہول بنایا جو سینکڑوں فٹ اونچا ہے اور ساری دنیا میں اس کی شہرت ہے۔ دُور دُور سے لوگ آتے اور اس کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ گویا خالی بُت نہیں بلکہ وہ ایسی شان کا بُت بناتے تھے کہ اس کی طرف خود بخود توجہ پھر جاتی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ فلاں بُت بڑا عظیم الشان ہے۔ یا اُن کے ایسے ایسے شاندار معبد بناتے تھے کہ دیکھنے والے دیکھتے اور حیران ہو کر رہ جاتے۔ پھر ان بُتوں پر میلے کئے جاتے۔ ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا اور اپنی قوم ہمسایوں پر فخر کرتے کہ ہم نے کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مثلاً سومنات کا بُت بنایا اور اس پر لاکھوں روپیہ خرچ کر دیا۔ اب

ایک دیکھنے والا جب بُت کو دیکھتا ہے کہ اُس کی آنکھیں ہیرے کی ہیں۔ اس کے سر پر تاج ہے۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا گُرز ہے اور اس کا قد اتنا بڑا ہے کہ سر چھت سے لگا ہوا ہے تو وہ مرعوب ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جتنا سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہرات اس بُت کے پاس ہیں اُتنی دولت تو میری سات پشتوں کے پاس بھی نہیں ہو سکتی۔ پس اُس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور بُت بنانے والوں کی عظمت کا اُسے قائل ہونا پڑتا ہے۔ پس چونکہ بُت پرست بڑے بڑے بُت بناتے تھے۔ اور پھر اپنے ہمسایوں پر فخر کرتے تھے کہ ہم نے اتنا روپیہ خرچ کیا ہے اور جتنا زیادہ وہ روپیہ خرچ کرتے تھے اتنی ہی اُن کی عزت بڑھتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا کے بنانے پر تو ان کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا کیونکہ وہ ازل سے موجود ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی عزت اور شہرت کے لئے بڑے بڑے بُت بناتے ہیں۔ اُن پر سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہرات خرچ کرتے ہیں۔ اور اُن کے بڑے بڑے معبد بناتے ہیں تاکہ لوگوں میں فخر کر سکیں کہ ہمارا معبد اتنا شاندار ہے۔ ہمارا بُت اتنا بڑا ہے اور ہم نے اس پر اتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی مساجد کو دیکھو کہ وہ کتنی سادہ ہوتی ہیں۔ خانہ کعبہ کتنی سادگی کا مظہر ہے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر

کتنی سادہ ہے۔ ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جائے گا وہ خالص خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے جائے گا۔ ہیرے اور جواہرات اور سونے اور چاندی کے لئے نہیں جائے گا۔ اسی طرح جو شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر پہ دعا کرنے کے لئے جائے گا وہ صرف عقیدت اور محبت کے جذبات کے ساتھ وہاں جائے گا۔ کوئی بلند و بالا اور شاندار عمارت دیکھنے کے لئے وہاں نہیں جائے گا۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب مساجد کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ مسجد کی ضرورت ہو یا نہ ہو وہ محض اپنے نام اور نمود کے لئے بڑی بڑی مسجدیں بنا دیتے ہیں اور پھر ہزاروں روپیہ خرچ کرکے اُن پر نقش و نگار کرتے اور بڑے بڑے بیل بوٹے بناتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

مَیں مصر کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے گیا تو مَیں نے دیکھا کہ محراب کو چھوڑ کر مسجد کے ایک کونہ میں چند آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ امام سمیت غالباً وہ چار یا پانچ آدمی تھے جب وہ نماز پڑھ چکے تو مَیں نے اُن سے پوچھا کہ کیا یہاں نماز ہو چکی ہے اور آپ لوگ پیچھے رہ گئے تھے؟ انہوں نے کہا نہیں یہی امام صاحب اس مسجد کے امام ہیں اور ہم ان کے مقتدی ہیں۔ مَیں نے کہا تو پھر آپ محراب چھوڑ کر ایک کونہ میں نماز کیوں پڑھ رہے تھے؟ کہنے لگے کیا کریں شرم آتی ہے کہ اتنی بڑی مسجد میں ہم صرف تین یا چار آدمی نماز پڑھنے والے ہیں۔ اسی شرم کے مارے ہم محراب میں کھڑے نہیں ہوتے ایک کونہ میں نماز پڑھ لیتے ہیں تاکہ اگر کوئی شخص ہمیں دیکھ لے تو وہ یہی سمجھے کہ یہ نماز سے پیچھے رہ گئے تھے۔ غرض مسلمانوں میں بھی آج کل یہ نقص پیدا ہو چکا ہے کہ وہ نماز کی طرف تو توجہ نہیں کرتے اور بڑی بڑی مسجدیں بنا دیتے ہیں حالانکہ مسجد کی خوبی اس کی سادگی میں ہے اور اسلام نے اُسے روحانی زینت کا موجب بنایا ہے۔ اس لئے نہیں بنایا کہ اُسے فخر و مباہات کا موجب بنا لیا جائے۔ ہاں نمازیوں کے لئے صفائی اور گنجائش اور صحت کا خیال ضرور رکھنا چاہئیے کہ یہ زینت نہیں ضرورت ہے۔

غرض فرماتا ہے وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا۔ یہ لوگ بڑے بڑے بُت بناتے ہیں۔ اُن بتوں کے معبد بناتے ہیں اُن پر میلے لگاتے ہیں تاکہ لوگوں میں اُنکی شہرت ہو اور وہ تعریف کریں کہ فلاں کا بُت بڑا شاندار ہے یا فلاں نے بڑا شاندار میلہ لگایا ہے۔

اس کے علاوہ لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بُت پرست بُت کو ذریعۂ شفاعت قرار دیتا ہے اور اُسے خدا تعالےٰ کے حضور میں قرب کا موجب بناتا ہے اس کے نزدیک وہ خود حضور دربار کا اہل نہیں اس لئے وہ کسی درباری کا درباری بن جاتا ہے تاکہ اس کے خادموں میں شامل ہوکر خدا کے دربار میں چلا جائے وہ سمجھتا ہے مَیں بہت گنہگار ہوں میں خدا کے دربار میں کہاں پہنچ سکتا ہوں۔ یہ بُت بڑی شان رکھتے ہیں مَیں ان کی عبادت کروں گا تو ان کے غلاموں اور خادموں میں شامل ہوکر مَیں بھی خدا تعالیٰ کے دربار میں پہنچ جاؤں گا۔ جیسے ڈپٹی کمشنر کہیں جاتا ہے تو اس کا چپڑاسی بھی اُس کی وجہ سے بڑے بڑے افسروں تک پہنچ جاتا ہے۔ بُت پرست بھی سمجھتا ہے

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ

ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ معبود ایک دن اُن کی عبادتوں کا انکار کرینگے اور اُن کے

عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝۸۳

خلاف کھڑے ہو جائیں گے ۵۲۶

ع ۸ ۵ ۱۷

کہ میں اس بُت کی عبادت کر کے اس قابل ہو جاؤنگا کہ خدا تعالےٰ کے دربار میں بیٹھ سکوں مگر خدا تعالےٰ جو حاضر و ناظر ہے وہ اس کا حاجتمند نہیں۔ اس کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ اسی مضمون کیطرف قرآن کریم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (الزمر ع ۱) یعنی دوسروں کی شرکت میں مَیں عبادت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ خدا تعالےٰ کے سوا جو لوگ دوسروں کو پوجتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ہم تو اُن کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں وہ خدا تعالےٰ کے قریب کر دیں یعنی وہ خدا کے مقرب ہیں۔ جب ہم اُن سے تعلق پیدا کریں گے تو اُن کے ذریعہ سے ہم بھی خدا کے دربار میں چلے جائیں گے فرماتا ہے یہ اچھے درباری ہیں کہ ایک دوسرے سے لڑائی ہو رہی ہے اور ایک بُت کے نام پر دوسرے پر چڑھائی کی جا رہی ہے۔ خدا کے قرب میں تو وہ جائیں گے مگر درباری کے طور پر نہیں بلکہ ملزم کے طور پر۔ اور خدا تعالےٰ فیصلہ کریگا کہ انکے دعوے کیا حقیقت رکھتے تھے اور یہ لوگ دو جرموں کے مرتکب ہیں۔ اوّل جھوٹے کہ اپنے مُنہ سے بُتوں

یا اللہ تعالےٰ کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو اُن میں نہیں ہیں۔ دوسرے خدا تعالےٰ کے احسانوں کے سخت منکر ہیں کہ وہ تو ایسا بلند شان ہو کر اُن کو نوازتا ہے اور یہ جھوٹے معبودوں کی پناہ لیتے پھرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ میں کاذب کہہ کر ان کو جھوٹا بتایا کہ وہ دیکھتے ہیں کہ انکے بتوں میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی۔ اور پھر اُن کی طرف خدائی طاقتیں منسوب کرتے ہیں اور کفّار کہہ کر بتایا کہ وہ بڑے ناشکرے ہیں وہ خدا تعالےٰ کے متواتر احسانات کو دیکھتے ہیں اور پھر خدا تعالےٰ کی پناہ میں آنے کی بجائے اپنے جھوٹے معبودوں کی پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

حل لغات:۔ ضِدّ کے معنے مخالف کے بھی ہیں اور ضد کے معنے معاون کے بھی ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہیں یعنی اُن کے خلاف اُن کے دشمن بن کر کھڑے ہوں گے یا ان کے خلاف سچائی کے مددگار بنکر کھڑے ہونگے۔

تفسیر:۔ كَلَّا کہہ کر بتایا کہ ان بُت پرستوں کی بڑی غرض تو یہ ہے کہ انہیں عزت حاصل ہو مگر یہ بُت اُن کے لئے عزت کا موجب نہیں بلکہ ذلّت کا موجب ہوں گے اور یہ لوگ خود اپنے مُنہ سے انکی عبادت کا انکار کریں گے اور یہ بھی کہ وہ معبود اِن کی عبادت کا انکار

کریں گے گویا سَيَكْفُرُوْنَ میں جو ضمیر استعمال کی گئی ہے یہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کی طرف بھی جاتی ہے اور اُن کے معبودوں کی طرف بھی جاتی ہے۔ اِس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ سَيَكْفُرُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ سَيَكْفُرُوْنَ الْمَعْبُوْدُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ یعنی بتوں کی عبادت کرنے والے خود اپنے مُنہ سے اُن کی عبادت کا انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے ان کی کبھی عبادت نہیں کی یا یہ کہ معبود اُن کی عبادت کا انکار کریں گے اور کہیں گے کہ یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں انہوں نے ہماری عبادت نہیں کی۔ بلکہ ان کے سامنے انکی اپنی اغراض اور شہرتیں تھیں جن کے لئے یہ عبادت کرتے رہے قرآن کریم میں یہ دونوں معنے استعمال کئے گئے ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (بقرہ ع ۲۰)

یعنی جس دن وہ لوگ جن کی فرمانبرداری اور اطاعت کی جاتی تھی اُن لوگوں سے جو ان کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اپنی برأت اور نفرت کا اظہار کریں گے اور وہ خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ہر قسم کے اسباب کو منقطع پائیں گے تو وہ لوگ جو اس دنیا میں اُن کی اتباع کرتے رہے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر کہیں گے کہ اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں جس طرح آج یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں۔

اِسی طرح سورۂ قصص میں فرماتا ہے کہ معبودانِ باطلہ کہیں گے تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ (قصص ع ۷) یعنی اے خدا ہم تیرے سامنے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ اپنے نفسوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔

غرض اس آیت میں ضمائر دونوں طرف جا سکتی ہیں۔ یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ مشرک اپنی عبادت کا انکار کریں گے اور اپنے معبودوں کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے اور اُن کا انکار کریں گے جیسا کہ سورۂ اعراف میں آتا ہے کہ جب فرشتے مشرکوں کی جان نکالتے ہیں تو اُن سے پوچھتے ہیں کہ ماسوی اللہ معبود اب کہاں ہیں تو وہ کہتے ہیں ضَلُّوْا عَنَّا (اعراف ع ۴) "وہ تو کہیں بھاگ گئے ہیں آج ہمیں نظر نہیں آتے۔"

اِسی طرح یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ معبودانِ باطلہ ان لوگوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور مشرکوں کے خلاف گواہی دیں گے جیسا کہ سورۂ قصص ہی کی آیت اوپر لکھی جا چکی ہے۔

اِسی طرح معبودوں کے متعلق قرآن کریم میں ایک اور جگہ آتا ہے کہ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (النحل ع ۱۲)

یعنی جب وہ مشرک لوگ جو شرک کیا کرتے تھے اپنے معبودانِ باطلہ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ حضور! یہ ہیں وہ معبود جن کو ہم تیرے سوا پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے ہم کو خراب کیا ہے۔ وہ معبود کہیں گے کہ یہ خبیث بالکل جھوٹ بولتے ہیں ہم نے انہیں خراب نہیں کیا۔ یہ آپ اپنی اغراض کے لئے شرک کرتے رہے ہیں۔ گویا وہی معبود جن کو آج عزت کا موجب سمجھا جاتا ہے اُس دن اُن کیلئے ذلت کا موجب ہو جائیں گے۔

اسی طرح سورۂ انعام میں آتا ہے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (انعام ع ۳)

یعنی اُس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے اور پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے معبود جن کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں۔ اس پر سوائے اس کے اُن کا اور کوئی جواب نہیں ہوگا کہ حضور ہم ان خبیثوں کو کیا جانتے ہیں ہم نے تو کبھی شرک نہیں کیا۔

اسی طرح سورۂ یونس میں آتا ہے

وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ (یونس ع ۳)

یعنی اس روز معبودانِ باطلہ اُن سے کہیں گے کہ تم نے تو ہماری کبھی پرستش نہیں کی۔

سورۂ روم میں بھی مشرکوں کے متعلق آتا ہے کہ

وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ (روم ع ۲)

مشرک اپنے معبودانِ باطلہ کا انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے انکو کبھی اپنا خدا نہیں مانا۔

وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا۔ میں اُوپر بتا چکا ہوں کہ ضِدّ کے ایک معنے معاون کے بھی ہیں۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ معبود اُس دن مشرکوں کے خلاف خدا تعالیٰ کے معاون ہو جائیں گے یا اُس دن مشرک اپنے معبودوں کے خلاف خدا تعالیٰ کے معاون ہو جائیں گے۔ یعنی اُس دن معبودانِ باطلہ اور مشرک جہاں ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں گے وہاں وہ دونوں سچائی اور راستی کے معاون بھی ہو جائیں گے۔ مشرک کہیں گے کہ ہم معبودوں کی عبادت نہیں کرتے اور معبود کہیں گے کہ مشرک ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

اس جگہ ایک اور امر بھی یاد رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ يَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا میں ضد کا لفظ جمع ہونا چاہیئے تھا مگر آیا مفرد ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ مفرد کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے اُن کے کمالِ اتحاد کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ گو وہ مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے ہوں گے مگر اس معاملہ میں اُن کا اختلاف بالکل ختم ہو جائے گا اور وہ یکزبان ہو کر کہیں گے کہ ہمارا اِن معبودانِ باطلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور معبودانِ باطلہ بھی یکزبان ہو کر کہیں گے کہ ہمارا ان مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی اُس دن اس قسم کی حالت ہوگی کہ اس دن کی سختی کو دیکھ کر اور اُس دن کی مایوسی کو دیکھ کر اور اس دن کے خطرات کو دیکھ کر مشرک بھی فردِ واحد کی طرح یکزبان ہو کر کہیں گے کہ ہم اِن معبودانِ باطلہ سے بیزار ہیں اور معبودانِ باطلہ بھی یکزبان ہو کر فردِ واحد کی طرح کہیں گے کہ ہم اِن مشرکوں سے بیزار ہیں۔ گویا اس امر کے اظہار کے لئے کہ باوجود لاکھوں اور کروڑوں ہونے کے وہ فردِ واحد کی طرح متفقہ طور پر غیر اللہ کی عبادت کا انکار کریں گے۔ جمع کی بجائے مفرد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مشرک بھی انکار کر کے اپنی جان بچانا چاہیں گے اور معبودانِ باطلہ بھی انکار کر کے اپنی جان بچانا چاہیں گے (املاء ما منّ بہ الرّحمٰن) یہ عربی زبان کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس تھوڑے سے فرق سے کہ جمع کی جگہ مفرد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ایک وسیع مضمون اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان کر دیا ہے اور نہ صرف یہ بتایا ہے

کہ یہ بُت جن کو وہ اپنے لئے عزت کا موجب سمجھ رہے
ہیں اُن کے لئے ذلّت کا موجب ہوں گے بلکہ اِس
میں اُن کی بے بسی بھی بیان کر دی گئی ہے۔ خطرہ کی
سختی بھی بیان کر دی گئی ہے اور یہ بھی بیان کر دیا گیا
ہے کہ خطرہ اس وقت اتنا قریب پہنچ چکا ہوگا کہ
انہیں سوچنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی معبودانِ
باطلہ کے دماغ بھی ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے اور
مشرکوں کے دماغ بھی ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے
اور وہ بغیر سوچنے اور غور کرنے کے اور بغیر کسی
قسم کا مشورہ کرنے کے یکزبان ہو کر اُن کی عبادت
سے انکار کر دیں گے اور سمجھیں گے کہ یہی ایک راستہ
ہے جس پر چل کر ہم بچ سکتے ہیں۔

غرض بتایا کہ اُس وقت خطرہ سخت ہوگا۔ بے بسی
انتہاء درجہ کی ہوگی اور مشرک بھی اور معبودانِ باطلہ
بھی سوائے اس نتیجہ کے اَور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے
کہ وہ غیر اللہ کی پرستش کا انکار کر دیں۔ وہ اُس
وقت تعداد کے لحاظ سے لاکھوں اور کروڑوں
ہوں گے۔ مگر نتیجہ پر پہنچنے کے لحاظ سے فردِ واحد کی
حیثیت اختیار کر لیں گے اور یک زبان ہو کر
مشرک معبودوں کی اور معبود مشرکوں کی تردید
کریں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر معبود
تو بے جان ہوتے ہیں پھر وہ کیسے بات کریں گے
اس کے تین جواب ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ کچھ معبود جاندار ہیں۔
جیسے ملائکہ اور مسیحؑ وغیرہ۔ وہ ایسا کریں گے۔
بے جانوں کی طرف سے خود ہی جواب آجائیگا۔

(۲) دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ کبھی کبھی
روحانی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے جان چیزیں
بھی متمثل ہو کر جواب دے دیتی ہیں۔ چنانچہ خوابوں
اور کشوف میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ بعض
دفعہ درخت بولنے لگ جاتے ہیں بعض دفعہ مکان
بولنے لگ جاتے ہیں بعض دفعہ دیوار بولنے لگ
جاتی ہے اور انسان اُن کے کلام سے ویسا ہی اثر
قبول کرتا ہے جیسے زندہ اور جاندار چیزوں کے
کلام سے اثر قبول کرتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام
نے ایک دفعہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ
مکان مجھے کہتا تھا کہ یہاں سے جلدی نکلو میں گرنے والا
ہوں۔ پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ بے جان
بُت کس طرح کلام کریں گے۔ وہ بے شک بے جان
ہیں مگر اُس وقت متمثل ہو کر انہیں ذلیل کرنے کیلئے
یہ جواب دیں گے۔ اور چونکہ اس وقت روحانیت
تیز ہو جائے گی وہ سمجھ جائیں گے کہ حقیقت
یہی ہے۔

(۳) تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ بُت درحقیقت
پرانے بزرگوں یا ملائکہ کے تمثیلی وجود ہیں۔ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ بُت اصل میں
پتھر نہیں بلکہ ہر قوم کے بزرگوں کی ایک تمثیل اور نقل
ہیں۔ جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قوم نے عزت
کی تو اُن کا ایک بُت بنا لیا۔ یا فرشتوں کی عزت کی تو اُن
کے نام پر بُت بنا لئے۔ پس چونکہ یہ بُت ایک تمثیلی
وجود ہیں۔ اس لئے جن کی وہ تمثیل ہیں وہ جواب دینگے
اور وہی جواب بُتوں کا سمجھا جائے گا۔ اور چونکہ
اصل معبود وہی ہیں اس لئے اُنہی کا جواب حقیقی
جواب ہوگا۔ مثلاً جس فرشتے کا بُت بنا کر پوجا جاتا ہے
وہ فرشتہ کھڑا ہوگا اور سب کے سامنے انہیں ذلیل
کرے گا یا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جن کا بُت بنا کر
اُس کی پرستش کی جاتی تھی کہیں گے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی
کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہم نے شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ وہ
الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۴﴾
کافروں کو اُکساتے رہیں ۔ ۵۹ ؎

کیس تو آپ خدا تعالےٰ کو ماننے والا اور اسکی پرستش کرنے والا تھا۔ پس باوجود اس کے کہ بتوں کی اکثریت بے جان ہے یعنی لوگ یا تو پتھروں کو پوجتے ہیں۔ یا درختوں کو پوجتے ہیں یا دریاؤں کو پوجتے ہیں۔ چونکہ وہ ان بتوں کو بعض پرانے بزرگوں یا ملائکہ وغیرہ کا قائم مقام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بت فلاں دیوتا کا قائم مقام ہے۔ یہ بُت فلاں فرشتہ کی تمثیل ہے یہ بُت فلاں بزرگ کا مجسمہ ہے۔ اس لئے وہی فرشتہ اور بزرگ اُن کے سامنے آئیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو خدا تعالےٰ کے عبادت گذار تھے۔ مگر تم نے ہماری ہی پرستش شروع کر دی۔ ہم تمہارے اس فعل سے بیزار ہیں اور تمہیں کسی قسم کی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتے۔ اور چونکہ اصل معبود وہی ہیں اس لئے اُن کے جواب میں سب کے سب بُت بھی شریک ہو جائیں گے۔

۵۹ ؎ **حل لغات**:۔ اَزٌّ کے اصل معنے ہنڈیا کے اُبال کے ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ کسی کو جوش دلانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پس تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے معنے یہ ہیں کہ وہ ان کو خوب جوش دلاتے ہیں هَزٌّ کے معنے بھی ہلانے اور جوش دلانے کے ہوتے ہیں لیکن اَزٌّ کا لفظ هَزٌّ سے معنوں میں زیادہ قوی ہوتا ہے (مفردات)

اَرْسَلَ کے معنے عام طور پر بھیجنے کے ہوتے ہیں لیکن اس کے ایک معنے علاوہ بھیجنے کے خلی کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو چھوڑ دیا اور اس کے ارادوں میں مزاحم نہ ہوا۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اَرْسَلْتُ الْبَعِیْرَ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خَلَّیْتُهٗ (قرطبی) یعنی جب اونٹ کے رستے کھول دئے جائیں اور اُسے آزادانہ طور پر بلا روک ٹوک پھرنے دیا جائے تو کہتے ہیں اَرْسَلْتُ الْبَعِیْرَ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ خَلَّیْتُهٗ میں نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ ہمارا اصل کام تو یہ ہوتا ہے کہ ہم شیطانوں سے اپنے بندوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ہی اللہ تعالےٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (سورة حجر ع ۳) ہم نے اپنے بندوں پر شیطان کے لئے غلبہ مقدر نہیں کیا لیکن یہ قسم کفار کی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ہم اپنی حفاظت واپس لے لیتے ہیں اور شیطانوں کو اُن پر حملہ کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ اب تمہارا جو جی چاہے کرو ہم تمہارے معاملات میں کوئی دخل دینے کیلئے تیار نہیں۔ گویا اَرْسَلَ کے یہ معنے نہیں کہ ہم اُن پر حملہ کرنے کے لئے شیطانوں کو بھیجتے ہیں یا خود انہیں کفار کے پیچھے لگا دیتے ہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے تو ہم شیطانوں کو باندھے رکھتے ہیں یا جب وہ حملہ کرتے ہیں تو ہم اُن کے اور اپنے بندوں کے

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۵﴾

پس تو اُن کے خلاف جلدی میں کوئی قدم نہ اُٹھا ہم نے انکی تباہی کے دن گن رکھے ہیں ۵۶۸

درمیان کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُن کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ قسم کفار کی ایسی ہے کہ جب شیطان حملہ کرتے ہیں تو ہم انہیں کہتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری مرضی ہے کرو اور ہم اُن دونوں کے درمیان سے اپنے وجود کو نکال لیتے ہیں کیونکہ دونوں میں ایسی موانست ہو جاتی ہے کہ وہ شوق سے ایک دوسرے کی طرف بھاگتے ہیں۔

غرض اس جگہ اَرْسَلْنَا کے یہ معنے نہیں کہ ہم انہیں حملہ کرنے کے لئے بھیجتے ہیں بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ پہلے تو ہم انہیں باندھے رکھتے ہیں یا اگر وہ حملہ کرتے ہیں تو اُن کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ ہم اُن دونوں کے درمیان آنے سے رُک جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن دونوں میں ایسا اتحاد ہو جاتا ہے اور اس قسم کی محبت باہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ انتہائی شوق سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے دوڑتے ہیں۔ اس لئے ہم اُن کے معاملات میں دخل دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے تین معنے ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اُن کو معاصی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ کیونکہ بہرحال جب شیطان کسی کو اُکسائیگا تو ایسے ہی کاموں پر اُکسائیگا جو اس کی طبیعت کے مطابق ہوں اور چونکہ شیطان کا معاصی سے ہی تعلق ہے اس لئے شیطان کا کسی کو اُکسانا یہی معنے رکھتا ہے کہ وہ اُسے معاصی کی رغبت دلائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُستاد لڑکے کو بہت اُکساتا ہے تو فوری طور پر انسانی ذہن اسی طرف جائے گا کہ وہ لڑکے کو تعلیم کی ترغیب دیتا ہے اور اُسے بار بار اس طرف متوجہ کرتا ہے۔ یا اگر کہا جائے کہ کرکٹ کا کپتان بہت اُکساتا ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ لڑکوں کو کرکٹ کھیلنے کی ترغیب دیتا ہے شیطان چونکہ شیطانی کاموں پر ہی اُکسا سکتے ہیں اس لئے تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ وہ اُن کو معاصی کی ترغیب دلاتے ہیں۔

دوسرے معنے یہ ہوں گے کہ وہ انکو اتنا اُکساتے جاتے ہیں کہ آخر وہ جہنم میں جا گرتے ہیں یعنی وہ انہیں معاصی کی رغبت دلاتے .... چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ جہنم میں جا گرتے ہیں۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ وہ انکو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے اور اُن پر حملہ کرنے کے لئے جوش دلاتے ہیں۔ کیونکہ شیطان اپنے مدمقابل کے خلاف ہی انہیں اُکسا سکتا ہے۔ اور اس کا اصل مقابلہ اسلام اور مسلمانوں سے ہی ہے شیطان چونکہ براہ راست حملہ نہیں کر سکتا اس لئے وہ اپنے ساتھیوں کو اُبھارتا اور انہیں اُکساتا ہے کہ اُٹھو اور مسلمانوں پر حملہ کرو۔

۵۶۸ تفسیر:- فرماتا ہے جب حالات یہ ہیں تو تم کو کیا ضرورت ہے کہ تم اُن کی سزا کے متعلق سکیمیں سوچو اور اُن کے خلاف مختلف قسم کی تدابیر عمل میں لاؤ۔ ہماری ہدایت تمہیں یہی ہے کہ لَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ تم ان کے خلاف اپنے ارادوں میں یا اُن کے خلاف اپنے حملوں میں یا انکے خلاف اپنی تدبیروں میں یا انکے خلاف اپنی دعاؤں میں ہرگز جلدی نہ کرو اور چونکہ اس جگہ کسی خاص بات کی

تعیین نہیں کی گئی۔ اس لئے جتنی باتیں دوسروں کے خلاف
کی جاسکتی ہیں وہ ساری کی ساری اس جگہ مراد ہو سکتی
ہیں۔ اس جگہ تدبیریں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ غیالات
بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ غم و غصہ اور رنج کے جذبات
بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ دعائیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔
ان سب باتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا
تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ تم کسی قسم کی تدبیریں بھی اُنکے
کے خلاف جلدبازی مت کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ پہلی
آیت بتا رہی ہے کہ خدا نے اُن پر شیطانوں کو چھوڑا
ہوا ہے۔ خدا میں طاقت تھی کہ جب وہ حملہ آور ہوتے
تو اپنے بندوں کو اُن کے حملہ سے بچا لیتا۔ خدا میں طاقت
تھی کہ وہ اُن کے حملوں کو ناکام کر دیتا۔ مگر وہ خدا
جس کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ جب شیطان
حملہ کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ اس حملہ کا مقابلہ
کرنے کے لئے شیطان اور بندہ کے درمیان آ کر
کھڑا ہوتا ہے۔ جب اُس نے اپنے آپ کو درمیان سے
نکال لیا ہے تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی خدائی حکمت
ہے۔ اور جب خدائی حکمت ایک اور بات کا تقاضا
کرتی ہے تو مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اُسی
چیز کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جائے جسے خدائی
مشیت کے ماتحت ڈھیل دی جا رہی ہے۔ مگر اس کا
یہ مطلب بھی نہیں کہ دشمنانِ اسلام کے خلاف کسی قسم
کی تدبیریں کرنا جائز نہیں۔ یہ مطلب بھی نہیں کہ
سچائی سے عناد رکھنے والوں کے خلاف کسی قسم کے
جذباتِ غیرت جوش میں نہیں آنے چاہئیں۔ اس کا
یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی جماعت اسلام کے خلاف
ریشہ دوانیاں کر رہی ہو تو تم اس کی کوششوں کو باطل
کرنے کے لئے کوئی جائز تدبیر نہ کرو۔ بلکہ صرف اس
چیز کا مقابلہ کرنے سے روکا ہے جس کا ذکر پہلی آیت
میں آ چکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ
حالات ظاہر ہیں اور اگر تم غور کرو تو تم سمجھ سکتے ہو
کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ الٰہی مشیت کے ماتحت ہو رہا ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات ایسی ہو کہ
ہمیں یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کے متعلق خدائی
تدبیر کیا ہے یا وہ کوئی ایسا واقعہ ہو جو قانونِ قدرت
کے عام قوانین کے ماتحت ہے تو اس وقت ہمیں اجازت
ہے کہ ہم دشمن کے حملوں کا دفاع کریں۔ ہمیں اجازت
ہے کہ ہم اس کے خلاف جائز اور مطابقِ قانون تدابیر
اختیار کریں۔ لیکن جب نظر آ جائے کہ خدا اپنی عام
سنت کے خلاف ایک کام کر رہا ہے تو اُس وقت یہی
حکم ہوتا ہے کہ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ۔ اُس وقت
بددعا کرنا بھی منع ہوتا ہے۔ اُس وقت تدبیریں کرنا
بھی منع ہوتا ہے۔ اس وقت صرف اتنا ہی حکم ہوتا ہے
کہ دشمن کے حملوں کو برداشت کرو اور صبر سے کام لو۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمن جب شرارت میں حد
سے بڑھ جاتا ہے تو مومن گھبرا جاتے ہیں اور کبھی
گھبرا کر اظہارِ غیرت کرتے ہیں۔ کبھی نبی یا اُس کے خلفاء
سے کہتے ہیں کہ دشمن کی تباہی کی دعا مانگو۔ کبھی جہاد کا
فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات اُن کی تباہی ایک
سکیم کے ساتھ مقدّر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ تسلّی
دیتا ہے کہ جلدی نہ کرو وقت پر سب کام ہو جائیگا
اور اُن کی سزا خدا تعالیٰ کی طرف سے آ جائے گی۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا۔ تمہاری یہ حالت ہے
کہ تم سو بھی جاتے ہو۔ تم دشمن سے غافل بھی ہو جاتے
ہو لیکن ہمیں تو اُن کی یہ باتیں اتنی بُری لگ رہی
ہیں کہ ہم خود اُن کی تباہی کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔
جب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خود انکی گھڑیاں گن رہے ہیں

کہ کب وقت آئے اور ہم اُن کی گردن مروڑ کر رکھ دیں تو تم کیوں جلدی کرتے ہو۔ تم میں تو طاقت ہی نہیں کہ اُن کا مقابلہ کرسکو۔

دیکھو اس جگہ جہاد کے متعلق کیسی واضح اور اہم ہدایت دی گئی ہے اور کس طرح اس عظیم الشان نظریہ کی تائید کی گئی ہے جو بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجودہ زمانہ میں جہاد کے متعلق پیش فرمایا ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب مسلمانوں کا ایک حصہ یہ کہے گا کہ اسلام کی ترقی اب اسی طرح ہوسکتی ہے کہ ان کفار سے جہاد کیا جائے اور انہیں تلوار کے زور سے مٹانے کی کوشش کی جائے۔ مگر اُن کی یہ رائے بالکل غلط ہوگی۔ صحیح اور درست راستہ یہی ہوگا کہ اُن کے مقابلہ میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور اُن کے حملوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے اور صرف روحانی تدابیر اختیار کی جائیں یعنی تبلیغ اسلام اور دعائیں وغیرہ۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے انہوں نے لوگوں کے سامنے یہی اعلان فرمایا کہ ؎

یہ حکم سن کے بھی جو لڑائی کو جائیگا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اُٹھائیگا

آپ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں کے پاس کسی قسم کی طاقت ہی نہیں تو اُن پر جہاد بالسیف کس طرح فرض ہوسکتا ہے۔ جب وہ وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ جس رنگ میں چاہے گا مسلمانوں کو اُن کے مقابلہ کی طاقت عطا فرما دے گا۔ بہرحال آپ نے جہاد کے متعلق مسلمانوں کے رائج الوقت خیالات کی تردید فرمائی اور یہی وہ حقیقت ہے جو لَا تَعْجَلْ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس سورۃ میں مسیحیوں کی جن ترقیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ آئندہ زمانہ میں ہونے والی تھیں بلکہ حدیثوں اور قرآن میں اُنہیں آخری زمانہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے پس لَا تَعْجَلْ سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا وجود نہیں بلکہ آئندہ زمانہ کا مسلمان مراد ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ایک وقت مسیحیوں کی ترقی کو دیکھ کر اُن سے جہاد کرنے کے شوق میں مبتلا ہو جائے گا چنانچہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ جس زمانہ میں مسیحیت مسلمانوں کا شکار تھی اور اُن کو اس سے مقابلہ کرنے کی طاقت تھی اُس وقت تک تو مسلمان انکی طرف سے غافل رہے اور جب مسیحیت دنیا میں پھیل گئی تو انہیں جہاد کا خیال آیا حالانکہ اُس وقت خدا کی مشیّت نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا والی ظاہر ہو چکی تھی اور اس علم کے بعد مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ سابق غفلت پر استغفار کرتے اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے مجملاً دعا کرتے کہ اُن کے فتنہ سے مسلمانوں کو بچائے اور جہاد بالقرآن شروع کر دیتے تاکہ سابق غفلت کا ازالہ ہو جاتا اور قرآن کریم کی برکت سے مسیحیت کی طاقت ٹوٹ جاتی۔ مگر انہوں نے جہاد بالسیف کا بے موقع اظہار کرکے مسیحیوں کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کا موقع دیا اور اس سے متاثر ہو کر ہزاروں مسلمان مسیحی ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ حضرت مسیح موعودؑ ایک ہی شخص تھے جنہوں نے اس نقص کی طرف توجہ دلائی۔ مگر اس وجہ سے اُن پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور کہا گیا کہ یہ شخص اسلامی ترقی کا دشمن ہے۔ حالانکہ اسلامی ترقی کا واحد ذریعہ

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۶﴾

جس دن ہم متقیوں کو زندہ کر کے (اغذائے) رحمان کے حضور میں اکٹھا کر کے لے جائیں گے ۱۹

اس زمانہ میں اسلام کی صحیح تعلیم کی اشاعت تھا تاکہ خود مسیحیوں میں سے ایک حصہ کو جیتا جائے اور باقی حصہ کے دل سے غلط فہمیاں دور کی جائیں مگر افسوس کہ اس خدمت کی وجہ سے آپ کو اتنی گالیاں مسلمانوں نے دیں کہ شاید کسی مامور کو اتنی کثرت سے اور اس مقدار میں گالیاں نہ ملی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی گالیاں اس زمانہ کے علماء نے ایک ایک دن اور ایک ایک جلسہ میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو دی ہیں اُس قدر گالیاں سابق ماموروں کو شاید بیس بیس سال میں بھی نہ ملی ہوں گی۔ بلکہ گذشتہ زمانہ کے علماء کی زبان پر ایسا گند کبھی آیا ہی نہ ہو گا۔ اس ظلم کا بدلہ قیامت کے دن ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کے ذریعہ سے لیں گے۔ وہ خود ان ظالموں پر اپنی ناراضگی کا اظہار کریں گے اور ہمارے دلوں پر تسکین کا مرہم رکھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ کے یہ معنے نہیں کہ ان کے خلاف کسی قسم کی دعا نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مومنوں کو گھبرانا نہیں چاہیئے اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے ورنہ بعض قسم کی دعائیں ایسی ہیں جو اصولی رنگ میں جائز ہیں مثلاً یوں کہنا کہ اللہ تعالےٰ عیسائیوں کی طاقت کو توڑ دے بالکل جائز ہو گا۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی دعا کی اور فرمایا کہ ؎

يَا رَبِّ سَحِّقْهُمْ كَسَحْقِكَ طَاغِيًا
وَاَنْزِلْ بِسَاحَتِهِمْ بِهَدْمِ مَكَانِهِمْ

مگر یہ اصولی دعا ہے اُن کے کسی خاص فعل کے متعلق نہیں۔ کہ چونکہ انہوں نے فلاں حملہ کیا ہے اس لئے انہیں تباہ کیا جائے۔ محض اصولی رنگ میں خدا تعالیٰ سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ عیسائیوں کی طاقت کو توڑ دے۔ اس رنگ میں عیسائیت کے خلاف دعائیں بھی کی جا سکتی ہیں مگر اُن کے کسی خاص فعل پر بد دعا کرنا جائز نہیں ہو گا۔

بہرحال فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ میں جلو کے مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہم نے ان کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہُوا ہے اور ہم ان کی ہلاکت کی گھڑیاں گن رہے ہیں جب وہ وقت آئے گا تو ہم خود پکڑ لیں گے تم ان کے مقابلہ میں کیا کر سکتے ہو۔ تم سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا جو کچھ کرنا ہے ہم نے ہی کرنا ہے۔

۱۹ حل لغات:۔ وَفْد کی تشریح کرتے ہوئے مفردات والے لکھتے ہیں کہ هُمُ الَّذِيْنَ يَقْدِمُوْنَ عَلَى الْمُلُوْكِ مُسْتَنْجِزِيْنَ الْحَوَائِجَ یعنی وفد سے وہ لوگ مراد ہوا کرتے ہیں جو بادشاہوں کے پاس اس غرض کے لئے جاتے ہیں کہ اپنی حوائج اور ضروریات الخیر پوری کروائیں۔

تفسیر:۔ جہاں تک اگلے جہان کا سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ آیت بھی اور اس سے اگلی آیات بھی اگلے جہان پر چسپاں ہو جاتی ہیں اور اس صورت میں ہم اس آیت کے یہ معنے لے لیں گے کہ قیامت کے دن سب مومن خدا تعالیٰ کے

سامنے اجتماعی طور پر پیش ہوں گے لیکن سوال یہ ہے کہ اس جگہ اُن دنیوی ترقیات کا ذکر ہے جو عیسائیوں نے حاصل کیں اور دنیوی ترقیات کے متعلق ایک مومن کے دل میں خیال نہیں آتا کہ جب یہ لوگ مر جائیں گے تو انہیں اگلے جہان میں عذاب دیا جائے گا بلکہ اس کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو میرے سامنے ذلیل کرے اور اسلام کو فتح عطا فرمائے۔ بیشک وہ معنے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن جب ساری سورۃ میں عیسائیوں کے دنیوی عروج اور اُن کی شان و شوکت کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کے بعد یہ بات کتنی پھسپھسی نظر آتی ہے کہ الٰہی ان کا قیامت کے دن بیڑہ غرق ہو۔ اگر ان کا اگلے جہان میں ہی بیڑہ غرق ہوتا ہے تو دنیا ہماری اس بات کو کس طرح مانے گی۔ وہ تو یہی کہتی رہے گی کہ انہوں نے بڑے مزے اٹھائے ہیں پس لازماً ہمیں اس کے ایسے معنے کرنے پڑیں گے جو اس دنیا پر بھی چسپاں ہو سکیں۔ لیکن چونکہ الفاظ ایسے ہیں جو اگلے جہان پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اس لئے ہم یہ معنے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اُس دن مومن خدا تعالیٰ کے حضور اجتماعی طور پر حاضر ہوں گے اور انعام و اکرام سے نوازے جائیں گے لیکن پہلے ہمیں اسی دنیا پر اس آیت کو چسپاں کرنا پڑے گا اور جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں تو یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے سوائے اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ جب ہمارے فیصلہ کا وقت آئے گا تو اُس وقت ہم خود مومنوں کے دلوں میں القاء کریں گے کہ اب اُن کی ہلاکت کے لئے اجتماعی طور پر دعائیں مانگو۔ ہم روزانہ نمازیں پڑھتے ہیں جنمیں تمام مومن اکٹھے ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں۔ یہی حشر ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس دن ہم سب مسلمانوں کو خدائے رحمٰن کی طرف اکٹھا کر کے لے جائیں گے یعنی اُس دن اُن کے دلوں میں ہم ایک آگ لگا دیں گے اور انہیں کہیں گے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ آؤ اور ہم سے دعائیں مانگو تاکہ ہم اس قوم کے خلاف اپنے فیصلہ کو نافذ کر دیں۔

وفد کا لفظ عربی زبان میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی جماعت کسی بادشاہ کے سامنے اپنی حاجات لے کر پیش ہو۔ اور نمازیں روزانہ پانچ وقت مسلمان اجتماعی طور پر اپنی اغراض لیکر خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ گویا وفد کے اندر جتنی باتیں ضروری ہوتی ہیں وہ مسلمانوں کی نماز میں پائی جاتی ہیں وفد کا لفظ چاہتا ہے کہ جماعت ہو۔ وفد کا لفظ چاہتا ہے کہ اس جماعت کی کوئی غرض ہو اور پھر وفد کا لفظ اِس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ وفد میں شامل ہونیوالوں کا اچھا لباس ہو۔ کیونکہ انہوں نے بادشاہ کے دربار میں پیش ہونا ہوتا ہے اور یہ ساری باتیں نماز میں پائی جاتی ہیں۔ نماز جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حاجات پیش کی جاتی ہیں اور پھر نماز کے متعلق یہ بھی حکم ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نماز پڑھنی چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ع ۳) اے بنی نوع انسان ہر نماز کے وقت زینت کا خیال رکھا کرو۔ اسی لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ نماز سے پہلے وضو کیا جائے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے جائیں۔ کوئی بُو دار چیز نہ کھائی جائے۔ پھر جب نماز میں انسان کھڑا

ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ پس وفد کے طور پر پیش ہونیکی بہترین صورت نماز ہے - اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ اُس دن ہم مومنوں کے دلوں میں خود تحریک پیدا کریںگے کہ ان کی تباہی کے لئے ہم سے دعائیں کرو۔

اگر اس آیت کو مرنے کے بعد کی زندگی پر چسپاں کیا جائے تو يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعث بعد الموت دو قسم کی ہے ایک بعثت فردی اور ایک بعثت اجتماعی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو مرنے کے بعد ایک زندگی ملتی ہے مگر وہ فردی زندگی ہوتی ہے - اس کے علاوہ جیسا کہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور حدیثوں میں بھی اس کی تفصیل آتی ہے ایک ایسی بعثت ہوگی جس میں تمام کے تمام انسان اللہ تعالےٰ کے حضور اکٹھے کئے جائیں گے - اور وہ بعثت اجتماعی اس بعثتِ فردی سے کچھ فرق رکھتی ہوگی۔ وہ لوگ جنہوں نے پورا غور نہیں کیا اُن کے دماغ مشوش ہو جاتے ہیں کہ اِدھر تو کہتے ہیں کہ موت کے معًا بعد ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور اُدھر کہتے ہیں کہ ایک دن ساری دنیا اکٹھی ہوگی ان دونوں باتوں کا آپس میں جوڑ کیا ہوا؟ یہ اعتراض اِسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ بعثتیں دو قسم کی ہیں - ایک بعثت وہ ہے جو موت کے معًا بعد شروع ہو جاتی ہے اور جس میں انسان اگلے جہان کے انعامات یا عذاب محسوس کرنے کے لئے نئی طاقتیں حاصل کرتا ہے - مگر اس کی یہ حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی کی طفولیت یا بچپن کا زمانہ ہوتا ہے - اس کے بعد جب سارے انسانوں کو مجموعی طور پر ایسی طاقت حاصل ہو جائے گی کہ وہ وہاں کے ثواب اور عذاب کو کامل طور پر محسوس کر سکیں اور ان کی حالت ایک جوان بالغ مرد کی سی ہو جائیگی جو دنیا کی نعمتوں سے پوری طرح حظ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت تمام انسانوں کا حشر ہوگا جس میں مومن بھی شامل ہوں گے اور کافر بھی چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں آل فرعون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۛ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن ع ۵) یعنی آل فرعون پر صبح اور شام آگ پیش کی جاتی ہے - لیکن جب قیامت کا دن آئے گا تو ہماری طرف سے حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو اس سے بھی زیادہ شدید عذاب میں داخل کر دو - اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو دوزخ پر سے گذرنا پڑیگا جہاں ایک پُل بچھایا جائے گا جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگا بعض لوگ تو اس پر سے بجلی کی طرح گذر جائیں گے - بعض ہوا کی سی تیزی اختیار کریں گے - اور گذر جائیںگے بعض پرندوں کی طرح اُڑتے ہوئے گذر جائیںگے بعض گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے گذر جائیںگے بعض گھسٹتے ہوئے لولوں لنگڑوں کی طرح گذر جائیں گے اور کافر اور منافق کٹ کٹ کر نیچے گریں گے اور جہنم میں جا پڑیں گے - غرض ایک حشر اکٹھا ہوگا اور ایک انفرادی ہوگا یہ آیت اجتماعی حشر پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ صرف انفرادی بعث ہی نہیں بلکہ ایک اجتماعی بعث بھی مقدر ہے۔

نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا۔ کے متعلق مفسرین نے بحث کی ہے کہ کیا وہ جنت کی طرف

جائیں گے یا اللہ تعالیٰ کی طرف ۔ بعض نے کہا ہے ۔ کہ جنت کی طرف ۔ اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ کا گھر ہے اس لئے اِلَی الرَّحْمٰنِ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جو جنت کی طرف گئے وہ ایسے ہی ہیں ۔ گویا وہ خدا تعالیٰ کی طرف گئے اور اس کی مثال میں وہ سورۂ صافات میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (صافات ع ۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کنعان کی طرف ہجرت کرکے جاتے ہیں مگر کہتے یہ ہیں کہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں کیونکہ وہ مقام خدا نے اُن کے لئے چُنا تھا ۔ جس طرح خدا تعالیٰ کے منتخب کردہ مقام کی طرف ہجرت کرکے جانے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ اسی طرح ان کے جنت کی طرف جانے کو نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ اسی طرح حدیث بخاری میں آتا ہے کہ مَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یعنی جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے وہ اللہ اور رسول کی طرف جاتا ہے حالانکہ درحقیقت وہ مدینہ کی طرف گیا ہوتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی موعود مقام یا چُنے ہوئے مقام کی طرف جانا بھی خدا کی طرف جانا کہلاتا ہے ۔ پس وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت اس کے معنے جنت کی طرف جانے کے ہیں ۔ مگر چونکہ وہ خدا کا گھر ہے اس لئے اُن کا جنت کی طرف جانا گویا خدا کی طرف جانا ہوگا ۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف ہی جائیں گے بعض احادیث میں بھی آتا ہے کہ پہلے وہ خدا تعالیٰ کی طرف جائیں گے اور پھر جنت کی طرف ۔

یہ سب اختلاف اس وجہ سے ہے کہ خدا تعالیٰ کو مجسّم مانا گیا ہے اور پھر اُسے ایک مقام میں محدود کیا گیا ہے ۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ ہے ۔ مدینہ کو ہجرت ہو تو وہ مدینہ میں ہے ۔ حبشہ کو ہجرت ہو تو وہ حبشہ میں ہے اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جہاں جائیں وہیں خدا تعالیٰ موجود ہوتا ہے بلکہ کفار کیلئے بھی وہ ہر جگہ ہوتا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ (نور ع ۵) یعنی کافروں کے اعمال سراب کی طرح ہوتے ہیں جیسے کسی وادی میں سراب نظر آئے تو پیاسا آدمی اُسے پانی سمجھ لیتا ہے ۔ مگر جب وہ پانی سمجھ کر وہاں جاتا ہے تو اُسے پانی نہیں ملتا لیکن اُسے خدا نظر آجاتا ہے اور وہ اس سے سارا حساب لے لیتا ہے ۔ گویا اس کا تباہی اور بربادی کے مقام پر پہنچنا خدا کا ملنا قرار دیا گیا ہے ۔ اسی طرح مومنوں کے متعلق آتا ہے کہ جہاں وہ جاتے ہیں ۔ انہیں اللہ تعالیٰ نظر آجاتا ہے جیسے فرماتا ہے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ ع ۱۴) جس طرف بھی تم اپنا مُنہ کرو وہیں تم اللہ تعالیٰ کو موجود پاؤ گے یا جیسے قرآن کریم میں ہی ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح ع ۱) وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو اُن کے ہاتھ کے اوپر ہے ۔ اب وہ ہاتھ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا مگر اُسے خدا نے اپنا ہاتھ قرار دیدیا ۔ اس میں بھی

درحقیقت وہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مومن جہان
جاتا ہے اُسے خدا نظر آجاتا ہے۔ اسی طرح کافر کو بھی
خدا نظر آجاتا ہے مگر وہ اُسے عذاب کی شکل میں نظر
آتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کا وجود کسی خاص جگہ میں
محدود نہیں اور پھر وہ مجسّم بھی نہیں۔ قرآن کریم میں ہی آتا
ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق ع ۲)
کہ ہم انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں پس
وہ چیز جو ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جو تجسّم سے
پاک ہے اور غیر محدود ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ
کسی خاص جگہ پر بیٹھا ہوا ہوگا اور مومن گھوڑوں پر
چڑھ کر اس کی ملاقات کے لئے جا رہے ہونگے بالکل
نامعقول بات ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو
حضرت علی نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
کہ میں نے تو وفد سوار ہی دیکھے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی طرف
جانے والے وفد کیسے ہونگے۔ یعنی جب بادشاہوں کی
طرف اُن کی ملاقات کے لئے وفد جاتے ہیں تو گھوڑوں
پر سوار ہوتے ہیں نہایت اچھے اور قیمتی لباس پہنے
ہوئے ہوتے ہیں اور بڑی شان کے ساتھ جاتے ہیں۔
خُدا تعالیٰ کی طرف جو لوگ وفد کی صورت میں جائیں گے
وہ کس طرح جائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ جنت کے اونٹ
اُن کی سواری کے لئے لائے جائیں گے (قرطبی)

الثعلبی نے اسی روایت کو اس طرح نقل کیا ہے۔
کہ جب خدا تعالیٰ کو مل کر مومن نکلیں گے تو اُن کے لئے
سواریاں لائی جائیں گی۔ یعنی پہلے وہ سوار ہو کر نہیں
جائیں گے بلکہ پیدل جائیں گے۔ لیکن جب ملاقات کرکے
نکلیں گے تو انہیں سواریاں دی جائیں گی۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّکُمْ تُحْشَرُوْنَ اِلَی اللّٰهِ
حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا۔ کہ اے لوگو! تم کو جب خدا کے
سامنے اُٹھایا جائیگا تو تم ننگے ہونگے اپنے پاؤں سے
بھی اور ننگے ہونگے جسم سے بھی اور بے ختنہ کے ہونگے
اب جو بے ختنہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن ہوں گے
اُن کے لئے گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ہو کر جانیکا تو
کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرحال یہی تسلیم کرنا پڑتا
ہے کہ وہ پیدل جائیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں۔
کہ مومن جب خدا تعالیٰ کو مل کر نکلیں گے تو اُن کے لئے
سواریاں لائی جائینگی۔ وہ اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالتے
ہیں کہ وہ جائیں گے ننگے اور پیدل۔ اور آئینگے سوار
اور ملبوس۔

یہاں بھی وہی غلطی کی گئی ہے۔ یہ سب محاورے
ہیں جن کو ظاہر پر محمول کیا گیا ہے۔ وہاں کے لباس
اور روح کی سواریاں اس دنیا کی نہیں ہیں بلکہ مطلب
یہ ہے کہ بعث کے معاً بعد ایک گھبراہٹ ہوگی۔ اس
کے بعد فوراً مومن سنبھل جائیں گے اور اکرام اور
اعزاز سے نوازے جائیں گے۔ اور حدیث شفاعت
سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ سخت
گھبرائے ہوئے ہوں گے مگر آہستہ آہستہ مومنوں کے
دلوں میں ایک سکون اور اطمینان پیدا کر دیا جائیگا
اور انہیں تسلّی دی جائیگی۔ اور خدا کے ملنے سے مراد
اُسی طرح ملنا ہے جس طرح ایک محدود شے غیر محدود
سے مل سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ خدا عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا
اور مومن گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر اس سے ملنے
کے لئے جائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مومن وہاں
خدا تعالیٰ سے ملیں گے۔ مگر یہ ملاقاتیں اسی طرح کی ہونگی
جس طرح اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اسی دنیا میں
اس سے ملاقات کیا کرتے ہیں صرف اسقدر فرق ہوگا
کہ اگلے جہان میں چونکہ ہمارا مادی جسم نہیں ہوگا

اس لئے وہ ملاقات زیادہ مکمل اور شاندار ہوگی یہ نہیں ہوگا کہ اگلے جہان میں خدا محدود ہو جائے۔ جب ہم جو محدود ہیں وہاں غیر محدود ہو جائیں گے تو خدا جو غیر محدود ہے اس کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ وہ محدود ہو جائیگا یہ عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ہم نے بھی وہاں ان جسمانی بندشوں سے آزاد ہو جانا ہے تو خدا تعالیٰ کو محدود سمجھ لینا عقل کے صریح خلاف ہے بے شک حُفَاةً عُرَاةً کے الفاظ ایسے ہیں جن سے بظاہر شبہ پڑتا ہے کہ شاید وہاں مومن اُسی طرح ملاقات کے لئے جائیں گے جس طرح یہاں پیدل اور سوار بادشاہوں کی ملاقات کیلئے لوگ جایا کرتے ہیں۔ مگر یہ شبہ بھی درست نہیں۔ رات کو انسان سویا ہوا ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ ننگے پاؤں ہوتا ہے اور بھر کپڑے بھی اس نے زیادہ تر اتارے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی اُسے خدا مل جاتا ہے۔

مَیں نے کئی دفعہ سُنایا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک تحریر مَیں نے ایک دفعہ دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ اے خدا! لوگ کہتے ہیں کہ مَیں تجھے چھوڑ دوں مگر مَیں تجھے کس طرح چھوڑ دوں۔ جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے جب میرے دوست اور رشتہ دار مجھ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں بلکہ میرا نفس بھی مجھے چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے اُس وقت تو میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ گھبرا نہیں مَیں تیرے ساتھ ہوں۔ اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوتے ہوئے بھی خدا تعالیٰ سے ملاقات ہو جاتی تھی تو روحانی طور پر اس میں کونسے تعجب کی بات ہے کہ سب مومن خدا تعالیٰ سے اجتماعی طور پر ملیں اور وہ انہیں اپنے اکرام و انعام سے نوازے جب آدمی نیم بیہوشی یا غنودگی کی حالت میں خدا تعالیٰ سے مل سکتا ہے تو ننگے بدن یا ننگے پیر ہونے کی حالت میں خدا تعالیٰ سے کیوں نہیں مل سکتا؟ روحانی نقطہ نگاہ سے ایک ہی وقت میں انسان کا ننگے پیر ہونا ننگے بدن ہونا اور اس کا نامختون ہونا بھی ممکن ہے۔ اور پھر خدا تعالیٰ سے اس کا اعزاز و اکرام کے ساتھ ملنا بھی ممکن ہے۔ صرف اتنی بات ضروری ہے کہ ان امور کو ظاہری طور پر دیکھنے کی بجائے انسان روحانی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

بعض دفعہ انسان پیاسا لیٹتا ہے اور کشف میں اُسے محبتِ الٰہی کا پیالہ پلایا جاتا ہے جس سے اُس کے مادی جسم میں بھی طراوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُس کی پیاس دُور ہو جاتی ہے۔ اب گو اسے ایک پیالہ پلایا گیا جس سے اس کی پیاس بھی بجھ گئی۔ مگر روحانی نقطۂ نگاہ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کشفی حالت میں پانی اور شراب اور دودھ کے پیالے پیش کئے گئے اور آپ نے صرف دودھ کا پیالہ لے لیا اور پانی اور شراب کا پیالہ ردّ کر دیا۔ تو گو دودھ کے پیالہ کی یہ تعبیر تھی کہ آپ کی اُمت ہلاکت سے بچی رہے گی اور اُسے الٰہی علوم سے ہمیشہ حصّہ ملتا رہے گا مگر ہم تمثیلی طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے جسم نے اسوقت پیاس محسوس کی۔ جس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دودھ کا پیالہ دیا گیا اور اس کے پینے سے آپ کو اسقدر سیری ہوئی کہ آپ کی پیاس بالکل جاتی رہی۔ سارے جھگڑے صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ انسان ان باتوں کو جسمانیات کی طرف لے آتا ہے حالانکہ ان کا تعلق جسمانیات سے نہیں بلکہ روحانیات سے ہے۔

وقف لازم وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۞ ۸۷

اور مجرموں کو ہانکتے ہوئے جہنم کی طرف لے جائیں گے ۔ ؎۸۵

اگر انسان ہر بات کو روحانی نقطہ نگاہ سے دیکھے اور سمجھے کہ ننگے پیر ہونا بھی روحانی دنیا میں ایک مفہوم رکھتا ہے ۔ ننگے بدن ہونا بھی ایک مفہوم رکھتا ہے ۔ نامختون ہونا بھی ایک مفہوم رکھتا ہے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہونا بھی ایک مفہوم رکھتا ہے ۔ تو خواہ اس سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب حدیثیں آ جائیں وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ وہاں کی روحانی کیفیات کا یہ ایک ظاہری نقشہ صرف ہمیں سمجھانے کے لئے کھینچا گیا ہے ۔ ورنہ ہر ظاہر ایک باطن بھی رکھتا ہے اور اصل چیز وہی باطن ہے جو خالص روحانی چیز ہے اور مادیات سے بہت بالا ہے ۔

؎۸۵ حل لغات :۔ سَاقَ الْمَاشِيَةَ سُوْقًا وَ سِيَاقًا وَ اَسَاقَ اِسَاقًا کے معنے ہوتے ہیں حَثَّهَا عَلَى السَّيْرِ مِنْ خَلْفٍ اس نے سواری کو پیچھے کی طرف سے ہانکا یعنی اسے سونٹا مار مار کر چلایا ۔ اس لئے وہ شخص جو اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ مجرموں کے پیچھے پیچھے چلے اور انکی نگرانی رکھے یا اونٹوں وغیرہ کے پیچھے چلے اُسے سائق کہا جاتا ہے ۔ اور سَاقَ الْحَدِيْثَ کے معنے ہوتے ہیں سَرَدَهٗ یعنی اس نے بے تحاشا لمبی باتیں شروع کر دیں ۔

عربی زبان میں جرنیل کو قائد کہتے ہیں اور قائد وہ ہوتا ہے جو فوج کے آگے آگے چلتا ہے ۔ یورپین افواج میں جرنیل کا مقام بالعموم پیچھے ہوتا ہے پس عربی کے لحاظ سے وہ سائق کہلائیگا قائد نہیں ۔ سائق جانوروں کے لئے ہوتا ہے یا مجرموں کے لئے

کیونکہ وہ آگے بڑھنے میں خوشی محسوس نہیں کرتے ۔ جانور کی مرضی ہوتی ہے کہ میں جہاں جانا چاہوں جاؤں اور آدمی کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس سے کام لے یا اُسے پانی وغیرہ پلانے کے لئے لے جائے پس جانور اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے مالک کی مرضی سے چلتا ہے ۔ اسی طرح مجرموں کا بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوں اس لئے ان کے لئے بھی ایک سائق ہوتا ہے جو انہیں اپنی نگرانی میں مجسٹریٹ کی طرف لے جاتا ہے ۔ غرض مجرموں کے لئے اور یا پھر جانوروں کے لئے سَاقَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ سَائِقُ الْاِبِلِ اونٹوں کے چرواہے کو کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح کمزوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب جنگ کے احکام نازل ہوئے تو مومنوں میں سے ایک گروہ کی یہ حالت تھی کہ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (انفال ع۱) وہ سمجھتے تھے کہ گویا وہ موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں ۔ کیونکہ ان کے دلوں میں بار بار یہ خیال اٹھتا تھا کہ ہمیں کہا جاتا تھا کہ رحم کرو ۔ ہر ایک سے محبت کے ساتھ پیش آؤ ۔ حسن سلوک کرو ۔ نرمی اور ملاطفت سے کام لو مگر اب کہتے ہیں کہ جنگ کرو ۔ پس اس وقت یہ انہیں ایسی چیز نظر آتی تھی جو عام تعلیم کے خلاف تھی اس لئے جب انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان کی طبیعتوں پر گراں گذرا ۔ یہ نہیں کہ وہ نافرمانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ انہیں یہ عجیب چیز نظر آئی کیونکہ اس میں اُن کے لئے

بڑی تلخی تھی اور انہیں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں سے ہی لڑنا پڑتا تھا جن سے لڑنا اُن پر طبعاً گراں گذرتا تھا مگر اسی فعل کے نتیجہ میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کی اور وہ جنت کی طرف دھکیل دئے گئے۔

اسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں صرف مجرموں اور کمزوروں کے لئے نہیں بلکہ مومنوں کے لئے بھی سَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ زمر میں ہے۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (ع ۸) اگر سِیْقَ کے معنے ندے اور دھکیل کر آگے کرنے کے ہیں تو اس کے کیا معنے ہوئے؟ مفسرین نے تو یہ جواب دیا ہے کہ کفار کے لئے جو نَسُوْقُ کا لفظ آیا ہے اس کے معنے کفار کو دھکیل کرلے جانے کے ہیں لیکن مومنوں کے لئے یہ لفظ اُن کی سواریوں کو دھکیلنے کی مناسبت سے ہے۔ یعنی خدا تعالےٰ ان کی آمد کا منتظر ہوگا اور فرشتے اُن کی سواریوں کو مار مار کر بھگا رہے ہوں گے۔ تاکہ جلد پہنچیں۔

میرے نزدیک اس کے دو جواب اور ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کفار کی نسبت اس سے پہلے آیا ہے کہ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (ع ۸) پس آگے جوار کے لحاظ سے وہی لفظ مومنوں کی نسبت بھی استعمال کر دیا ہے۔ پس اس جگہ اس کے معنے صرف چلانے کے ہیں آگے یا پیچھے کا ذکر نہیں۔ اور نہ اہانتِ عزت کی طرف اشارہ ہے صرف پہلے سِیْقَ کی متابعت میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کفار کی موجودہ حالت اور مومنوں کی سابق حالت کا اس لفظ سے نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کافر عذاب سے بھاگتا ہے۔ مومن نعمتوں اور آسائشوں سے بچتا ہے۔ وہ تو صرف زیارتِ باریؔ کا خواہشمند ہوتا ہے۔ پس مومنوں کی نسبت یہ لفظ رکھ کر بتایا ہے کہ جس طرح کافر تکلیف سے بچتا ہے، مومن آرام کی زندگی سے بچتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اُسے زبردستی دیتا ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ سید عبد القادر صاحب جیلانیؒ کہتے ہیں کہ مَیں اچھا کھانا یا کپڑا استعمال نہیں کرتا جب تک کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھا کر مجھے مجبور نہیں کرتا کہ مَیں اچھا کھانا کھاؤں یا اچھا کپڑا پہنوں۔ پس مومنوں کے دلوں کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ یہ کہ ظاہری طور پر ان کو دھکیل کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

سائق کے مقابلہ میں قائد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قائد کا لفظ ایک طرف افسر کی بہادری پر اور دوسری طرف فوجوں کی بشاشت پر دلالت کرتا ہے تیسرے اچھا نمونہ دکھا کر دوسروں کو تحریص دلانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ درحقیقت عمدہ لیڈر وہی ہوتا ہے جس میں یہ تینوں باتیں پائی جائیں یعنی وہ اپنے نمونہ کے ساتھ فوج کو رغبت دلائے اور انہیں بتائے کہ مَیں بھی قربانی کرتا ہوں تم بھی ہر قسم کی قربانی سے کام لو۔ پھر خود اس کے اندر ایسی بشاشت پائی جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنے میں ایک لذت محسوس کرے کیونکہ قائد وہی ہوتا ہے جو اپنے ساتھیوں سے آگے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ سپاہی اُسکے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔ اور وہ دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے آگے آگے جا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے جس کے سپاہیوں میں بھی بشاشت پائی جائے۔ چنانچہ قائد کے لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں

میرے ماتحت اپنے فرائض کا ایسا احساس رکھتے ہیں کہ وہ خودبخود میرے پیچھے چلے آئیں گے۔ غرض سائق اور قائد دو متقابل الفاظ ہیں۔ سائق پیچھے پیچھے چلتا ہے اور قائد فوج کے آگے آگے چلتا ہے اور اپنے نمونہ سے سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا اور اُن کے اندر ایک نیا دلولہ اور نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔

امریکن تاریخ میں ایک نہایت ہی لطیف واقعہ بیان ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب لیڈر کس طرح اپنے نمونہ سے اپنے ساتھیوں کے دلوں کو فتح کیا کرتے ہیں۔

یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ پہلے انگریزوں کے ماتحت ہوا کرتا تھا ایک عرصہ کی غلامی کے بعد اُن میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی مگر اسوقت انکی حالت یہ تھی کہ اُن کے پاس مقابلہ کے لئے فوجیں نہیں تھیں۔ اور نہ ہی کافی مقدار میں سامانِ جنگ موجود تھا اور انگریزوں کے پاس فوجیں بھی تھیں اور ہر قسم کا سامانِ جنگ بھی تھا۔ بہرحال جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو زمینداروں اور مزدوروں وغیرہ نے اپنے آپ کو والنٹیرز کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا اور سارے ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک آگ لگ گئی۔ جب یہ تحریک زیادہ مضبوط ہوگئی تو انہوں نے اپنے میں سے ایک افسر مقرر کیا جس کا نام واشنگٹن تھا اسی کے نام پر بعد میں امریکہ میں واشنگٹن شہر بنایا گیا ہے یہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔ جنگی فنون میں کچھ زیادہ مہارت نہیں رکھتا تھا مگر اخلاص اور دردِ قومی اس کے اندر موجود تھا۔ وہ سارے ملک میں چکر لگاتا۔ تقریریں کرتا اور لوگوں کو اُبھارتا کہ آزادی بڑی نعمت ہے اس کیلئے جدوجہد کرو۔ ایک دفعہ وہ اپنے ملک کا چکر لگا رہا تھا کہ اُس نے ایک جگہ پر دیکھا کہ کوئی قلعہ بن رہا ہے اور کارپورل نگرانی کیلئے پاس کھڑا ہے۔ کام کرنے والے صرف چار پانچ سپاہی تھے اتفاقاً ایک دو شہتیر ایسے آگئے کہ اُن کا اوپر چڑھانا مشکل ہوگیا۔ وہ زور لگا لگا کر اوپر کھینچتے مگر وہ پھر نیچے گر جاتے اور وہ کارپورل پاس کھڑا انہیں کہتا جاتا کہ شاباش خوب زور لگاؤ۔ شاباش ہمت نہ ہارو مگر آگے بڑھ کر اُن کی مدد نہیں کرتا تھا۔ اِسی دوران میں واشنگٹن وہاں سے گذرا۔ وہ اس وقت ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے جب یہ نظارہ دیکھا تو اپنا گھوڑا روک لیا اور پُوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے بتایا کہ انگریزی فوج آ رہی ہے اس کے مقابلہ کے لئے ہم یہ قلعہ بنا رہے ہیں۔ تاکہ سپاہی اس میں ٹھہر سکیں۔ اُس نے کہا کہ پھر اس قلعہ کے بننے میں دِقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا دِقت یہ ہے کہ شہتیر بہت بھاری ہیں اور ہم سے اوپر چڑھائے نہیں جاتے۔ اُس نے کارپورل سے پُوچھا کہ تم ان کی کیوں مدد نہیں کرتے؟ اُس نے کہا کہ میں تو افسر ہوں۔ میرا فرض یہ ہے کہ میں ان سے کام لوں اور ان کی نگرانی کروں۔ واشنگٹن نے یہ بات سُنی۔ تو فوراً اپنے گھوڑے پر سے اُترا۔ اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شہتیر اوپر چڑھ گئے۔ جب کام ہو چکا اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر واپس جانے لگا تو کارپورل نے اُسے کہا۔ کہ مَیں آپ کا اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس مشکل کام میں ہماری مدد کی۔ واشنگٹن نے جواب میں کہا۔ آپکی مہربانی۔ مَیں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آپ کسی ایسی مصیبت میں پھنس جائیں کہ آپکو دوسرے کی مدد کی ضرورت ہو۔ تو اپنے کمانڈر انچیف واشنگٹن کو

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ

اُس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا سوائے اس کے جس نے

عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۸﴾ وقف لازم

(خدائے) رحمان سے عہد لے چھوڑا ہے ۱۷۵

بلا لیا کرنا۔

یہ قائد کی مثال ہے کہ وہ اپنے آپکو ہر کام کے لئے پیش کر دیتا ہے اور قربانی کے وقت وہ دوسروں سے پیچھے نہیں بلکہ اُن کے آگے آگے ہوتا ہے۔ اور اپنے نمونہ سے ان کے اندر کام کی تحریص پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی اعلیٰ درجہ کے قائد کے ہوتے ہوئے بھی لوگ اس کے نمونہ سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ اُن کی بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔

ہم نے خدام کے افسروں کا نام بھی قائد اسی لئے رکھا ہے کہ وہ اپنے نمونہ سے لوگوں کے دل فتح کریں۔

وِرْدًا کے معنے پانی پر آنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْوِرْدُ: اَلْاِشْرَافُ عَلَى الْمَآءِ۔ اسی طرح اس کے معنے پیاس کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے معنے پانی کے حصہ کے بھی ہوتے ہیں اور وِرْدٌ کے معنے اس پانی کے گھاٹ کے بھی ہوتے ہیں جس پر لوگ آتے جاتے ہیں تاکہ پانی وغیرہ پئیں اور اس کے معنے اس قوم کے بھی ہوتے ہیں جو کسی پانی والی جگہ پر جمع ہو جاتی ہے۔

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار کا حشر بھی اجتماعی ہوگا۔ مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہونے سے گھبرائیں گے۔ اس لئے ان کو مار مار کر اکٹھا رکھا جائیگا۔ اور آخر وہ جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے اس حالت میں کہ وہ ایسی جگہ پر جانے کے محتاج ہوں گے جہاں اُن کی پیاس بجھے۔

یہ الفاظ اُن کے عذاب کی شدت پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس بات کے محتاج ہونگے کہ اُن کو کوئی ایسا مقام ملے جہاں وہ آرام کریں اور انہیں پینے کے لئے پانی ملے۔ مگر باوجود اس شدید احتیاج کے اُن کو مار مار کر جہنم کی طرف لے جایا جائیگا اور وہ اتنا خطرناک اور تکلیف دہ مقام ہوگا کہ وہ اُسکی طرف رُخ کرنا بھی پسند نہیں کریں گے۔

۱۷۵ حل لغات:۔ لغت میں لکھا ہے اَلشَّفْعُ ضَمُّ الشَّيْءِ اِلٰى مِثْلِهٖ۔ یعنی شفع اس بات کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اپنی ہم جنس اور مشابہ چیز کے ساتھ ملا لیا جائے۔ وَقِيْلَ اَلشَّفْعُ: اَلْمَخْلُوْقَاتُ۔ اور شفع کے معنے مخلوقات کے بھی ہوتے ہیں مِنْ حَيْثُ اَنَّهَا مُرَكَّبَاتٌ۔ کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ ساری کی ساری مرکب ہیں۔ کَمَا قَالَ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ جیساکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔

اِسی طرح شفاعت کے متعلق لکھا ہے۔ اَلشَّفَاعَةُ: اَلْاِنْضِمَامُ اِلٰى اٰخَرَ نَاصِرًا لَهٗ وَسَائِلًا عَنْهُ وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي انْضِمَامِ

مَنْ هُوَ اَعْلٰى حُرْمَةً وَّ رُتْبَةً اِلٰى مَنْ
هُوَ اَدْنٰى وَمِنْهُ الشَّفَاعَةُ فِى الْقِيٰمَةِ
قَالَ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا - وَلَا
يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ قَالَ مَا
مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (مفردات)
یعنی شفاعت کے معنے ہیں کسی شخص کا دوسرے کے
ساتھ اس طرح پر مل جانا کہ وہ اس کا مددگار ہو جائے
اور اس کے متعلق سوال کرنے والا بن جائے اور اس
لفظ کا اکثر استعمال کسی اعلیٰ چیز کے ساتھ ادنیٰ
چیز کو ملانے پر کیا جاتا ہے۔ یعنی دوسری چیز
جس کو ساتھ ملایا جاتا ہے وہ مثل تو ہوتی ہے
لیکن درجہ اور مقام کے لحاظ سے وہ ادنیٰ ہوتی ہے
انہی معنوں میں وہ شفاعت بھی ہے جو قیامت کے
دن ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا
ہے کہ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ
عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا فرماتا ہے لَا يَشْفَعُوْنَ
اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (انبیاء ع) اسی طرح فرماتا ہے
مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس ع)

تفسیر - اوپر کے معنوں کو مدنظر
رکھتے ہوئے شفاعت کی صورت بالکل حل ہو جاتی
ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے
کہ ہر مسلمان جس نے کلمہ پڑھ لیا اسکی قیامت کے دن
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائینگے
بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شفاعت ہے ہی گنہگاروں کے
لئے اور وہ بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں ؎

کہ مستحق شفاعت گنہگار انند

حالانکہ شفاعت کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا مثیل ہونا ضروری ہے۔ اور وہی شخص آپؐ کی
شفاعت کا مستحق ہو سکتا ہے جس نے پوری کوشش
کی کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جیسا بنے مگر
بعض کوتاہیوں کی وجہ سے وہ اپنے اس ارادہ میں
سو فیصدی کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کی اس کمی کو
پورا کرنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
خدا تعالےٰ کے حضور درخواست فرمائیں گے کہ خدایا
اس شخص نے میرا مثیل بننے کیلئے پوری کوشش کی
ہے مگر بعض کمزوریوں نے اُسے اپنے مقصد میں پوری طرح
کامیاب نہیں ہونے دیا۔ میں تجھ سے درخواست کرتا
ہوں کہ تو اس پر رحم فرما اور اس کی کوتاہیوں کو
نظر انداز فرماتے ہوئے اسے بھی اپنے قرب سے حصہ
دے۔ پس شفاعت گنہگار کے لئے نہیں بلکہ اس کے
لئے بھی قانون مقرر ہیں۔ چنانچہ پہلا قانون یہی ہے
کہ وہ شفاعت کرنے والے کا مثیل ہو۔ اگر وہ مثیل
نہیں ہوگا تو اس کی شفاعت نہیں کی جائے گی۔

دوسرا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس سے
راضی ہو۔ چنانچہ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ
ارْتَضٰى (انبیاء ع) میں یہی بات بیان کی گئی ہے
کہ شفاعت کا مستحق بننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے
کہ اللہ تعالےٰ اس شخص سے راضی ہو۔

تیسرا قانون یہ ہے کہ شفاعت کے متعلق
اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل ہو۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔
مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس ع)
کوئی شخص اُس وقت تک شفیع نہیں بن سکتا جب تک
شفاعت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو
اگر محض گناہ شفاعت کا موجب ہوتا جیسا کہ مسلمانوں
میں عام طور پر خیال پایا جاتا ہے تو شفاعت کے
لفظ اور رضاء اور اذن کی شرط کی کیا ضرورت
تھی۔ پھر تو کہنا چاہیئے تھا کہ جو بھی گنہگار ہوگا

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اُس کی شفاعت فرمادیں گے۔

حقیقت یہی ہے کہ جب تک کوئی شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مثیل نہ بن جائے اُس وقت تک وہ آپ کی شفاعت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے تم بازار میں جاؤ اور دوکاندار سے کہو کہ مجھے اچھی قسم کے لنگڑے آم دو۔ وہ چند اچھے آم نکال کر تمہیں دے دیتا ہے اور تم انہیں ٹوکری میں ڈال لیتے ہو۔ اب اگر تمہیں ضرورت زیادہ ہے اور ویسے آم تمہیں اَور نہیں مل سکتے تو تم دوکاندار سے کہوگے کہ اس سے ملتے جلتے اگر کچھ چھوٹے سائز کے آم ہوں تو وہ بھی رکھ دو۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ لنگڑے آم کا سائز اَور ہوگا اِس وجہ سے کہ تمہیں ضرورت ہوگی تم ذرا چھوٹے سائز کے آم بھی لے لوگے اور کہوگے کہ یہ آپس میں ملتے ہی ہیں اگر ان کا سائز کچھ چھوٹا ہے تو کیا ہُوا۔ لیکن تم اس کی جگہ کوئی ٹوٹی ہوئی جوتی نہیں رکھوگے۔ تم اس کی جگہ کیلے کا چھلکا نہیں لے آؤگے۔ تم اس کی جگہ آم کی گٹھلیاں نہیں لے آؤگے تم بہرحال آم ہی لاؤگے خواہ وہ سائز میں کچھ کم ہی ہوں۔ اسی طرح شفاعت میں بھی ایک مشابہت کا پایا جانا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنے یہ ہیں کہ ایسے انسان جو کوشش کریں گے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مثیل ہو جائیں لیکن اُن کی تکمیل روحانی میں کچھ کمی باقی رہ جائیگی قیامت کے دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے متعلق خدا تعالےٰ کے حضور عرض کریں گے کہ خدایا انہوں نے میرا مثیل بننے کی کوشش کی تھی لیکن اُنکے اعمال میں کچھ کمی رہ گئی اب اس کمی کو تو اپنے فضل سے پورا فرمادے۔ یہ نہیں کہ حرامکاری کر رہے ہیں۔ فساد کر رہے ہیں۔ قتل کر رہے ہیں جھوٹے نعرے لگا رہے ہیں۔ ناکردہ گناہ لوگوں پر الزام لگا رہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کہہ رہے ہیں ؎

کہ مستحق شفاعت گنہگار انند

جو شخص پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے۔ جو شخص پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ صحابہؓ کے نقشِ قدم پر چلے لیکن باوجود اس کوشش اور جدوجہد کے اس کے اعمال میں کچھ کمی باقی رہ جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس جدوجہد اور کوشش کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انکشاف فرمائے گا اور آپؐ اللہ تعالےٰ کے حضور اس کے لئے رحم کی درخواست کرینگے اور فرمائینگے کہ اس شخص نے کوشش تو کی تھی لیکن پیچھے رہ گیا۔ اب تُو اپنے فضل سے اس کی کمی کو پورا فرمادے۔ یہی لغت والے لکھتے ہیں کہ شفاعت کیلئے ہم مثل ہونا ایک لازمی امر ہے۔ کیونکہ ایک قسم کی جب دو چیزیں ہوں جن میں سے ایک ادنیٰ ہو اور ایک اعلیٰ، تو ادنیٰ کو اعلیٰ سے ملانے کو شفاعت کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت اللہ تعالےٰ اس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا۔ اُس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا۔ سوائے اس کے جس نے خدائے رحمٰن سے عہد لے چھوڑا ہے۔ اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح جس کو عیسائی خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اُسکو شفاعت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ شفاعت کے ذکر کے ساتھ ہی یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا بیٹا قرار دینا بڑے گناہ کی بات ہے پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٩﴾

اور یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ (خدائے) رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے ۵۹؎

کہ جس چیز کا خیال بھی خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہو وہی چیز جس شخص کی طرف منسوب کی جارہی ہو اُسے شفاعت کا حق حاصل ہو۔

اس جگہ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو خدا کی وحی نے بتایا کہ قیامت کے دن آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ خصوصیتیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے اَور کسی نبی کو نہیں ملیں (۱) مجھے ایسا رعب عطا فرمایا گیا ہے کہ مہینہ بھر کی مسافت پر بھی دشمن مجھ سے لرزہ براندام رہتا ہے (۲) میرے لئے زمین کے چپہ چپہ پر خدائے واحد کی عبادت کرنا جائز قرار دیا گیا ہے (۳) غنائم کے اموال میرے لئے حلال کئے گئے ہیں (۴) سابق انبیاء صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے لئے مبعوث فرمایا ہے (۵) اور مجھے قیامت کے دن شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ باب جعلت لی الارض مسجدًا وطهورًا)

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب تمام انبیاء شفاعت سے انکار کریں گے اور میں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں جھکا ہوا ہونگا تو مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ اے محمد رسول اللہ سجدہ سے اپنا سر اُٹھا اور اللہ تعالیٰ سے مانگ کہ تجھے دیا جائے گا اور اس کے بندوں کی شفاعت کر کہ تیری شفاعت قبول کی جائیگی۔

(بخاری کتاب التفسیر زیر آیت ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ)

سورۂ زخرف میں بھی اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے شفیع ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (زخرف ع۷)

یعنی وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے جس کے قبضہ و تصرف میں زمین و آسمان کی بادشاہت ہے۔ اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے اس کا بھی وہی بادشاہ ہے اور قیامت کا علم بھی صرف اُسی کو حاصل ہے اور تم سب کو اُسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور وہ معبودانِ باطلہ جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں ہرگز شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے۔ صرف وہی شفاعت کا حق رکھتا ہے جو سچی گواہی دے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اور کفار اس حقیقت کو اگر وہ غور کریں تو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس آیت سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا مقام صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگا۔ اور کسی کو نہیں۔ اور یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے۔

۵۹؎ **تفسیر**:۔ فرماتا ہے یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ انہیں مسیح کی شفاعت حاصل ہوگی۔ حالانکہ

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٩٠﴾

(تو کہہ دے) تم ایک بڑی سخت بات کہہ رہے ہو سلکہ

ان کو مسیح کی شفاعت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ مسیح تو ہمارا موحد بندہ تھا اور یہ مسیح کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں۔ جب یہ ہمارے موحد مسیح کے ساتھ مشابہت ہی نہیں رکھتے تو انہیں اس کی شفاعت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ شفاعت مثیل کے لئے ہو سکتی ہے اور یہ اُس کے مثیل نہیں۔ یہ لوگ مسیح کی تعلیم کے سراسر خلاف خدائے رحمٰن کی طرف ولد منسوب کر رہے ہیں۔ حالانکہ رحمٰن اور ولد ہونا متضاد ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ رحمٰن ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کو رحمٰن مانتے ہیں وہ ایسا نہیں مانتے۔ لیکن دلیل کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ خواہ مخالف مانے یا نہ مانے جب ایک واقعہ ظاہر ہو تو اُس واقعۂ ثابتہ کے ساتھ نتیجہ کو ملا دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی اِسی طرح کیا گیا ہے۔ بے شک وہ نہیں مانتے کہ خدا رحمٰن ہے مگر چونکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ رحمٰن ہے اور رحمٰن خدا ولد کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عیسائیوں کا دعویٰ یقیناً غلط ہے اور اس غلط اِدّعا کے بعد یہ امید رکھنا کہ ہمارے حق میں شفاعت ہوگی بڑی بھاری غلطی ہے۔

سلکہ حل لغات:۔ اِدًّا کے معنے ہیں اَمْرًا مُّنْكَرًا يَقَعُ فِيْهِ جَلَبَةٌ۔ ایسا ناپسندیدہ امر جس پر لوگوں میں شور مچ جائے۔ دنیا میں ناپسندیدہ اعمال کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو ہنس کے چلے جاتے ہیں۔ ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو اغماض کر لیتے ہیں۔ ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو گھورتے ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو شور مچا دیتے ہیں کہ یہ کیا ہوا۔ اِدًّا کے معنے ایسے ہی ناپسندیدہ فعل کے ہیں جس کو فطرت تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور لوگوں میں شور برپا ہو جائے کہ یہ کیا ہو گیا۔

تفسیر: شرک کی انتہائی بُرائی بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے ایک ایسا کام کیا ہے جو فطرتِ صحیحہ کے خلاف ہے اور جس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کے جذبات کے اظہار سے کوئی شریف آدمی رُک نہیں سکتا۔ یہ کسی فعل کی حد درجہ کی ناپسندیدگی کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کے خلاف ہر انسان بے تحاشا احتجاج کرنے پر تیار ہو جائے اور اُسے کسی صورت میں بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شرک ایک ایسا فعل ہے جس کو ماننے سے فطرت انکار کرتی ہے اور یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب عیسائیت اسلام کے اعتراضات سے ڈر کر خود تثلیث کے اَور معنے کرنے لگ گئی ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اس کے خلاف ہر انسان کو آواز اُٹھانی چاہیئے۔ مگر اس زمانہ میں جو لوگ اس فتنہ کے خلاف آواز اُٹھا رہے ہیں اور خدا تعالیٰ کی توحید کے قیام کے لئے رات دن کوششیں کر رہے ہیں وہی مسلمان کہلانے والوں کی نگاہ میں کافر اور بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ وہ عیسائیوں کے ساتھ جو مسیح کو خدا کا شریک

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ

قریب ہے کہ (تمہاری بات سے) آسمان پھٹ کر گر جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩١﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩٢﴾

اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر جا پڑیں۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے (خدائے) رحمٰن کا بیٹا قرار دیا ہے۔

قرار دیتے ہیں تو محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں مگر جو توحید کے قیام کے لئے عیسائیوں کو تبلیغ کرتے ہیں اُن کو کافر قرار دیتے ہیں۔

حل لغات:۔ تَفَطَّرَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کا اپنے اندر سے ضعف کی وجہ سے ٹوٹ جانا۔ چنانچہ تَفَطَّرَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں اِنْشَقَّ وہ چیز پھٹ گئی اور تَفَطَّرَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ کے معنے ہوتے ہیں تَصَدَّعَتْ بِہٖ وَاَخْرَجَتْهُ یعنی زمین پھٹ گئی اندر سے سبزی نکل آئی اور تَفَطَّرَتِ الْقَضِیْبُ کے معنے ہوتے ہیں بَدَءَ نَبَاتُ وَرَقِہٖ شاخ کے پتے نکلنے شروع ہو گئے۔ گویا کسی چیز کے اندر سے جب کوئی چیز باہر نکلنی شروع ہو جائے تو اس کے لئے تَفَطَّرَ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز آپ ہی آپ پھٹ گئی ہے اور فَطَرَ کے معنے کسی چیز کو نئے سرے سے شروع کرنے کے ہوتے ہیں۔

هَدًّا کے متعلق لغت میں لکھا ہے کہ اَلْهَدَّةُ صَوْتُ وَقْعِ الْحَائِطِ یعنی دیوار کا اس زور سے گرنا کہ اُس کے گرنے سے آواز پیدا ہو اُسے هَدًّا کہتے ہیں۔ اگر کوئی دیوار آہستگی سے گر جائے اور آواز پیدا نہ ہو تو اس کیلئے هَدًّا کا لفظ استعمال نہیں ہوگا۔ هَدًّا کا لفظ اُسی وقت استعمال ہوگا جب وہ اس زور سے گرے کہ ساتھ ہی آواز بھی پیدا ہو۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ شرک کے خلاف آسمانوں کے اندر ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ اس جوش کی وجہ سے پھٹ جائیں گے اور زمین میں بھی ایسا اندرونی جوش پیدا ہو چکا ہے کہ اس کا سینہ چاک ہو جائے گا اور پہاڑوں پر بھی اس کا اتنا اثر ہے کہ قریب ہے کہ وہ بھی بیتاب ہو کر یکدم گر جائیں اور اُن کے گرنے سے ایک شور برپا ہو جائے۔ یعنی یہ دعویٰ آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے لئے گراں ہے۔ آسمانوں کے لئے اس لئے گراں ہے کہ یہ آسمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ صفاتِ الٰہیہ اور ملائکہ کا تصور سب اس کے متباعد ہیں اور زمین بھی اس کے خلاف ہے یعنی فطرتِ صحیحہ بھی اس کے خلاف ہے اور پہاڑوں کا دھاوا یعنی ترقی کے جذبات اور احساسات جو فطرت کا ایک اعلیٰ مقام ہیں وہ بھی اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ ابنیّت کفارہ کی مستلزم ہے اور کفارہ انسان کی اعلیٰ درجہ کی ترقیات کے خلاف ہے اور انسان کی پستی پر دلالت کرتا ہے۔ جو کچھ عیسائیت کفارہ اور ابنیّت سے ثابت کرتی ہے اسلام اُسے انسان کی اعلیٰ ترقیات سے قابلِ حصول قرار دیتا ہے۔ پس جبال بھی اس کے وجود کے خلاف ہیں گویا آسمان اور زمین اور جبال اپنے مطابق

روحانی وجودوں کی طرف اشارہ کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اور جہاں بھی انسان کی اعلیٰ ترقیات کے حصول پر اعتراض کیا جائے گا اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے رحم اور اس کے عفو اور اس کی مہربانی کی صفات کو نظر انداز کیا جائے گا لازماً اس پر آسمان بھی پھٹے گا کیونکہ خدا بھی اُسے ناپسند کریگا اور فرشتے بھی اُسے ناپسند کریں گے اور زمین بھی پھٹے گی کیونکہ انسان بھی اس کو ناپسند کریگا اور جبال بھی پھٹیں گے کیونکہ انسانوں میں سے جو اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں یعنی خدا تعالیٰ کے انبیاء وہ بھی اس کو ناپسند کریں گے۔

عام انسان اس تعلیم کو اس لئے ناپسند کرے گا کہ وہ کہے گا یہ تعلیم میرے لئے ہر قسم کی ترقی کے راستہ کو بند کر دیتی ہے۔

اعلیٰ انسان اس لئے اس تعلیم کو ناپسند کرے گا۔ کہ وہ کہیگا۔ یہ تو میری تجربہ شدہ چیز ہے اور مجھے مل چکی ہے۔ اب یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ایسی ترقی کسی انسان کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ اور اس کے فرشتے اس لئے ناراض ہونگے کہ ہم تو اپنی نعمتیں ان کو دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایسا نہیں کرسکتا پس انسان اس کی مخالفت کرے گا اور کہیگا کہ عجیب بات ہے میرے لئے ایک ہی امید کا سہارا تھا وہ بھی اس تعلیم نے توڑ دیا۔ اعلیٰ انسان اس تعلیم کی مخالفت کرے گا اور کہے گا میں نے تو اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کے انعامات کو نازل ہوتے دیکھا ہے یہ کیا کہہ رہا ہے کہ ایسے انعامات کسی انسان کو حاصل نہیں ہوسکتے اور پھر خدا اور اسکے ملائکہ بھی ناراض ہوں گے کہ ہم تو اپنی نعمتوں میں سے انہیں حصہ دے رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو معاف نہیں کرسکتا۔ کسی کی توبہ قبول کرکے اُسے اپنے قرب میں جگہ نہیں دے سکتا پس آسمان اور زمین اور جبال تینوں اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے یعنی آسمانی ہستیاں اس کو ناپسند کریں گی اور اُن کے دل پھٹ جائیں گے۔ اسی طرح انسان کی فطرت بھی اس کو دیکھ کر چلّا اُٹھے گی۔ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اور پھر اس صدمہ سے جو اعلیٰ درجہ کی روحانی ہستیاں ہیں وہ بھی گھبرا کر کہیں گی کہ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک چیز ملی ہوئی ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مل ہی نہیں سکتی۔

منکرینِ الہام سے جب بھی میری گفتگو ہوتی ہے میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ میں تمہاری دلیلوں کو کیا کروں جبکہ خدا مجھ سے خود ہمکلام ہوتا ہے اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر الہامات نازل نہ ہوتے تو شاید میں خیال کر لیتا کہ تمہاری دلیلوں میں کچھ وزن ہوگا۔ لیکن بیان دلائل کا مجھ پر کیا اثر ہوسکتا ہے جبکہ خود مجھ پر الہامات نازل ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہ دلیلیں سُنکر ہنسی آتی ہے کہ خدا موجود ہے اُس کا کلام ہم پر نازل ہوتا ہے اور دلائل یہ دئے جارہے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر جو چیز میں نے دیکھ لی ہے حالانکہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادموں میں سے ہوں اُس کے متعلق میں یہ کس طرح تسلیم کرسکتا ہوں کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نے نہیں دیکھی ہوگی۔ جب نیچری کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خیالاتِ عالیہ کا نام قرآن ہے تو سُن کر ہنسی آتی ہے کہ جب ہمیں معیّن الفاظ میں الہام ہوتے ہیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۳﴾

اور (خدائے) رحمٰن کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے ف ۵۵

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي

کیونکہ ہر ایک جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ (خدائے) رحمٰن کے حضور میں

الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۴﴾ لَقَدْ أَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ

غلام کی صورت میں حاضر ہونیوالا ہے ف ۵۶ (خدا نے) اُن کو گھیر رکھا ہے اور گن

عَدًّا ﴿۹۵﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۶﴾

رکھا ہے ف ۵۷ اور وہ سب کے سب قیامت کے دن (فردًا) فردًا اسکی خدمت میں حاضر ہونگے ف ۵۸

شان تو بہت بالا ہے آپ پر خدائی الفاظ میں ہی قرآن کیوں نازل نہیں ہوسکتا تھا۔ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا میں اِسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کے روحانی لوگ ہیں اور جنہوں نے اِن تمام انعامات کا مشاہدہ کیا ہُوا ہے وہ اسبات کو سُن کر ایسا محسوس کریں گے کہ گویا وہ سارے مقامات جو اُن کو حاصل ہیں اُن کو انہوں نے گرا دیا ہے۔

ف ۵۵ تفسیر:۔ عیسائیوں کا عقیدۂ ابنیت خداتعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے بالکل خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت خدا تعالیٰ کو رحمٰن تسلیم نہیں کرتی اور وہ دنیا کی نجات کیلئے بیٹے کی قربانی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے گناہوں کو معاف نہیں کرسکتا تھا اور اُس نے اپنے بیٹے کو قربان کرکے لوگوں کو بچا لیا تو اس کی رحمانیت کہاں گئی۔ یہ بخشش کا کام تو اسکی رحمانیت نے کرنا تھا۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ یعنی کلام الٰہی جو بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے نازل ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی گمراہی کو دیکھکر خداتعالیٰ کی صفتِ رحمانیت جوش میں آتی ہے اور جس طرح ظاہری عالم میں بغیر مانگنے کے اُس نے ہزاروں ہزار نعمتیں پیدا کردی ہیں اسی طرح روحانی عالم میں وہ کلام الٰہی نازل کرتا ہے جس پر عمل کرکے دنیا نجات پا جاتی ہے۔

ف ۵۶ تفسیر:۔ یعنی جب ہر چیز اسکے تابع فرمان ہے تو پھر بیٹے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹا تو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی مدد کرے یا باپ کی موت کے بعد اُسکے نام کو زندہ رکھے۔ جب خداتعالیٰ کو کسی کی مدد کی احتیاج نہیں اور ہر چیز پر اسکی دائمی حکومت ہے تو پھر بیٹے نے کس پر حکومت کرنی ہے۔

ف ۵۷ تفسیر:۔ یہ پہلی آیت کی تشریح ہے اور مراد یہی ہے کہ جب ان میں سے ایک ایک کی گنتی خدا تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے تو اُسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹے کی احتیاج تو تب ہوتی جب کوئی کام ایسا بھی ہوتا جسے وہ خود سرانجام نہ دے سکتا۔

ف ۵۸ تفسیر:۔ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے ہمارا بوجھ اُٹھا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسکی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس دنیا میں بھی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور (جنہوں نے) نیک عمل کئے ہیں (خدائے)

لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۹۷

رحمان اُن کے لئے وُدّ پیدا کردے گا ۔

خدا تعالےٰ کا قانون چل رہا ہے اور مرنے کے بعد بھی اُسی کا قانون جاری ہوگا اور ہر شخص فرداً فرداً اُس کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے حاضر ہوگا۔ پس یہ غلط خیال ہے کہ تمہاری جگہ مسیحؑ صلیب پر لٹک گیا اور اس نے تمہارا بوجھ اُٹھا لیا۔ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اُٹھا کر چلنا پڑے گا۔ جیسا کہ مسیح ناصری نے بھی کہا ہے۔

"جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"

(لوقا باب ۱۴ آیت ۲۷)

اسی طرح انہوں نے کہا

"اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہولے"

(مرقس باب ۸ آیت ۳۴)

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب مسیحؑ خود اس امر کی وضاحت کر چکا ہے کہ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑیگی تو تم کس طرح سمجھتے ہو کہ تمہارے سب بوجھ اس نے اُٹھا لئے ہیں۔

حل لغات:- وُدّ اس محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے ساتھ گہرا اور مضبوط تعلق پیدا کردے اور دونوں ایک دوسرے کے وابستہ ہو جائیں جس طرح جانور کو کیلے کے ذریعہ زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح وُدّ میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا انسان سے ایسا مضبوط تعلق قائم ہو جائے کہ وہ کٹ نہ سکے۔ یہ لفظ وَدّ کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے وِدّ کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے اور وُدّ کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور تینوں شکلوں میں محبتِ شدید کے معنوں میں ہی آتا ہے۔

اس کے معنوں کی حقیقت اس طرح واضح ہوتی ہے کہ وَدّ عربی زبان میں وَتَد یعنی میخ کو بھی کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اُس کے ذریعہ جانور کو زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ پس وُدّ ایسی محبت کا نام ہے جو مُحِبّ اور محبوب دونوں کو اس طرح جوڑ دیتی ہے جیسے کیلا گاڑ کر جانور کو باندھ دیا جاتا ہے۔ اور وہ زمین کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ بیشک رغبت اور اُنس کے الفاظ بھی عربی زبان میں اظہارِ محبت کے لئے استعمال ہوتے ہیں مگر اُن میں وہ شدتِ محبت نہیں پائی جاتی جو وُدّ میں پائی جاتی ہے رغبت کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ میرے دل میں شوق پیدا ہو گیا ہے اس میں یہ مفہوم داخل نہیں ہوتا کہ محبوب کے دل میں بھی کوئی شوق پیدا ہُوا ہے یا نہیں۔ اور اُنس میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہو گیا ہے اور میرے

محبوب پر بھی میری محبت کا اتنا اثر ہوا ہے کہ اُس نے اپنا مُنہ میری طرف کر لیا ہے مگر وُدّ میں یہ مفہوم داخل ہے کہ اُس نے صرف مُنہ ہی نہیں کیا بلکہ محبت نے ہماری آپس میں گرہ باندھ دی ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں جو کفار کے بتوں کے نام آئے ہیں اُن میں سے ایک بُت کا نام وَدّ بھی آیا ہے (نوح ع) کیونکہ مشرکین کا خیال تھا کہ جیسے کیلے کا زمین سے تعلق ہوتا ہے ایسا ہی اُس بُت کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہے۔ یہ لفظ مدارجِ محبت کے لحاظ سے رغبت اور اُنس سے بڑھکر لیکن خُلّة سے نچلے مقام پر ہے کیونکہ خُلّت کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایسی محبت جو جسم کے سوراخ سوراخ میں داخل ہو جائے۔ وُدّ میں یہ کیفیت تو پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا مستقل تعلق ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کٹ نہیں سکتا۔

تفسیر:۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا کہ ہم اُسے لوگوں کے لئے ایک نشان اور اپنی طرف سے رحمت کا ذریعہ بنائیں گے گویا مسیح کے لئے رحمت کا لفظ آیا تھا مگر مسلمانوں کے لئے وُدّ کا لفظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے اور جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے وُدّ اس محبت کو کہتے ہیں جو کیلے کی طرح گڑی ہوئی ہو۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض جگہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کو چسپاں کرنے سے کئی کئی مضامین نکل آتے ہیں۔ یہاں بھی اسی قسم کا طریق اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں لَهُمْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنے ہیں اُن کے فائدہ کے لئے کیونکہ لام فائدہ کے لئے آتا ہے مگر یہ کہ کس کس امر کے متعلق اللہ تعالیٰ وُدّ پیدا کرے گا اِسے اللہ تعالیٰ نے مخفی رکھا ہے تاکہ جتنے معانی پیدا ہو سکتے ہوں وہ اس ایک لفظ سے ہی پیدا ہو جائیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے معنے عربی زبان کے لحاظ سے یوں بنتے ہیں کہ مومنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت کیلے کی طرح گاڑ دیگا۔ یا یہ کہ اپنے دل میں مومنوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دیگا یا یہ کہ مومنوں کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔ یا یہ کہ بنی نوع انسان کے دل میں مسلمانوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔

یہ چار معنے ہیں جو اس آیت سے مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) پہلے معنے اس کے یہ ہیں کہ مومنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے انعامات پر غور کرے گا۔ اس کی رحمانیت کے وسیع فیضان کو دیکھیگا اور اس کے بے شمار احسانات کا مطالعہ کرے گا اس کے دل میں لازمی طور پر خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی اور وہ اُس کے قرب میں بڑھنے کی کوشش کرے گا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا دنیا کی نجات کے لئے بھیجا ہے اس لئے بنی نوع انسان کا فرض ہے کہ وہ اُس سے محبت کریں مگر خدا کہتا ہے کہ ہم تو آپ تم سے رات دن محبت کر رہے ہیں۔ ہم رحمٰن ہیں اور اپنی صفتِ رحمانیت سے تم کو ہر وقت حصہ دے رہے ہیں کیا تم ہمارے ان انعامات کو دیکھ کر ہم سے محبت نہیں کر سکتے ؟ مسیح کو صلیب پر چڑھتے ہم نے نہیں دیکھا اور پھر ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ ہماری خاطر صلیب پر چڑھا لیکن خدا تعالیٰ کا سورج ہم ہر روز

چڑھتا دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا چاند ہم ہمیشہ آسمان پر چمکتا دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ دریا ہمیں اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نے ہمیں آنکھیں دیں جن سے ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ یہ آنکھیں ہمارے ماں باپ نے ہمیں نہیں دیں۔ نہ ہم نے کہیں سے خریدی ہیں صرف خدا نے اپنی رحمانیت کے طفیل ہمیں عطا کی ہیں۔ اسی طرح اس نے ہمیں زبان دی ہے جس سے ہم بولتے ہیں۔ غلہ دیا ہے جو ہم رات دن کھاتے ہیں۔ چاول دئے ہیں۔ گوشت دیا ہے۔ ترکاریاں دی ہیں۔ مال دیا ہے۔ صحت دی ہے۔ عزت دی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی رحمانیت کے ہزاروں ہزار نظارے ہم روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور ہمارا دل انتہائی محبت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر تعجب ہے عیسائی کہتے ہیں کہ ہم محبتِ الٰہی اس واقعہ کی بناء پر کریں جو ہم نے نہیں دیکھا۔ اور اُن ہزاروں ہزار انعامات کی بناء پر نہ کریں جو ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے دل میں مومنوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دیگا اور ایسی محبت کرنے والوں سے خاص تعلق پیدا کریگا یہ معنے بھی مسلمانوں کے وجود سے ظاہر ہوئے۔ چنانچہ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ مسلمانوں کا خدا تعالیٰ نے ایسا ساتھ دیا اور اپنی محبت اور پیار کا اُن سے ایسا سلوک کیا کہ جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

(۳) تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں بنی نوع انسان کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دیگا۔ حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں بار بار یہی تعلیم دی ہے کہ دوسروں سے محبت کرو اور اُن سے نیکی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ مگر اس محبت کے پیدا کرنے کا یہ ذریعہ نہیں کہ مسیحؑ پر ایمان لایا جائے بلکہ حقیقی محبت بنی نوع انسان کی تب پیدا ہوتی ہے جب انسان خود اپنے آپ کو ایک رنگ میں خدا کا بیٹا سمجھ لے۔ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھنے سے یہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ محبت تب پیدا ہوتی ہے جب انسان وُدّ کا مقام حاصل کرلے۔ اور جس طرح جانور کیلے کے ذریعہ زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے جب اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اس کے بندوں کی محبت بھی اس کے دل میں لازمی طور پر جاگزیں ہو جاتی ہے صرف مسیحؑ پر ایمان لانے سے یہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۴) چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کے دل میں مسلمانوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دیگا۔ یہ بھی محبت کا ایک لازمی نتیجہ ہے کیونکہ جب کسی کی محبت ہوگی تو انسان اسکی خدمت بھی کرے گا اور اس کے ساتھ حسن سلوک بھی کریگا اور اس سے محبت اور پیار کے ساتھ بھی پیش آئے گا اور جب وہ ایسا کرے گا تو لوگوں کے دلوں میں بھی اُس کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ پس سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی محبت بنی نوع انسان کے دل میں کیلے کی طرح گاڑ دیگا۔ چنانچہ اس کی مثال ہمیں رومی فتوحات میں ملتی ہے۔ ایک موقعہ پر جب عیسائی لشکر بڑی تعداد میں آگے بڑھا اور مسلمانوں نے سمجھا کہ اب ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو جو روپیہ مسلمانوں نے ملک کی حفاظت کے ٹیکس کے طور پر

دمول کیا تھا وہ سب ملک کے لوگوں کو واپس کر دیا۔ اور اس کا اثر عیسائیوں اور یہودیوں پر اتنا ہوا کہ وہ روتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر کو وداع کرنے گئے۔ پادری بھی اور دوسرے لوگ بھی دُعا کرتے جاتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو واپس لائے۔ اور یہودی اتنے متأثر تھے کہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی قسم ہم اپنی جانیں دے دیں گے مگر عیسائی لشکر کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ محبت کا یہ عملی وعظ مسیحؑ کی محبت کی تعلیم سے کتنا زیادہ شاندار ہے۔ مسیحؑ نے تو صرف مُنہ سے کہا تھا کہ خدا محبت ہے مگر مسلمانوں نے عملاً ثابت کیا کہ خدا محبت ہے اور مسیحؑ کے لئے تو رحمت کا لفظ استعمال ہُوا تھا مگر قرآن نے مسلمانوں کے لئے وُدّ کا لفظ استعمال کیا۔ جو اس سے بہت زیادہ شدید ہے۔ کیونکہ وُدّ کے معنے ہیں کہ محبت اتنی شدید ہو گئی کہ وہ کیلے کی طرح گڑ گئی۔ بس کُجا انجیل کی محبت کی تعلیم اور کُجا قرآن کی محبت کی تعلیم۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

غور کرو کہ اس جگہ تھوڑے سے لفظوں میں خدا تعالیٰ نے کتنا وسیع مضمون بیان کر دیا ہے اس مضمون کا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ساتھ یہ جوڑ ہے کہ (۱) ایمان اور (۲) مناسب حال عمل سے لوگ محبت کرتے ہیں۔ ایمان میں چونکہ امن دینے کے معنے پائے جاتے ہیں اسلئے مومن وہ ہے جو لوگوں کے لئے برکات اور امن کا موجب ہو اور عمل صالح کے معنے ہیں ایسا عمل جو ضرورت کے مطابق اور مناسب حال ہو پس جس شخص میں یہ دو خوبیاں پائی جائیں گی کہ وہ لوگوں کے لئے امن کا باعث ہو گا اور اس کے تمام اعمال مناسب حال ہونگے اُس سے لوگ لازمی طور پر محبت کرینگے۔

(۲) پھر ایمان اور عمل صالح کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی پیدا ہو گا کہ اس کے دل میں لوگوں کی محبت پیدا ہو جائیگی۔ کیونکہ جو شخص سب سے نیک سلوک کرتا ہے لازمی طور پر اس کے دل میں بھی لوگوں کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) اور پھر جو شخص لوگوں سے حسن سلوک کریگا اور اُن کے بوجھوں کو بٹائیگا اور اُن کی ترقی میں حصّہ لیگا اور اُن کے دُکھوں کو دُور کریگا۔ لازماً اس کی محبت بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائیگی۔

(۴) اِسی طرح جو شخص بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے اس کے دل میں خدا تعالےٰ کی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ شخص جو کسی بچہ سے محبت رکھتا ہے وہ اُس کے ماں باپ سے بھی محبت کرتا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ بچے سے محبت کرے اور ماں باپ سے نفرت رکھے۔

(۵) پھر جو شخص خدا تعالیٰ کے عیال سے محبت کرتا ہے خدا تعالیٰ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

غرض ایمان اور عمل صالح کے نتیجہ میں بنی نوع انسان کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور بنی نوع انسان کی محبت کا لازمی نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ بھی اُس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں پھر جو شخص بنی نوع انسان سے محبت کے ساتھ پیش آتا ہے اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ تم یہ کس طرح کر سکتے ہو کہ ایک اچھی کتاب پڑھو تو کتاب سے تو تم محبت کرو اور کتاب لکھنے والے سے محبت نہ کرو۔ یا ایک تصویر کو تو تم پسند کرو لیکن مصوّر کو تم پسند نہ کرو۔ جو شخص بنی نوع انسان سے محبت رکھتا ہے اُس کی محبت لازمی طور پر خدا تعالےٰ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور وہ مخلوق کے بعد خالق سے بھی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی وہ

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ

پس ہم نے تو اس (قرآن) کو تیری زبان میں آسان کرکے اُتارا ہے تاکہ تو اس کے ذریعہ سے متقیوں کو بشارت دے

وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۸﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ

اور اسکے ذریعہ سے جھگڑالو قوم کو ہوشیار کرے ﴿۹۸﴾ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو ان سے پہلے گذری ہیں (کہ ہم انکو ہلاک کرچکے ہیں)

چیز ہے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں عشق مجازی کہا جاتا ہے یعنی انسانوں کی محبت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہونا۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ ظاہری حُسن کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ظاہری حُسن کے نتیجہ میں نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی محبت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور پھر جو شخص خدا تعالےٰ کے عیال سے محبت کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ بھی اس کے لئے اپنی محبت کو مخصوص کر دیتا ہے اور ان چاروں امور کے نتیجہ میں کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

۹۸ تفسیر:- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ شریعت لعنت نہیں ہم نے اِسے سُلجھے ہوئے آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے لعنت تب ہوتی جب یہ قابلِ عمل نہ ہوتی یا ہم کوئی ایسا حکم دیتے جس پر عمل کرنا لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتا۔ اگر ہم نے ایسے ہی احکام دئے ہیں جن پر عمل ہو سکتا ہے اور پھر ایسے احکام دئے ہیں جن پر عمل کرنے میں لوگوں کا اپنا فائدہ ہے تو پھر شریعت لعنت کس طرح ہوئی؟ پس يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ میں بتایا کہ ہم نے اِسے سُلجھے ہوئے آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے جس کو مومن خوب سمجھ سکتے ہیں اور اُسے قابلِ عمل یقین کرتے ہیں۔ اگر قابلِ عمل نہ ہو تو تبشیر نہیں انذار ہوتا ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو شریعت کو لعنت قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ ہاں جو جھگڑالو ہوں وہ بے شک نہیں مانتے۔ مگر وہ تو شریعت کو لعنت کہو یا رحمت بہرحال نہیں مانیں گے۔

اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم ہر صحیح الفطرت انسان کے نزدیک قابلِ عمل کتاب ہے اور وہ عمل کرنے والوں کیلئے رحمت اور بشارت ہے۔ لیکن جو شخص ارادہ کرلے کہ مَیں نے نہیں ماننا اس کے لئے آسان یا مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے تو جو چیز بھی رکھی جائے گی اس کا وہ انکار کر دے گا۔ کیونکہ اُس کی فطرت میں مخالفت ہے۔ لیکن جس کی فطرت میں کجی نہیں اور جو فطرتِ صحیحہ رکھنے والا انسان ہے وہ جانتا ہے کہ شریعت خدا تعالےٰ کی رحمت ہے۔ اور اس کے تمام احکام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ اور خدا نے اس کو آسان اور قابلِ عمل بنایا ہے۔

الثلث ع ۶ / ۹

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۹﴾ ع

کیا تو اُن میں سے کسی کو بھی کسی حِس کے ذریعہ سے محسوس کرتا ہے یا اُن کی بھنک سُنتا ہے؟ ۱۵۸

۱۵۸ حل لغات:- تُحِسُّ - حَسَّ الشَّیْءَ وَبِالشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں عَلِمَهٗ وَ شَعَرَ بِهٖ وَ اَدْرَكَهٗ - یعنی کسی چیز کو جاننا اور اُسے خوب اچھی طرح پہچاننا اور اَحَسَّ عَنْهُ خَبَرًا کے معنے ہوتے ہیں رَاٰی اُس نے دیکھا - اِس جگہ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ کے مقابلہ میں تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا کے الفاظ آئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ تُحِسُّ میں رؤیت والے معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رِكْزًا کے معنے ہیں اَلصَّوْتُ الْخَفِیُّ - ایسی آواز جو بہت آہستہ ہو -

تفسیر:- فرماتا ہے ، عیسائیوں کا سارا غرور اس وجہ سے ہے کہ اُن کو طاقت حاصل ہے - شریعت کو لعنت قرار دینا اور کفارہ وغیرہ مسائل کا ایجاد کرنا سب غلط ہے - اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ عیاشیاں کرنا چاہتے ہیں اور خدا تعالےٰ کے قانون پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ اِنہیں اپنی طاقتوں پر گھمنڈ ہے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اُن پر کبھی زوال نہیں آسکتا حالانکہ اُن کو مغرور نہیں ہونا چاہیئے ہم اُن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کر چکے ہیں - کیا آج اُن میں سے کسی قوم کے نشان تمہیں نظر آتے ہیں - یا اُن کی ہلکی سی آواز بھی سُنائی دیتی ہے؟ یعنی آج اُن کے نشان تک نظر نہیں آتے - اُنکی تاریخ تک مشتبہ ہوگئی ہے اور اُن کی آہٹ تک سُنائی نہیں دیتی - یعنی اُن کے کام بالکل مخفی ہوگئے ہیں - یہاں تک کہ اُن کے وجود کے آثار تک مٹ گئے ہیں - اگر پہلی قوموں کے لوگ اس طرح صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکے ہیں - تو ان کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری طرف سے اُن کے لئے اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ کا اعلان ہو چکا ہے - جن کے لئے عذاب مقدر ہے وہ عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد خدائے واحد پر ایمان لے آئیں گے - اور جن کے لئے عذاب مقدر نہیں بلکہ کامل تباہی مقدر ہے وہ اس طرح تباہ کر دیئے جائینگے کہ نہ وہ خود نظر آئیں گے اور نہ اُن کے آثار تک دکھائی دیں گے - ایمان غالب آجائے گا اور کفر دنیا سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا ؎

سُوْرَۃُ طٰہٰ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ طٰہٰ - یہ سورۃ مکّی ہے

وَھِیَ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ مِائَۃٌ وَّ سِتٌّ وَّ ثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً وَّ ثَمَانِیَۃُ رُکُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ کو شامل کر کے اسکی ایک سو چھتیس (۱۳۶) آیات ہیں - اور آٹھ رکوع ہیں - ؎۱

؎۱ یہ سورۃ بلا اختلاف مکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسے ابتدائی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جو سورتیں میں نے حفظ کیں اُن میں سے ایک یہ بھی سورۃ ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے سورۂ بنی اسرائیل، کہف، مریم اور انبیاء کو بھی گنا ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

وہیری نے اِسے مکی زندگی کے تیسرے دَور یعنی قبل از ہجرت کے سالوں میں شمار کیا ہے، کیونکہ اس میں انبیاء بنو اسرائیل کے ذکر تفصیل سے آئے ہیں، روایت اور تاریخ کی موجودگی میں محض انبیاء کے ذکر کی وجہ سے جو سورۂ مریم میں بھی موجود ہے اور جسے ابتدائی کہا جاتا ہے اسے آخری زمانہ کی مکی قرار دینا بہت بڑی جرأت ہے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو ابتدائی صحابی ہیں اس سورۃ کو ابتدائی ابتدائی یاد کی ہوئی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں۔

تعلق و ترتیب اس سورۃ کا سورۃ مریم سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۃ مریم کے آخر میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۔ یعنی یہ کلام تجھ پر تیری زبان میں اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تُو آسانی سے اپنے گرد وپیش کے لوگوں کو تبلیغ کر سکے اور وہ تیری بات کو سمجھ سکیں اور شریروں پر حجت تمام ہو۔

سورۃ طٰہٰ مکی ہے

اسکا مضمون کو اس سورۃ کے شروع میں پھیلایا گیا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ سورۂ مریم اصولی طور پر مسیحیت کے بارہ میں ہے جس کا ایک نقطۂ مرکزی یہ ہے کہ شریعت لعنت ہے۔ اس سورۃ میں اس مرکزی نقطہ کا ردّ کیا ہے اور بتایا ہے کہ شریعت رحمت ہوتی ہے لعنت نہیں۔ وہ بوجھ نہیں ہوتی بلکہ انسان کے لئے سہولت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى یعنی قرآن کا نزول تجھے عزت بخشنے اور خدا تعالیٰ کا سپرد کردہ کام آسان کرنے کے لئے ہے۔ تجھے تکلیف اور دُکھ میں ڈالنے کے لئے نہیں۔ اسلئے لفظاً و معناً ہر قسم کی سہولتیں اس کتاب کے نزول میں مدنظر رکھی گئی ہیں۔ زبان تیری اپنی ہے عبارت سلیس ہے، مطلب مطابق فطرت وعقل ہے اور عمل آسان ہے۔ غرض ہر رنگ میں اس کتاب کو بوجھ ہونے سے بچایا گیا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کا سورۃ مریم سے تعلق۔

اس سورۃ کا وسیع تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ سورۃ مریم میں مسیحیت کی ابتدائی تاریخ بیان کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ مسیحؑ کی آمد تو توحید کے قیام کے لئے تھی مگر مسیحیوں نے اُسے شرک کا ذریعہ بنا دیا اور شریعت کو اُڑا دیا اور اُسے لعنت قرار دے دیا۔ اب سورۃ طٰہٰ میں ابتدائے اسرائیلیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ

موسیٰؑ کا بڑا کارنامہ اُس کی شریعت تھی۔ چنانچہ موسوی
سلسلہ کی طرف اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل
سے توجہ دلائی اور بتایا کہ موسوی سلسلہ شریعت
اور توحید پر قائم تھا۔ اُس کی شاخ عقلاً توحید کے
خلاف نہیں ہو سکتی۔ پس توحید کے خلاف مسیحی تعلیم
بعد کی داخل شدہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے ابتدائے آفرینش تک
شریعت اور گناہ کی حقیقت بیان کرنے کیلئے مضمون
لے گیا ہے جس کا نہ سمجھنا درحقیقت لاشریعت اور
شرک مسیحی کی جڑ اور منبع ہے۔ لاشریعت کی اسلئے
کہ اگر ابتدائے عالم سے وحی کو جاری نہ سمجھا جائے
تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کسی زمانہ میں بغیر
شریعت کے بھی رہ سکتا ہے۔ اور شرک کا منبع
اس لئے کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں
آئی تو پھر انسان کو کوئی قانون اپنے لئے بتانا پڑیگا
اور وہی خدا کا قائم مقام ہو جائیگا یعنی خدا کا شریک
بن جائیگا۔

سورۃ طٰہٰ کے مضامین کا خلاصہ

خلاصہ مضامین

اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن آسانیاں
پیدا کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ تکلیف میں ڈالنے
کے لئے۔ اس کا سمجھنا آسان ہے مگر دل کی کھڑکی
کھولنی ضروری ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کے ادنیٰ
اور اعلیٰ احساسات اور ان کی تمام ضرورتوں کا ذکر ہے
اور خدا تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے انسانی پیدائش
میں یہ بات مدنظر رکھی تھی کیونکہ وہ فطرت کے باریک
رازوں سے واقف ہے اور ہر قسم کی ضرورتوں کے
سامان مہیا کرنے اس کے اختیار میں ہیں۔ پس جو
قانون خدا تعالیٰ دے وہ عذاب نہیں بلکہ رحمت
ہے (آیت ۳ تا ۹)

مسیحیوں کو چاہیئے کہ ان صداقتوں کے سمجھنے
کے لئے موسیٰؑ کے حالات پر غور کریں اور سوچیں کہ
کس طرح مایوسی کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اُسکی
مدد کی اور اُسے ہدایت بخشی اور اُس پر اپنا وجود
ظاہر کیا جو توحید کے رنگ میں ہی تھا۔ غرض موسیٰؑ
کو برگزیدہ بنایا گیا اور وہ وحیٔ الٰہی کا حامل ہوا اور
اُسے سب سے پہلا حکم شریعت توحید کا ہی دیا گیا
اور کہا گیا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا یعنی تمام جہان میں صرف
مَیں ہی ایک معبود ہوں۔ اور عبادتِ الٰہی کی تاکید
کی گئی اور بُرے بھلے عمل کی جزا و سزا کا وعدہ دیا گیا
اور بتایا گیا کہ جزا و سزا مطابق اعمال ہوگی نہ کہ
مطابق کفارہ (آیت ۱۰ تا ۱۶)

پھر موسیٰؑ کو بتایا گیا کہ اصلاح قوم کا حقیقی
ذریعہ صحبتِ صلحاء ہے (آیت ۱۷ تا ۲۴)

پھر فرماتا ہے۔ ہم نے موسیٰؑ کو اس کی قوم
کے لئے صحیح ذریعۂ اصلاح بتا کر اُسے فرعون کی طرف
جانے کا حکم دیا اور اس کے لئے دُعا کا طریق
سکھایا جو خدا تعالیٰ سے کی جاتی ہے نہ کہ کسی غیر اللہ
سے اور اس کے بھائی کو اس کی درخواست پر اس
کے ساتھ مقرر کیا اور خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا
دوسرا احسان ہے۔ پہلا احسان وہ تھا کہ فرعونیوں
سے بچانے کے لئے تجھے دریا میں ڈالا گیا اور مَیں نے
تجھے اس سے نجات دلوائی اور تیرے رشتہ داروں
کو تیرے پاس جمع کر دیا (آیت ۲۵ تا ۴۱)

پھر جب تیری جنگ فرعونی حکومت سے
چھڑی تو ہم نے تجھے بچایا اور تجھے نجات دی۔ اور
مَیں تیری روحانی پرورش کرتا رہا یہاں تک کہ تُو
اصل کام کے قابل ہو گیا اور ہم نے کہا اَب جا
اور فرعون کو سمجھا اور اپنی قوم کو اُس سے لے کر

کنعان کے ملک کی طرف لے جا۔ چنانچہ وہ گئے اور فرعون کو سمجھایا (آیت ۴۱ تا ۷۷)

جب فرعون نے نہ مانا تو ہم نے موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے نکال لے جانے کا حکم دے دیا۔ فرعونؔ نے پیچھا کیا مگر سزا پائی (آیت ۷۸ تا ۸۰)

پھر طُور پر کلام الٰہی کا سلسلہ شروع ہُوا۔ اور شریعت نازل ہوئی اور توبہ کا دروازہ کھولا گیا (آیت ۸۱ تا ۸۳)

مگر باوجود اس کے بنی اسرائیل نے شرک کیا۔ جس پر انکو سزا ملی اور توحید کی طرف اُن کو کھینچ کر لایا گیا (آیت ۸۴ تا ۹۹)

یہ مسیحؑ سے پہلے کے مذہبی حالات ہیں اور بعد میں تُو آیا ہے۔ تُو بھی وہی تعلیم لایا ہے۔ پھر یہ درمیان میں بے جوڑ تعلیم کیسی آگئی جو شریعت کو لعنت کہتی ہے اور خدا کے شریک قرار دیتی ہے (آیت ۱۰۰ تا ۱۰۲)

اس کے بعد مسیحیوں کے عذاب اور انکی ہزار سالہ ترقی کا ذکر کیا۔ یعنی چوتھی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک جس میں سے تین صد اعلےٰ ترقی کے سال ہونگے جس طرح مسلمانوں کے ہزار سال میں تین صد اعلےٰ ترقی کے سال تھے۔ اس فرق سے کہ مسلمانوں کے پہلے تین صد اعلےٰ تھے اور مسیحیوں کے آخری تین صد اعلےٰ ہونگے اور اس فرق سے کہ عیسائیوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے چھ سو سال مذہب کے قیام کے ملے اور مسلمانوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سو سال گذرنے کے بعد چھ سو سال اسلام کے روحانی استحکام کے ملیں گے (آیت ۱۰۴ و ۱۰۵)

فرماتا ہے۔ اُس وقت لوگ سوال کریں گے کہ یہ پہاڑ اُڑینگے کس طرح؟ یعنی یہ عیسائی حکومتیں جو اتنی زبردست ہوگئی ہیں کس طرح تباہ ہونگی؟ مگر ہم بتلاتے ہیں کہ وہ اُڑ جائیں گے اور مسلمان ترقی پاجائینگے (آیت ۱۰۶ تا ۱۱۳)

اس کے بعد پھر ابتدائے سورۃ کے مضمون کی طرف رجوع کیا کہ اس قرآن کا سمجھنا آسان ہے کیونکہ یہ قرآن ملکی زبان میں ہے (غالباً مسیحیوں کو طعنہ ہے جو انجیل کے یونانی میں ہونے پر زور دیتے ہیں) اور پھر اس میں مضمون بھی خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے اس لئے تمثیل والی مصیبت سے محفوظ ہے جس کا کثرت سے اور مبالغہ آمیز طور پر استعمال انجیل میں کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بھی مَثَل کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ (بنی اسرائیل ۶ع) اور یہی مضمون سورۃ کہف رکوع ۸ میں بھی بیان ہُوا ہے۔ مگر وہاں مَثَل کا لفظ تمثیل کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ بیان کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں ہر قسم کے مضامین مختلف پیرایوں میں عمدگی کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں (آیت ۱۱۴)

پھر بتایا کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے اس لئے احکامِ سماوی کے متعلق خود فیصلے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ وحی کا انتظار کرنا چاہیئے (آیت ۱۱۵)

اس کے بعد موسیٰؑ سے اوپر عروج کیا اور بتایا کہ آدم کا وہ واقعہ جس پر مسیحیت کی ساری بنیاد ہے محض ایک غلط فہمی ہے اس سے زیادہ اسکی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے زیادہ حقیقت ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ آدم جس سے یہ واقعہ پیش آیا تھا اُس کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سکیم کے ماتحت تھی پھر کس طرح ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ کی سکیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰہٰ ﴿۲﴾

اے کامل قوتوں والے مرد! ؎۲

ناکام ہو جاتی۔ چنانچہ بائیبل میں بھی لکھا ہے کہ:۔

"خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"

(پیدائش باب ۱ آیت ۲۷)

لیکن ساتھ ہی بائیبل یہ بھی کہتی ہے کہ آدم نے حوّا کے ورغلانے پر گناہ کیا (پیدائش باب ۳ آیت ۱۲) اس کے مقابلہ میں قرآن کہتا ہے کہ آدم نے گناہ نہیں کیا بلکہ صرف ایک لغزش تھی جو بغیر ارادہ کے اُس سے ظہور میں آئی۔ جیسا کہ فرماتا ہے کہ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا (طٰہٰ ع ۷) پس قرآن کریم کا مضمون عقل کے بھی مطابق ہے اور بائیبل کے بھی اس بیان کے مطابق ہے کہ آدم کو خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا۔ لیکن بائیبل کا بیان آپس میں تضاد رکھتا ہے۔ بائیبل نے پہلے خود کہا کہ آدم خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس کے افعال کو شیطانی قرار دے دیا حالانکہ اگر آدم نے فی الواقعہ گناہ کیا تھا تو درحقیقت خدا تعالیٰ کی سکیم فیل ہوئی اور نعوذ باللہ اس کی کمزوری ثابت ہوئی (آیت ۱۱۶ تا ۱۲۴)

طٰہٰ مقطعات میں سے نہیں ہے

پس شریعت سے مونہہ موڑنا تباہی کا موجب ہے اور وہی ایسا کرتا ہے جو بینائی سے محروم ہوتا ہے۔ (آیت ۱۲۵ تا ۱۲۹)

پھر بتایا کہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ صداقت کے منکر بھی دنیا میں موجود ہیں اور انہیں سزا نہیں مل رہی۔ آسمانی قانون کے مطابق ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے تو اپنے لوگوں کی اصلاح میں لگا رہ۔ انجام کار تیری ہی فتح ہوگی (آیت ۱۳۰ تا ۱۳۳)

اس کے بعد فرمایا کہ جب تیرے دلائل لوگ سُنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نشان کیوں نہیں دکھلاتے؛ تُو کہہ کہ نشان وہی ہے جو پہلے نبیوں نے دکھایا۔ تمہارے تجویز کردہ نشان کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ پہلے نبیوں کے دشمنوں کو بھی مہلت ملی تھی مگر حجت تمام ہونے پر عذاب آیا۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ ورنہ خدا تعالیٰ پر ظلم کا الزام عائد ہوتا ہے (آیت ۱۳۴ تا ۱۳۶)

؎۲ تفسیر۔ ہم نے سورۃ یونس کی تفسیر کے ابتداء میں قرآنی مقطعات پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ طٰہٰ بھی حروف مقطعات میں سے ہے لیکن بعد میں لغت اور مفسرین کے اقوال پر اور اس سورۃ کے مضامین پر مزید غور سے معلوم ہوا کہ چونکہ حروف مقطعات کی طرح طآء اس جگہ کسی مستقل لفظ کا قائم مقام نہیں اور نہ ھآ اس جگہ کسی اور مستقل لفظ کی قائم مقام ہے بلکہ ھا، طاء کے ساتھ مل کر ایک مستقل معنے دیتی ہے اور وہ معنے یَا رَجُلُ کے ہیں اس لئے اسے ایک مستقل لفظ قرار دینا چاہیئے۔ حروف مقطعات میں سے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے کہ اِنَّھَا بِمَعۡنٰی یَا رَجُلُ فِیۡ لُغَۃِ عُکۡلٍ وَفِیۡ لُغَۃِ عَکٍّ قَالَ الۡکَلۡبِیُّ لَوۡ قُلۡتَ لِرَجُلٍ مِّنۡ عَکٍّ یَا رَجُلُ لَمۡ یُجِبۡ حَتّٰی تَقُوۡلَ طٰہٰ وَقَالَ قُطۡرُبُ ھِیَ کَذٰلِکَ فِیۡ لُغَۃِ طَیٍّ۔ (تفسیر فتح البیان جلد ۶ صفحہ ۴۹) یعنی عکل اور عکّ

جو قبائل عرب میں سے ہیں اُن کی زبان میں طٰہٰ کے معنے یَا رَجُلُ کے ہیں۔ کلبی کہتے ہیں کہ اگر تم کسی عکّ قبیلہ کے شخص کو یَا رَجُلُ کہہ کر پکارو تو وہ بالکل جواب نہیں دیگا ہاں اُسے طٰہٰ کہو تو وہ بول پڑے گا قطرب جو ایک مشہور لغوی اور نحوی ہیں اور سیبویہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ یہ لفظ طے قبیلہ میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ لسان العرب میں بھی اس استعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ پس طٰہٰ کے معنے عرب کے مختلف قبیلوں میں چونکہ "اے مرد کامل القوٰی" کے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے طٰہٰ کا ترجمہ اسی نظریہ کے ماتحت کیا ہے اور اسی نظریہ کے ماتحت اب ہم سورۂ طٰہٰ کو سورۂ مریم کے مضمون کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

کامل قوتوں والے مرد سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مردانگی کی تمام اعلیٰ صفات یعنی شجاعت اور سخاوت اور بدی کا مقابلہ وغیرہ کامل طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے تمام عالمِ انسانی میں صرف آپ ہی کامل انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حقیقۃً ایک کامل انسان تھے اور آپ میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے جو ایک کامل قوتیں رکھنے والے مرد کے اندر پائے جانے چاہئیں۔ مثلاً بدی کے مقابلہ کی قوت کو ہی لے لو۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو آپؐ کے پاکیزہ و مطہر قلب میں ہمیں بدی کے مقابلہ کی اس قدر شدید تڑپ دکھائی دیتی ہے کہ جس کی دنیا میں اور کہیں نظیر نظر نہیں آتی۔ آپؐ ابھی نبوت کے مقام پر فائز بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپؐ نے اس فطری جذبہ کے مطابق اس راستہ کی تلاش اور جستجو شروع کر دی جس پر چل کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا عرفان حاصل ہو سکتا ہو۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ آپ کا گرد و پیش سارے کا سارا کفر اور شرک سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو شرک اور بُت پرستی میں مبتلا نہ ہو۔ ایک طرف آپ کے ملنے والے عیسائی اور یہودی لوگ تھے جو شرک میں مبتلا ہو چکے تھے اور دوسری طرف مکہ کے لوگ تھے جو سرتاپا شرک میں ملوّث تھے۔ آپ نے اِن تینوں قوموں کو دیکھا اور آپ کو محسوس ہُوا کہ اِن قوموں کے اندر معرفت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کفارِ مکّہ شرک کے اندر سر سے پاؤں تک غرق تھے یہاں تک کہ خانہ کعبہ کے اندر بھی تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔ ادھر یہودی اور عیسائی بھی شرک میں مبتلا تھے اور خدا کا خانہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ یہودی لوگ یوں تو زبان سے شرک کے قائل نہ تھے مگر وہ ایک نبی کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہی آتا ہے کہ یہودی کہتے تھے عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (توبہ عٓ) یعنی عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ بہرحال یہ تینوں قومیں یعنی کفارِ مکّہ اور یہودی اور عیسائی خدا تعالیٰ کی معرفت اور صداقت پر قائم نہ تھیں۔ یہود کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کی نافرمانیوں اور مخالفت کی وجہ سے مجرم قرار دے دیا تھا۔ پس وہ قوم جو مجرم قرار پا چکی تھی وہ کس طرح کسی کی رہنمائی کر سکتی تھی۔ عیسائی مشرک تھے کیونکہ وہ ایک خدا کی بجائے تین خدا مانتے تھے۔ اور مکّہ والے بُت پرست تھے۔ پس جب آپؐ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور تفرید ان تینوں قوموں کے اندر مفقود ہے اور یہ سارے کے سارے کفر اور شرک کے تاریک گڑھوں میں گر چکے ہیں تو آپؐ کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ مَیں کوئی ایسا رستہ تلاش کروں جو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہو۔ یہ تڑپ آپ پر اتنی غالب آئی کہ آپ کو دنیا سے نفرت ہو گئی۔

طٰہٰ کے لفظ سے آنحضرتؐ کے کامل ہونے کی طرف اشارہ

اور آپ نے اپنے گردوپیش کے شرک سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے ان لوگوں کی مجالس میں شرکت سے پرہیز کرنا شروع کر دیا جو دن رات بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ مگر چونکہ آپ کے چاروں طرف ایسے لوگ بستے تھے جو بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے اور بتوں کی تعریف میں شعر کہتے تھے اور اُن سے کلّی علیحدگی ایک ناممکن امر تھا اس لئے آپ نے ارادہ کیا کہ کہیں الگ ہو کر خدائے واحد سے مدد طلب کی جائے تاکہ اس کی طرف سے ہدایت کے سامان پیدا ہوں۔ چنانچہ آپ حضرت خدیجہؓ سے کئی کئی دن کا کھانا ساتھ لیکر مکہ سے باہر تین چار میل کے فاصلہ پر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ اس زمانہ میں اور تو کوئی خاص کھانا نہ ہوتا تھا۔ صرف کچھ کھجوریں، ستو اور سوکھا گوشت آپ اپنے ساتھ لے جاتے اور متواتر کئی کئی دن اس غار میں عبادتِ الٰہی اور دعاؤں میں مشغول رہتے تاکہ آپ کو اور دوسرے بنی نوع انسان کو وہ رستہ مل جائے جو خدا تک پہنچاتا ہے۔ یہ تڑپ جو آپ کے دل میں پیدا ہوئی ایک غیر معمولی تڑپ تھی۔ اور پھر یہ ایسی تڑپ تھی جس میں کسی انسانی مدد کا کوئی سوال نہ تھا کیونکہ دنیا کا کوئی انسان اس میں آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتا تھا۔ دوسرے کاموں میں تو عزیزوں اور دوستوں کی مدد کام دے سکتی ہے یا روپیہ کام دے سکتا ہے لیکن اِس کام میں کوئی انسانی طاقت آپ کی مدد نہ ہو سکتی تھی۔ اگر تو آپ کے زمانہ میں کوئی مذہب حقّہ موجود ہوتا تو اُسکی مدد ایک ذریعہ بن سکتی تھی۔ مگر آپ کے زمانہ میں کوئی مذہب حقّہ موجود نہ تھا اور تمام کی تمام قومیں شرک میں مبتلا تھیں اس لئے وحدانیت کی تلاش کی تڑپ ایک ایسی چیز تھی جس میں سوائے خدا تعالیٰ کے دنیا کی کوئی طاقت آپ کی مدد نہ کر سکتی تھی۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی وفادار اور غمگسار بیوی تھیں مگر وہ بھی اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھیں آپ کے دوست بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ آپ کے اقرباء بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ عیسائی راہب بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ اور مکہ کے کاہن بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے بلکہ وہ تو خود گم گشتہ راہ تھے انہوں نے آپ کی کیا مدد کرنی تھی ان سب سے بہتر خود آپ کی اپنی فطرت تھی جو بچپن سے ہی ایسی تھی کہ شرک سے سخت متنفر تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے چچا زید بن عمرو جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں ہی شرک چھوڑ دیا تھا اور جو اپنے آپ کو شرک کے خلاف ایک بڑے مقام پر سمجھتے تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ گفتگو کے بعد آپ نے اُن سے فرمایا کہ آؤ کھانا کھا لو۔ اس پر زید نے کہا۔ مَیں مشرکوں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا کرتا۔ یہ سُنکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَیں نے کبھی شرک نہیں کیا۔ مگر زید نے تو یہودیوں کی صحبت میں رہ کر شرک کی تھوڑی بہت مخالفت سیکھی تھی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں پیدائشی طور پر یہ بات موجود تھی۔ یوں احکام الٰہی اور شریعت کی تفاصیل الہام الٰہی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوئیں لیکن جہاں تک توحید سے محبت اور شرک سے انتہائی نفرت کا سوال ہے یہ چیز بچپن سے ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں موجود تھی۔ آپ اتنا تو جانتے تھے کہ خدا ایک ہے اور ایک ہی ہونا چاہیئے لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے اور معرفت کے حصول کے لئے رستہ کونسا ہے یہ آپ کو معلوم نہ تھا۔ اسی چیز کی تلاش میں آپ غارِ حرا میں عبادت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ اپنے معمول کے مطابق عبادت الٰہی میں مشغول تھے کہ خدا تعالیٰ کا فرشتہ آپ پر ظاہر ہوا اور اس نے کہا اِقْرَأْ یعنی پڑھ۔

آپ نے فرمایا۔ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ یعنی مَیں تو پڑھ نہیں سکتا فرشتے نے یہ سُنا تو آپ کو زور کے ساتھ اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور چھوڑ کر پھر کہا اِقْرَاْ۔ مگر آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ فرشتہ نے پھر آپ کو پکڑا اور زیادہ زور کے ساتھ سینہ سے لگا کر بھینچا اور چھوڑ کر کہا اِقْرَاْ۔ مگر آپ نے پھر فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ اسپر فرشتہ نے تیسری بار پھر آپ کو پکڑا اور نہایت زور کے ساتھ سینہ سے لگا کر بھینچا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے دنیا کی تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے اور جس نے انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ ہم پھر تجھے کہتے ہیں کہ پڑھ۔ تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ سکھایا ہے اور اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ (بخاری باب بدء الوحی)

یہ آیات آپ پر پہلے دن غارِ حرا میں نازل ہوئیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا کہ اَب آپ کو وہ علوم عطا کئے جانے والے ہیں جو اس سے پہلے دنیا میں کوئی انسان نہیں جانتا۔ اس جگہ اللہ تعالےٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تجھے وہ علوم عطا کریں گے جن کو انسان بھول چکا ہے۔ بلکہ فرمایا۔ ہم تجھ پر وہ علوم ظاہر کریں گے جن کو پہلے کوئی نہیں جانتا اگر اللہ تعالےٰ یہ فرماتا کہ مَیں تجھے وہ علوم عطا کرونگا جو انسان بھول چکا تھا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ مَیں تجھے وہ علم اور ہدایت دے رہا ہوں جو مَیں نے ابراہیمؑ کو دی تھی اور اب انسان اس کو بھول چکا ہے یا مَیں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو مَیں نے نوحؑ کو دیئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ یا مَیں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو مَیں نے موسیٰؑ کو دیئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ یا مَیں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو مَیں نے عیسیٰؑ کو دئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے [illegible]یں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو مَیں نے اور انبیاء [illegible]ئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ بلکہ اس نے یہ فرمایا کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ مَیں تجھے وہ علوم عطا کرنے والا ہوں جو نہ آدمؑ کو ملے نہ ابراہیمؑ کو ملے نہ موسیٰؑ کو ملے نہ عیسیٰؑ کو ملے اور نہ کسی اور نبی کو ملے۔ پس درحقیقت ان پہلی آیتوں میں ہی اللہ تعالےٰ نے بتا دیا تھا کہ آپ خاتم النبیین کے مقام پر فائز ہونے والے ہیں اور آپ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسی تعلیم ملنے والی ہے جو پہلے کسی نبی کو حاصل نہیں تھی۔ گویا طٰہٰ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس کی طرف اس ابتدائی الہام میں بھی اشارہ کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ آپ رُوحانی نقطۂ نگاہ سے اپنے اندر کامل قوتیں رکھنے والے ہیں اور اسی وجہ سے آپ کو ایک کامل اور غیر متبدل تعلیم عطا کی جانے والی ہے۔

اب اس کے بعد ایک اور مرحلہ شروع ہوا جس نے ثابت کر دیا کہ آپ حقیقۃً طٰہٰ تھے اور ایک کامل انسان میں جسقدر اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سب کے سب آپ میں پائے جاتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِقْرَاْ یعنی جا اور دنیا کو میرا پیغام پہنچا دے تو یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جا اور فرعون تک میرا پیغام پہنچا دے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھبرا کر کہا کہ

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (طٰہٰ ع ۲) اے خدا یہ ایسا بوجھ نہیں جس کو مَیں اکیلا برداشت کرسکوں اس لئے میری مدد کے لئے میرے ہی اہل میں سے ایک آدمی میرے ساتھ مقرر کردیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کہا۔ بلکہ جب اللہ تعالےٰ نے آپ سے کہا کہ جا اور دنیا تک میرا پیغام پہنچا دے تو آپ نے اکیلے ہی اس بوجھ کو برداشت کرلیا اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ آپ نے گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ کو یہ تمام واقعہ سُنایا اور پھر کہا لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ یعنی خدا تعالےٰ نے ایک بہت بڑا کام میرے سپرد کیا ہے۔ مَیں ڈرتا ہوں کہ مَیں اس عظیم الشان کام کو سرانجام بھی دے سکونگا یا نہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی پاکیزہ زندگی کی شاہد تھیں انہوں نے یہ سُنتے ہی کہا کَلَّا وَاللّٰہِ لَا یُخْزِیْكَ اللّٰہُ اَبَدًا۔ نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کریگا۔ اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ کیونکہ آپ ہمیشہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اخلاق فاضلہ جو دنیا سے مٹ چکے ہیں اُن کو ازسرِنو قائم کر رہے ہیں اور ہمیشہ مہمان نوازی کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص بغیر کسی شرارت کے مصیبت میں پھنس جائے تو آپ اس کی اعانت فرماتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان اوصاف رکھنے والے انسان کو خدا چھوڑ دے (بخاری باب بدء الوحی)

دنیا میں انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کی سب سے بڑی گواہ اس کی بیوی ہوتی ہے جو رات دن اس کے حالات کو دیکھتی رہتی ہے۔ پس یہ گواہی سب سے زیادہ معتبر گواہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم واقعہ میں طٰہٰ تھے۔ یعنی ایک کامل مرد میں جو فضائل اور اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سب کے سب آپ میں اپنی پوری شان کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ چنانچہ جب ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی پر تفصیلی طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے آپ میں وہ تمام اوصاف ودیعت فرما دئے تھے جو ایک کامل القویٰ مرد میں پائے جانے چاہئیں۔ تاکہ آپ ہر قسم کے لوگوں کے لئے نمونہ بن سکیں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی ایک اعلیٰ درجہ کے نبی تھے۔ لیکن وہ ہر زمانہ اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے نمونہ نہیں تھے۔ مثلاً انجیل سے آپکی شادی ثابت نہیں۔ اس لئے شادی شدہ لوگوں کی متاہلانہ زندگی میں آپ کوئی راہنمائی نہیں کرسکتے۔ اسی طرح آپ بادشاہ نہیں ہوئے کہ آج بادشاہ یہ کہہ سکیں کہ مسیحؑ ہمارے لئے بھی نمونہ ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایسے حالات میں سے گذرے جن کے نتیجہ میں آپ دنیا کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک بے مثال نمونہ بن گئے اور پھر زندگی کے ہر مرحلہ میں آپ نے اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور بلند کردار کا اظہار کرکے ثابت کردیا کہ آپ کے اندر کامل روحانی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے والد آپ کی پیدائش سے قبل ہی فوت ہوچکے تھے اور بہت چھوٹی عمر میں آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔

مگر دادا کی زیرِ نگرانی جو باپ کا قائم مقام تھا آپ نے بتا دیا
کہ اخلاق کیسے ہونے چاہئیں۔ یتیم کی حالت دو قسم کی
ہوتی ہے۔ یا تو بچہ بہت ہی سر چڑھ جاتا ہے یا بہت
ہی پژمردہ رہنے لگتا ہے۔ اگر اس کے نگران ایسے لوگ
ہوں جو اس کی دلجوئی کے خیال سے ہر وقت پیار ہی
کرتے رہیں تو اس کی اخلاقی حالت بہت ہی گر جاتی ہے
اور اگر وہ ایسے لوگوں کی تربیت میں ہو جو سمجھیں کہ
ہمارا بچہ تو یہ ہے ہی نہیں تو یتیم کی ہمت ٹوٹ جاتی
ہے مگر بچپن میں ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا
نمونہ ایسا اعلیٰ تھا کہ آپ کے ہمجولی بیان کرتے ہیں
کہ گھر میں کسی چیز کے لئے آپ چھینا جھپٹی نہیں کرتے تھے
بلکہ وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے حتیٰ کہ چچی
خود بلا کر آپ کا حصّہ دیتیں پھر آپ وقار کے ساتھ ہی
اس کا استعمال کرتے۔ آپ کی رضاعی والدہ کا بیان
ہے کہ آپ میں ایسی سعادت تھی کہ بچے بھی حیران
رہ جاتے تھے۔ رضاعی بھائی بیان کرتے ہیں کہ آپ
لغو کھیلیں نہیں کھیلتے تھے۔ مذاق کر لیتے تھے مگر
جھوٹی باتوں سے سخت نفرت تھی۔ اس زمانہ میں
ایسی ہمدردی آپ کے اندر پائی جاتی تھی کہ چھوٹے
بچے بھی آپ کو اپنا سردار سمجھتے تھے۔ پھر جس قسم کا
حسن سلوک آپ نے ابو طالب اور اپنی چچی سے کیا
ہے اس کی نظیر سگے بیٹوں میں بھی نہیں ملتی۔ فتح مکّہ
کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ!
آپ کس مکان میں ٹھہریں گے۔ اس پر آپ نے بغیر
کسی قسم کے غصّہ کے فرمایا۔ عقیل نے کوئی مکان
باقی چھوڑا ہے کہ اس میں ٹھہریں۔ یعنی چچا زاد
بھائیوں نے سب مکان بیچ دیئے ہیں۔ اب ہمارا
کونسا مکان ہے جس میں ہم ٹھہریں۔ پھر آپ نے
نہ صرف باپ کی محبت کو ابو طالب کے متعلق قائم
رکھا بلکہ دوسروں کو بھی تعلیم دی کہ ماں باپ کو اُف
بھی نہ کہو۔

اس کے بعد آپ جوان ہوئے۔ لوگ اس عمر
میں کیا کچھ نہیں کرتے۔ عرب میں اس وقت کوئی
قانون نہ تھا۔ کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا۔ لوگ
اس پر فخر کرتے تھے کہ ہمارا فلاں کی عورت یا لڑکی
سے ناجائز تعلق ہے۔ اس ماحول میں رہنے والے
نوجوانوں سے کوئی شخص بلند کردار کی توقع نہیں
کر سکتا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
ایسی گندی فضا کے باوجود جوانی میں ایسا اعلیٰ نمونہ
دکھایا کہ لوگ آپ کو امین اور صدوق کہتے تھے۔ یہ
کہنا کہ آپ جھوٹ نہ بولتے تھے آپ کی ہتک ہے۔
کیونکہ آپ صداقت کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھے کہ جس کی
نظیر نہیں ملتی۔ اور صداقت کا مقام جھوٹ نہ بولنے
سے اوپر ہے۔ پس آپ کا یہی کمال نہیں کہ آپ جھوٹ
نہیں بولتے تھے بلکہ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ صدوق
کہلاتے تھے۔ آپ کے کلام میں کسی قسم کا اخفا اور
پردہ دری یا فریب نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ
آپ جو کچھ کہہ دیتے تھے لوگ اُسے تسلیم کر لیتے
آپ نے اہل مکّہ سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس
پہاڑ کے پیچھے ایک بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے
والا ہے تو کیا تم یقین کر لوگے۔ سب نے کہا ہاں
ہم مان لیں گے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ شعراء) حالانکہ
ویران علاقہ تھا اور صفا اور مروہ پر چڑھ کر دُور دُور
نظر جاتی تھی۔ ایسی حالت میں آپ کی بات ماننے کے
صاف معنے یہی تھے کہ وہ اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھتے
حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوتے کہ کوئی لشکر نہیں مگر
وہ سب کے سب اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھنے کے لئے
تیار تھے لیکن یہ کہنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ آپ

غلط کہہ رہے ہیں اور جب سب نے یہ اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا۔ خدا نے مجھے تمہاری ہدایت و اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔

پھر آپ کی صداقت کے متعلق ایک شدید ترین دشمن کی گواہی موجود ہے۔ اہلِ مکّہ کو جب خیال ہُوا کہ حج کے موقعہ پر لوگ جمع ہونگے تو ممکن ہے آپ اُن میں سے بعض کو اپنے ساتھ ملا لیں تو وہ لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے۔ کسی نے کہا یہ مشہور کر دو کہ یہ شاعر ہے۔ کسی نے کہا یہ مشہور کر دو کہ یہ مجنون ہے۔ اتنے میں ایک شخص بولا اور کہنے لگا اس میں گھبراہٹ کی کونسی بات ہے۔ ہم کہہ دینگے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اِس پر انہی میں سے ایک مخالف نضر بن الحارث بڑے جوش سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان جوان ہُوا اس کے اخلاق تم سب سے زیادہ اچھے تھے۔ وہ تم سب سے زیادہ راستباز تھا۔ وہ تم سب سے زیادہ امین تھا مگر جب تم نے اس کی کنپٹیوں میں سفید بال دیکھے اور وہ تمہارے پاس وہ تعلیم لیکر آیا جس کا تم انکار کر رہے ہو تو تم نے کہہ دیا کہ وہ جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم! وہ ہرگز جھوٹا نہیں۔ (شفاء قاضی عیاض)

پھر ہم آپ کی زندگی کے اخلاقی پہلو اور غرباء کی امداد کو لیتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

مکّہ کے بعض اشخاص نے مل کر ایک ایسی جماعت بنائی تھی جو غریب لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے اور چونکہ اس کے بانیوں میں سے اکثر کے نام میں فضل آتا تھا اس لئے اسے حلف الفضول کہا جاتا تھا۔ اِس میں آپ بھی شامل ہوئے۔ یہ زمانۂ نبوت سے بہت پہلے کی بات ہے۔ بعد میں صحابہؓ نے ایک دفعہ اِس کے متعلق دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہ تحریک جو مظلوموں کی امداد اور غرباء کے حقوق کے لئے جاری کی گئی تھی مجھے ایسی پیاری تھی کہ اگر آج بھی مجھے کوئی شخص اس کی طرف بلائے تو مَیں اسمیں شامل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ گویا غرباء کی امداد کے لئے دوسروں کی ماتحتی سے بھی آپ کو کوئی عار نہیں تھا۔

پھر آپ نے جب حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تو اس وقت آپ کے پاس کوئی مال نہ تھا۔ بعض لوگوں نے روایت کی ہے کہ آپ کے والد نے چند بکریاں اور ایک دو اونٹ آپ کے لئے چھوڑے تھے (طبقات ابن سعد) مگر یہ جائیداد ایسی قلیل تھی کہ اسکا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامل قوتوں کے ساتھ پیدا فرمایا تھا اور آپ صحیح معنوں میں طٰہٰ کے مصداق تھے۔ اس لئے آپ کی طبیعت میں حرص بالکل نہ تھی اور سیر چشمی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ آپ کی قوم نے آپ کو امین کا خطاب دے دیا اور آپ کی دیانت و امانت کا سکّہ تسلیم کر لیا۔

ایک دفعہ صدقات کا کچھ روپیہ آیا اور اسے تقسیم کرتے ہوئے ایک دینار کسی کونے میں گر گیا جسے اٹھانے کا آپ کو خیال نہ رہا۔ نماز کے بعد یاد آیا تو لوگوں کے اوپر سے پھاندتے ہوئے آپ جلدی سے اپنے گھر تشریف لے گئے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا بات تھی۔ آپ نے فرمایا۔ اِس اِس طرح ایک دینار تقسیم کرنے سے رہ گیا تھا مَیں نے چاہا کہ جسقدر جلدی ممکن ہو اسے بھی تقسیم کر دوں۔ غرض مال و دولت کے باوجود آپ نے ایسی سیر چشمی

اور استغنا ء ظاہر کی کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے ۔ جو کچھ آتا آپ خدا تعالیٰ کی راہ میں تقسیم کر دیتے حالانکہ گھر کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض دفعہ ایک ایک مہینہ تک ہمارے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی ۔ ہم اونٹنی کا دودھ پی لیتے یا کھجوریں کھا لیتے تھے یا بعض دفعہ کوئی ہمسایہ دودھ یا کوئی اور چیز بھیج دیتا تو وہ استعمال کر لیتے اور کبھی فاقہ سے ہی رہتے تھے ۔ (شمائل ترمذی باب ما جاء فی عیش النبی صلے اللہ علیہ وسلم) یہ اُس زمانہ کی حالت ہے جب کثرت سے دولت آ رہی تھی ۔ غرض آپ نے ہر حالت میں اعلیٰ نمونہ دکھایا ۔ آپ کو روپیہ ملا مگر پھر بھی آپ نے غربت کو قائم رکھا ۔ آپ مجرد رہے اور ایسا اعلےٰ نمونہ دکھایا کہ دنیا حیران ہے ۔ آپ نے پچیس۲۵ برس کی عمر میں شادی کی جبکہ عرب میں سولہ سترہ برس کا لڑکا پورا بالغ ہو جاتا ہے ۔ اور اس عمر میں بھی ایک بڑی عمر کی بیوہ کے ساتھ شادی کی۔ پھر شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر دی ۔ تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سب غلاموں کو آزاد کر دیا ۔

دشمنوں کے ظلم سہنے میں بھی آپ نے ایسا نمونہ دکھایا جو بے نظیر ہے ۔ طائف میں تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تو پتھروں کی بوچھاڑ کی وجہ سے سر سے پاؤں تک آپ زخمی ہو گئے ۔ مگر ایسی حالت میں بھی جب خدا تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اُس نے کہا کہ اگر چاہو تو ابھی اِن لوگوں کو سزا دے دی جائے ۔ تو آپ نے فرمایا ۔ نہیں یہ لوگ نادانی سے ایسا کر رہے ہیں ۔

پھر جب کبھی ضرورت پیش آتی آپ فوراً اُن دشمنوں کی امداد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے جو آپ کی ایذا رسانی پر ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے ۔ کوئی نہیں جو آپ کے پاس اپنی حاجت لے کر آیا ہو اور آپ نے اس کی حاجت روائی سے انکار کر دیا ہو ۔ وہ شہر جہاں سے رات کے وقت چھپ کر آپ کو بھاگنا پڑا تھا اُس شہر کے شدید ترین معاند جب مغلوب ہونے کے بعد آپ کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ آج تم پر کوئی گرفت نہیں ۔ مَیں نے تم سب کو معاف کر دیا ہے حالانکہ ان لوگوں میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے آپ کے صحابہؓ کو اونٹوں سے باندھ کر چیر ڈالا ۔ بعض ایسے تھے جنہوں نے عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں شہید کر ڈالا ۔ بعض ایسے تھے جنہوں نے صحابہؓ کو جلتی ریت پر لٹا لٹا کر انہیں دُکھ دیا اور ان کا جینا دوبھر کر دیا ۔ مگر آپ نے ان سب کو معاف کر دیا اور اس طرح بتا دیا کہ آپ کے اندر کتنا عدیم المثال عفو پایا جاتا ہے ۔

آپ نے تجارت بھی کی اور ایسی کہ حضرت خدیجہؓ کے غلام کہتے ہیں ہم نے ایسا ایماندار کوئی نہیں دیکھا ۔ سب سے زیادہ نفع آپ کو ہوتا تھا ۔ اور آپ کی چیز میں اگر کوئی نقص ہوتا تو آپ خود ہی اس کو ظاہر کر دیتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ گاہک تلاش کر کر کے آپ سے مال خریدتے تھے ۔

آپ کا غریبوں سے معاملہ ایسا احسان کا تھا کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی گردن میں پٹکا ڈال لیا اور کہا مجھے کچھ مال دو ۔ آپ نے اُسے کچھ نہیں کہا بلکہ صرف یہ جواب دیا کہ مَیں

بخیل نہیں ہوں اگر میرے پاس مال ہوتا تو مَیں ضرور دے دیتا۔ اُس وقت دس ہزار آدمی آپ کے ہاتھ پر اپنی جان و مال کو قربان کرنیکا عہد کر چکا تھا۔ اگر آپ ذرا بھی اشارہ کر دیتے تو وہ اس کی گردن اُڑا دیتے مگر آپ نے اُس پر خفگی کا اظہار نہیں کیا۔

پھر شجاعت اور دلیری آپ میں اسقدر تھی کہ مکّہ کی مخالفت جب انتہا کو پہنچ گئی تو رؤسائے قریش نے ابوطالب کو دھمکی دی کہ اگر تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ روکا تو تمہیں بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور ہم تمہیں اپنی سرداری سے الگ کر دینگے۔ ابوطالب اِس دھمکی سے گھبرا گئے۔ اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر آئے۔ تو انہوں نے بلا کر کہا کہ مکّہ کے رئیس اِس اِس طرح کہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کرو جس سے اُن کی بھی دلجوئی ہو جائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چچا مَیں ساری تکالیف برداشت کرونگا مگر مَیں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے کبھی رُک نہیں سکتا۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر رکھدیں تب بھی مَیں خدائے واحد کی توحید پھیلانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ مَیں اس کام میں مشغول رہوں گا اور اس کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔

غرض ایک کامل قوتوں والے انسان کے اندر جسقدر اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سارے کے سارے اپنی پوری شان اور عظمت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے تھے۔ آپ کے اندر شجاعت بھی پائی جاتی تھی، سخاوت بھی پائی جاتی تھی، احسان بھی پایا جاتا تھا، وفاداری بھی پائی جاتی تھی، تحمّل بھی پایا جاتا تھا، رحم بھی پایا جاتا تھا، حلم بھی پایا جاتا تھا، ایثار بھی پایا جاتا تھا، دیانت بھی پائی جاتی تھی۔ اخوت بھی پائی جاتی تھی، تواضع بھی پائی جاتی تھی، غیرت بھی پائی جاتی تھی، شکر بھی پایا جاتا تھا، استقلال بھی پایا جاتا تھا، وقار بھی پایا جاتا تھا، بنی نوع انسان کی خیرخواہی بھی پائی جاتی تھی، بلند ہمتی بھی پائی جاتی تھی، صبر بھی پایا جاتا تھا، رأفت بھی پائی جاتی تھی۔ بدی کے مقابلہ کی طاقت بھی پائی جاتی تھی۔ قوت برداشت بھی پائی جاتی تھی، جفاکشی بھی پائی جاتی تھی، سادگی بھی پائی جاتی تھی، صلہ رحمی بھی پائی جاتی تھی، سچائی بھی پائی جاتی تھی، غرباء پروری بھی پائی جاتی تھی، مصیبت زدوں کی مدد کی خواہش بھی پائی جاتی تھی، مہمان نوازی بھی پائی جاتی تھی، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی پائی جاتی تھی۔ محبت الٰہی بھی پائی جاتی تھی، توکّل بھی پایا جاتا تھا۔ عبادات کی محافظت بھی پائی جاتی تھی۔ غرض کونسی خوبی تھی جو آپ میں نہ پائی جاتی ہو۔ اور کونسا کمال تھا جو آپ میں موجود نہ ہو۔ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت سورۂ مریم کے بعد اس سورۃ کو رکھا گیا ہے۔ اور ایک لطیف پیرایہ میں اسطرف اشارہ کیا گیا کہ جب حضرت مریمؑ کے پیٹ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پڑے تھے تو گو جس فرشتے نے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تھی وہ بَشَرًا سَوِیًّا کی شکل میں آیا تھا۔ یعنی ایک تندرست مرد کی شکل میں ظاہر ہوا تھا جیسا کہ سورۂ مریم میں آتا ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (ع)، لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر کسی فرشتہ نے ایک تندرست بشر کی شکل میں ظاہر ہو کر نہیں دی بلکہ آپ خود ایک کامل القویٰ مرد تھے جن کے اندر تمام مردانہ صفات اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو یہ صفا بالواسطہ

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۳﴾

ہم نے تجھ پر (یہ) قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو دُکھ میں پڑ جائے ؎۵

اور وہ بھی ناکمل شکل میں ملیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دینے والا فرشتہ بشر کہلاتا تھا رَجُل نہیں۔ اور بشر کا وجود متمدن انسان کے دور سے پہلے تھا۔ یعنی بشر انسان کا پہلا درجہ تھا لیکن رَجُل انسان کا آخری درجہ ہے۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کامل قوائے انسانی کے ظہور تھے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سورۂ مریم اور بائیبل کے بیان کے مطابق صرف بشری طاقتوں کے ظہور تھے۔ اسی وجہ سے بقول انجیل جب ان پر جبریل نازل ہوا تو وہ ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہوا (متی باب ۳ آیت ۱۶) جو ایک کمزور اور نحیف جانور ہے اور بلی بھی اس کو کھا جاتی ہے۔ مگر جب وہی جبریل رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو ایک قوی ہیکل انسان کی صورت میں نازل ہوا جس نے اپنی پوری طاقت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا والے واقعہ کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب فرشتہ میرے پاس آیا اور میں نے مَا اَنَا بِقَارِئٍ کہا تو فَغَطَّنِیْ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَهْدَ (بخاری باب بدء الوحی) اُس نے مجھے ایسا بھینچا کہ میری مقابلہ کی طاقت بالکل جاتی رہی۔

یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا فرشتہ ایک قوی ہیکل انسان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا جبکہ مسیحؑ پر نازل ہونے والا فرشتہ ایک کبوتر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود کامل قوائے انسانی کے ظہور تھے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی طرف طٰهٰ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۳؎ حل لغات۔ تَشْقٰى شَقِیَ سے مضارع واحد مخاطب کا صیغہ ہے اور شَقِیَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں كَانَ شَقِيًّا وہ شقی ہو گیا۔ دراصل شَقَاوَةٌ کا لفظ سَعَادَۃ کے مخالف معنے ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (اقرب) اور سَعَادَۃ کے معنے ہیں مُعَاوَنَةُ الْاُمُوْرِ الْاِلٰهِيَّةِ لِلْاِنْسَانِ عَلٰى نَيْلِ الْخَيْرِ۔ بھلائی اور برکت حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کردہ اسباب کی امداد (مفردات)۔ پھر مفردات میں شَقَاوَۃ کے معنے کرتے ہوئے امام راغبؒ لکھتے ہیں۔ قَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ يُوْضَعُ الشَّقَاءُ مَوْضِعَ التَّعَبِ۔ یعنی بعض اہل زبان کہتے ہیں کہ تھکان اور تکلیف کے معنوں میں بھی شَقَاوَۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پس لِتَشْقٰى کے معنے ہونگے (۱) تجھ کو تھکان اور تکلیف لاحق ہو (۲) تو اپنے مقصد کے حصول میں خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب کی امداد سے محروم رہے۔

تفسیر۔ یہ آیت اُسی مضمون کی تصدیق کرتی ہے جو سورۂ مریم میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسان کر کے اتارا ہے تاکہ متقیوں کے لئے بشارت ہو اور مسیحی قوم کے اس عقیدہ کی تردید کی گئی تھی کہ شریعت لعنت ہے۔ اب فرماتا ہے کہ قرآن کا نزول اس لئے نہیں کہ تُو مشقت میں پڑے بلکہ اس لئے ہے کہ تجھ کو تیرے فرائض یاد کرائے جائیں اور جو شریعت انسان کو اس کی ذمہ واری یاد کراتی ہے وہ لعنت نہیں کہلا سکتی وہ تو ایک اچھا ساتھی ہے جو وقت پر

اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ﴿۴﴾ تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ﴿۵﴾

(یہ تو) صرف (خدا سے) ڈرنے والے انسان کے لئے رہنمائی اور ہدایت کیلئے ہے ۔ ؎۴ (قرآن) اُس کی طرف سے اُتارا ہُوا ہے جس نے زمین اور اونچے آسمان کو پیدا کیا ہے ۔ ؎۵

انسان کو صحیح طریقہ بتاتا رہتا ہے ۔ پس مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰی میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم میں جتنی تعلیم نازل ہوئی ہے وہ انسان کے لئے رحمت اور برکت کا موجب ہے اسکی کوئی تعلیم ایسی نہیں جو اسکی فطرت کے خلاف ہو اور اس طرح اسے دکھ اور تکلیف میں ڈالنے والی ہو ۔

اسی طرح اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب تو کامل القویٰ انسان ہے جو ہمارے سپرد کردہ فرائض کو اچھی طرح ادا کر سکتا ہے اور کر رہا ہے تو کسطرح ہو سکتا تھا کہ ہم تجھے تباہ کرتے ۔ کیونکہ کوئی شخص اپنی قیمتی چیز کو تباہ نہیں کیا کرتا ۔ پس ہم نے یہ قرآن تجھے تباہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ تجھے اور تیری قوم کو اپنے فرائض کی طرف توجہ دلانے کے لئے نازل کیا ہے اور اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم گمراہی سے بچ جاؤ ۔

؎۴ حل لغات ۔ یَخۡشٰی خَشِیَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور خَشِیَ کے معنے ہیں خَافَہٗ اس سے ڈرا (اقرب) مفردات میں ہے ۔ اَلۡخَشۡیَۃُ خَوۡفٌ یَشُوۡبُہٗ تَعۡظِیۡمٌ وَاَکۡثَرُ مَا یَکُوۡنُ ذٰلِکَ عَنۡ عِلۡمٍ بِمَا یُخۡشٰی مِنۡہُ ۔ کہ خشیت کا لفظ خوف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن ایسے خوف کیلئے جو کسی کی عظمت کی وجہ سے لاحق ہو اور یہ عام طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ جس سے ڈرا جاتا ہے اس کی شخصیت اور اس کے مقام کا علم ہوتا ہے کہ وہ کس مرتبہ کا ہے (مفردات) پس یَخۡشٰی کے معنے ہونگے جو خدا تعالیٰ کی عظمت سے ڈرتا ہو ۔ اور اس کے مقام اور مرتبہ کا خوف رکھتا ہو ۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے ۔ یہ قرآن دوسری کتابوں کی طرح محض انسان کے دل میں خدا کا ڈر ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ ڈر پیدا کرنے کے بعد انسان کو اوراوپر لے جاتا ہے اور خدا سے ملا دیتا ہے ۔ یعنی اس کا دوست بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم کے شروع میں بھی فرمایا ہے کہ یہ کتاب هُدًى لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ہے ۔ یعنی جو لوگ متقی ہوتے ہیں ان کو مزید راستہ دکھا کر خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مقرب لوگ صرف ڈرا نہیں کرتے بلکہ انعامات کے امیدوار بھی ہوتے ہیں اور محبت کے شعلے اُن کے دلوں میں بھڑک رہے ہوتے ہیں اور یہی وہ عالی مقام ہے جس کو قرآن کریم کے سوا اور کوئی کتاب پیش نہیں کرتی ۔

؎۵ حل لغات ۔ تَنۡزِیۡلًا نَزَّلَ کا مصدر ہے اور یہ اس لئے منصوب ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے یعنی اَنۡزَلۡنٰہُ تَنۡزِیۡلًا کہ ہم نے اسکو خوب اچھی طرح اُتارا ہے ۔ اَلۡعُلٰی اَلۡعُلۡیَا کی جمع ہے اور اَلۡعُلۡیَا اَلۡاَعۡلٰی کا مؤنث کا صیغہ ہے ۔ (مفردات) پس اَلسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی کے معنے ہوں گے بلند آسمان ۔

تفسیر ۔ اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس خدا نے مادہ کو پیدا کیا اور بے انتہا درجوں میں پیدا کیا ہے یہاں تک کہ اس کے بالائی حصے نظر تک نہیں آتے وہ خدا اگر رُوحانی دنیا پیدا

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ⑥

(وہ) رحمٰن (ہے جو) عرش پر مستحکم طور پر قائم ہو گیا ہے ۶

کریگا تو اس کو بھی اسی شکل میں پیدا کریگا۔ یعنی ایسے ایسے بلند رُوحانی مقامات اس میں رکھے گا کہ وہ رُوحانی آسمان کہلانے کے مستحق ہونگے۔ اور جس طرح یہ جسمانی آسمان دنیا کی خدمت میں لگا ہُوا ہے اسی طرح وہ روحانی آسمان دنیا کی روحانی خدمت میں لگا رہے گا۔ اور لوگ اس کی مدد سے بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ خادم حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ نے فرمایا کہ ؎

دمبدم رُوح القدس اندر معینے می دمد
من نمی گویم مگر من عیسیٰؑ ثانی شدم

یعنی جبرئیلؑ ہر گھڑی معین الدین چشتیؒ کے کان میں بول رہا ہے۔ پس گو مَیں مُنہ سے نہیں کہتا مگر واقعہ یہی ہے کہ مَیں عیسیٰؑ کا نظیر ہو گیا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو پادری اور پوپ پیدا کئے جن میں ہزاروں عیوب پائے جاتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ جیسے وجود پیدا کئے یعنی خود عیسیٰؑ پیدا کئے۔

اِسی طرح آپؐ کے ایک اور خادم یعنی بانیٔ سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ

الا اے منکر از شانِ محمدؐ - ہم از نورِ نمایانِ محمدؐ
کرامت گرچہ بے نام و نشاں است - بیا بنگر ز غلمانِ محمدؐ

(آئینہ کمالاتِ اسلام کے آخری صفحات)

یعنی اے وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چمکتے ہوئے انوار کا منکر ہے۔ کان کھول کر سُن لے کہ اگرچہ کرامت اس زمانہ میں ہر جگہ مفقود ہے مگر تو آ اور اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں دیکھ لے۔

۶ حل لغات

اَلْعَرْشُ: سَرِيْرُ الْمَلِكِ بادشاہ کا تخت۔ اَلْعِزُّ عزت و غلبہ۔ قَوَامُ الْاَمْرِ معاملات اور امور کی درستی کا ذریعہ اور مدار۔ عَرْشٌ مِّنَ الْبَيْتِ: سَقْفُهٗ مکان کی چھت۔ اَلْعَرْشُ اَلْمُلْكُ بادشاہت (اقرب) مفردات میں ہے۔ وَ سُمِّيَ مَجْلِسُ السُّلْطَانِ عَرْشًا اِعْتِبَارًا بِعُلُوِّهٖ۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ یعنی تخت کو بھی عرش کہتے ہیں اسوجہ سے کہ وہ بلند ہوتا ہے اور عرش میں بلندی کے معنے پائے جاتے ہیں۔ وَكُنِّيَ عَنِ الْعِزِّ وَالسُّلْطٰنِ وَالْمَمْلَكَةِ اور عرش کے لفظ کو عزت اور غلبہ اور بادشاہت کے مفہوم کے ادا کرنے کیلئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ وَقَوْلُهٗ ذُو الْعَرْشِ وَمَا يَجْرِيْ مَجْرَاهُ قِيْلَ هُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى مَمْلَكَتِهٖ وَسُلْطٰنِهٖ لَا اِلٰى مَقَرٍّ لَّهٗ يَتَعَالٰى عَنْ ذٰلِكَ اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لئے جو یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ وہ عرش والا ہے اس سے خدا تعالیٰ کی بادشاہت اور غلبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص تخت ہے جس پر وہ قرار فرما ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے تجسّم لازم آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجسّم سے پاک ہے (مفردات)

اِسْتَوٰى: اِسْتَوَى الرَّجُلُ اِنْتَهٰى شَبَابُهٗ وَ بَلَغَ اَشُدَّهٗ اَوْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَاسْتَقَامَ اَمْرُهٗ یعنی جب اِسْتَوٰى کا لفظ کسی انسان کے لئے استعمال کریں تو یہ معنے ہونگے کہ وہ عین عنفوان شباب کو

پہنچ گیا۔ اور اس عمر کو جا پہنچا جبکہ اس کی ساری طاقتیں اور قوتیں پختہ ہو کر ظاہر ہو گئیں۔ اور کام کرنے لگیں۔ اور جب اِسْتَوٰی عَلٰی سَرِیْرِ الْمُلْکِ کہیں تو یہ معنے ہونگے کہ وہ کسی جگہ کا مالک ہو گیا۔ گو وہ کسی خاص تخت پر نہ بیٹھا ہو۔ اور اِسْتَوٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَوْلٰی وَظَھَرَ وہ کسی چیز پر غالب آگیا (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ کلام الٰہی کا نزول صفتِ رحمٰن کے ماتحت ہوتا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی کمزوری دیکھ کر خود ہی اُن کی ہدایت کے لئے جوش میں آتا ہے اس آیت میں عیسائیت کا رد کیا گیا ہے کیونکہ عیسائیت کفارہ کی قائل ہے۔ اور کفارہ اور رحمانیت اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ کفارہ تبھی سچا ہو سکتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ بغیر کسی کام کے کسی پر رحم نہ کر سکے۔ لیکن رحمٰن کے معنے یہ ہیں کہ بغیر کسی سابقہ خدمت کے رحم کرنے والی ہستی۔ چنانچہ مسلمانوں کی سب کتابوں پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوتا ہے۔ لیکن عیسائی مصنف اپنی کتابوں سے پہلے اوّل تو کچھ لکھتے نہیں اور اگر بعض لوگ کچھ لکھتے بھی ہیں تو اپنی اپنی مرضی کے مطابق الفاظ منتخب کر کے لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تو

"بسم الاب والابن والروح"

لکھتے ہیں (دستہ ہامان منظومہ منشی کیدار ناتھ صاحب) بعض

"بسم اللہ الہادی الجواد"

لکھ دیتے ہیں (شہادۃ القرآن) اور بعض یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں کہ "خدا تعالیٰ کے نام پر جو ہادی لا شریک ہے"۔ (بہت بیش قیمت عطر کی شیشی مصنفہ پادری ٹسڈل صاحب) گویا اور الفاظ تو وہ استعمال کرتے ہیں لیکن رحمٰن کا لفظ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ رحمٰن کا لفظ اُن کے مذہب کے خلاف ہے مگر دنیا کا ذرّہ ذرّہ بتا رہا ہے کہ خدا رحمٰن ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کوئی نیکی کر کے تو نہیں آتا مگر خدا تعالیٰ اس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ اتار دیتا ہے اور یہ انعام بغیر کسی نیکی کے ہوتا ہے۔ اسی طرح جوانی تو پیدائش کے بڑے عرصہ بعد آتی ہے لیکن اس کے جسم کو سردی گرمی سے بچانے کے لئے کپڑے اور مکان کا سامان پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ پس دنیا کا ذرّہ ذرّہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت پر دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح ہر مذہب بھی اس کی رحمانیت کا ثبوت ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام جب نازل ہوتا ہے تو کسی نیکی کے بدلہ میں نازل نہیں ہوتا بلکہ بطور احسان نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی قرآن کریم کے نزول کا ذکر ہے یہی فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کو رحمٰن خدا نے نازل کیا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (شوریٰ ع ۵) تو نہیں جانتا تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے اور کتاب کیا ہوتی ہے پس قرآن جو تجھ پر نازل ہوا ہے نہ کسی ایمان کے نتیجہ میں نازل ہوا ہے اور نہ کسی کتاب پر عمل کرنے کے نتیجہ میں نازل ہوا ہے بلکہ محض اس محبت کی مخفی چنگاری کے بدلہ میں نازل ہوا ہے جو تیرے دل میں خدا کے لئے اس طرح سُلگ رہی تھی جس طرح بچہ کے دل میں ماں کے لئے محبت کی مخفی چنگاری سُلگ رہی ہوتی ہے۔

عرش کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ عرش کوئی مادی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تنزیلی کا نقطۂ مرکزی ہے یعنی خدا تعالیٰ کی جو صفات بندوں سے تعلق رکھتی ہیں ان کو خدا تعالیٰ عرش پر سے ظاہر کرتا ہے جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کے لئے اپنے تختِ حکومت پر سے احکام دیتے ہیں۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور وہ بھی جو اُن دونوں کے درمیان ہے اُسی کا ہے۔ نیز (وہ بھی) جو

تَحْتَ الثَّرٰى ۝۷ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۸

گیلی مٹی کے نیچے ہے ۔ ؎۸ اگر تو اونچی آواز سے بولے تو خدا اسکو بھی سُنتا ہے اور اگر آہستہ آواز سے بولے تو اسکو بھی سُنتا ہے کیونکہ وہ پوشیدہ بات کو بھی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۹

جانتا ہے اور جو بہت ہی پوشیدہ ہوتی ہے اُسکے بھی جانتا ہے) ؎۹ ۔ اللہ (وہ ذات ہے کہ اس) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسکی بہت سی اچھی صفتیں ہیں ؎۹

(عرش کی مفصّل بحث کیلئے دیکھیں سورۃ یونس آیت ۴) چونکہ کلام الٰہی خدا تعالیٰ کی طرف سے مختلف قسم کے احکام پر مشتمل ہوتا ہے اسلئے فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یہ قرآن ہے تو رحمانیت کی صفت کے ماتحت یعنی انسانوں کی کسی خدمت کے نتیجہ میں نازل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے غیر محدود رحم سے بندوں کی ہدایت کیلئے نازل کیا ہے مگر خدا کے رحمٰن ہونے کی وجہ سے یہ دھوکا نہ کھا لینا کہ اس کلام کو ردّ کر دینا معمولی بات ہے بلکہ یاد رکھنا کہ رحمٰن خدا نے اپنے تختِ شاہی پر بیٹھ کر یہ اعلان کیا ہے اور اس کو ردّ کرنا اس کی بادشاہت کا انکار کہلائیگا اور تمہیں سزا کا مستحق بنا دیگا۔

؎۷ حل لغات ۔ اَلثَّرٰى: اَلتُّرَابُ النَّدِيُّ گیلی مٹی۔ اَلْاَرْضُ زمین (اقرب)

تفسیر ۔ اس میں عرش پر قائم ہونے کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کے بادشاہ جب اپنے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہیں تو ان کی حکومت محدود ہوتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی حکومت آسمانوں پر بھی ہے زمین پر بھی ہے اور زمین کے نچلے طبقوں پر بھی ہے۔ پس اس کے احکام کو ردّ کرنا دنیا کی چوٹی سے لیکر اس کے نچلوں سے نچلے طبقہ تک ساری مخلوقات کو اپنا مخالف بنانا ہے۔

اسی طرح اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ اسکی تعلیم پر عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نچلے طبقات میں ہے سب کو ان کی تائید میں لگا دیتا ہے۔

؎۸ حل لغات ۔ تَجْهَرْ: جَهَرَ سے ہے اور جَهَرَ بِالْقَوْلِ کے معنے ہیں رَفَعَ بِهٖ صَوْتَهٗ۔ بات کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کی (اقرب) پس اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ کے معنے ہونگے اے مخاطب اگر تو بات کرتے وقت اپنی آواز بلند کرے۔

تفسیر ۔ یہ آیت پہلی آیت کی مزید تشریح ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بلندیوں کا مالک ہے وہ اونچی آواز کو بھی سُنتا ہے اور جو زمین کے نچلے طبقہ کا مالک ہے وہ آہستہ آواز کو بھی سُنتا ہے۔ ورنہ ان دونوں حصوں پر حکومت کس طرح کر سکتا ہے۔

؎۹ حل لغات ۔ اَلْاَسْمَآءُ ۔ اِسْمٌ کی جمع ہے اور اِسْمٌ کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابو البقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں۔ اَلْاِسْمُ ذَاتُ الشَّيْءِ وَالْاِسْمُ اَيْضًا اَلصِّفَةُ۔ کہ اسم اس کو بھی کہیں گے کہ جو کسی چیز کی حقیقت اور ذات کو بیان کرے اور اس کو بھی کہیں گے جو اس چیز کی صفات کو بیان کرے۔

اَلْحُسْنٰى ۔ اَحْسَنُ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور اَلْحُسْنُ کے معنے ہیں عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُبْهِجٍ

(حاشیہ: تَجْهَرْ ؎۸ ۔ اَلثَّرٰى ؎۷ ۔ اَلْاَسْمَآءُ ؎۹)

ترجمہ

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝﴿۱۰﴾ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ

اور (اسکے ثبوت میں ہم کہتے ہیں کہ) کیا تیرے پاس موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے (یا نہیں)۔ ۱۰؎ (یعنی) جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اُس نے اپنے

امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ

اہل سے کہا (اپنی جگہ) ٹھہرے رہو۔ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ ممکن ہے کہ میں وہاں جاکر اس آگ میں سے کوئی انگارہ تمہارے

اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝﴿۱۱﴾

لئے بھی لے آؤں یا آگ پر (اپنے لئے کوئی روحانی) ہدایت حاصل کروں ۱۱؎

مَرْغُوْبٌ فِيْهِ۔ ہر وہ چیز یا حالت جو خوش کرے اور انسان کے دل میں اس کے لینے کی خواہش پیدا ہو۔ پھر لکھا ہے کہ حُسن کا لفظ عام لوگوں کے استعمال میں اُن چیزوں کی خوبصورتی کے لئے استعمال ہوتا ہے جن کو آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن قرآن مجید میں جن چیزوں کے لئے حُسن کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے بصیرت کے ساتھ معلوم کئے جانے والا حُسن مراد ہے (مفردات) پس اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کے معنے ہونگے بہترین صفات۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی آسمانوں کا مالک ہے اور خدا تعالیٰ ہی زمین کے نچلے طبقوں کا بھی مالک ہے تو پھر اور کوئی معبود ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان کے سوا اور کونسی جگہ رہ جائیگی جو اس معبود کی ملکیت ہو گی۔

۱۰؎ حل لغات۔ اَلْحَدِيْثُ: اَلْخَبَرُ يَاْتِيْ عَلَى الْقَلِيْلِ وَالْكَثِيْرِ۔ یعنی حدیث کے معنے خبر کے ہیں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی (اقرب)

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ایک صاحب شریعت نبی تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے واقعہ کو یہ بتانے کے لئے پیش کیا ہے کہ اُن کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے عرش سے دنیا پر روحانی حکومت کی تھی اور اُن پر بھی کلام الٰہی نازل ہوا تھا۔

۱۱؎ حل لغات۔ اُمْكُثُوْا۔ مَكَثَ يَمْكُثُ سے امر کا جمع کا صیغہ ہے اور مَكَثَ بِالْمَكَانِ کے معنے ہیں لَبِثَ وَ اَقَامَ۔ کسی جگہ پر ٹھہرا (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلْمُكْثُ ثَبَاتٌ مَعَ اِنْتِظَارٍ۔ کسی جگہ پر ٹھہر کر کسی کا انتظار کرنا مُکث کہلاتا ہے۔ پس اُمْكُثُوْا کے معنے ہوں گے تم ٹھہرو اور انتظار کرو۔

اٰنَسْتُ۔ اٰنَسَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اور اٰنَسَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَهٗ اس کو دیکھا (اقرب) پس اٰنَسْتُ نَارًا کے معنے ہوں گے میں نے آگ دیکھی ہے۔

قَبَسٌ: شُعْلَةُ نَارٍ تُؤْخَذُ مِنْ مُعْظَمِ النَّارِ (اقرب) آگ کا وہ انگارہ جو بڑی آگ سے لیا جاتا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے "ایک آگ" دیکھی اس سے روحانی اور کشفی نظارہ مراد ہے نہ کہ کوئی ظاہری آگ۔ کیونکہ جسمانی آگ دیکھنے والا یہ نہیں کہا کرتا کہ میں نے "ایک آگ" دیکھی ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ

مَیں نے آگ دیکھی ہے ۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی جسمانی آگ دیکھی ہوتی تو عربی محاورہ کی رُو سے انہیں اَلنَّارُ یعنی آگ کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ مگر یہاں نَارًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ جس کے معنے ایک آگ کے ہیں۔ پس "ایک آگ" کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک روحانی نظارہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی سمجھتے تھے کہ یہ جسمانی لکڑیوں یا کوئلوں کی آگ نہیں ہے ۔ اور یہ جو فرمایا کہ مَیں شاید وہاں سے تمہارے لئے کوئی انگارہ لاؤں۔ اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ روحانی جلوے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جلوے وہ ہوتے ہیں جو صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں ہوتے جس پر وہ ظاہر ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے دوستوں اور قوم کے لئے بھی ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ جلوۂ نبوت اور جلوۂ نزولِ شریعت ۔ اور ایک جلوہ وہ ہوتا ہے جو صرف دیکھنے والے کی ذات تک محدود ہوتا ہے ۔ جیسے جلوۂ ولایت پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر واپس آتے ہوئے جب راستہ میں ایک روحانی نظارہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اہل سے کہا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی جلوہ دکھانے والا ہے ۔ اگر تو وہ ہدایتِ نبوت ہوئی اور وہ جلوہ شریعت والا ہُوا اور مجھے حکم ہُوا کہ دوسروں کو بھی تعلیم دو۔ تو مَیں اُس میں سے کوئی انگارہ یعنی کوئی تعلیم اپنے خاندان یا اپنی قوم کے فائدہ کے لئے بھی لے آؤنگا اور اگر یہ جلوہ شریعت والا نہ ہُوا بلکہ صرف ہدایتِ ولایت ہوئی اور میری ذات تک محدود ہوئی تو کم سے کم مَیں اپنی جان کے لئے ہی کوئی ہدایت اس سے حاصل کرونگا اور اس سے فائدہ اٹھا کر واپس چلا آؤنگا ۔

زیرِ تفسیر آیت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعض واقعات کو بیان کرنا شروع کیا ہے ۔ اور ابتداءً بتایا ہے کہ کس طرح اُن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلامی کا سلسلہ شروع ہُوا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے اور عمر کا ابتدائی حصہ آپ نے مصر میں ہی گذارا لیکن پھر بعض واقعات سے مجبور ہو کر مدین تشریف لے گئے اور دس سال وہاں قیام کیا ۔ اور وہیں شادی کی ۔ دس سال وہاں ٹھہرنے کے بعد اہل و عیال سمیت واپس مصر تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں آپ نے خدا تعالیٰ کی تجلّی کا مشاہدہ آگ کی صورت میں کیا۔ بائیبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر آتا ہے ۔ مگر بائیبل نے اس واقعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں اور قرآن کریم کے اس بیان کردہ واقعہ میں کچھ اختلاف ہے جس کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے ۔

اس اختلاف کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے مصر کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی وحی اُن پر نازل ہوئی اور بائیبل بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کا واقعہ پہلے پیش آیا ۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین تشریف لے گئے اور پھر مدین سے اپنے اہل و عیال کو لے کر مصر روانہ ہوئے ۔ چنانچہ خروج باب ۳ آیت ۱ اور ۲ میں لکھا ہے :۔

" اور موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور وہ بھیڑ بکریوں کو ہنکاتا ہُوا ان کو بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک لے آیا اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اُس پر ظاہر ہُوا ۔"

اور آخر میں لکھا ہے :۔

"تب موسیٰ لوٹ کر اپنے خسر یترو کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ مجھے ذرا اجازت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں۔ اور دیکھوں کہ وہ اب تک جیتے ہیں کہ نہیں۔ یترو نے موسیٰ سے کہا۔ سلامت جا۔ اور خداوند نے مدیان میں موسیٰ سے کہا کہ مصر کو لوٹ جا کیونکہ وہ سب جو تیری جان کے خواہاں تھے مر گئے۔ تب موسیٰ اپنی بیوی اور بیٹوں کو لے کر اور ان کو ایک گدھے پر چڑھا کر مصر کو لوٹا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۱۸ تا ۲۰)

گویا بائیبل یہ بتاتی ہے کہ مدین میں ہی ایک دن جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے حورب کی چٹان کی طرف گئے تو وہاں ایک جھاڑی میں انہیں خدائی جلوہ دکھائی دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خسر کے پاس آئے اور اُن سے اجازت حاصل کر کے اپنی بیوی اور بچوں کو مصر لے گئے۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ واقعہ انہیں مدین سے مصر جاتے ہوئے پیش آیا جبکہ اُن کے اہل و عیال بھی اُن کے ہمراہ تھے۔

اس اختلاف کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ بائیبل کا غور سے مطالعہ کرنے والے یہ امر اچھی طرح جانتے ہیں کہ بائیبل میں آدمیوں کی تعداد اور وقت کے اندازے بالکل غلط دیئے گئے ہیں۔ جن پر کوئی معقول انسان اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جہاں تاریخی طور پر ہزاروں کی تعداد ہوتی ہے بائیبل اس تعداد کو لاکھوں بیان کرتی ہے اور جہاں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہوتا ہے بائیبل اُسے قریب کا مقام ظاہر کرتی ہے۔ اسوجہ سے بائیبل کا بیان ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُسے اس واقعہ کے متعلق یقینی اور قطعی قرار دیا جا سکے۔ مثلاً اِسی واقعہ میں خدائی تجلّی ظاہر ہونے کا مقام حورب کا پہاڑ قرار دیا گیا ہے جو دشتِ سینا میں ہے اور مدین سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر ہے مگر اسے بیان اس رنگ میں کیا گیا ہے کہ گویا مدین سے میل آدھ میل کے فاصلہ پر کوئی مقام تھا جہاں حضرت موسےٰ علیہ السلام اپنی بکریوں کو چرانے لے گئے۔ اور وہاں اُن پر خدائی کلام نازل ہوا اور اس کے بعد وہ پھر اپنے خسر کے مکان پر آئے اور اُن سے اجازت چاہی کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو مصر لے جائیں۔ حالانکہ اوّل تو یہ عقل کے بالکل خلاف ہے کہ سینکڑوں میل پر کوئی بکریاں چرانے کیلئے لے جائے اور اسی شام کو واپس آ جائے پھر اگر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو ساتھ ہی لے جانا تھا تو وجہ کیا تھی کہ وہ پہلی دفعہ ہی اُن کو ساتھ نہ لے گئے اور اتنا لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوبارہ واپس آئے اور اُن کو ساتھ لے گئے۔ اگر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو لے جانا تھا تو عقلاً انہیں پہلی دفعہ ہی ساتھ لے جانا چاہیئے تھا۔ نہ یہ کہ سینکڑوں میل اکیلے چلے جاتے اور پھر واپس آتے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتے لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اہل و عیال اُن کے ساتھ ہی تھے۔ یہ غلط ہے کہ وہ دوبارہ آئے اور اپنے بیوی بچوں کو لے گئے۔ پس بائیبل کا بیان عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن جو بات قرآن نے کہی ہے وہ عقل کے مطابق ہے۔ اسی طرح بائیبل کا بیان جغرافیہ کے بھی خلاف ہے۔ جہاں دو مقامات میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہو وہاں یہ کہنا کہ وہ بکریاں چراتے ہوئے وہاں چلا گیا کسی طرح درست نہیں مانا جا سکتا۔ پس قرآن کریم نے جو کچھ کہا عقل اور جغرافیہ کے مطابق ہے اور بائیبل جو کچھ کہتی ہے وہ عقل اور جغرافیہ کے خلاف ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۲﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ

پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اُسے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ ۱۲ میں تیرا رب ہوں۔ پس تو اپنی دونوں

نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۳﴾

جوتیاں اُتار دے۔ کیونکہ تُو اس پاک وادی طُوٰی میں ہے ۱۳

پھر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس نظارہ کے دوران میں اُن کے بیوی بچّوں کے متعلق کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اگر تو انہیں یہ کہا جاتا کہ تمہارا اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جانا ضروری ہے تب تو سمجھا جا سکتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سینکڑوں میل کا فاصلہ دوبارہ اس لئے طے کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں مگر اس قسم کا کوئی اشارہ بائبل میں نہیں پایا جاتا کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں یہ کہا ہو کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ پس اس نظارہ کے بعد اُن کے مدین میں واپس آنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ ان کے اہل وعیال اس وقت ساتھ ہی تھے۔ کیونکہ وہ سینکڑوں میل کے سفر پر جا رہے تھے اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو مدین میں ہی چھوڑ جاتے۔ پس قرآن کریم کا بیان عقل اور جغرافیہ کے بالکل مطابق ہے مگر بائیبل کا بیان کسی طرح بھی درست نہیں سمجھا جا سکتا۔

۱۲ تفسیر - جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس بظاہر آگ نظر آنے والی چیز کے پاس پہنچے۔ تو اُن کو الہام ہُوا کہ اے موسیٰ! مَیں تیرا رب ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آگ موسیٰؑ کا رب تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جلوہ کو ظاہر کرنے والا موسیٰؑ کا رب تھا کیونکہ آگ نہیں بولا کرتی۔ خدا بولا کرتا ہے۔

۱۳ حل لغات - طُوًی: طَوَی (یَطْوِیْ) الصَّحِیْفَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ کاغذ کو لپیٹا (اقرب) اور تاج العروس میں طُوًی کے معنے اَلشَّیْءُ الْمُثَنّٰی کے بھی لکھے ہیں یعنی ایسی چیز جو ٹیڑھی ہو سیدھی نہ ہو۔ مفردات میں ہے۔ قِیْلَ هُوَ اسْمُ الْوَادِیْ۔ کہتے ہیں طُوٰی اس وادی کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمکلام ہُوا تھا۔ وَ قِیْلَ اِنَّ ذٰلِكَ جُعِلَ اِشَارَةً اِلٰی حَالَةٍ حَصَلَتْ لَهٗ عَلٰی طَرِیْقِ الْاِجْتِبَاءِ فَكَاَنَّهٗ طَوٰی عَلَیْهِ مَسَافَةً لَوِ احْتَاجَ اَنْ یَّنَالَهَا فِی الْاِجْتِهَادِ لَبَعُدَ عَلَیْهِ۔ اور بعض ماہرینِ لغت کے نزدیک طُوًی کے لفظ میں اِس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چُن کر اس روحانی مقام پر پہنچا دیا جہاں عام حالات میں مجاہدات سے پہنچنا مشکل ہوتا ہے (مفردات)

تفسیر - فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ کے لفظی معنے تو یہی ہیں کہ اپنی جوتیاں اُتار دے مگر مراد یہ ہے کہ اپنے ہر قسم کے دنیوی تعلقات کو خدا کی خاطر توڑ دے اور کلّی طور پر اپنے خدا کا ہو جا کیونکہ رؤیا یا کشف کی حالت میں اگر جوتی دیکھی جائے۔ تو علمِ تعبیر الرؤیا کے لحاظ سے اس سے مراد انسان کے

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ⑭ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ

اور میں نے تجھے (اپنے لئے) چن لیا ہے۔ پس تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے اسکو تو سُن (اور اس پر عمل کر) ۱۴؎ میں یقیناً اللہ ہوں میرے سوا کوئی

اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ⑮

معبود نہیں۔ پس تو میری ہی عبادت کر۔ اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کر ۱۵؎

متعلقین کا وجود ہوتا ہے، جیسے اس کی بیوی ہوئی، یا بچے ہوئے یا دوست اور رشتہ دار وغیرہ ہوئے اور چونکہ یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ فرما کر انہیں یہ ہدایت دی کہ اپنے تمام مادی تعلقات کو اب خدا کی خاطر توڑ دے کیونکہ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى اب تو ایک ایسی روحانی وادی میں داخل ہو چکا ہے جو دو طرف چکر کھاتی ہے یعنی ایک طرف تو اس کا خدا سے تعلق ہے اور دوسری طرف اس کا بندوں سے تعلق ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف سے تجھے نبوّت و رسالت سے سرفراز فرمایا گیا ہے اور یہ ایسا مقام ہے جہاں پر کھڑا ہونے والا انسان دنیا سے کٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور انسانی فطرت کا رُخ مادیات کو چھوڑ کر روحانیات کی طرف پھرتا ہے اس لئے تیرا فرض ہے کہ اب تو اپنے تمام دنیوی تعلقات اور محبتوں کو ترک کرکے کامل طور پر اپنے خدا کا ہو جا اور اُسی سے اپنا تعلق استوار رکھ۔

اِخْتَرْتُكَ

۱۴؎ حل لغات - اِخْتَرْتُكَ۔ اِخْتَارَ سے متکلم کا صیغہ ہے اور اِخْتَارَهٗ مِنَ الرِّجَالِ اِخْتِيَارًا کے معنے ہیں اِنْتَقَاهُ وَاصْطَفَاهُ مِنْ بَيْنِهِمْ کہ اس کو تمام لوگوں میں سے کسی کام کے لئے چُن لیا اور خاص کر لیا (اقرب) پس اِخْتَرْتُكَ کے معنے ہونگے میں نے تجھے تمام دوسرے لوگوں میں سے اپنے کام کے لئے چن لیا ہے اور خاص کر لیا ہے۔

تفسیر - اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ آگ میں سے کوئی چیز نہیں بولی بلکہ خدا کی طرف سے وحی ہوئی تھی کیونکہ یہاں وضاحتاً اللہ تعالےٰ نے فرما دیا ہے کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے چُن لیا ہے پس جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے تو اُس کو سُن اور اس پر عمل کر۔

اَقِمْ

۱۵؎ حل لغات - اَقِمْ: اَقَامَ سے امر کا صیغہ ہے اور اَقَامَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اَدَامَهٗ کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے رکھا۔ اور اَقَامَ الصَّلٰوةَ کے معنے ہیں اَدَامَ فِعْلَهَا ہمیشہ نماز پڑھتا رہا۔ اور اَقَامَ لِلصَّلٰوةِ کے معنے ہوتے ہیں نَادٰی لَهَا نماز کے لئے دوسروں کو بلایا (اقرب)

تفسیر - اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ کے یہ معنے ہیں کہ خود بھی نماز پڑھ اور دوسروں سے بھی پڑھوا۔ گویا اقامتِ صلوٰۃ کے معنے باجماعت نماز ادا کرنے کے ہیں۔ اور باجماعت نماز سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں ادا نہیں کی جاتی ہاں رسمی طور پر لوگ عبادت کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں جیسے عیسائی گرجا میں اور یہودی صومعہ میں۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ میں لِذِكْرِيْ کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ میں نے تجھے یاد کیا ہے اس لئے تو میرے شکر کے طور پر نماز پڑھ۔ اور دوسرے یہ کہ میرے ذکر کے لئے نماز پڑھ۔ یعنی تیری نماز دکھاوے

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ
قیامت یقیناً آنے والی ہے ۔ قریب ہے کہ میں اُسے ظاہر کردوں۔ تاکہ ہر نفس کو اپنے اعمال کے

بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۶﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا
مطابق جزا دی جائے ۱۶؎ پس جو (شخص) قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۷﴾
تجھے قیامت پر ایمان لانے سے روک نہ دے جس کے نتیجہ میں تُو ہلاک ہوجائے ۱۷؎

کیلئے نہ ہو بلکہ صرف میرے ذکر کے لئے ہو۔

۱۶؎ حل لغات۔ اُخْفِيْ۔ اَخْفٰى سے متکلم کا صیغہ ہے اور اَخْفٰى خَفٰى سے باب افعال ہے جو اپنے اندر متضاد معنے رکھتا ہے یعنی اس کے معنے ظاہر کرنے کے بھی ہیں اور چھپانے کے بھی۔ چنانچہ خَفَاهُ کے معنے ہوتے ہیں اَظْهَرَهُ اس کو ظاہر کر دیا۔ اور اس کے ایک معنے سَتَرَهُ کے بھی ہوتے ہیں یعنی چھپا دیا (اقرب) اسی طرح اَخْفَى الشَّيْءَ کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے اَزَالَ خِفَاءَهُ اس کے پردے کو دُور کر دیا (اقرب) یعنی اسکو ظاہر کر دیا۔

تفسیر۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا میں اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنیوالی ہے۔ قریب ہے کہ میں اُسے چھپا دوں اور یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنیوالی ہے قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کر دوں۔ چنانچہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ اَخْفَى الشَّيْءَ کے ایک معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ اَزَالَ خِفَاءَهُ اس کے پردہ کو دُور کر دیا۔ یعنی اُسے ظاہر کر دیا عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مجرد فعل کو باب افعال میں لے آئیں تو اس میں سلب کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں جیسے کہتے ہیں شَكَانِيْ فَاَشْكَيْتُهُ کہ اُس نے شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت کا ازالہ کر دیا۔ پس اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں یہ بھی کہ اُسے چھپائے رکھوں اور یہ بھی کہ اُسے ظاہر کر دوں۔ اگر اس کے معنے چھپائے رکھوں کے کئے جائیں تو اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ یہ مخالف اتنے گندے لوگ ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سے اس عذاب کی گھڑی کو پوشیدہ رکھوں تاکہ عذاب ان پر اچانک آجائے اور انہیں اس کے ازالہ کا کوئی موقعہ نہ مل سکے۔ اور اگر اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوں تو مراد یہ ہوگی کہ وہ گھڑی جو تیری ترقی اور تیرے دشمنوں کی تباہی کے لئے مقدر ہے وہ آرہی ہے اور قریب ہے کہ میں اس کو ظاہر کر دوں یعنی عنقریب ایسے حالات پیدا ہونے والے ہیں کہ تیرے دشمنوں کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگ جائیں گے اور میری ان آثار کو ظاہر کرنے سے غرض یہ ہوگی کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا پالے جو ماننے والے ہیں وہ انعام حاصل کریں اور جو منکر ہیں وہ سزا پالیں۔ بِمَا تَسْعٰى میں باء کے معنے مطابق کے ہیں اور ما مصدریہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تا ہر نفس اپنے عمل کے مطابق جزا پالے۔

اُخْفِيْ

۱۷؎ حل لغات۔ تَرْدٰى۔ رَدِيَ يَرْدٰى سے مخاطب کا صیغہ ہے اور رَدِيَ کے معنے ہوتے ہیں هَلَكَ۔ وہ ہلاک ہو گیا (اقرب) پس فَتَرْدٰى کے

تَرْدٰى

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ

اور (ہم نے اُس وقت موسیٰ سے کہا کہ) اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ (اُس نے) کہا۔ یہ میرا سونٹا ہے۔

اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَ لِيَ فِيْهَا

مَیں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اس کے ذریعہ سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور اسکے سوا بھی اِس میں

معنے ہونگے تُو ہلاک ہو جائے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے موسیٰ! تجھے کسی ایسے شخص کی مخالفت خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ فرائض سے نہ روکے جو اس ساعت پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہؤا ہے ورنہ تو بھی مصیبت میں مبتلا ہو جائیگا۔ اس آیت میں بھی سورۃ کے اس پہلے حصہ کی تصدیق کی گئی ہے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى یعنی قرآن اس لئے نازل نہیں ہؤا کہ تجھے تباہی میں ڈالے اور کہا گیا ہے کہ اے موسیٰ جو تیری تعلیم پر عمل کریگا وہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ جو اس کو چھوڑیگا وہ تباہ ہوگا۔ چنانچہ بائیبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو یہی پیغام دیا کہ

"اگر تُو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اُس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کریگا اور اگر تُو خداوند اپنے خدا کی بات سُنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہونگی اور تجھ کو ملینگی۔ شہر میں بھی تُو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے چوپایوں کے بچے یعنی گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے مبارک ہونگے۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی (یعنی آٹا گوندھنے کا برتن) دونو مبارک ہونگے اور تُو اندر آتے وقت مبارک ہوگا۔ اور باہر جاتے وقت بھی مبارک ہوگا ...... لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سُن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی دونوں لعنتی ٹھہریں گے۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے لعنتی ہونگے۔ تُو اندر آتے لعنتی ٹھہرے گا اور باہر جاتے بھی لعنتی ٹھہرے گا۔"

(استثناء باب ۲۸ آیت ۱ تا ۲۰)

گویا وہی مضمون جو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے تورات میں بھی موجود ہے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے اس لئے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

مَآرِبُ اُخْرٰی ⑲

میرے لئے اور کئی فائدے پوشیدہ ہیں ۵۱۸

یہ کہا کہ اگر تُو تورات کی تعلیم پر عمل کریگا تو تُو اندر آتے وقت مبارک ہوگا اور باہر جاتے وقت بھی مبارک ہوگا"۔ اِسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دُعا سکھائی گئی کہ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا (بنی اسرائیل ع۹) یعنی اے میرے رب! میرا دوبارہ مکہ میں داخل ہونا بھی مبارک ہو اور میرا مکہ سے نکلنا بھی مبارک ہو۔ گویا اس آیت کی رو سے بھی آپ کا مثیلِ موسیٰ ہونا ثابت ہے۔

۵۱۸ حل لغات۔ اَتَوَكَّؤُا۔ تَوَكَّأَ سے متکلم کا صیغہ ہے اور تَوَكَّأَ عَلَى الْعَصَا کے معنے ہوتے ہیں تَحَمَّلَ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهَا سونٹے پر سہارا لیا (اقرب) پس اَتَوَكَّؤُا کے معنے ہونگے میں سہارا لیتا ہوں۔

اَهُشُّ۔ هَشَّ سے ہے اور هَشَّ الْوَرَقَ کے معنے ہوتے ہیں خَبَطَهُ بِعَصًا لِيَتَحَاتَّ۔ درخت کے پتّوں کو سونٹے سے مارا تاکہ وہ گر پڑیں (اقرب) پس اَهُشُّ کے معنے ہونگے میں جھاڑتا ہوں۔

مَآرِب۔ اِرْبٌ کی جمع ہے اور اَلْاِرْبُ کے معنے ہیں اَلْحَاجَةُ۔ ضرورت (اقرب)

تفسیر۔ یہ عصا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ میں دیکھا یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا۔ اور عصا سے مراد درحقیقت بنی اسرائیل تھے جو انہیں دکھائے گئے۔ چنانچہ لُغت میں عصا کے ایک معنے جماعت کے بھی لکھے ہیں۔ (اقرب)

جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے پُوچھا کہ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طبعاً اس طرف توجہ پیدا ہوئی کہ مجھ سے عصا کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا ہے اور انہوں نے اس کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیں کہ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَآرِبُ اُخْرٰى میں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اس کے ذریعہ سے میں اپنی بکریوں پر درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے سوا بھی اس میں میرے لئے کئی قسم کے فوائد اور منافع ہیں۔

اَتَوَكَّؤُا

سہارا لینے کا یہ مفہوم ہے کہ میں ان لوگوں پر اعتماد رکھتا ہوں اور اشاعتِ دین کے کاموں میں ان کی معاونت اور امداد چاہتا ہوں۔ اور اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ کے یہ معنے ہیں کہ میں ان کے ذریعہ اپنے توابع کے فوائد کی نگرانی کرتا ہوں۔ غنم قوم کا حصّہ نہیں ہوتی بلکہ ایک تابع چیز ہوتی ہے۔

اَهُشُّ

پس جب عصا کے معنے قوم کے ہوئے تو اس آیت کے یہ معنے بنے کہ میں اپنی قوم کے ذریعہ سے اپنے توابع کے فوائد کی بھی نگرانی کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام نبی اپنے متبعین سے چندہ لیتے آئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اپنی قوم کے غریبوں کے علاوہ دوسری قوم کے غرباء اور شریف لوگوں کی بھی مدد کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ گلّہ بان اپنی بھیڑوں کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی مسلمانوں کے لئے زکوٰۃ کا حکم ہے اور زکوٰۃ کے جہاں اخراجات گنائے گئے ہیں اُن میں غریب اور مصیبت زدہ مسلمانوں کا بھی ذکر

مَآرِب

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿٢٠﴾ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢١﴾

(اس پر) اُس (یعنی خدا تعالیٰ) نے فرمایا۔ اے موسیٰ! اس عصا کو زمین پر پھینک دے ؎۱۹ سو اس نے اُسے زمین پر پھینک دیا جس کے بعد اس نے اچانک دیکھا

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢٢﴾

کہ وہ سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے ؎۲۰ اس پر اُس (یعنی اللہ تعالیٰ) نے فرمایا۔ اسکو پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اسکو پھر اس کی پہلی حالت کی طرف لوٹا دینگے ؎۲۱

کیا گیا ہے۔ اور مسافروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ اور مؤلفۃ القلوب کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً غیر مذاہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور اس طرح موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو سو فیصدی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ اُن کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنی قوم سے زکوٰۃ لو۔ یعنی اپنی قوم کے سونٹے کے ساتھ درختوں کے پتے جھاڑو۔ لیکن وہ پتے تمہاری قوم کے ہی کام نہ آئیں بلکہ اُن لوگوں کے بھی کام آئیں جو تمہاری قوم سے باہر ہیں۔ اور جانور کہلانے کے مستحق ہیں۔

؎۱۹ تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے موسیٰ! اس عصا کو زمین پر پھینک دے۔ یعنی دیکھ کہ اگر تو اپنی قوم کی نگرانی چھوڑ دے تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

؎۲۰ تفسیر۔ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى انہوں نے اُسے زمین پر پھینک دیا۔ تو اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ قوم کی ذرا سی بھی نگرانی چھوڑنے پر وہ سانپ کی طرح زہریلی بن گئی مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام چند دنوں کے لئے ہی پہاڑ پر گئے تو اُسی عرصہ میں وہ قوم بت پرست ہو گئی۔ اسی طرح جب کبھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگرانی میں رخنہ پڑا تو وہ قوم خراب ہو گئی۔

؎۲۱ حل لغات۔ اَلسِّيْرَةُ کے معنے ہیں اَلْهَيْئَةُ۔ ہیئت (اقرب)

اَلسِّيْرَةُ

تفسیر۔ سونٹے کو سانپ کی شکل میں دیکھ کر حضرت موسےٰ علیہ السلام گھبرائے تو اللہ تعالےٰ نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ یہ تمہاری قوم ہی ہے۔ اس کو اچھی طرح پکڑ لو۔ یہ پھر اصل حالت کی طرف لوٹ آئے گی۔ اور ایک مفید وجود بن جائے گی۔ یعنی تیری قوم تیری زندگی میں مستقل طور پر خراب نہیں ہو گی۔ بلکہ جب بھی تو اس کی طرف توجہ کرے گا وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

چنانچہ دیکھ لو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بے شک آپ کی قوم کا ایک حصہ شرک میں مبتلا ہو گیا۔ مگر جب آپ واپس آئے تو آپ کے ذریعہ اس قوم کی پھر اصلاح ہوئی اور اس نے اپنے فعل سے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اُن کی اس توبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (البقرۃ ع۶) اس واقعہ کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوشش سے قوم درست ہو گئی اور اللہ تعالےٰ نے اس سے رحمت اور عفو کا سلوک کیا۔ گویا حضرت

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ

اور اپنے ہاتھ کو بغل میں دبا لے۔ جب تو اُسے نکالے گا تو وہ سفید ہو گا۔ مگر بغیر

غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۳﴾

کسی بیماری کے۔ یہ ایک اور نشان ہو گا ؎۲۲

موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے علیحدگی نقصان دہ ثابت ہوئی لیکن جونہی آپ نے قوم کی طرف توجہ کی وہ پھر درست ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہر قسم کی قربانیاں کرنے لگ گئی۔

؎۲۲ حل لغات۔ اَلْيَدُ کے معنے ہیں اَلْكَفُّ ہاتھ۔ نیز اس کے ایک معنے اَلْجَمَاعَةُ کے بھی ہیں۔ یعنی جماعت (اقرب) تعطیر الانام میں ہے کہ اَلْيَدُ تَدُلُّ عَلَى الْوَلَدِ وَ الْاَخِ وَالْمَالِ وَالزَّوْجَةِ وَالشَّرِيْكِ وَالصَّدِيْقِ۔ اگر کوئی شخص خواب یا کشف میں ہاتھ دیکھے تو اس سے مراد لڑکا، بھائی، مال، بیوی، شریک اور دوست ہوتا ہے۔

اَلْجَنَاحُ کے معنے ہیں اَلْعَضُدُ بازو۔ اَلْاِبِطُ بغل۔ اَلْجَانِبُ پہلو۔ نَفْسُ الشَّيْءِ کسی چیز کی ذات۔ اور جب اَنَا فِيْ جَنَاحِ فُلَانٍ کا فقرہ کوئی شخص کہے تو معنے ہونگے اَيْ فِيْ ذُرَاهُ وَظِلِّهٖ میں اس کی پناہ اور سایہ تلے ہوں (اقرب)

تفسیر۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے پہلو کے ساتھ لگا لو۔ عربی زبان میں ید کے معنے بھائی کے بھی ہوتے ہیں اور جب اس کے معنوں کو وسیع کیا جائے تو اس کے معنے قوم کے بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ قوم کے افراد بھی اعیان و مددگار کے طور پر کام آتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ کہہ کر توجہ دلائی کہ تیری قوم میں سے جو کارآمد لوگ ہیں اور تیرے ساتھ ملنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کو اپنے ساتھ چمٹا لو۔ وہ بڑے نورانی وجود بن جائیں گے۔ اور بڑے بڑے روحانی کمالات اُن سے ظاہر ہونگے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہُوا کہ اپنے ہاتھ کو سینہ سے لگاؤ اور آپ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ تو اس وقت وہ بالکل سفید اور نورانی تھا۔ اور یہ سفیدی کسی بیماری کے نتیجہ میں نہیں تھی۔ درحقیقت یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو آپ نے دیکھا اور ایک عظیم الشان تعبیر کا حامل تھا۔ لیکن بائیبل اس کے متعلق یہ کہتی ہے کہ:-

"اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اُسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اُسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۶)

گویا نعوذ باللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ اس وقت کوڑھ کی وجہ سے سفید ہو گیا تھا حالانکہ کوڑھ کی وجہ سے ہاتھ کا سفید ہونا ایک عذاب ہے اور یہ مقام الٰہی تجلّی اور اس کی نشان نمائی کا تھا۔ ایسے موقعے پر کسی عذاب کا سوال ہی کہاں پیدا

اَلْيَدُ

اَلْجَنَاحُ

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿۲۴﴾

(اور ہم یہ اس لئے کرینگے) تاکہ اس کے نتیجہ میں ہم تجھ کو اپنے بڑے بڑے نشانات دکھائیں ۲۳؎

ہوتا ہے۔ پس بائیبل کی یہ بات بالبداہت غلط ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت اپنے آپ کو کوڑھی دیکھا تھا تو اُن کا ایمان کیا بڑھا ہوگا۔ وہ تو غمزدہ ہوئے ہونگے کہ مجھے کوڑھ ہوگیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ۔ اس کا ہاتھ سفید تو تھا مگر کوڑھ سے اُسے کوئی مشابہت نہ تھی ہم نے بتایا ہے کہ یہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ اپنی قوم کے کارآمد لوگوں کو اپنے ساتھ ملاؤ۔ اِن معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ ان لوگوں میں جو نیکی پائی جائیگی وہ ایسی کامل ہوگی کہ اس میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوگی۔ بعض لوگ ظاہر میں اچھے نظر آتے ہیں لیکن اندرونی طور پر نہایت خراب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ جب تم ان لوگوں کو اپنے قریب رکھوگے تو یہ کامل طور پر روحانی وجود بن جائینگے خرابیاں اُن میں اسی وقت پیدا ہونگی جب یہ تجھ سے دُور ہوجائیں گے۔

۲۳؎ **تفسیر**۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہم نے یہ نشان تجھے یہ یقین پیدا کرنے کے لئے دکھائے ہیں کہ ہم تیرے ہاتھ پر اور بھی بڑے بڑے نشانات ظاہر کرینگے جن سے تیرا مشن کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے اُن نشانات کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر دکھائے گئے۔ وہ فرماتا ہے:۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (اعراف ع ۱۶) یعنی جب فرعون اور اس کی قوم نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تو ہم نے ان پر کئی قسم کے عذاب بھیجے جن میں طوفان، ٹڈیوں جوؤں، مینڈکوں اور خون کا عذاب شامل تھا۔ اور یہ ایسے نشانات تھے جن کو ہر ایک مشاہدہ کرسکتا تھا۔ لیکن ان نشانوں کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ہماری بات ماننے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اسی طرح فرماتا ہے:۔ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (نمل ع ۱) یعنی ہم نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور پھر نکالو تو وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نظر آئیگا۔ یہ معجزہ اُن نو معجزات میں سے ایک ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر فرعون اور اس کی قوم کے لئے دکھائے گئے۔ لیکن انہوں نے ان معجزات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

بائیبل میں بھی ان نشانات کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ پہلا نشان عصا کا ہے جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اُس نے کہا لاٹھی۔ پھر اس نے کہا کہ اِسے زمین پر ڈال دے۔ اُس نے اسے زمین پر ڈالا۔ اور وہ سانپ بن گئی۔ اور موسیٰ اس کے

سامنے سے بھاگا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی دُم پکڑلے۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی بن گیا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۲ تا ۴)

(۲) پھر دوسرا نشان ہاتھ کی سفیدی کا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے :-

" پھر خداوند نے اسے یہ بھی کہا کہ تُو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اُسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۶ و ۷)

(۳) تیسرا نشان دریا کے لہو ہو جانے کا ہے چنانچہ لکھا ہے :-

" موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہوگیا اور دریا کی مچھلیاں مرگئیں اور دریا سے تعفّن اُٹھنے لگا۔ اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے۔"

(خروج باب ۷ آیت ۲۰-۲۱)

(۴) چوتھا نشان مینڈکوں کا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے :-

" خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا۔ اور مینڈکوں کو مُلک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے۔ اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔"

(خروج باب ۸ آیت ۵ تا ۷)

(۵) پانچواں نشان جوؤں کا ہے۔ اس کے متعلق آتا ہے :-

" تب خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مار تاکہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا۔ اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہوگئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔"

(خروج باب ۸ آیت ۱۶ تا ۱۸)

(۶) چھٹا نشان مچھروں کے عذاب کا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے :-

" خداوند نے ایسا ہی کیا اور فرعون کے گھر اور اس کے نوکروں کے گھروں اور سارے ملک مصر میں مچھروں کے غول کے غول بھر گئے۔ اور ان مچھروں کے غولوں کے سبب سے ملک کا ناس ہوگیا۔"

(خروج باب ۸ آیت ۲۴)

(۷) ساتواں نشان مری کا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے :-

" اور خداوند نے ایک وقت مقرر

کردیا اور بتا دیا کہ کل خداوند اس ملک میں یہی
کام کریگا - اور خداوند نے دوسرے دن ایسا
ہی کیا اور مصریوں کے سب چوپائے مر گئے لیکن
بنی اسرائیل کے چوپایوں میں سے ایک بھی نہ مرا۔"
(خروج باب ۹ آیت ۵ و ۶)

(۸) آٹھواں نشان جسموں پر پھوڑے نکلنے کا ہے
چنانچہ لکھا ہے :-

"اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا۔
کہ تم دونوں بھٹی کی راکھ اپنی مٹھیوں میں
لے لو - اور موسیٰ اسے فرعون کے سامنے
آسمان کی طرف اڑا دے اور وہ سارے ملک
مصر میں باریک گرد ہو کر مصر کے آدمیوں اور
جانوروں کے جسم پر پھوڑے اور پھپھولے
بن جائینگے - سو وہ بھٹی کی راکھ لیکر فرعون
کے آگے جا کھڑے ہوئے اور موسیٰ نے
اسے آسمان کی طرف اُڑا دیا اور وہ آدمیوں
اور جانوروں کے جسم پر پھوڑے اور
پھپھولے بن گئی۔"
(خروج باب ۹ آیت ۸ تا ۱۱)

(۹) نواں نشان اولوں کا ہے - چنانچہ لکھا
ہے کہ :-

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ
اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا کہ سب
ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت
کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے
گریں - اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان
کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد
اور اولے بھیجے - اور آگ زمین تک
آنے لگی - اور خداوند نے ملک مصر پر
اولے برسائے - پس اولے گرے اور
اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور
وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے
مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک
میں کبھی نہیں پڑے تھے -"
(خروج باب ۹ آیت ۲۲ ، ۲۳ و ۲۴)

(۱۰) دسواں نشان ٹڈیوں کا ہے - چنانچہ لکھا
ہے :-

"تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ
ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں
ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو
جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے
چٹ کر جائیں - پس موسیٰ نے ملک مصر
پر اپنی لاٹھی بڑھائی - اور خداوند نے
اس سارے دن اور ساری رات پُروا
آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پُروا
آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے
ملک مصر پر چھا گئیں - اور وہیں مصر کی
حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دَل ایسا
بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی
ٹڈیاں کبھی آئیں - نہ ان کے بعد پھر آئینگی
کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو
ڈھانک لیا - ایسا کہ ملک میں اندھیرا
ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی
ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں
کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا۔"
(خروج باب ۱۰ آیت ۱۲ تا ۱۶)

(۱۱) گیارھواں نشان تاریکی کا نشان ہے
چنانچہ لکھا ہے :-

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۲۵ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝۲۶

تو فرعون کی طرف جا - کیونکہ اُس نے سرکشی اختیار کی ہے - (اس پر موسیٰ نے) کہا - اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے -

" پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا - تاکہ ملک مصر میں تاریکی چھا جائے - ایسی تاریکی جسے ٹٹول سکیں اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھایا اور تین دن تک سارے ملک مصر میں گہری تاریکی رہی - تین دن تک نہ تو کسی نے کسی کو دیکھا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا - "

(خروج باب ۱۰ آیت ۲۱ تا ۲۳)

(۱۲) بارھواں نشان پلوٹھے بچوں کا مرنا ہے چنانچہ لکھا ہے :-

" اور آدھی رات کو خداوند نے ملک مصر کے سب پلوٹھوں کو فرعون جو اپنے تخت پر بیٹھا تھا اس کے پلوٹھے سے لیکر وہ قیدی جو قید خانہ میں تھا اسکے پلوٹھے تک بلکہ چوپایوں کے پلوٹھوں کو بھی ہلاک کر دیا اور فرعون اور اس کے سب نوکر اور سب مصری رات ہی کو اُٹھ بیٹھے - اور مصر میں بڑا کہرام مچ گیا کیونکہ ایک بھی ایسا گھر نہ تھا جس میں کوئی نہ مرا ہو - "

(خروج باب ۱۲ آیت ۲۹ و ۳۰)

(۱۳) تیرھواں نشان سمندر سے پار گذرنے کا ہے - چنانچہ لکھا ہے :-

" پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا - اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے - اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا - " (خروج باب ۱۴ - آیت ۲۱ و ۲۲)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے قرآن کریم نے صرف نو نشانات کا ذکر کیا ہے - یعنی

۱ - عصا کا نشان

۲ - یدِ بیضاء کا نشان

۳ - طوفان کا نشان

۴ - ٹڈیوں کا نشان

۵ - جوؤں کا نشان

۶ - مینڈکوں کا نشان

۷ - خون کا نشان

۸ - قحط کا نشان - جیسے فرمایا :- وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (اعراف ع ۱۶)

۹ - سمندر سے پار گذرنے کا نشان

اِن نشانات کے بیان کرنے میں قرآن کریم اور بائیبل میں اختلاف نظر آتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ بائیبل نے اِن نشانات کے بارے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے - ورنہ قرآن کریم نے جن نشانوں کا نو کی تعداد میں ذکر کیا ہے - اس میں بائیبل کے بیان کردہ تمام کے تمام نشانات آ جاتے ہیں چنانچہ طوفان میں اولوں اور تاریکی کا نشان شامل ہے لیکن بائیبل میں اس کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے

وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝۲۷ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝۲۸

اور جو فرض مجھ پر ڈالا گیا ہے اسکو پورا کرنا میرے لئے آسان کر دے - اور اگر میری زبان میں کوئی گرہ ہو تو اسے بھی کھول دے

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝۲۹ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝۳۰

(حتّٰی کہ) لوگ میری بات آسانی سے سمجھنے لگیں ۲۴؎ اور میرے اہل میں سے میرا ایک نائب تجویز کر -

اِسی طرح قرآن کریم نے خون کا نشان بیان کیا ہے لیکن بائیبل نے اسے دریا کے لہو ہو جانے اور جسموں پر پھوڑے اور پھنسیاں نکلنے میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ دریا کے پانی کے خون ہو جانے کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ دریا کا پانی اس قدر خراب ہو گیا تھا کہ جو کوئی اس کو پیتا تھا اس کا خون خراب ہو جاتا تھا - اسی طرح پلوٹھے بچوں کی موت کا نشان بائیبل نے علیحدہ بیان کیا ہے حالانکہ اسے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں - یا تو یہ نشان دَم کے نشان کے ماتحت آجاتا ہے اور یا پھر قمّل کے نشان کے ماتحت آجاتا ہے - کیونکہ جوؤں کھٹملوں اور مچھروں سے بیماری پھیلتی ہے اور ان سے موت واقع ہو جاتی ہے - اسی طرح قمّل کے ماتحت مچھروں کا نشان بھی آجاتا ہے کیونکہ عربی زبان میں قمّل کے معنے اُن چھوٹے کیڑوں کے بھی ہوتے ہیں - جن کے چھوٹے چھوٹے پَر ہوتے ہیں (اقرب) غرض ان نشانات کے بارے میں قرآن کریم کا بیان بالکل صحیح اور درست ہے -

۲۴؎ **تفسیر** - فرماتا ہے - یہ نشان دکھا کر ہم نے موسیٰؑ سے کہا - کہ اب فرعون کی طرف جا - کیونکہ وہ سرکش ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا - الٰہی مَیں جاتا تو ہوں لیکن آپ میرے سینہ کو کھول دیجئے - اور میرے کام کو آسان کر دیجئے اور میری زبان کو چلا دیجئے اور اس کی ساری گرہیں کھول دیجئے تاکہ فرعون اور اس کے ساتھی میری بات کو سمجھ سکیں - کیونکہ جو پیغام مجھے دیا گیا ہے اُس کا ان لوگوں کے لئے سمجھنا بڑا مشکل ہے -

اِس دُعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہ کہا ہے کہ اے میرے رب میرا سینہ کھول دے یعنی میرے اندر اس کام کے لئے ایک قسم کی دیوانگی جوش اور ولولہ پیدا فرما دے - اور میرے معاملہ میں میرے لئے آسانیاں پیدا کر دے - یعنی ایسی تعلیم اور ایسے احکام مجھے دے کہ لوگ اس کو ماننے کے لئے تیار ہوں - اور اسی طرح وہ تعلیم ایسی اعلیٰ درجہ کی ہو کہ جس کا پھیلانا آسان ہو اور پھر مجھے اُس کے بیان کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائیں اُسے عمدہ طریق سے پیش کر سکوں - اور اس کے بعد اے میرے خدا لوگوں کی طبائع اس طرف پھیر دے تاکہ وہ اس تعلیم کی طرف توجہ کرنے لگیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا سے ظاہر ہے کہ ہدایت درحقیقت خُدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے - تقریروں اور دلیلوں سے نہیں آتی - اِسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی کہ الٰہی جو تعلیم میں دوں اُس پر خود بھی عمل کروں اور دوسرے لوگ بھی اس کو آسانی سے مان لیں -

اِن آیات میں تبلیغ کا یہ گُر بتایا گیا ہے کہ

هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۱﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۲﴾ وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۳﴾ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۴﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۵﴾

(یعنی) ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اُس کے ذریعہ سے میری طاقت کو مضبوط کر۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر ۔ ۵۱ تاکہ ہم (دونوں) کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیرا ذکر کریں۔

انسان اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دُعا کرتا رہے۔ پس ہمارے مبلغین کو یہ دُعا بار بار مانگتے رہنا چاہیئے۔

۲۵ حل لغات۔ وَزِیْرٌ کے معنے مُعَاوِنٌ کے ہیں (اقرب) اَلْاَزْرُ کے معنے ہیں اَلظَّهْرُ پیٹھ۔ اَلْقُوَّةُ۔ طاقت اور قوت (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرق ظاہر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی وحی ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ مجھے کوئی ساتھی بھی دے اور اس کے ذریعہ سے میری طاقت کو بڑھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گو تھوڑے سے وقفہ کے لئے انکسارًا یہ ظاہر کیا کہ میں اتنا بڑا بوجھ اٹھانے کے ناقابل ہوں۔ مگر پھر اکیلے ہی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہوگئے (فداہ ابی وامی وجسدی وروحی) تبھی قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (الجن ع) یعنی جب ہمارا بندہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کھڑا ہوتا ہے تاکہ خدا کی عبادت کو دنیا میں قائم کرے تو لوگ اس پر حملہ کرنے کے لئے دوڑے چلے آتے ہیں۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ساری عمر اکیلے کھڑے رہے اور ساری قوم کے حملے سہتے رہے۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ جب اُحد کے موقعہ پر کفار کا ایک تجربہ کار جرنیل آگے بڑھا اور صحابہؓ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے آگے کھڑے ہوگئے تو اُس نے کہا۔ میرا صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مقابلہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ پھر جب وہ حملہ کرتے ہوئے آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے صرف اپنا نیزہ بڑھا کر اُسے چھُو دیا۔ قتل کرنے کی پھر بھی کوشش نہیں کی۔ اس پر وہ شخص یہ چلاتا ہوا دوڑ گیا کہ ہائے میں مرگیا۔ ہائے میں مرگیا۔ جب اس کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ تم تو اتنے بڑے جرنیل ہو۔ اس تھوڑے سے زخم سے کیوں چلا رہے ہو تو اس نے کہا تم کو معلوم نہیں۔ اس شخص کے نیزہ کی اَنی میں سارے جہنم کی آگ بھری ہوئی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ میرا سارا جسم جل رہا ہے (سیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

اسی طرح غزوۂ حنین کے موقعہ پر جب دشمن دائیں بائیں کے ٹیلوں پر چڑھ کر تیر برسا رہا تھا اور مکہ کے نومسلموں کے بھاگ جانے کی وجہ سے صحابہؓ کے پاؤں بھی اکھڑ گئے تھے۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور اکیلے کافروں کے دو رویہ لشکروں میں گھس گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر آپ کے گھوڑے کی باگ پکڑلی اور کہا۔ یا رسول اللہ! مسلمانوں کو لوٹنے دیجئے۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اس پر آپ نے

وَزِیْرًا

إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا ﴿۳۶﴾ قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ

تو ہمیں خوب دیکھ رہا ہے ۵۲۶ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا - اے موسیٰ! جو تو نے مانگا تجھے

يٰمُوسٰى ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ﴿۳۸﴾ إِذْ

دیا گیا اور ہم (اس سے پہلے) ایک بار اور بھی تجھ پر احسان کر چکے ہیں - جب ہم نے

أَوْحَيْنَا إِلٰى أُمِّكَ مَا يُوحٰى ﴿۳۹﴾ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ

تیری ماں پر وحی کے ذریعہ وہ سب کچھ نازل کر دیا جو (ایسے موقعہ پر) نازل کرنا ضروری تھا (جس کی تفصیل یہ ہے) کہ اس (یعنی موسیٰ) کو تابوت میں

حضرت ابوبکرؓ کو سختی سے ہٹا دیا اور فرمایا - میرے گھوڑے کی باگ چھوڑ دو اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ - أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

(بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ و یوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم)

اے لوگو! میں موعود نبی ہوں - میں جھوٹا نہیں - تم مجھے مار نہیں سکتے مگر میرے اس نشان کو دیکھ کر مجھے خدا نہ بنا لینا میں عبدالمطلب کا بیٹا اور انسان ہوں -

کتنا عظیم الشان فرق ہے مسیح میں اور میرے آقا میں - وہ ساری رات یہ دعائیں مانگتا رہا کہ "اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے" (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) مگر پھر بھی اسکو لوگوں نے خدا بنا دیا - وہ صرف دو گھنٹے صلیب پر لٹکا رہا اور اتنے عرصے میں ہی خدا تعالیٰ سے شکایت کرنے لگا کہ "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" (متی باب ۲۷ آیت ۴۷) مگر میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے دشمن کے نرغہ میں گھر گیا جو دو طرف پہاڑیوں پر چڑھا ہوا تھا - اور دونوں طرف سے اس پر تیر اندازی کر رہا تھا - اور اُس کے ساتھی ایک فریب میں آکر بھاگ گئے تھے - مگر پھر بھی وہ اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوا - اور پھر بھی اس نے یہی کہا کہ میں انسان ہوں خدا نہیں کیسی اندھی ہے وہ دنیا جو ان واقعات کے بعد بھی مسیح کو آسمان پر چڑھاتی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین میں دفن کرتی ہے - اگر آسمان پر کوئی چڑھ سکتا تھا تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اگر زمین میں دفن ہونے کا کوئی مستحق تھا تو مسیح ناصری - مگر یہ طاقت اللہ ہی کو ہے کہ وہ لوگوں کو آنکھیں دے کہ وہ ہر ایک کا مقام پہچانیں -

۵۲۶ تفسیر - حضرت موسیٰ علیہ السلام تو کثرت سے تسبیح کرنے کے لئے ایک ساتھی مانگ رہے ہیں - لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے ہی اس کام کو کرتے تھے - جیسا کہ سورۃ مزمل میں آتا ہے :- إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ (سورۃ مزمل ع ۲ آیت ۲۱) یعنی تیرا رب اس بات کو خوب جانتا ہے کہ تو کبھی دو تہائی رات کے قریب - کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات نماز میں کھڑا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بجا لاتا ہے اور تیری اقتداء میں

فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ

رکھدے پھر اس (تابوت) کو دریا میں رکھدے ۔ پھر (اس کے بعد یوں ہو کہ) دریا ہمارے حکم سے اس (تابوت) کو ساحل تک پہنچا دے

عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ

(تاکہ) اسکو وہ شخص لے جائے جو میرا بھی اور اُس (یعنی موسیٰ) کا بھی دشمن ہے ۔ اور تجھ پر میں نے اپنی طرف سے محبت نازل کی (یعنی تیرے لئے لوگوں کے دلوں

لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝۴۰ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ

میں محبت پیدا کی) اور اسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ تُو ہماری آنکھوں کے سامنے پالا گیا ۔ (یاد کر وہ) وقت ہُوا جب تیری بہن (ساتھ ساتھ) چلتی جاتی تھی اور کہتی جاتی

وقف لازم

اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ

تھی کہ اے لوگو! کیا میں تمہیں اس عورت کا پتہ بتاؤں جو اسکو پال لیگی ۔ اور اس طرح ہم نے تجھ کو تیری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اسکی آنکھیں ٹھنڈی

عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ

ہو جائیں اور وہ غم نہ کرے ۔ اور (اے موسیٰ!) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا پھر ہم نے تجھ کو اس غم سے نجات بخشی اور ہم نے تجھ کو اور کئی

فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۬ۥ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ

امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح آزمایا (جس کے بعد) تو کئی سال مدین کے لوگوں میں رہا ۔ پھر اے موسیٰ! (ہوتے ہوتے) تو اس عمر کو

عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝۴۱ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝۴۲ ۚ

پہنچ گیا جو ہمارے کام کے قابل ہوتی ہے اور میں نے تجھ کو اپنی ذات کیلئے (روحانی ترقی دیتے دیتے) تیار کیا ۔ ۲۷

مومنوں کا ایک بڑا گروہ بھی تیرے ساتھ عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے ۔ پس اس آیت سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کا فرق ظاہر ہے ۔

۲۷ حل لغات لِتُصْنَعَ ۔ اَلصُّنْعُ کے معنے ہیں اِجَادَةُ الْفِعْلِ کسی کام کو اچھی طرح سے کرنا (اقرب) اور عَلٰى عَيْنِيْ کا محاورہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی کی حفاظت اور شفقت مطلوب ہو (اقرب) پس لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ کے معنے ہونگے ۔ تاکہ تو ہماری خاص شفقت اور رحمت میں پرورش پائے ۔

لِتُصْنَعَ

اِصْطَنَعَ فُلَانًا لِنَفْسِهٖ کے معنے ہیں اِخْتَارَهٗ لِنَفْسِهٖ ۔ اس کو اپنے لئے چن لیا (اقرب) پس اِصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ کے معنے ہونگے ۔ میں نے تجھ کو اپنے کام کے لئے چن لیا ۔

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے

فرمایا کہ اے موسیٰ! جو کچھ تُو نے مانگا ہے وہ سب کچھ ہم نے تجھے دیا۔ اِس میں اشارۃً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی وعدہ ہے کہ آپ کو بھی وہی کچھ دیا جائیگا جو آپ مانگیں گے۔

پھر ہم نے اُسے کہا کہ یہ ہمارا دوسری دفعہ احسان ہے۔ پہلی دفعہ وہ احسان تھا جب تیری ماں نے تجھے ہمارے حکم کے مطابق دریا میں پھینک دیا تھا - اور ہم نے ایسا ذریعہ اختیار کیا تھا کہ جس کی وجہ سے تُو پھر اپنی ماں کی طرف لوٹا دیا گیا - اور یہ نشان جو دریا سے بچانے کا تھا اس لئے ظاہر کیا گیا تاکہ تُو میرے فضل کے نیچے پرورش پائے -

اسجگہ بائیبل کے اس بیان کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی ماں نے ٹوکرے میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا اور وہ بہتے ہوئے اس جگہ پر جا لگے جہاں فرعون کی بیٹی سیر کر رہی تھی۔ اور اس نے آپ کو دیکھا تو اُسے رحم آیا اور کہنے لگی کہ یہ کسی عبرانی کا بچہ ہے - اور اُس نے کہا - آؤ ہم اس بچے کو پال لیں۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پالیں کس طرح - اتنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بہناپے کی محبت سے بے تاب ہو کر دریا کے کنارے آتی ہوئی نظر آئی اور اُس نے دیکھ لیا کہ موسےٰ کو فرعون کی لڑکی نے پسند کر لیا ہے اور اس کی پرورش کرنا چاہتی ہے مگر حیران ہے کہ کس طرح پرورش کرے تب وہ آگے بڑھی اور اُس نے اپنی ماں کا پتہ بتایا - کہ وہ اس بچہ کو پال لے گی - اور اس طرح بیٹا اپنی ماں کی گود میں آگیا -

بائبل نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ چونکہ فرعون کا حکم تھا کہ اسرائیلی بچوں کو مار دیا جائے اس لئے اس خوف سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے "سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا اور اُسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی" (خروج باب ۲ آیت ۳)

بائیبل کے اس بیان اور قرآن کریم کے اس بیان میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم تو بتاتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی ماں کو یہ وحی کی کہ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ - یعنی اُسے تابوت میں رکھدے اور پھر اس کو دریا میں ڈال دے لیکن بائیبل میں سرکنڈوں کے ٹوکرے میں ڈالنے کا ذکر ہے - لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اختلاف کوئی حقیقت نہیں رکھتا - کیونکہ مختلف ملکوں میں سامان رکھنے کے لئے مختلف چیزوں سے برتن بنائے جاتے ہیں - دریا کے کنارے کے لوگ جھاڑیوں کی شاخوں سے ایسے بکس بنا لیتے ہیں جن میں وہ چیزیں رکھتے ہیں - عربی زبان میں ہم اسکو تابوت کہہ دیں گے - یہ ضروری نہیں کہ تابوت سے مراد لکڑی کا بنا ہُوا بکس ہو - پس یہ اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں - لیکن پھر بھی قرآنی الفاظ زیادہ درست ہیں اسلئے کہ جس چیز کو دریا میں ڈالا جائیگا وہ بہر حال ایسی ہی ہو گی جس کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے - اسی لئے بائیبل بھی بتاتی ہے کہ سرکنڈے کے ٹوکرے پر چکنی مٹی اور رال لگا کر اُس کے سوراخوں کو بند کیا گیا - اور جب سرکنڈے کے ٹوکرے پر مٹی اور رال وغیرہ لگا کر اسے اچھی طرح بند کیا گیا تو وہی ٹوکرا تابوت بن گیا -

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے واقعہ سے بھی ایک مشابہت حاصل ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ موسیٰؑ کو دودھ پلوانے کے لئے اس کی بہن نے کوشش کی - لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلانے والی

عورت کو خدا تعالیٰ خود پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا۔ چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مکّہ کے اردگرد کے گاؤں کی عورتیں ایک خاص موسم میں مکّے میں جمع ہو جاتی تھیں تاکہ امیروں کے بچّے دودھ پلانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم چند ماہ کے ہوگئے اور وہ وقت آیا جب عورتیں باہر سے آتی تھیں تو باہر سے کچھ عورتیں آئیں جن میں آپ کی ہونے والی دائی حلیمہ بھی تھی۔ حلیمہ کا خاندان غریب تھا۔ اس لئے جن امیر گھروں میں بھی وہ گئی انہوں نے اپنا بچہ اُسے دینے سے انکار کر دیا یہ سمجھ کر کہ یہ غریب عورت بچے کو اچھی طرح سے پال نہیں سکیگی۔ حلیمہ سارا دن مکّہ کے گھروں میں پھرتی رہی اور ردّ ہوتی رہی۔ اور میرے آقا کی ماں بیوہ آمنہ اپنے گھر میں کسی مناسب دایہ کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن کسی مناسب دایہ نے اِس گھر میں جھانکنا تک پسند نہ کیا، اس خیال سے کہ آمنہ کے یتیم بچے کے پالنے کا بدلہ کون دیگا جب سارا دن مکّہ کے ہر گھر سے حلیمہ دھتکاری گئی تو اس نے خیال کیا کہ اگر میں بغیر بچّے کے گئی تو بدنام ہو جاؤنگی۔ چلو اگر کسی امیر گھرانے کا بچہ نہیں ملتا تو غریب گھرانہ کا یتیم محمدؐ ہی ساتھ لیتی جاؤں (سیرۃ الحلبیہ جلد اول صفحہ ۹۶) گویا ساری دائیوں کا رد کردہ بچہ اُس دایہ نے لیا جسے سب مکّہ والوں نے رد کر دیا تھا۔ اور اس طرح وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو صحف سابقہ میں آچکی ہے کہ

"جس پتھر کو معماروں نے ردّ کیا وہی
کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔"

(متی باب ۲۱ آیت ۴۲)

دایہ بھی معمار ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی بچہ کی پرورش کرتی اور اُسے کھڑا ہونے کے قابل بناتی ہے۔ غرض وہ تمام دائیوں کا ردّ کیا ہُوا بچّہ حلیمہ کے گھر گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک صحت افزا مقام پر پرورش کا انتظام فرما دیا۔ مگر خدا تعالیٰ کی غیرت دیکھو کہ جس یتیم بچے کے لے جانے سے حلیمہ ڈرتی تھی اسی یتیم بچے کو خدا تعالیٰ نے ایک دن اس کی قوم سے لڑوا دیا اور اس کو غالب کر دیا۔ حلیمہ کی قوم کے بہت سے افراد غزوۂ حنین میں قید ہوئے اور بہت سے جانور پکڑے گئے۔ حلیمہ کی قوم کے مالدار فرعون حلیمہ کے غریب بچوں سے سفارش کی خواہش کرنے سے گھبراتے تھے لیکن آخر مجبور ہو کر اُن کے پاس گئے۔ اور جاکر کہا کہ قوم کی نظر تو تمہیں پر ہے۔ جاؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی قوم کی سفارش کرو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک اُن کا انتظار کرتے رہے تھے۔ آخر مجبور ہو کر آپ نے حلیمہ کی قوم کے اموالِ غنیمت کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ صرف غلام رہنے دئے تھے۔ جب حلیمہ کی ایک بچی آپ کے پاس سفارش کے لئے آئی۔ تو آپ نے فرمایا۔ مَیں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ آخر تنگ آکر مال تقسیم کر دیا۔ اب تم خود ہی پسند کر لو۔ آیا مَیں مال واپس لے کر تم کو دے دوں یا قیدی تم کو دے دوں۔ اس نے قوم سے مشورہ کیا اور کہا ہمیں قیدی چاہئیں مال نہیں چاہیئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کے سامنے یہ معاملہ رکھا۔ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم خوشی سے اپنے اپنے قیدی آزاد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو ہوازن کا چھ ہزار قیدی رہا کر دیا گیا۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱)

اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَاَخُوۡكَ بِاٰيٰتِىۡ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ ۝۴۲

(پس جب تو اُس عمر کو پہنچ گیا تو میں نے تجھے کہا کہ) تُو اور تیرا بھائی میرے نشان لے کر جاؤ اور میرے ذکر میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔

اِذۡهَبَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳

تم دونوں ہی فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے[۲۸]

اب موسیٰؑ کی پرورش کے واقعہ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پرورش کے واقعہ کا مقابلہ کرکے دیکھو۔ یہ دونوں واقعات آپس میں مشابہ بھی ہیں لیکن پھر بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا واقعہ موسیٰؑ کی پرورش کے واقعہ سے اپنی شان میں ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

۲۸ حل لغات۔ لَا تَنِيَا: وَنٰى سے نہی کا صیغہ ہے اور وَنَى الرَّجُلُ فِى الْاَمْرِ کے معنے ہیں فَتَرَ وَ ضَعُفَ۔ کمزور ہوگیا اور سست ہوگیا (اقرب) پس لَا تَنِيَا کے معنے ہونگے۔ تم دونوں سستی نہ کرنا۔

تفسیر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت ہے۔ چنانچہ آپ کو بھی اللہ تعالےٰ نے فرعون کی مثیل قوم کی طرف بھیجا اور فرمایا اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل ع ۱) یعنی ہم نے تمہاری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح تمہارا نگران بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف موسیٰؑ کو بھیجا تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ گو فرعون کی طرح آپ کی قوم نے بھی آپ کو قتل کرنیکی دھمکی دی مگر آپ ڈرے نہیں بلکہ بڑی جرأت سے خدا تعالیٰ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچاتے رہے اس کے بعد جب مکہ کے رؤساء نے دیکھا کہ ان کے اپنے گھروں میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو بتوں میں خدائی طاقت تسلیم نہیں کرتے اور وہ کھلے طور پر خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں تو یہ بات ان کی برداشت سے بالکل باہر ہوگئی اور وہ اکٹھے ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس گئے۔ اور اُن سے کہا کہ ہم نے آپکی خاطر اب تک آپ کے بھتیجے کو کچھ نہیں کہا مگر اب معاملہ حد سے نکل چکا ہے اور یہ ہمارے بتوں کی تذلیل کر رہا ہے اس لئے آپ یا تو اُسے سمجھائیں اور اس طریق سے اُسے باز رکھنے کی کوشش کریں ورنہ ہم صرف اس کا نہیں بلکہ آپکا بھی مقابلہ کریں گے اور آپ کو اپنی قوم کی سرداری سے الگ کر دیں گے۔ ابو طالب کے لئے اپنی ریاست کو چھوڑنا ایک نہایت ہی تلخ گھونٹ تھا۔ انہوں نے سرداران قریش سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنے بھتیجے کو سمجھانے کی کوشش کرونگا۔ چنانچہ اُن کے چلے جانے کے بعد ابو طالب نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور اُن سے کہا کہ اے میرے بھتیجے! اب تیری قوم تیرے خلاف سخت مشتعل ہو چکی ہے اور قریب ہے کہ وہ تجھے بھی اور ساتھ ہی مجھ کو بھی ہلاک کر دیں۔ مَیں تجھے خیر خواہی اور ہمدردی سے

لَا تَنِيَا

کہتا ہوں کہ تُو بتوں کو بُرا بھلا نہ کہہ - ورنہ میں اپنی ساری قوم کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا -
جب ابو طالب نے یہ بات کہی تو اس وقت انکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے - انہیں غمزدہ دیکھ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے - مگر آپ نے فرمایا - خدا کی قسم اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لاکر کھڑا کر دیں تب بھی مَیں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا جس کے لئے خدا نے مجھے کھڑا کیا ہے - اور اے میرے چچا اگر آپ کو اپنی کمزوری اور تکلیف کا احساس ہے تو بے شک مجھے اپنی پناہ میں رکھنے سے دست بردار ہو جائیں - مَیں خدا تعالےٰ کی توحید کی اشاعت سے کسی صورت میں بھی نہیں رُک سکتا - مَیں اس کام میں مشغول رہوں گا یہاں تک کہ خدا مجھے موت دے دے - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس جواب کا ابو طالب پر اتنا اثر ہؤا کہ انہوں نے کہا - اے میرے بھتیجے جا اور اپنے کام میں مشغول رہ - اگر قوم مجھے چھوڑنا چاہتی ہے تو بے شک چھوڑ دے - مَیں تجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا (سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۸۸)

اسی طرح اُحد کی جنگ میں جب آپ زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے اور لوگوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو اس سے دشمنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی - اور ابوسفیان نے سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر بلند آواز سے کہا کہ بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟ چونکہ اس وقت بہت سے مسلمان زخمی پڑے تھے اور لشکر منتشر ہو چکا تھا اور خطرہ تھا کہ کفار پھر لوٹ کر مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی جواب نہ دے - جب اس نے دیکھا کہ مسلمان بالکل خاموش ہیں اور وہ کوئی جواب نہیں دے رہے جس کے معنے یہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واقعہ میں شہید ہو چکے ہیں - تو پھر اُس نے کہا ابو بکرؓ کہاں ہے - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کوئی نہ بولے - جب اس سوال پر بھی ابوسفیان نے مسلمانوں کو خاموش دیکھا تو اُس نے سمجھا کہ ابو بکرؓ بھی مارے گئے ہیں - اِس پر پھر اس نے بلند آواز سے کہا کہ بتاؤ عمرؓ کہاں ہے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کوئی جواب نہ دے - اس سے ابوسفیان کو یقین ہو گیا کہ عمرؓ کو بھی ہم نے مار ڈالا ہے اور اُس نے بڑے جوش سے کہا - اُعْلُ ھُبُلْ - اُعْلُ ھُبُلْ - یعنی ہبل جو ہمارا بڑا بُت ہے اس کی شان بلند ہو کیونکہ آج اُس نے اپنے مخالفوں کو چن چن کر ہلاک کر دیا ہے - جب اس نے یہ نعرہ لگایا تو چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار صحابہؓ کو یہ ہدایت دے چکے تھے کہ خاموش رہو اس لئے صحابہؓ پھر بھی خاموش رہے اور وہ بولے نہیں - اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑے جوش سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے - کہو اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ - اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلُّ - یعنی اللہ ہی اعلیٰ اور بلند شان والا ہے - اللہ ہی اعلیٰ اور بلند شان والا ہے - صحابہؓ نے یہ جواب دیا تو ابوسفیان کہنے لگا - لَنَا الْعُزّٰی وَ لَا عُزّٰی لَکُمْ - ہمارے پاس تو عزیٰ ہے مگر تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں - اِس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - کہو

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٥﴾ قَالَا

اور تم دونوں اُس سے نرم نرم کلام کرو۔ شاید کہ وہ سمجھ جائے یا (ہم سے) ڈرنے لگے۔ دونوں نے عرض کیا کہ

رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٦﴾

اے ہمارے رب! ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے یا ہم پر حد سے زیادہ سختی نہ کرے۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٧﴾ فَاْتِيٰهُ

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ تم دونوں بالکل نہ ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں (تمہاری دعائیں بھی) سنتا ہوں اور (تمہاری حالت بھی) دیکھتا ہوں۔ پس دونوں

فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬

اُس کے پاس چلے جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں۔ پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے اور ان کو

وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَ

تکلیفیں مت دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک بڑا نشان لیکر آئے ہیں اور (تجھے بتلاتے ہیں کہ) جو

السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٨﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ

(شخص ہماری لائی ہوئی) ہدایت کے پیچھے چلیگا (خدا کی طرف سے) اسپر سلامتی نازل ہوگی۔ ہم پر یہ وحی نازل کی گئی ہے۔ کہ

اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٩﴾

جو کوئی (خدا کے نشان کو) جھٹلائے گا۔ اور پیٹھ پھیرلے گا۔ اُس پر عذاب نازل ہوگا[29]

اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ ہمارا اللہ ہمارا حافظ و ناصر ہے مگر تمہارا کوئی حافظ و ناصر نہیں (سیرۃ الحلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۰) اب دیکھو باوجود اس کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ یہ موقعہ انتہائی طور پر نازک ہے اور اگر اسوقت دشمن کو جواب دیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ دوبارہ حملہ کردے۔ جب ابوسفیان نے اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ کیا تو آپؐ برداشت نہ ہوسکا اور آپ نے بڑے جوش سے فرمایا تم غلط کہتے ہو ہبل اور عزیٰ میں کیا طاقت ہے، اصل طاقت تو زمین و آسمان کے خدا میں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ غرض خطرناک سے خطرناک مواقع پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نڈر اور بہادر پہلوان کی طرح دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہوجاتے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ڈر اور خوف کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے۔

[29] حل لغات۔ يَفْرُطُ۔ فَرَطَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور فَرَطَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اٰذَاهُ۔ اس کو تکلیف دی۔ پس اَنْ يَّفْرُطَ

يَفْرُطُ

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ

(اس پر فرعون نے) کہا۔ اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (موسیٰ نے) کہا۔ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو (اسکی ضرورت کے مطابق)

شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۲﴾

اعضاء عطا کئے ہیں اور پھر اُن (اعضاء) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے۔ (فرعون نے) کہا (اگر یہ بات ہے) تو پہلے لوگوں کا کیا حال تھا (یعنی وہ تو ان باتوں

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۳﴾

کو نہیں مانتے تھے اُن سے کیا سلوک ہوگا!) (موسیٰ نے) کہا اُن (پہلے لوگوں) کا علم تو میرے رب کو ہے (ان سب کے حالات اسکی) کتاب میں محفوظ (ہیں)

کے معنے ہونگے کہ وہ ایذاء یا دُکھ دے۔ فَرَطَ فِي الْاَمْرِ کے معنے قَصَّرَ فِيْهِ کے بھی ہیں یعنی کسی معاملہ میں کمی کی (اقرب) پس اَنْ يَّفْرُطَ کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ کمی کرے یعنی ہماری بات ہی نہ سُنے۔

تفسیر:- اس میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت پائی جاتی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ فرعون سے نرم نرم باتیں کرنا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ منذر ہو کر خدا کے متعلق باتیں سناتے ہیں بلکہ ان کے مرید بھی ایسے ہی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (سورة القلم) یعنی اے محمد رسول اللہ! کفار چاہتے ہیں کہ تو اپنے دین کے متعلق ذرا نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کرنے لگ جائیں مگر تو ایسا نہیں کرتا۔ اور مومنوں کے متعلق فرمایا:- اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (سورة الفتح ع ۴) یعنی دشمن کتنا ہی ان سے نرمی کرے اُنکو دین کے معاملہ میں نرم کرنا چاہے وہ کبھی دین کے معاملہ میں کوئی لچک نہیں دکھاتے۔ ہاں مومن اگر سختی بھی کریں تو اُس کو بھلا دیتے ہیں۔

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى میں اللہ تعالیٰ فرعون کے متعلق کہتا ہے کہ شاید وہ نصیحت پکڑے اور ڈرے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ کو علم تھا یا نہیں کہ وہ مانیگا یا نہیں اگر تھا تو شاید کا لفظ کیوں رکھا اور اگر یہ شاید یقین کے معنوں میں آیا ہے تو یہ بات غلط نکلی کیونکہ فرعون نے مانا نہیں پھر شاید کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لَعَلَّ بے شک شک پر دلالت کرتا ہے لیکن ماہرین لغت کہتے ہیں کہ لَعَلَّ میں امید کے معنے بھی پائے جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ یہ امید قائل کی طرف سے ہو بلکہ کبھی قائل کی طرف سے ہوتی ہے کبھی سامع کی طرف سے اور کبھی اس شخص کی طرف سے جس کے متعلق بات کہی گئی ہو آیت لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى میں لَعَلَّ کا لفظ موسیٰ اور ہارون کے لئے ہے یعنی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا رَاجِيَيْنِ اَنْ يَّتَذَكَّرَ یعنی اس امید کے ساتھ فرعون کو تبلیغ کرنا کہ شاید وہ ہدایت پا جائے۔ پس لَعَلَّ کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کا کلام جو کسی پیشگوئی پر مشتمل ہوتا ہے اس میں بالعموم یہی طریق اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر دوسرا شخص اپنی اصلاح کریگا تو بچ جائیگا۔ اور اگر نہیں کریگا تو ہلاک ہوگا۔

۵۳ تفسیر:- جب خدا تعالیٰ کی صفات اور اُسکی وحی نازل کرنے کی عادت کا ذکر فرعون نے سُنا تو چونکہ وہ ان باتوں سے ناواقف تھا اُس نے حیران ہو کر موسیٰ سے پوچھا کہ اے موسیٰ: یہ کیسا خدا تو نے پیدا کر لیا ہے جو پہلے لوگوں نے کبھی سُنا نہ تھا۔ اِسپر موسیٰ نے کہا کہ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ دنیا میں ایک کامل نظام پایا جاتا ہے اور ہر مخلوق کو اُسکی ضرورت کے مطابق اعضاء ملے ہیں اور اُن اعضاء سے کام لینے کا طریق بھی وہ

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ

(وہی ہے) جس نے تمہارے لئے اس زمین کو فرش کے طور پر بنایا ہے۔ اور اُس میں تمہارے لئے راستے بھی

فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ

نکالے ہیں۔ اور آسمان سے پانی اتارا ہے۔ پھر (تو ان سے یہ بھی کہدے کہ) ہم نے اس پانی کے ذریعہ سے

پیدائش سے سیکھ کر آتی ہے۔ اسپر فرعون نے کہا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى اگر یہ بات ہے تو ہمارے باپ دادے جو ان باتوں سے ناواقف تھے انکا تو بُرا حال ہوگا۔ اِس طرح اُس نے لوگوں کو اشتعال دلانا چاہا اور وہی حربہ استعمال کیا جو ہمیشہ سے انبیاء کے مخالف استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں عام طور پر سچائی کے مقابلہ میں لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر تمہارے باپ دادے تو جھوٹے اور جہنمی ہوئے اور جب کسی بات کے ساتھ جذبات مل جاتے ہیں تو دلیل لوگوں کی نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب توحید کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو ایک بُت پرست فوراً کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے سُنو! یہ توحید کے پرستار کیا کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں۔ تمہارے باپ دادے بڑے جاہل تھے بڑے احمق اور نادان تھے جو بُتوں کے آگے سر جھکاتے رہے۔ اب کون شخص یہ ماننے کیلئے تیار ہو سکتا ہے کہ اس کے باپ دادا واقعہ میں جاہل تھے۔ آخر کافر کو بھی اپنے ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، اسلئے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ انہیں بُرا بھلا کہا جائے۔ پس جب وہ اُن کے سامنے شرک کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ تمہارے باپ دادے اسے مانتے تھے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جاہل اور بے ایمان تھے تو لوگوں میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں یہ تمہارے باپ دادا کو بُرا بھلا کہتے ہیں انہیں قتل کر دو۔ ان کا مال و اسباب لوٹ لو اور انہیں اپنے ملک سے نکال دو۔ ہم اپنے ماں باپ کی ہتک برداشت نہیں کر سکتے۔ غرض مخالف ہمیشہ اس اشتعال انگیز حربہ سے کام لیتے رہے ہیں مگر یہ حربہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوا فطرتِ صحیحہ ہمیشہ غالب آتی رہی ہے، اور یہ حربہ ناکامیاب ہوتا رہا ہے۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے جواب میں کہا کہ باپ دادوں کا حال تو خدا کو معلوم ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر شخص سے اس کے حالات کے مطابق معاملہ کرتا ہے مجھے کیا معلوم ہے کہ تمہارے باپ دادوں تک کونسی سچائی پہنچی تھی اور کونسی سچائی نہیں پہنچی یا یہ کہ اُن پر حجت تمام ہوئی تھی یا نہیں۔ جزا سزا تو پورے حالات کے علم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور وہ صرف خدا کو ہے۔ پھر میں اس بارہ میں کیا کہہ سکتا ہوں جو حقیقت سے بے خبر ہوں۔

اِسی امر کے متعلق بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ جزا سزا اتمام حجت سے تعلق رکھتی ہے اور اتمام حجت کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے، بندہ اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ جب آپ پر بعض مُرتدوں نے الزام لگایا کہ آپ اپنے نہ ماننے والوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے صاف انکار کیا اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں میرا عقیدہ تو اپنے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی ہے کہ اُن کے نہ ماننے والوں میں سے بھی وہی دوزخی ہونگے جن پر حجت تمام ہو چکی ہوگی چنانچہ آپ نے اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں تحریر فرمایا کہ:-

"ڈاکٹر عبد الحکیم خان اپنے رسالہ المسیح الدجال وغیرہ میں میرے پر یہ الزام لگاتا ہے کہ گویا میں نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ جو شخص میرے پر ایمان نہیں لائیگا گو وہ میرے نام سے بھی بے خبر ہوگا اور گو وہ ایسے ملک میں ہوگا جہاں تک میری

اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۴﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ

مختلف قسم کی روئیدگیوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں - (پس) تم بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۵۵﴾ ع مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ ع

اس میں عقل والے لوگوں کے لئے بہت سے نشان ہیں ۱۳۵ ہم نے اِسی (زمین) سے تم کو پیدا کیا ہے

دعوت نہیں پہنچی تب بھی وہ کافر ہو جائیگا اور دوزخ میں پڑے گا۔ یہ ڈاکٹر مذکور کا سراسر افترا ہے۔ مَیں نے کسی کتاب یا کسی اشتہار میں ایسا نہیں لکھا۔ اُس پر فرض ہے کہ وہ ایسی کوئی میری کتاب پیش کرے جس میں یہ لکھا ہے۔ یاد رہے کہ اس نے محض چالاکی سے جیسا کہ اس کی عادت ہے یہ افتراء میر پر کیا ہے۔ یہ تو ایسا امر ہے کہ بالبداہت کوئی عقل اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ جو شخص بکلی نام سے بھی بے خبر ہے اس پر مؤاخذہ کیونکر ہو سکتا ہے ...... ایسا ہی عقیدہ میرا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بارہ میں بھی ہے کہ جس شخص کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ چکی ہے اور وہ آپ کی بعثت سے مطلع ہو چکا ہے اور خدا تعالےٰ کے نزدیک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارہ میں اُس پر اتمام حجت ہو چکا ہے وہ اگر کفر پر مرگیا تو ہمیشہ کی جہنم کا سزاوار ہوگا اور اتمام حجت کا علم محض خدا تعالیٰ کو ہے۔ ہاں عقل اسبات کو چاہتی ہے کہ چونکہ لوگ مختلف استعداد اور مختلف فہم پر مجبول ہیں اس لئے اتمام حجت بھی صرف ایک ہی طرز سے نہیں ہو گا۔"

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷۸ و ۱۷۹)

۱۳۵ حل لغات۔ شَتّٰی۔ اَلشَّتِیْتُ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں اَلْمُتَفَرِّقُ۔ مختلف اور متفرق (اقرب)

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یہ جواب دینے کے بعد کہ جزا سزا دینے والا تو صرف خدا ہے جس کو سب باتوں کا علم ہے۔ پھر مَیں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اور فرمایا کہ دیکھو۔ اللہ تعالےٰ نے اس زمین کو ایسا بنایا ہے کہ اس سے انسان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھر سفر کے ایسے طریق نکالے ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک جا سکتا ہے اور اُس نے آسمان سے پانی اُتارا ہے تاکہ زمین اپنی روئیدگی نکالے۔ پھر اس پانی سے وہ مختلف قسم کی روئیدگیاں نکالتا ہے تاکہ تم بھی کھاؤ اور تمہارے جانور بھی کھائیں۔ پھر تم کیوں نہیں سمجھتے کہ اسی طرح خدا تعالیٰ آسمان سے روحانی پانی بھی اتارتا ہے یعنی وحی اور اس سے مختلف روحانی علوم پیدا کرتا ہے تاکہ جو اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور جو ادنیٰ یعنی چارپایوں کی طرح ہیں وہ بھی اپنے ظرف کے مطابق اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ اگر کوئی سوچنے والا ہو تو اس مثال سے وہ بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ﴿٥٦﴾

اور اُسی میں تم کو لوٹا دیں گے ۔ اور اُسی میں سے تم کو دوسری دفعہ نکالیں گے ۔ ۳۲ٰ

وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ﴿٥٧﴾ قَالَ

اور ہم نے اس (یعنی فرعون) کو اپنے ہر قسم کے نشان دکھائے مگر (باوجود ان کے) وہ جھٹلانے پر مصر رہا اور انکار کرتا چلا گیا اور کہنے لگا

أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿٥٨﴾

اے موسیٰ! کیا تو اس لئے ہمارے پاس آیا ہے تاکہ اپنی سحر بیانی کے ذریعہ سے ہم کو ہماری زمین سے نکال دے ۳۳ٰ

یعنی جسطرح مادی پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اسی طرح روحانی پانی یعنی الہام الٰہی بھی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے بھی آدمیوں اور جانوروں کی غذا مہیا کی جاتی ہے یعنی ان لوگوں کی غذا بھی جو اعلیٰ روحانی طاقتیں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کی غذا بھی جن کی روحانی حالت کمزور ہوتی ہے۔
فَأَخْرَجْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نباتات کے جوڑے ہیں۔ اس مسئلہ کا سوائے چند ایک چیزوں مثلاً کھجور کے آج سے سو سال قبل کسی کو علم نہیں تھا۔ مگر اب بیشمار نباتی چیزوں کے جوڑے ثابت ہو چکے ہیں جو قرآن کریم کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت ہے۔

۳۲ٰ **تفسیر**۔ گذشتہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کا ذکر ہے جو اُن کا فرعون کے ساتھ ہُوا۔ اس مکالمہ کے دوران میں انہوں نے خدا تعالیٰ کے متعلق اپنا عقیدہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اب اس کے بعد فرماتا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى۔ یعنی ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی زمین میں تمہیں مرنے کے بعد لوٹائیں گے اور پھر اسی زمین سے تمکو دوبارہ نکال کر کھڑا کرینگے۔ یہ وضاحت اللہ تعالیٰ نے اسلئے فرمائی کہ فرعون کی قوم ستارہ پرست تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ ستاروں سے روحیں اُترتی اور جنم لیتی ہیں اور پھر وہیں چلی جاتی ہیں۔ اسی عقیدہ کے ماتحت ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی قومیں بنیں جن کے ناموں میں اس طرف اشارہ تھا کہ چاند اور سورج سے جن روحوں نے اُتر کر جنم لیا اُن کے خاندانوں کے یہ نام ہیں۔ پس چونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ دنیا کے کاروبار کا تعلق ستاروں سے ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور اسی کے قبضہ و تصرف میں تمام ارواح ہیں۔
اس آیت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی زندگی اُس کی موت اور اس کا دوبارہ بعث اسی زمین سے وابستہ ہے۔ پس جب یہ ایک مسلمہ قانون ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کیسے جا سکتے ہیں۔

۳۳ٰ **تفسیر**۔ اس میں فرعون موسیٰ کی ایک اور چالاکی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ موسیٰ مجھ کو تخت حکومت سے الگ کرکے خود اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اسے ایک قومی سوال بنا کر کہتا ہے کہ کیا تو اس لئے آیا ہے کہ اپنی چالوں سے ہمیں

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا

(اگر یہ بات ہے) تو ہم بھی تیرے مقابلہ میں ویسا ہی جادو لائیں گے۔ پس ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک (وقت اور) مقام موعود مقرر کر

لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۹﴾ قَالَ

نہ اُس سے ہم پیچھے ہٹیں اور نہ تو ہٹے۔ وہ (ایک ایسا) مکان (ہو جو) ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہو ؂۳۴ (اس پر موسٰی نے) کہا

مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۶۰﴾

کہ تمہارے (ہمارے) اکٹھے ہونیکا دن (تمہاری) عید کا دن ہو۔ اور نیزہ بھر سورج چڑھے سب لوگوں کو جمع کیا جائے ؂۳۵

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۱﴾ قَالَ لَهُمْ

اس پر فرعون پیٹھ پھیر کر چلا گیا اور جو تدبیریں اُس سے ممکن ہو سکتی تھیں انکو مہیا کیا اور پھر (موسٰی کی طرف) لوٹا۔ (تب) موسٰی نے ان سے

مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ

کہا۔ اے لوگو! تم پر ہلاکت ہو۔ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو عذاب کے ذریعہ سے

ہمارے ملک سے نکال دے۔ گویا اُس نے چاہا کہ ملک کے تمام باشندوں کو موسٰیؑ کے خلاف بھڑکائے اور انہیں جوش دلائے کہ موسٰی تمہیں نکال کر اپنی قوم کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اُسوقت فرعون کی حکومت مصر پر اُسی طرح تھی جس طرح انگریز ایک مدت تک ہندوستان پر حکمران رہے ہیں۔ اسلئے اسنے اصل باشندوں کو بھی بھڑکانا ضروری سمجھا تاکہ موسٰیؑ کی مخالفت ایک قومی مسئلہ بن جائے۔

؂۳۴ حل لغات۔ لَا نُخْلِفُهٗ۔ اَخْلَفَ سے ہے اور اَخْلَفَهٗ مَا وَعَدَهٗ کے معنے ہیں قَالَ شَيْئًا وَلَمْ يَفْعَلْهُ یعنی کسی بات کے کرنے کا وعدہ کیا اور پھر نہ کیا۔ (اقرب) پس لَا نُخْلِفُهٗ کے معنے ہونگے۔ ہم وعدہ کے خلاف نہیں کرینگے۔

سُوًى کے معنے ہیں اَلْعَدْلُ۔ برابر۔ اَلْوَسَطُ درمیانہ (اقرب) اور لَا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَا اَنْتَ مَكَانًا سُوًى میں مَكَانًا سُوًى کے معنے ہیں مَعْلَمًا اَيْ ذَا مَعْلَمٍ یعنی ایسی جگہ جس تک پہنچنے کے نشانات کا سب کو علم ہو۔ گویا ایسی مشہور جگہ جس کو سب جانتے ہوں (اقرب)

تفسیر معلوم ہوتا ہے فرعون موسٰی مکّہ کے لوگوں کی نسبت زیادہ منصف تھا۔ اسی طرح آجکل کے بعض مولویوں کی نسبت بھی اُس میں زیادہ انصاف پایا جاتا تھا کیونکہ وہ موسٰیؑ کے مشورہ سے مقابلہ کیلئے ایسی جگہ مقرر کرتا ہے جہاں فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو اور موسٰیؑ اور فرعون کو ایک جیسے حقوق حاصل ہوں لیکن آجکل کے مولوی یا پادری جس سے اختلاف ہوتا ہے اُسے ایسی مجلس میں بلاتے ہیں جس میں اُن کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہو تاکہ فساد ہو اور وہ اپنے دشمنوں کو مار پیٹ سکیں۔

؂۳۵ تفسیر۔ حضرت موسٰی علیہ السلام یہی چاہتے تھے کہ کوئی ایسی جگہ تجویز ہو جو فریقین کیلئے

بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۲﴾ فَتَنَازَعُوْٓا

پیس ڈالے ۔ اور جو کوئی (خدا پر) افترا کرتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے ۔ یہ سن کر (فرعون اور اُس کے ساتھی)

اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۳﴾ قَالُوْٓا اِنْ

آپس میں جھگڑنے لگے اور خفیہ منصوبے کرنے لگے ۔ (اور بالآخر) انہوں نے کہا یہ دونوں (یعنی موسیٰ

هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ

اور ہارون) اور کچھ بھی نہیں صرف جادوگر ہیں (جو) یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہاری زمین سے اپنے جادو کے زور

اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۴﴾

سے نکال دیں ۔ اور تمہارے اعلیٰ درجہ کے مذہب کو تباہ کر دیں ۳۶

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ

پس چاہیئے کہ تم بھی اپنی تدبیریں سوچ لو پھر سب کے سب ایک جماعت کی شکل میں آؤ اور جو (شخص) آج

الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۵﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ

جیتے گا وہ ضرور بامراد ہوگا ۳۷ (اس پر اُن لوگوں نے جن کو موسیٰ کے مقابلہ کیلئے فرعون نے جمع کیا تھا) کہا کہ اے موسیٰ!

مساوی ہو اسلئے انہوں نے کہا مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى کہ زینت یعنی عید کا دن ہونا چاہیئے۔ یہ اُن کا ایک مقدس دن تھا جسمیں کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی تھی۔ جیسے عربوں میں حج کے ایام مقدس سمجھے جاتے ہیں پھر صبح کا وقت مقرر کیا گیا یہ بھی بہت اچھا وقت تھا کیونکہ دن میں کام کرنے کی وجہ سے لوگوں کے دماغ تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور اچھی طرح توجہ پیدا نہیں ہو سکتی لیکن صبح کے وقت دماغ تازہ ہوتا ہے اس لئے بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

۳۶ حل لغات۔ يُسْحِتَكُمْ۔ اَسْحَتَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَسْحَتَ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَاْصَلَهٗ اس کو جڑھ سے اکھیڑ دیا (اقرب)، پس يُسْحِتَكُمْ کے معنے ہونگے تم کو ہلاک کر دیگا۔ جڑھ سے اکھیڑ دیگا۔

اَلْمُثْلٰى کے معنے ہیں۔ افضل۔ اعلیٰ (اقرب)

تفسیر۔ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یہ فرعون کے ساتھیوں کا قول ہے جنہوں نے لوگوں کو جوش دلانے کیلئے کہا کہ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم کو اپنے فریب سے ملک سے نکال دیں۔ اور تمہارا مذہب جو سب سے افضل ہے اس کو مٹا دیں۔ گویا دنیوی اور مذہبی دونوں طریق سے انہوں نے لوگوں کو اشتعال دلانا چاہا۔

۳۷ تفسیر۔ آجکل دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اچھے مقصد کے لئے خواہ کیسے ہی ناجائز ذرائع استعمال کرنے پڑیں جائز

تُلۡقِيَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ﴿۶۶﴾ قَالَ بَلۡ

یا تو (اپنی تدبیر) پھینک (یعنی ظاہر کر) یا ہم تجھ سے پہلے پھینکیں ۔ ۳۸ھ (تب موسیٰ نے) کہا (بہتر یہ ہے) کہ

اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ

تم اپنی تدبیر پھینکو (یعنی ظاہر کرو) پس انہوں نے جو تدبیر کی اس کے نتیجہ میں اُن کی رسیاں اور اُن کے سونٹے موسیٰ کو ان کے

مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ﴿۶۷﴾ فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ

فریب کی وجہ سے یوں نظر آئے گویا کہ وہ دوڑ رہے ہیں ۳۹ھ اور موسیٰ اپنے نفس میں پوشیدہ

خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ﴿۶۸﴾ قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ﴿۶۹﴾

طور پر ڈرا ۔ (تب) ہم نے وحی کی (اے موسیٰ!) مت ڈر ۔ کیونکہ تُو ہی غالب آئے گا ۔

وَاَلۡقِ مَا فِىۡ يَمِيۡنِكَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا

اور جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اسکو زمین پر ڈال دے جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس سب کو وہ نگل جائیگا (یعنی اسکا بھانڈا پھوڑ دیگا)

ہوتے ہیں ۔ حالانکہ ناجائز ذرائع کے ساتھ کسی چیز کے حصول کی کوشش ہی اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس چیز کا صداقت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ۔ یہی حربہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے استعمال کیا اور لوگوں کو اکسایا کہ تم سے جو کچھ دھوکا اور فریب ممکن ہو اُس سے کام لو اور جسقدر چالبازی کر سکتے ہو کرو ۔ تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم نے موسیٰ پر غلبہ حاصل کرنا ہے پس یہ مت دیکھو کہ تمہاری تدابیر کیسی ہیں ۔ یہ دیکھو کہ تم نے کامیاب ہونا ہے پس جس قدر تدابیر اختیار کر سکتے ہو اختیار کرو ۔

۳۸ھ تفسیر ۔ ساحر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کیلئے تو تیار ہو گئے ۔ مگر باوجود اس کے کہ فرعون ان کے ساتھ تھا اور اسوجہ سے ان کے اندر کبر اور غرور ہونا چاہیئے تھا ۔ انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ کہا کہ اے موسیٰ! بتایئے آپ ابتدار کریں گے یا ہم ابتداء کریں ۔ مثنوی رومی والوں نے اس کے متعلق ایک نہایت ہی لطیف بات لکھی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کا یہی ادب تھا جو ان کے کام آیا اور اللہ تعالےٰ نے جو نکتہ نواز ہے انہیں دولتِ ایمان سے بہرہ ور فرما دیا ۔

۳۹ھ تفسیر ۔ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى سے معلوم ہوتا ہے کہ جادوگروں کی اُن رسیوں اور سونٹوں میں یا تو پارہ تھا یا لچکدار پیچ تھے جن کے دبانے کی وجہ سے وہ ہلنے لگ جاتے تھے ۔ یورپ سے آجکل ایسی چیزیں بہت کثرت سے آتی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بھی ایسی صنعت جاری تھی اور اسی کو جادوگروں

صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝۷۰

انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ تو فریب کاروں کا ایک فریب ہے اور فریب کار جس طرف سے بھی آئے (خدا کے مقابلہ میں) کامیاب نہیں ہو سکتا ۴۰

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ

پس (جب موسیٰ کے سونٹا ڈالنے کے بعد فرعون کے لائے ہوئے) چالباز (اپنی فرد دی سمجھ گئے تو وہ اپنی ضمیر کی آواز سے) سجدہ میں گرائے گئے اور کہنے لگے ہم ہارون

وَمُوْسٰى ۝۷۱ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ

اور موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں ۴۱ (اس پر فرعون نے) کہا۔ کیا تم میرے حکم سے پہلے ہی اس پر ایمان لاتے ہو (معلوم ہو گیا کہ) وہ تمہارا

لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ

سردار ہے جس نے تم کو یہ چالاکیاں سکھائی ہیں پس (اس فریب کی سزا میں) میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں (اپنی)

اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ

اپنی خلاف ورزی کی وجہ سے کاٹ دونگا - اور (میں تم کو) کھجور کے تنوں سے باندھ کر

نے مقابلہ کے لئے اختیار کیا۔

۴۰ حل لغات ۔ اَوْجَسَ الرَّجُلُ اِيْجَاسًا کے معنے ہوتے ہیں اَحَسَّ وَاَضْمَرَ۔ محسوس کیا اور چھپایا (اقرب) خِيْفَةً کے معنے ہیں اَلْحَالَةُ الَّتِيْ يَكُوْنُ عَلَيْهَا الْاِنْسَانُ مِنَ الْخَوْفِ۔ وہ حالت جو خوف کی وجہ سے انسان پر طاری ہوتی ہے (اقرب)۔ تَلْقَفْ لَقِفَ سے ہے اور لَقِفَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاوَلَهٗ بِسُرْعَةٍ۔ کسی چیز کو جلدی سے لے لیا (اقرب) پس تَلْقَفْ کے معنے ہونگے۔ جلدی سے نگل لیگا۔

تفسیر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کے ذریعہ بتا دیا کہ ان چیزوں کے اندر پیچ ہیں اور کچھ نہیں۔ ان پر زور سے سونٹا مار دو۔ پیچ ٹوٹ جائیں گے اور ان کی حرکت بند ہو جائیگی اور اس طرح معنوی طور پر تیرا سونٹا انکی رسیوں اور سانپوں کو نگل جائے گا۔ یعنی اُن کا فریب لوگوں پر ظاہر کر دیگا۔

۴۱ تفسیر ۔ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا بڑا معنے خیز فقرہ ہے۔ جو بتاتا ہے کہ جادوگروں کی شکست اتنی واضح تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی خفیہ طاقت نے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی ہے۔ چنانچہ وہ سجدہ میں گر گئے۔ اور چونکہ اپنی شکست سے اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا رب اُن کی تائید میں ہے۔ اس لئے فوراً کہہ اُٹھے کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى۔ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔

جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَلَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰی ﴿۷۱﴾

صلیب دے دوں گا - اور تم کو معلوم ہو جائیگا کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے ۵۴۲

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ

اِسپر انہوں نے (یعنی فرعون کے پہلے ساتھیوں یا ساحروں نے) کہا۔ ہم تجھ کو ان نشانات پر فوقیت نہیں دے سکتے جو (خدا کی طرف سے) ہمارے

فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ

پاس آئے ہیں اور نہ اُس (خدا) پر جس نے ہم کو پیدا کیا۔ پس جو تیرا زور لگتا ہے لگالے - تو صرف اس دنیا کی زندگی کو

الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا

ختم کر سکتا ہے - ہم (اب) اپنے رب پر ایمان لاچکے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے

وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ

اور اس دھوکا بازی (کے مقابلہ) کو بھی معاف کردے جس کیلئے تونے ہم کو مجبور کیا تھا۔ اور اللہ سب سے بہتر اور

اَبْقٰی ﴿۷۳﴾ اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ

سب سے زیادہ قائم رہنے والا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے رب کے پاس مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوتا ہے اُسے یقیناً

جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ﴿۷۴﴾ وَمَنْ یَّاْتِهٖ

جہنم ملتی ہے - نہ وہ اُس میں مرتا ہے اور نہ زندہ رہتا ہے - اور جو شخص مومن ہونے کی

۵۴۲ **حل لغات**۔ مِنْ خِلَافٍ کے معنے ہیں اِحْدَاهُمَا مِنْ جَانِبٍ وَّالْاُخْرٰی مِنْ جَانِبٍ اٰخَرَ یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں (مفردات) اور مِنْ خِلَافٍ کے معنے مخالفت کی وجہ سے بھی ہو سکتے ہیں (مفردات)

تفسیر۔ فرعون کا دعویٰ تو یہ تھا کہ ہم ایسے لوگ بلائیں گے جو موسیٰؑ سے بڑے ہونگے مگر جب ساحر شکست کھاکر موسیٰ کے قدموں میں گر گئے تو فرعون کو سخت غصہ آیا اور اُس نے اپنی ذلت چھپانے کیلئے اُن سے کہا کہ تم میرے کہنے سے پہلے ہی کیوں ایمان لے آئے۔ اب میں تمہیں اس کی سزا دوں گا -

مِنْ خِلَافٍ کے یہ معنے ہیں کہ خلاف ورزی کی وجہ سے یا یہ کہ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں مختلف اطراف سے کاٹوں گا - مثلاً دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں۔ یہ اس لئے کیا جاتا تھا تاکہ انسان بالکل ناکارہ ہو جائے -

مِنْ خِلَافٍ

مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ

حالت میں جبکہ وہ ساتھ ساتھ مناسب حال عمل بھی کرتا ہوگا اُس (یعنی خدا تعالیٰ) کے پاس آئیگا تو ایسا ہر شخص اعلیٰ درجے

الْعُلٰى ﴿۷۶﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

پائیگا - (وہ درجے) ہمیشہ رہنے والے باغات (ہونگے) جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی (اور وہ

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۷﴾ ع ۳ ۱۲

اُن میں رہتے چلے جائیں گے اور یہ اُس (شخص) کا مناسب بدلہ ہے جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے ۵۴۳

۵۴۳ تفسیر - وہی جادوگر جو پہلے فرعون سے بھیک مانگ رہے تھے ایمان نصیب ہوتے ہی اتنے دلیر ہو گئے کہ فرعون کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اُسے کہدیا کہ ہم تیری بات سُننے کیلئے تیار نہیں۔ ہم تو اسی بات کو مانیں گے جو ہمارے خدا کی طرف سے آئیگی۔ تو اگر کچھ کرسکتا ہے تو یہی کہ دنیا کی زندگی کو منقطع کر دے سو بے شک کر دے ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ خدا نے اپنے فضل سے ہمیں حق کی شناخت کی توفیق عطا فرما دی ہے۔ اب دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں کفر کی طرف واپس نہیں لوٹا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایمان کامل کسی کو نصیب ہو جائے تو پھر دنیا کی مشکلات اور دنیا کی تکالیف اُس کی نگاہ میں بالکل بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔ احادیث میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ ایمان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اور جب وہ کسی شخص کو سچے طور پر حاصل ہو جائے تو اس کی نگاہ میں دُنیا کتنی بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ اُحد کی جنگ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کے نتیجہ میں لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ تمام مدینہ میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور عورتیں اور بچے بلبلاتے اور چیختے ہوئے میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑے۔ شہر سے نکلنے والی عورتوں میں ایک ستر سالہ بڑھیا بھی تھی اُسکی بینائی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ دُور کی چیز کو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی اور قریب آ جانے پر بھی وہ زیادہ تر دکھ کر کو اُس کی آواز سے ہی پہچانتی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اُس وقت میدان جنگ سے بخیریت واپس تشریف لا رہے تھے اور آپ کی خاص طور پر حفاظت کرنے کے لئے ایک انصاری صحابیؓ آپ کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اور وہ اِس فخر میں آپ کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے تھے کہ ہم خدا کے رسولؐ کو میدان جنگ سے زندہ وسلامت لے آئے ہیں۔ اُن کے ایک دوسرے بھائی اسی جنگ میں شہید ہو چکے تھے۔ جب مدینہ سے عورتوں اور بچوں کا ایک ریلا روتا اور بلبلاتا ہوا نکل رہا تھا تو اُس صحابیؓ نے دیکھا کہ اُن کی ستر سالہ بڑھیا ماں بھی بے تابی کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ اُس نابینا بڑھیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اُسے رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ جب اس صحابیؓ نے اپنی ماں کو دیکھا تو انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! میری ماں! یا رسول اللہ! میری ماں! مطلب یہ تھا کہ اُس کا جوان بیٹا اِس بڑھاپے کی عمر اور کمزوری میں

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۥ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ فَاضْرِبْ

اور ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی تھی کہ میرے بندوں (یعنی اپنی قوم) کو رات کے اندھیرے میں نکال کر لیجا

لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا

پھر انکو سمندر میں ایک راستہ بتا جو خشک ہو - نہ تم کو یہ ڈر ہوگا کہ کوئی (شخص) آکر پیچھے سے پکڑ لے

تَخْشٰى ﴿۷۸﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ

اور نہ تم (سمندر کی تباہی) ڈرو گے (اس پر موسیٰؑ اپنی قوم کو لیکر سمندر کی طرف گئے) اور فرعون اپنے لشکر لیکر انکے پیچھے پیچھے چلا اور

مارا گیا ہے - آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں تاکہ اُسکے دل کو تسکین حاصل ہو - رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کو سمجھ گئے - وہ بڑھیا قریب آئی - تو آپ نے فرمایا - میری اونٹنی کو کھڑا کرو - پھر آپ نے اُس عورت کو مخاطب کیا اور فرمایا - اے خاتون! میں تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے بیٹے کو شہادت کا مرتبہ دیا وہ تمہیں صبر دے اور تمہارے اس غم کو دُور کرے - نظر کی کمزوری کی وجہ سے وہ عورت حیران ہوئی کہ یہ آواز مجھے کہاں سے آرہی ہے - وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں اور آواز تھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی - دیکھتے دیکھتے اُس کی نظر آپ کے چہرہ پر پڑ گئی - اور اُس نے پہچان لیا کہ آپ ہی ہیں اور آپ ہی اسوقت مجھ سے بول رہے ہیں - تو جیسے عورت خفگی میں بولتی ہے بڑی تنک کر کہنے لگی - یا رسول اللہ! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں - یا رسول اللہ! آپ زندہ آگئے میرے بیٹے کا یہاں کیا ذکر ہے - سوال تو آپ کی زندگی کا تھا - سو الحمد للہ کہ آپ خیریت سے آگئے -

توحقیقت یہ ہے کہ اگر ہم کو خدا مل جائے اور اگر اپنے ایمان کے نتیجہ میں اور ہر قسم کے خطرات کو مول لینے کے بعد خدا کا دامن ہمارے ہاتھ میں آجائے تو ہمیں بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہیں ہو سکتی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو سچے دل کے ساتھ حلاوتِ ایمان نصیب ہو جائے تو اس کے بعد اگر اُس کو آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو وہ اُسکو بہت زیادہ پسند کریگا بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے عقیدہ کو چھوڑ دے (بخاری کتاب الایمان)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ پُرانے زمانہ کی اُمتوں میں سے جن کو ایمان نصیب ہوتا تھا لوگ اُنکے سروں پر آرے رکھ کر انہیں چیر دیتے تھے - اور وہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتے تھے لیکن اپنے ایمان پر قائم رہتے تھے - صحابہؓ میں بھی اس کی نظیریں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں - حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہی دیکھ لو - انہیں بھوکا رکھا جاتا تھا - اس کے بعد اُن کو تپتی ہوئی ریت پر لٹاتے - بڑا سا گرم پتھر اُنکے سینہ پر رکھتے اور پھر ایک آدمی اُن کے سینہ پر چڑھ جاتا اور کودتا اور کہتا - کہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں اور لات، مناۃ اور عزیٰ خدا کے

الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۹﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۸۰﴾

سمندر نے اُنکو اور اُسکے ساتھیوں کو بالکل ڈھانپ لیا - اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہدایت کا طریق نہ بتایا ۴۴۵

شریک ہیں - زبان اُن کی لٹک جاتی تھی - گلا اُن کا خشک ہو جاتا تھا مگر وہ یہی کہتے جاتے تھے - کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور جب بالکل ہی بے دم ہو جاتے تو فرماتے اَحَدٌ اَحَدٌ یعنی خدا ایک ہی ہے - غرض اس قربانی کا صحابہؓ نے جو نمونہ دکھایا تاریخ اس کے ذکر سے بھری پڑی ہے - یہی نمونہ ان جادوگروں نے دکھایا اور فرعون سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تیری بات سننے کے لئے تیار نہیں - ہم تو اُسی بات کو مانیں گے جو ہمارے خدا کی طرف سے آچکی ہے اور جس کی صداقت کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں -

۴۴۵ تفسیر - فرماتا ہے - ہم نے موسٰے کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں یعنی بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال لے جاؤ - اور سمندر میں سونٹا مار کر ان کے لئے خشک راستہ بنا دو - تم اس طرح اُس کو پار کر لوگے اور تعاقب سے اور ڈوبنے سے نہ ڈروگے - پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت بنی اسرائیل کا تعاقب کیا لیکن سمندر کا ایسا ریلا آیا کہ وہ غرق ہو گئے اور یوں فرعون نے اپنی قوم کو تباہی میں ڈالا اور اس سے بچ نہ سکا -

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو فرعونیوں نے ان کا تعاقب کیا - جب وہ قریب پہنچے تو بنی اسرائیل گھبرا گئے - خدا تعالےٰ نے اُن کو تسلی دی اور موسیٰؑ سے کہا کہ سمندر پر سونٹا ماریں - اُن کے سونٹا مارنے سے سمندر میں ایک رستہ ہو گیا اور دونوں طرف پانی اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح ریت کے ٹیلے - جب وہ اس میں سے گذر گئے تو اُن کے بعد فرعونیوں نے بھی گذرنا چاہا مگر اتنے میں پانی واپس آ گیا اور وہ سمندر میں غرق ہو گئے -

قرآن کریم میں اس واقعہ کے متعلق دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں - ایک فَرَقَ اور ایک اِنْفَلَقَ - جس کے معنے جدا ہو جانے کے ہیں - پس قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق اس واقعہ کی یہی تفصیل ثابت ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کے وقت سمندر کنارہ سے ہٹ گیا تھا اور خشکی نکل آئی تھی - اُس میں سے بنی اسرائیل گذر گئے تھے - اور بحیرۂ احمر کے اس کنارہ پر جس پر سے موسیٰؑ گذرے یہ نظارہ عموماً نظر آتا رہتا ہے - چنانچہ لائف آف نپولین میں بیان کیا گیا ہے کہ جب نپولین مصر گیا تو وہ اس جگہ کو دیکھنے گیا جس کی نسبت روایت میں ہے کہ وہاں سے مصری گذرے تھے - اُس وقت لہر پیچھے کو ہٹی ہوئی تھی - وہ ایشائی کنارہ کی طرف چلا گیا - اور مختلف چیزوں کے دیکھنے میں اس کا بہت سا وقت لگ گیا - جب وہ واپس لوٹنے لگا تو رات آ گئی اور یہ جماعت راستہ بھول گئی - رات کی تاریکی بڑھ گئی اور گھوڑے زیادہ سے زیادہ پانی کی اونچی ہونے والی لہروں میں دھنسنے لگے - حتّٰی کہ پانی گھوڑوں کے تنگوں تک پہنچ گیا اور ہلاکت یقینی ہو گئی - اس مصیبت سے نپولین نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو اسی نہ گھبرانے والی طبیعت کے ذریعہ سے نکالا جو اُسے کسی موقعہ پر بھی چھوڑتی نہ تھی - گھوڑے آدھی رات کے وقت جا کر کہیں

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ

اے بنی اسرائیل! ہم تم کو تمہارے دشمن سے نجات دے چکے ہیں اور اس کے بعد ہم تم سے طور

جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ

کے دائیں طرف ایک بالمقابل وعدہ کر چکے ہیں۔ اور ہم نے تم پر ترنجبین اور بٹیر بھی اتارے تھے

السَّلْوٰى ﴿۸۱﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا

(تاکہ تمہارے لئے خوراک مہیا کریں) (اور کہا تھا کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے پاک چیزیں کھاؤ اور اس (رزق)

تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِىْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ

کے بارے میں ظلم سے کام نہ لینا تا ایسا نہ ہو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے۔ اور جس پر میرا غضب

عَلَيْهِ غَضَبِىْ فَقَدْ هَوٰى ﴿۸۲﴾ وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ

نازل ہو وہ (بلندی سے) گر جاتا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے

پانی سے باہر نکلے جبکہ وہ چھاتی تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کنارہ پر لہر بائیس فٹ تک اونچی اٹھتی ہے۔ نپولین نے باہر نکل کر کہا کہ:-

" اگر میں اس طریق پر فرعون کی
طرح غرق ہو جاتا تو تمام مسیحی پادریوں
کو میرے خلاف وعظ کرنے کا ایک
اچھا مصالحہ مل جاتا۔ "

(LIFE OF NEPOLEON BONAPART BY JEAN S. C. ABBOT .)

اس واقعہ میں معجزہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر کے سامنے پہنچایا جبکہ جزر کا وقت تھا اور اُس نے مصریوں کے راستہ میں اس قسم کی رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دیں جن سے اُن کی رفتار سست ہو گئی۔ یہاں تک کہ پانی کے لوٹنے کا وقت آگیا۔

بائیبل میں لکھا ہے کہ خدا نے

" ان کے رتھوں کے پہیوں کو نکال
ڈالا۔ سو اُن کا چلانا مشکل ہو گیا۔"
(خروج باب ۱۴ آیت ۲۵)

معلوم ہوتا ہے کہ فرعون جب سمندر پر پہنچا ہے اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اُس خشک ٹکڑے کا جس سے وہ گذر رہے تھے اکثر حصّہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے ان کو پار ہوتے دیکھ کر جلدی سے اُس میں اپنی رتھیں ڈال دیں مگر سمندر کی ریت جو گیلی تھی اس کی رتھوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اور اس کی رتھیں اس میں پھنسنے لگیں اور اس قدر دیر ہو گئی کہ مدّ کا وقت آگیا۔ اور پانی بڑھنے لگا۔ اب نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سمندر نے اُسے

وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۳﴾

اور پھر مناسب حال عمل (بھی) کرے اور ہدایت پا جائے تو میں اُسکے (بڑے سے بڑے) گناہ معاف کر دیا کرتا ہوں ۴۵

درمیان میں آ گیا اور وہ اور اُس کے ساتھی سمندر میں غرق ہو گئے۔

۴۵ حل لغات:۔ اَلْمَنُّ۔ مَنَّ يَمُنُّ کا مصدر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مَنَّ عَلَيْهِ بِالْعِتْقِ وَغَيْرِهٖ يَمُنُّ مَنًّا اَىْ اَنْعَمَ عَلَيْهِ بِهٖ مِنْ غَيْرِ تَعَبٍ وَلَا نَصَبٍ وَاصْطَنَعَ عِنْدَهٗ صَنِيْعَةً وَاِحْسَانًا۔ یعنی دوسرے کو اس کے کسی محنت طلب کام کے بغیر انعام دینا اور اس کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کرنا۔ اِسی طرح اَلْمَنُّ کے معنے ہیں كُلُّ مَا يَمُنُّ اللّٰهُ بِهٖ مِمَّا لَا تَعَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ۔ یعنی ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کسی شخص کو محنت اور مشقت کے بغیر محض اپنے فضل سے عطا فرمائے وہ مَنّ کہلاتی ہے۔ اِسی طرح لکھا ہے۔ كُلُّ طَلٍّ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ عَلٰى شَجَرٍ اَوْ حَجَرٍ وَيَحْلُوْ وَيَنْعَقِدُ عَسَلًا وَيَجِفُّ جَفَافَ الصَّمْغِ كَالشِّيْرِخِشْتِ وَالتَّرَنْجَبِيْنِ۔ یعنی ہر وہ رطوبت جو آسمان سے درختوں اور پتھروں پر گرتی ہے اور وہ میٹھی ہوتی ہے اور پھر شہد کی طرح گاڑھی ہو جاتی ہے اور گوند کی طرح سوکھ جاتی ہے جیسے شیر خشت اور ترنجبین اسے بھی مَنّ کہتے ہیں۔

اَلسَّلْوٰى کے معنے ہیں اَلْعَسَلُ۔ شہد۔ كُلُّ مَا سَلَاكَ ہر وہ چیز جو انسان کی تسلّی کا موجب ہو۔ طَائِرٌ اَبْيَضُ مِثْلُ السُّمَانٰى۔ بٹیر یا تلیر کی مانند سفید پرندے۔ وَقِيْلَ اَلسَّلْوٰى اَللَّحْمُ اور بعض نے کہا ہے کہ سلویٰ گوشت کو کہتے ہیں۔ مفردات میں لکھا ہے کہ اَلسَّلْوٰى اَصْلُهَا مَا يُسَلِّى الْاِنْسَانَ یعنی سلویٰ کے اصل معنے اس چیز کے ہیں جو انسان کو تسلّی دلا دے۔

تفسیر۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو جس علاقہ میں سے انہیں گذرنا پڑا وہ بہت غیر آباد تھا اور دُور دراز فاصلہ پر بعض شہر آباد تھے۔ اب تک یہ علاقہ ایسا ہی ہے اور اب بھی اس علاقہ سے گذرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بے شک اس علاقہ میں اب ریل جاری ہو گئی ہے اور سفر میں سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں لیکن اس کی غیر آبادی میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ یہ علاقہ آبادی کے قابل زمینوں سے خالی ہے۔ اور بے آب و گیاہ میدانوں پر مشتمل ہے۔ ترکوں نے جنگِ عظیم میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح مصر میں داخل ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات قطع کر دیں لیکن پانی کی دقّت اور سامانِ خورد و نوش کی کمی کی وجہ سے عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والی قربانی کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں نے بھی شروع میں بہت زور مارا لیکن خشک اور چٹیل میدانوں کی وجہ سے وہ بھی سویز کے راستہ سے فلسطین میں داخل نہ ہو سکے۔ آخر جنرل ایلنبی نے نیل سے پانی لے کر سویز کے اوپر سے نلوں کے ذریعہ سے پانی گذارا اور اس علاقہ کو جو بڑے شہروں کیلئے ناقابل تھا قابلِ سکونت بنا دیا۔ صلیبی جنگوں کے وقت جب فلسطین اور شام

کے محاذ پر یورپ کی تمام اقوام کے منتخب بہادر اس نیّت سے ڈیرے ڈالے پڑے تھے کہ اسلام کے بڑھنے والے سیلاب کو روک دیں۔ اس وقت بھی دشتِ سینا مسلمانوں اور مسیحیوں سے راستہ دینے کا ٹیکس لیتا رہا تھا۔ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں نہ معلوم کتنے اسلامی اور مسیحی لشکر پانی نہ ملنے اور کھانے کی کمی کے سبب اس دشت میں تباہ ہو گئے تھے۔

پانی کی کمی کے سبب گذرنے والے قافلوں کو لازماً اُن چشموں یا تالابوں کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا جو کہیں کہیں اس دشت میں پائے جاتے تھے اور اس وجہ سے جو فریق بھی غالب ہوتا تھا، اُسے دوسرے فریق کے آدمیوں کو مارنے کا ایک آسان بہانہ مل جاتا تھا۔ کیونکہ تھوڑے سے آدمی ان چشموں یا تالابوں پر مقرر کر دینے سے بھی اس بات کی کافی ضمانت ہو جاتی تھی کہ حریف کے آدمی نقصان اُٹھائے بغیر مصر سے فلسطین کی طرف نہیں جا سکتے۔ چنانچہ اسامہ بن منقذ اپنی کتاب الاعتبار میں لکھتے ہیں کہ الجعفر نامی چشمہ جو مصر اور فلسطین کے درمیان تھا کسی وقت فرنگیوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اس جگہ سے لوگوں کو بچ کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ انہیں سیف الدین ابن سالار وزیر مصر نے شاہ نور الدین کے پاس بھیجا کہ وہ طبریہ پر حملہ کریں تو ہم مصر سے غزہ پر حملہ کر کے فرنگیوں کو وہاں قلعہ بنانے سے روک دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم الجعفر چشمہ پر پہنچے تو اتفاقاً اس وقت فرنگی وہاں موجود نہ تھے۔ لیکن طے قبیلہ میں سے بنو ابی خاندان کے کچھ لوگ وہاں تھے جن کے جسم پر چیتھڑے کے سوا گوشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور بالکل بدحال ہو رہے تھے وہ کہتے ہیں میں نے اُن سے پوچھا تم لوگ یہاں کس طرح گذارہ کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ مُردار کی ہڈیاں اُبال کر اس پر گذارہ کرتے ہیں اور کوئی چیز کھانے کی یہاں نہیں ہے۔ اُن کے کتّے بھی اسی پر گذارہ کرتے تھے۔ ہاں گھوڑے چشمے کے ارد گرد کی گھاس پر گذارہ کرتے تھے۔ اسامہ لکھتے ہیں کہ میں نے اُن لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو۔ دمشق کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خیال سے کہ وہاں کی وباؤں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ اسامہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسے بیوقوف لوگ تھے۔ اُن کی اس وقت کی حالت سے بڑھ کر وبا کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔

غرض دشتِ سینا ایک ایسا خطرناک علاقہ ہے کہ بڑی جماعتوں کے لئے بھی بغیر خاص انتظام کے اس میں سے گذرنا مشکل ہے اور اس میں قیام کرنا تو اور بھی مصیبت ہے۔ پھر بنی اسرائیل جن کے بیس سال سے زائد عمر کے نوجوانوں میں سے جنگی خدمت کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے (یہ تعداد بائیبل کی رو سے ہے ورنہ ہم اسکو صریح غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم اس بارہ میں یہ فرماتا ہے کہ وَهُمْ أُلُوفٌ (بقرہ ع ۳۲) وہ ساری قوم اس وقت ہزاروں کی تعداد میں تھی اور قرآنی بیان ہی عقل کے مطابق اور سچا ہے) اور جو بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے بھاگے تھے۔ اس علاقہ میں سے کس طرح گذرے۔ اور کس طرح اڑتیس سال تک اس علاقہ میں انہوں نے بسر کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہا ہے۔ بائیبل نے اس کا جواب منّ کے نزول اور حورب کی چٹان میں بارہ چشموں کے پھوٹنے

کے معجزہ سے دیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مظلوم قوم کی خدا تعالیٰ نے مدد کی اور اپنے فضل سے اُس نے ان کے لئے کھانے اور پینے کا سامان مہیا کیا۔ مَیں اِس وقت باقی کی تحقیقات کو چھوڑتا ہوں اور صرف مَنّ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بائیبل کا بیان پڑھنے کے بعد طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (۱) منّ کیا چیز تھی؟ (۲) کیا اس کا وجود معجزانہ تھا؟ (۳) کیا بنی اسرائیل اُسے کھا کر ایک طویل مدت تک زندگی بسر کر سکتے تھے۔ پہلے سوال کا جواب دیتے وقت خود بخود یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ اس غذا کو منّ کا نام بنی اسرائیل نے دیا تھا یا پہلے سے اُس کا یہ نام تھا۔ اگر بنی اسرائیل نے اسے اس نام سے پکارا تو کیوں؟ کیا اس غذا کی کسی اندرونی خاصیت کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے۔ خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ میں منّ کا سب سے پہلے ذکر ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل ایلیم روانہ ہوئے تو راستہ میں خوراک نہ ملنے کے سبب انہوں نے شور مچایا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُن سے گوشت اور روٹی کا وعدہ کیا۔ شام کو بے شمار بٹیر جنگل میں آگئے۔ جنہیں پکڑ کر انہوں نے گوشت کھایا۔ اور صبح کے وقت ایک چیز زمین پر پڑی ملی جو چھوٹی چھوٹی سفید رنگ کی تھی۔ جسے دیکھ کر بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے "مَنْ"۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ (عربی میں مَن کے معنے کون کے ہیں پس درحقیقت یہ بھی عربی لفظ ہے جو عبرانی نے استعمال کر لیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عربی میں مَنْ جاندار کے لئے بولا جاتا ہے غیر جاندار کے لئے نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے عبرانی میں یہ لفظ بے جان کیلئے بھی استعمال ہونے لگ گیا تھا) تب موسیٰؑ نے اُن سے کہا۔ یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے (خروج باب ۱۶ آیت ۱۵)

اس آیت کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ متن کا لفظ اس جگہ بطور استفہام استعمال ہؤا ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ بعد میں یہ لفظ نام کے طور پر بنی اسرائیل میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اسی بات کو آیت ۳۱ میں لکھا ہے:-

" اور بنی اسرائیل نے اسکا نام مَن رکھا"۔

بعض محققین جارج ایبرز کی اتباع میں اس تشریح کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لفظوں کی مشابہت سے مغالطہ ہو گیا ہے۔ اصل میں یہ لفظ "منو" ہے اور قبطی زبان کا لفظ ہے اور اسکے معنے قبطی زبان میں کھانے کے ہیں۔ اس لئے بنی اسرائیل نے من سوال اور استفہام کے طور پر نہیں کہا بلکہ چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ موعودہ روٹی ہے انہوں نے اس کا نام منا (یعنی خوراک) رکھ دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی اور نام انہیں معلوم نہ تھا۔ ان کا خیال ہے کہ من استفہامیہ کا استعمال ارمیک زبان میں نہیں اور یہ قابلِ تعجب امر ہے کہ اس مفہوم میں جس میں ارمیک زبان کا کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہؤا یہ لفظ مستعمل ہو جاتا۔ مگر مسٹر فیلڈ نے اس حیرت کو بائیبل کے ایک قدیم یونانی نسخہ سے دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز اس نسخہ میں خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ کے الفاظ "من" کی بجائے " کیا یہ من ہے " کے الفاظ ہیں۔ اور اگر یہ فرق صحیح تسلیم کر لیا جائے تو منّ خوراک کے معنوں میں درست ثابت ہوتا ہے۔ اور استفہام کے الفاظ کا علیحدہ موجود ہونا ثابت کر دیتا ہے کہ من کا لفظ اسجگہ استفہام کے طور پر استعمال نہیں ہؤا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبرانی کا لفظ جو اس جگہ استعمال ہوا ہے اس کے معنے استفہام کے بھی ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ لفظ بنی اسرائیل کی جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں اِن معنوں میں صرف عزرا اور دانیال کی کتب میں استعمال ہوا ہے۔ جلاوطنی سے پہلے کے زمانہ میں اس کا استعمال ان معنوں میں نظر نہیں آتا اور اس وجہ سے بعض اہل نظر نے اسے ارمیک قرار دیا ہے۔

ہم جب اس لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تورات کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا کیا طریق ہے تو وہاں ہمیں ایک ایسی بات مل جاتی ہے جو اس سوال کو ہمارے لئے قطعی طور پر حل کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ تورات میں جہاں بے جان چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہاں "مَنہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مَنّ کا۔ اور جہاں جاندار چیزوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں "زی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ خروج باب ۴/۲ آیت میں ہے۔

"خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ کہ یہ تیرے
ہاتھ میں کیا ہے۔ اُس نے کہا لاٹھی۔"

اِس جگہ عبرانی میں لفظ "مَ زِہ" ہے۔ یعنی یہ کیا ہے۔ یہ الفاظ عربی کے الفاظ "مَاذَا" سے ملتے ہیں۔ "مَ زِہ" کا یہ استعمال غیر معمولی ہے ورنہ احبار باب ۲۰ آیت ۲۰۔ ا سموئیل باب ۳ آیت ۱۷۔ زبور باب ۱۲ آیت ۴ امثال باب ۲۵ آیت ۸ اور دیگر مقامات میں پُرانی عبرانی زبان میں کیا کے لئے لفظ "مَنہ" استعمال کیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں جاندار کے متعلق سوال کے موقع پر کون کے لئے پیدائش ۲۴/۱۸ و پیدائش ۳۲/۵ و خروج ۱۵/۱۱ ا سموئیل ۲۵/۱۰ ۔ زبور ۴/۲۴ وغیرہ میں عبرانی کا لفظ "زی" استعمال ہوا ہے۔ اِس فرق کو دیکھ کر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ خروج باب ۱۶ میں جو "مَن" کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ کیا کے معنوں میں نہیں۔ کیونکہ پرانی عبرانی زبان میں کیا کیلئے "من" نہیں بلکہ "منہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

اِسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں جب "مَن" کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا تو اس سے بے جان نہیں بلکہ جاندار کے متعلق سوال کیا جاتا تھا جیسا کہ عربی زبان میں ہے چنانچہ عزرا ۵/۳۔۹ اور دانیال ۲/۱۵ میں "مَن" کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن وہاں سوال جانداروں کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہُوا کہ اوّل تو تورات کے نزول کے وقت مَن کا لفظ سوال کیلئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دوم بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ سے جب یہ لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا اس وقت بھی یہ لفظ قاعدہ کے طور پر جاندار چیزوں کے متعلق سوال کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا نہ یہ کہ بے جان چیزوں کے متعلق (معلوم ہوتا ہے اُسوقت بنی اسرائیل عربوں سے خلط ملط کرنے لگ گئے تھے اور عربی زبان کے صحیح محاورات اُن میں استعمال ہونے لگ گئے تھے۔) اور استثناء کے طور پر اگر کہیں اس کے خلاف استعمال ہوا ہے تو اسے بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خروج باب ۱۶/۱۵ میں "مَن" کے معنے کیا ہے کے کرنا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا۔ کہ "مَن" کو مَنّ اسلئے کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل نے اسے پہچاننے کی وجہ سے مَن کے لفظ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا درست نہیں۔ یہ غلط فہمی یوروپین مصنفین کو اس لئے ہوئی ہے کہ وہ عبرانی جیسی مردہ زبان کی تحقیق کرتے وقت اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں

کہ عبرانی کی ماں عربی زبان زندہ موجود ہے ۔ عبرانی الفاظ
کی حقیقت کے سمجھنے میں جب مشکلات ہوں تو انہیں
عربی زبان سے مدد لینی چاہیئے ۔ اس موقعہ پر اگر وہ
عربی سے مدد لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عربی زبان
میں مَنّا بے جان کے لئے اور مَنْ جاندار کے لئے
استعمال ہوتا ہے اور پھر اس علم کی روشنی میں بائیبل
کے الفاظ کو دیکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ یہی قاعدہ
بائیبل کی عبرانی میں بھی مدِ نظر رکھا گیا ہے اور اس طرح
اس لغزش سے بچ جاتے ۔ مگر اتنی تعریف ان کی ضرور
کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے یہ فرق ضرور محسوس کیا ہے
کہ مَنْ کا لفظ سوال کے معنوں میں جلاوطنی کے زمانہ
اور اس کے بعد استعمال ہوا ہے (دیکھو انسائیکلوپیڈیا
ببلیکا جلد ۳ زیر لفظ منا) پہلے نہیں ۔ اور اسکی بنا پر
بعض نے مَنْ کے معنے استفہام کے سوا کچھ اور دینے
کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ۔
جارج ایبرز نے اس لفظ کو قبطی لفظ منو سے
ماخوذ قرار دیا ہے جس کے معنے خوراک کے ہیں ۔ اسی
طرح جے سینیس (JESENIUS) نے اپنی لغت
میں مَنّ کی وجہ تسمیہ عربی لفظ مَنّ سے بیان کی ہے
جس کے معنے فضل اور احسان کے ہیں ۔ اس مصنف
کے خیال کے مطابق اس چیز کا نام مَنّ اس لئے
رکھا گیا تھا کہ وہ خدا تعالےٰ کے فضل سے حاصل
ہوئی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وجہ زیادہ
قرینِ قیاس ہے ۔

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ مَنّ کیا چیز
تھی ؟ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبنم کے ساتھ
گرتی تھی ۔ اور سفید سفید گول دھنیئے کے بیجوں کی طرح
ہوتی تھی اور لوگ اُسے چکی میں پیس کر یا اوکھلی میں
کوٹ کر توے پر پکاتے تھے یا پھلکیاں بناتے تھے
اور اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا ۔ جب دھوپ نکل آتی
تو مَنّ پگھل جایا کرتا تھا ۔ (خروج باب ۱۶ آیت ۲۲ و گنتی ۹/۱۱)
یہ چیز سبت کے دن نہیں گرتی تھی اور اگر لوگ جمع کرتے
تھے تو سڑ جاتی تھی ۔ سوائے اس کے جو سبت کے دن
کے لئے جمع رکھی جاتی تھی ۔ یہ مَنّ برابر چالیس سال تک
بنی اسرائیل پر نازل ہوتا رہا (خروج باب ۱۶ آیت ۳۵)
اور اس وقت بند ہوا ۔ جب انہوں نے موعودہ زمین
میں قدم رکھا اور وہاں کا دانہ کھایا (یشوع ۵/۱۲)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو
بائیبل کی بیان کردہ صفات کے مطابق ہو اور سینا
مقام میں پائی جاتی ہو ۔ اس سوال کا جواب یہ ہے
کہ اگر معجزانہ امور کو نظر انداز کر دیں تو ہمیں معلوم
ہوتا ہے کہ فی الواقعہ ایک ایسی چیز سینا کے علاقہ
میں پائی جاتی ہے جو شبنم کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے ۔
اور دھوپ کی گرمی میں پگھل جاتی ہے اور تیل کا سا
اس کا مزہ ہوتا ہے اور سفید رنگ کی ہوتی ہے جس
کی ایک قسم کو ہمارے ملک میں شیر خشت کہتے ہیں ۔
اور دوسری کو ترنجبین اور ہندی میں اسے یورس
شرکرا یعنی جواسہ کی شکر کہتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں
یہ چیز جواسے کے درخت سے نکالی جاتی ہے ۔ لاطینی
میں اسے منّا کہتے ہیں اور اس چیز کی ماہیت پوری
طرح طبی کتب میں بھی درج ہے اور انسائیکلوپیڈیا
برٹینکا میں بھی بیان ہے ۔ یورپین سیاحوں نے
شہادت دی ہے کہ اب تک اس علاقہ میں مَنّ
ملتا ہے ۔ گو وہ شبنم کے ساتھ نہیں گرتا ۔ بلکہ
ٹیمرکس گیلیکا نامی درخت کا رس ہوتا ہے جس کی
چھال کو جب ایک کیڑا چھیدتا ہے تو اس سے یہ
رس ٹپکتا ہے ۔ بغیر کیڑے کے انسانی طریقوں سے
درخت کی چھال میں شگاف کرنے سے بھی یہ رس

گر کر جم جاتا ہے ۔ اور مختلف ممالک میں اس درخت سے
مختلف طریقوں سے اس کو جمع کیا جاتا ہے ۔ سسلی اور
خراسان کا منّ مشہور ہے ۔ ہندوستان میں بھی جوانسہ
کے درخت سے دَید منّ بناتے ہیں ۔ مصر سے مصنوعی
منّ بنا ہوا آتا ہے ۔ لیکن اطباء اُسے پہچان لیتے ہیں ۔
بونارڈٹ جرمن سیاح کا بیان ہے کہ سینا میں موجودہ
درختوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے
کہ سالانہ اڑھائی تین سو سیر تک من تیار ہو سکتا ہے
مگر خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زمانہ میں جنگل زیادہ
وسیع ہوتا تھا اور اس سے بہت زیادہ من تیار
ہو سکتا تھا ۔ بائبل میں بنی اسرائیل کی جو تعداد لکھی
ہے اس کے مطابق انہیں روزانہ چھبیس ہزار سات سو
پچاس (۲۶۷۵۰) من کے قریب مَنّ کی ضرورت
ہوتی ہوگی ۔ اور سالانہ ایک کروڑ من کے قریب ۔
لیکن اڑہائی تین سو سیر سالانہ جو اب وہاں پیدا
ہوتا ہے اور ایک کروڑ من جس کی انہیں ضرورت
ہوتی تھی ان دونوں اندازوں میں اس قدر فرق ہے
کہ خواہ قوتِ واہمہ کو کتنا ہی آزاد چھوڑ دیا جائے
خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ
میں اس قدر جنگل تھا کہ ایک کروڑ من منّ پیدا ہو
جاتا تھا خصوصاً جب ہم اس امر کو مدِّنظر رکھیں کہ
اس علاقہ کا اکثر حصّہ ایسا ہے کہ اس میں درخت
پیدا ہی نہیں ہو سکتے ۔

اس مشکل کا ایک حل تو یہ ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ
بائبل میں جو تعداد بنی اسرائیل کی لکھی ہے ۔ وہ
مبالغہ آمیز ہے ۔ گنتی باب ۱ سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ
بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے
قابل مردوں کی تعداد بارھویں قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی
گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار اور پانچ سو پچاس تھی ۔
اگر بارھویں قبیلہ کا اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں
کہ کل لڑنے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے عورتوں
بچوں اور جنگ کے ناقابل بوڑھوں کی تعداد کا اندازہ
لگانے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گنا زیادہ کر
لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک عام اندازہ ہے کہ چھ فیصدی
سے لے کر دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت
کے قابل ہوتی ہے ۔ ہم خیال کر لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل
سے سختی سے جنگی خدمت لی جاتی تھی ۔ اور کل تعداد
بنی اسرائیل کی جنگی سپاہیوں سے صرف دس گنا تھی
یعنی ساٹھ لاکھ مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ
بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تھے ۔ کیونکہ اتنے آدمی مصر
سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے تھے ۔ پھر
یردن پار کی بستی جس میں آکر وہ بسے ہیں اس قدر
آبادی کی حامل نہیں ہو سکتی ۔ فلسطین کی آبادی کا
اندازہ ۱۹۲۶ء میں آٹھ لاکھ باون ہزار دو سو اڑسٹھ
(۸۵۲۲۶۸) تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا چودھواں ایڈیشن)
اور اس ملک کا کل رقبہ ۹ ہزار مربع میل ہے اور پھر
اس کا ایک بڑا حصّہ ناقابلِ سکونت ہے ۔ صرف ریت
کے میدان ہیں جنہیں آباد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب
بھی جبکہ یہودیوں نے امریکہ کی مدد سے اسے آباد
کیا ہے اس کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے ۔ پس اس
ملک میں جو پہلے سے آباد تھا ساٹھ لاکھ آدمیوں کا
آکر بس جانا بالکل خلافِ عقل ہے ۔

ایک اور دلیل سے بھی یہ امر خلافِ عقل معلوم
ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تو درکنار چند لاکھ
بھی ہوں اور وہ اس طرح کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے لیکر
حضرت یعقوبؑ کے مصر میں داخل ہونے تک قریباً
دو سو سال کا عرصہ بائبل کے بیان کے مطابق گذرا
ہے اس عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل

کے افراد بارہ تک پہنچتے ہیں۔ عیسو کی اولاد کو بھی اگر معتدّ
فرض کر لیا جائے تو دو سو سال میں چوبیس افراد تک
اُن کی نسل پہنچتی ہے۔ اس کے بعد مصر سے نکلنے کے
زمانہ تک دو سو سال گذرے ہیں۔ پس عام اندازہ تو
یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی
نسل اس دو سو سال میں چھ سات سو افراد تک پہنچ گئی
ہو گی۔ لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کریں کہ وہ بہت شادیاں
کرتے تھے اور اولاد زیادہ ہوتی تھی تب بھی پندرہ
بیس ہزار سے زائد تو کسی صورت میں بھی ان کی تعداد
نہیں ہو سکتی اور اس امر کو مدّنظر رکھتے ہوئے۔ کہ
بنی اسرائیل اپنے سفر کے دوران میں معمولی شہر کے
آدمیوں سے بھی ڈرتے تھے اور ان کا مقابلہ نہیں کر
سکتے تھے یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے ساتھ دو اڑھائی ہزار سپاہیوں سے
زیادہ نہیں تھے۔ اس اندازہ کے ماتحت منّ کی وہ
مقدار جو بنی اسرائیل کے لئے ضروری ہوتی ہو گی بہت
کم رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا
ہے کہ کیا بنی اسرائیل منّ پر گذارہ کر سکتے تھے؟ منّ
جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک گوند ہے جو ہے بھی
مسہل۔ اس غذا پر انسان چند دن سے زیادہ گزارا
نہیں کر سکتا۔ پھر بنی اسرائیل نے اڑتیس سال تک
اس پر کیونکر گذارہ کیا؟ نئے یورپین محققین بھی اس
سوال کی معقولیت کے قائل ہو گئے ہیں اور اب ان کا
یہ خیال ہے کہ منّ کی جو ماہیت بائیبل میں بتائی گئی
ہے اس میں مبالغہ اور تداخل ہو گیا ہے۔ منّ ان کے
نزدیک لچن LICHEN کے دانوں کا نام ہے۔ جو
قحط کے دنوں میں لوگ کھانے لگتے ہیں۔ لچن ایک
بوٹی ہے جو سطح کے اوپر ہی اُگ آتی ہے۔ جڑ کے
لئے اُسے زمین کی ضرورت نہیں ہوتی اسلئے چٹانوں
کی سطح اور درختوں کی چھال پر بھی اُگ آتی ہے۔ اس کی
بعض قسمیں پتھروں پر اُگتی ہیں خصوصاً چونسے کے پتھروں
پر اور جب اسے پتھر سے الگ کیا جائے تو جوار کے
کھلے ہوئے دانے کے مشابہ ہو جاتی ہے جب یہ بوٹی
پک جائے تو اس کے چھلکے جڑ سے الگ ہو کر گول شکل
اختیار کر لیتے ہیں اور ہلکا ہونے کی وجہ سے ہوا انہیں
اڑا کر دُور دُور لے جاتی ہے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۳)

علماء نباتات کے نزدیک یہ بوٹی کھمب کی قسموں
میں سے ہے۔ اگر نئے یورپین محققین کی رائے تسلیم
کر لی جائے تو پھر یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل
نے اس کھانے پر گذارہ کس طرح کیا، لیکن وہ سوال
پھر پیدا ہو جاتا ہے کہ بائیبل کی بیان کردہ منّ کی
ماہیت کے ساتھ اس بوٹی کی کوئی مناسبت نہیں نہ یہ
بوٹی میٹھی ہوتی ہے نہ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا ہوتا ہے
اور نہ یہ بوٹی دوپہر کو پگھل جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس سوال کا جواب بائیبل اور
اس کی متعلقہ کتب سے نہیں مل سکتا۔ یورپین محققین
خواہ کتنا ہی زور لگائیں وہ اس سوال کا پوری طرح
جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ اس سرچشمہ سے
دُور ہیں جس سے حقیقی علم عطا ہوتا ہے۔ پس اگر ہمیں
صحیح جواب کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہیئے کہ قرآن
اور حدیث سے مدد حاصل کریں۔

قرآن کریم اور حدیث میں منّ کے متعلق مندرجہ
ذیل حقائق بیان ہوئے ہیں:۔

(۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (بقرۃ ع ۳۲)
کیا تجھے اُن لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے
موت کے ڈر سے اس حال میں نکلے تھے کہ وہ ہزاروں کی

تعداد میں تھے۔ اس پر اللہ نے انہیں کہا کہ مرجاؤ۔
پھر اُس نے انہیں زندہ کر دیا۔

(۲) وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (بقرۃ ع ۶)
اور ہم نے تم پر منّ اور سلوٰی اتارا تھا اور کہا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اعلیٰ اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔

(۳) بخاری میں سعید بن زیدؓ کی روایت ہے۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھمب بھی مَنّ کی اقسام میں سے ہے۔ ترمذی میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ اِنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحٰبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا اَلْكَمْاَةُ جُدَرِيُّ الْاَرْضِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَمْاَةُ مِنَ الْمَنِّ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بعض لوگ اعراب کے توہمات کے مطابق باتیں کر رہے تھے کہ کھمب زمین کی چیچک ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سُنکر فرمایا کہ کھمب مَنّ کی اقسام میں سے ہے۔

اُوپر کی آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے:۔
کہ (۱) بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نہیں نکلے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے۔
(۲) جو چیز اُن کے کھانے کے لئے مہیا کی گئی تھی وہ غذا کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اور ایسی نہ تھی جو غذائیت یا مزے کے لحاظ سے تکلیف دہ ہو۔
(۳) جو چیز بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے ملی تھی وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزیں تھیں اور ان کئی چیزوں میں سے ایک کھمب بھی تھی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ منّ کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ پر آیا ہے۔ ایک سورۃ بقرۃ میں ایک سورۃ اعراف میں اور ایک سورۃ طٰهٰ میں اور تینوں جگہ اس کے ذکر کے بعد كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ کا فقرہ ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی تردید کرنا مقصود ہے کہ وہ کھانا ایک ہی تھا اور طبیعت پر بوجھ ڈالنے والا تھا یا غذائیت کے لحاظ سے ادنیٰ قسم کا تھا۔

جب ہم لچن کی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کھمب کی قسم کا پودا ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے:۔

"لچن اور کھمب کے اقسام بالکل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اور یہ امر ان اقسام کی مشابہت سے جو ایک دوسرے کی طبعی سرحد پر واقع ہیں بالکل ظاہر ہو جاتا ہے۔"

لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ لچن خود کوئی اچھا کھانا نہیں ہے۔ بلکہ قحط کے ایام میں مجبورًا اسے لوگ کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس کھمب اعلیٰ درجہ کے کھانوں میں سے ہے اور گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر اسے امرا کیلئے بویا جاتا ہے۔ اور فرانس میں تو اس کی اسقدر کھپت ہے کہ پیرس میں ایک زمیندار دن میں تین ہزار پونڈ تک کھمب منڈی میں فروخت کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور پھر بھی یہ جلد اُگنے والی چیز چنانچہ انگریزی میں اس چیز کو جو جلد ہو جانے والی ہو مشروم گروتھ یعنی کھمب کی طرح پیدا ہونے والی کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے جو کھانے سے تنگ ہوں ایسی ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو جلد اُگ آئیں اور جلد استعمال میں آسکیں۔ اب کیا یہ صاحبانِ بصیرت کیلئے عجیب بات نہیں کہ بائیبل کے کثیر نسخوں اور علم طبیعات کے ماہروں کی امداد کے باوجود یورپ بیسویں صدی میں جس نتیجہ پر منّ کے متعلق پہنچا ہے اور وہ بھی ناقص صورت میں اسکی

قرآن کریم میں آج سے تیرہ سو سال پہلے نہایت جامعیت کے ساتھ توضیح کر دی گئی تھی۔

مَیں جہاں تک مندرجہ بالا آیات اور احادیث سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دشتِ سینا میں کھمب ترنجبین اور ایسی ہی اور چیزیں جو جلد تیار ہو جاتی تھیں پیدا کر دیں جن سے بنی اسرائیل کو بآسانی غذا ملنے لگی۔ اِسی طرح تلیئر وغیرہ کثرت سے آگئے کیونکہ ان علاقوں میں ٹڈی بہت ہوتی ہے اور تلیئر زیادہ تر ان مقامات کو پسند کرتا ہے جن میں ٹڈی ہو کیونکہ وہ ٹڈی بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اور چونکہ اس کے لئے انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی تھی اس غذا کا نام مَنّ یعنی احسانِ الٰہی سے ملنے والی غذا رکھا گیا۔ وہ ایک قسم کی غذا نہ تھی بلکہ کئی قسم کی غذائیں تھیں۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ کئی طرح کا مَنّ تھا۔ ہاں سب میں ایک مشابہت تھی اور وہ یہ کہ غذائیں ہل چلا کر اور محنت کر کے بنی اسرائیل کو پیدا نہیں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن چونکہ غذائیں اور تلیئر وغیرہ جو اسوقت کثرت سے جنگل میں آگئے تھے شکم میں قبض پیدا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ترنجبین بھی کثرت سے پیدا کر دی جسے دوسری غذاؤں میں ملا کر کھانے سے ان کی صحت درست رہتی تھی۔ پس یہ ایک حقیقت ہے کہ مَنّ جس کا کثرت سے ان ایام میں پیدا ہونا ایک معجزہ تھا۔ لیکن خود اس کا وجود اِس دنیا کی چیزوں میں سے تھا۔ وہ ایسی غذا تھی جسے ایک عرصہ تک کھایا جا سکتا تھا۔ اور اسکی مصلح ترنجبین بھی ساتھ ہی پیدا کر دی گئی تھی تاکہ جنگل کی خشک غذا صحت کو نقصان نہ پہنچائے۔

اِس تشریح کے ساتھ سب سوال حل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہ مَنّ کو لوگ دیر تک کس طرح کھاتے رہے؟ اور یہ بھی کہ وہ سال بھر کس طرح ملتی رہتی تھی اور یہ بھی کہ وہ تیل کی طرح تھی اور اس سے روٹیاں بھی پکتی تھیں اور پھلکیاں بھی بنائی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزوں کا نام مَنّ تھا۔ اور اس تشریح کو تسلیم کر کے کوئی خلافِ عقل بات بھی تسلیم نہیں کرنی پڑتی۔ کیونکہ تلیئر وغیرہ کی قسم کی چیزوں پر ایک ایسی قوم جس کا اہم سیاسی اغراض کے لئے جنگل میں رہنا ضروری ہو گذارا کر سکتی ہے اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی تعداد کے مطابق قوم کا اس جنگل میں آسانی سے بسر اوقات کر سکنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

سَلْوٰی کے معنے بھی مَنّ کی طرح ایک عام ہیں اور ایک خاص۔ اس کے عام معنے تو ہر اس چیز کے ہیں جو تسلّی دینے والی ہو۔ اور خاص معنوں کے لحاظ سے وہ ایک پرندے کا بھی نام ہے جو تلیئر کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور شہد کو بھی سلوٰی کہتے ہیں بائیبل میں اس کا ذکر گنتی باب ۱۱ آیت ۳۱ تا ۳۴ میں اس طرح آتا ہے:۔

"پھر موسیٰ اور وہ اسرائیلی بزرگ لشکرگاہ میں گئے۔ اور خداوند کی طرف سے ایک آندھی چلی اور سمندر سے بٹیریں اُڑا لائی اور اُن کو لشکرگاہ کے برابر اور اُس کے گرداگرد ایک دن کی راہ تک اِس طرف اور ایک ہی دن کی راہ تک دوسری طرف زمین سے قریباً دو دو ہاتھ اوپر ڈال دیا اور لوگوں نے اُٹھ کر اُس سارے دن اور اس ساری رات

وَ مَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ

اور (ہم نے کہا) اے موسٰی: تم اپنی قوم کو چھوڑ کر کس لئے جلدی جلدی آگئے ہو؟ (موسٰی نے جواب میں) کہا کہ وہ (لوگ)

عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۵﴾

میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے رب: مَیں اسلئے تیرے پاس جلدی سے آیا ہوں تاکہ تو (میرے اس فعل پر) خوش ہو جائے[۴۶]

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ

(اسپر اللہ تعالیٰ نے) کہا۔ ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ اور سامری نے اُن کو

السَّامِرِيُّ ﴿۸۶﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ

گمراہ کردیا ہے۔ اِسپر موسٰی اپنی قوم کی طرف غصّے سے بھرے ہوئے افسردہ لوٹ گئے (اور اپنی قوم سے)

اور اُس کے دوسرے دن بھی بٹیریں جمع کیں۔"

غرض سلوٰی میں پرندے۔ شہد اور تمام ایسی غذائیں جو قلب کو تسکین دیتی ہیں شامل ہیں۔ چونکہ اللہ تعالےٰ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کو جنگل میں آزاد رکھکر اُن میں جرأت اور بہادری کے اخلاق پیدا کرے اسلئے اُس نے اپنے فضل سے اُن کے لئے ایسی غذائیں مہیّا فرمادیں۔ جو بغیر محنت کے ملتی تھیں اور جن میں گوشت بھی شامل تھا اور پھل اور سبزی ترکاری کی قسم کی غذائیں بھی شامل تھیں تاکہ ان کی غذائی ضرورت بھی پوری ہو اور اُن کی صحت بھی اچھی رہے۔

اس کے بعد فرمایا:- كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ۔ کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک چیزیں کھاؤ۔ اور اس رزق کے بارے میں تم ظلم سے کام نہ لو۔ یعنی چونکہ تمہیں جنگل میں رزق مل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زبردست سارا رزق جمع کرلے۔ اور غریب کو محروم کردے۔ اگر ایسا کروگے تو تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔

۴۶ تفسیر۔ پاک لوگ خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کس طرح بیتاب رہتے ہیں اِس کا ایک نمونہ اِن آیات میں دکھائی دیتا ہے جب اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کے لئے ایک وقت مقرر کیا تاکہ اس وقت میں اُن سے کلام کرے توحضرت موسےٰ علیہ السلام اپنی قوم سے آگے آگے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ کہ اے موسےٰ: تیز تیز کیوں چل رہے ہو؟ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے کہا۔ حضور مجھ پر اظہارِ خوشنودی فرمانے والے تھے ایسے وقت میں مَیں تیزی سے آگے نہ بڑھتا تو کیا کرتا۔ اور میری قوم تو میرے نقشِ قدم پر ہی چل رہی ہے اس لئے میرا اُن کے ساتھ رہنا کوئی ضروری نہ تھا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ

کہا۔ اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟

اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ

کیا اُس وعدہ کے پُورا ہونے میں کوئی دیر ہوگئی تھی! یا تم چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے رب کی

عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۷﴾

طرف سے کوئی غضب نازل ہو۔ سو تم نے میرے وعدے کو ردّ کر دیا۔

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ

انہوں نے کہا۔ ہم نے تیرے وعدہ کو اپنی مرضی سے ردّ نہیں کیا بلکہ فرعون کی قوم کے زیورات کا

اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى

جو بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا۔ اُس کو ہم نے پھینک دیا۔ اور اسی طرح سامری نے بھی

السَّامِرِيُّ ﴿۸۸﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ

اس کو پھینک دیا۔ پھر اُس نے اُن کیلئے (یعنی ہمارے لئے) ایک بچھڑا تیار کیا جو محض جسم ہی تھا اُس سے ایک بے معنی آواز نکلتی تھی

فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ﴿۸۹﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ

(یعنی حقیقی بچھڑا نہیں تھا) پھر (اُس نے اور اُسکے ساتھیوں نے) کہا کہ یہ تمہارا بھی اور موسیٰ کا بھی خدا ہے اور وہ اُسے بھول کر پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۬ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ

(بیشک سامری اور اُس کے ساتھیوں نے ایسا کیا) مگر کیا وہ خود نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بچھڑا) انکی کسی بات کا جواب نہیں دیتا

ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۹۰﴾ ع

ع ۴ / ۱۴

اور نہ انکو کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے [۴۷]

[۴۷] **تفسیر:**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو تو ہماری ملاقات کا اتنا شوق ہے۔ مگر تمہاری قوم کا یہ حال ہے کہ ادھر تم ہماری طرف آئے اور ادھر وہ سامری کے بہکانے سے بہک گئی۔ اِس پر موسیٰ غصہ اور

افسوس کی حالت میں واپس لوٹے۔ اور اپنی قوم سے کہا کہ کیا تمہارے رب نے نہایت اعلیٰ اور شاندار وعدہ تم سے نہیں کیا تھا۔ یعنی تمہارے نبی کو ہم کلام ہونے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ کیا تم اتنے بے ایمان ہو کہ اتنی تھوڑی سی دیر میں تمہارا ایمان ضائع ہو گیا یا تم کو اپنے رب کے غضب کے نازل ہونے کی خواہش ہے۔ جس کی وجہ سے اتنے تھوڑے عرصہ میں ہی تم خدا کو بھول گئے اور میری اطاعت کا جو تم نے اقرار کیا تھا اس کی تم نے خلاف ورزی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا۔ ہم نے تیرے وعدے کو اپنی مرضی سے نہیں جھٹلایا بلکہ فرعون کی قوم کے زیورات چلتے ہوئے ہم پر لاد دئے گئے تھے۔ تیرے جانے کے بعد وہ زیورات ہم نے اٹھا کر ایک جگہ رکھدیئے اور سامری نے بھی ایسا ہی کیا پھر اس نے اُن زیورات کو پگھلا کر ایک بے جان بچھڑا بنا دیا جس میں سے ایک بے معنے آواز نکلتی تھی۔ جس پر موسیٰؑ کی سب قوم بول اٹھی کہ اے لوگو! یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی یہی معبود تھا۔ جو پہاڑ پر جانے کے شوق میں اسے بھول گیا۔

حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات مصریوں نے خود دیئے تھے۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے سونے چاندی کے برتن عاریتہً لئے اور اُن کو خوب لوٹا اور وہ بھی دیتے چلے گئے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے نکل جائیں تاکہ اُن کے سبب سے وہ ہلاک نہ ہو جائیں چنانچہ خروج باب ۱۲ آیت ۳۵-۳۶ میں لکھا ہے:۔

"اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لئے۔ اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا انہوں نے دے دیا۔ سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔"

گویا بائیبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ اُن کے کہنے کے مطابق بنی اسرائیل نے مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے مانگ لئے اور انہوں نے مصریوں کو خوب لوٹا۔ لیکن قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ انہوں نے وہ زیورات نہیں مانگے بلکہ مصریوں نے آپ اُنکو دئے۔ اور انسانی عقل اس کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ نبی ڈاکو نہیں ہوتا مگر بائیبل ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی قرار دیتی ہے اور دوسری طرف انہیں ڈاکو ثابت کرتی ہے۔ حالانکہ خود بائیبل کی ایک اندرونی شہادت بتا رہی ہے کہ موسیٰؑ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ چنانچہ گو بائیبل نے یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے خدا کے حکم سے زیورات مانگے مگر خروج باب ۱۲ میں ہی لکھا ہے کہ جب مصریوں پر عذاب آیا اور سارے مصر میں پلوٹھے بچوں کی ہلاکت سے ایک کہرام مچ گیا تو فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر میری قوم کے لوگوں میں سے نکل جاؤ اور

"مصری اُن لوگوں سے بضد ہونے لگے (یعنی اُن کے پیچھے پڑ گئے) تاکہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں۔ کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔"

(خروج باب ۱۲ آیت ۳۳)

اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مصری خود دل سے چاہتے تھے کہ وہ لوگ مصر سے نکل جائیں۔ پس قرین قیاس یہی ہے کہ انہوں نے خود اُن کو زیورات دئے تاکہ وہ عبادت کیلئے باہر جائیں اور اُن کا عذاب ٹل جائے

اور یہی بات قرآن کریم نے بیان کی ہے بلکہ ممکن ہے سامری نے بھی ان لوگوں سے یہی کہا ہو کہ اگر یہ لوگ باہر نکلیں گے تو میں ان کے لئے سونے کا بچھڑا بنا دونگا اور اُن سے اس کی پُوجا کرواؤنگا اور یہ لوگ تمہارے مذہب میں واپس آجائیں گے۔

فَقَذَفْنٰهَا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اُن زیورات سے نفرت کر کے اُسے پھینک دیا تھا مگر سامری نے اس سے بچھڑا تیار کر لیا اور بچھڑا بھی ایسا جو بولتا تھا۔ چونکہ وہ مصر میں بچھڑے کی پرستش ہوتی دیکھ آئے تھے اور فرعون بھی اس کے آگے سجدہ کرتا تھا اس لئے اُن کے خیال میں اس سے زیادہ اعلیٰ چیز اور کیا ہو سکتی تھی۔ پس وہ کہتے ہیں کہ ایک تو بچھڑا، دوسرا سونے کا اور تیسرا بولنے والا۔ اس کے بعد بھی اگر ہم اس کی عبادت نہ کرتے تو کیا کرتے۔ گویا وہ اپنی مجبوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور موسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ آپ ہماری بھی تو مجبوری دیکھیں اگر اتنی باتوں کے بعد بھی ہم اس کی پرستش نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اُن کی یہ مجبوری بالکل ویسی ہی تھی جیسا کہ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مولوی کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے ایک شادی شدہ عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح پڑھ دیا ہے۔ فرماتے تھے مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اور میں نے اس مولوی کو بلوا کر کہا۔ کہ مولوی صاحب میں نے آپ کے متعلق ایک بات سُنی ہے۔ مجھے اعتبار تو نہیں آتا کہ وہ درست ہو مگر چونکہ میرے پاس اس کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے آپ سے بھی میں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے ایک عورت کا نکاح پر نکاح پڑھ دیا ہے۔ وہ سُن کر بڑے جوش سے کہنے لگا۔ مولوی صاحب! آپ پہلے تحقیق تو کر لیا کریں۔ یونہی سُنی سُنائی باتوں میں نہ آجایا کریں۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ میری مجبوری کیا تھی۔ آپ نے فرمایا۔ اسی لئے تو میں نے آپکو بلوایا ہے تاکہ آپ سے سارے حالات کا علم ہو جائے۔ وہ کہنے لگا۔ مولوی صاحب: دوسرے فریق نے جب چڑھے چِٹا روپیہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا تو پھر میں نکاح نہ پڑھتا تو اور کیا کرتا۔ یہی مثال موسیٰؑ کی قوم کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے تیرے عہد کو اپنی مرضی سے نہیں ٹلایا۔ ہم تو اس پر مجبور کر دئے گئے تھے اور وہ مجبوری یہ تھی کہ فرعون کی قوم کے زیورات کا جو بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا وہ ہم نے پھینک دیا اور اسی طرح سامری نے بھی اس کو پھینک دیا۔ مگر اس کے بعد سامری نے انہی زیورات کو ڈھال کر ایک عجیب و غریب بچھڑا تیار کر دیا جس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ اب بتائیے ہم اس کی کس طرح پرستش نہ کرتے۔ اُس بچھڑے کو دیکھنے کے بعد ہمارے لئے انکار کی کوئی صورت ہی نہ رہی۔ سامری کا یہ واقعہ ساحروں کے واقعہ کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے اور اس سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ مصریوں میں اس قسم کی کرتب بازی کا رواج تھا اور وہ مکینیکل کھلونے بنایا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم مصر سے آ رہی تھی اور فرعون کی قوم میں بَیل کی پُوجا کا عام رواج تھا۔ بلکہ سب سے بڑا مندر مصر کا وہی تھا جس میں ایک بے عیب بیل بطور دیوتا کے رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس جلد ۱ صفحہ ۵۰۸ میں لکھا ہے کہ مصریوں میں جانور کی پوجا کرنے کا جو رواج تھا اس میں سب سے اہم مقام بَیل کو حاصل تھا۔ جب کوئی پُرانا بَیل مر جاتا تھا تو

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ

اور ہارون نے (موسیٰ کے واپس آنے سے بھی) پہلے اُن سے کہدیا تھا کہ اے قوم! تم کو اس (بچھڑے) کے ذریعہ

بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا

آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن (خدا) ہے پس میری اتباع کرو اور میرے حکم کو مانو

ایک نئے بیل کی تلاش کی جاتی تھی - اور جس گلّے میں سے یہ بیل ملتا تھا اُس کے مالک کو بڑی عزت دی جاتی تھی اور جو شخص اُس کو تلاش کرتا تھا اسکو بھی بہت بڑا انعام دیا جاتا تھا - اسی طرح نیو سٹینڈرڈ ڈکشنری میں ایپس کے لفظ کے نیچے لکھا ہے کہ یہ ایک مقدس بیل ہوتا تھا جس کی مصری لوگ قدیم زمانہ میں پوجا کرتے تھے - اس کی پیدائش کے دن کو ایک عام چھٹی کے طور پر ملک میں منایا جاتا تھا - اور اس کی موت پر تمام ملک میں ماتم کیا جاتا تھا اور یہ ماتم اُس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کہ ایک نیا ایپس اُن علامتوں کے مطابق نہ مل جاتا۔ جن سے اُس کے خدا کے مظہر ہونے کا ثبوت حاصل ہو جاتا - غرض فرعون کی قوم چونکہ بیل کی پرستش کی عادی تھی - اس لئے محکوم قوم ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ خیالات پیدا ہو گئے اور موسیٰؑ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر سامری نے انہیں پھر شرک کے راستہ پر ڈال دیا اور وہ بچھڑے کو بڑے ادب کی نگاہ سے دیکھنے لگ گئے - سامری جو درحقیقت دل سے کافر انسان تھا اُس نے قوم کی اس کمزوری ایمان سے فائدہ اٹھایا اور اُن سے کہا کہ اپنے زیورات لاؤ اور میں بھی اپنا سونا ڈالتا ہوں - اس سے میں فرعونیوں کی طرح کا ایک بچھڑا تمہیں بنا دونگا - وہ سامری کی یہ بات سُن کر خوش ہو گئے

کیونکہ بچھڑے کا ادب فرعونیوں سے اُن کو ورثہ کے طور پر ملا تھا - جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے - کہ مصر کا بڑا بت بچھڑا ہی ہوتا تھا - اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ زمیندار ملکوں میں عام طور پر گائے کو خدا سمجھا جاتا تھا - چنانچہ ہندوستان میں سب ہندو گائے کو خدا سمجھتے ہیں - اور ایک گائے کے ذبح کرنے پر ہزاروں مسلمانوں کا قتل جائز اور درست جانتے ہیں - بلکہ ہندوؤں کے کئی مندر ایسے ہیں جن میں گائے یا بچھڑے کی شکل پر بت بنایا جاتا ہے - اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ گائے کو ایک جانور نہیں بلکہ دیوتا سمجھتے ہیں

اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ سامری نے جو بچھڑا بنایا تھا اُس میں ایسی ترکیب رکھی تھی کہ اس میں سے ایک بے معنے آواز نکلتی تھی - معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سیٹیاں بنائی جاتی ہیں سامری نے بچھڑا اسی طرح بنایا تھا - کہ اگر پیچھے سے ہوا داخل ہو تو مُنہ کی طرف سے آواز نکلتی تھی - بے وقوف یہودی جو قوم فرعون کے غلام تھے اور اس کے دین سے متأثر وہ اِس دھوکا میں آ گئے اور انہوں نے سمجھا کہ موسیٰؑ جو کہتا تھا کہ مجھ سے خدا کلام کرتا ہے تو درحقیقت اس کے پاس کوئی ایسا ہی بچھڑا تھا جس کی بات سے وہ نال نکال لیا کرتا تھا -

اَمۡرِیۡ ﴿۹۱﴾ قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَیۡہِ عٰکِفِیۡنَ حَتّٰی یَرۡجِعَ

(اور شرک نہ کرو) (مگر اس ضدی قوم نے) کہا جب تک موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اسکی عبادت میں

اِلَیۡنَا مُوۡسٰی ﴿۹۲﴾ قَالَ یٰہٰرُوۡنُ مَا مَنَعَکَ اِذۡ رَاَیۡتَہُمۡ

مشغول رہیں گے ۔ (جب موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے ہارون سے) کہا اے ہارون! جب تو نے اپنی قوم کو گمراہ ہوتے دیکھا

ضَلُّوۡۤا ﴿۹۳﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیۡتَ اَمۡرِیۡ ﴿۹۴﴾

تھا تو تجھے کس نے منع کیا تھا کہ تو میرے نقش قدم پر نہ چلے؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ ۵۴۸

۵۴۸ تفسیر:۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام شرک میں شامل نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی قوم کو شرک سے سختی کے ساتھ رد کا تھا۔ لیکن بائیبل کہتی ہے کہ وہ شرک میں شامل تھے۔ چنانچہ تورات میں لکھا ہے:۔

"اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی۔ تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے۔ جو ہمارے آگے آگے چلے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا۔ تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر انکو ہارون کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لیکر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب وہ کہنے لگے۔ اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھکو ملک مصر سے نکال کر لایا۔"

(خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۴)

پھر لکھا ہے کہ ہارون نے اس بچھڑے کے لئے قربان گاہ بنائی اور اسے بنی اسرائیل کا معبود قرار دیا چنانچہ لکھا ہے:۔

"یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہوگی۔ اور دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر انہوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں۔ پھر ان لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور اٹھ کر کھیل کود میں لگ گئے۔"

(خروج باب ۳۲ آیت ۵ و ۶)

ایک ادنیٰ سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس سے خدا بولا کرتا تھا وہ ایک بچھڑے کو خدا کس طرح قرار دے سکتا ہے۔ ایک شخص جو اپنے بھائی سے ہم کلام ہوتا ہے وہ کبھی ایسی غلطی کر سکتا ہے کہ ایک گیدڑ کو اپنا بھائی سمجھ لے مگر بائیبل جو دعویٰ کرتی ہے کہ

وہ موسیٰ پر نازل ہوئی تھی وہ کہتی ہے کہ ہارون شرک میں شامل ہو گیا تھا۔

لیکن عقل سلیم نے جب بھی اس پر غور کیا۔ یہی فیصلہ کیا کہ اس بارہ میں موسیٰؑ پر نازل ہونے والی بائیبل جھوٹی تھی۔ لیکن دو ہزار سال بعد نازل ہونے والا قرآن سچا ہے۔ بلکہ اگر بائیبل کو ہی غور سے دیکھا جائے تو اس کی اندرونی شہادت بھی اس واقعہ کو غلط قرار دیتی ہے۔ چنانچہ بائیبل بتاتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی ہے تو وہ سخت غیظ و غضب کی حالت میں پہاڑ سے واپس تشریف لائے اور بچھڑے کو آگ میں جلا کر اُسے خاکستر کیا اور اس کی خاک پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلوائی۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے:-

"اُس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا اور اسکو آگ میں جلایا۔ اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اُس میں سے بنی اسرائیل کو پلوایا۔"

(خروج باب ۳۲ آیت ۲۰)

پھر موسیٰؑ نے اس کی سزا میں حکم دیا کہ ہر شخص اپنے قریبی کو قتل کرے۔ اور اس طرح تین ہزار آدمی مارے گئے۔ چنانچہ بائیبل کہتی ہے:-

"اور اس نے اُن سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اُس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت رہے۔"

(خروج باب ۳۲ آیت ۲۷ و ۲۸)

پھر موسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ

"ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا دیوتا بنایا اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کر دے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تُو نے لکھی ہے مٹا دے۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۳۲)

مگر

"خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اُسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔"

(خروج باب ۳۲ آیت ۳۳)

اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد وہ پھر پہاڑ پر گئے۔ تو خدا تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ

"ہارون کو مقدس لباس پہنانا اور اسے مسح اور مقدس کرنا۔ تاکہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دے اور اس کے بیٹوں کو لا کر اُن کو کُرتے پہنانا۔ اور جیسے اُن کے باپ کو مسح کرے ویسے ہی اُن کو بھی مسح کرنا تاکہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دیں۔ اور اُن کا مسح ہونا اُن کے لئے نسل در نسل ابدی کہانت کا نشان ہوگا۔ اور موسیٰ نے سب کچھ جیسا خداوند نے اس کو حکم کیا تھا اس کے مطابق کیا۔"

(خروج باب ۴۰ آیت ۱۳ تا ۱۶)

اسی طرح گنتی باب ۳ میں بھی ذکر آتا ہے کہ

ہارون اور اُس کے بیٹوں کو ہی لاوی کی کہانت سپرد کر کے
اُن کا نام ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا گیا۔

بائبل کے اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ جہاں
اور لوگوں پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور مجرموں
کو قتل کی سزائیں دی گئیں وہاں حضرت ہارون علیہ السلام
پر بجائے کسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے اللہ تعالیٰ نے
یہ فیصلہ کیا کہ ہارون کو مقدس لباس پہنایا جائے
اور نہ صرف اس کی عزت افزائی کی جائے بلکہ اس کی
تمام اولاد کو بھی قابلِ اعزاز سمجھا جائے اور عبادت گاہوں
کی نگرانی کا کام اُن کے سپرد کیا جائے۔ اب کیا ایک
مشرکانہ فعل کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور کیا ہارون
علیہ السلام اگر اُسی فعل کے مرتکب ہوتے جس کا بائبل
انہیں مرتکب قرار دیتی ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے
اُن سے یہی سلوک کیا جاتا۔ جب اس شرارت کے تمام
سرغنے قتل کر دیئے گئے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام
کو کیوں قتل نہ کیا گیا۔ اور جب خدا نے موسیٰؑ سے
کہا تھا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اس کے نام کو
اپنی کتاب میں سے مٹا دُونگا۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۳۳)
تو اگر حضرت ہارونؑ قصور وار تھے تو اُن کا نام کیوں
نہ مٹایا گیا۔ بلکہ بائبل تو ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ
خدا تعالیٰ نے ہارون پر اظہارِ ناراضگی کرنے کی بجائے
اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور حکم دیا کہ آئندہ
تمام عبادت گاہوں کا انتظام ہارون اور اس کے
بیٹوں کے سپرد کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ انعام اور اس کی طرف سے
خوشنودی کا اظہار بتا رہا ہے کہ بچھڑا بنانا تو الگ
رہا حضرت ہارون اس کے پجاریوں میں سے بھی
نہیں تھے بلکہ جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے انہوں
نے بنی اسرائیل کو شرک سے روکا اور انہیں توحید
پر قائم رکھنا چاہا مگر انہوں نے ہارونؑ کی بات ماننے
سے انکار کر دیا۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے۔ کہ
انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا والا بھی ہارونؑ کے شرک
کرنے کے واقعہ کو غلط قرار دیتا ہے اور اس سے
یہ استدلال کرتا ہے کہ بائبل میں کئی واقعات بعد
میں بڑھا دیئے گئے ہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا
جلد ۴ زیر لفظ CALF THE GOLDEN
وجلد ۱۵ زیر لفظ موسیٰ)

تورات کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا
ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر جاتے
ہوئے بنی اسرائیل سے وقت کی کوئی تعیین نہیں
کی تھی۔ بلکہ صرف اتنا کہا تھا کہ

"جب تک ہم لوٹ کر تمہارے پاس
نہ آجائیں تم ہمارے لئے یہیں ٹھہرے
رہو۔" (خروج باب ۲۴ آیت ۱۴)

اور پھر وہ

"پہاڑ پر چالیس دن اور چالیس
رات رہا۔" (خروج باب ۲۴ آیت ۱۸)

لیکن موسیٰؑ کے پہاڑ پر جانے کے بعد جب
بنی اسرائیل نے اُن کے آنے میں دیر محسوس کی تو انہوں نے
ہارون سے اپنے لئے بچھڑا بنوا لیا۔ قرآن کریم
اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ موسیٰ تیس راتوں کے
وعدہ سے گئے تھے۔ مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے
اُن پر احسان فرما کر دس راتیں اور اپنے ساتھ ہمکلام
ہونے کا شرف عطا فرما دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے :- وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً
وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ
اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اعراف ع ۱۷) یعنی ہم نے موسیٰ
سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا مگر پھر ہم نے

دس راتیں اور بڑھا کر انہیں تکمیل تک پہنچا دیا۔ اور یُوں اُس کے رب کا چالیس رات کا وعدہ اِس سے پُورا ہُوا۔

اِن دونوں بیانات میں سے قرآنی بیان صاف طور پر سچا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تبھی تو بنی اسرائیل اُن کی غیر حاضری میں گھبرا گئے۔ ورنہ اگر غیر معیّن وقت ہوتا تو ایک مہینہ کچھ زیادہ وقت نہیں تھا کہ اس عرصہ میں وہ گھبرانے لگ جاتے۔ اُن میں گھبراہٹ اسی لئے پیدا ہوئی کہ موسیٰؑ تیس راتوں کا وعدہ کر گئے تھے مگر تیس راتیں گذرنے کے بعد واپس نہیں آئے۔ معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ سامری نے موسیٰؑ کی اس غیر حاضری سے فائدہ اُٹھایا اور قوم میں فتنہ کھڑا کر دیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس موقعہ پر جو یہ کہا کہ يَا قَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۔ یعنی اے میری قوم تمہیں اِس بچھڑے کے ذریعہ ایک آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری اصل آزمائش کا وقت اب آیا ہے۔ گویا فرعون کے عذاب اِس آزمائش کے مقابل پر بالکل ہیچ تھے کیونکہ وہ آزمائش دشمن کی طرف سے تھی جس میں قدرتاً سب لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب اندرونی فتنہ کھڑا ہو تو کئی کمزور طبائع ڈانواں ڈول ہو جاتی ہیں۔ پس حضرت ہارون علیہ السلام اپنی قوم کو توجہ دلاتے ہیں کہ بے شک پہلے بھی تمہارے سامنے مختلف آزمائشیں آتی رہی ہیں مگر اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ تمہاری آزمائش کا اصل وقت اَب آیا ہے اور اب دنیا پر ظاہر ہو جائیگا کہ تم میں سے کون سچے دل سے ایمان لایا تھا اور کون اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹا تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اندرونی فتنوں کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ پُوری تندہی سے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ خطرے والا فتنہ وہی ہوتا ہے۔ خواہ قوم کتنی بھی تھوڑی ہو اگر اندرونی فتنہ اس میں نہ ہو تو دشمن اُسے مٹا نہیں سکتا۔ لیکن اگر اندرونی فتنہ پیدا ہو تو پھر تباہی کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس جگہ ایک مختصر سا نوٹ سامری کے متعلق بھی دے دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک سامری کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک صفاتی نام ہے جو اب آہستہ آہستہ عَلم بن گیا ہے۔ سَمَرَ اصل میں کیل ٹھونکنے کو کہتے ہیں۔ اور سَامِر اس شخص کو کہتے ہیں جو کیل ٹھونکتا ہے چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ سَمَرَ کے معنے ہوتے ہیں اَوْثَقَهٗ وَشَدَّهٗ بِالْمِسْمَارِ۔ اُس نے کسی چیز کے بناتے وقت اس کی مضبوطی کا خاص خیال رکھا۔ اور اُسے کیلوں سے جڑ دیا۔ پس لوہار۔ ترکھان۔ سُنار اور معمار وغیرہ سب سامر کہلائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل میں آہنگری۔ نجاری۔ معماری اور سُناری وغیرہ کا کام کرنے والے کچھ لوگ تھے جن کو اپنے پیشہ کی مناسبت کے لحاظ سے سامرہ کہنے لگ گئے تھے۔ انہی پیشہ وروں میں سے یہ کوئی فتنہ پرداز شخص تھا جس نے توحید کے خلاف ایک خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا۔ اِس تحقیق کے مطابق سامرہ اُس قبیلے کا نام تھا جو یہ کام کرتے تھے۔ اور سامر اُسے کہا جاتا تھا جو اس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب تو مختلف پیشے مختلف قوموں اور افراد میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اُس زمانہ میں چونکہ ابھی میل جول کے ذرائع بہت محدود تھے اور پیشہ وروں کو کام کے حصول میں بہت دقت پیش آتی تھی اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ کئی

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ

(ہارونؑ نے) کہا۔ اے میری ماں کے بیٹے! نہ میری داڑھی (کے بال) پکڑ اور نہ میرے سر کے بال پکڑ۔ میں تو اس بات سے ڈر گیا تھا کہ

اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۵﴾

تُو یہ نہ کہے کہ تُو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا ہے اور میری بات کا خیال نہیں رکھا (کہ قوم کی تنظیم قائم رہے)۔ ۴۹

پیشے ایک ہی قوم میں اکٹھے ہوتے تھے۔ گویا یہ ایک پیشہ ور قبیلہ تھا جو لوہار۔ ترکھان۔ سُنار اور معمار وغیرہ کا کام جانتے تھے اور انہی کے ایک فرد سے اس فتنہ کی ابتداء ہوئی۔ بلکہ اگر تاریخ کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہی لوگوں سے خفیہ سوسائٹیاں شروع ہوئی ہیں۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بھی اسی قوم نے فتنہ اٹھایا تھا اور اس وقت اُن کے ایک لیڈر ہیرام نے جو حضرت سلیمانؑ کے تعمیر کردہ معبد کا سب سے بڑا کاریگر تھا۔ آپ کا مقابلہ کیا تھا۔ فری میسن اپنے آپ کو اُسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اِسی طرح ہماری جماعت میں مستریوں کا فتنہ ایک مشہور فتنہ ہے۔ پس سامری ایک پیشہ ور قبیلہ کا فرد تھا جسے اپنے کام کی مناسبت کے لحاظ سے سامرہ کہا جاتا تھا اور سامری اس کا صفاتی نام تھا مگر آہستہ آہستہ یہی نام اس کا عَلَم کے طور پر مشہور ہوگیا۔

معلوم ہوتا ہے یہودیوں میں یہ قبیلہ دیر تک طاقتور رہا ہے۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مدینہ منورہ میں بنو قرنیظہ سُنار اور لوہار کا ہی کام کرتے تھے۔

تَرْقُبْ

۴۹ حل لغات: - تَرْقُبْ رَقَبَ سے ہے اور رَقَبَہٗ کے معنے ہوتے ہیں اِنْتَظَرَہٗ۔ اس کا انتظار کیا۔ اور جب رَقَبَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہونگے حَرَسَهٗ اس کی نگہبانی کی۔ (اقرب)

تفسیر: - اسجگہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حقیقی عذر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو روکا تو تھا۔ لیکن زیادہ سختی اس لئے نہیں کی کہ کہیں یہ مقابل پر کھڑے نہ ہو جائیں اور تو یہ الزام نہ دے کہ قوم میں بغاوت پیدا کر دی اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ یا تو نے میرے اس حکم کا کہ امن رہے خیال نہیں رکھا۔ رَقَبَ کے دونوں معنے ہوتے ہیں۔ رَقَبَ کے معنے اِنْتَظَرَ کے بھی ہوتے ہیں اور رَقَبَ کے معنے حَرَسَ کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اَنَا اَرْقُبُ لَكَ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ آج رات میں تیری نگہبانی کرونگا۔ پس حضرت ہارونؑ کہتے ہیں کہ میں نے صرف اِس خیال سے اِن پر زیادہ سختی نہیں کی کہ مبادا آپ یہ کہدیں کہ تُو نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میرے حکم کا انتظار نہیں کیا۔ یا تو نے میرے اس حکم کا کہ امن رکھا جائے خیال نہیں رکھا۔

بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کسی دوسرے نبی کا مطیع نہیں ہو سکتا وہ صرف مطاع ہوتا ہے حالانکہ یہ تو درست ہے کہ نبی مطاع ہوتا ہے مگر ان لوگوں کا

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۶﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ

(اس پر موسیٰ سامری سے مخاطب ہوئے اور) کہا۔ اے سامری: تیرا کیا معاملہ ہے۔ اُس نے کہا۔ مَیں نے وہ کچھ دیکھا جو اِن لوگوں نے نہیں

يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ

دیکھا تھا۔ اور مَیں نے اِس رسول (یعنی موسیٰؑ) کی باتوں میں سے کچھ اختیار کر لیں (اور کچھ اختیار نہ کیں)

فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۷﴾ قَالَ

پھر (جب موقعہ آیا تو) مَیں نے اُن (اختیار کی ہوئی باتوں) کو بھی پھینک دیا۔ اور میرے دل نے یہی چیز مجھے اچھی کر کے دکھائی تھی۔ (موسیٰ نے)

فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ

کہا۔ اچھا تو جا تیری اِس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو اس (دنیا) میں ہر ایک سے یہ کہتا رہے کہ (مجھے) چھوؤ نہیں

وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى

(یعنی مجھ کو موسیٰ نے گندہ قرار دیدیا ہے) اور (موسیٰ نے سامری سے یہ بھی کہا کہ) تیرے لئے ایک وقت مقرر ہے (یعنی سزا کا) جسکو تو ٹلا نہیں سکیگا ۵۵ؔ اور تُو اپنے

جنکی طرف وہ مبعوث کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اور کسی کا مطیع نہیں ہوتا۔ اسطرح تو کہنا پڑیگا کہ نعوذ باللہ نبی خدا تعالیٰ کا بھی مطیع نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ بات بالبداہت باطل ہے۔ انہی آیات کو دیکھ لو۔ حضرت ہارونؑ اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ تم میری اطاعت اختیار کرو اور میرے حکم کی نافرمانی مت کرو۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو قوم کا مطاع قرار دیا۔ مگر دوسری طرف جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ کیا تُو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ اپنی قوم کے تو مطاع تھے لیکن حضرت موسیٰ کے مطیع تھے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے صرف اِس خیال سے ان لوگوں پر زیادہ سختی نہیں کی کہ کہیں آپ مجھے یہ الزام نہ دیں کہ مَیں نے آپ کے حکم کا انتظار نہ کیا اور بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ گویا وہ ہر اہم بات میں اُنکے حکم کے منتظر رہتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں موسیٰؑ کی اطاعت میں کوئی فرق نہ آ جائے۔ یہ بات بتاتی ہے کہ عوام الناس کا یہ خیال کہ نبی کسی دوسرے نبی کا مطیع نہیں ہوتا قرآن کریم کے رو سے بالکل غلط ہے۔

۵۵ؔ حل لغات:۔ اَثَرٌ کے معنے حدیث کے ہیں یعنی بات (اقرب) اور اَلرَّسُوْل میں الف لام معہود ذہنی کا ہے یعنی وہ رسول جس کو سب مخاطب لوگ بھی جانتے ہیں اور مَیں بھی جانتا ہوں یعنی موسیٰ علیہ السلام۔

تفسیر:۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ سامری نے کہا کہ اے موسیٰ! تیری قوم تو بے وقوف تھی مَیں عقلمند تھا۔ مَیں نے تیرے وہ حالات دیکھے جو تیری قوم نے نہیں دیکھے۔ یعنی وہ تو اندھا دھند

اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ

معبود کی طرف دیکھ جس کے سامنے بیٹھ کر تُو اس کی پرستش کیا کرتا تھا۔ ہم اس کو جلائیں گے اور پھر

تجھے نبی مان رہی تھی میں نہیں مان رہا تھا۔ سو میں نے تیری باتوں میں سے کچھ اختیار کریں اور کچھ پر ایمان نہ لایا اور جس باتوں پر میں ایمان لایا وہ بھی اس لئے تاکہ تیری قوم دھوکا میں آکر مجھے اپنا لیڈر بنالے۔ اس کے بعد جب میں نے مصلحت اس کے خلاف دیکھی اور تیرے پہاڑ پر جانے کے بعد تیری قوم کو میں نے ڈگمگاتے پایا تو وہ تعلیم جو پہلے میں نے اختیار کرلی تھی اُسے میں نے پھینک دیا اور جس طرح پہلے تجھ پر ایمان لانا میرے نفس نے پسند کیا تھا اب اُس نے مجھے یہ صلاح دی کہ اُسے چھوڑ دوں کیونکہ جب میں نے دیکھا کہ تیری قوم شرک کی طرف جھکی ہوئی ہے تو ایک بچھڑا بنا کر اُن کے آگے پیش کردیا تاکہ وہ مجھے اپنا لیڈر بنالیں۔ یہ سب باتیں سُنکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تُو نے قوم میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا تھا۔ اب تیری سزا یہی ہے کہ تجھے قوم میں ذلیل کیا جائے۔ پس جب تک تُو زندہ ہے تیرا فرض ہے کہ جب بھی بنی اسرائیل کے پاس سے گذرے تو کہتا جائے مجھے کوئی نہ چھوئے کیونکہ موسیٰ نے مجھ سے تعلق رکھنے سے منع کردیا ہے۔ مگر یہ سزا بہرحال دنیوی ہے۔ تیرے لئے ایک اور سزا بھی مقرر ہے جو ضرور پوری ہو کر رہے گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اپنی قوم کے نظام کے لئے بھی کسی سے کلام کرنے کو روکنا جائز نہیں۔ حالانکہ اگر اپنی قوم کا نظام قائم رکھنے کے لئے کسی سے کلام کرنے کو روکنا جائز نہیں تو سب سے پہلے مجرم حضرت موسیٰؑ ہیں۔ جنہوں نے سامری کو حکم دے دیا کہ تُو جب بھی بنی اسرائیل کے پاس سے گذرے۔ تو یہ کہا کر کہ موسیٰؑ کے حکم کے مطابق میرے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومی نظام کے مطابق قطع تعلقی ایمان کے مظاہرہ کا نام ہے۔ اور اِسے مقاطعہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ مقاطعہ ہے تو چاہیئے کہ ہر مسلمان اپنے بچوں کو پنڈتوں کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجا کرے تاکہ وہ وید کی باتیں سیکھیں یا عیسائی پادریوں کے پاس بھیجا کرے تاکہ وہ اُن سے انجیل کی باتیں سیکھیں۔ سارے پاکستان اور مصر میں شور مچا ہوا ہے کہ عیسائی سکولوں میں استادوں کو انجیل پڑھانے کی اجازت نہ ہو۔ ورنہ ایسے سکولوں میں مسلمان بچوں کو داخل کرنے سے منع کردیا جائے۔ اگر جوشِ ایمان کے ماتحت ان لوگوں سے جو ظاہر میں قوم کے ساتھ شامل ہو کر فریب کرتے ہیں کسی قوم کا اپنی مرضی سے انقطاع کرنا ناجائز ہے تو پھر تو کوئی قوم اپنے ایمان کی حفاظت کر ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی کے باپ کو کوئی گالی دیتا ہے تو وہ اس سے کلام نہیں کرتا۔ کیا اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مقاطعہ کر رہا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص کسی گروہ میں شامل ہو کر اس گروہ کے عقائد کے خلاف آہستہ آہستہ اُس کے نوجوانوں کو ورغلائے اور والدین اپنے بچوں کو اس سے ملنے سے روکیں تو یہ بھی بائیکاٹ نہیں غیرتِ ایمانی ہے۔

لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ﴿۹۸﴾ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ

اس کو سمندر میں پھینک دیں گے ۵۵ تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۹﴾ كَذٰلِكَ

سوا اور کوئی معبود نہیں - وہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے - اسی طرح

۵۵ حل لغات :- نَسْفَہٗ کے معنے ہوتے ہیں عَضَّہٗ اُس کو کاٹا (اقرب) اور نَسَفَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں غَرْبَلَہٗ (لسان العرب) کسی چیز کو چھلنی سے چھانا - پس لَنَنْسِفَنَّہٗ کے معنے ہوں گے ہم اُس کو کاٹیں گے اور پھر اس کو چھلنی میں چھانیں گے۔

تفسیر :- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا کہ انقطاعِ تعلق کے علاوہ اس دنیا میں تجھے یہ روحانی سزا بھی ملے گی کہ جس معبود کی تو پوجا کرتا تھا ہم اُس کو جلا دیں گے اور اس کی راکھ کو دریا میں پھینک دیں گے تاکہ تجھ پر یہ بات کھل جائے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں -

اِس جگہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بُت تو سونے کا تھا - اُس کو جلا کر اُس کی راکھ سمندر میں پھینکنا ایک بے معنے بات ہے - سونا جل کر راکھ نہیں ہُوا کرتا اور اگر کشتہ بنا کر اس کو راکھ کی طرح بھی کر دیتے ہیں تب بھی اس میں بہت سی دوائیں پڑتی ہیں - اسی وجہ سے لوگ دو تین تولہ سونے کا کشتہ بناتے ہیں - لیکن یہ سونا فرعون کے دارالخلافہ کے امراء کا سونا تھا - اس کا کشتہ بنانا آسان کام نہیں تھا - عیسائی جو کہ یہودیت کے قائم مقام ہیں اور جن کی کتابوں میں ابتداءً یہ باتیں درج ہیں وہی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں لغو قصے درج ہیں حالانکہ قرآن کریم نے اُن کی کتابوں کا لکھا ہُوا واقعہ درج کیا ہے اور اس صورت میں درج کیا ہے کہ وہ معقول ہو گیا ہے -

اصل بات یہ ہے کہ آواز نکالنے کیلئے لکڑی کو استعمال کیا جاتا ہے - کیونکہ اس میں آسانی کے ساتھ انسانی گلے کے مشابہ پردے پیدا کئے جا سکتے ہیں - جیسے مُرلی میں - پس قرآن نے صرف اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بُت میں سے اس نے کس طرح آواز پیدا کر لی یعنی اُس کے منہ کی طرف اس نے کچھ لکڑی استعمال کی جس میں مُرلی کی طرح کے پردے بنائے جب ہوا اُس میں سے نکلتی تو آواز پیدا ہوتی - جب بُت کو آگ میں ڈالا گیا - تو سونا تو پگھلا مگر لکڑی جل کر راکھ ہو گئی - جس راکھ کو بُت سمیت اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا - لیکن چونکہ نَسَفَ کے معنے کاٹنے کے بھی ہیں اور دھاتوں کو ریتی کے ساتھ رگڑ کر کاٹا جاتا ہے اور اسی طرح نَسَفَ کے معنے چھلنی میں ڈال کر چھاننے کے بھی ہیں - اس لئے اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ہم پہلے تو اس بت کو ریتی کے ذریعہ سے رگڑ کر اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے - پھر لکڑی کی راکھ سمیت اس کو چھلنی میں ڈالیں گے اور اس کے بعد راکھ اور باریک ذرات تو سمندر میں پھینک دیں گے اور سونے کے ریزے جو اب بُت کی شکل میں نہیں رہے اور جن سے شرک پیدا نہیں ہو سکتا - اُن کو قومی ضرورت کے لئے استعمال کریں گے کیونکہ ہماری غرض صرف

نَسْفَہٗ

نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ

ہم تیرے سامنے پہلے لوگوں کی خبریں بیان کرتے ہیں - اور ہم نے تجھے اپنے

اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ

پاس سے ذکر (یعنی قرآن) عطا فرمایا ہے ۵۵۲ جو اس سے منہ پھیرے گا -

فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ

وہ قیامت کے دن ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے گا - (ایسے لوگ) اس حالت میں بڑی دیر تک رہنگے

خدا کی وحدانیت ثابت کرنا ہے -

۵۵۲ تفسیر :- اس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس واقعہ کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے - اور جو تفصیل اسرائیلی روایات میں آتی ہے وہ جھوٹی ہے کیونکہ قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے - اور خدا تعالےٰ ہی ہر چیز کو جانتا ہے - یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے مسلمان مفسرین نے اسرائیلی روایات کے مطابق یوں بیان کیا ہے کہ "الرَّسُوْل" سے مراد موسیٰؑ نہیں تھے بلکہ جبرائیل تھے - اور "اثر" سے مراد "بات" نہیں تھی جیسا کہ لغت میں لکھا ہے بلکہ قدموں کے نشان تھے - اور سامری نے یہ کہا تھا کہ جب جبرائیل تیرے پاس آیا کرتا تھا تو تیری قوم کو تو وہ نظر نہیں آتا تھا - لیکن مجھے نظر آتا تھا - میں نے ایک دن جبرائیل کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھالی پھر جب بچھڑا بنایا تو سونا پگھلا کر اس میں وہ مٹی ڈال دی نتیجہ یہ ہوا - کہ وہ بچھڑا بولنے لگ گیا -

یہ قصہ بالبداہت باطل اور غلط ہے - اوّل تو یہ کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس طرح ہم تجھے پرانی باتیں بتاتے ہیں اور تجھے اپنے پاس سے حقیقت کی تفصیل عطا کرتے ہیں پھر تو ساری کی ساری حقیقت پرانی کتابوں میں موجود تھی - کسی ایسے دعویٰ کی کیا ضرورت تھی - دوسرے اس بات کے ماننے کے لئے ہمارے مفسرین جیسے سادہ لوح آدمی چاہئیں کہ موسیٰؑ کے اعلےٰ درجہ کے متبعین نے تو جبرائیل کو نہ دیکھا لیکن سامری جو کافر ہی تھا اُس نے دیکھ لیا -

پھر اس بات کو ماننا بھی بڑی سادگی کی بات ہے کہ جبرائیل کے پاؤں کی مٹی ڈالنے سے سونے کا بچھڑا بولنے لگ گیا - حالانکہ معمولی سُنار بھی جانتے ہیں کہ اگر خول دار بُت بنایا جائے اور اسکے منہ کی طرف ایک سوراخ کیا جائے اور اُس میں مُرلی کی طرح لکڑی کے پردے بنا دئے جائیں - اور ایک سوراخ اس کی پیٹھ کی طرف کیا جائے تو جب پیٹھ کی طرف سے ہوا آئیگی تو منہ میں سے آواز نکلے گی - جیسا کہ مُرلی اور سیٹیوں میں ہوتا ہے - بس واقعہ وہی صحیح ہے جو ہم نے لکھا ہے اور قرآن کے الفاظ کے مطابق ہے - مفسرین کو یہ غلطی لگی ہے کہ ایک تو انہوں نے اسرائیلی روایتوں کو سچ سمجھ لیا -

وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ

اور قیامت کے دن یہ بوجھ اور بھی تکلیف دہ ہوگا - جس دن کہ بگل میں

فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾

پھونکا جائیگا - اور اُس دن مجرموں کو ہم اس حالت میں اٹھائینگے کہ اُن کی آنکھیں نیلی ہونگی۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ

وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرینگے کہ تم تو صرف دس (صدیاں اس دنیا میں حاکم) رہے ہو گے ہم

اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً

خوب جانتے ہیں اس کو جو وہ کہیں گے۔ جب اُن میں سے سب سے زیادہ اُن کے مذہب پر چلنے والا کہے گا۔

دوسرے انہوں نے لغت پر غور نہیں کیا۔ اگر وہ لغت پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اثر کے معنے بات کے بھی ہیں اور الرَّسُوْل کے معنے لغت کے مطابق معلوم رسول کے بھی ہیں نہ کہ جبرائیل کے۔

۵۵۳ تفسیر:- یوم القیامۃ قرآن و حدیث سے دو ثابت ہوتے ہیں۔ ایک مرنے کا دن جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (مجمع البحار جلد ۳ ص۱۸۳) یعنی جو شخص مرگیا اُس کی قیامت کا دن آگیا۔ اور ایک قیامت کا دن وہ ہوگا جس دن سب اگلے پچھلے لوگ زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں جو پہلا یوم القیامۃ آیا ہے اس سے مُراد انسانی موت کا دن ہے اور جو دوسرا یوم القیامۃ آیا ہے اس سے مراد تمام قوموں کے زندہ ہو کر اُٹھائے جانے کا دن ہے۔ جب مشرکین کے انجام کا ساری قوموں کو پتہ لگ جائے گا۔ اور سب قومیں شرک سے نفرت کرنے لگ جائیں گی۔

یہ موجودہ زمانہ کے متعلق خبر ہے کہ اس میں ہر مشرک قوم دعویٰ کرنے لگ گئی ہے کہ درحقیقت وہ موحد ہے۔ کیا ہندو اور کیا عیسائی سب کہنے لگ گئے ہیں کہ ہم تو ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ فرماتا ہے۔ یہ پیشگوئی اُسوقت پوری ہوگی جب تمام اقوام میں بیداری پیدا ہو جائے گی۔ اور مشرک لوگ خصوصیت کے ساتھ نیلی آنکھوں کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔ مطلب یہ کہ اُس دن شرک زیادہ تر نیلی آنکھوں والی قوموں میں ہوگا۔ یعنی یورپین اور امریکن لوگوں میں اور وہ پہلے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہونگے کہ ہم ہمیشہ دنیا پر حکومت کریں گے لیکن اس دن اُن میں یہ کانا پھوسی شروع ہو جائیگی کہ تمہاری عمر تو صرف دس تھی یعنی دس صدیاں۔ مُراد یہ ہے کہ تمہاری ترقی کا زمانہ صرف ایک ہزار سال تھا۔ تم اِسی پر اترا گئے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو بھول گئے۔

ع ۵ ۱۴

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ

کہ تم ایک تھوڑی سی مدت ٹھہرے ہو۔ ۵۵۴ اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پُوچھتے ہیں۔

فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۶﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا

تو کہدے کہ ان کو میرا رب اکھاڑ کر پھینک دیگا۔ اور اُن کو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت

صَفْصَفًا ﴿۱۰۷﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۸﴾

میں چھوڑ دے گا کہ نہ تو تُو اُس میں کوئی موڑ دیکھے گا اور نہ کوئی اونچائی۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

اُس دن لوگ پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہ ہوگی۔ اور

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا

رحمٰن (خدا کی آواز) کے مقابلہ میں (انسانوں کی) آوازیں دب جائیں گی۔ پس تُو سوائے کھُسر پھُسر کے

هَمْسًا ﴿۱۰۹﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ

کچھ نہ سُنیگا۔ اُس دن شفاعت سوائے اس کے جس کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت

۵۵۴ تفسیر:۔ فرماتا ہے نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ۔ ہم اُن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں جس وقت اُن میں سے سب سے بڑا لیڈر یہ کہے گا کہ اگر حقیقت دیکھی جائے تو تم نے بہت تھوڑا عرصہ اِس دُنیا میں بادشاہت کی ہے۔

لفظی طور پر تو اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نے ایک دن بادشاہت کی ہے لیکن یوم کے معنے چونکہ عربی زبان میں وقت کے بھی ہوتے ہیں اور یوم کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج ع ۶) خدا کا ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اور اِس سے پہلے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم "دس" رہے ہو۔ اور دس سے مراد دس صدیاں بھی ہوسکتی ہیں جو ہزار سال کے برابر بنتی ہیں۔ اسلئے اِلَّا يَوْمًا کے بھی دو معنے ہو سکتے ہیں۔ کہ تم "یوم" خداوندی رہے ہو۔ یعنی دس صدیاں۔ اور یہ بھی کہ جب آخر میں تنزل آگیا تو عیش کا زمانہ بہت چھوٹا ہوگیا۔ اور یہی کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے بہت تھوڑی دیر دنیا میں ترقی حاصل کی اور آخر میں تم کو ہلاک کردیا گیا۔

اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۱۰﴾ يَعْلَمُ

رحمٰن (خدا) دے گا - اور جس کے حق میں بات کہنے کو وہ پسند کریگا کسی کو نفع نہ دیگی ۵۵ وہ جو کچھ اُنکے

مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ

آگے آنے والا ہے اسکو بھی جانتا ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے گذر چکا ہے اسکو بھی جانتا ہے اور وہ اپنے علم کے

۵۵ حل لغات :- يَنْسِفُ نَسَفَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور نَسَفَ کے معنے ہوتے ہیں اِقْتَلَعَهٗ - جڑھ سے اکھیڑ دیا - چنانچہ کہتے ہیں نَسَفَتِ الرِّيْحُ الشَّيْءَ - یعنی ہوا نے چیزوں کو جڑوں سے اکھیڑ دیا (اقرب)

اَلْجَبَلُ کے معنے ہوتے ہیں كُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ - پہاڑ - سَيِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ - قوم کا سردار اور عالم (اقرب)

اَلْاَمْتُ کے معنے ہیں اَلْمَكَانُ الْمُرْتَفِعُ بلند مکان (اقرب)

هَمْسٌ کے معنے ہیں اَلصَّوْتُ الْخَفِيُّ - بالکل نیچی آواز (اقرب)

تفسیر :- اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب نیلی آنکھوں والے یعنی یوروپین لوگ یہ پیشگوئی پڑھیں گے تو کہیں گے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ عیسائی حکومتیں تباہ ہو جائیں گی لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے ڈیوک اور ایمپرر اور کنگ کہاں جائیں گے ؟ اس کا جواب یہ دیا ہے - کہ اس تباہی کے آنے سے پہلے ہی ان کو ختم کر دیا جائے گا - اور تمام ملکوں میں ڈیماکریسی قائم ہو جائے گی - اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ لوگ قرآن لانے والے کی آواز سننے لگ جائیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہیں - اور رحمٰن خدا کی آواز بلند ہونے لگ جائے گی - اور شرک کی آواز دھیمی پڑنے لگ جائے گی اور یا تو ترقی کے لئے عیسائی ہونا بڑی سفارش سمجھا جاتا تھا اور یا اُس زمانہ میں ترقی کے لئے مسلمان ہونا سفارش سمجھا جائے گا -

مسلمان ہونے کا نتیجہ ہم نے اس بات سے نکالا ہے کہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ شفاعت اُسی کو فائدہ دے گی جس کے لئے رحمٰن خدا اجازت دے گا - اور جس کے متعلق بات کہنے پر وہ راضی ہوگا اور قرآن کریم میں مسلمانوں کے متعلق آتا ہے کہ

"رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ"

(مجادلہ ع۳)

کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے - پس رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا میں مسلمانوں کا ذکر ہے - کہ اس وقت مسلمان ہونا ہی ترقی کا سب سے بڑا معیار سمجھا جائے گا -

يَنْسِفُ اَلْجَبَلُ اَلْاَمْتُ

بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِؕ وَقَدْ

ذریعہ سے اس (یعنی خدا) کا احاطہ نہیں کر سکتے ۵۵۶ اور (اس دن) زندہ اور قائم رہنے اور قائم رکھنے والے (خدا) کے سامنے سب بڑے لوگ

خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

(ادب سے) جھک جائیں گے اور جو ظلم کریگا وہ ناکام رہیگا ۵۵۷ اور جس نے وقت کی ضرورت کے مطابق

الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا

عمل کئے ہونگے اور وہ مومن بھی ہوگا۔ وہ نہ تو کسی قسم کے ظلم سے ڈریگا اور نہ کسی قسم

هَضْمًا ﴿۱۱۳﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ

کی حق تلفی سے ۵۵۸ اور اسی طرح ہم نے اس (کتاب) کو عربی زبان کے قرآن کی صورت میں اتارا ہے اور اس میں

صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ

ہر قسم کے انذار کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں یا (یہ قرآن) ان کیلئے

۵۵۶ تفسیر:۔ اسجگہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ پیشگوئی ضرور پوری ہو کر رہے گی۔ کیونکہ یہ خدائے علیم کی طرف سے ہے۔

۵۵۷ حل لغات:۔ وَجْهٌ کے کے معنے ہوتے ہیں سَيِّدُ الْقَوْمِ۔ قوم کا سردار (اقرب)

اَلْقَيُّوْمُ کے معنے ہوتے ہیں اَلْقَائِمُ الْحَافِظُ بِكُلِّ شَيْءٍ وَالْمُعْطِيْ لَهٗ مَا بِهٖ قَوَامُهٗ۔ (مفردات) یعنی ایسا وجود جو خود قائم ہے۔ اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے۔ (مفردات)

تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کہ آخر وہ وقت آ جائیگا جب کہ سب بڑے بڑے لوگ اور قومیں اور حکومتیں خدا تعالیٰ کے سچے دین کے سامنے جھک جائیں گی۔ اور اسلام میں داخل ہو جائینگی۔

۵۵۸ حل لغات:۔ هَضْمٌ۔ هَضَمَ کا مصدر ہے۔ اور هَضَمَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں كَسَرَهٗ۔ اس کو توڑ دیا۔ اور هَضَمَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں ظَلَمَهٗ وَغَصَبَهٗ۔ اس پر ظلم کیا اور اس کی اشیاء اور جائداد پر قبضہ کر لیا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اس زمانہ کے آنے سے پہلے وہ زمانہ تھا کہ مسلمان ظلم اور حق تلفی سے ڈرتے تھے۔ مگر پھر وہ زمانہ آ جائے گا۔ جبکہ خود عیسائی بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ اور مسلمان ظلم اور حق تلفی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۴﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

(خدا کی) یاد کا سامان (نئے سرے سے) پیدا کرے ۵۹ پس اللہ (تعالیٰ) جو بادشاہ ہے بڑی شان والا ہے، اور ہمیشہ

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ

قائم رہنے والا ہے اور تو قرآن کی وحی اُترنے سے پہلے اسکے بارے میں جلدی سے کام نہ لے۔ اور (مجملاً) یہ کہتا رہ

وَحْيُهٗ ؗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ

کہ اے میرے رب! میرے علم کو بڑھا۔ اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو (ایک امر

اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۶﴾

کی) تاکید کی تھی مگر وہ بھول گیا اور ہم نے خوب جانچ لیا کہ اُس کے دل میں ہمارا حکم توڑنے کے متعلق کوئی پختہ ارادہ نہیں تھا۔ ۶۰

ع ۶ ۱۵

۵۹ تفسیر:- عیسائیوں کے اسلام لانے کی یہ ترکیب کی گئی ہے کہ قرآن کو ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے کہ ہر غیر متعصب اس کو سمجھ سکتا ہے۔ پس جب عیسائیوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ تو وہ اس کو ماننے لگ جائیں گے اور جو ضدی ہونگے وہ اگر عقل سے نہیں مانیں گے تو عذابوں سے گھبرا کر مان لیں گے۔ یا قسم قسم کے عذابوں سے تباہ کر دئے جائیں گے۔ اور قرآن کریم خدا کی یاد پیدا کرنے کے لئے نئے نئے مضامین عیسائیوں کے سامنے رکھیگا جو اُن کی ہدایت کا موجب ہونگے۔ اور اُن کے دلوں میں نیکی کا مادہ پیدا کر دینگے۔

اس آیت میں قرآن کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کتاب کثرت سے پڑھی جائیگی اور عربیًّا کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اس کے مفہوم کا سمجھنا بھی آسان ہوگا۔ کیونکہ یہ ہر بات دلیل کے ساتھ بیان کرے گی۔

۶۰ تفسیر:- اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان بہت سے امور میں اپنی عقل استعمال کرے۔ لیکن وہ شخص جو اس حکمت کو نہیں سمجھتا وہ چاہتا ہے کہ جھٹ خدا کی وحی نازل ہو کر تمام تفصیلات بیان کردے اور مجھے سوچنا نہ پڑے۔ فرماتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں وحی جب مکمل ہو جائیگی تو جتنی ضروری باتیں ہیں اُس میں بیان ہو جائیں گی۔ اور جن باتوں کے متعلق خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان خود سوچ کر فیصلہ کرے وہ اُس میں بیان نہیں ہونگی۔ ان باتوں کے متعلق ہدایت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان مجملاً یہ دُعا کرتا رہے کہ الٰہی جن جن شخصی یا قومی کاموں کے لئے مجھے ہدایت کی ضرورت ہو تو میرے دل پر ان کے متعلق روشنی نازل کر دیا کر۔ تاکہ میں اور میری قوم گمراہ نہ ہوں اور میرے علم کو ہمیشہ بڑھاتا رہ۔

دنیا میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچپن سیکھنے کا زمانہ ہوتا ہے جوانی عمل کا زمانہ ہوتا ہے اور بڑھاپا عقل کا زمانہ

زمانہ ہوتا ہے لیکن قرآن کریم کی رو سے ایک حقیقی مومن
ان ساری چیزوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ اس کا
بڑھاپا اُسے قوتِ عمل اور علم کی تحصیل سے محروم نہیں
کرتا۔ اس کی جوانی اس کی سوچ کو ناکارہ نہیں کر دیتی
بلکہ جس طرح بچپن میں جب وہ ذرا بھی بولنے کے
قابل ہوتا ہے ہر بات کو سُنکر اس پر فوراً جرح
شروع کر دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ فلاں بات کیوں
ہے اور کس لئے ہے۔ اور اس میں علم سیکھنے کی خواہش
انتہا درجہ کی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا بڑھاپا
بھی علوم سیکھنے میں لگا رہتا ہے۔ اور وہ کبھی بھی اپنے
آپ کو علم کی تحصیل سے مستغنی نہیں سمجھتا۔ اس کی
موٹی مثال ہمیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مقدس
ذات میں ملتی ہے۔ آپ کو پچپن چھپن سال کی عمر میں
اللہ تعالیٰ الہاماً فرماتا ہے کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ
عِلْمًا یعنی اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے
ساتھ ہمارا سلوک ایسا ہی ہے جیسے ماں کا اپنے
بچّہ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے بڑی عمر میں جہاں
دوسرے لوگ بے کار ہو جاتے ہیں اور زائد علوم
اور معارف حاصل کرنے کی خواہش ان کے دلوں سے
مٹ جاتی ہے اور ان کو یہ کہنے کی عادت ہو جاتی
ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے تجھے ہماری ہدایت یہ
ہے کہ تو ہمیشہ خدا تعالےٰ سے دُعا کرتا رہ کہ خدایا
میرا علم اَور بڑھا۔ میرا علم اَور بڑھا۔ پس مومن اپنی
زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی علم سیکھنے سے غافل
نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ ایک لذّت اور سرور محسوس
کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب انسان پر ایسا
دَور آ جاتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ میں نے جو کچھ
سیکھنا تھا سیکھ لیا ہے۔ اگر میں کسی امر کے
متعلق سوال کروں گا تو لوگ کہیں گے کیسا جاہل ہے
اسے ابھی تک فلاں بات کا بھی پتا نہیں۔ تو وہ علم
حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ دیکھو حضرت
ابراہیم علیہ السلام بڑی عمر کے آدمی تھے مگر پھر بھی
کہتے ہیں۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی۔
(بقرہ ع ۳۵) دُنیا کے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ
احیاءِ موتٰی پر کبھی غور ہی نہیں کرتے۔ نہ انسانی زندگی
انہیں اعجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ نہ حیوانی زندگی انہیں
اعجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ ہزاروں سال سے زندگی کا دَور
چلا آ رہا ہے۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ انسان
کی زندگی کس طرح شروع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں
صرف ڈارون کی ایک مثال ہے جس کے دل میں یہ
سوال پیدا ہوا کہ زندگی کس طرح ظاہر ہوئی ہے اور
وہ کیا کیا مدارج ہیں جن میں سے انسان گذرا ہے
اُسکی تحقیق غلط تھی یا صحیح بہرحال اس کے دل میں
خیال پیدا ہُوا اور اس کے بعد ساری دنیا میں ایک
رَو چل گئی کہ دیکھیں دنیا کس طرح پیدا ہوئی ہے؟
اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ
سے سوال کیا کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی
گویا وہی خیال جو دنیوی اور مادی لوگوں کے دلوں میں
ڈارون کے زمانہ میں پیدا ہُوا۔ آج سے ہزاروں سال
پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی پیدا ہُوا
اور انہوں نے کہا اے میرے رب! یہ بے جان مادہ
کس طرح زندہ ہو جایا کرتا ہے؟ ڈارون نے تو مادی
احیاء کے متعلق جستجو کی تھی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام
کو مادی زندگی سے کوئی غرض نہیں تھی انہیں رُوح کی
زندگی مطلوب تھی اور انہوں نے چاہا کہ میں اللہ تعالیٰ
سے یہ پتہ لگاؤں کہ اَرواح کس طرح زندہ ہُوا کرتی ہیں
جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا تو اللہ تعالےٰ
نے یہ نہیں کہا کہ ابراہیم تُو تو پچاس ساٹھ سال کا ہو چکا ہے،

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا

اور (یہ بھی یاد کرو کہ) جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم (کی پیدائش کے شکریہ میں) (خدا کو) سجدہ کرو۔ تو ابلیس کے سوا

اب یہ بچوں کی سی باتیں چھوڑ دے۔ بلکہ اُس نے بتایا کہ ارواح کس طرح زندہ ہُوا کرتی ہیں۔ پس ہر عمر میں علم سیکھنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتے رہنا چاہیئے کہ الٰہی میرا علم بڑھا۔ کیونکہ جب تک انسانی قلب میں علوم حاصل کرنے کی ہر وقت پیاس نہ ہو اُس وقت تک وہ کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔

پھر آدم کی مثال دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ تم نسلِ آدم میں سے ہو۔ آدم تم سے بڑا تھا چھوٹا نہ تھا۔ وہ تمہارا باپ تھا اور مامور من اللہ تھا اور اپنے دل میں خدا تعالیٰ کی اطاعت کا جوش رکھتا تھا جب ہم نے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اُس پر احکام نازل کئے۔ تو گو وہ دل سے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ارادہ کر چکا تھا مگر پھر بھی بعض باتوں کو وہ بھول گیا یعنی اُن کے بارہ میں اُس سے غفلت ظاہر ہوئی۔ تو تم جو آدم کے بیٹے ہو اور اس سے چھوٹے درجہ کے ہو کیوں ہر معاملہ میں خدا تعالیٰ کے یقینی احکام مانگتے ہو۔ جو احکام آجائیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ اور جو نہ آئیں اُن پر خود غور کرو اور خدا تعالیٰ کی مدد مانگتے رہو۔ اور اس سے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ جو سچا علم ہے اور ہمارے لئے مفید ہے وہ ہم کو عطا کر تاکہ ہم اس کی روشنی میں ہدایت کے راستہ پر گامزن ہو سکیں۔

اِس آیت میں لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آدم سے صرف ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی جس میں اس کے عزم اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے سورۂ اعراف میں بتایا ہے کہ جب شیطان اخلاص کا جبّہ پہن کر آدم کے پاس گیا تو قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (اعراف ع ۲) وہ آدم اور اسکے ساتھیوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ مَیں تو آپ لوگوں کا بڑا خیر خواہ ہوں۔ گویا ظاہری مخالفت کو چھوڑ کر وہ منافقانہ رنگ میں آدم کی جماعت کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اور اس نے اپنے اخلاص کا انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا جیساکہ سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا یہی طریق بتایا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ درست تو ہے کہ تُو اللہ کا رسول ہے مگر خدا تعالیٰ اس بات پر بھی گواہ ہے کہ یہ منافق اپنی قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں۔ اس لئے ان منافقوں سے ہمیشہ بچتے رہو۔ یہی طریق زمانۂ آدم کے منافقین کے سردار نے اختیار کیا۔ اور آدم کو اپنے اخلاص اور فدائیت کا یقین دلایا۔ اس پر آدم نے یہ اجتہاد کیا کہ گو یہ شخص پہلے ابلیسی رُوح اپنے اندر رکھتا تھا۔ مگر اب تو یہ مخالفت کا راستہ ترک کر چکا ہے۔ اس لئے اب اِس سے تعلق رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ چنانچہ اس اجتہادی غلطی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جس حالتِ امن میں وہ رہتے تھے اس سے انہیں نکلنا پڑا۔ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا میں انکی اسی اجتہادی غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان نے آدم کو بغیر اس کے کہ اُس کا اپنا ارادہ ہوتا پھسلا دیا۔

إِلَّآ إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ ﴿١١٧﴾ فَقُلْنَا يَـٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَـٰذَا عَدُوٌّ

سب نے سجدہ کر دیا۔ اُس نے انکار کیا ۵۶۱ اِس پر ہم نے آدم سے کہا۔ اے آدم! یہ (ابلیس) یقیناً تیرا اور تیرے

لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ

ساتھیوں کا دشمن ہے۔ پس تم دونوں (گروہوں) کو یہ جنت سے نہ نکال دے کہ اس کے نتیجہ میں تو (اور تیرا

فَتَشْقَىٰٓ ﴿١١٨﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٩﴾

ہر ساتھی) مصیبت میں پڑ جائے۔ یقیناً اس (جنت) میں تیرے لئے یہ (مقدر) ہے کہ تو بھوکا نہ رہے (اور نہ تیرا ساتھی)

وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١٢٠﴾ فَوَسْوَسَ

اور تو ننگا نہ رہے۔ اور نہ تو پیاسا رہے۔ اور نہ دھوپ میں جلے۔ اس پر شیطان نے اس

إِلَيْهِ الشَّيْطَـٰنُ قَالَ يَـٰٓـَٔادَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ

کے دل میں وسوسہ ڈالا (اور) کہا۔ اے آدم! کیا میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ دوں

۵۶۱ تفسیر: بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ سجدہ کا حکم تو ملائکہ کو دیا گیا تھا۔ اگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو اس کا قصور کیا ہُوا؟ اس سوال کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بالکل حل کر دیتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ جبریل کو کہتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تُو بھی اس سے محبت کر۔ چنانچہ وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ پھر جبریل آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس پر تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ

يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ اُس بندے کے لئے زمین میں بھی قبولیت پھیلا دی جاتی ہے (بخاری جلد ۲ کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین سے محبت کرنے کا حکم فرشتوں کو دیتا ہے اور پھر وہ اس حکم کو دنیا میں جاری کر دیتا ہے۔ پس معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم فرشتوں سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ اہل زمین بھی اس میں شامل ہوتے ہیں اس حکم کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سوائے ابلیس کے اور سب نے میرے حکم کی اطاعت کی اور وہ آدم کی تائید میں مشغول ہو گئے۔

اس تشریح سے قرآن کریم کی وہ آیت بھی حل ہو جاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ابلیس سے

شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۱﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا

جو سدا بہار ہے۔ اور ایسی بادشاہی (کا پتہ دوں) جو کبھی فنا نہ ہوگی۔ پس ان دونوں نے (یعنی آدم اور اس کے

فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ

ساتھیوں نے) اُس درخت میں سے کچھ کھایا (یعنی اس کا مزہ چکھا) جس پر ان دونوں کی کمزوریاں اُن پر کھل گئیں اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کی زینت

عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؗ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ

کے سامان (یعنی اعمال نیک) لپیٹنے لگ گئے۔ اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ پس وہ صحیح راستہ

فَغَوٰى ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۳﴾

سے بھٹک گیا۔ اس کے بعد اس کے رب نے اُس کو چُن لیا اور اُس پر رحم کی نظر ڈالی اور اسے صحیح طریق کار بتا دیا ۶۲

فرماتا ہے کہ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (اعراف ع ۲) کہ باوجود اس کے کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ تو آدم کی فرمانبرداری کر۔ پھر تجھے میرے اس حکم کی اطاعت سے کس چیز نے روکا؟ اس جگہ بھی امر لمہ ملکی کا ہی نام رکھا گیا ہے ورنہ یہ مراد نہیں کہ ابلیس کو کوئی علیحدہ حکم دیا گیا تھا۔

۶۲ تفسیر:۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے۔ کہ ہم نے آدم کو جنت میں رکھا تو شیطان اُن کا مدِّ مقابل بن کر کھڑا ہوگیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ اے آدم! یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا بھی دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال دے اور تم تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ۔ تیرے لئے خدا تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے کہ تو اس جنت میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے اور نہ گرمی کی تکلیف تجھے ستائے۔ اگر تُو نے اسکی بات مانی تو یہ جنتی گھر جو مومن کے لئے مقرر ہے اُس میں سے

وہ تجھے نکال دیگا۔ یعنی اس کی بات ماننے سے تُو جنت سے محروم رہ جائیگا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اُس وقت اس جنت میں تھے جس کا موت کے بعد مومنوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات اس امر کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ کیونکہ شیطان بھی آدم سے جنت کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر وہ اُس وقت جنت میں تھے تو اس وعدہ سے دھوکا کیونکر کھا سکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ شیطان کے قول سے انہوں نے یہی دھوکا کھایا کہ یہ ہمارے مقصد میں ممد ہے۔ پس اس جگہ جنت سے اُخروی جنت مراد نہیں بلکہ دنیوی جنت مراد ہے۔ اور یہ جو بعض دوسرے مقامات پر آتا ہے کہ انہیں جنت میں رکھا گیا تو درحقیقت اس سے مُراد بھی دنیوی جنت ہے جو اُخروی جنت کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور جس کے ملے بغیر انسان کو اُخروی جنت بھی نہیں مل سکتی۔

بہرحال جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا۔ کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تو شیطان نے اپنا بھیس بدل

اور اُس نے آدم کے پاس آ کر کہا - کہ کیا میں آپ کو ایک ایسے درخت کا پتہ دوں جس کا پھل کھانے سے آپ کو دائمی حیات مل سکتی ہے اور ایسی حکومت کا آپ کو پتہ دوں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی - جب اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں اُس نے کیں تو آدم کو دھوکا لگ گیا - اور انہوں نے اور اُن کی جماعت نے یا آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت کا پھل کھا لیا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا تھا یعنی انہوں نے وہ کام کر لیا جس سے انہیں روکا گیا تھا - اور چونکہ آدم کا یہ فعل خدائی منشار کے خلاف تھا - اِس لئے یکدم اس فعل کے بُرے نتائج ظاہر ہونے شروع ہوگئے اور آدم کی آنکھیں کھل گئیں کہ اُس نے خدائی منشار کی خلاف ورزی کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے - چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا درخت کا پھل کھانے سے اُن کا ننگ ظاہر ہونا شروع ہوگیا اور اس فعل کے بُرے نتائج اُن پر روشن ہوگئے - اور انہوں نے سمجھا کہ ہم ایک عیب کے مرتکب ہوئے ہیں - جب آدم کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ انہوں نے اس غلطی کے ازالہ کے لئے جنّت کے پتّوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا - اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا ہوا - مگر پھر خدا نے اُسے بزرگی دی - اور جب اس نے ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا تو خدا تعالےٰ نے اُسے وہ راستہ دکھا دیا جو اُسے اور اس کی جماعت کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والا تھا - عربی زبان میں ورق کے معنے زینت کے بھی ہوتے ہیں - اور ورق کے معنے نسل کے بھی ہوتے ہیں - چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْوَرَقُ جَمَالُ الدُّنْیَا وَ بَهْجَتُهَا یعنی دنیا کی خوبصورتی اور اُس کی رونق کو ورق کہتے ہیں - اِسی طرح عربی زبان کا محاورہ ہے - اَنْتَ طَیِّبُ الْوَرَقِ - اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تُو طیب النسل ہے اِن دونوں محاوروں کے لحاظ سے طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ کے یہ معنے ہوئے کہ آدم نے جنّت کی زینت اور اس کے جمال سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا - اور یہ ظاہر ہے کہ جنت کا جمال اُس کے مومن اور پاکباز ساکن ہوتے ہیں - اِسی طرح دوسرے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہوا - کہ آدم نے ایک پاکیزہ نسل کے ذریعہ شیطانی فریب کا ازالہ کرنا شروع کر دیا اور وہ کامیاب ہوگیا -

بائبل نے اس واقعہ کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے :-

" سانپ کُل دشتی جانوروں میں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اُس نے عورت سے کہا - کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا - عورت نے سانپ سے کہا - کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں - پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اُسے کھانا اور نہ چھونا - ورنہ مر جاؤ گے - تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اُسے

کھاؤ گے ۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم
خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے
بن جاؤ گے ۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ
درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو
خوشنما معلوم ہوتا ہے ۔ اور عقل بخشنے کے
لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا
اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا ۔ اور اس نے
کھایا ۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں ۔ اور
انکو معلوم ہؤا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے
انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں
بنائیں ۔"

(پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

اسجگہ بائیبل نے وَرَقُ الْجَنَّةِ کی بجائے
انجیر کے پتوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے
انجیر کے پتے سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں ۔ اب ہم
دیکھتے ہیں کہ کیا انجیر اور ورق الجنۃ دو مختلف چیزیں
ہیں یا ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں ۔ اس غرض
کے لئے ہم علم تعبیر الرؤیا کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تعطیر الانام
میں یہ لکھا ہؤا نظر آتا ہے ۔ کہ اَلتِّيْنُ فِي الْمَنَامِ
يُفَسَّرُ بِالصُّلَحَاءِ وَ اَخْيَارِ النَّاسِ یعنی جب کوئی
شخص رؤیا یا کشف کی حالت میں انجیر دیکھے ۔ تو
اس کے معنے صالح اور نیک لوگوں کے ہوتے ہیں
اور یہی وَرَقُ الْجَنَّةِ کے معنے ہیں کیونکہ ورق پاکیزہ
نسل کو کہتے ہیں اور وَرَقُ الْجَنَّةِ کے معنے تھے
جنت کی پاکیزہ نسل ۔ پس قرآن اور بائیبل میں
اس بارہ میں کوئی اختلاف نہ رہا ۔ دونوں اس امر
پر متفق ہیں کہ شیطان جب آدم کو دھوکا دے
چکا تو آدم نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے
مومنوں کی جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر شیطانی تدبیر
کو ناکام کر دیا ۔ شیطان نے چاہا تھا کہ اس ذریعہ سے
وہ آدم کو شکست دے دے مگر بجائے اس کے کہ
آدم کا یہ فعل اُن کے لئے کسی مستقل نقصان یا خرابی
کا باعث بنتا اُن کے اندر ایک نئی بیداری پیدا
ہو گئی اور انہوں نے مومنوں کی پاکیزہ جماعت کو
اپنے ساتھ ملا کر شیطان کے پھیلائے ہوئے فتنہ کو
کچل کر رکھ دیا ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ
اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ۔ اس کے
بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو چن لیا اور اُس پر رحم
کی نظر ڈالی اور اُسے صحیح طریقۂ کار بتا دیا ۔ اور
اس نے شیطان کی تمام تدابیر کو خاک میں ملا دیا ۔

لوگوں نے غلطی سے قرآن کریم کی آیت اِنَّ
لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۔ وَ اَنَّكَ لَا
تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى کے یہ معنے لئے ہیں کہ
آدم ایسے مقام پر رکھا گیا تھا جہاں نہ اُسے بھوک
ہی لگتی تھی نہ پیاس ۔ حالانکہ اگر انہیں بھوک ہی نہیں
لگتی تھی تو وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا
(بقرۃ ع ۴) کے کیا معنے ہوئے ؛ جب خدا نے اُن کی
بھوک ہی اُڑا دی تھی تو اس کے بعد یہ کہنا اب خوب کھاؤ
پیؤ عقل کے بالکل خلاف ہے ۔ پس كُلَا کے لفظ
نے بتا دیا کہ انہیں بھوک اور پیاس لگتی تھی ۔ مگر پھر
سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کے کیا معنے ہوئے ؛
سو یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلا دَورِ انسانی جو آدم کے
ذریعہ قائم ہؤا وہ صرف تمدنی ترقی تک محدود تھا
اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی معلومہ دُنیا میں حضرت
آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے ایک تمدنی حکومت قائم
کی اور اس حکومت کی غرض یہ بتائی کہ (۱) ایک
دوسرے کی کھانے کے معاملہ میں مدد کی جائے گی ۔
(۲) ایک دوسرے کی پینے کے معاملہ میں مدد کی جائیگی ۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ

(اور خدا تعالیٰ نے) کہا تم دونوں (گروہ) اس میں سے سارے کے سارے نکل جاؤ۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ

پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے — تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا

فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ

وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا اور نہ کبھی ہلاکت میں پڑیگا ۶۳ اور جو شخص میرے یاد دلانے کے باوجود اعراض سے کام لیگا

هَبَطَ

(۳) ایک دوسرے کی عُریانی کو دُور کرنے کے معاملہ میں مدد کی جائیگی (۴) ایک دوسرے کی رہائش کے معاملہ میں مدد کی جائے گی۔ گویا کھانا۔ پانی۔ کپڑا اور مکان یہ چار چیزیں انہیں اس تعاونی حکومت میں حاصل ہونگی۔ پس اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰى میں اللہ تعالیٰ نے دَورِ تمدّن کے حکومتی نظام کا ڈھانچہ بیان کر دیا اور بتایا کہ اے آدم! اگر لوگ اعتراض کریں۔ تو تُو انہیں کہدے کہ اس حکومت کا پہلا فائدہ یہ ہو گا۔ کہ تم بھوکے نہیں رہوگے۔ گویا تمہاری خوراک کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم ننگے نہیں پھروگے کیونکہ تمہارے کپڑوں کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ تیسرا فائدہ یہ ہو گا کہ تم پیاسے نہیں رہو گے کیونکہ تمہیں پانی مہیّا کرنے کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی اور چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ تم بے گھر بھی نہیں رہو گے کیونکہ تمہارے لئے مکانات مہیّا کرنے کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ غرض اس آیت میں اُس نئے نظام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ اور لوگوں کو بتایا گیا کہ اگر اس نئے نظام کے ماتحت تم رہوگے تو تمہیں یہ یہ سہولتیں حاصل ہونگی۔

۶۳ حل لغات:۔ هَبَطَ الْوَادِی کے معنے ہوتے ہیں نَزَلَهٗ۔ اس وادی میں اُترا۔ اور هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰى مَوْضِعٍ اٰخَرَ کے معنے ہوتے ہیں اِنْتَقَلَ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (کلیات ابوالبقاء) پس اِهْبِطَا کے معنے ہونگے۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے کہا۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے۔ اس جگہ دونوں سے آدم اور حوّا مراد نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ آدم اور حوّا آپس میں دشمن رہیں گے۔ اور یہ بات بالبداہت باطل ہے دونوں سے مراد درحقیقت دو گروہ ہیں۔ یعنی ایک وہ گروہ جو آدم کے ساتھ تعلق رکھنے والا تھا اور ایک وہ گروہ جو شیطان کے ساتھ تعلق رکھنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم اور شیطان سے تعلق رکھنے والے گروہو: تم دونو اس جگہ سے چلے جاؤ۔ اب تم دونوں گروہ آپس میں ہمیشہ دشمن رہوگے۔ چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ

فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اُسے تکلیف والی زندگی ملے گی - اور قیامت کے دن ہم اُسے

اَعْمٰى ﴿۱۲۵﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ

اندھا اُٹھائیں گے ۔ (جسپر) وہ کہیگا ۔ اے میرے رب ! تُونے مجھے کیوں اندھا اُٹھایا ؟ حالانکہ

كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۶﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا

مَیں تو خوب دیکھ سکتا تھا - (اسپر خدا تعالیٰ) فرمائیگا - تیرے پاس بھی تو ہماری آیات آئی تھیں -

فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۷﴾ وَكَذٰلِكَ

جن کو تُونے بھلا دیا تھا سو آج تجھ کو بھی (خدا کی رحمت کی تقسیم کے وقت) ترک کر دیا جائیگا - اور جو خدائی قانون

نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ

سے باہر چلا جاتا ہے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لاتا اسکے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے (اور یہ تو دنیوی سلوک ہے)

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۸﴾

آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت اور بہت مدت تک جانیوالا ہے ۔ ع۴۲ ۵

اِهْبِطَا کے ساتھ جَمِيْعًا کا لفظ بھی آتا ہے حالانکہ دو کیلئے عربی زبان میں جَمِيْعًا کبھی نہیں آتا - یہ جَمِيْعًا کا لفظ اسی لئے بڑھایا گیا ہے کہ آدم کے بھی کئی ساتھی تھے اور شیطان کے بھی کئی ساتھی تھے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سب اسجگہ سے چلے جاؤ - اسی طرح بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ میں بھی کُمْ کا لفظ جو تین یا تین سے زیادہ افراد کے لئے بولا جاتا ہے بتا رہا ہے کہ جن کو نکلنے کا حکم دیا گیا تھا وہ ایک جماعت تھی نہ کہ دو افراد ۔

ع۴۲ ۵ حل لغات :- اَلضَّنْكُ اَلضِّيْقُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ - یعنی ضنك تنگی کو کہتے ہیں (اقرب) پس مَعِيْشَةً ضَنْكًا کے معنے ہونگے - تنگ زندگی ۔

تفسیر :- اس آیت میں منکروں کیلئے پہلے تو ایک دنیوی سزا کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُن کو اس دنیا میں ایک تکلیف دہ زندگی ملے گی - اور پھر اُخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ اندھے اٹھائے جائیں گے یہاں تک کہ اُن میں سے ہر شخص چلا اٹھیگا کہ اے خدا ! مَیں تو اُس دنیا میں اچھا سوجھ بوجھ والا آدمی تھا - اس دنیا میں تُونے کیا کیا کہ مجھے اندھا اٹھایا - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندھا اٹھانا اگلے جہان کا عذاب ہے - اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے کہ دنیا میں تو بھی ہمارے نشانوں کے پاس اندھا ہو کر آتا تھا ۔

اور ان کو بھول جاتا تھا۔ اس لئے آج اس دنیا میں تجھ کو بھی بُھلا دیا گیا ہے۔ اور جو بھی اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے اور حد سے بڑھ جائے اس کو ہم ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ اور آخرت کا عذاب تو اس اندھے اٹھائے جانے کے عذاب سے بھی زیادہ ہوگا۔

اس آیت کے مفہوم میں ایک اُلجھن ہے جس کو اسجگہ دُور کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے حصہ میں تو یہ کہا گیا ہے کہ مجھے تو نے اندھا کرکے کیوں اُٹھایا جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ اُخروی زندگی کا ذکر ہے۔ اس دنیا کی زندگی کا ذکر نہیں۔ قرآن بھی کہتا ہے وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى۔ اور کافر بھی کہتا ہے کہ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اور کافر بھی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اخروی زندگی کے عذاب کا ذکر ہے۔ لیکن ان آیات کے معًابعد پھر یہ فرمانا کہ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی سخت ہوگا ایک بالکل بے جوڑ فقرہ معلوم ہوتا ہے اور انسان حیران ہوتا ہے کہ جب پہلے بھی عذاب آخرۃ کا ذکر آچکا ہے تو پھر دوبارہ عذاب آخرۃ کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اور یہ کونسا عذاب آخرت ہے جو پہلے عذاب آخرت سے بھی زیادہ سخت ہوگا؟ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ قرآن و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم آخرت ایک لمبا وقت ہے جس میں مختلف اوقات میں کفار کی مختلف حالتیں ہونگی۔ چنانچہ سورۃ انعام رکوع ۱۱ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَ مَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ یعنی آج تو تم ہمارے پاس اس طرح اکیلے اکیلے آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا اُسے تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ اور پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان شفعاء کو نہیں دیکھتے جن کے بارہ میں تم بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ تم میں خدا کے شریک ہیں بات یہ ہے کہ آج تمہارے آپس کے رشتے بالکل کٹ گئے ہیں اور جو کچھ تم کیا کرتے تھے وہ سب کچھ تم سے کھویا جا چکا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم آخرت میں ایک وقت ایسا بھی آئیگا کہ کافروں اور ان کے معبودوں کے درمیان تعلق منقطع ہو جائیگا اور وہ اپنے شرک کے دعویٰ کو بھول جائیں گے۔ یعنی دنیا میں تو ان کو اصرار تھا کہ جن بتوں کو ہم پوجتے ہیں وہ واقعہ میں خدا کے شریک ہیں اور ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں۔ یعنی اپنے مذہب کی سچائی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ایک وقت آئے گا کہ وہ سب دعوے اُن کو بھول جائیں گے اور وہ بُت جن کو وہ دنیا میں پوجتے تھے اُن کے دماغ سے اوجھل ہو جائینگے گویا وہ اُن کی خدائی سے منکر ہو جائیں گے۔ اس وقت وہ اپنی دنیوی حالت کا مقابلہ اخروی حالت سے کریں گے اور کہیں گے کہ اے خدا! یہ کیا ہوگیا کہ ہم دنیا میں تو اپنے بتوں کی خدائی دیکھ رہے تھے اور اسی لئے اُن پر ایمان لائے تھے لیکن اب وہ سب دلیلیں غائب ہوگئیں اور اب ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ گویا ہم دنیا کے مقابلہ میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں۔ یہ حالت بھی ایک عذاب کی ہوگی کیونکہ ان کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ دنیا میں جس چیز کو صحیح سمجھتے تھے

وہ غلط تھی۔ اس احساس کا پیدا ہو جانا خود ایک عذاب پیدا کرتا ہے۔ اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ مرنے کے بعد پہلا عذاب کافروں کو یہ ملے گا کہ انکو یقین ہو جائیگا کہ جن کو ہم خدا کا شریک قرار دیتے تھے وہ اس کے شریک نہیں اور وہ یقین کریں گے کہ شاید ہماری روحانی بصیرت ماری گئی ہے کہ معبودان الٰہی اب ہمیں معبودانِ الٰہی نظر نہیں آتے۔ فرماتا ہے۔ ضمیر کا یہ عذاب بھی بڑا عذاب ہے اور خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ دنیا کے عقیدہ کے بطلان کو صحیح سمجھیں گے اور دنیا کے عقیدہ کو غلط سمجھیں گے اور حیران ہوں گے کہ ہم ایسی بات کو کس طرح صحیح سمجھتے رہے۔ جب یہ بات اتنی واضح تھی تو کیا اب ہم اندھے ہو گئے ہیں کہ ہم کو اپنے معبودوں کی سچائی تک نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ عذاب تو کچھ بھی نہیں اصل عذاب تو وہ ہے جو بعد میں آنے والا ہے یعنی جہنم کا عذاب۔ یہ ضمیر کا عذاب بھی بے شک گھبراہٹ پیدا کرتا ہے اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا تم اب اندھے ہو گئے ہو۔ اور پہلے سوجاکھے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تم پہلے اندھے تھے اور اب بینا ہو۔ اور جب اس حقیقت کے مطابق تم پر عذاب آئیگا تب تم کو معلوم ہوگا کہ تم اندھے دنیا میں تھے کہ غلط چیز کو صحیح سمجھتے تھے لیکن بینا اب ہو کہ غلط کو غلط سمجھنے لگ گئے ہو اور صحیح کو صحیح۔ پس درحقیقت اس آیت میں ایک طنزیہ کلام کیا گیا ہے۔ جس سے کفار کے عقیدہ پر طنز کی گئی ہے کہ وہ بے وقوف شرک کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بینا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آخرت میں اس شرک کے منکر ہو جائینگے اور حیران ہونگے کہ کیا اب ہم اندھے ہیں یا پہلے اندھے تھے۔ یہ کیا حماقت ہے کہ جب ہم اندھے تھے تو اپنے آپ کو بینا سمجھتے تھے۔

اس آیت کے متعلق ایک اور سوال بھی قابلِ حل ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا جو شخص میرے ذکر سے اعراض کریگا اُسے ایک تنگ زندگی میں سے گذرنا پڑیگا۔ مگر ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ غیر مذاہب والوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہیں بلکہ اُن میں سے اکثریت ایسی ہے جن کی مالی حالت مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہے اور ہر قسم کے عیش اور آرام کے سامان انہیں میسر ہیں۔ اس سوال کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ معیشت کے معنے اس چیز کے ہوتے ہیں جس سے انسانی زندگی قائم رہے اور انسانی زندگی کے قیام کے لئے صرف کھانا پینا یا مال و دولت کا میسر آجانا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اور بھی ہزاروں چیزیں ہیں جو انسان کی مذہبی۔ تمدنی اور روحانی زندگی کو سنوارنے والی ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو الٰہی تعلیم سے اعراض کرنے والوں کو میسر نہیں آتیں۔ اور اِس لحاظ سے اُن کی معیشت اُن پر شدید طور پر تنگ ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وسعتِ عمل خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانے اور ان کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص صفاتِ الٰہیہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اس کا دائرۂ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ دائرۂ عمل ہمیشہ اعلیٰ مطمحِ نظر سے وسیع ہوتا ہے اور جب کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر سامنے نہ ہو تو اعمال بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے مقابلہ میں فلاسفروں کے اخلاق بالکل ہیچ ہوتے ہیں۔ اور پھر ان کے اندر جو تھوڑے بہت اخلاق پائے بھی جاتے ہیں

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ

کیا ان لوگوں کو (اس بات سے) ہدایت حاصل نہ ہوئی کہ اُن سے پہلی گذری ہوئی قوموں میں سے بہتوں کو

الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

ہم نے ہلاک کردیا ۔ یہ (لوگ) اُن کے گھروں میں چلتے پھرتے ہیں ۔ اِس میں عقل والے

اُن کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے ۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھا جائے ۔ تو ہمیں آپ کے اندر تمام اخلاق دکھائی دیں گے ۔ آپ میں سچائی بھی شاندار طور پر نظر آئے گی ۔ آپ میں امانت بھی شاندار طور پر نظر آئے گی ۔ آپ میں سخاوت بھی شاندار طور پر نظر آئے گی ۔ آپ میں رحم بھی شاندار طور پر نظر آئے گا ۔ آپ میں غریبوں کی پرورش کا مادہ بھی شاندار طور پر نظر آئیگا ۔ آپ میں انصاف بھی شاندار طور پر نظر آئیگا ۔ آپ میں توکل بھی شاندار طور پر نظر آئیگا ۔ اِسی طرح تحمّل ۔ بردباری ۔ دوسروں کے جذبات کا احترام ۔ عورتوں سے حسن سلوک ۔ بنی نوع انسان کی خدمت ۔ متبسم چشم پوشی ۔ تعاون باہمی ۔ بہادری ۔ وفائے عہد اور اسی قسم کے سینکڑوں اخلاق آپ کے اندر شاندار طور پر دکھائی دیں گے ۔ لیکن کوئی فلاسفر ایسا نہیں نکل سکتا جو تمام اخلاقِ فاضلہ کا جامع ہو بلکہ کسی میں کوئی ایک خوبی ہوگی اور کسی میں دو ۔ اور پھر اُن کا دائرہ بھی محدود ہوگا ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب تک کوئی اعلیٰ مطمح نظر نہ ہو اور جب تک کوئی ایسا کامل نمونہ سامنے نہ ہو جس کی نقل کی جاسکے اُس وقت تک انسان ایک محدود دائرہ میں ہی چکر کھاتے رہتے ہیں ۔ اور اُن میں وسعت پیدا نہیں ہوسکتی ۔ اور چونکہ کلام الٰہی کا منکر خدا تعالیٰ سے اعراض کرنے کی وجہ سے صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا نہیں کرتا ۔ اس لئے

قیامت کے دن بھی جب خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہوگا ۔ تو وہ اُن کو پہچان نہیں سکیگا اور اندھوں کی طرح کھڑا رہیگا ۔ جس طرح وہ شخص جس نے کبھی خربوزہ نہیں دیکھا ۔ خربوزے کو دیکھ کر بھی اُسے پہچان نہیں سکتا ۔ اِسی طرح وہ شخص جس نے صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا نہیں کیا وہ صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کو بھی پہچان نہیں سکیگا ۔ اور نابینا ہونے کی حالت میں اٹھیگا ۔ اسپر وہ گھبرا کر کہے گا کہ میں تو بڑا بصیر تھا مجھے آج اندھا کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۔ دنیا میں ہم نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بیسیوں نشانات و معجزات ظاہر کئے تھے مگر تم نے اُن کی طرف کبھی توجہ نہ کی ۔ اگر تم بینا ہوتے تو ہماری آیات کا انکار کیوں کرتے ۔ پس چونکہ تم پہلے بھی اندھے تھے اس لئے آج بھی اندھے ہی اُٹھے ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اخروی نابینائی درحقیقت روحانی ہی ہوگی ۔ کیونکہ فرماتا ہے جس طرح اب تم روحانی امور کو نہیں دیکھ سکتے اِسی طرح تم دنیا میں رُوحانی امور کو نہ دیکھ سکے تھے ۔ اگر روحانی نابینائی مراد نہ ہوتی تو كَذٰلِكَ کا لفظ استعمال نہ ہوتا ۔ دوسری دفعہ كَذٰلِكَ اسلئے استعمال کیا کہ پہلے جہان میں بھی تیرے عمل کی وجہ سے ہم نے تجھے چھوڑ دیا تھا اور اب بھی چھوڑ دیا ہے ۔ تجھے ہم نے بینا کبھی قرار نہیں دیا ۔

لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۹﴾ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ

لوگوں کے لئے بڑے نشان ہیں ۵۶۵ اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ گذر چکی ہوتی اور

مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۳۰﴾

مدت بھی مقرر نہ ہوتی تو عذاب (ان قوموں کیلئے) دائمی بن جاتا (اور ایک لمبے عرصہ تک جاری رہتا -) ۵۶۶

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس پر صبر کر (کیونکہ تیرے رب کی سنت یہی ہے کہ رحم سے کام لیا جائے) اور سورج کے چڑھنے

قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ

اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اسکی حمد کے ساتھ اسکی تسبیح بھی کیا کر۔ اور رات کے مختلف حصوں

اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ

اور (اسی طرح) دن کے سب حصوں میں بھی اس کی تسبیح کیا کر۔ تاکہ (اس کے فضل کو حاصل کرکے)

تَرْضٰى ﴿۱۳۱﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ

تو خوش ہو جائے ۵۶۷ اور ہم نے جو کچھ اُن میں سے بعض لوگوں کو دنیوی زندگی کے زیبائش کے سامان دے رکھے ہیں

۵۶۵ تفسیر: — فرماتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن گذری ہوئی قوموں کی وادیوں اور علاقوں میں یہ لوگ رہتے ہیں وہ بھی شرک میں مبتلا تھیں۔ لیکن آخر تباہ ہوگئیں۔ پھر یہ کیوں اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

۵۶۶ تفسیر: — لَوْ لَا كَلِمَةٌ سے مراد اس جگہ یہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ع ۱۹) والا قانون ہے۔ یعنی ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہمارا رحم ہماری گرفت پر غالب رہتا ہے۔ اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہوتا اور گناہوں کی وجہ سے فوراً عذاب آجایا کرتا۔ تو جس ملک پر عذاب آتا وہ اس کے لئے دائمی بن جاتا اور ایک لمبے عرصہ تک جاری رہتا۔ اس عذاب سے نجات پانے کی کوئی راہ انہیں نظر نہ آتی۔

۵۶۷ تفسیر: — مفسرین کا قول ہے کہ اسجگہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا سے صبح اور عصر اور اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مغرب اور عشا اور اَطْرَافَ النَّهَارِ سے ظہر اور ضحٰی یعنی چاشت کی نمازیں مراد ہیں۔ کیونکہ وہ بھی نصف کے کناروں پر ہوتی ہیں ایک زوال سے پہلے اور ایک زوال کے بعد یا خالی ظہر کہ وہ دونوں نصف کے کناروں پر واقع ہے۔

اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ

تو اس کی طرف اپنی دونوں آنکھوں کی نظر کو پھیلا پھیلا کر مت دیکھ کیونکہ یہ سامان انکو اس لئے دیا گیا ہے) کہ ہم

فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۱۳۲) وَاْمُرْ

اس کے ذریعہ سے انکی آزمائش کریں۔ اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے والا ہے ۵۶۸ اور تو اپنے

اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْــَٔـلُكَ

اہل کو نماز کی تاکید کرتا رہ۔ اور تو خود بھی اس حکم (یعنی نماز) پر قائم رہ۔ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے

رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۱۳۳)

بلکہ ہم تجھے رزق دے رہے ہیں۔ اور انجام تقوٰی ہی کا بہتر ہوتا ہے۔ ۵۶۹

زَهْرَةً

۵۶۸ حل لغات:- زَهْرَةَ الدُّنْيَا کے معنے ہوتے ہیں بَهْجَتُهَا وَ غَضَارَتُهَا وَحُسْنُهَا۔ دنیا کی خوبصورتی اور حسن (اقرب)

لِنَفْتِنَهُمْ

لِنَفْتِنَهُمْ۔ نَفْتِنَ فَتَنَ سے بنا ہے اور فَتَنَهٗ کے معنے ہیں خَبَرَهٗ۔ اس کی آزمائش کی۔ نیز اس کے معنے ہیں اَضَلَّهٗ۔ اس کو گمراہ کیا۔ اسی طرح جب یہ کہیں کہ فَتَنَ الصَّائِغُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ تو معنے ہوتے ہیں اَذَابَهٗ بِالْبُوْتَقَةِ وَاَحْرَقَهٗ بِالنَّارِ لِيُبَيِّنَ الْجَيِّدَ مِنَ الرَّدِيِّ وَيُعْلَمَ اَنَّهٗ خَالِصٌ اَوْ مَشُوْبٌ (اقرب) یعنی جب سنار کیلئے فَتَنَ کا لفظ استعمال ہو تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے سونے کو آگ میں ڈال کر اسپر آگ تپائی تاکہ سونا پگھل جائے اور خالص سونا علیحدہ ہو جائے اور کھوٹ علیحدہ ہو جائے پس لِنَفْتِنَهُمْ کے معنے ہونگے (۱) ہم معلوم کریں (۲) ہم اچھے اور بُرے کی تمیز کر دیں۔

تفسیر:- انسان بعض دفعہ دوسرے کی دولت دیکھکر لالچ میں آجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ دولت اسکو مل جائے۔ لیکن اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ جب یورپین قومیں ترقی کریں اور بہت دولت سمیٹ لیں تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اُن کی دولت دیکھ دیکھ کر لالچ میں نہ آئیں کیونکہ یہی دولت آخر اُن کی تباہی کا موجب ہو گی جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہو رہا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی دولت کو دیکھ کر روس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُس نے بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد کرلئے تاکہ اُن کی مدد سے مغربی ممالک کی دولت چھین لے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتا ہے کہ تم اپنی دولت خدا کے ہاں جمع کرو۔ کیونکہ جو دولت خدا کے ہاں جمع ہوتی ہے اُسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور وہ بہتر بھی ہوتی ہے اور ہمیشہ قائم بھی رہتی ہے۔

۵۶۹ تفسیر:- فرماتا ہے کہ یہ قانونِ قدرت ہے کہ بچے ماں باپ کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس لئے عیسائیوں کی ترقی کے زمانہ میں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کو نماز کی تاکید کرتا رہے اور خود بھی نمازوں کا پابند رہے تاکہ اس کی اولاد بھی اسی رنگ میں رنگین ہو کیونکہ جو شخص عبادت پر قائم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو ضرور

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ

اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں وہ ہمارے پاس اپنے ربّ کی طرف سے کوئی نشان نہیں لاتا۔ کیا اُن کے پاس وہ

بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۴﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ

نشان نہیں آیا جیسا کہ پہلی کتابوں میں بیان ہو چکا ہے ۱۷۵؎ اور اگر ہم ان کو اس (رسول) سے پہلے کسی

بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ

عذاب کے ذریعہ سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے۔ اے ہمارے ربّ! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا

اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۵﴾

(اگر تو ایسا کرتا) تو ہم تیرے نشانوں کے پیچھے چل پڑتے قبل اس کے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہو جاتے ۱۷۶؎

حلال رزق دیتا ہے اور اُس سے رزق مانگتا نہیں۔ بظاہر یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام انبیاء دین کی خدمت کیلئے چندے مانگتے چلے آئے ہیں۔ اور اسلام نے بھی زکوٰۃ اور صدقات پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ یا صدقہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں اُن کا مال کم نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ بڑھتا ہے۔ اور اس کا فائدہ خود لوگوں کو ہی پہنچتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (روم ع۴) یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ وہی اپنے مالوں کو بڑھانے والے ہوتے ہیں۔ پس چندہ لینا یا صدقہ و زکوٰۃ وغیرہ اس آیت کے خلاف نہیں۔

۱۷۵؎ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ نشان جادوگری کا نام نہیں بلکہ پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں بھی نشان ہوتی ہیں اور محمد رسول اللہ کے حق میں پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ پھر یہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ اگر محمد رسول اللہ نہ آتے تو ان کا اعتراض ہوتا کہ ہماری طرف تو کوئی نبی آیا ہی نہیں ورنہ ہم مان لیتے۔ لیکن نبی آگیا ہے اس لئے اب سزا کا انتظار کرنے کے سوا اُن کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ آخر میں حق کھل جائیگا۔ مگر اسوقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

۱۷۶؎ تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کرتا ہے کہ اگر رسول کی بعثت سے پہلے ہم ان پر عذاب نازل کر دیتے تو یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے کہ جب ہم گمراہ تھے اور ہدایت کے محتاج تھے تو تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے ہی تیرے احکام کو قبول کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس اعتراض کو ردّ نہیں کرتا۔ بلکہ اسے تسلیم کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے انبیاء و رسل کی بعثت کا انتظام نہ ہوتا تو بندوں کا حق تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرتے کہ جب اُس نے اُن کے پاس کوئی ہادی ہی نہیں بھیجے

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ

تو کہدے ہر ایک شخص اپنے انجام کی انتظار میں ہے پس تم بھی اپنے انجام کی انتظار کرتے رہو۔ اور تم جلدی ہی معلوم کر لوگے

اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۶﴾ ع ۸ ۱۷

کہ کون شخص سیدھے راستہ پر چلنے والوں اور ہدایت پانے والوں میں سے ہے (اور کون نہیں) ۵۷۲

تو وہ ان سے جواب طلبی کیوں کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ کہ دنیا میں خواہ کتنی گمراہی پھیل جائے اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے کسی مامور کو مبعوث نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان آیات میں اسی بات کی تردید کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اگر ہم دنیا میں اپنے مامور نہ بھیجیں تو لوگ بجا طور پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب اس نے ہدایت کا کوئی سامان ہی نہیں کیا تو وہ انہیں عذاب کیوں دیتا ہے۔ گویا مسلمان اپنے عمل سے اس اعتراض کو تقویت دے رہے ہیں جس اعتراض کو مٹانے کے لئے اس کی طرف سے ہمیشہ مامورین آتے رہے ہیں۔

۵۷۲ تفسیر:۔ اس جگہ سیدھے راستہ کے لئے سَوِیّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے ایسے راستہ کے ہیں جو افراط اور تفریط سے منزہ ہو (مفردات) اسی طرح سَوِیّ کا لفظ کامل اور مضبوط کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (لسان العرب) پس اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ تمہیں جلدی ہی پتہ لگ جائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم لوگوں کے لئے لائے ہیں وہ افراط اور تفریط سے منزہ ہے۔ اور ایسی کامل درجہ کی تعلیم ہے کہ خواہ زمانہ کے حالات کتنے بھی بدلیں وہ کبھی منسوخ قرار نہیں دی جا سکتی۔ یعنی دائمی اور غیر متبدل قانون ہے۔ اور تمہیں پتہ لگ جائیگا کہ کون شخص ہدایت پانے والوں میں سے ہے اور کون نہیں۔ یعنی جس شخص کو ایسی شریعت ملے جو کبھی منسوخ نہ ہو سکتی ہو اور نہ زمانہ کے حالات سے کبھی بدل سکتی ہو۔ وہی شخص اور اس کے متبعین کامل ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں اور جو لوگ اس سے الگ ہوتے ہیں وہ کبھی بھی ہدایت یافتہ نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ جس شخص کو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر ہمیشہ اپنا ایمان اور عمل بدلنا پڑتا ہے اس کے متعلق یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وہی ہدایت ہوتی ہے جو قابل عمل ہو سوائے اس کے کہ وہ خود اس کو کسی زمانہ میں ایک نئے الہام کے ذریعہ سے بدل دے بہرحال انسان اسکو نہیں بدل سکتا کیونکہ کوئی انسان خدا کی تعلیم کا قائم مقام نہیں بن سکتا۔

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ انبیاء - یہ سورۃ مکی ہے [1]

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَةٌ وَّثَلَاثَ عَشَرَةَ اٰيَةً وَّسَبْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ایک سو تیرہ (۱۱۳) آیات ہیں - اور سات رکوع ہیں -

[1] یہ سورۃ بلا خلاف مکی ہے - صرف امام سیوطیؒ نے ساتویں آیت کو مدنی قرار دیا ہے (اتقان) - دہیری کے نزدیک یہ سورۃ نویں سال نبوت کی معلوم ہوتی ہے - کیونکہ اس میں کفار کی مخالفتوں کا ذکر ہے - یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ چونکہ سورۂ رحمٰن میں بحیرہ قلزم اور بحیرہ احمر کے ملائے جانے کا ذکر ہے - اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کا ذکر ہے اور یہ امور انیسویں صدی کے آخر میں ہوئے ہیں - اس لئے یہ سورۃ انیسویں صدی کے آخر میں نازل ہوئی ہے - انسان جب تعصب اور بد دیانتی پر اُتر آتا ہے تو وہ ایسی ایسی احمقانہ باتیں ہی کیا کرتا ہے - دہیری کیلئے کیسا آسان راہ موجود تھا کہ صحابہؓ جن کے زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی انہوں نے شہادت دی ہے کہ یہ سورۃ ۵ھ دعوئ نبوت سے پہلے نازل ہو چکی تھی - اور انہوں نے اسے حفظ کر لیا تھا - اس لئے یہ سورۃ ۵ھ سے پہلے کی نازل شدہ ہے مگر چونکہ ریورنڈ دہیری یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ قرآن کریم غیر الہامی کتاب ہے - اس لئے اُن کے لئے یہ امر ماننا مشکل تھا کہ بعض باتیں اِس میں وقت سے پہلے پیشگوئی کے طور پر بیان کی گئی تھیں -

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق کہ سورۂ کہف - مریم - طٰہٰ اور انبیاء ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ ہیں جن کو انہوں نے اپنے اسلام کے شروع زمانہ میں یاد کیا تھا (بخاری کتاب التفسیر) اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابتدائی مسلمانوں میں سے ہیں - یہ سورتیں بہرحال ابتدائی زمانہ کی ہیں اور چونکہ سورۂ مریم ہجرتِ حبشہ کے شروع میں نجاشی کے دربار میں پڑھی گئی تھی - اور ہجرت حبشہ ۵ھ کے شروع میں ہوئی تھی - اس لئے یہ سورتیں پہلے چار سال کے اندر کی ہیں - پس سورۂ انبیاء ۵ھ کے ابتداء سے پہلے نازل ہوئی تھی اور دہیری کا دعویٰ سراسر لغو اور بے دلیل ہے -

[1] سورۃ انبیاء مکی ہے -

ترتیب سورۃ یہ سورۃ سورۂ طٰہٰ کے بعد آتی ہے اور اس کا قریبی تعلق سورۂ طٰہٰ سے یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ کے آخر میں یہ مضمون تھا کہ کفار پر عذاب تو آئیگا مگر حجت تمام کرنے کے بعد - اس لئے صبر سے کام لو - اپنے وقت پر ضرور منکرینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عذاب آکر رہیگا - اس مضمون کے تسلسل میں سورۂ انبیاء کے شروع میں یہ فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا ہے لیکن وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور برابر انکار کئے جاتے ہیں - گویا عذاب کی خبر کے متعلق جو کچھ سورۂ طٰہٰ کے آخر میں کہا گیا تھا اُسے سورۂ انبیاء میں جاری رکھا گیا ہے - یہ تو اس کا قریبی تعلق ہے - پچھلی کئی سورتوں کے تسلسل کے لحاظ سے اس کا تعلق پچھلی سورتوں سے یہ ہے کہ سورۂ مریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا تھا کہ اُن کے متعلق مسیحیوں کو غلطی لگی ہے کہ (۱) انہیں

[2] سورۂ انبیاء کا پہلی سورۃ سے تعلق

خدائی صفات دے دی ہیں (۲) اُن کے ذریعہ سے شریعت کو منسوخ قرار دیا ہے اور شریعت کو لعنت قرار دیا ہے (۳) اور نجات کو توبہ اور عمل صالحہ کی جگہ کفارہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ یہ غلطیاں اُن کو حق سے دُور لے گئی ہیں۔ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرکے اِن دعووں کی نقلی تردید کی اور بتایا کہ مسیحی سلسلہ تو موسوی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر موسیٰ کے حالات اِن سب دعووں کی تردید کرتے ہیں۔ اُس کا سارا فخر تو شریعت لانے میں تھا۔ اگر شریعت ایک لعنت ہے تو موسیٰ کا وجود قابلِ نفرت ہونا چاہیئے نہ کہ قابلِ فخر۔ پھر حضرت آدمؑ کا ذکر کرکے گناہ کی تصویری کو اس کی جڑ تک پہنچا کر اس امر کی تردید کی گئی کہ گناہ ورثہ کے ذریعہ سے قائم ہوا ہے۔ اور پھر بتایا کہ بنی نوع انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سزائیں ملتی ہیں اگر گناہ سے بچنا ممکن ہے تو پھر سزا کیسی؟ پھر تو سزا آنی ہی نہیں چاہیئے نبی سزا کو پکا کرنے کی جگہ اس کے امکان کو گھٹانے کے لئے آتے ہیں۔ پس اگر شریعت لعنت ہے تو نبی سزا کے امکان کو گھٹاتا نہیں بڑھاتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اِسی مضمون کو لمبا کرکے بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک نہیں دو نہیں آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام دشمنانِ انبیاء کو سزا ملتی رہی ہے۔ اگر گناہ ورثہ میں ملا ہے۔ اگر اس سے بچنے کی انسان میں توفیق نہیں تو ایسا کیوں ہوا؟ پس مسیحؑ کے آنے سے پہلے بعض اشخاص کا برگزیدہ ہونا اور بعض کا سزا پانا بتاتا ہے کہ ورثہ کے گناہ کا عقیدہ محض ایک ڈھکوسلہ ہے۔

خلاصۂ مضامین عذاب آرہا ہے مگر یہ لوگ مختلف بہانوں سے اپنے نفس کو تسلّی دے رہے ہیں (آیت ۲)

کوئی بھی نیا پیغام لوگوں کو ہدایت دینے کیلئے نہیں آتا کہ یہ لوگ اس سے تمسخر نہ کرتے ہوں۔ یعنی سب انبیاء نے لوگوں کو ہدایت کے لئے بلایا ہے اگر گناہ ورثہ میں ملا ہے تو ہدایت کی طرف بُلانے کے معنے ہی کیا ہوئے؟

کفار بے سوچے سمجھے انبیا پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ تمہارے جیسا انسان ہے (حالانکہ ہادی کا اپنے مخاطبین جیسا انسان ہونا ہی ضروری ہے۔ یہ آیت بھی ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کو ردّ کرتی ہے۔) اس کی باتیں بڑی دلکش ہیں۔ تم بڑے عقلمند ہو تم اِس کے دھوکا میں کیوں آؤ گے؟ ہمارا نبی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ خدائے سمیع وعلیم خود جواب دیگا۔ (آیت ۳ تا ۵)

اِس کے بعد منکر ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیہودہ خوابیں اسے نظر آتی ہیں بلکہ یہ سرتا پا جھوٹ بناتا ہے اور اس جھوٹ کو شاعرانہ زبان میں پیش کرکے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔ اُسے چاہیئے کہ پہلوں کی طرح عذاب لائے۔ فرماتا ہے کہ سب نبی انسان ہی تھے۔ اس لئے اب بھی انسان ہی آیا چنانچہ پہلی کتب میں پڑھ کر دیکھ لو کہ پہلے رسول بھی انسان ہی تھے۔ ذرا پوچھ کر تو دیکھو۔ ہر ایک کھانا کھاتا تھا۔ اور آخر مرا (جن میں مسیحؑ بھی شامل تھا) اور پھر اُن کے منکروں کو ہم نے تباہ کر دیا۔ (آیت ۶ تا ۱۰)

اِن لوگوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ قرآن کریم اُن پر کیا بوجھ ڈالتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اُن کی عزت کے سامان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ (آیت ۱۱)

اور جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی سچائیوں کے منکر ہوتے ہیں عذاب ہی پاتے ہیں (آیت ۱۲ تا ۱۶)

کبھی یہ بھی ان لوگوں نے سوچا کہ خدا تعالیٰ جیسی

حکیم ہستی دنیا کو بلا غرض نہیں پیدا کرسکتی تھی یعنی صرف ایک کھلونے کے طور پر۔ لیکن کھلونا بھی تو کھیلنے والا اپنے پاس رکھتا ہے نہ کہ دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے۔ جیسا کہ یہ دنیا انسانوں کے سپرد کر دی گئی ہے۔ پس یاد رکھو کہ ہم حق کو باطل سے ٹکرا دیں گے اور باطل کو تباہ کر دیں گے (آیت ۱۷ تا ۱۹)

زمین و آسمان پر اللہ تعالیٰ کا قبضہ ہے۔ اور اس کے قریب جتنا کوئی ہو آتا ہی وہ متواضع اور عبادت کی طرف راغب ہوتا ہے (آیت ۲۰:۲۱)

جب ساری دنیا میں ایک ہی قانون ہے تو شرک کا مسئلہ یہ لوگ کہاں سے نکالتے ہیں۔ شرک سے تو اختلاف لازمی ہے اور تمام انبیاء شرک کے خلاف تعلیم دیتے آئے ہیں۔ پس دنیا بھر میں ایک قانون کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ جو شرکانہ باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اُن سے وہ پاک ہے (خدا تعالیٰ کی طرف شرک عیسائیت کی طرف سے اسی بنا پر منسوب کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہ معاف نہیں کرسکتا۔ اس کیلئے بیٹے کی قربانی کی ضرورت تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو مالک کامل ہے اور مالک کامل پر عفو کرنے کی وجہ سے کوئی الزام نہیں آتا)

پھر فرماتا ہے کہ مسیحی لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی معبود ہیں جیسے روح القدس اور مسیحؑ۔ یہ درست نہیں خدا ایک ہی ہے۔ اور یہ تعلیم میں ہی نہیں دیتا بلکہ مجھ سے پہلے جتنے رسول گذرے ہیں سب یہی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں کیا ابراہیمؑ اور کیا اسحاقؑ اور کیا موسیٰؑ۔ بائبل اس سے بھری پڑی ہے (آیت ۲۲ تا ۲۵)

پہلے زمانوں میں بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینے والے انسان ہی آتے رہے ہیں مسیح کی طرح خدا کا کوئی بیٹا نہیں آیا۔ پھر مسیحی کس طرح کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ایک انسان کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کیونکہ بیٹا ایسی ہستیوں کیلئے ضروری ہوتا ہے جنہوں نے مرجانا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر عیب سے پاک ہے اور موت اس کے قریب بھی نہیں آتی۔ اُس کو بیٹے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح بیٹے کی خواہش اُن ہستیوں میں ہوتی ہے جن کو مددگاروں کی ضرورت ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ وہ سب کام آپ ہی کرسکتا ہے۔ وہ تو شروع دن سے اپنے بندوں میں سے کچھ لوگوں کو چُن کر انہیں اپنی رسالت کے ساتھ عزت بخشا کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے مسیحؑ کو چُنا اور عزت بخشی۔ پس خدا تعالیٰ کے اس احسان کی بے قدری کرنا اور ایک بندے کو جس کو خدا نے عزت بخشی تھی اس کا بیٹا قرار دیکر اس کا ہمسر بنا دینا سخت ظلم ہے (آیت ۲۶ و ۲۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے جتنے نبی آئے ہیں وہ تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع قرار دیتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے ماتحت چلتے تھے۔ درحقیقت مسیحؑ بھی ایسا ہی تھا۔ صرف مسیحیوں نے مبالغہ کرکے اسکو دوسرے نبیوں کی صف سے باہر نکال دیا ہے۔ ورنہ وہ ایک برگزیدہ انسان تھا (آیت ۲۸ و ۲۹)

پھر فرماتا ہے۔ مشرک تو جہنم کا عذاب پاتا ہے تم اپنے بزرگوں کی طرف الٰہی صفات منسوب کرکے ان کو جہنمی کیوں بناتے ہو۔ (تعجب ہے کہ مسیحیوں نے اشارۃً نہیں بلکہ وضاحتاً اپنے عقیدہ کا یہ جزو بنا لیا ہے کہ مسیح صلیب سے اتارے جانے کے بعد تین دن جہنم میں رہا۔ لیکن قرآن فرماتا ہے کہ مسیح جہنمی نہیں تھا وہ خدا تعالیٰ کا برگزیدہ اور بخشا ہوا انسان تھا۔ ایسے برگزیدہ انسان کو تین دن چھوڑ تین سیکنڈ کیلئے بھی جہنمی قرار دینا ایک ظلم عظیم ہے) (آیت ۳۰)

خدائی طریق یہ ہے کہ جب دنیا روحانیت سے محروم

ہوجاتی ہے تو وہ آسمان سے رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اور الٰہی پانی سے دنیا میں از سرِنو نیکی قائم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد آسمانی سلسلہ میں بڑے بڑے روحانی آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے ذریعہ سے نیکی کو قائم رکھا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی امداد سے یہ کارخانہ چلتا ہے۔ اور رات اور دن دنیا پر آتے ہی رہتے ہیں کبھی وقت سورج کام کرتا ہے کبھی وقت چاند۔ یہی روحانی عالم کا حال ہے نہ ایک سال نیکی نہ ایک سال بدی۔ پس یہ سلسلہ نیکی بدی اور تاریکی اور روشنی کا دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ پیدائش عالم ناکام رہی ہے غلط ہے یہ سلسلہ تو طبعی ہے اور مادی دنیا بھی اسکے مطابق چل رہی ہے۔ پھر اس پر اعتراض کیسا اور اس کی وجہ سے کفارہ وغیرہ عقائد نکالنے کی ضرورت کیا ہے (یہ عقیدے اسی خیال کے ماتحت ہیں کہ گویا نبوت کا سلسلہ ناکام رہا ہے۔ حالانکہ خود مسیح کے بعد بھی دنیا کا وہی حال رہا ہے۔ نہ نیکی بڑھی ہے نہ بدی گھٹی ہے (آیت ۳۱ تا ۳۴)

تمام انبیاء فوت ہوئے۔ مسیحؑ بھی فوت ہوا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی فوت ہونگے مگر اس سے روحانی سلسلہ میں کوئی فرق نہیں آتا جیسطرح سورج کے ڈوبنے سے کوئی فرق نہیں آتا۔ ہر اک کا ایک کام ہوتا ہے وہ کرتا ہے اور چلا جاتا ہے اصل زنجیر سارے عالم میں صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے (آیت ۳۵ و ۳۶)

دشمن تجھ پر ہنسی کرتے ہیں کہ ایک انسان اتنا دعوےٰ کرتا ہے حالانکہ سوال کلام کے لانے والے کا نہیں سوال کلام کے بھیجنے والے کا ہے۔ اور وہ مرنے کے بعد بھی ان کو پکڑ سکتا ہے اور پکڑیگا (آیت ۳۷)

خدا تعالےٰ عذاب دینے میں ڈھیلا ہے اسلئے لوگ غرور میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ اسلام غالب ہوگا۔ (آیت ۳۸ تا ۴۵)

جو کچھ میں کہتا ہوں خدا تعالیٰ کی وحی سے کہتا ہوں۔ عذاب آکر رہیگا۔ اُس وقت یہ لوگ پچھتائینگے لیکن ہم عذاب دینے میں بھی ظلم نہیں کرینگے۔ ہر اک کے اعمال کے مطابق معاملہ کرینگے (آیت ۴۶ تا ۴۸)

اِس رسول سے پہلے موسیٰ آچکا ہے۔ اور اُس نے بھی لوگوں کو نجات کی دعوت دی (اگر نجات مل نہ سکتی تھی تو ایسا کیوں کیا؟) (آیت ۴۹ و ۵۰)

مگر یہ ذکر اس سے زیادہ مکمل ہے۔ اِس میں سب اعلیٰ تعلیمیں جمع ہیں (آیت ۵۱)

موسیٰؑ سے پہلے ابراہیمؑ آیا جس کی طرف مسیحؑ اپنے سلسلہ کو منسوب کرتا ہے۔ مگر ابراہیمؑ نے بھی شرک سے لوگوں کو روکا اور اس نے زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ کو قرار دیا۔ (نہ یہ کہ کلام یعنی مسیح سے دنیا پیدا ہوئی) اور مشرکوں کی غلطی اِس طرح ثابت کی کہ اصنام کو نقصان پہنچ سکتا ہے (اسی طرح مسیح کو پہنچا اور اُسے پھانسی دی گئی ہے) (آیت ۵۲ تا ۷۱)

ہم نے ابراہیمؑ کو چنا اور اُسے ایک ملک کا وارث کردیا اور لُوطؑ جیسے لوگ اس پر ایمان لائے اور اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا اُسے دیا اور یہ لوگ نیک تھے۔ (یعنی کفارہ کی ضرورت انہیں پیش نہ آئی۔ کفارہ کے رُو سے تو ہر مسیحی ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور موسیٰؑ سے بڑا ہونا چاہیئے کیونکہ ہر عیسائی کو کفارہ کے ذریعہ سے نجات مل چکی ہے۔ جو انہیں نہیں ملی) (آیت ۷۲ تا ۷۶)

پھر نوحؑ کو دیکھو اُسے ہم نے نجات دی۔ اور اس کے دشمنوں کو ہلاک کیا ۔ اگر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

ورنہ کا گناہ تھا تو وہ کیوں تباہ ہوئے؟ (آیت ۷۷ و ۷۸)

اسی طرح داؤدؑ و سلیمانؑ کو ہم نے اعلیٰ مقام دیا۔ خدا نخواستہ کے ان کو یہ مقام کیوں ملا۔ چونکہ داؤد سے مسیح کا شجرہ ملایا جاتا ہے اس لئے ان کا خاص طور پر ذکر کیا (آیت ۷۹ تا ۸۳)

پھر ایوبؑ کو دیکھو۔ اُس کی عبادت اس کے کام آئی۔ اُس کے مصائب مسیحؑ سے بڑھ کر تھے۔ اگر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھانا فائدہ دیتا ہے تو اُسے سب سے بڑا ہونا چاہیئے تھا پھر اسمٰعیلؑ ادریسؑ اور ذوالکفلؑ یہ سب لوگ خدا کی راہ میں قربانی کرنے والے تھے۔ آخر ایک ہی صابر کو یہ درجہ ابنیت کا کیوں دیا جاتا ہے؟ (آیت ۸۴ تا ۸۰)

پھر ذوالنون کو دیکھو جس سے مسیحؑ اپنی مشابہت بتاتا ہے۔ اُس نے بھی تو تکالیف اٹھائیں۔ وہ کیوں کفارہ کا موجب نہ بنا (آیت ۸۸ و ۸۹)

پھر زکریاؑ کو لو اور اُس کے بیٹے کو۔ زکریاؑ جو نیکی پر قائم اور اُس کا بیٹا بھی انجیل کی رُو سے نیک اور خدا کی راہ میں مرنے والا تھا۔ وہ کیوں کفارہ کا موجب نہ بنے۔ اُن کے بعد مریمؑ اور مسیحؑ آئے۔ اُن کا ذکر بے شک دنیا میں پھیلیگا مگر بہرحال ان لوگوں سے ان کے حالات مختلف نہیں۔ پیدائش مسیحؑ اگر غیر معمولی تھی تو پیدائش یحیٰؑ بھی غیر معمولی تھی۔ (ایک کے ساتھ باپ کا اور ایک کے ساتھ ماں کا ذکر کیا ہے۔ تا دونوں کی معذوری ظاہر ہو۔ بیوی کے علاج کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیک دونوں تھے۔ مصائب دونوں نے برداشت کئے۔ پھر یحیٰؑ کیوں نہ کفارہ کا موجب ہوا؟ (آیت ۹۰ تا ۹۲)

یہ سب کے سب انسان ایک قسم کی طاقتوں والے تھے۔ اور ایک ہی قانون کے تابع تھے اور سب میری طرف توجہ دلاتے تھے۔ پس اب نیا طریق اختیار نہ کرو۔ (آیت ۹۳)

مگر تعجب ہے کہ لوگ تفرقہ کرتے ہیں۔ اور مجرب آزمودہ راستہ کو چھوڑتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا طریق شروع سے ایک ہے جو نیک ہوگا اس سے نیک سلوک ہوگا۔ (آیت ۹۴ و ۹۵)

ہماری یہ سنت ہے کہ جب کوئی قوم ہلاک ہوتی ہے تو اُسے دوبارہ اٹھنے کا موقعہ نہیں ملتا لیکن یاجوج ماجوج کے وقت ایسا ہوگا (جو مسیحی ہونگے جن کا ذکر ہے) جب وہ سب طرف سے دنیا پر چھا جائیں گے تو اس کے بعد دنیا میں ایک نئی رَو چلے گی۔ اور یاجوج ماجوج پر عذاب نازل ہوگا اور وہ سب سامان جن پر اُن کو غرور ہوگا تباہ ہو جائیں گے۔ اُس وقت مومن عذاب سے بچائے جائیں گے۔ مگر کفر کا نظام لپیٹ دیا جائیگا اور اس کے بعد پھر مومن فلسطین کے مالک ہو جائیں گے (آیت ۹۶ تا ۱۰۷)

اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو رحمت کے طور پر آیا ہے تاکہ کفارہ کی لعنت سے بچاکر توبہ کا دروازہ کھولے۔ تو توحید کا اعلان کر اور منکروں کو ہوشیار کر۔ تیری قوم بھی فلسطین سے نکالی جائیگی پس تو ابھی سے دُعا کرے۔ کہ اے خدا! اِس طرح

الجزء ۱۷

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲

لوگوں کے حساب لینے کا وقت قریب پہنچ چکا ہے مگر وہ (پھر بھی) غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور اعراض کرتے جا رہے ہیں ؎۲

اسلام اور یہودیت کے معاملہ میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے تو ایسا فیصلہ کر کہ اسلام کی سچائی ظاہر ہو جائے۔ اور پھر اس ملک میں مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے۔

(آیت ۱۰۸ تا ۱۱۳)

اقترب

؎۲ حل لغات:- اِقْتَرَبَ الْوَعْدُ کے معنے ہیں قَرُبَ۔ وعدہ کے پورا ہونے کا وقت آگیا۔ (اقرب)

تفسیر:- مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ سورۃ انبیاء نویں سال میں نازل ہوئی ہے۔ مسلمان مفسرین چونکہ تُک مارنے کے عادی نہیں۔ انہوں نے اسے مکی قرار دیا ہے۔ اگر مغربی مصنفین کے اس دعویٰ کو تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سورۃ نویں یا دسویں سال نبوت میں نازل ہوئی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی مکہ سے ہجرت کا وقت قریب آ رہا ہے جس کے نتیجہ میں مکہ والوں کی تباہی کے سامان پیدا ہو جائیں گے۔ دوسرے اس میں مدینہ میں اسلام کے پھیلنے کی طرف بھی اشارہ ہوگا جہاں محمد رسول اللہ صلعم کی فتح کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تعجب ہے کہ عیسائی مستشرقین جیسے ہوشیار لوگ آپ ہی اپنے جال میں پھنس گئے اور انہوں نے اس سورۃ کے نزول کی تاریخ ایسی مقرر کر دی جو ہجرت اور مدینہ میں اسلام پھیلنے کے قریب زمانہ کی تھی۔ اور اسطرح تسلیم کر لیا کہ قرآن کریم خدائی کتاب ہے اور اس میں غیب کی اہم خبریں بتائی گئی ہیں جن خبروں کے مطابق عرب جیسے وسیع ملک پر چند سال میں ایک چھوٹی سی قوم غالب آ گئی۔ اور مکہ جو ابتدائے عالم سے کبھی فتح نہیں ہوا تھا اس قوم کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ میں ڈرایا جا رہا ہے کہ عذاب آنے والا ہے۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی مانتا ہی نہیں اُس پر افسوس کس بات کا کہ وہ غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ وہ تو یہ سُنکر ہنسے گا کہ مَیں تو مانتا ہی نہیں پھر مجھ پر افسوس کیسا ہو رہا ہے؟

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اِقْتَرَبَ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے ابتدائی آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جو نہیں مانتے انہیں اتنا تو سوچنا چاہیئے کہ اس عذاب سے بچنے کا کیا طریق ہے اور کیوں اس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔ مگر چونکہ یہ اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور اتنا بھی نہیں سوچتے اس لئے معلوم ہوا کہ یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ عذاب کے نشان پے در پے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اطمینانِ قلب کسی کو بھی حاصل نہیں لیکن باوجود اس کے کوئی نہیں دیکھتا کہ اس کی کیا وجہ ہے اور فتنہ و فساد کے اصل منبع کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ لوگ یہی چاہتے ہیں کہ جو تکلیف یا روک ہمارے سامنے ہے۔ وہ کسی طرح ہٹ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ عذاب میں دن بدن زیادہ پھنس رہے ہیں اور جب تک وہ

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا

اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے کبھی کوئی نئی یاد دہانی نہیں آتی - مگر وہ اُسے سُنتے

اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۲﴾ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَ

بھی جاتے ہیں اور اُس سے ہنسی مذاق بھی کرتے جاتے ہیں - اُن کے دِل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں -

اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ

وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا چپکے چپکے مشورے کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ (دیکھتے نہیں) یہ شخص تم جیسا ہی ایک بشر

مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۳﴾

ہے - پھر کیا تم اس کی فریبانہ باتوں میں آتے ہو حالانکہ تم خوب سمجھتے ہو - ۳؎

مصائب کے اصل منبع کو بند کرنے کی کوشش نہیں کرینگے - یہی حالت جاری رہے گی -

۳؎ حلِ لغات :- اَلذِّكْرُ کے معنے ہیں اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّيْءِ کسی چیز کا تلفظ کرنا - نیز اس کے معنے ہیں اِحْضَارُهٗ فِي الذِّهْنِ بِحَيْثُ لَا يَغِيْبُ عَنْهُ کہ ذہن میں کسی چیز کو اس طرح بار بار لایا جائے کہ وہ ذہن سے اُتر نہ جائے - ذِكْرٌ کے ایک معنے اَلصِّيْتُ کے بھی ہیں یعنی شہرت - نیز اس کے معنے ہیں اَلشَّرَفُ بزرگی - چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ کہ یہ کتاب تیرے لئے اور تیری قوم کیلئے شرف اور عزت کا موجب ہے - اِسی طرح ذکر کے معنے ہیں اَلْكِتَابُ فِيْهِ تَفْصِيْلُ الدِّيْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ کہ وہ کتاب جس میں دین اور مذہب کی تفصیلاً کا ذکر ہو - اگر ذِكْرٌ مِّنَ الْقَوْلِ کا فقرہ بولیں تو معنے ہونگے اَلصُّلْبُ الْمَتِيْنُ مضبوط اور پکی بات (اقرب)

مُحْدَثٌ کے معنے ہیں نَقِيْضُ الْقَدِيْمِ یعنی نیا -

۲/۲ يَلْعَبُوْنَ — يَلْعَبُوْنَ - لَعِبَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے - اور لَعِبَ فِي الْاَمْرِ وَالدِّيْنِ کے معنے ہیں اِسْتَخَفَّ بِهٖ اُس نے دین کی باتوں کو معمولی سمجھا اور اُن کو حقیر قرار دیا (اقرب)

۱/۲ اَلذِّكْرُ

۲/۳ لَاهِيَةً — لَاهِيَةً لَهِيَ سے ہے اور لَهِيَ عَنْهُ کے معنے ہوتے ہیں سَلَا وَغَفَلَ وَتَرَكَ ذِكْرَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْهُ - کسی چیز کو بھلا دیا اور اس سے غافل ہوگیا اور اس کی یاد کو بھلا دیا اور اُس سے ہٹ گیا (اقرب)

۲/۴ اَلنَّجْوٰى — اَلنَّجْوٰى کے معنے ہیں پوشیدہ بات کرنا - نیز اس کے معنے ہیں اَلسِّرُّ - بھید (اقرب)

۲/۴ اَلسِّحْرُ — اَلسِّحْرُ کے معنے ہیں كُلُّ مَا لَطُفَ مَاْخَذُهٗ وَدَقَّ - ہر وہ بات جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو اِسی طرح اِس کے معنے ہیں اَلْفَسَادُ - فساد - اِخْرَاجُ الْبَاطِلِ فِيْ صُوْرَةِ الْحَقِّ - غلط بات کا ایسے رنگ میں پیش کرنا کہ وہ صحیح اور درست نظر آئے - وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا - قِيْلَ مَعْنَاهُ اَنَّهٗ يَمْدَحُ

۱/۲ مُحْدَثٌ

قَالَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ز

(ان باتوں کو سنکر محمد رسول اللہ نے) کہا۔ میرا رب جانتا ہے اُن باتوں کو جو آسمان میں (کہی جاتی) ہیں اور (انکو بھی) جو

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵

زمین میں (کہی جاتی) ہیں اور وہ بڑا سننے والا (اور) بڑا جاننے والا ہے ۵ۓ

الْاِنْسَانَ فَيَصْدُقُ فِيْهِ حَتّٰى يَصْرِفَ قُلُوْبَ السَّامِعِيْنَ اِلَيْهِ وَيَذُمُّهُ فَيَصْدُقُ فِيْهِ حَتّٰى يَصْرِفَ قُلُوْبَهُمْ اَيْضًا عَنْهُ یعنی جب کسی کلام کے متعلق یہ کہیں کہ وہ سحر ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کلام کرنے والا جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو ایسے رنگ میں کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے اور جب کسی کی مذمت کرتا ہے تو ایسا طریق اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور وہ اسکو سچا سمجھنے لگتے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے۔ کہ مکہ والوں کا قرآن کریم کی باتوں کو حقیر سمجھنا اور اسلام سے ہنسی کھیل کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا کے تمام کفار ہمیشہ سے ہر نئے الہام کی مخالفت کرتے آئے ہیں اور اُسے سُن کر ان کے دل خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ ہنسی مذاق کی طرف متوجہ رہے ہیں اور خدا کے پیغام کو مٹانے کے لئے کافروں کے سردار ہمیشہ منصوبے کرتے رہے ہیں۔ انہیں یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور ہم انسان ہیں۔ بلکہ اس کلام کو انسان کی طرف منسوب کرکے ہی سمجھتے رہے ہیں کہ یہ تو ایک آدمی ہے اور ہم بڑی قوم ہیں یہ ہم سے بچکر کہاں جا سکتا ہے اور اس کی اعلیٰ تعلیم سے مجتنب رہنے کیلئے اپنی قوم کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے ہیں کہ اس کی دلفریب باتوں پر نہ جانا جب تمہاری تعداد زیادہ ہے اور یہ مدعی تمہارے مقابلے میں اکیلا ہے تو آخر تمہیں غالب آؤ گے۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے نجویٰ کے معنے پوشیدہ بات کرنے کے ہیں۔ یہ نجویٰ جو خود مخفی ہوتا ہے اس کے ساتھ اَسَرُّوْا کا لفظ مبالغہ کیلئے لگایا گیا ہے یعنی ایسے خفیہ منصوبے کرتے ہیں جن کا لوگوں کو علم تک نہیں ہوتا پھر پبلک میں کہتے ہیں هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کہ یہ تو ایک تمہارے جیسا انسان ہے۔ کیا تم اس کے کلام کو جو سحر ہے سُنتے ہو اور اُسے قبول کرتے ہو۔ حالانکہ تم کو علم ہے کہ یہ سب ملمع سازی کی باتیں ہیں۔

۵ۓ تفسیر:۔ فرماتا ہے عالم الغیب خدا کو کفار کے یہ ارادے پہلے سے معلوم تھے کہ وہ خفیہ منصوبے کریں گے اور پھر پروپگنڈا کرکے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے اس لئے اُس نے اپنے الہام میں اور انسانی قلوب میں پہلے سے اس کا علاج رکھ دیا ہے۔ یہ تو رسولوں کو صرف ایک بشر سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ رسولوں کے پیچھے ایک دُعائیں سُننے والا اور غیب کا جاننے والا خدا بھی ہے اسلئے خواہ یہ ان کے خلاف دنوں کو منصوبے کریں یا راتوں کو اور خواہ اُن منصوبوں کو ظاہر کریں یا پوشیدہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے منصوبوں کو توڑ کر رکھ دیگا۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ

بلکہ انہوں (یعنی مخالفوں) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ (کلام) تو پریشان خوابیں ہیں بلکہ (پریشان خوابیں بھی نہیں) اس نے دیدہ و دانستہ یہ باتیں اپنے

شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۞

پاس سے بنالی ہیں بلکہ وہ، ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والا آدمی ہے (جس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اٹھتے رہتے ہیں) پس چاہیئے کہ ہمارے پاس کوئی نشان لائے جسطرح کہ پہلے رسول (نشانات دیکر) بھیجے گئے تھے

۵ حل لغات :- اَضْغَاث اَلضِّغْثُ کی جمع ہے اور اَلضِّغْثُ کے معنے ہیں قَبْضَةُ حَشِيْشٍ مُخْتَلِطَةِ الرَّطْبِ بِالْيَابِسِ۔ گھاس کے مٹھی بھر تنکے جو خشک اور تر ملے جلے ہوں اور جب اَلضِّغْثُ مِنَ الْاَمْرِ اَوِ الْخَبَرِ کہیں تو اس کے معنے ہونگے مَا كَانَ مُخْتَلِطًا لَاحَقِيْقَةَ لَهٗ ایسی خبریں یا ایسی باتیں جو سچی اور جھوٹی ملی جلی ہوں۔ اور اُن کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

اَحْلَام حُلْم کی جمع ہے اور حُلْم کے معنے ہوتے ہیں وہ خواب جو انسان سونے کی حالت میں دیکھتا ہے۔ لیکن عام طور پر پراگندہ خوابوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے (اقرب)

اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کے معنے ہیں اَحْلَامٌ مُلْتَبِسَةٌ لَا يَصِحُّ تَاْوِيْلُهَا لِاخْتِلَاطِهَا کہ ایسی خوابیں جو پراگندہ خیالات کے ساتھ ملی ہوئی ہوں۔ جن کی تعبیر اور تاویل کرنی درست نہ ہو (اقرب)

شَاعِرٌ شِعْر سے نکلا ہے۔ ہر شخص جو شعر کہتا ہے اُس کو بھی شاعر کہتے ہیں۔ اور ہر شخص جو انسانی شعور یعنی جذبات سے کھیلتا ہے اس کو بھی شاعر کہہ لیتے ہیں۔

تفسیر :- الہام کی تردید میں کفار کوئی ایسی بات تو پیش نہیں کر سکتے۔ جس میں دلائل کے ذریعہ اُسکو رد کیا گیا ہو۔ صرف یہ کہہ کر اپنے متبعین کو تسلی دے دیتے ہیں کہ تمہیں بھی تو کبھی کبھی پریشان خوابیں آ جایا کرتی ہیں۔ اگر اس شخص کو آ گئیں تو کونسی عجیب بات ہے تم بھی تو کبھی کبھی جھوٹ بول لیا کرتے ہو۔ اگر اس نے جھوٹ بول لیا تو کونسی بات ہے۔ تم بھی تو ضرورت کے موقعہ پر جذبات کو ابھارنے والی باتیں کر بیٹھتے ہو۔ اس نے جذبات کو ابھارنے والی باتیں کرلیں تو کیا بات ہے۔ یا پہلے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ کچھ پریشان خوابیں اس نے دیکھی ہونگی۔ پھر اس سے بھی ڈرتے ہیں کہ کم از کم اسکو سچا تو مانا۔ پھر کہتے ہیں مفتری ہے۔ مگر پھر اس دعوٰی کو بھی بڑا سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ایسے صادق کی نسبت لوگ یہ بات کس طرح مانیں گے؟ چنانچہ پھر کہتے ہیں یہ یونہی تمسخر ہے جیسے شاعر باتیں بناتا ہے۔

اَضْغَاث

اَحْلَام

شَاعِر

چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام میں کوئی ایک شعر بھی نہیں اور قرآن کریم خود کہتا ہے کہ یہ کلام کسی شاعر کا نہیں اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب قرآن کریم کے متعلق یا پہلے نبیوں کی نسبت شاعر کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد عرف عام والا شاعر نہیں ہوتا بلکہ محض جذبات سے کھیلنے والا انسان ہوتا ہے۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے مگر وہ شاعر نہیں کہلا سکتے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

کچھ شعر و شاعری سے اپنا نہیں تعلق
اس ڈھب سے کوئی سمجھے بس مدعا یہی ہے

زمیندار اخبار چالیس سال سے اس بات پر تمسخر اُڑاتا رہا ہے کہ مرزا صاحب شعر کہتے ہیں۔ حالانکہ

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ⑦

اِن سے پہلی بستیوں میں سے بھی جنکو ہم نے ہلاک کر دیا تھا کوئی ایمان نہیں لایا تھا۔ تو پھر کیا یہ ایمان لے آئینگے؟ ۵

نہ اُن کے شعروں میں کوئی لطافت ہے نہ فصاحت اور نہ زباندانی کی جھلک۔ غریب زمیندار تو یہ سمجھتا رہا کہ اس سے وہ مرزا صاحب کی تردید کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ اِس ذریعہ سے احمدیوں کو یہ ہتھیار مہیا کر کے دے رہا تھا کہ باوجود کچھ موزون کلام کہنے کے مرزا صاحب شاعر نہیں کہلا سکتے۔ اور اُن کے ملہم ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار اپنے باپ دادوں کو آپ جھوٹا کہتے ہیں۔ پہلے زمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر نبی کو لوگوں نے کہا کہ یہ نشان نہیں لایا۔ لیکن انہی لوگوں کی اولاد نے آگے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں اپنے باپ دادوں کو جھوٹا کہدیا اور یہ کہنے لگے کہ پہلے رسول تو آیات لایا کرتے تھے مگر محمدؐ رسول اللہ کوئی آیت نہیں لائے۔ دیکھو خدا تعالیٰ کی تدبیر کیسی زبردست ہے۔ جب پہلے نبیوں کے دشمن یہ کہتے تھے کہ لاؤ نشان دکھاؤ۔ تو خدا کے فرشتے اُن پر ہنستے ہونگے کہ ٹھہر جاؤ ابھی تمہارے پوتے پڑپوتے تمہیں جھوٹا کہیں گے۔ چنانچہ اس کی ظاہری صورت یہ پیدا ہوگئی کہ وہی نبی جن کی قوم ان کو کہتی تھی کہ تم کوئی نشان کیوں نہیں لائے جب مر گئے تو ان کی قوم نے ان کی طرف مضحکہ خیز باتیں منسوب کر دیں۔ کبھی کہہ دیا وہ مُردے زندہ کرتے تھے جیسا کہ مسیحؑ کی قوم نے کہا۔ کبھی کہہ دیا کہ جدھر انکے پیر ہوتے تھے اُدھر مقدس مقامات اپنی جگہ سے ہٹ کر پھر جاتے تھے۔ جیسا کہ سکھوں نے کہہ دیا کہ جب باوا نانکؒ مکّہ گئے تو جدھر اُن کے پیر ہوتے تھے مکّہ اُدھر ہی ہو جاتا تھا۔ غرض یہ مضحکہ خیز باتیں تھیں جن کے فریب میں اُن کی اولاد آگئی اور جب انہوں نے یہ کہا کہ جس طرح پہلے رسول آیتیں لاتے تھے موجودہ رسول بھی لائے تو اُن کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح پہلے رسولوں کے مرنے کے بعد ہم نے اُن کے معجزات کے متعلق کہانیاں بنالی تھیں ہماری کہانیوں کے مطابق نشان لاؤ۔ حالانکہ وہ رسول خدا کے رسول تھے ان کافروں کے رسول نہیں تھے اور خدا تعالیٰ اپنی سنت آپ نہیں توڑا کرتا۔ کیا کوئی احمق سے احمق بادشاہ بھی لوگوں نے دیکھا ہے جو اپنا قانون خود توڑنے لگ جائے؟۔

۵ حل لغات

قَرْيَةٌ: قَرْيَةٌ کے معنے شہر اور بستی کے ہیں۔ لیکن یہاں قَرْيَة سے اہل قریہ مراد ہیں۔ یعنی بستی اور شہر کے رہنے والے۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ جب پہلی قوموں پر ہلاکت آگئی تو کیا وہ لوگ ایمان لائے تھے۔ اب ان لوگوں کا بھی عذاب قریب ہے پھر یہ کس طرح ایمان لائیں گے۔

قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ صرف یونسؑ کی قوم ایسی تھی جو عذاب کے آثار دیکھنے کے بعد ایمان لے آئی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی برکات سے نوازا۔ اس کے علاوہ اور کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس نے عذاب کے آثار دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا ہو۔ اور وقت کے نبی پر ایمان لے آئی ہو۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي

الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰھُمْ اِلٰی حِیْنٍ (یونس ع۱۰) یعنی یونسؑ کی قوم کے سوا کیوں کوئی اور قوم ایسی نہ ہوئی جو ایمان لاتی تو اس کا ایمان لانا اُسے نفع دیتا ۔ صرف یونسؑ کی قوم ایسی تھی کہ جب وہ ایمان لائی تو ہم نے دنیا میں اس سے رسوا کن عذاب دُور کر دیا اور ان لوگوں کو ایک لمبے عرصہ تک فائدہ پہنچایا ۔ قرآن کریم کے یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ ان میں صرف ماضی کے ایک واقعہ کا ہی ذکر نہیں کیا گیا ۔ بلکہ اس خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ کیوں یونسؑ کی قوم کی طرح اور اقوام بھی نہ ہوئیں جو ایمان لاکر نجات حاصل کرتیں ۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا دروازہ بنی نوع انسان کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح یونسؑ کی قوم ایمان لائی ۔ اور اللہ تعالےٰ نے اُسے عذاب سے نجات دی اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم بھی عذاب کے آنے کے بعد آپ پر ایمان لائی اور اللہ تعالےٰ نے اُسے اپنی برکات سے بہرہ ور فرمایا ۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکہ والوں کو انتہائی ذلت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھکنا پڑا اور خالدؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے لوگ جنہوں نے بعد میں ساری دنیا کو اسلام کے لئے فتح کیا اسلام لے آئے ۔ اور جب مسلمانوں کا جرار لشکر مکہ میں داخل ہوا اور مکہ کی حکومت تہ و بالا کر دی گئی ۔ تو ہند جیسی دشمن اسلام عورت بھی ایمان لے آئی اور ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی ایمان لے آیا یونسؑ کے بعد صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک ذات ہے جن کی قوم پر عذاب آیا مگر پھر بھی وہ ایمان لے آئی ۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دم قدم کی برکت تھی ۔ ورنہ نہ یہ بات مسیحؑ کو نصیب ہوئی نہ کسی اور نبی کو ۔ صرف یونسؑ کو پہلے نبیوں میں سے اور محمد رسول اللہ کو آخری نبیوں میں سے یہ بات نصیب ہوئی ۔ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔

یہ جو فرمایا کہ جب پہلے ایمان نہیں لائے تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے ؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔ وہ تو لے آئے تھے ۔ بلکہ اس میں اُن کے اپنے خیالات کا رد ہے اور یہ بتایا ہے کہ عقلی قاعدہ کے مطابق تو وہ ایمان نہیں لا سکتے تھے اتنے شدید ظلموں کے بعد اگر ایک قوم مغلوب ہوتی ہے تو اس کو ایمان نصیب نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس کے مرد قتل کر دئے جاتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے دشمن کنعانیوں کے ساتھ سلوک کرنیکا حکم دیا گیا ۔ (استثنا باب ۲۰ آیت ۱۴) یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ستودہ صفات تھی کہ موسیٰؑ اور پہلے نبیوں کے طریق کے خلاف ظالم اہل مکہ کو جب انہوں نے فتح کر لیا ۔ تو یہ اعلان کر دیا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ آج تم پر کسی قسم کی گرفت نہیں تم سب کو معاف کیا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ جب عکرمہ بن ابوجہل اپنی بیوی کے اصرار پر حبشہ کی طرف بھاگتے ہوئے لوٹ کر واپس آیا تو اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا ۔ یا محمدؐ! میری بیوی کہتی ہے ۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور میں مکہ میں رہ سکتا ہوں ۔ کیا یہ ٹھیک ہے ۔ آپ نے فرمایا ۔ ہاں ٹھیک ہے ۔ عکرمہ نے کہا ۔ یا محمدؐ! آپ کا شکریہ ۔ مگر میں اپنا مذہب بدلنے کے لئے تیار نہیں ۔ کیا اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی میں آپ کی مملکت میں رہ سکتا ہوں آپ نے فرمایا ۔ ہاں ۔ جب اُس نے یہ سُنا ۔ تو بے اختیار کہہ اُٹھا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں ۔ عکرمہ حقیقت سے ناواقف تھا ۔ اُس نے یہ سمجھا کہ اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے آپ نے مجھے معاف کیا ہے حالانکہ موسیٰؑ بھی اللہ کے رسول تھے اور انہوں نے اپنی مدمقابل قوم کو فتح کرکے سب زن و مرد کو قتل کر دیا تھا ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

اور تجھ سے پہلے بھی ہم نے صرف بعض مردوں کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾

اگر تم (یہ بات) نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ کر دیکھ لو۔ ؎۵

عکرمہؓ کو تو یہ کہنا چاہیئے تھا۔ کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اور اے محمدؐ! میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ تیرا نام ہی محمدؐ نہیں بلکہ تو وہ محمدؐ ہے جس کی سب نبیوں نے خبر دی ہے اور جس کے حمد کے سب انبیاءؑ گن گاتے رہے ہیں۔

؎۵ **تفسیر**:- اس میں بتایا گیا ہے کہ تجھ سے پہلے رسول بھی کامل القویٰ انسان ہوتے تھے۔ اُن میں اور دوسرے شریف مردوں میں یہی فرق ہوتا تھا کہ خدا اُن کی طرف وحی کرتا تھا۔ اس جگہ دوسرے انبیاء کو بھی رِجَالًا کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ یعنی کامل القویٰ لوگ۔ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کے لوگوں کے مقابلہ پر ہے ہر نبی اپنی قوم کے لوگوں میں سے اشرف اور اعلےٰ ہوتا ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ جو تم سے پہلے اہل کتاب گذر چکے ہیں اُن سے پوچھ لو۔ کہ ان کی طرف بھی انسان رسول آئے ہیں یا خدا رسول آیا ہے۔

یہ آیت درحقیقت کفار کے اس اعتراض کا الزامی جواب ہے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ یعنی یہ تو تمہارے جیسا ایک آدمی ہے۔ کیا تم اس کی باتوں پر ایمان لاتے ہو؟ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے بھی ہدایت کے لئے آدمی ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی نازل کیا کرتے تھے۔ اگر تم کو معلوم نہ ہو تو یہود اور نصاریٰ سے پُوچھ لو۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالف اگر اور نہیں تو کم از کم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت اور آپ کے خدا رسیدہ ہونے کے تو ضرور قائل تھے۔ پس جب وہ بشر رسول تھے تو اب ایک بشر رسول کے آنے پر انہیں کیوں اعتراض ہے۔

اس قسم کے الزامی جواب سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معترض جس بات کو تسلیم کرتا ہے اس کے خلاف اُسے تعصب نہیں ہوتا بلکہ اس کی تائید میں اس کے پاس دلائل ہوتے ہیں۔ پس بجائے اس کے کہ جس بات پر اُس نے اعتراض کیا ہو اس کی تائید میں دلائل دئے جائیں۔ یہ زیادہ سہل طریق ہوتا ہے کہ خود اسی کی تسلیم کردہ باتوں میں سے کوئی اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔ تاکہ اس کی تائید میں جو دلائل اُس کے ذہن میں ہوں انہی کے ذریعہ سے وہ اس بات کی صداقت کو بھی سمجھ لے جس پر وہ اعتراض کرتا ہے۔ یہاں بھی بجائے یہ ثابت کرنے کے کہ نبی کیلئے بشر ہونا ضروری ہے اللہ تعالیٰ صرف یہ حوالہ دیتا ہے کہ پہلے نبی جن کو تم مانتے ہو وہ بھی تو ایسے ہی تھے پھر تم نے انکو کیوں مانا تھا۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا

اور ہم نے ان (رسولوں) کو ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر معمولی عمر پانے

خٰلِدِيْنَ ﴿۹﴾ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ

والے لوگ تھے ۸؎ اور ہم نے جو وعدہ اُن سے کیا تھا اُسے پُورا کر دکھایا اور انکو اور انکے مواحن کو جانی

مَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۰﴾ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ

(دشمنوں سے) نجات دی۔ اور جو حد سے بڑھنے والے تھے انکو ہلاک کر دیا ۹؎ ہم نے تمہاری طرف ایک

اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱﴾ ع

ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری بزرگی کے سامان ہیں۔ کیا تم عقل نہیں کرتے ۱۰؎

۸؎ حل لغات:۔ اَلْجَسَدُ کے معنے ہیں جِسْمُ الْاِنْسَانِ۔ انسان کا جسم۔ وَكُلُّ خَلْقٍ لَا يَاْكُلُ وَلَا يَشْرَبُ مِنْ نَحْوِ الْجِنِّ وَالْمَلٰٓئِكَةِ۔ ہر وہ مخلوق جو نہ کھاتی ہے اور نہ پیتی ہے۔ جیسے جنّ اور ملائکہ (اقرب)

تفسیر۔ یہاں سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم تو اُن کو ابن اللہ مانتی ہے یا رام اور کرشن کی قوم اُن کو خدا مانتی ہے۔ کیونکہ وہ ابن اللہ مانیں یا خدا مانیں وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ عورتوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اور انسانوں جیسا جسم رکھتے تھے اور کھانے پینے سے آزاد نہیں تھے۔ اور نہ موت سے آزاد تھے۔ یہ اقرار ثابت کرتا ہے کہ درحقیقت اُن کی قوم اُن کو انسان ہی مانتی تھی۔ چنانچہ دیکھ لو اسلام کے ذریعہ سے توحید کی ضرب ایسی کاری پڑی کہ اب ہندو اور عیسائی بھی کہنے لگ گئے ہیں کہ ہم موحد ہیں۔

۹؎ حل لغات:۔ مُسْرِفِيْنَ اَسْرَفَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور اَسْرَفَ فِيْ كَذَا کے معنے ہوتے ہیں جَاوَزَ الْحَدَّ۔ حد سے تجاوز کیا۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں اَخْطَاَ۔ غلطی کی۔ جَهِلَ۔ نادانی کی غَفَلَ۔ غفلت برتی (اقرب) پس مُسْرِفِيْنَ کے معنے ہونگے۔ حد سے تجاوز کرنے والے۔ غلطی کرنے والے نادانی کرنے والے۔

تفسیر:۔ بے شک ان لوگوں سے غیر معمولی سلوک ہوا۔ مگر غیر معمولی سلوک الٰہی باتوں کے معاملہ میں تھا جن کا ذکر الہام میں آیا تھا۔ ورنہ عام طبعی باتوں میں وہ دوسرے انسانوں کے مشابہ تھے۔

۱۰؎ حل لغات:۔ ذِكْرٌ کے معنے شرف کے ہیں۔ یعنی بزرگی اور عزت (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ الہام الٰہی رحمت کے طور پر آتا ہے نہ کہ لعنت کے طور پر جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ قرآن کریم میں وہ تعلیم ہے کہ اگر تم اس پر عمل کروگے تو تم کو بڑا شرف نصیب ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے ہمیشہ سچ بولو قرآن کہتا ہے ایفائے عہد کرو۔ قرآن کہتا ہے چوری نہ کرو

۱ اَلْجَسَدُ ۲ ذِكْرٌ

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو ظلم کیا کرتی تھیں۔ کہ ہم نے اُن کو کاٹ کر رکھ دیا

بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑫ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ

اور اُن کے بعد ایک اَور قوم کو پیدا کر دیا۔ پس جب (ہلاک ہونے والے لوگوں نے) ہمارے

اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ⑬

عذاب کو محسوس کیا تو لگے (اس سے بچنے کے لئے) دوڑنے [۱۱]

قرآن کہتا ہے ظلم نہ کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مال ہو۔ تو غریبوں پر خرچ کرو۔ صرف اپنے نفس کا خیال نہ رکھو۔ اپنے اہل وعیال کو بھی توفیق کے مطابق خرچ دو۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر دو حکومتیں آپس میں لڑ پڑیں تو اُن میں صلح کراؤ۔ اور صلح کے وقت اپنا حصہ بٹوانے میں نہ رکھو اور جب معاملہ کرو انصاف اور عدل کے ساتھ کرو۔ بیویوں اور نوکروں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ مزدور کو اس کا حق ادا کرو۔ مسافروں کی خبر گیری رکھو۔ قرضدار کے قرضے چکاؤ۔ غلاموں کو آزاد کراؤ۔ جو مخلوقات مانگ نہیں سکتی۔ یعنی بے زبان ہے یا مانگنے کو عار سمجھتی ہے اُن کی خبر گیری کرو۔ اور ظالم کو اس حد تک معاف کرو کہ اس کی اصلاح ہو۔ مگر جب معاف کرنے سے شرارت پیدا ہوتی ہو تو معاف نہ کرو۔ اَب دیکھ لو۔ جو شخص اس تعلیم پر عمل کریگا۔ اس کو عزت نصیب ہوگی یا ذلّت؟ اگر اس تعلیم پر عمل کرنا لعنت ہے تب تو عیسائی سچے ہیں۔ لیکن اگر اس تعلیم پر عمل کرنا لعنت کا موجب نہیں بلکہ عزت کا موجب ہے تو قرآن سچا ہے اور مسیحیت جو شریعت کو لعنت قرار دیتی ہے جھوٹی ہے۔

[۱۱] **حل لغات**:۔ قَصَمْنَا قَصَمَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور قَصَمَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں كَسَرَهٗ وَ اَبَانَهٗ۔ اُس کو توڑ دیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور مختلف حصّوں کو علیحدہ کر دیا۔ اور جب قَصَمَهُ اللّٰهُ کہیں تو معنے ہونگے اَهَانَهٗ وَ اَذَلَّهٗ اُس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل وخوار کیا۔ (اقرب)

مفردات میں ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً اَيْ حَطَمْنَاهَا وَهَشَمْنَاهَا وَ ذٰلِكَ عِبَارَةٌ عَنِ الْهَلَاكِ۔ یعنی آیت كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ کے معنے ہیں ہم نے بہت سی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور اس طرح ہلاک و ویران کیا کہ اُن کے مکانات ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اَلْبَاْسُ: اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔ اَلشِّدَّةُ فِي الْحَرْبِ لڑائی کی سختی (اقرب)

يَرْكُضُوْنَ رَكَضَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور رَكَضَ کے معنے ہوتے ہیں حَرَّكَ رِجْلَهٗ۔ اپنے پاؤں کو حرکت دی۔ اور رَكَضَ مِنْهُ کے معنے ہیں هَرَبَ مُسْرِعًا۔ جلدی جلدی بھاگا (اقرب) پس يَرْكُضُوْنَ کے معنے ہونگے۔ وہ جلدی جلدی بھاگتے تھے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ نیکی اور بدی کی لہریں دُنیا میں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں۔ انسان ایک عرصہ کے بعد بگڑ جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اور

اَلْبَاْسُ [۲]

يَرْكُضُوْنَ [۲]

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ

(تب ہم نے کہا) دوڑو نہیں۔ اور اُن چیزوں کی طرف جن کے ذریعہ سے تم آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے گھروں کی طرف

لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾

واپس جاؤ تاکہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے۔ ہس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ اے افسوس! ہم تو عمر بھر ظلم ہی کرتے رہے ۱۳

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور وہ یہی بات کہتے چلے گئے یہاں تک کہ ہم نے اُن کو ایک کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا جس کی سب نمی برباد ہو چکی تھی ۱۴

جب وہ اصلاح کے سامان پیدا کرتا ہے۔ پہلے مفسد لوگ اصلاح کرنے والے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور پھر ہمیشہ بھاگ جاتے ہیں۔ اسجگہ ظالم کے معنے ایسے شخص کے ہیں جو اپنے حقوق اور طاقتوں کو غیر محل استعمال کرتا ہے۔ یا کوئی حقیقت جو کسی کی طرف منسوب کرنی چاہیئے وہ نہیں کرتا۔ یا جو بات کسی میں نہیں ہے وہ اسکی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ دنیا میں تمام بدیاں انہی باتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ہر ایک طاقت کو اپنے موقعہ اور محل پر استعمال کیا جائے تو ہمیشہ نیک نتائج پیدا ہوں نقصان کا موجب وہی بات ہوتی ہے جو بے جا طریق سے کی جاتی ہے

وہ بستیاں جن میں رہنے والے اپنی طاقتوں کو بے جا اور بے محل استعمال کر کے ظالم بن گئے تھے اُنکے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انکو ہلاک کر دیا اور اُن کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کر دیا۔

۱۲ حل لغات:۔ اُتْرِفْتُمْ۔ اَتْرَفَ سے جمع مخاطب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور اَتْرَفَ النِّعْمَةُ زَيْدًا کے معنے ہیں نَعَّمَتْهُ۔ زید کو نعمت نے خوشحال بنا دیا۔ اسی طرح اَتْرَفَتْهُ النِّعْمَةُ کے معنے ہوتے ہیں اَطْغَتْهُ وَاَبْطَرَتْهُ۔ اسکو نعمت اور خوشحالی نے متکبر اور سرکش بنا دیا (اقرب) مفردات میں ہے اَلتُّرْفَةُ: اَلتَّوَسُّعُ فِي النِّعْمَةِ کہ الترفہ کے معنے ہیں نعمتوں کی کثرت۔ پس وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ

کے معنے ہونگے کہ جن چیزوں کے ذریعہ سے تم آرام اور نعمت کی زندگی بسر کرتے تھے اُن کی طرف لوٹو۔

تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ مجرم لوگ آخر میں اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر اُن کی یہ اصلاح صرف سزا کے زمانہ تک رہتی ہے اس کے بعد پھر بگاڑ شروع ہو جاتا ہے۔

۱۳ حل لغات:۔ حَصِيْدًا کے معنے ہیں اَلزَّرْعُ الْمَحْصُوْدُ۔ کٹی ہوئی کھیتی۔ خَامِدِيْنَ۔ خَامِدٌ سے جمع کا صیغہ ہے جو خَمَدَ سے اسم فاعل ہے اور خَمَدَتِ النَّارُ کے معنے ہیں۔ آگ بجھ گئی۔ اور خَامِدِيْنَ کے معنے ہیں اَیْ لَا يُسْمَعُ لَهُمْ حِسٌّ اَوْ مَوْتٰى وہ ایسے ہو گئے کہ اُن کی کوئی حس باقی نہ رہی۔ یا وہ مردہ ہو گئے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ہم نے اُن کی جڑوں کو کاٹ دیا اور وہ بجھی ہوئی آگ کی طرح ہو گئے۔ یعنی بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ اُن میں نہ رہا۔ اُن کی اُمنگیں جاتی رہیں اور اُن کی ترقی کی خواہشیں مٹ گئیں۔ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے اُن کی یہی حالت ہوتی ہے۔

حَصِيْدًا خَامِدِيْنَ اُتْرِفْتُمْ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا (بلکہ انکی پیدائش میں

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ

حکمت تھی) ۱۴؎ اگر ہم نے کوئی دل بہلاوا ہی تجویز کرنا ہوتا تو اس کو اپنے قرب میں تجویز کرتے

اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۸﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

لیکن ہم تو حق کو باطل پر اُٹھا مارتے ہیں۔ اور

فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

وہ اُس کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ (باطل) فوراً ہی بھاگ جاتا ہے۔ اور تم پر تمہاری باتوں کی وجہ سے افسوس ہے ۱۵؎

لٰعِبِيْنَ

۱۴؎ **حل لغات**:۔ لٰعِبِيْنَ لَاعِبٌ کی جمع ہے جو لَعِبَ سے اسم فاعل ہے اور لَعِبَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں ضِدُّ جَدَّ وَمَزَحَ۔ یعنی سنجیدگی کے بالمقابل کی حالت اختیار کی اور مزاح کرنے لگ گیا۔ اَوْ فَعَلَ فِعْلًا بِقَصْدِ اللَّذَّةِ اَوِ التَّنَزُّهِ۔ یا صرف مزے کی خاطر کام کیا یا ہنسی کھیل میں کام کیا۔

يَدْمَغُ

تفسیر:۔ یہاں فرماتا ہے۔ کہ آسمان اور زمین پر غور کر کے دیکھو ہم نے اِن کو بغیر حکمت کے نہیں پیدا کیا۔ بلکہ حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے بے حکمت پیدا کیا ہو کہ کھائے پیئے اور مرجائے۔

نَقْذِفُ

۱۵؎ **حل لغات**:۔ نَقْذِفُ قَذَفَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَذَفَ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں رَمٰی بِهٖ۔ اس کو پھینکا۔ عربی میں محاورہ ہے هُمْ بَيْنَ حَاذِفٍ وَقَاذِفٍ اَیْ ضَارِبٍ بِالْعَصَا وَرَامٍ بِالْحِجَارَةِ۔ یعنی اُن میں سے بعض تو سونٹے سے مارنے والے ہیں۔ اور بعض پتھر مارنے والے ہیں (اقرب) پس نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ کے معنے ہیں ہم حق کو باطل پر پتھر کی طرح مارتے ہیں۔

يَدْمَغُ دَمَغَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور دَمَغَهٗ کے معنے ہیں شَجَّهٗ حَتّٰی بَلَغَتِ الشَّجَّةُ دِمَاغَهٗ۔ اس کے سر کو ایسا زخم لگایا کہ وہ زخم اس کے دماغ تک پہنچ گیا۔ نیز جب دَمَغَ الْحَقُّ الْبَاطِلَ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اَبْطَلَهٗ وَمَحَقَهٗ۔ اُس کو باطل کر دیا اور مٹا دیا۔ پس يَدْمَغُهٗ کے معنے ہیں۔ اُس کا سر توڑ دیتا ہے اور اس پر غالب آجاتا ہے۔

تفسیر:۔ مفسرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ اگر ہم ان کو کھیل کے طور پر پیدا کرتے۔ تو اپنے پاس رکھتے کیونکہ کھیل کی چیزیں اپنے پاس رکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ لَهْو کے معنے بیٹے کے ہیں اور خدا تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم نے کوئی بیٹا بنانا ہوتا تو اپنی جنس کا بناتے نہ کہ انسان بناتے۔ اور بعض لوگ

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ

اور جو وجود بھی آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں سب اُسی کے ہیں - اور جو اُس کے پاس ہیں وہ

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

اُس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے - اور نہ (اس سے) تھکتے ہیں -

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا

وہ رات کو بھی اور دن کو بھی تسبیح کرتے ہیں اور وہ اس سے رُکتے نہیں - کیا اُن لوگوں نے

اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

زمین میں سے معبود بنا لئے ہیں * اور وہ (مخلوقات) پیدا کرتے ہیں ١٦ه

کہتے ہیں کہ لَهْو سے مُراد مرد اور عورت کا خاص تعلق ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر مَیں نے ایسا تعلق رکھنا ہوتا تو اپنی جنس سے رکھتا نہ کہ انسان کی جنس سے - مگر میرے نزدیک چونکہ آگے یہ ذکر ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ اس لئے اس کا بیٹے یا عورت سے کوئی تعلق نہیں - البتہ کھلونے والے معنے درست ہیں اور مراد یہ ہے کہ اگر ہم کھلونوں سے کھیلنے والے ہوتے تو کھلونا اپنے پاس رکھتے تمہیں کیوں دیتے - مگر اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے جو یہ دنیا کا کارخانہ بنایا ہے جس سے بنی نوع انسان اتنا فائدہ اُٹھاتے ہیں کیا اس کارخانہ کو ہم نے ہنسی اور تمسخر کے طور پر ہی بنایا ہے - اگر اسی لئے بنایا ہے تو کیا ہم اپنی ہی ذات سے تمسخر کرتے ہیں - یہ تو کوئی عقلمند نہیں کیا کرتا - پھر ہم ایسا کس طرح کر سکتے تھے - بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ بلکہ ہم تو ہمیشہ حق و حکمت کی باتیں دنیا میں بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ باطل کا سر کچل دیں - اور ہمیشہ باطل حق کے مقابلہ میں بھاگ جاتا ہے - پس اگر یہ دنیا ہم نے بے حقیقت پیدا کی ہوتی تو الہام الٰہی کا سلسلہ دنیا میں کیوں جاری کرتے ؟

وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ - اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی باتوں پر ہنسی اُڑانا بہت معیوب بات ہے - اور اس کا بڑا خطرناک نتیجہ نکلتا ہے - کیا ہنسی اور مذاق کے لئے ان کے پاس خدا کا کلام ہی رہ گیا ہے - اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو اُن پر سخت عذاب نازل ہوگا -

١٦ه حل لغات :- يَسْتَحْسِرُوْنَ اِسْتَحْسَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَحْسَرَ کے معنے ہیں - اَعْيَا - وہ تھک گیا - اور لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ کے معنے ہونگے لَا يَعْيَوْنَ مِنْهَا وہ عبادت سے تھکتے نہیں (اقرب)

يَسْتَحْسِرُوْنَ ١

يُنْشِرُوْنَ اَنْشَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے - اور اَنْشَرَ اللّٰهُ الْمَيِّتَ کے معنے ہوتے ہیں اَحْيَاهُ اللہ تعالیٰ نے مردہ کو زندہ کیا (اقرب) پس يُنْشِرُوْنَ کے معنے ہونگے - وہ زندہ کرتے ہیں مخلوق

يُنْشِرُوْنَ ٢

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ

اگر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔ پس اللہ (تعالیٰ) جو

اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۳﴾

عرش کا بھی رب ہے، تمام نقصوں سے پاک ہے اور ان (باتوں) سے بھی جو وہ کہتے ہیں ؎

پیدا کرتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ تم دیکھو آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ خدا کا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ انسانوں کو تباہ ہونے دیگا اور اُن کے لئے ہدایت کا سامان نہیں کریگا۔ دنیا میں کوئی شخص اپنی چیز کو آپ تباہ نہیں کیا کرتا۔ پھر تم کس طرح سمجھتے ہو کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب خدا کا ہو۔ اور پھر بھی اُسے اپنے بندوں کی اصلاح کا خیال نہ ہو۔ وہ ہمیشہ اُن کی اصلاح کے لئے اپنے مامور بھیجتا رہتا ہے اور جس شخص کے عمل بتاتے ہیں کہ وہ خدا رسیدہ ہے وہ کبھی تکبر کرکے خدا تعالیٰ کی عبادت سے ہٹ نہیں جاتا۔ اور نہ خدا کی عبادت سے تھکتا ہے بلکہ ایسے لوگ رات اور دن بغیر وقفہ کے تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو خود بے وقوف ہیں اور ہماری طرف بے وقوفی منسوب کرتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھوں سے بُت بناتے ہیں۔ اور اُن کی پوجا کرنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے متعلق بھی خیال کرتے ہیں کہ ہم خود ایک مخلوق پیدا کرکے اس کو اپنا بیٹا یا ہمسر بنا لیتے ہیں۔

؎ حل لغات:۔ یَصِفُوْنَ وَصَفَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور وَصَفَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں نَعَتَهٗ بِمَا فِيْهِ کسی چیز کی اندرونی کیفیت کو بیان کرنا (اقرب) پس یَصِفُوْنَ کے معنے ہونگے

وہ بیان کرتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ کیا یہ سمجھتے نہیں۔ کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے۔ تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے۔ یعنی اگر کئی معبود ہوتے تو دنیا میں کئی قانونِ نیچر ہوتے اور دنیا تباہ ہو جاتی۔ مگر قانونِ نیچر دنیا میں ایک ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ جب مَیں چھوٹا تھا غالباً میری عمر اس وقت کوئی اکیس[۲۱] سال کی تھی کہ ایک سندھ کے مولوی صاحب غالباً مولانا عبید اللہ صاحب سندھی جو اکثر قادیان آتے رہتے تھے۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ کو ملنے کے لئے آئے۔ اور انہوں نے یہ آیت آپ کے سامنے رکھی کہ آپ اس کو حل کر دیں اور یہ اعتراض کیا کہ قرآن نے یہ کیا کہا ہے کہ اگر کئی معبود ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد پیدا ہو جاتا۔ حالانکہ معبود تو کہتے ہی اُسے ہیں جو کامل القویٰ ہو۔ انسان بادشاہ دنیا میں لڑتے ہیں۔ اگر واقعہ میں خدا کے سوا اور کئی خدا ہوتے تو وہ آپس میں کیوں لڑتے۔ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ نے اُن کو کئی جواب دئے مگر اُن کی تسلی نہ ہوئی۔ بڑی دیر تک وہ اعتراض کرتے چلے گئے۔ مجھے اب تک وہ کمرہ یاد ہے جہاں یہ باتیں ہوئی تھیں بلکہ اب تک وہ جہتیں بھی یاد ہیں جس طرف دونوں کے مُنہ تھے۔ استاذی المکرم حضرت مولوی صاحبؓ کا مُنہ

اس وقت شمال کی طرف تھا اور سندھی مولوی صاحب کا مُنہ جنوب کی طرف تھا اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب بحث لمبی ہوگئی۔ اور سندھی مولوی صاحب (جو اغلبًا مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تھے) نے کہا کہ اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا تو استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحبؓ نے بڑے جوش سے کہا کہ آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں جواب نہیں دے سکتا۔ ذرا اس بچہ سے جو میرا شاگرد ہے بحث کرکے دیکھیں۔ مولوی عبید اللہ صاحب کو معلوم تھا کہ میں بانئ سلسلہ احمدیہ کا بیٹا ہوں۔ وہ تھے تو دیوبندی مگر ایک لمبے عرصہ تک مختلف پیروں کے مرید بھی رہ چکے تھے اور پیروں کا ادب ان کے دل میں بڑا تھا۔ استاذی المکرم کی بات سنکر کہنے لگے۔ ان سے میں بحث نہیں کرونگا۔ یہ تو مرزا صاحب کے بیٹے ہیں۔ معلوم نہیں اگر بحث ہو جاتی تو میں اس وقت کیا جواب دیتا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ بے شک اٰلِھَہ کامل القویٰ ہوتے ہیں لیکن ان کا کامل القویٰ ہونا ہی بتاتا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ مذکورہ بالا واقعہ تو سنہ ۹ء کا ہے۔ سنہ ۱۱ء میں میں ڈلہوزی گیا وہاں چرچ نے یورپین پادریوں کے آرام کے لئے کچھ کوٹھیاں بنائی ہوئی ہیں۔ پادری ینگسن صاحب جن کے ذریعہ سے سیالکوٹ میں عیسائیت مضبوط ہوئی ہے وہ وہاں سے بدل کر جنوبی ہند میں کسی جگہ پر مقرر ہوئے تھے اور گرمیاں گذارنے کے لئے ڈلہوزی آئے ہوئے تھے۔ وہ جوان سال بڈھا روزانہ شام کو اسلام کے خلاف پمفلٹ ہاتھ میں پکڑ کر بازار میں پھرتا تھا۔ اور مسلمانوں میں تقسیم کرتا تھا مسلمان بے عمل تو بہت ہیں مگر جوش میں بھی بہت جلد آجاتے ہیں خصوصًا اَن پڑھ طبقہ۔ چنانچہ ڈلہوزی اور ساتھ کی چھاؤنی بیلون میں بڑا شور پڑ گیا کہ اس پادری کے ساتھ کسی مسلمان عالم کی بحث کرانی چاہیئے۔ بیلون جو ڈلہوزی کے پاس چھاؤنی ہے اس کی جامع مسجد کے امام ایک کشمیری مولوی تھے اُن کو پتہ تھا کہ میں آیا ہُوا ہوں۔ جب لوگ اُن کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ مرزا صاحب کا بیٹا آیا ہُوا ہے اس کو مباحثہ کے لئے لے جاؤ۔ عیسائیوں سے مباحثہ قادیانی اچھا کرتے ہیں۔ میں تو ناتجربہ کار تھا مگر جب ایک وفد میرے پاس آیا تو مجھے اُن کی بات ماننی پڑی۔ اور میں نے مباحثہ کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کردی۔ ایک برات کی شکل میں ہم آٹھ نو آدمی پادری صاحب کی کوٹھی پہنچے۔ وہاں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ آپ بتائیں آپ ہیں کس مذہب کے میرے دل میں فورًا خدا تعالیٰ نے ڈال دیا کہ ان کا منشا یہ ہے کہ میرے سوالوں کو ٹلا دیں اور اسلام پر اعتراض شروع کردیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپکو اس سے کیا غرض ہے کہ میں کس مذہب کا ہوں آپ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ آپ مجھے تین خداؤں کی تھیوری سمجھادیں۔ اگر آپ کامیاب ہوگئے تو خواہ میں کسی مذہب کا پیرو ہُوا میں آپ کی بات مان لونگا۔ پہلے تو وہ ایچ پیچ کرتے رہے لیکن آخر انہیں میری بات ماننی پڑی۔ اور میں نے گفتگو یوں شروع کی کہ بتائیے خدا باپ کامل ہے یا ناقص اگر وہ ناقص ہے تو خدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح رُوح القدس کامل ہے یا ناقص۔ اگر وہ ناقص ہے تو وہ بھی خدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح تیسرا اقنوم بیٹا کامل خدا تھا یا ناقص خدا۔ اگر وہ ناقص تھا تو وہ بھی خدا نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے میری ان تینوں باتوں کو مان لیا۔ پھر میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا

خدا باپ کو اس زمین و آسمان کے پیدا کرنے کی طاقت کلّی طور پر حاصل تھی یا وہ کسی کی مدد کا محتاج تھا؛ اوپر کی بات سے ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج تھا۔ پھر مَیں نے یہ کہا کہ رُوح القدس اِس ساری کائنات کو پیدا کرنے پر کلّی طور پر قادر تھا یا کسی کی مدد کا محتاج تھا۔ انہوں نے کہا نہیں کلّی طور پر قادر تھا۔ پھر مَیں نے پُوچھا کہ کیا خدا بیٹا اِس کائنات کے پیدا کرنے پر کلّی طور پر قادر تھا یا کسی کی مدد کا محتاج تھا۔ انہوں نے پھر یہی کہا کہ وہ کلّی طور پر قادر تھا۔ مَیں نے کہا پادری صاحب پھر سوال حل ہو گیا۔ کہنے لگے کس طرح؟ مَیں نے ایک پنسل اُن کی میز سے اُٹھا کر اُن کے قریب رکھدی۔ اور مَیں نے کہا۔ پادری صاحب: اس پنسل کو اُٹھا کر دوسری جگہ رکھنے پر آپ قادر ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ پھر مَیں نے کہا۔ کیا مَیں قادر ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر مَیں نے ایک تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ کیا یہ صاحب قادر ہیں؟ پادری صاحب نے کہا۔ ہاں۔ مَیں نے کہا جب ہم تینوں شخص اپنی ذات میں اس پنسل کو ہلانے پر قادر ہیں لیکن پھر بھی ہم تینوں کھڑے ہو کر شور مچا دیں۔ کہ او بیرہ اِدھر آؤ او باورچی اِدھر آؤ۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوں تو ہم اُن سے کہیں کہ ہم تینوں سے مل کر یہ پنسل اِدھر رکھ دو تو بتائیے وہ ہمیں پاگل سمجھیں گے یا نہیں۔ پادری صاحب نے کہا۔ آپ کا مطلب؟ مَیں نے کہا صرف جواب دے دیجئے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں پاگل کہیں گے۔ مَیں نے کہا جب خدا باپ اور خدا بیٹا اور خدا روح القدس تینوں کائنات کے پیدا کرنے پر بذاتہٖ قادر ہیں اور اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو اس کام کے لئے بلاتے ہیں جس کو وہ اکیلے اکیلے کر سکتے ہیں تو بتائیے دوسرے خدا بُلانے والے خدا کو اور ہم لوگ اُس خدا کو پاگل کہیں گے یا نہیں۔ اور پاگل خدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یا تو پاگل کہلا کر وہ خدا نہ رہے گا یا ایسے پاگل دنیا میں وہ اودھم مچا دیں گے کہ دنیا ہی تباہ ہو جائے گی۔

یہی جواب سندھی مولوی صاحب کو دینا مناسب تھا۔ مگر اس وقت انہوں نے بحث کرنے سے انکار کر دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر خدا تعالےٰ کے سوا اور کوئی معبود ہیں یعنی کامل القوٰی ہستیاں موجود ہیں تو دنیا کے کام کو مل کر چلانا جبکہ اُن میں سے ہر ایک اس کام کو چلا سکتا ہے اُن کو پاگل ثابت کریگا۔ اور خدائی سے اُن کو جواب مل جائیگا۔ اور اگر خدائی سے جواب نہ ملیگا۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ پاگل دنیا کو تباہ کرکے رکھ دیں گے۔

پس یہ آیت بڑی سچی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ محض ادھوری منطق کے ذریعہ اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ

اِس آیت میں بتایا کہ اگر یہ لوگ عقل سے کام لیں تو ہماری اوپر کی دلیل اتنی مضبوط ہے۔ کہ ان کو ربّ العرش خدا یعنی دنیا پر حکمران خدا کے پاک ہونے اور ایک ہونے کا اقرار کرنا پڑے گا۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴿۲۴﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا

جو کچھ وہ کرتا ہے اسکے متعلق وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا۔حالانکہ وہ (لوگ) جوابدہ ہوتے ہیں ۔کیا انہوں نے اس کے سوا

مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ

معبود بنالئے ہیں ؟ تو کہہ دے ۔ اپنی دلیل لاؤ ۔ یہ (قرآن) تو اُن کے لئے بھی جو

مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا

میرے ساتھ ہیں شرف کا موجب ہے اور جو مجھ سے پہلے گذر چکے ہیں اُن کیلئے بھی شرف کا موجب ہے، لیکن اُن میں سے

يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۵﴾

اکثر حق کو پہچانتے نہیں اس لئے اُس سے اعراض کرتے ہیں ۱۸؎

۱۸؎ حل لغات :- ذِكْرٌ - اَلذِّكْرُ کے معنے ہیں اَلثَّنَاءُ. تعریف - اَلشَّرَفُ. شرف - اَلْكِتٰبُ فِيْهِ تَفْصِيْلُ الدِّيْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ - وہ کتاب جس میں دین کی تفصیلات ہوں اور مذہب کے اصول ہوں - اور جب اَلذِّكْرُ مِنَ الْقَوْلِ کہیں تو معنے ہونگے اَلصُّلْبُ الْمَتِيْنُ مضبوط اور ٹھوس بات - (اقرب)

تفسیر :- اللہ تعالیٰ چونکہ واحد مالک ہے کوئی دوسرا شخص اس سے جواب طلبی کا حقدار نہیں۔لیکن تمام کے تمام کسی نہ کسی کے سامنے جواب دینے کے ذمہ وار ہوتے ہیں۔پس اُن کا کمزور اور ناقص ہونا ثابت ہے۔ویسے ناقص العقل اور ناقص القویٰ لوگوں کا خدا کے سوا معبود قرار دینا خود ہی ایک ہنسی کی بات ہے ان کی بات تو ماننے کے قابل ہی نہیں ۔اُن کی بات تبھی صحیح ہو سکتی ہے جب خدا اس کا گواہ ہو۔لیکن یہ خدا کی گواہی کبھی پیش نہیں کر سکتے ۔پھر فرماتا ہے کہ اس قرآن کو دیکھو ۔ یہ محمد رسول اللہ کے زمانہ کے مومن لوگوں کے شرف کا بھی اظہار کرتا ہے اور جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے زمانہ کے لوگ تھے اُن کے شرف کو بھی ظاہر کرتا ہے ۔اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کے اتباع عظیم الشان شرف کے مالک نہ ہوتے تو یہ کبھی پہلے زمانہ کے نبیوں اور اُن کے متبعین کے شرف کا اظہار نہ کرتا ۔جیسا کہ قرآن میں آتا ہے :- وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع ۳) کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی نبی نہ آیا ہو ۔ قرآن مسیح کی طرح نہیں ہے جو کہتا ہے کہ جتنے مجھ سے پہلے آئے سب چور اور ڈاکو ہیں (یوحنا باب ۱۰ آیت ۸) کیونکہ مسیح اپنے اور اپنے حواریوں میں کوئی ایسی عملی اور ظاہر خوبی پیش نہیں کر سکتا تھا جس کی بنا پر وہ پہلے لوگوں پر اپنی فضیلت ثابت کر سکے ۔پس اپنی اور اپنے ساتھیوں کی عزت ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس یہی چارہ کار تھا کہ وہ موسیٰ اور یرمیاہ اور حزقیل اور الیاس کو چور اور بٹمار کہتا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ پہلے نبی چور اور بٹمار تھے اور عیسیٰ اور اس کے ساتھی چور اور بٹمار نہیں۔ اس لئے اُن سے بہتر ہیں ۔مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

ذِكْرٌ

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ

اور ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں ہم اُن میں سے ہر ایک کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ

اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۶﴾

حقیقت یہ ہے کہ مَیں ایک ہی خدا ہوں۔ پس (صرف) میری عبادت کرو ۱۹ھ

نے بجائے پہلے نبیوں کو چور اور بٹ مار کہنے کے اُنکو اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا مالک قرار دیا۔ اور اُن کے خدا رسیدہ ہونے اور خدا کے محبوب ہونے کا اقرار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب تک آپ اُن سے زیادہ اخلاق ظاہر نہ کرتے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا زیادہ محبوب ثابت نہ کرتے آپ اپنے دعویٰ کو ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ پس قرآن کا طریقِ استدلال نہ صرف مشکل ہے بلکہ اعلیٰ ہے۔ عیسائیت نے آسان راستہ اختیار کیا۔ مگر انجیل اور قرآن میں یہ فرق ہے کہ انجیل نے کہا مسیحؑ چوروں سے اچھا ہے کیونکہ پہلے نبی چور تھے۔ اور قرآن نے کہا کہ محمد رسول اللہ خدا کے گزرے ہوئے محبوبوں سے بھی زیادہ اس کا محبوب ہے اور اعلیٰ کردار والے لوگوں سے بھی زیادہ اعلیٰ کردار کا آدمی ہے۔ پس قرآن نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چوروں کا سردار ہے بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ بزرگوں اور محبوبانِ الٰہی کا سردار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ چوروں کے سردار سے محبوبانِ الٰہی کا سردار یقیناً بڑا ہوگا۔ اور اسی طرح وہ شخص جو پہلے نبیوں کو چور اور ڈاکو قرار دیتا ہے (یوحنا باب ۱۰ آیت ۸) اس سے وہ شخص اعلیٰ ہوگا جو پہلے نبیوں کی فضیلت کو تسلیم کر کے ان پر اپنی فضیلت ثابت کرتا ہے فصلی اللہ علیہ وسلم مگر فرماتا ہے بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ قرآن اور اسلام کی فضیلت کا معاملہ تو بالکل صاف تھا۔ لیکن جو لوگ حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرتے وہ اعراض سے کام لے رہے ہیں۔

۱۹ھ تفسیر یعنی اے محمد رسول اللہ! تجھ سے پہلے رسول بھی سب انسان ہی تھے۔ اگر تُو انسان ہے تو اس میں تیری کوئی ہتک نہیں اور سوائے انسان کے وہ پہلے رسول کچھ بھی ہو نہیں سکتے تھے کیونکہ خدا صرف ایک ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ سب انبیاء کا مشترکہ مشن اشاعتِ توحید تھا خواہ کوئی نبی ہندوستان میں پیدا ہوا ہو۔ جو کسی زمانہ میں شرک و بت پرستی کا گھر تھا۔ یا مصر میں پیدا ہوا ہو جہاں ایک انسان کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ یا ایران میں پیدا ہوا ہو جو آتش پرستوں کا مرکز تھا۔ یا کسدیوں کے اُور میں پیدا ہوا ہو جو بتوں سے اَٹا پڑا تھا یا مکہ مکرمہ میں ظاہر ہوا ہو جہاں کے رہنے والوں نے خدا کے گھر کو بھی بتوں سے خالی نہیں رکھا تھا۔ مگر بڑے سے بڑے نبیوں کی زندگیوں کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیوں سے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ آپ نے جس رنگ میں شرک کی بیخ کنی کی ہے اور توحید کو روئے زمین پر پھیلانے میں جس جانفشانی اور قربانی سے کام کیا ہے اس کی نظیر دُنیا کے اور کسی نبی کی زندگی میں نظر نہیں آسکتی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اُسوقت توحید دُنیا سے بالکل مٹ چکی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی

لکھا ہے کہ اُسوقت دنیا میں بڑی خرابی پیدا ہو چکی تھی اور عیسائیوں کی کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اُسوقت شرک پھیل چکا تھا۔ بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت اور ترقی کی وجہ ہی یہی ہوئی کہ عیسائی قوم بگڑ چکی تھی۔ اور عیسائیوں نے اسلام کی توحید کو دیکھ کر اُسے قبول کر لیا۔ یہی بات زرتشتی کہتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں چونکہ زرتشتی لوگ توحید کو چھوڑ چکے تھے۔ انہیں مسلمانوں کی پیش کردہ توحید پسند آگئی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ غرض سب مذاہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس وقت شرک پھیل چکا تھا۔ اور دنیا میں توحید باقی نہیں رہی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس زمانہ میں پیدا ہو کر اور پھر ایسے مقام میں پیدا ہو کر جو توحید سے بالکل ناواقف تھا اور پھر ایسی قوم میں پیدا ہو کر جس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ اور جو نہ وید کو الہامی مانتی تھی نہ تورات کو نہ انجیل کو الہامی مانتی تھی نہ ژند اوستا کو۔ توحید کو ایسے کامل اور ایسے اعلیٰ رنگ میں پیش کیا کہ آج آپ کے مخالف بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے دنیا کو صرف یہ نہیں کہا کہ توحید کو مان لو بلکہ یہ بھی بتایا کہ کس طرح مانو۔ اسی طرح آپ نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ شرک نہ کرو۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ شرک سے کس طرح بچو۔ پھر آپ نے صرف یہ نہیں کہا کہ توحید کو مان لو بلکہ توحید کے دلائل دے کر کہا کہ اسے مانو اسی طرح آپ نے صرف یہی نہیں کہا کہ شرک نہ کرو بلکہ دلائل اور براہین سے شرک کی بُرائی سمجھا کر اس سے نفرت پیدا کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ شرک کی تردید کرتے ہوئے نہایت لطیف پیرایہ میں فرماتا ہے:۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ اس چھوٹی سی سورۃ میں جو سورۂ اخلاص کے نام سے موسوم ہے اللہ تعالیٰ نے چار اقسام کا شرک پیش کر کے اس کا ردّ کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ تم خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق مختلف خیالات میں مبتلا ہو اور قسم قسم کی تصویریاں ایجاد کرتے ہو طرح طرح کے فلسفے اور نکتے نکالتے ہو اور خدا تعالیٰ کے متعلق مختلف تصوّرات قائم کرتے ہو لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق جو یقینی بات ہے اس کا نقطۂ مرکزی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر رنگ میں اور ہر طرح ایک ہی ہے۔ نہ وہ کسی کی ابتدائی کڑی ہے اور نہ آخری سرا۔ نہ کسی کے مشابہ ہے اور نہ کوئی اُسکے مشابہ اس لئے اگر خدا تعالیٰ جیسی کوئی اور ذات قرار دو گے تو تم اس کی احدیّت پر حملہ کرنے والے سمجھے جاؤ گے۔

پھر شرک کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ صفات کے لحاظ سے کسی کو خدا کا شریک قرار دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ الصَّمَدُ کہہ کر اس کی تردید کی اور بتایا کہ صمدیّت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہی پائی جاتی ہے اس لئے اس کے دروازہ سے بھٹکنا کسی انسان کیلئے فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ تم دنیا میں جس کو بھی اپنا حاجت روا سمجھو گے وہ میرا ہی محتاج ہوگا۔ اس لئے تم چشمہ کو چھوڑ کر گاس کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہو۔

پھر فرمایا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ خدا تعالیٰ کے متعلق یہ بھی یاد رکھو کہ وہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ نہ اُس نے کسی کو جنا ہے کہ اُسکا بیٹا اس کا قائم مقام ہو سکے اور نہ اس کا کوئی باپ ہے کہ جس سے اُس نے ورثہ میں طاقتیں حاصل کی ہوں۔ گویا خدا پہلے بھی صمد تھا اب بھی صمد ہے اور آئندہ بھی وہی صمد ہوگا۔ اس لئے تمہیں اُسی سے مدد مانگنا اپنا شعار بنانا چاہیئے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ کسی مخلوق میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کا کفو یعنی اسکی شریک ہو سکے۔ خدا تعالیٰ کی شان اتنی بلند ہے اور اس کا مقام اتنا ارفع ہے کہ انسان خواہ کتنا اونچا چلا جائے وہ اس کا عبد ہی رہے گا۔ اور ہمیشہ اس کی مدد کا محتاج ہوگا۔

یہ وہ توحید ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے اور جس کے بغیر اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی انسان کو تقدس حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر توحید پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (بقرہ ع ۳۴)

ان آیات میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اپنی ذات میں ہمیشہ زندہ رہنے والا اور دوسروں کو بھی زندہ رکھنے والا ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ اُسے نہ کبھی اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ گویا اس کے کاموں میں کبھی کوئی وقفہ نہیں پڑا۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کے قبضہ و تصرّف میں ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ کون ہے جو بغیر اس کے اذن کے اُس کے حضور کسی کی شفاعت کر سکے۔ بے شک خدا تعالےٰ نے دُعائیں قبول کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے مگر کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ وہ اپنے زور سے خدا تعالےٰ سے کوئی بات منوا سکتا ہے۔ خدا خود کسی کی شفاعت کے متعلق اجازت دے تو انسان کچھ مانگ سکتا ہے ورنہ نہیں یَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ جانتا ہے جو ہو چکا اور جو آئندہ ہوگا۔ گویا توحید کے لئے علم کامل ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ علم کامل کے بغیر تصرّف کامل نہیں ہو سکتا۔ پس خدا تعالیٰ کے متعلق علم کامل کا ماننا ضروری ہے۔ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ اور دنیا میں کوئی انسان خدا تعالےٰ کے دیئے ہوئے علم کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ پس انسان کو ہمیشہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ اُسے حاصل ہونا ہے خدا تعالیٰ سے ہی حاصل ہونا ہے۔ پھر فرماتا ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ اُس کی کرسی ساری زمین اور آسمانوں پر چھائی ہوئی ہے۔ یعنی ہر ذرّہ جو حرکت کرتا ہے خدا تعالےٰ کے تصرّف کے ماتحت کرتا ہے۔ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا اور زمین و آسمان کی حفاظت میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ جاری رہے گی۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ مگر باوجود اس کے کہ دنیا کے ذرّہ ذرّہ سے اس کی قدرت ظاہر ہو رہی ہے وہ اتنا بلند ہے کہ کوئی شخص اُس کی کُنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ العظیم بھی ہے یعنی اپنی قدرتوں کے ظہور سے اتنا روشن ہے کہ ہر شخص جو کوشش کرے اُسے پا سکتا ہے اور اس کا وصال حاصل کر سکتا ہے۔

غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو بتایا کہ توحید کامل یہ ہے کہ خدا تعالےٰ سے کامل اتحاد اور وصال حاصل ہو جائے۔ جب کوئی شخص خدا تعالےٰ کو پالے تو اُسوقت یہ کہا جا سکتا ہے

کہ اُس نے اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لیا۔

یہ وہ توحید ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔ اور بتایا کہ تمہاری کامیابی اسی میں ہے کہ تمہارا اِسی دنیا میں خدا سے وصال ہو جائے اور سوائے خدا کے تمہاری نگاہ اور کسی وجود پر نہ پڑے۔ دنیا نے آپ کے اس پیغام کا انکار کیا اور بڑی سختی سے آپ کا مقابلہ کیا۔ آپ کو بڑی بڑی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور بڑی بڑی رکاوٹیں آپ کے مقصد میں حائل کی گئیں۔ مگر آپ نے خدائے واحد کے نام کی بلندی کے لئے ہر مصیبت کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور ہر دکھ کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور کسی نازک سے نازک موقع پر بھی مداہنت یا نفاق کو برداشت نہیں کیا۔ اُحد کی جنگ میں جب بعض مسلمانوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی اور کفار نے پیچھے سے حملہ کر کے مسلمانوں کو تتر بتر کر دیا بلکہ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دشمن کے دباؤ کی وجہ سے ایک گڑھے میں گر گئے اور لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو اُس وقت مسلمانوں کی یہ کیفیت تھی کہ زمین و آسمان اُن کے لئے تنگ ہو گئے۔ مگر جلدی ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ نے آپکو لاشوں کے نیچے سے نکالا۔ اور جوں جوں مسلمانوں کو علم ہوتا گیا وہ آپ کے گرد جمع ہوتے گئے مگر پھر بھی اُن کی تعداد تھوڑی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو ساتھ لے کر پہاڑ کے ایک دامن میں چلے گئے۔ اُس وقت ابوسفیان نے بڑے تکبر سے آواز دی کہ مسلمانو! کہاں ہے تمہارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے اُسے مار دیا ہے۔ صحابہؓ جواب دینا چاہتے تھے مگر آپ نے روک دیا۔ ابوسفیان نے پھر آواز دی اور کہا۔ کہاں ہے ابوبکرؓ؟ صحابہؓ پھر جواب دینا چاہتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی روک دیا۔ پھر اُس نے بڑے جوش سے کہا۔ کہاں ہے عمرؓ؟ حضرت عمرؓ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں تمہارا سر توڑنے کیلئے یہاں موجود ہوں۔ مگر آپ نے فرمایا۔ مت بولو۔ دراصل ابوسفیان کی غرض یہ تھی کہ وہ پتہ لگائے کہ کون کون زندہ ہے اور کون کون نہیں۔ آج کل بھی جنگ میں ایسی خبریں مشہور کر دی جاتی ہیں جن کی اصل غرض صرف اطلاع حاصل کرنا ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور کر دیا جاتا ہے کہ فلاں جرنیل پکڑا گیا ہے یا فلاں جہاز ڈوب گیا ہے۔ اور جس حکومت کا وہ جرنیل یا جہاز ہوتا ہے خاموش رہتی ہے تردید نہیں کرتی تاکہ دشمن کو معلومات حاصل نہ ہوں۔ یہی غرض ابوسفیان کی بھی تھی۔ مگر جب مسلمانوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے سمجھ لیا کہ یہ تینوں مسلمان لیڈر مارے گئے ہیں۔ اِس پر اُس نے بڑے زور سے اپنا مشرکانہ نعرہ بلند کیا اور کہا اُعْلُ ھُبَلْ اُعْلُ ھُبَلْ۔ یعنی ہمارا ھُبَل دیوتا بڑی شان والا ہے اِس لئے اُس نے مسلمانوں کو شکست دیدی ہے۔ چونکہ صحابہؓ کو بار بار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ خاموش رہو۔ اس لئے اس مشرکانہ نعرہ پر بھی وہ خاموش رہے۔ اِس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے جوش سے صحابہؓ سے کہا۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم کیا کہیں۔ آپ نے فرمایا کہو۔ اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ یعنی تمہارے ھُبَل کی کیا حقیقت ہے اللہ تعالیٰ ہی بلند اور سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ اب دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی اور اپنے صحابہؓ کی موت کا اعلان تو برداشت کر لیا

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط

اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ رحمٰن (خدا) نے بیٹا بنا لیا ہے (ان کی بات درست نہیں) وہ تو ہر کمزوری سے پاک ہے۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

حقیقت یہ ہے کہ (جنکو یہ بیٹا کہتے ہیں) وہ خدا کے کچھ بندے ہیں جنکو (خدا کی طرف سے) عزت ملی ہے۔ ۲۰

مگر جب خدا تعالیٰ کا نام آیا تو اُس وقت آپنے اس بات کی کوئی پروا نہ کی کہ ہم تھوڑے ہیں۔ اگر دشمن کو پتہ لگ گیا تو وہ حملہ کرکے نقصان پہنچا دیگا بلکہ آپنے صحابہؓ سے فرمایا۔ کہ جواب دو۔ تمہارا ھُبَل ہمارے خدا کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔

پھر اس واقعہ پر غور کرو کہ بڑے بڑے رؤسا اکٹھے ہو کر ابوطالب کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو سمجھا لو۔ ورنہ ہم تمہیں بھی اپنی سرداری سے الگ کر دینگے۔ اس پر ابوطالب آپ کو بلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بتوں کے بارہ میں کچھ نرمی اختیار کریں۔ مگر آپ فرماتے ہیں۔ اے چچا! اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں۔ تب بھی میں خدا تعالیٰ کی توحید کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کو اپنی قوم عزیز ہے تو بیشک مجھے چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے مل جائیں میرے لئے میرا خدا کافی ہے۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپکے دل میں سوائے اس کے اور کوئی خواہش نہیں تھی کہ شرک مٹ جائے اور خدا تعالیٰ کی توحید دنیا میں پھیل جائے۔

پھر حدیثوں میں آتا ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ گھبراہٹ میں کبھی اس پہلو پر جھکتے تھے اور کبھی اُس پہلو پر اور فرماتے کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کے مرنے کے بعد اُن کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ یہ آپ کی آخری وصیّت تھی جو آپ نے اپنی امت کو کی اور انہیں کھلے الفاظ میں انتباہ کیا کہ دیکھنا میرے بندے ہونے کو کبھی نہ بھول جانا اور میری قبر کو ایک قبر سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھنا۔ باقی اُمتیں بے شک اپنے نبیوں کی قبروں پر سجدے کریں یا اُن کی قبروں پر چڑھاوے چڑھائیں تمہارا کام یہی ہونا چاہیئے کہ تم خدائے واحد کے آستانہ پر جھکو اور اس کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھو۔

پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر غرغرۂ موت کے وقت جو آخری الفاظ جاری ہوئے وہ بھی یہی تھے کہ اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى۔ اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى یعنی اب عرش معلیٰ پر بیٹھنے والے مہربان دوست کی طرف جاتا ہوں۔ یہ آخری الفاظ تھے جس کے بعد آپ کی رُوح جسد اطہر سے پرواز کر گئی۔ اور آپ اپنے خدا کے حضور جا پہنچے۔

غرض ایک ایک قدم اور ایک ایک سانس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس رنگ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کے جلال کا اظہار کیا ہے اور جس طرح اپنے عشق اور محبت کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دنیا کے اور کسی نبی میں دکھائی نہیں دیتی۔

۲۰ حل لغات

:- سُبْحَانَهٗ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ کے معنے ہیں اُبَرِّئُ اللّٰهَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَةً۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ہر بُرائی سے براءت کرتا ہوں (اقرب) پس سُبْحٰنَهٗ کے معنے ہونگے میں اللہ تعالیٰ کو لڑکا بنانے سے پاک قرار دیتا ہوں۔

سُبْحٰنَهٗ ۲

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

وہ خدا کی بات سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں کہتے - اور وہ اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں ۲۱

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ

وہ (یعنی خدا) اس کو بھی جانتا ہے جو ابھی آئندہ پیش آنیوالا ہے اور جو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور وہ سوائے اس کے جس کیلئے خدا نے

اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۹﴾

یہ بات پسند کی ہو کسی کے لئے شفاعت نہیں کرتے (یعنی معبودان باطلہ) اور وہ اس کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں ۲۲

تفسیر:- فرماتا ہے - یہ لوگ جھوٹ بول کر کہتے ہیں کہ رحمٰن خدا نے اپنا ایک بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ سب پہلے نبیوں کے حالات پر غور کر کے دیکھ لو - وہ یہی کہتے تھے کہ ہم بندے ہیں - مگر تُو خدا نے ہم کو عزت بخشی ہے - چنانچہ مسیحؑ جس کو خدا کا بیٹا قرار دیا گیا ہے ہمیشہ اپنے آپکو ابن آدم کہتا رہا - اب جو شخص خدا کا بیٹا تھا اگر وہ اپنے آپ کو ابن آدم کہتا تھا تو کیا نعوذ باللہ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اپنے باپ کے سوا اپنے آپ کو دوسرے کی طرف منسوب کرتا تھا - یہ کتنا بڑا الزام ہے - جو عیسائی لوگ خدا تعالےٰ کے ایک معزز بندہ پر لگاتے ہیں -

۲۱ حل لغات :-

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ - سَبَقَ سے مضارع منفی کا جمع کا صیغہ ہے - اور سَبَقَهٗ کے معنے ہوتے ہیں تَقَدَّمَهٗ وَ جَازَهٗ وَ خَلَّفَهٗ - اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کو پیچھے چھوڑ دیا (اقرب) پس لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ کے معنے ہونگے - وہ خدا کی بات سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں کہتے -

تفسیر:- یعنی خدا تعالےٰ کے نیک بندے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو خدا نے اُن سے نہ کہی ہو - اور ہمیشہ خدا تعالےٰ کے فرماں بردار رہتے ہیں - پھر وہ خدا کس طرح ہو سکتے ہیں -

۲۲ حل لغات :-

مُشْفِقُوْنَ - اَشْفَقَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور اَشْفَقَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں خَافَ وَ حَاذَرَ - اس سے ڈرا (اقرب) پس مُشْفِقُوْنَ کے معنے ہونگے ڈرنے والے -

تفسیر:- فرماتا ہے - اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام حالات سے واقف ہے - جو کام انہوں نے کرنے ہیں ان سے بھی واقف ہے اور جو رہ گئے اُن سے بھی واقف ہے اور ان کو بغیر قید کے شفاعت کا حق نہیں جس کے حق میں خدا اجازت دے اُسی کے حق میں شفاعت ہو سکتی ہے - پس بخشش بہر حال خدا کے ہاتھ میں ہی رہی - بائیبل میں بھی لکھا ہے :-

> " اگر ایک آدمی دوسرے کا گناہ کرے تو خدا اس کا انصاف کریگا - لیکن اگر آدمی خداوندی گناہ کرے تو اس کی شفاعت کون کریگا - "
>
> (۱ سموئیل باب ۲ آیت ۲۵)

یرمیاہ باب ۷ آیت ۱۶ میں بھی آتا ہے :-

> " تو اِن لوگوں کے لئے دُعا نہ کر - اور ان کے واسطے آواز بلند نہ کر - اور

مُشْفِقُوْنَ

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ

اور جو بھی اُن میں سے یہ کہے کہ مَیں خدا کے سوا معبود ہوں - ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے

نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۳۰) ع ۲ ۴

اور ہم ظالموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں - ۲۳

مجھ سے منت اور شفاعت نہ کر کیونکہ میں تیری نہ سنونگا - "

پس بخشش کسی انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ صرف خدا تعالےٰ کے اختیار میں ہے -

۲۳ تفسیر - فرماتا ہے کہ انسان کے لئے خدائی کا دعویٰ اتنا باطل ہے کہ جہاں افترا اور تکذیب کی سزا اس دنیا میں بھی دی جاتی ہے وہاں خدائی کے دعویٰ کی سزا اس دنیا میں نہیں دی جاتی بلکہ اگلے جہان میں دی جاتی ہے - اور فرماتا ہے کہ اس قسم کے ظالموں کو ہم اس طرح سزا دیا کرتے ہیں یعنی اگلے جہان میں - اس آیت میں جواب ہے اُن لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ فلاں شخص الوہیت کا مدعی تھا - مگر پھر اُسے دنیا میں کیوں سزا نہ ملی - نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق اِسی جہان میں سزا کا وعدہ ہے - جیساکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے - لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ - لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (حاقہ ع ۲) یعنی اگر یہ رسول ہم پر افترا کرتا اور کوئی بات اپنی طرف سے بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اس کو داہنے ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگِ جان کاٹ دیتے یعنی اسکو تباہ کر دیتے لیکن خدائی کا دعویٰ کرنے والے کے متعلق فرماتا ہے فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ - اُس کو اس دنیا میں سزا دینے کی ضرورت نہیں اُسکو ہم اگلے جہان میں جہنم میں ڈالیں گے - اِس میں حکمت یہ ہے کہ جھوٹا نبی چونکہ سچے نبیوں کی طرح انسان ہی ہوتا ہے لوگوں کو شبہ پڑ سکتا ہے کہ کہیں یہ سچا نہ ہو - اس لئے اُس کو فوراً سزا دینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لوگوں پر حق کھل جائے لیکن خدائی کا دعویٰ کرنے والا کھاتا پیتا اور سوتا ہے جو خدائی کے منافی ہے اس لئے اُس کے دعویٰ سے دھوکا کوئی اُلّو ہی کھا سکتا ہے - پس اُس کا فریب کھولنے کے لئے دنیا میں سزا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی - اگلے جہان کی سزا ہی کافی ہے - یہی وجہ ہے کہ بہاء اللہ وغیرہ جو خدائی کے مدعی تھے اُن کو اس دنیا میں سزا نہیں ملی - آخرت میں ملے گی کیونکہ اُن کے خدائی کے دعویٰ کا جھوٹ ہونا بالبداہت ظاہر تھا - ہے تو ذیل کا واقعہ لطیفہ لیکن چونکہ اس سے حقیقت روشن ہو جاتی ہے - مَیں اس کو بیان کر دیتا ہوں -

کہتے ہیں کسی سائیں فقیر نے خدائی کا دعویٰ کیا - چند چیلے بنائے جو ہر وقت اس کے گرد بیٹھے رہتے تھے - باری باری شہر میں جاکر بھیک مانگ لاتے تھے اور خدا صاحب اور اُن کے چیلے خوب پُرلطف غذائیں اُڑاتے تھے - ایک مومن زمیندار ہمسایہ میں رہتا تھا اُس کو غصہ چڑھتا تھا - مگر مشٹنڈے چیلوں کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتا تھا - اور ہر وقت موقعہ کی انتظار میں رہتا تھا - ایک دن شاید مانگنے کا پروگرام دُور کا تھا - اس لئے سارے چیلے اکٹھے اپنے خدا کو اکیلا چھوڑ کر

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا

کیا کفار نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے - پس ہم نے اُن کو

فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا

کھول دیا - اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا - پس کیا وہ ایمان

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ

نہیں لاتے ، ۵۲۴ اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے - تا ایسا نہ ہو کہ وہ (یعنی زمین) اُن (یعنی اہل زمین) سمیت شدید

مانگنے کیلئے چلے گئے۔ زمیندار کو موقعہ ہاتھ آیا۔ بڑے ادب سے جاکر اُس فقیر کے آگے جاکر بیٹھ گیا۔ اور اٹھ کر اس کی گردن پکڑلی اور زور سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور کہا۔ میرے باپ کو تُونے مارا تھا۔ آج میرے قابو آیا ہے۔ پھر کہا۔ میری ماں کو تُونے مارا تھا۔ پھر ایک اور تھپڑ مارا۔ پھر کہا میرے فلاں بیٹے کو تُونے مارا تھا اور زور سے ایک اور تھپڑ مارا پھر ایک اور بیٹے کا نام لیا اور کہا۔ میرے اُس بیٹے کو بھی تُونے مارا تھا اور ایک اور تھپڑ مارا۔ اسی طرح سب رشتہ داروں اور دوستوں کا نام لیتا گیا اور ہر ایک کا نام لے کر ایسے زور سے تھپڑ مارتا تھا کہ آواز گونج جاتی تھی۔ اور کہتا جاتا تھا کہ مَیں تو بیس سال سے تیرا منتظر تھا۔ آج تُو میرے قابو چڑھا ہے۔ مَیں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ آخر ڈر کر خدا کے مدعی فقیر نے گھٹنے ٹیک دئے اور بولا۔ میری توبہ۔ مَیں کوئی خدا نہیں۔ اَب دیکھو خدائی کے دعویٰ کا پول کتنی جلدی کھل گیا۔ اگر صرف نبوت کا دعویٰ ہوتا تو ہر تھپڑ پر کہتا مَیں تو آدمی مول ہوں۔ مَیں نے تیرے رشتہ داروں کو کس طرح مارنا تھا۔ وہ تو خدا نے مارے ہیں۔ بلکہ کہتا کہ پہلے نبیوں کو بھی لوگوں نے دکھ دئے ہیں تو مجھے دُکھ دے کر میری نبوت ثابت کررہا ہے۔

پس حقیقت یہ ہے کہ جھوٹے مدعیٔ رسالت کے جھوٹ کو خدا ہی ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے آسمانی نشانوں سے اُسے تباہ کیا جاتا ہے اور بہت جلد تباہ کیا جاتا ہے لیکن جھوٹے مدعیٔ الوہیت کو آسمانی نشانوں سے تباہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر روز جب وہ کھانا کھاتا ہے۔ ہر روز جب وہ پانی پیتا ہے تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ خدا نہیں۔ ہر روز جب وہ سوتا ہے پاخانہ پیشاب کو جاتا ہے تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ خدا نہیں جب وہ شادی کرتا ہے اور بچہ ہوجاتا ہے۔ تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ خدا نہیں۔ اس کے زمانہ میں کوئی اُلّو یا گدھا ہی اس کو خدا مان سکتا ہے۔ جیسا کہ بہاء اللہ کے اتباع۔ لیکن اس کی موت کے بعد اُس کی تعلیم یا اس کے آنے والے مامور اس کی خدائی کا پردہ چاک کردیتے ہیں۔ جیسے مسیحؑ کے اپنے اقوال اور تاریخ اس کی خدائی کا پردہ چاک کررہے ہیں۔

۵۲۴ حل لغات :- رَتْقًا :- رَتَقَهٗ رَتْقًا کے معنے ہیں سَدَّهٗ وَاَغْلَقَهٗ۔ اسکو بند کردیا (اقرب) اسی طرح یہ لفظ فَتْقٌ کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے اور فَتَقَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں۔ شَقَّهٗ کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ اور فَتَقَ الثَّوْبَ کے

رَتْقًا ۲

وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۲﴾

زلزلہ میں مبتلا ہو جائے۔ اور ہم نے زمین میں کھلے کھلے راستے بھی بنائے تاکہ یہ لوگ انکے ذریعہ (مختلف مقامات تک) پہنچیں ۲۵ھ

معنے ہوتے ہیں نَقَضَ نَحْبًا طَتَهٗ حَتّٰی فَصَلَ بَعْضَهٗ مِنْ بَعْضٍ کہ کپڑے کی سیون کو کھول دیا اور وہ علیحدہ ہو کر مختلف حصے ہو گیا (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلرَّتْقُ اَلضَّمُّ وَ الْاِلْتِحَامُ۔ یعنی رَتْقٌ کے معنے ملنے اور اکٹھے ہونے کے ہیں۔ اور کَانَتَا رَتْقًا کے معنے ہیں۔ مُنْضَمَّتَيْنِ۔ دونوں ملے ہوئے تھے۔ (مفردات)

تفسیر: - فرماتا ہے۔ کیا ان کافروں کو معلوم نہیں کہ آسمان اور زمین جُڑے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو چیر کر الگ کر دیا۔ اس میں پیدائش عالم کی ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جو اس صدی سے پہلے لوگوں کو معلوم نہیں تھی اور وہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی کرۂ فلکی تیار ہوتا ہے تو اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ذرات کا ایک وسیع ڈھیر فضا میں جمع ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب اس کے درمیان ذرات کچھ زیادہ سمٹ جاتے ہیں تو وہ چکر کھانے لگ جاتے ہیں اور اُن کے اردگرد کا مادہ دھکا کھا کر دُور جا پڑتا ہے۔ اسی طرح پیدا ہونے والے نظام ہائے فلکی میں سے ایک نظامِ شمسی ہے جس میں ہمارا کرۂ ارض واقع ہے۔ نظامِ شمسی کے عالمِ وجود میں آنے کے متعلق جتنے بھی نظریات سائنسدانوں نے آج تک پیش کئے ہیں اُن میں کم و بیش اس حقیقت کا اقرار موجود ہے کہ کرۂ ارض اپنی موجودہ شکل سے پہلے سورج یا سورج جیسے ایک ستارے کا حصہ تھا۔ تازہ ترین نظریہ جس کی تصریح فریڈ ہائل (کیمبرج یونیورسٹی) نے کی ہے یہ ہے کہ یہ ستارہ ہمارے سورج کا ہمراہی ایک SUPER NOVA تھا اور اس کے پھٹنے سے سیارے عالمِ وجود میں آئے حتّٰی کہ زمین ایک علیحدہ وجود کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ زمین میں سے بعد میں پانی کے بخارات پیدا ہوئے اور پانی کے وجود سے آگے زندگی کا وجود پیدا ہوا۔ (دی نیچر آف دی یونیورس" مصنفہ فریڈ ہائل ص۱۹ تا ص۹۰ و "دی یونیورسٹی سروے" مصنفہ ہیرالڈ رچرڈس ص۹۴ تا ص۱۰۹)

اللہ تعالیٰ انہی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا اس نظارہ کو دیکھ کر یہ ایمان نہیں لاتے آخر دنیا کیوں بار بار پیدا کی جا رہی ہے۔ کیوں زندگی پیدا کرنے کے لئے بادلوں سے پانی اتارا جاتا ہے۔ دنیا کا بار بار پیدا کرنا اور بادلوں سے متواتر پانی کا اترنا اور اس سے زندگی کا پیدا ہونا بتاتا ہے کہ یہ دنیا بلاوجہ نہیں پیدا ہوئی۔ اس کو کسی بڑی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس غرض کو پورا کرنے کے لئے روحانی پانی کا آسمان سے اُترتے رہنا بھی ضروری ہے تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اپنی روحانی زندگی کے لئے اس سے سامان حاصل کرتے رہیں۔

۲۵ھ حل لغات: - رَوَاسِيَ کے معنے ہیں اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ۔ مضبوط پہاڑ (اقرب)

تَمِيْدُ مَادَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور مَادَ الشَّيْءُ يَمِيْدُ کے معنے ہیں تَحَرَّكَ وَ زَاغَ اُس نے حرکت کی اور ٹیڑھا ہو گیا۔ اور مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں دَارَتْ۔ زمین نے اس کے سمیت چکر کھایا۔ (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلْمَيْدُ اِضْطِرَابُ الشَّيْءِ الْعَظِيْمِ یعنی بڑی چیز کا حرکت کرنا اور ہلنا مَيْد کہلاتا ہے۔ جیسے زمین بعض اوقات ہلتی ہے۔

۲ رَوَاسِيَ
۲ تَمِيْدُ

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَهُمْ عَنْ

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت (یعنی حفاظت کا ذریعہ) بنایا ہے اور پھر بھی وہ اس کے نشانوں (یعنی آسمانی ظاہر ہونیوالے

اسی طرح بعض ماہرین لغت کہتے ہیں کہ مَادَنِي يَمِيْدُنِي اور اس کے معنے ہوتے ہیں اَطْعَمَنِيْ یعنی مجھے کھانا کھلایا (مفردات)

فِجَاجٌ : اَلْفَجُّ کی جمع ہے اور اَلْفَجُّ کے معنے ہیں اَلطَّرِيْقُ الْوَاسِعُ الْوَاضِحُ بَيْنَ الْجَبَلَيْنِ ۔ دو پہاڑوں کے درمیان کا کھلا اور واضح راستہ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے ۔ ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے ہیں تاکہ وہ انسانوں سمیت تہ و بالا نہ ہو جائے ۔ یعنی پہاڑوں کی غرض یہ ہے کہ زمین اپنی تمکنت کی حالت پر قائم رہے کیونکہ علم طبقات الارض سے ثابت ہے کہ زمین اندر سے اب تک بھی گرم ہے ۔ لیکن شروع پیدائش میں زیادہ گرم تھی ۔ یعنی تغیرات کے نتیجہ میں جب زمین کی گرمی نے اندر کی چھپی ہوئی چٹانوں کو گلا دیا اور بہت سی گیس پیدا ہوگئی تو گیس نے زور مار کر باہر نکلنا چاہا اور اس نکلنے کی کوشش سے زلزلہ آیا اور آتش فشاں پہاڑ پھوٹے ۔ اسی طرح پہاڑوں کے عالم وجود میں آنے میں زمین کے اندرونی حصہ کی سطح پر قشری حصوں کے توازن (ISOSTASY) کو بھی دخل ہے اس لحاظ سے پہاڑ گویا سطح زمین کے توازن کا ذریعہ بھی ہیں ۔ اور زمین کے اندر پیدا ہونے والے معمولی تغیرات کو زمین کی سطح پر کسی بڑے انقلاب کا موجب بننے سے روکتے ہیں سوائے ایسے استثنائی واقعات کے جو زمین پر ایک قیامت کی طرح وارد ہو سکتے ہیں ۔ اور جن کا ثبوت کرۂ ارض کی گذشتہ تاریخ سے ظاہر ہے جو زمین ہی کے موجودہ آثار سے معلوم ہوئی ہے ۔ پس پہاڑ نہ زمین کو تہ و بالا ہونے سے بچاتے بھی ہیں اور اُن کے بعض حصے آتش فشانی کی شکل میں زمین کی اندرونی طاقتوں کا نقشہ بھی پیش کرتے رہتے ہیں ۔ (دیکھو " مارولز اینڈ مسٹریز آف سائنس " مصنفہ ایلی سن ہاکس ایف ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ۔ زیر عنوان کرسٹ آف دی ارتھ " نیز دیکھیں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ۔ زیر عنوان جیالوجی)

اللہ تعالیٰ اِن مادی پہاڑوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ روحانی عالم کے اندر جو گرمی بھری ہوئی ہے وہ بھی جوش میں آکر آتش فشاں پہاڑوں کی طرح دنیا پر تباہی لاتی ہے ۔ لیکن پھر ہم روحانی پانی کے ذریعہ سے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں ۔ اور کچھ سبزہ زار میدانوں والے پہاڑ ظاہر ہو جاتے ہیں یعنی اولیاء اللہ ۔

پھر فرماتا ہے کہ ہم نے اِن پہاڑوں کے درمیان بڑے بڑے کھلے راستے بنائے ہیں تاکہ لوگ اِن پر چل کر فائدہ اٹھائیں ۔ چنانچہ ابتداء تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ لشکروں کی نقل و حرکت ہمیشہ پہاڑی رستوں کے ذریعہ ہی ہوا کرتی تھی ۔ کیونکہ میدانوں میں رستوں کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے ۔ لیکن پہاڑوں کے اندر قدرت نے جو خود بخود وادیاں اور رستے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اُن کا پہچاننا آسان ہوتا ہے اور دُور دُور کی قومیں ان رستوں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ اِدھر اُدھر آجا سکتی ہیں ۔ فرماتا ہے جس طرح مادی دنیا میں تمہیں یہ نظارہ نظر آتا ہے ۔ اسی طرح روحانی پہاڑوں کی ہدایت کے ساتھ لوگ روحانی سفر طے کرتے ہیں اور اس طرح مادی اور روحانی سلسلہ آپس میں متوازی چلتا چلا جاتا ہے ۔

آيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ

نشانوں سے (جو ان کے فائدہ کیلئے ہیں) اعراض کرتے ہیں ۵۲۶ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو اور سورج

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا

اور چاند کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب (آسمانی سیارے) اپنے اپنے محوروں میں بے روک چل رہے ہیں۔ اور ہم نے کسی

جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ

انسان کو تجھ سے پہلے غیر طبعی عمر نہیں بخشی۔ کیا اگر تو مر جائے تو وہ غیر طبعی عمر تک

الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۵﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ

زندہ رہیں گے؟ ۵۲۷ ہر جان موت چکھنے والی ہے۔ اور ہم تمہاری

۵۲۶ تفسیر :- فرماتا ہے۔ ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا ہے۔ یعنی جس طرح دُور آسمان کے کُرّے نظامِ شمسی کی حفاظت کر رہے ہیں اسی طرح وہ لوگ جن پر آسمان سے روحانی پانی اُترتا ہے۔ نظامِ روحانی کی حفاظت کر رہے ہیں۔ مگر پھر بھی لوگ اُنکی طرف توجہ نہیں کرتے۔

۵۲۷ حل لغات :- یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ سَمَآءٌ اَور چیز ہے اور فَلَكٌ اَور چیز ہے۔ فَلَكٌ درحقیقت نظامِ شمسی کے پھیلاؤ کا نام ہے اور ان وسعتوں کو کہتے ہیں جن میں نظامِ شمسی کے افراد چکر لگاتے رہتے ہیں اقرب میں ہے۔ اَلْفَلَكُ: مَدَارُ النُّجُوْمِ کہ فلک ستاروں کی گردش کی جگہ کا نام ہے۔ مفردات میں ہے۔ اَلْفَلَكُ مَجْرَى الْكَوَاكِبِ کہ فلک ستاروں کی حرکت گاہ کا نام ہے

يَسْبَحُوْنَ سَبَحَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلسَّبْحُ (جو سَبَحَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلْمَرُّ السَّرِيْعُ فِي الْمَآءِ وَالْهَوَاءِ۔ پانی یا ہوا میں جلدی سے گذرنا (اقرب) پس يَسْبَحُوْنَ کے معنے ہونگے وہ اپنے مدار میں تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔

اَلْخُلْدُ : مفردات میں ہے اَلْخُلُوْدُ هُوَ تَبَرِّى الشَّيْءِ مِنِ اعْتِرَاضِ الْفَسَادِ وَبَقَآؤُهٗ عَلَى الْحَالَةِ الَّتِيْ هُوَ عَلَيْهَا وَكُلُّ مَا يَتَبَاطَأُ عَنْهُ التَّغْيِيْرُ وَالْفَسَادُ تَصِفُهُ الْعَرَبُ بِالْخُلُوْدِ۔ یعنی کسی چیز کا خراب ہونے سے اور فساد پذیر ہونے سے محفوظ رہنا اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنا اور ہر وہ چیز جس سے تغیر اور خرابی دُور ہوتی ہے اور اپنی اصلی حالت پر وہ قائم رہتی ہے اس کے لئے خلود کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کقولهم للاثافی خَوَالِدُ وَذٰلِكَ لطول مكثها لا لدَوَامِ بَقَاءِهَا۔ چنانچہ چولھے کے پتھروں کو بھی خوالد کہتے ہیں کیونکہ جہاں چولھے بنائے جاتے ہیں وہ پتھر ایک عرصہ تک وہیں پڑے رہتے ہیں اور اس وجہ سے اُن کو خوالد نہیں کہتے کہ وہ ابدالاباد تک باقی رہیں گے۔

تفسیر :- فرماتا ہے۔ رات اور دن اور سورج اور چاند سب خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں اور کسی غرض سے پیدا کئے گئے ہیں۔ رات بھی انسانی ضرورت کو

نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝۳۶

بُرے اور اچھے حالات سے آزمائش کرینگے - اور آخر ہماری طرف ہی تم کو لوٹا کر لایا جائے گا ۝ ۵۲۸

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا

اور جب تجھے کفار دیکھتے ہیں تو تجھ کو صرف ایک حقیر چیز سمجھتے ہیں -

هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ

(اور کہتے ہیں) کیا یہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کی کمزوریاں گنتا ہے ؟ حالانکہ وہ خود

پُورا کرتی ہے - اور دن بھی اور سورج بھی اور چاند بھی - اور سورج اور چاند دونوں ایک مقررہ راستہ پر چل رہے ہیں - یعنی ہمیشہ ہی انسان کو رات اور دن کی ضرورت رہے گی - اور سورج اور چاند کے ذریعہ سے ہمیشہ رات اور دن آتے رہیں گے -

اِسی طرح روحانی سورج اور روحانی چاند بھی ظاہر ہوتے رہیں گے - روحانی سورج مرے گا تو روحانی چاند آجائیگا - چنانچہ فرماتا ہے کہ اے روحانی سورج یعنی محمد رسول اللہ - اگر تُو نے مرنا ہے تو کیا انہوں نے زندہ رہنا ہے ! ہر ایک انسان کے لئے مقدر ہے کہ آخرت کا مزہ چکھے - لیکن تیرے مارنے والا خدا ایک روحانی چاند پیدا کرنے پر بھی قادر ہے - پھر اسلام کے لئے مایوسی کی کونسی بات ہے -

۵۲۸ تفسیر:- فرماتا ہے - ہر انسان جو اِس دنیا میں پیدا ہُوا ہے اس کے ساتھ خدا نے موت لگائی ہوئی ہے - بے اندازہ زندگی کسی کو بھی نہیں ملتی - وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً - اور ہم تم کو منحوس اور اچھی گھڑیوں کے ذریعہ سے آزماتے رہیں گے - یعنی خدائی طریق یہ ہے کہ وہ کبھی خیر کے ذریعہ بنی نوع انسان کی آزمائش کرتا ہے - اور کبھی شر کے ذریعہ اُن کی آزمائش کرتا ہے یعنی کبھی تو وہ بنی نوع انسان کو یہ موقعہ دیتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے انبیاء ظاہر ہوں تو وہ اُن کی فرمانبرداری اور اطاعت کرکے ترقی حاصل کریں - اور کبھی تاریکی کے دَور میں جب نبیوں کی بعثت پر ایک لمبا زمانہ گذر جاتا ہے وہ لوگوں کو موقعہ دیتا ہے کہ اُن میں سے سمجھدار اور دُور اندیش انسان اپنی عقل سے کام لے کر اِس صحیح تعلیم کو جو فطرت کے مطابق ہو اخذ کریں - اور بدی کی رَو میں بہنے کی بجائے انبیاء کے طریق کو دنیا میں قائم رکھنے کی کوشش کریں یہ دونوں طریق ہیں جن سے لوگوں کی آزمائش کا سلسلہ جاری ہے - اِسی طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کبھی آسمانی چاند مٹ جائیگا اور تاریکی چھا جائیگی اور کبھی پھر دوسرا چاند ظاہر ہو جائیگا - وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ - اور ہر چاند کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف لوٹائے -

بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ خُلِقَ الْاِنْسَانُ

رحمٰن (خدا) کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔ ۲۹ انسان کے اندر جلد بازی کا مادہ

مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۸﴾

رکھا گیا ہے۔ سو (یاد رکھو) میں تم کو اپنے نشان دکھاؤں گا۔ پس تم جلد بازی سے کام نہ لو ۳۰

هُزُوًا

۲۹ حل لغات :۔ هُزُوًا۔ هَزَءَ کے معنے ہوتے ہیں سَخِرَمِنْهُ اُس سے ہنسی مذاق کیا (اقرب) اور هُزُوًا کے معنے ہونگے ہنسی اور مذاق۔

تفسیر :۔ فرماتا ہے۔ کافر ہمیشہ تیری ہنسی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہ شخص تمہارے معبودوں کی تباہی کی خبر دیتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ تو رحمٰن خدا کے ذکر کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اگر محمد رسول اللہ ان بیہودہ شخصیتوں کو مٹانا چاہے جن کو کفار نے خدا بنا چھوڑا ہے تو یہ ہنسی کی کونسی بات ہے۔ گویا آپ تو حقیقی خدا کے بھی منکر ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اُن کے جھوٹے معبودوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُن کا تمسخر اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ ہمارے معبودوں کا حقارت کے ساتھ ذکر کرے۔

۳۰ تفسیر :۔ فرماتا ہے۔ محمد رسول اللہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مخالف ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم پر عذاب نہیں آتا۔ گویا محمد رسول اللہ کی ہنسی اور تحقیر صرف اس لئے ہے کہ عذاب میں دیر ہو رہی ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ عذاب جلدی آجائے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں۔ انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے مگر جلدی کوئی مادہ نہیں جس سے کوئی دوسری چیز بنائی جائے۔ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں جب یہ کہا جائے کہ خُلِقَ مِنْ فُلَانٍ تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ شخص فلاں مادہ سے بنایا گیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں امر اُس کی طبیعت میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی اس محاورہ کو مختلف مقامات پر استعمال فرمایا ہے۔ سورۂ روم میں فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً (روم ع ۶) کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا ہے۔ اب بتاؤ کیا ضعف کوئی مادہ ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں کمزوری رکھی گئی ہے۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے فطرتی طور پر سخت کمزور ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں مگر بڑھاپے میں پھر اس پر ضعف طاری ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی طاقتیں اُسے جواب دے دیتی ہیں۔ پس یہاں خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ سے مراد بچے کے قویٰ کی کمزوری اور اس کا ضعف ہے۔ یہ مراد نہیں کہ کمزوری کوئی مادہ ہے جس سے وہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ ابلیس نے کہا کہ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (سورۂ ص ع ۵) اے خدا تُو نے تو میری طبیعت میں آگ کا مادہ رکھا ہے اور اس میں طین کا مادہ ہے مجھے تو کوئی بات کہے تو آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے میں تو آدم کی طرح دوسرے کی بات کبھی نہیں مان سکتا۔ اردو میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٩﴾

اور (یہ سُنکر) وہ کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ (یعنی مسلمان) سچے ہو تو یہ وعدہ کب پُورا ہوگا؟ ۳۱ ؎

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ

اگر کفار اِس گھڑی کو جان لیتے جبکہ وہ نہ اپنے مونہوں سے اور نہ اپنی پیٹھوں سے آگ کو

النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٠﴾ بَلْ

ہٹا سکیں گے۔ اور نہ کسی کی طرف سے اُنکی مدد کی جائیگی (تو وہ اتنی تعلّی نہ کرتے)۔ لیکن (وہ عذاب)

تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا

اُن کے پاس اچانک آئے گا۔ اور انکو حیران کردیگا۔ پس وہ اس کو ردّ کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٤١﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ

اور نہ انکو (کوئی) مہلت دی جائیگی ۳۲ ؎ اور تجھ سے پہلے جو رسول گذرے ہیں اُن سے بھی ہنسی کی گئی تھی

کہتے ہیں۔ فلاں شخص تو آگ ہے۔ اب اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ اُس کے مونہہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے کوئی نصیحت کی جائے تو آگ لگ جاتی ہے۔ انگریزی میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو فائر برینڈ ہے یعنی ایسا شرارتی ہے کہ ہر جگہ آگ لگا دیتا ہے۔ یہی محاورہ اس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے یعنی انسانی فطرت میں جلد بازی رکھی گئی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جو کام بھی ہو جلدی سے ہو جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس لئے فرماتا ہے سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں سُنتے ہی اُسے جھوٹا جھوٹا کہنے کیوں لگ جاتے ہو۔ تم جلدی نہ کرو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کا نتیجہ آخر نکل آئیگا اور ہماری پیشگوئیاں پوری ہو کر رہیں گی۔

۳۱ ؎ تفسیر:- مگر کفار پھر بھی نہیں سمجھتے وہ یہی کہتے جاتے ہیں کہ اگر سچے ہو تو عذاب کا وعدہ جلدی پورا کرو۔ آخر وہ عذاب کب آئیگا؟

۳۲ ؎ حل لغات:- وُجُوهَهُمْ۔ وُجُوهٌ: اَلْوَجْهُ کی جمع ہے اور اَلْوَجْهُ کے معنے ہیں اَوَّلُ مَا يَبْدُوْا لِلنَّاظِرِ مِنَ الْبَدَنِ وَفِيْهِ الْعَيْنَانِ وَ الْأَنْفُ وَالْفَمُ۔ یعنی چہرہ۔ مُسْتَقْبَلُ كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز کا سامنے کا حصہ۔ اسی طرح اَلْوَجْهُ کے معنے ہیں سَيِّدُ الْقَوْمِ۔ قوم کا سردار۔ نَفْسُ الشَّيْءِ کسی چیز کا وجود۔ اَلْجَاهُ۔ عزت (اقرب)

تَبْهَتُهُمْ: تَبْهَتُ بَهَتَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور بَهَتَهُ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَهُ بَغْتَةً اُس کو اچانک آلیا۔ اور تَأْتِيهِمْ

وُجُوهُهُمْ

تَبْهَتُهُمْ

مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جنہوں نے ان رسولوں سے ہنسی کی تھی ان کو انہی باتوں نے آکر گھیر لیا جن کے

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۲﴾ ع قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ

ع ۳ ۳

ذریعہ سے وہ نبیوں کی ہنسی اُڑاتے تھے ۳۳؎ تو کہدے کہ رات یا دن کے وقت رحمٰن خدا کی

وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۳﴾

گرفت سے تم کو کون بچا سکتا ہے؛ لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) وہ اپنے رب کے ذکر سے اعراض کر رہے ہیں ۳۴؎

بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ کے معنے ہیں اَیْ تَغْلِبُهُمْ وَ تُحَيِّرُهُمْ کہ انکو مصیبت اچانک آئیگی اور اُن کو حیران کر دیگی (اقرب)

ینظرون

يُنْظَرُوْنَ۔ اَنْظَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا مجہول کا صیغہ ہے اور اَنْظَرَهٗ کے معنے ہیں اَمْهَلَهٗ اسکو مہلت دی (اقرب)، وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ کے معنے ہونگے انہیں مہلت نہیں دی جائیگی۔

حاقَ

تفسیر:۔ اصل بات یہ ہے کہ سزا ملنے سے پہلے انسان اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتا اور یہ لوگ بھی نہیں سمجھ رہے لیکن جب عذاب آجائیگا اور نہ صرف چھوٹوں پر بلکہ بڑوں پر اور ان کے مددگاروں پر بھی آجائیگا۔ اور کوئی مدد کرنے والا نہیں رہے گا۔ اُسوقت اُن کو ہوش آئے گی وہ عذاب اچانک آئیگا اور اُن کو حیران کر دیگا اور یہ اس کو ردّ کرنے کی طاقت نہیں پائیں گے اور نہ خدا ہی اُن کو مہلت دیگا۔

یکلؤ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار اس عذاب کو نہ اپنے موہنوں سے ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے ہٹا سکیں گے۔ یعنی نہ سامنے آنے والا عذاب اُن سے دُور ہو سکیگا اور نہ پیچھے سے آنیوالا عذاب اُن سے دُور ہو سکیگا سامنے آنے والے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جس کے نشانات ظاہر ہو جائیں اور پیچھے آنے والے عذاب سے وہ عذاب مراد ہے جو اچانک آجاتا ہے اور جس کا انسان کو پتہ تک نہیں لگتا۔ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ سے ظاہر ہے کہ جو عذاب اُن کے لئے مقدر ہے وہ اچانک آئیگا گویا اُن کی پیٹھوں کی طرف سے عذاب کا آنا مقدر ہے۔ انہیں پتہ بھی نہیں لگیگا کہ عذاب کب آنیوالا ہے اور کس طرح آنے والا ہے۔

۳۳؎ حل لغات:۔ حَاقَ بِهٖ کے معنے ہیں اَحَاطَ۔ اس کو گھیر لیا (اقرب)

تفسیر:۔ اور یہ جو تجھ سے مذاق کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلے رسولوں سے بھی ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے لیکن آخر انجام مخالفوں کا ہی بُرا ہُوا ہے۔ اور اُن کے ٹھٹھے کا وبال انہی پر عذاب کی صورت میں پڑا ہے۔ اگر تیرے مخالفوں کا انجام بھی بُرا ہُوا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تو ہمارا سچّا رسول ہے اور یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

۳۴؎ حل لغات:۔ يَكْلَؤُ كَلَاَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور كَلَاَ کے معنے ہیں حَفِظَهٗ وَحَرَسَهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اور نگہبانی کی (اقرب)، پس يَكْلَؤُكُمْ کے معنے ہیں

اَمۡ لَهُمۡ اٰلِهَةٌ تَمۡنَعُهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِنَا ؕ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ

کیا اُن کی تائید میں کوئی دیسے معبود ہیں جو انکو ہمارے عذاب سے بچا لیں گے؟ وہ (معبود) تو اپنی جانوں کی بھی

نَصۡرَ اَنۡفُسِهِمۡ وَلَا هُمۡ مِّنَّا يُصۡحَبُوۡنَ ﴿۴۴﴾ بَلۡ

حفاظت نہیں کر سکتے - اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی اُن کا ساتھ دے سکتا ہے ۳۵ حقیقت یہ ہے

حفاظت کرتا ہے -

تفسیر :- فرماتا ہے. تمہاری رات اور دن میں کئی قسم کی مشکلات اور مصائب پیدا ہوتے ہیں بعض مصائب رات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بعض دن کے ساتھ - مگر کوئی پوشیدہ ہستی اُن کو ٹلاتی چلی جاتی ہے اور تمہاری حفاظت کرتی ہے - آخر یہ رحمٰن کے سوا کون ہستی ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ کئی قسم کی وبائیں اور بلائیں ہیں جو رات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور کئی قسم کی وبائیں اور بلائیں ہیں جو دن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان بلاؤں اور آفتوں اور بیماریوں اور عذابوں کو جانتے تو سائنس والے ہیں مگر اثر ان کا ساری پبلک پر پڑتا ہے جو اُن سے بے خبر ہوتی ہے اور جن کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ کوئی بلائیں ہمارے لئے تیار ہو رہی ہیں مگر پھر مخفی طور پر کچھ ایسے غیبی سامان پیدا ہوتے ہیں کہ وہ بلائیں دُور ہو جاتی ہیں - فرماتا ہے یہ رحمٰن خدا ہی ہے جو ان کو دُور کرتا ہے لیکن ان لوگوں کو پھر بھی سبق نہیں ملتا اور یہ صداقتوں کا مقابلہ کرتے چلے جاتے ہیں - مونہہ سے تو یہ کہتے ہیں کہ ایک جھوٹا مدعی پیدا ہوا ہے ہم اُسکی مخالفت کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکو اپنے خدا کے یاد کرنے کی رغبت ہی نہیں ہے، چونکہ ذکر الٰہی سے ان کا دل گھبراتا ہے اس لئے انبیاء کا انکار کرتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرنی پڑے اور ان ذمہ داریوں سے بچے رہیں جو ایمان لانیوالوں پر ڈالی جاتی ہیں -

ہر شخص جو تاریخ سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے جانتا ہے کہ انبیاء کی اصل مخالفت اسی بنا پر ہوتی ہے کہ وہ دنیوی لہو و لعب سے ہٹا کر خدا کی یاد کی طرف لوگوں کو لانا چاہتے ہیں اور یہی وجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کی بھی ہے ورنہ محمد رسول اللہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جو انسان کی فطرت یا اخلاق کے خلاف ہو اور نہ وہ لوگوں سے کچھ مانگتے تھے کہ انکی بات ماننا لوگوں پر بوجھ ہوتا.

روحانی نقطہ نگاہ سے اس آیت میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب بھی کوئی روحانی چاند یا روحانی سورج ظاہر ہوتا ہے تو اس کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے خدا کی طرف سے عذاب آتا ہے. سو اے لوگو: بتاؤ کہ خواہ چاند کا وقت ہو یا سورج کا خدا تعالےٰ کے عذاب سے تمہیں کون بچا سکتا ہے -

بَلۡ هُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ میں بتایا کہ ان کی یہ حالت صرف اعراض عن ذکر اللہ کے سبب سے ہے -

۳۵ تفسیر :- پھر فرماتا ہے. تم تو خدا تعالےٰ کی عبادت سے بچنا چاہتے ہو - لیکن اس کے نتیجہ میں جو عذاب آئیگا - اس سے کوئی جھوٹا معبود تمہیں نہیں بچا سکیگا - بلکہ وہ جھوٹے معبود تو اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے - اور نہ اپنا کوئی مددگار پیدا کر سکتے ہیں -

مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ

کہ ہم نے ان کو بھی اور ان کے باپ دادوں کو بھی بہت سامان و متاع دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان پر ایک لمبا زمانہ گذر

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ

گیا پس کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم ان کے ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کناروں کی طرف سے اُسے چھوٹا کرتے جا رہے ہیں تو کیا

اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ ؗ

(اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ) وہ غالب آ جائیں گے ؎۳۶ تو اُن سے کہدے کہ میں تو تم کو وحی کے ذریعہ سے ہوشیار کر رہا ہوں اور

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۶﴾

خوب سمجھتا ہوں کہ) جب (روحانی) بہروں کو ہوشیار کیا جائے تو وہ آواز نہیں سُن سکتے -

؎۳۶ حل لغات: - اَطْرَافٌ طَرَفٌ کی جمع ہے اور طَرَفٌ کے معنے ہیں حَرْفُ الشَّیْءِ وَنَاحِیَتُهٗ - کسی چیز کا کنارہ - اَلنَّاحِیَةُ - طرف - اَلرَّجُلُ الْکَرِیْمُ - معزز آدمی (اقرب)

تفسیر: حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کی عمر لمبی ہو جاتی ہے تو وہ تکبر کی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ نہیں دیکھتی کہ اس وقت اس کی تباہی کے سامان پیدا ہو رہے ہیں - تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے - بلکہ موجودہ زمانہ میں ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ہی دیکھ لو لمبی حکومت کے بعد خود ان کی حکومت ہی ان کے لئے وبالِ جان بن گئی - اور ان کی شہنشاہیت کے اجزا خود اُن کے لئے ایک ذلّت کا طوق بن گئے -

ہندوستان انگلستان سے کتنی دُور تھا - اور پھر انگریزوں نے کتنی شاندار حکومت یہاں کی لیکن پچھلی بڑی جنگ میں مسٹر چرچل کے قول کے مطابق ہندوستان انگریز کے گلے کا پتھر بن گیا اور چرچل چیخ اٹھا کہ اگر انگلستان کو بچانا چاہتے ہو تو اس پتھر کو سمندر میں پھینک دو - اب مصر اور ملایا اسی طرح پتھر بن کے گلے میں لٹکے ہوئے ہیں - کچھ عرصہ کے بعد نیوزی لینڈ آسٹریلیا اور کینیڈا گلے کے پتھر بن جائیں گے مگر پھر بھی کچھ عرصہ تک انگلستان کا غرور قائم رہے گا - اور انگریز یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم غالب ہیں - مگر آخر خدا تعالےٰ کی وحی جیتے گی -

تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑی مصیبت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جب دنیا میں کوئی قوم طاقتور ہو جاتی ہے تو اُسے جتنی زندگی ملتی ہے چاہے وہ ساٹھ سال کی ہو یا سو سال کی ہو یا دو سو سال کی ہو اس زندگی کی وہ ایسی عادی ہو جاتی ہے کہ سمجھتی ہے اب ہماری یہ حالت بدلے گی نہیں - فرماتا ہے کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ گو محمد رسول اللہ کو پوری فتح حاصل نہیں ہوئی لیکن محمد رسول اللہ کے مخالفوں کی حکومت کا پھیلاؤ کم ہونا شروع ہو گیا ہے اور ان کے اثر کے وہ حصے جنکو کنارے

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ

اور اگر ان کو عذاب کی گرمی کا کوئی جھونکا لگ جائے تو وہ ضرور کہیں گے۔

يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ

ہم پر افسوس! ہم تو ظلم ہی کرتے رہے۔ اور ہم قیامت کے دن ایسے تول کے سامان

الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ

(یعنی پورا پورا تولنے والے سامان) پیدا کرینگے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ

اور اگر ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی (کوئی عمل) ہوگا تو ہم (اُس کو) موجود کر دیں گے

وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں ۳۷ے

کہنا چاہیئے اب سمٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ کیا اس بات کو دیکھنے کے باوجود وہ خیال کرتے ہیں کہ آخر وہی غالب آئیں گے۔ یعنی جبکہ اسلام روز بروز ترقی کر رہا ہے اور وہ کم ہو رہے ہیں تو وہ کیونکر خیال کر سکتے ہیں کہ وہ غالب آجائیں گے۔

۳۷ے حل لغات: ۔اَلنَّفْحَةُ مِنَ الْعَذَابِ: اَلْقِطْعَةُ۔ عذاب کا ایک حصہ (اقرب)

اَلْقِسْطُ: کے معنے ہیں اَلْعَدْلُ۔ انصاف (اقرب)

اَلْخَرْدَلُ: حَبٌّ صَغِيْرٌ جِدًّا اَسْوَدُ مُقَرَّحٌ وَ مِنْهُ اَبْيَضُ۔ یعنی باریک باریک دانے جو سیاہ ہوتے ہیں اور اُن میں سے بعض سفید بھی ہوتے ہیں (اقرب) اردو میں ہم انہیں رائی کہتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ! تو اُن سے کہدے میں تو کسی طاقت کا مدعی نہیں۔ کمزور انسان ہوں۔ خدا کی وحی میں تمہارے عذاب کی خبر آئی ہے وہ تم کو سُناتا ہوں۔ مگر تم بہرے ہو گئے ہو۔ کتنا بھی ڈراؤں سنتے نہیں۔ لیکن جب عذاب آجائیگا تو اس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ افسوس ہم تو ظالم تھے مگر کیا اُن کا یہ کہنا اُن کو نفع دے سکیگا جب مقدرتِ ظلم کے وقت وہ ظلم کرتے رہے تو مقدرتِ ظلم کے چھینے جانے پر افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟ اور ہم اس فیصلہ کے دن انصاف کے ترازو رکھ دیں گے تاکہ جتنا جتنا کوئی مجرم ہے اس کو سزا مل جائے اور کسی پر تھوڑا سا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔ اور اگر کسی نے ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی تو اس کا بدلہ سکو مل جائیگا۔

دیکھو یہ کتنی زبردست صداقت ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے۔ ابوجہل کتنا شدید دشمن تھا مگر اس کے اندر کی نیکی کسی دوسرے شخص کو نظر نہیں آئی۔ لیکن جب

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً

اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو امتیازی نشان بخشا تھا ۔ اور روشنی بخشی تھی ۔

خدائی فیصلہ کا دن آیا تو اس کے بیٹے کو مسلمان کر دیا گیا ۔ اور وہ اعلیٰ درجہ کا اسلامی جرنیل ثابت ہؤا ۔ اسی طرح ابوسفیان اسلام کا کتنا دشمن تھا ۔ ظاہر میں دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ یہ اور اس کا خاندان ہمیشہ سزا پائیں گے ۔ مگر اس کے اندر بھی کوئی نیکی تھی ۔ جب وقت آیا تو اس کا بیٹا آدھی مملکت اسلامیہ کا حاکم بنا ۔ اور قریباً سو سال تک اس کے خاندان نے تمام عالم اسلام پر حکومت کی ۔ اور اس کے بعد اندلس پر قریباً پانچ سو سال تک حکومت کی یہ جزا محض عالم الغیب خدا کی طرف سے ہی آ سکتی ہے اگر انسان جزا دیتا تو ابوجہل اور اس کے خاندان کو اور ابوسفیان اور اس کے خاندان کو پیس ڈالتا ۔

اوپر کے مضمون کے علاوہ یہ آیت کہ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ جہنم کے غیر منقطع ہونے کے عقیدہ کو بھی رد کر رہی ہے ۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کسی نے ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی یا بدی کی ہوگی تو اس کا حساب لیا جائے گا ۔ اب اگر بدی کی وجہ سے انسان جہنم میں چلا گیا اور ابدالآباد تک وہیں رہا تو نیکیوں کا بدلہ کب پائیگا پس ضروری ہے کہ جہنم کا عذاب منقطع ہو ۔ اور نیکیوں کی جزا کے لئے اسے جنت میں داخل کیا جائے ۔

آریوں کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ حساب کے وقت ہر رُوح کا ایک گناہ باقی رکھ لیتا ہے ۔ چنانچہ پہلے تو وہ نیک روحوں کو نجات دے دیتا ہے ۔ مگر پھر اس گناہ کی وجہ سے انہیں مختلف جونوں میں ڈالتا رہتا ہے ۔ گویا اُن کے نزدیک خدا تعالیٰ انعام پہلے دیتا ہے اور عذاب پیچھے تاکہ رُوح ابدی نجات نہ پا جائے ۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہوں کی سزا پہلے دیتا ہے اور پھر انسان کو نجات دیتا ہے ۔ اور ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی تعلیم ہی فطرتِ صحیحہ کے مطابق ہے ۔ گناہ کو چھپا رکھنا اور پھر سلسلۂ انعام کو منقطع کر کے عذاب میں مبتلا کر دینا ایسا ہی ہے جیسے بنیا کسی کو روپیہ قرض دے کر اس کا بہت سا حصّہ تو وصول کر لیتا ہے مگر کچھ حصّہ باقی رہنے دیتا ہے تاکہ چند سالوں کے بعد پھر سود سمیت اُس سے ایک بہت بڑی رقم وصول کر سکے ۔ اس قسم کی کینہ توزی کسی انسان میں بھی برداشت نہیں کی جا سکتی کجا یہ کہ اُسے خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کیا جائے لیکن اسلام کہتا ہے کہ جس شخص کے لئے سزا مقدر ہوگی ۔ اُسے پہلے سزا دی جائیگی اور پھر اُس کی نیکیوں کا انعام دیا جائے گا ۔ اور یہ انعام غیر منقطع ہوگا ۔ اور اس میں کوئی رخنہ واقع نہیں ہؤا ہوگا چنانچہ اللہ تعالےٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ جو لوگ میری جنت میں داخل ہو جائیں گے وہ اس سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے ۔ پس اسلام کی تعلیم عقل اور فطرت کے مطابق ہے ۔ جبکہ آرین مذہب کی تعلیم خدا تعالےٰ پر ظلم کا الزام عائد کرنے والی ہے ۔

وَ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ

اور متقیوں کے لئے ایک یاد دہانی کی تعلیم بخشی تھی۔ وہ (متقی) جو اپنے رب سے غیب میں (بھی) ڈرتے ہیں۔

وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ

اور جو جزا کے وقت مقررہ سے بھی ڈرتے رہتے ہیں ۳۸؎ اور یہ (قرآن) ایسی یاد دہانی کرنیوالی کتاب ہے جس میں تمام

اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ

ع الربع ۴/۴

آسمانی کتابوں کی خوبیاں بھر دی گئی ہیں اس کو ہم نے اتارا ہے پس کیا تم ایسی کتاب کے منکر ہو ۳۹؎ اور ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو

رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ اِذْ قَالَ

اس کی صلاحیت اور قابلیت عطا کی تھی۔ اور ہم اس کے اندرونہ سے خوب واقف تھے۔ جب اس نے اپنے باپ

لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا

اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کیا مجسمے ہیں جن کے آگے تم

۳۸؎ حل لغات:۔ اَلْفُرْقَانَ کے معنے ہیں کُلُّ مَا فُرِّقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔ ہر وہ معجزہ جس سے حق اور باطل کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ اَلنَّصْرُ۔ مدد۔ اَلْبُرْهَانُ۔ دلیل۔ اَلصُّبْحُ صبح (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو ایک امتیاز اور روشنی دینے والی اور متقیوں کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے والی کتاب بخشی تھی۔ ایسے متقی جو علیحدگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اپنے انجام سے ڈرتے رہتے ہیں۔

۳۹؎ تفسیر:۔ مُبَارَكٌ در اصل بَرَكَةٌ سے نکلا ہے۔ اور بَرَكَةٌ کے معنے گڑھے کے ہوتے ہیں جس میں ارد گرد کا تمام پانی جمع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کو مبارک اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں پچھلی ساری صداقتوں اور اعلیٰ درجے کی تعلیموں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

فرماتا ہے۔ یہ قرآن جو ساری برکتیں اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ اور تورات کی طرح خدا کو یاد دلانے والا ہے۔ ہم نے تجھ پر اتارا ہے۔ مگر پھر بھی لوگ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس جگہ چونکہ قرآن کریم کو ذکر کہا گیا ہے اس لئے جہاں خدا تعالیٰ نے مومنوں کو ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ قرآن کریم کو پڑھو اور اس پر عمل کرو۔

الفرقان

عَاكِفُونَ ﴿٥٣﴾ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿٥٤﴾

بیٹھے رہتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا تھا کہ وہ انکی عبادت کرتے تھے

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٥٥﴾

اُس نے کہا۔ تب تم بھی اور تمہارے باپ دادے بھی ایک کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ﴿٥٦﴾ قَالَ

انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس ایک حقیقت لے کر آیا ہے یا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ اُس (یعنی ابراہیم)

بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ

نے کہا حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب آسمانوں کا بھی رب ہے، اور زمین کا بھی رب ہے، (وہی ہے) جس نے ان کو پیدا کیا ہے

وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٥٧﴾ وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ

اور میں اس بات پر تمہارے سامنے گواہ ہوں۔ اور اُس نے کہا خدا کی قسم! جب تم پیٹھ پھیر کر

أَصْنَامَكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ﴿٥٨﴾ فَجَعَلَهُمْ

چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کے خلاف ایک پکی تدبیر کروں گا۔ پھر اس نے اُن (یعنی بتوں) کو

جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ﴿٥٩﴾ قَالُوا

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سوائے اُن میں سے بڑے کے تاکہ وہ (ایک دفعہ پھر) اس کے پاس آئیں۔ اسپر انہوں نے کہا کہ

مَنْ فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٦٠﴾ قَالُوا

ہمارے معبودوں سے یہ کام کس نے کیا ہے! ایسا کرنیوالا یقیناً ظالموں میں سے ہے (جس پر کچھ دوسرے لوگوں نے) کہا

سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ﴿٦١﴾ قَالُوا

ہم نے ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیم ہے ان کی کمزوریاں بیان کرتے سُنا ہے (تب قوم کے سرداروں نے) کہا

فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ﴿٦٢﴾

(اگر بات یوں ہے تو) اس شخص کو سب لوگوں کے سامنے لاؤ۔ شاید وہ (اس کے متعلق) کوئی فیصلہ کریں۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۲﴾ؕ

(پھر) انہوں نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا یہ کام تو نے ہمارے معبودوں سے کیا ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖۗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا

(ابراہیم نے) کہا کہ (آخر) کسی کرنے والے نے یہ کام ضرور کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا بُت سامنے کھڑا ہے اگر وہ بول سکتے ہیں

یَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ

تو ان سے (یعنی اس بُت سے بھی اور دوسرے بتوں سے بھی) پوچھکر دیکھو۔ اسپر وہ اپنے سرداروں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے کہا

اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ۙ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ

سچی بات تو یہی ہے کہ ظالم تم ہی ہو۔ اور وہ لوگ اپنے سروں کے بل گرائے گئے (یعنی لاجواب کئے گئے) اور انہوں نے کہا

عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ

کہ تو جانتا ہے کہ یہ تو بولا نہیں کرتے۔ (ابراہیم نے) کہا۔ تو کیا تم اللہ تعالےٰ کے سوا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ؕ

ایسی شے کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہیں نفع دیتی ہے نہ نقصان پہنچاتی ہے

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

ہم تم پر افسوس کرتے ہیں اور اس پر بھی جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ نـ۵۴۰

نـ۵۴۰ حل لغات: اَلرُّشْدُ: اَلْاِسْتِقَامَةُ عَلٰی طَرِیْقِ الْحَقِّ مَعَ تَصَلُّبٍ فِیْهِ۔ حق بات پر اس طرح قائم رہنا کہ انسان مضبوطی سے اُسے اختیار کرے۔

جُذٰذًا: اَلْمُقَطَّعُ الْمُکَسَّرُ۔ ٹکڑے اور توڑی ہوئی چیز۔ مَا تُکُسِّرَ مِنَ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا حصہ جو ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے (اقرب)

نُکِسُوْا: نَکَسَ سے جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے۔ اور نَکَسَ کے معنے ہوتے ہیں قَلَبَهٗ عَلٰی رَأْسِهٖ وَ جَعَلَ اَسْفَلَهٗ اَعْلَاهُ وَمُقَدَّمَهٗ مُؤَخَّرَهٗ۔ اس کو سر کے بل اُلٹا کر دیا اور نچلے حصے کو اوپر اور اوپر کے حصہ کو نیچے کر دیا۔ اسی طرح نَکَسَ رَأْسَهٗ کے معنے ہوتے ہیں طَاطَاهُ مِنْ ذُلٍّ اُس نے ذلت سے سر نیچے کر لیا (اقرب) نُکِسَ الْمَرِیْضُ کے معنے ہوتے ہیں عَاوَدَهُ الْمَرَضُ کَاَنَّهٗ قُلِبَ اِلَی الْمَرَضِ۔ یعنی مریض کو دوبارہ بیماری نے آلیا اور مرض کا پھر اعادہ ہو گیا اور نُکِسَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں ضَعُفَ وَعَجَزَ۔ وہ

اَلرُّشْدُ

جُذٰذًا

نُکِسُوْا

ضعیف اور عاجز ہو گیا (اقرب) پس نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ کے معنے ہوئے (۱) اپنی پہلی حالت یعنی شرارت کی طرف دوبارہ لوٹ آئے۔ (۲) اُن کے سر ذلّت سے نیچے گرائے گئے (۳) جیسا کہ اوپر حل لغات سے ظاہر ہے کہ النکس کے اصلی معنے یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح اُلٹانا کہ اس کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہو جائے۔ علّامہ آلوسی مصنف رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ میں نکس کا لفظ ان معنوں میں استعمال ہونا درست ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالفوں نے شرمندگی سے اپنے سر نیچے ڈال دئے۔ اور وہ حیرت میں ڈوب گئے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے موسیٰؑ سے پہلے ابراہیمؑ کو بھی ہم نے اس کے زمانہ کے مطابق ہدایت بخشی تھی۔ اور ہم اس زمانہ کے حالات کو خوب جانتے تھے۔ اس کا چچا اور اس کی قوم مشرک تھے۔ اسجگہ اَبٌ بمعنے چچا استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد فوت ہو چکے تھے۔ اُس نے اپنے چچا اور اپنی قوم سے کہا۔ کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ یہ کیا مجسمے ہیں جن کے آگے تم رات دن بیٹھے رہتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم نے تو اپنے باپ دادوں کو بھی دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ کے الفاظ ان بتوں کی تحقیر کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خوب جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہیں۔

درحقیقت طرزِ کلام کی واقفیت بھی کلام کے سمجھنے میں خاص طور پر مدد دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی کہ وہ عام طور پر تعریضاً کلام کیا کرتے تھے۔ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کا کلام بھی اسی طرز کا ہے اور مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ بھی اسی رنگ میں کہا گیا ہے کہ یہ کیا چیز ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ مراد یہ ہے کہ کیا ایسی ذلیل اور حقیر چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو۔

اسجگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک عجیب مماثلت ثابت ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ بھی آپ کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی اُن کی پیدائش سے قبل فوت ہو گئے تھے۔ اور دونوں کو ان کے چچا نے پالا تھا اور پھر دونوں پالنے والے بھی مشرک تھے۔ اور دونوں نبیوں نے اُنکو توحید کی تبلیغ کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا اور اُن کی قوم نے بھی اُن کو کہا تھا کہ ہمارے باپ دادے ان بتوں کی پُوجا کرتے تھے اس لئے ہم ان کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوطالب کو اسلام لانے کی دعوت دی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ اے میرے بھتیجے میں جانتا ہوں کہ تیری باتیں سچی ہیں مگر لوگ کہیں گے کہ اس نے اپنے باپ دادے کا مذہب ڈر کر چھوڑ دیا ہے (سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۱۴۶)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے بزرگوں سے یہی کہا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے بزرگوں سے یہی کہا کہ اگر تمہارے باپ دادے گمراہ ہونگے تو کیا پھر بھی تم اُن کے پیچھے چلو گے؟ (مائدہ ع ۱۴)

اِس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ کیا تم مذاق کر رہے ہو یا کوئی سچی تعلیم لائے ہو۔ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی غلطی کر سکتے تھے۔ انبیاء کے دشمن چونکہ دل میں اُن کی قوتِ استدلال سے متأثر اور مرعوب ہوتے ہیں۔ اُنکی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ خود ہی کہہ دیں کہ ہم تو

ہنسی کرتے تھے اور اس طرح اُن کو اس فکر سے نجات ملے جیسے حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ حکیم الہ دین صاحب کا حال سُناتے تھے کہ وہ وفاتِ مسیحؑ کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مرزا صاحب نے صرف مولویوں کو شرمندہ کرنے کیلئے یہ دعویٰ کیا ہے اگر یہ سب معافی مانگ لیں تو وہ فوراً اس دعویٰ کو باطل ثابت کر دیں گے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو سخت حادثہ میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے دل میں ایک خفیف جھلک اُمید کی پیدا ہوتی ہے کہ شاید یہ خواب ہی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ سے یہی کہا کہ کیا تم ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے۔ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی غلطی کر سکتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ تمہارا رب آسمان و زمین کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے اور مَیں اس پر دلیل سے قائم ہوں اور اس کا گواہ ہوں۔ اور مَیں تمہارے گھروں کی طرف لوٹ جانے کے بعد تمہارے بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کرونگا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کلام اُن میں سے کسی ایک نے سُن لیا تھا۔ یا عید کو جاتے وقت سب سے آخر میں جو ضعفاء تھے اُن میں سے بعض نے سُن لیا۔ مگر یہ کلام غالباً انہوں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ حالانکہ اس کے صرف اتنے معنے ہیں کہ جب انہوں نے دلائل سے نہ مانا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی صورت میں اُن کے بتوں کی بُرائی اُن پر ظاہر کرنی چاہی۔ جو زیادہ مؤثر دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس نے بڑے بُت کو چھوڑ کر باقی بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے کہ شاید وہ خدا تعالیٰ کی طرف لوٹیں۔ اس پر اس کی قوم کے لوگ بہت بگڑے اور کہا کہ ہمارے معبودوں سے یہ کام کس نے کیا ہے۔ وہ بڑا ظالم ہے جو لوگ ابراہیمؑ سے بحث کر کے آئے تھے انہوں نے کہا کہ

ایک نوجوان ان بتوں کا بُرائی سے ذکر کرتا تھا۔ اُس کا نام ابراہیم ہے۔ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ سے مراد بھی یہی ہے کہ اُن کا بُری طرح ذکر کرتا تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ میں آتا ہے وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (ع) یعنی اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کفار تجھے دیکھتے ہیں تو وہ تجھے ایک حقیر چیز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا بُری طرح ذکر کرتا ہے حالانکہ وہ خود رحمٰن خدا کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔ بہرحال جب ابراہیمؑ کے متعلق کچھ لوگوں نے مذکورہ بالا باتیں کیں تو ابراہیمؑ کی قوم نے کہا کہ سب شہریوں کے سامنے اسکو لاؤ تاکہ جن لوگوں نے اس کو مخالفت کرتے دیکھا ہے وہ اس پر گواہی دیں۔ اس طرح ثابت ہو جائیگا کہ بتوں کا منکر ہی یہ کام کر سکتا ہے۔ یا یہ کہ اس کے متعلق وہ یہ فیصلہ کریں کہ اس کو کیا سزا ملنی چاہیئے اور یا یہ کہ وہ بھی اس کی سزا دیکھیں۔ پھر انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا۔ کہ اے ابراہیم! کیا یہ سب کچھ تیری کرتوت ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ ہاں بَلْ فَعَلَهٗ یہ کام کسی نے کیا تو ضرور ہوگا۔ بغیر کسی کے کرنے کے آپ ہی آپ تو ہو نہیں سکتا۔ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا۔ اب یہ بُت ان میں سے سب سے بڑا ہے تو ان صاحب سے پوچھو اگر بُت بول سکتے ہیں تو یہ صاحب جواب دے دیں گے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ بَلْ فَعَلَهٗ کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ بَلْ فَعَلَهٗ فَاعِلٌ یعنی یہ کام کسی نے تو ضرور کیا ہوگا۔ اس صورت میں بَلْ کے معنے اضراب کے نہیں ہونگے بلکہ تصدیق کے ہوں گے کہ ہاں کسی نے تو کیا ہی ہوگا۔ اور وقف سے ثابت ہوتا ہے

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۹﴾

(اس پر وہ غصہ میں آکر) کہنے لگے اس شخص کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اگر تم نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۷۰﴾

تب ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیم کے لئے ٹھنڈی بھی ہو جا اور اُس کے لئے سلامتی کا باعث بھی بن جا۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور انہوں نے اس سے کچھ بُرا سلوک کرنا چاہا۔ مگر ہم نے اُن کو ناکام بنا دیا ۔ ۷۱ ھ

کہ اگلا حصہ الگ ہے اور اُس میں سوال کیا ہے کہ مجھ سے کیوں پُوچھتے ہو اس بڑے بُت سے پُوچھ لیتے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی عادت کے مطابق تعریضاً کلام کرتے ہیں کہ نہیں میں نے کیوں کرنا تھا اس نے کیا ہوگا۔ ایسے کلام سے مراد انکار نہیں ہوتا بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ کیا یہ سوال بھی پوچھنے والا تھا میں نہ کرتا تو کیا اس بُت نے کرنا تھا!

یہ جواب سُن کر وہ لوگ دلوں میں شرمندہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ تم خود ہی ظالم تھے پھر مزید غور پر اور بھی شرمندہ ہوئے یا اپنی شرارت کی طرف لوٹ آئے اور بولے کہ ابراہیم! تم جانتے ہو کہ یہ تو بولتے نہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا خدا تعالیٰ کے سوا ان بتوں کی تم پرستش کرتے ہو جو تمہیں کچھ بھی نفع نہیں دیتے اور نہ نقصان دیتے ہیں۔

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک زبردست مقابلہ کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بھی آپکی پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور دونوں کو اُن کے چچاؤں نے پالا تھا جو دونوں مشرک تھے۔ دونوں نے

اپنے چچاؤں کو توحید کی تبلیغ کی مگر دونوں نے توحید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں نبی توحید پر بڑی مضبوطی سے قائم تھے اور دونوں علی وجہ البصیرت خدا تعالیٰ کو خالقِ ارض و سما سمجھتے تھے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بُت توڑے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بُت توڑے۔ جب اُن کی قوم کے لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بُت توڑے جبکہ دوپہر کا وقت تھا اور کعبہ کے پاس تمام لوگ جمع تھے۔ آپکے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اُسے آپ سارے مکّہ والوں کے سامنے بتوں پر مارتے اور انہیں گراتے جاتے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اُف بھی کر سکے (تاریخ الحلبیہ جلد ۳) ابراہیمؑ بے شک بڑا آدمی تھا مگر کتنا فرق ہے ابراہیمؑ میں اور میرے محمدؐ میں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَدَدَ كُلِّ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ بَلْ اَكْثَرَ

۷۱ ھ حل لغات:۔ اَلْكَيْدُ: اَلْمَكْرُ وَالْخُبْثُ تدبیر اور کسی کے ساتھ شرارت کرنا۔ اَلْحِيْلَةُ۔ حیلہ۔ اَلْحَرْبُ۔ لڑائی۔ نیز اس کے معنے ہیں اِرَادَةُ مَضَرَّةِ الْغَيْرِ خُفْيَةً۔ دوسرے کو اس طور پر نقصان پہنچانا کہ اس کو معلوم نہ ہو۔ (اقرب)

اَلْكَيْدُ

تفسیر:- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے کہا
کہ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ابراہیمؑ کو جلا دو۔ اور اپنے معبودوں
کی مدد کرو۔ ہم نے کہا۔ اے آگ! تو ابراہیمؑ کے لئے
ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ اور قوم ابراہیمؑ نے اس
کے خلاف ایک تدبیر کرنی چاہی۔ مگر ہم نے اس کو ناکام کر دیا۔
معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیبی سامان یعنی آندھی یا
بارش وغیرہ سے آگ بجھا دی گئی تھی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ
یہ فرماتا ہے کہ اے آگ! ٹھنڈی ہو جا۔ یہ نہیں فرماتا
کہ اے آگ جلا نہیں۔ درحقیقت ایمان بالغیب کے
قیام کے لئے بھی کسی ایسے ہی طریق کی ضرورت ہوتی
ہے جس میں ایک حد تک اخفاء کا بھی پہلو ہو۔ ورنہ ایمان
لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

اس واقعہ میں بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک بڑی مماثلت ہے
قوم ابراہیمؑ نے کہا تھا اس کو جلا دو۔ اور اپنے معبودوں
کی مدد کرو۔ گویا وہ سمجھتے تھے کہ معبودوں کی مدد کا کوئی
راستہ کھلا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
قوم نے آپ کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ انکو قید کر دو یا
قتل کر دو یا اپنے شہر سے جلا وطن کر دو۔ چنانچہ اللہ
تعالےٰ قرآن کریم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے
وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ
يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ
اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (انفال ع۴) یعنی اُس وقت کو
بھی یاد کرو۔ جبکہ کفار تمہارے متعلق یہ منصوبے کر رہے
تھے کہ وہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا تجھے اپنے وطن
سے باہر نکال دیں۔ اور وہ اس کے متعلق بڑی بڑی تدبیریں
سوچ رہے تھے۔ مگر اس کے مقابلہ میں خدا بھی اپنی تدبیر
کر رہا تھا۔ اور خدا تعالےٰ سے بہتر اور کون تدبیر کرنے
والا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مکہ والوں نے لڑائی کی آگ
متواتر دس سال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف
جلائی مگر ناکام رہے اور وہی لڑائیاں جو محمد رسول اللہؐ
کے جلانے کے لئے کی گئی تھیں محمد رسول اللہ کی ترقی اور کامیابی
کا موجب ہوئیں اور آخر محمد رسول اللہ فاتحانہ رنگ میں
مکہ میں داخل ہوئے اور پرانے سے پرانے دشمن آپ کی
بیعت کرنے کے لئے آئے۔ ہندہ کے متعلق آپ نے
کہا تھا۔ کہ چونکہ اُس نے مسلمانوں کے مروانے میں بڑا
حصہ لیا ہے اس لئے جہاں بھی ملے اُسے قتل کر دیا جائے
وہ چادر اوڑھ کر دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بیعت
کرنے کے لئے آگئی۔ اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ اے عورتو! وعدہ کرو۔ کہ ہم شرک نہیں کریں گی
تو ہندہ جو بڑی جوشیلی عورت تھی تڑپ کر بولی۔ یا
رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کریں گی۔ آپ اکیلے تھے
اور ہمارے بُت اور سب عرب والے ہمارے ساتھ تھے
پھر بھی ہم ہار گئے۔ اور آپ جیت گئے۔ ہم ایسے
بیوقوف نہیں کہ اب بھی سمجھیں کہ بُتوں کے ہاتھ میں کوئی
طاقت ہے۔ دیکھو محمد رسول اللہ کی فتح نے مشرکوں
کو کیسا مایوس کر دیا تھا۔ جبکہ ابراہیمؑ کے دشمن آخر تک
کہتے رہے کہ آؤ اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

اس جگہ اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی
ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بُت خانہ کے بُت توڑے
تھے وہ کسی دوسرے کا نہیں تھا۔ بلکہ اُن کا اپنا خاندانی
بُت خانہ تھا اگر وہ دوسروں کا ہوتا تو اس کا توڑنا اُن
کے لئے جائز نہ ہوتا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
خاندان کا اپنا بُت خانہ تھا۔ اور انہیں ورثہ میں ملا تھا
اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن سے ہی
شرک سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے
اس بُت خانہ کو جو اُن کی آمدنی کا ایک بڑا بھاری ذریعہ
اور ملک میں اُن کی عزت اور نیک نامی کا باعث تھا۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۲﴾

اور ہم نے اُسے بھی اور لوطؑ کو بھی اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے تمام جہانوں کیلئے برکتیں رکھی تھیں۔ ۷۲

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور ہم نے اُسے اسحاقؑ بھی بخشا اور یعقوبؑ بھی بطور پوتے کے (دیا) اور ہم نے سب کو نیک بنایا۔ ۷۳

توڑ دیا۔ جب انہوں نے بتوں کو توڑا تو سارے ملک میں ایک شور مچ گیا۔ بادشاہ کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا۔ ملک کے دستور اور بادشاہ کے قوانین کے مطابق اس فعل کی سزا جلا دینا تھا۔ یہ ایک پُرانی رسم تھی کہ جو بتوں کی ہتک کرتا اُسے جلا دیا جاتا تھا۔ کیونکہ بتوں کی ہتک کرنا ارتداد سمجھا جاتا تھا اور ارتداد کی سزا پُرانے زمانہ میں یا تو جلانا تھی یا سنگسار کرنا۔ چنانچہ یورپ میں جب پراٹسٹنٹ عقیدہ کے عیسائی پیدا ہوئے تو انہیں مرتد قرار دے کر آگ میں جلایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایشیا میں سنگسار کرنے کا رواج تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ بتوں کے توڑنے کی وجہ سے یہ سزا تجویز ہوگی۔ مگر خدا تعالےٰ چاہتا تھا کہ اپنا نشان دکھلائے۔ آخر ان لوگوں نے آگ جلائی اور اُس کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈال دیا۔ لیکن عین اس موقعہ پر بادل آیا جس نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس میں سے صحیح سلامت نکل آئے۔ چونکہ بُت پرست بہت وہمی ہوتے ہیں۔ اس لئے جب اِدھر انہوں نے آگ جلائی اور اُدھر بادل آگیا۔ اور آگ بجھ گئی۔ تو انہوں نے سمجھا کہ خدا کی مشیئت یہی ہوگی اس لئے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ دیا۔

۷۲ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے اُور میں رہتے تھے جو عراق کے علاقہ میں تھا۔ وہاں آپ حاران کی طرف جو بالائی عراق میں واقعہ ہے تشریف لے گئے اور وہاں سے کنعان کی طرف خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ نے ہجرت کی اور یہ زمین آئندہ اُن کی اولاد کیلئے مقرر کر دی گئی۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور لوطؑ دونوں کو نجات دی۔ اور کامیاب کر کے فلسطین میں لے گیا۔ بعینہٖ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی دشمنوں سے نجات دی اور آن کے غلام عمرؓ کو ایک فاتح کی شکل میں بیت المقدس میں لے گیا۔

۷۳ حل لغات: نَافِلَةً۔ اَلنَّفْلُ کے معنے ہوتے ہیں اَلزِّيَادَةُ عَلَى الْوَاجِبِ۔ جو کسی کو دینا واجب اور ضروری تھا اس سے زیادہ دیا۔ اور نَافِلَةٌ وَلَدُ الْوَلَدِ کو بھی کہتے ہیں یعنی پوتے کو (مفردات)

تفسیر: پھر فرماتا ہے۔ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ انعام کے طور پر بخشے۔ ایسا ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی وعدہ ہے چنانچہ مسلمانوں کو دُعا سکھائی گئی ہے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ یعنی اے اللہ! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آنے والی روحانی اولاد پر اُسی طرح فضل نازل فرما جس طرح تُو نے ابراہیمؑ اور اس کی اولاد پر فضل نازل فرمائے تھے۔

بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بڑا ہے۔ پھر ایک بڑے

نَافِلَةً ۲

درجہ والے کیلئے یہ دُعا کرنا کہ اُسے وہ کچھ ملے جو اُن سے چھوٹے درجے والے کو ملا تھا۔ اور نہ صرف ایک دفعہ یہ دعا کرنا بلکہ قیامت تک کرتے چلے جانا ایک مضحکہ خیز امر ہے۔ اور یہ ایسی ہی دُعا ہے۔ جیسے کسی ای۔ اے۔ سی کو کہا جائے کہ خدا تمہیں تھانیدار بنا دے۔ اِس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو قسم کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک خوبیاں تو وہ ہیں جو اُن کی ذاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ابراہیمؑ حلیم تھا اوّاہ تھا۔ منیب تھا۔ صدیق تھا۔ خدا کا مقرب تھا۔ اِن خوبیوں اور مدارج کے لحاظ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں اگر آپ افضل نہ ہوتے تو آپ خاتم النبیین اور سید ولد آدمؑ کس طرح ہو سکتے۔ پس جہاں تک محمدی مقام کا سوال ہے وہ ابراہیمی مقام سے یقیناً افضل ہے۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اِن ذاتی خوبیوں کے علاوہ قرآن کریم سے ہمیں اُن کی ایک اور خوبی بھی معلوم ہوتی ہے۔ جو قومی انعام کے رنگ میں ظاہر ہوئی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگی تھی کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲ : ۱۲۹) یعنی اے ہمارے رب ہمیں اپنا سچا فرمانبردار بنائیو۔ اور ہماری ذریّت میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کیجیئو جو تیری رضا کو حاصل کرنے والی اور تیری راہوں پر چلنے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو اس رنگ میں قبول فرمایا کہ وہ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ (عنکبوت ع۳) ہم نے ابراہیمؑ کی ذریت میں نبوت رکھ دی۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے جو کچھ مانگا تھا اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑھ کر آپ کو انعام دیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم درُود میں یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! تُو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی اُسی طرح فضل نازل فرما جس طرح تُو نے ابراہیم پر فضل نازل فرمایا تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدایا جو معاملہ تُو نے ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا وہی سلوک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی کرنا۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ مانگا تھا تُو نے اس سے بڑھ کر ان کو انعام دیا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ مانگا ہے اس سے بڑھ کر آپ کو انعام دیجیئو۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عرفان کے مطابق دُعائیں کیں۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عرفان کے مطابق کیں۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالےٰ سے اتنی دُعائیں کی ہیں کہ مجموعی طور پر تمام انبیاء نے بھی اتنی دُعائیں نہیں کی ہونگی۔ پھر جب یہ مسلّمہ امر ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عرفان ابراہیمی عرفان سے بہت بالا تھا تو پھر یہ بھی یقینی امر ہے کہ آپ کی دعائیں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں سے بڑھی ہوئی تھیں اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو جو کچھ ملنا ہے وہ بھی ابراہیمی انعام سے بہت زیادہ ہے۔ پس درود میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدارج کی بلندی اور آپ کی اُمت کی ترقی کے لئے اتنی جامع دُعا سکھائی گئی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دُعا تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ کیونکہ اس میں یہ سکھایا گیا ہے کہ الٰہی وہ رحمتیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اُن کی ذریّت پر نازل ہوئیں اُن سے بڑھ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل کی جائیں یعنی جس طرح ابراہیمؑ کو اُن کے مانگنے سے بڑھ کر ملا اِسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ مانگا ہے،

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ

اور ہم نے انکو (لوگوں کا) امام بنایا - وہ ہمارے حکم سے اُن کو ہدایت دیتے تھے - اور ہم نے ان کی طرف نیک کام کرنے

فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ

اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی - اور وہ سب

وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا

ہمارے عبادت گذار بندے تھے - اور (ہم نے اسے) لُوطؑ (بھی بخشا) جسے ہم نے حکم بھی عطا کیا اور علم بھی

آپکو بھی اس سے بڑھ کر انعام دیا جائے - اور چونکہ وسعتِ فیض کے لحاظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں بہت بڑھی ہوئی ہیں اس لئے آپ کے انعامات بھی ابراہیمی انعامات سے بہت بڑھ کر ہیں - لوگوں کو غلطی صرف کَمَا کے لفظ سے لگی ہے - حالانکہ اسجگہ مَا مصدریہ ہے اور کَمَا صَلَّیْتَ کے صرف اتنے معنے ہیں کَصَلٰوتِکَ عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ یعنی جس طرح تُونے ابراہیمؑ پر اپنی برکات نازل کیں اسی قسم کی برکات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل فرما - اگر کَمَا صَلَّیْتَ کی بجائے اِلٰی قَدْرِ مَا صَلَّیْتَ کہا جاتا تو بے شک اس کے یہ معنے ہو سکتے کہ تُو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس درجہ کا درود بھیج جس درجہ کا درود تم نے ابراہیم علیہ السلام پر بھیجا تھا - مگر یہاں درجہ کا ذکر نہیں بلکہ قسم کا ذکر ہے اور مراد یہ ہے کہ جس قسم کی برکت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو دی گئی تھی وہی قسم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اولاد کو بھی ملے اور وہ یہی برکت ہے کہ جو کچھ ابراہیمؑ نے مانگا تھا خدا نے اس سے بڑھ کر اُسے انعام دیا - اسی طرح ہمیں یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مانگا ہے اے خدا تُو اُس سے بڑھ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت پر انعام و اکرام کی بارش نازل فرما -

آجکل اسلام کے خلاف سب سے بڑا فتنہ عیسائیت کا ہے - اور عیسائیت اس بات کی مدعی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے - پس درود میں یہ دُعا سکھائی گئی ہے - کہ اے خدا ! یہ جتنی ترقیاں عیسائیت کو مل رہی ہیں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُن وعدوں کی وجہ سے ہیں جو تُو نے اُن سے کئے تھے - ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ابراہیمی وعدوں کی وجہ سے اس کی ایک شاخ جو اسحاقؑ سے تعلق رکھتی تھی اس پر جو تُو نے فضل نازل کئے ہیں اس سے بڑھ کر اسماعیلؑ کی نسل یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ سے تعلق رکھنے والوں پر فضل نازل فرما - اگر اللہ تعالیٰ اُدھر سے اپنی برکتیں ہٹا لے اور اُن کا رُخ اسماعیلؑ کی نسل کی طرف پھیر دے تو عیسائیت ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے -

پس یہ ایک عظیم الشان دُعا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے سکھائی گئی ہے اور پھر یہ ایک ایسی دُعا ہے جس میں دنیا کے ہر ملک اور ہر علاقہ کا مسلمان شامل ہے - گویا یہ ایسی کامل دُعا ہے کہ نہ آقا اس سے

وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ

اور اس کو اس بستی سے نجات دی جو کہ نہایت گندے کام کرتی تھی۔ وہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ

(یعنی لوطؑ کے شہر کے رہنے والے) ایک بہت بُری قوم یعنی نافرمان تھے۔ اور ہم نے اُس (یعنی لوط) کو اپنی

رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۶﴾

رحمت میں داخل کیا۔ وہ ہمارے نیک بندوں میں سے تھا ۴۴؎

۵
ع
۵

باہر رہتا ہے اور نہ امت محمدیہ کا کوئی فرد باہر رہتا ہے آجکل یوروپین اقوام کو جو طاقت حاصل ہے یہ صرف اُن وعدوں کی وجہ سے ہے جو اسحٰقؑ کی نسل سے کئے گئے تھے۔ اگر اب اسماعیلؑ کی نسل سے اس کے وعدے پُورے ہونے شروع ہو جائیں تو عیسائیت اِس طرح ختم ہو جائیگی جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر حزقیلؑ۔ یرمیاہؑ۔ یسعیاہؑ اور یحییٰؑ وغیرہ ختم ہو گئے ہیں اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہو جائیگی جو مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔

۴۴؎ **تفسیر** :- فرماتا ہے۔ یہ سب لوگ اپنے زمانہ کے امام تھے اور خدا تعالیٰ کے حکم کو دنیا میں پھیلاتے تھے بعینہٖ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں کہ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۴۱) یعنی اللہ تعالیٰ میری اُمت میں بھی ہر صدی کے سر پر ایسے انسان مبعوث فرماتا رہیگا جو دین اسلام کی تجدید کریں گے اور انسانوں کی داخل کی ہوئی خرابیوں کو دُور کر کے اسلام کو پھر نئے سرے سے قائم کرینگے۔ یہ حدیث درحقیقت وہی مضمون بیان کر رہی ہے جو قرآن کریم نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر ع ۱) میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی قیامت تک اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ گویا وہی مضمون جو قرآن کریم میں بیان کیا گیا تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے پیرایہ میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے بیان فرما دیا۔ تاکہ ظاہر پرست لوگ اس آیت سے قرآن کریم کی صرف ظاہری حفاظت ہی مراد نہ لے لیں بلکہ وہ سمجھیں کہ اس میں قرآن کریم کی معنوی حفاظت کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ جس کے لئے مجددین اور مامورین کا آنا ضروری ہے۔ اور اگر غور سے کام لیا جائے تو درحقیقت یہی وہ فوقیت ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب پر حاصل ہے۔ ورنہ اگر صرف قصے اور روایات ہی کسی مذہب کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں تو ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں بھی کچھ کم قصے نہیں۔ اسلام کا فخر صرف اس بات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اسلام کی صداقت کے ثبوت کے لئے ایسے مقدس انسان کھڑے کرتا ہے جو خود اپنے وجود کو اسلام کی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کا خدا ہمارے ساتھ اب بھی کلام کرتا اور ہمیں اپنے غیب سے اطلاع دیتا؛

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ

اور (یاد کر) نوحؑ کو جب اُس نے اس (یعنی ابراہیمؑ کے واقعہ) سے پہلے (ہم کو) پکارا۔ اور ہم نے اُسکی دُعا سُنی پس ہم نے اسکو بھی

اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۷﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ

اور اسکے اہل کو بھی ایک بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔ اور ہم نے اس کی اس قوم کے مقابلہ میں مدد کی

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ

جس نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ وہ بہت بُری قوم تھی۔

اگر تمہارے اندر بھی سچائی پائی جاتی ہے تو آؤ اور ہمارا مقابلہ کرلو۔ مگر دنیا کے کسی مذہب کا پیرو اس مقابلہ میں کھڑا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ صرف ایک مردہ مذہب کا پیرو ہے جو اپنی زندگی کا کوئی تازہ ثبوت پیش نہیں کرسکتا۔ گویا اُن کی مثال اس درخت کی سی ہے جو جس کے پتے خزاں کی وجہ سے جھڑ گئے اب نہ وہ اپنے میووں سے کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ اپنی چھاؤں میں کسی کو بٹھا سکتا ہے۔ لیکن اسلام ایک ثمرور درخت ہے جس کے شیریں پھلوں سے کوئی زمانہ بھی محروم نہیں رہتا اور اس طرح اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہر زمانہ میں لوگوں پر روشن ہوتی رہتی ہے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا :- یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نبیوں کی بعثت کی بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اس چشمۂ فیض تک پہنچائیں جس سے سیراب ہوئے بغیر اُن کی روحانی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ یعنی اللہ تعالےٰ سے اُن کو وابستہ کردیں اور اس سے اُس کا مضبوط پیوند کردیں۔ اور یہ بات علوم روحانیہ کے حصول کے بغیر کبھی سرانجام نہیں دی جاسکتی۔ وہی شخص روحانی امور میں لوگوں کو ہدایت دے سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کی معرفتِ تامہ حاصل ہو اور اُس کے قرب کے ذرائع اُسے معلوم ہوں۔ اور اس کی صفات کا باریک در باریک علم اُسے حاصل ہو۔ پس مدّعی ماموریت کے لئے ضروری ہے کہ خدا تعالےٰ خود اُس کی علمی غور و پرداخت کرے۔ اور اُسے ایسے روحانی علوم عطا فرمائے جو اُس زمانہ کے لحاظ سے بے نظیر ہوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت لُوط علیہ السلام کے متعلق بیان فرمایا کہ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا اور اسی طرح اور کئی انبیاء کے متعلق فرمایا کہ ہم نے انہیں اپنے علم سے نوازا تھا۔ درحقیقت علمی معجزات ایک مامور کی صداقت معلوم کرنیکا بڑا زبردست ذریعہ ہوتے ہیں جن کے مقابلہ میں مخالفین بالکل گُنگ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ علمی معجزات اگرچہ دنیا میں ہر نبی کو ملتے چلے آئے ہیں مگر عظمت اور شان کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ ملا ہے۔ اُس کی دُنیا کے اور کسی نبی میں نظیر نہیں مل سکتی۔ باقی انبیاء کے معجزات تو اب ایک قصۂ ماضی کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ جن کا کوئی ثبوت دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکتا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٧٨ وَ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ

پس ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔ ۴۵ اور (یاد کر) داؤد کو بھی اور سلیمان کو بھی جبکہ وہ دونوں ایک

فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا

کھیتی کے جھگڑے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ اس وقت جبکہ ایک قوم کے عامی لوگ اسکو کھا گئے تھے (یعنی تباہ کر گئے تھے)

لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝٧٩ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا

اور ہم اُن کے فیصلہ کے گواہ تھے۔ ہم نے اصل معاملہ سلیمان کو سمجھا دیا اور سب کو ہی ہم نے

وہ علمی نشان بخشا گیا ہے جو قیامت تک زندہ رہنے والا اور ہر زمانہ میں دشمنوں پر حجت تمام کرنے والا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی پاک کتاب عطا فرمائی جس کے متعلق رہتی دنیا تک یہ کھلا چیلنج موجود ہے کہ اگر تم میں ہمت ہے تو آؤ اور اس کتاب کی نظیر تیار کر دو۔ اگر اور نہیں تو اس کی ایک سورۃ میں ہی جسقدر علوم اور معارف اور پیشگوئیاں اور تزکیہ نفس کے ذرائع وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اُسی قدر حقائق اور معارف جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر دکھا دو۔ مگر تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا دنیا اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکی۔ اور قیامت تک وہ اسی طرح اس چیلنج کو قبول کرنے سے گریز کرتی رہیگی اور اسطرح ہر عقلمند انسان یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم کا مقابلہ کرنا ناممکن امر ہے۔

۴۵ حل لغات :- اَلْكَرْبُ کے معنے ہیں اَلْحُزْنُ وَالْغَمُّ يَاْخُذُ بِالنَّفْسِ۔ غم و اندوہ جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر :- اسجگہ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے خدا تعالیٰ سے دُعا کی اور خدا نے اُسے قبول کر لیا۔ اس ذکر سے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذکر کو آدمؑ تک پہنچا دیا گیا ہے کیونکہ نوحؑ آدمؑ کا پوتا تھا اور وہ پہلا نبی تھا جسپر شریعت کا نزول ہوا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا ہے کہ اَوَّلُ نَبِيٍّ شُرِّعَتْ عَلٰى لِسَانِهِ الشَّرَائِعُ کہ نوحؑ پہلا نبی تھا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت نازل ہوئی۔ اس مضمون کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (نساء ع ۲۳) یعنی اے محمد رسول اللہ! ہم نے تیری طرف اُسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ اور اس کے بعد آنے والے انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔ گویا قرآن کریم کے رو سے عقائد کے متعلق پہلی وحی حضرت نوح علیہ السلام کو ہوئی۔ کیونکہ اس زمانہ میں ایک طرف تو انسانی دماغ کا ارتقاء اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اس نے صفاتِ الٰہیہ کا ادراک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور دوسری طرف انسانوں میں وہ گناہ پیدا ہونے لگ گئے تھے جو تمدن کا ایک لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ پس خرابیوں کی اصلاح اور مزید روحانی ترقیات کا دروازہ کھولنے کے لئے

اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ

حکم اور علم عطا فرمایا تھا - اور ہم نے داؤد کے ساتھ اہل جبال کو بھی اور پرندوں کو

يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۸۰ وَ عَلَّمْنٰهُ

بھی کام پر لگا دیا تھا وہ سب خدا کی تسبیح کرتے تھے اور ہم یہ سب کچھ کرنے پر قادر تھے - اور ہم نے اسکو ایک لباس

صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ

کا بنانا سکھایا تھا - تاکہ وہ تمہاری جان لڑائی میں بچائے - پس کیا

اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝۸۱ وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ

تم شکرگذار بنوگے ؟ اور ہم نے سلیمان کے لئے تیز ہوا کو بھی مسخر کر چھوڑا تھا

بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝۸۲

جو اسکے حکم کے مطابق چلتی تھی اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم سب کچھ جانتے ہیں - ۵۴۶

حضرت نوح علیہ السلام کو پہلا شارع نبی بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کے پیرؤں میں سے ہی تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (صافات ع) یعنی ابراہیمؑ بھی نوحؑ کے گروہ میں سے تھا اور چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنے زمانہ کے نوح تھے اور نوحؑ والا پیغام آپ کی وحی میں بھی شامل تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں نوحؑ کا ذکر کرکے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر شریعت لعنت ہے تو پھر نوحؑ کا بھی انکار کرو جس کے ذریعہ نسل انسانی کے لئے شریعت کا آغاز ہوا۔ اور جس کے پیرؤں میں ابراہیمؑ جیسا جلیل القدر نبی بھی شامل تھا۔ اور اگر شریعت لعنت نہیں بلکہ ہمیشہ شریعت کا انکار کرنے والے سزایاب ہوتے رہے ہیں جس طرح نوحؑ کے زمانہ میں وہی لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے نوحؑ کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا اور وہی لوگ کامیاب ہوئے جو آپ کی ہدایت پر چلے۔ تو اب بھی یاد رکھو کہ کامیابی انہی کو حاصل ہوگی۔ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور آپ کے مخالفوں کو سوائے ناکامی و نامرادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

نَفَشَتْ ۔ اَلْجِبَالُ

۵۴۶ حل لغات

نَفَشَتْ :- نَفَشَتْ نَفَشَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور نَفَشَتِ الْاِبِلُ اَوِ الْغَنَمُ کے معنے ہیں رَعَتْ لَيْلًا بِلَا رَاعٍ - رات کے وقت اونٹ یا بکریاں کھیتی کو چر گئیں جبکہ کوئی گڈریا یا نگہبان شخص ان کو روکنے والا نہ تھا۔ (اقرب)

اَلْجِبَالُ ۔ اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ

کے معنے ہیں پہاڑ - نیز اس کے معنے ہیں صَبِیْدُ الْقَوْمِ وَ عَالِمُهُمْ - قوم کا سردار اور عالم - (اقرب)

عَاصِفَةً - عَصَفَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور عَصَفَ الرِّیْحُ عَصْفًا کے معنے ہیں اِشْتَدَّتْ - ہوا سخت تیز چلی (اقرب) پس عَاصِفَةً کے معنے ہونگے - تیز چلنے والی -

تفسیر: - پھر فرماتا ہے کہ داؤدؑ اور سلیمانؑ کو یاد کرو - جبکہ وہ ایک کھیتی کے بارہ میں فیصلہ کر رہے تھے - جبکہ اُس کھیتی میں قوم کی بکریاں داخل ہو کر کھیتی کھا گئی تھیں - مفسرین کہتے ہیں کہ کسی کی کھیتی بکریاں چر گئی تھیں - حضرت داؤدؑ نے بکریاں کھیتی والے کو دلا دیں - حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں - بکریوں والا پانی دے اور کھیتی ہری کرے - اور جب کھیتی پہلے جیسی ہو جائے تو اپنی بکریاں واپس لے لے - اس فیصلہ میں اگر یہ واقعہ اِسی طرح ہوا ہو تو کوئی خاص بات نہیں کہ جسے قرآن کریم میں اس جگہ بیان کیا جائے -

میرے نزدیک اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی نبی کی قوم عزت پاتی ہے تو داؤدؑ اور سلیمانؑ کے زمانہ کی طرح اُن کی قوم کے حریص لوگ نظام میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چارپایہ مزاج لوگ دین کی کھیتی کو چرنے لگ جاتے ہیں - فرماتا ہے اس کا علاج ہم نے سلیمانؑ کو سکھا دیا تھا جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کی ہمسایہ قومیں جو چھاپے مار کر اُن کی حکومت کو برباد کرنا چاہتی تھیں اُن کے حملوں سے اُس نے اپنی مملکت کو بچا لیا اور نظام کی حفاظت کی -

بے شک سلیمانؑ اور داؤدؑ دونوں کو بادشاہت بھی ملی تھی اور علم بھی ملا تھا مگر اس بارہ میں سلیمانؑ کا طریق ٹھیک تھا - اصل بات یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ جنگی آدمی تھے اور انہوں نے ظالموں اور مفسدوں کو بڑی سخت سزائیں دی تھیں - بلکہ بعض جگہ اُن کے دو تہائی مرد قتل کر دیئے تھے - حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ فہم عطا فرمایا کہ اب ہمسایوں سے نرمی کرو تو اُنکی عداوت کم ہو جائیگی - چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے زیادہ تر معاہدات سے کام لیا اور اس طرح تمام ہمسایوں سے اپنی مملکت کو بچا لیا - مگر اس کے علاوہ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ میں ایک اور حکمت بھی مدنظر رکھی گئی ہے - اور وہ یہ کہ اسرائیلی مصنّفوں بلکہ یورپ کے مصنفوں کا بھی خیال ہے کہ حضرت داؤدؑ کی پالیسی اعلیٰ تھی اور حضرت سلیمانؑ کا طریق عمل ناقص تھا - اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے سلیمانؑ کو اس جھگڑے کا فیصلہ کرنا خوب سکھایا تھا اور چونکہ اس سے شبہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر کیا داؤدؑ کو نہیں سکھایا تھا؟ اِس لئے اگلے حصہ میں وَ کُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا کہہ کر اُس کا بھی ازالہ کر دیا اور بتا دیا کہ حضرت سلیمانؑ کو سکھانے سے یہ مراد نہیں کہ حضرت داؤدؑ کا طریق عمل غلط تھا بلکہ اس سے سلیمانؑ پر عائد کردہ ایک الزام کا ازالہ مقصود ہے -

اس کے بعد فرماتا ہے کہ داؤدؑ کے ساتھ بھی بڑے بڑے لوگ شامل تھے - جو اس کے ساتھ مل کر خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی اُس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے - یعنی روحانی لوگ بھی اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کی پرواز اور نظریں آسمان پر ہوتی ہیں -

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَ کُنَّا فٰعِلِیْنَ - یعنی ہم نے داؤدؑ کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا جو ہر وقت تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی مسخر کر دئے تھے اور ہم یہ سب کچھ کرنے پر قادر تھے - اِسی مضمون سے ملتا جلتا مضمون

عَاصِفَةً

بعض دوسری سورتوں میں بھی بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ سبا رکوع ۲ میں بھی آتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۗ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ یعنی ہم نے داؤد پر بڑا فضل کیا۔ اور ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ اے پہاڑو! اس کے ساتھ چلو۔ اور پرندوں کو بھی حکم دے دیا کہ اس کے ساتھ رہیں۔ اس کے لئے ہم نے لوہا نرم کر دیا۔ اور اُسے کہا کہ اس لوہے سے زرہیں بناؤ اور نیک اعمال کرو۔ میں تمہارے کاموں سے خوب واقف ہوں۔

اسی طرح سورۂ نمل میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (نمل ع ۲) یعنی حضرت سلیمانؑ داؤدؑ کے وارث بنے اور انہوں نے کہا۔ اے لوگو! مجھے اور میرے باپ کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ اور ہم کو ہر چیز دی گئی ہے۔ اور ہم پر یہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔ اور سلیمان کے لئے لشکر جمع کئے گئے۔ وہ لشکر انسانوں کے بھی تھے اور جنّوں کے بھی تھے اور پرندوں کے بھی تھے۔

پھر سورۂ ص رکوع ۲ میں آتا ہے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۔ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۔ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ۔ یعنی ہمارے بندے داؤدؑ کو بھی یاد کرو۔ جو بڑی طاقت والا تھا۔ وہ ہماری درگاہ میں بات بات پر جھکتا تھا۔ ہم نے اس کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے تھے جو صبح و شام تسبیح کرتے تھے۔ اسی طرح پرندے بھی اس کی خاطر اکٹھے کر دیئے تھے۔ اور یہ سب کے سب اُس کے کامل مطیع اور فرمانبردار تھے۔

اِن آیات کی بنا پر مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں پہاڑ بھی تھے، جنّ بھی تھے۔ پرندے بھی تھے اور وہ سب مل کر حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ذکر الٰہی کرتے تھے۔ جب وہ کہتے سبحان اللہ تو پہاڑ بھی اور پرندے بھی اور جنّ بھی اور حیوانات بھی سب سبحان اللہ کہنے لگ جاتے۔ جیسے کشمیری واعظوں کا دستور ہے کہ لیکچر دیتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد خود سستانے کیلئے کہہ دیتے ہیں۔ "پڑھو درود"۔ وہ بھی گویا اسی طرح کرتے تھے۔ جب خود ذکر الٰہی کرتے کرتے تھک جاتے تو کہتے ہمالیہ کر تسبیح اور وہ تسبیح کرنے لگ جاتا۔ پھر جب انہیں آرام آجاتا تو کہتے چپ کر جاؤ۔ اب میں تسبیح کرتا ہوں۔ بعض کہتے ہیں۔ پہاڑوں وغیرہ کا سبحان اللہ کہنا کونسی بڑی بات تھی وہ باقاعدہ رکوع و سجود بھی کرتے تھے۔ جب حضرت داؤدؑ سجدہ میں جاتے تو سارے پہاڑ اور پرند چرند بھی سجدہ میں چلے جاتے۔ اور جب وہ رکوع کرتے تو سب رکوع کرنے لگ جاتے۔ بعض کہتے ہیں اس تاویل سے بھی مزہ نہیں آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ جہاں بھی جاتے۔ پہاڑ آپ کے ساتھ چل پڑتے۔ حضرت داؤدؑ تھے شام میں اور یہ ہمالیہ۔ شوالک اور ایلپس سب آپ کے ساتھ ساتھ پھرا کرتے تھے۔ اسی طرح

پرندے بھی مل کر تسبیح کرتے تھے۔ اُن دنوں چڑیاں چوں چوں نہیں کرتی تھیں۔ بکریاں مَیں مَیں نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ سب سبحان اللہ سبحان اللہ کہا کرتی تھیں۔ کوئی یہ نہ پوچھے کہ بکری کس طرح پرندہ ہو گیا۔ کیونکہ تفسیروں میں اسی طرح لکھا ہے۔ غرض وہ عجیب زمانہ تھا۔ اسی طرح سلیمانؑ پر خدا تعالیٰ نے ایک اور مہربانی کی۔ اور وہ یہ کہ جن اُن کے حوالے کر دیئے جو اُن کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ جب وہ چلتے تو پرندے اُن کے سر پر اپنے پر پھیلا کر سایہ کر دیتے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ حضرت داؤدؑ بڑے شکّی طبیعت کے آدمی تھے۔ جب کہیں باہر جاتے تو اپنی بیویوں کو گھر میں بند کر جاتے۔ ایک دفعہ گھر میں آئے تو دیکھا۔ ایک جوان مضبوط آدمی اندر پھر رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ اندر آ گیا ہے۔ پھر اُس سے پوچھا کہ جب مکان کے تمام دروازے بند تھے تو تُو اندر کس طرح آ گیا۔ وہ کہنے لگا میں وہ ہوں جسے دروازوں کی ضرورت نہیں۔ آپ نے پوچھا کیا تو ملک الموت ہے۔ اُس نے کہا۔ ہاں۔ اور اُس نے آپ کی جان نکال لی حضرت داؤد علیہ السلام کو جب دفن کرنے لگے تو تمام پرندے اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے آپ پر پروں سے سایہ کیا۔

کہتے ہیں حضرت سلیمانؑ تمام پرندوں کی بولی جانتے تھے۔ کسی نے کہا کہ جانوروں کی بولیاں جانتے تھے یا نہیں تو مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جانتے تو تھے مگر اختصار کے لحاظ سے صرف پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی تو لوگوں نے حضرت سلیمانؑ سے کہا کہ چلیں استسقاء کی نماز پڑھائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا۔ گھبراؤ نہیں بارش ہو جائیگی۔ کیونکہ ایک کیڑی پیٹھ کے بل کھڑے ہو کر کہہ رہی تھی کہ خدایا اگر بارش نہ ہوئی تو ہم مر جائیں گی۔ (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد ۷ صفحہ ۲۰۴ تا ۲۱۰)

یہ وہ واقعات ہیں جو استعارے اور تشبیہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مفسرین کو گھڑنے پڑے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے داؤدؑ کے لئے پہاڑوں کو مسخّر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ایسے قصوں کی ضرورت ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق اگر خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے اس کے لئے پہاڑ مسخر کر دئے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق بھی قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (الجاثیہ ع۲) فرماتا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مومنو! اور اے کافرو اور اے منافقو! ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے سمندر مسخر کر دئے ہیں جس میں کشتیاں اُس کے حکم سے چلتی ہیں۔ تاکہ تم خدا کا فضل تلاش کرو۔ اور صرف سمندر ہی نہیں آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اور اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بڑے بڑے نشانات ہیں۔ اب اس آیت سے حضرت داؤد علیہ السلام والی آیت بالکل حل ہو جاتی ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان میں جسقدر چیزیں ہیں خواہ دریا ہیں یا پہاڑ سب انسان کے لئے مسخر ہیں اب یہ عجیب بات ہے کہ پہاڑ میرے لئے بھی مسخر ہوں مگر میرے ساتھ ہمالیہ کی ایک اینٹ بھی نہ چلے اور داؤدؑ کے ساتھ پہاڑ کا پہاڑ چلنے لگ جائے۔ اگر

داؤدؑ کے ساتھ یہ واقعات ہوئے ہیں تو ہمارے ساتھ بھی ہونے چاہئیں۔ اور اگر ہمارے ساتھ نہیں ہوتے تو صاف پتہ لگ گیا کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

اَب رہا سوال تسبیح کا۔ کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ قرآن میں تو لکھا ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ کیا اب بھی یہ چیزیں تسبیح کرتی ہیں؟ سو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ جمعہ میں دے دیا ہے۔ فرماتا ہے یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ یعنی سورج بھی تسبیح کر رہا ہے۔ چاند بھی تسبیح کر رہا ہے۔ ستارے بھی تسبیح کر رہے ہیں اسی طرح مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تسبیح کر رہے ہیں۔ درخت بھی تسبیح کر رہے ہیں اُس کے پتے بھی تسبیح کر رہے ہیں۔ آم بھی تسبیح کر رہا ہے کیلا بھی تسبیح کر رہا ہے بلکہ کیلے کا چھلکا جو ہم اتار کر پھینک دیتے ہیں وہ بھی تسبیح کر رہا ہے۔ روٹی بھی تسبیح کر رہی ہے تھالی بھی تسبیح کر رہی ہے۔ جب تم چائے پیتے ہو تو تمہارے ہونٹ بھی تسبیح کر رہے ہوتے ہیں۔ چائے بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ مصری یا کھانڈ بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ پیالی بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ پرچ بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے اسی طرح مکان بھی اور چھت بھی اور دیواریں بھی اور دروازے بھی۔ اسی طرح وہ بستر جس پر تم لیٹتے ہو وہ بھی بستر کی چادر اور توشک اور رضائی بھی سب سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہی ہوتی ہیں۔ اور جب ہر چیز سبحان اللہ کہہ رہی ہے تو حضرت داؤدؑ کے لئے اگر یہی الفاظ آجائیں تو اس کے نئے معنے بن جاتے ہیں۔ دیکھ لو۔ وہ دونوں باتیں جو حضرت داؤدؑ کے متعلق کہی گئی تھیں ہمارے لئے بھی موجود ہیں۔ ہمارے لئے بھی خدا کہتا ہے۔ کہ میں نے ہر چیز مسخر کر دی اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے۔ بلکہ حضرت داؤدؑ کے لئے تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ پہاڑ اور پرندے تسبیح کرتے تھے مگر ہمارے لئے یہ کہا گیا ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب تسبیح کرتے ہیں۔ اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ تسبیح سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز یہ ثابت کر رہی ہے کہ خدا بے عیب ہے۔ چونکہ اسلام نے دنیا بھر کے عیب دُور کرنے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ تسبیح کر رہا ہے لیکن حضرت داؤدؑ نے چونکہ صرف جبال یعنی اہلِ جبال سے عیب دُور کرنے تھے اور وہ ساری دنیا کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک محدود مقام کی طرف تھے اس لئے حضرت داؤدؑ کے لئے صرف جبال نے تسبیح کی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ سارے جہان کی طرف تھے۔ اس لئے آپ نے فرمایا جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں جو تسبیح نہیں کر رہا۔ اس لئے ہم جہاں جائیں گے وہ مسجد بن جائیگی۔ پس یُسَبِّحُ لِلّٰهِ والے مضمون کو داؤدؑ کے مضمون میں محدود کر کے صرف پہاڑوں تک رکھا گیا۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کے لئے تھے۔ اور حضرت داؤدؑ صرف چند اہلِ جبال کے لئے۔

باقی رہا اَوِّبِيْ مَعَهٗ کے الفاظ سے یہ استدلال کہ پہاڑ حضرت داؤدؑ کے ساتھ اُن کی تسبیح میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل دنیا کا ذرّہ ذرّہ تسبیح میں شامل ہے۔ کوئی کہے کہ پھر حضرت داؤدؑ کی خصوصیت کیا ہوئی تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس میں تو اُن کی کوئی خصوصیت نہیں کہ پہاڑ اُن کے لئے مسخر تھے۔ کیونکہ

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کے لئے مسخر کر دیا ہے جس ملک کا خدا تعالیٰ کسی کو بادشاہ بنا دیتا ہے اُس میں اُسے عام انسانوں سے زیادہ عظمت حاصل ہوتی ہے۔ پس گو زمین و آسمان کی چیزیں حضرت داؤدؑ کے لئے اسی طرح مسخر تھیں جس طرح تمام بنی نوع انسان کے لئے۔ لیکن حضرت داؤدؑ کو ایک زائد فائدہ یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو بادشاہ بھی بنا دیا تھا۔ پس گو تسخیر بعینہٖ وہی ہے جو ہر انسان کے لئے ہے۔ مگر اس تسخیر کی عظمت میں فرق ہے۔

اب میں لغت سے بتاتا ہوں کہ اس کے اور معنے بھی ہیں۔ چنانچہ جبل کے معنے لغت میں سَیِّدُ الْقَوْمِ کے لکھے ہیں۔ پس حضرت داؤدؑ کے لئے جبال مسخر کر دینے کے معنے یہ تھے کہ حضرت داؤدؑ یہود کے وہ پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے اردگرد کے قبائل پر فتح پائی اور وہ انکے ماتحت ہوگئے۔ حضرت داؤدؑ سے پہلے کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہوا جس نے اپنی قوم کے علاوہ دوسری اقوام پر بھی حکومت کی ہو۔ لیکن حضرت داؤدؑ پہلے بادشاہ تھے جن کے اردگرد کے حکمران اُن کے مطیع ہوگئے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو یُسَبِّحْنَ کا لفظ آیا ہے تم اس کے معنے مطیع کے کس طرح کرتے ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جبال چونکہ مؤنث ہے اس لئے یُسَبِّحْنَ کا لفظ آیا ہے۔ ورنہ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ قومیں آپ کی مطیع ہوگئی تھیں۔ اور پھر اقوام کا لفظ بھی عربی میں مؤنث ہے۔ کیونکہ وہ جمع ہے اور جمع مؤنث ہوتی ہے۔

باقی رہے طیور۔ سو طیور کے لئے تسبیح قرآن میں آئی ہی نہیں اور اس امر کا کہیں ذکر نہیں۔ کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ مگر لوگوں کو عربی کے ایک معمولی قاعدہ سے ناواقفیت کی وجہ سے دھوکا لگ گیا۔ اور وہ خیال کرنے لگے کہ جبال کے ساتھ طیور بھی تسبیح کیا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۔ یہاں طیر پر زبر ہے اور زبر دینے والا سَخَّرَ کا لفظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے داؤدؑ کے لئے پہاڑ مسخر کر دئے تھے جو تسبیح کرتے تھے۔ اسی طرح ہم نے طیر بھی مسخر کر دئے۔ یہاں کوئی تسبیح کا ذکر نہیں صرف اتنے معنے کئے جا سکتے ہیں کہ انہیں پرندوں سے کام لینے کا علم آتا تھا۔ جیسے کبوتروں سے خبر رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ پس قرآن میں سَخَّرْنَا الطَّيْرَ ہے یُسَبِّحْنَ کا فاعل اَلطَّيْرُ نہیں ہے۔

دوسری آیت یہ ہے:۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (ص ع ۲) یہاں بھی طَیْر کا ناصب سَخَّرَ ہے۔

تیسری آیت یہ ہے:۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ (سبا ع ۲) ہم نے داؤدؑ پر بڑا فضل کیا۔ اور پہاڑوں سے کہا۔ اے پہاڑو۔ تم اس کے ساتھ گونج پیدا کرو۔ اسی طرح ہم نے اُسے پرندے بھی دئے۔ گویا یہاں بھی اٰتَيْنَا الطَّيْرَ فرمایا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ پرندے تسبیح کیا کرتے تھے۔ غرض طَیْر کا ناصب یا سَخَّرَ ہے یا اٰتٰی ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے حضرت داؤدؑ کو طیر بھی دئے تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں اس کے معنے اگر تسبیح کے بھی کر لو تو جب زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے تو پرندوں کی تسبیح میں کونسی عجیب بات ہو سکتی ہے۔ مجھے ہمیشہ آجکل کے مسلمان مولویوں پر تعجب آیا کرتا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ یا حضرت سلیمانؑ یا حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے متعلق کوئی آیت آئے تو اس کے وہ اور معنے لے لیتے ہیں لیکن

اگر ویسی ہی آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے آجائے۔ تو اُس کے اَور معنے کر لیتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہاڑ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے تو کہتے ہیں پہاڑ واقعہ میں سبحان اللہ سبحان اللہ کیا کرتے تھے اور جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ کہے کہ ہم نے زمین و آسمان مسخر کر دئے۔ تو کہیں گے یہاں تشبیہہ مراد ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ذکر آئے کہ انہوں نے مردے زندہ کئے تو کہیں گے۔ یہاں مُردوں سے روحانی مُردے مراد ہیں لیکن حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق اگر یہ الفاظ آجائیں تو جب تک وہ یہ نہ منوالیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے مُردوں کے نتھنوں میں پھونک مار کر انہیں زندہ کر دیا تھا اس وقت تک انہیں چین ہی نہیں آتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا طَیر کے متعلق قرآن کریم میں کوئی اشارہ ہے یا نہیں۔ سو جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ طیر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (انعام رکوعؑ) کہ زمین پر چلنے والے جانور اور پرندے سب تمہاری طرح قومیں اور گروہ ہیں۔ اب یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے پرندوں کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کہ وہ پرندے جو اپنے پروں کے ساتھ اُڑتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرندہ ایسا بھی ہوتا ہے جو پروں سے نہیں اُڑتا۔

پھر اس سے بھی واضح آیت ایک اور ملتی ہے جس سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ واقعہ میں طیر کسی اَور چیز کا نام ہے۔ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (نور ع) فرماتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وہ تمام ذوی العقول کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ وہ طیر بھی جو صفیں باندھ باندھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اور ان گروہوں میں سے ہر ایک کو نماز اور تسبیح کا طریق معلوم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان ذوی العقول کے تمام اعمال سے واقف ہے۔ یہاں تین دلیلیں اس بات کی موجود ہیں کہ طیر سے مراد پرندے نہیں۔ اوّل مَنْ کا لفظ ہمیشہ ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ غیر ذوی العقول کے لئے نہیں۔ پھر یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں سے صرف طیر کو کیوں نکالا۔ جنّات اور دوسری مخلوق کا الگ ذکر کیوں نہیں کیا۔ کیا اس سے صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ طیر کوئی الگ چیز ہے۔ پھر فرماتا ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ اب سارے قرآن میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ پرندے بھی نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ وہ خالی تسبیح ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں نماز کا بھی علم ہے اور وہ صفیں باندھ باندھ کر نمازیں پڑھتے ہیں۔ آخر میں فرمایا۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ اور يَفْعَلُوْنَ کا صیغہ پھر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ آخر تم نے کبھی ایسے طیر بھی دیکھے ہیں جو صفیں باندھ باندھ کر نمازیں پڑھتے ہوں۔ ایسے طیر تو دنیا میں صرف مسلمان ہی ہیں اور کوئی نہیں۔ پس مَنْ کا استعمال كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ کا استعمال اور وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس میں انسانوں کا ہی ذکر ہے خصوصاً وہ بلند مرتبہ انسان جو باجماعت نمازیں ادا کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر طیر سے مراد اسجگہ مومن ہی ہیں تو پھر انہیں طیر کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی اعمال کا جو نتیجہ ہو یا فطرتی طاقت ہو اُسے عربی میں طائر کہتے ہیں۔ اور اس کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں فرماتا ہے فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (اعراف ع۱۶) فرماتا ہے جب اُن کو کوئی خوشی پہنچتی ہے۔ تو کہتے ہیں یہ ہمارا حق ہے اور جب انکو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں۔ یہ موسیٰؑ کے بدعمل کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اُن کا پرندہ خدا خدا کے پاس ہے۔ اب وہ تو کہتے ہیں کہ ہم پر موسیٰؑ کی وجہ سے عذاب آیا ہے۔ اور خدا کہتا ہے تمہارا پرندہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اِن دونوں کا آپس میں جوڑ کیا ہوا اس کے لئے لُغت دیکھی جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے لُغت میں لکھا ہے کہ طائر انسانی عمل کو بھی کہتے ہیں (اقرب) اور اسجگہ یہی معنے مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے تمام اعمال ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ پھر فرماتا ہے:- قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ (النمل ع۴) جب ثمود کے پاس حضرت صالحؑ نبی آئے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ تیرے اور تیرے ساتھیوں کے بُرے عمل کی وجہ سے ہم تباہ ہوئے ہیں۔ جیسے آج کل کہتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب کی وجہ سے ہی طاعون اور دوسری وبائیں آئیں۔ فرماتا ہے اُن کے نبی نے اُن کو جواب دیا کہ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ کہ تمہارا طائر خدا کے پاس ہے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ بلکہ تم ایک ایسی قوم ہو جس کے پاس اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے والا ہے۔

پھر تین رسولوں کا سورۃ یٰس میں ذکر کرکے فرماتا ہے قَالُوْۤا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (یٰس ع۲) یعنی جب وہ مصلح اور رسول اُن کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری وجہ سے بڑی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ انہوں نے کہا۔ تمہارا پرندہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے عمل تمہیں تباہ کریں گے۔ ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اِن تمام مقامات پر طائر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قوتِ عملیہ اور نتیجہ عمل کے معنوں میں ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کے استعمال کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کی انسان کے ساتھ نسبت کیا بنتی ہے؟ سو اس کے متعلق جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں سورۂ بنی اسرائیل میں ایک آیت نظر آتی ہے جو ہمیں اس مضمون کے بہت زیادہ قریب کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل ع۲) فرماتا ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ہم نے ایک پرندہ اس کی گردن کے نیچے باندھا ہوا ہے۔ اور ہم قیامت کے دن اس کے اعمالنامہ کو اس کے سامنے لائیں گے اور کہیں گے اسے پڑھ ہم حساب نہیں کرتے تو اپنی نیکی بدی کا حساب کر لے۔ جو ہدایت پاتا ہے وہ اپنے لئے پاتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اس کا نقصان بھی اُسی کو ہوتا ہے۔ کوئی کسی کا

بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ اور ہم اُس وقت تک لوگوں کو عذاب نہیں دیتے جب تک کوئی رسول مبعوث نہ کریں ۔

یہاں قرآن کریم نے طائر کے نہایت لطیف معنے کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ہر انسان کی گردن کے نیچے پرندہ ہے ۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے ۔ سو جب ہمیں خدا نے بتا دیا ہے کہ یہ پرندہ ہر انسان کی گردن کے نیچے ہے ۔ تو ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے کہ کوئی پرندہ گردن کے نیچے نہیں ہوتا ۔ پس صاف معلوم ہوا کہ اس پرندے سے مراد کوئی اور چیز ہے اور وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ قوت عمل یا نتیجۂ اعمال کا نام خدا تعالےٰ نے طائر رکھا ہے ۔ پس جو بھی انسان اعمال کرتا ہے ۔ اُن کی پرندے والی شکل بنتی چلی جاتی ہے ۔ اگر تو انسان نیک اعمال بجا لائے ۔ تو وہ انسان کو آسمان روحانیت کی طرف اُڑا کرلے جائیں گے جیسے ہوائی جہاز فضائے آسمان میں اُڑا کرلے جاتا ہے ۔ اور اگر بُرے اعمال ہوں گے ۔ تو لازماً پرندہ بھی کمزور ہوگا ۔ اور انسان بجائے اوپر اُڑنے کے نیچے کی طرف گریگا ۔ اَب قرآن کریم ایک طرف تو یہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کے ساتھ ایک طائر باندھ رکھا ہے ۔ اگر وہ اچھے عمل کریگا تو وہ طائر اُسے اوپر اُڑا کرلے جائیگا ۔ اور اگر بُرے اعمال کریگا تو وہ اُسے نیچے گرا دیگا ۔ دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ کہ ہر انسان کے اندر خدا تعالیٰ نے ترقی کی قابلیت رکھی ہوئی ہے ۔ پھر ماں باپ اسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں ۔ گویا ہر انسان میں اڑنے کی طاقت ہے ۔ یہی مضمون کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ میں بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا پرندہ بھی اس کے ساتھ پیدا کر دیا جاتا ہے ۔ پھر بعض ماں باپ اسکا گلا گھونٹ دیتے ہیں ۔ اور بعض جو بچ جاتے ہیں اُن کیلئے دوسری صورت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ انسان طائر جو اچھے لوگ ہوتے ہیں عمل نیک کی وجہ سے اُن کا طائر یعنی مادہ ترقی کرتا رہتا ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ فاطر میں فرماتا ہے ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (کہ سب تعریفیں اس اللہ کی ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے ۔ اور جس نے فرشتوں کو بنایا جن کے پر ہوتے ہیں دو دو ۔ تین تین اور چار چار ۔ پھر انسانوں کی طرف آتا ہے اور فرماتا ہے ۔ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ۔ وَ الَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ یَبُوْرُ ۔ (فاطر ع ۲) یعنی ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ فرشتوں کے ہم نے ترقی کے لئے کئی کئی پر بنائے ہیں مگر اے انسانو! یاد رکھو کہ تمہارے لئے بھی ترقی کے مواقع ہیں بلکہ تم اگر چاہو تو فرشتوں سے بھی بڑھ سکتے ہو ۔ یاد رکھو ۔ تمام عزت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۔ اور اسی کی طرف سچی اور پاکیزہ روحیں بلند ہوتی ہیں ۔ یعنی جن میں خدا کا کلام داخل ہو وہ ترقی کر جاتے ہیں ۔ مگر خالی نہیں بلکہ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ اعمال صالحہ کا اُسے سہارا چاہیئے ۔ گویا اَلْكَلِمُ الطَّیِّبُ ایک پرندہ ہے مگر وہ اکیلا نہیں اڑ سکتا بلکہ اعمال صالحہ کی مدد سے صعود کرتا ہے ۔ اور اس طرح اس کے دو پر بن جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ آسمانِ روحانیت کی طرف پرواز کرنے لگ جاتا ہے ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ پرندے کی دو خاصیتیں ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ وہ اونچا جاتا ہے ۔ یعنی

فضا میں اُڑتا ہے - دوسرے یہ کہ اُس کا آشیانہ ہمیشہ اونچا ہوتا ہے - اور بہت شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا آشیانہ اونچی جگہ نہ ہو - جو پرندے آشیانوں میں رہتے ہیں - وہ بھی درختوں کی ٹہنیوں پر آشیانہ بناتے ہیں اور جو بغیر آشیانے کے رہتے ہیں - وہ بھی کسی درخت پر بسیرا کرتے ہیں نیچے نہیں بیٹھتے - یہی دو خاصیتیں قرآن کریم میں مومنوں کے متعلق بیان کی گئی ہیں - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (مجادلہ ع۲) اے مومنو! جب تمہیں کہا جائے کہ اُٹھو تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوا کرو - اور نبی یا اُس کے خلیفہ کی آواز پر دوڑ پڑا کرو - کیونکہ یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ کہ اُس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو تم میں سے مومن ہیں اونچا کر دیگا - گویا اوپر اڑنے کی خاصیت کا مومنوں کے متعلق بھی ذکر آگیا -

دوسری خاصیت یہ تھی کہ پرندے اپنا آشیانہ ہمیشہ اونچا بناتے ہیں - اس کا بھی مومنوں میں پایا جانا قرآن کریم سے ثابت ہے - چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ - رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ (نور ع۵) فرماتا ہے یہ نور کچھ گھروں میں ہے - جن گھروں کے متعلق ہمارا حکم ہے کہ انہیں اونچا کر دیا جائے وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ اُن گھروں میں صبح و شام تسبیحیں ہوتی ہیں - مگر فرمایا رِجَالٌ ہماری مُراد آدمیوں کو اونچا کرنا ہے نہ کہ گھروں کو - گویا پرندے کی جو دو خاصیتیں تھیں ان دونوں کا مومنوں کے اندر پایا جانا بھی بیان کر دیا - اور بتا دیا کہ عمل صالح مومن کو اُڑا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے - حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی مومن مرتا ہے تو اُس کی رُوح کو فرشتے آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں - اور کہتے ہیں دروازے کھول دو - ایک مومن کی رُوح آتی ہے - مگر جب کافر مرتا ہے تو اس کی رُوح اُٹھائی نہیں جاتی بلکہ نیچے پھینکی جاتی ہے -

غرض طَیر سے مراد وہ اعلیٰ درجہ کی رُوحیں ہیں جو وسعت حوصلہ اپنے اندر رکھتی ہیں اور دین کے لئے ہر قسم کی بلندیوں پر چڑھنے کیلئے تیار رہتی ہیں - وہ مشکلات کی پرواہ نہیں کرتیں اور نہ مصائب سے گھبراتی ہیں بلکہ ہر قسم کی قربانیوں کیلئے آمادہ و تیار رہتی ہیں -

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو کر ایک دفعہ ایک صحابی نے کہا - یا رسول اللہ! آپ حکم دیجیئے ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور ذرا بھی نہیں پُوچھیں گے کہ حضور نے یہ حکم کیوں دیا - گویا مومن کو پرندہ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے ان قابلیتوں کا ذکر کیا ہے جو مومنوں کے اندر پائی جاتی ہیں اور بتایا ہے کہ وہ سفلی زندگی کی بجائے علوی زندگی اختیار کرتا اور نیچے جھکنے کی بجائے اوپر کی طرف اُڑتا ہے -

یہی حکمت ہے جس کے ماتحت حضرت داؤد علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کا نام طَیر رکھا گیا اور بتایا گیا کہ وہ آسمان روحانی کی طرف پرواز کرنے والے لوگ تھے اور اُن کے اندر خاص روحانی استعدادیں پائی جاتی تھیں - سفلی زندگی سے انہیں کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا - پھر فرماتا ہے وَعَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْۢ بَاْسِکُمْ فَھَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَۃً تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖۤ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ - اور

وَمِنَ الشَّيٰطِيۡنِ مَنۡ يَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ وَيَعۡمَلُوۡنَ

اور کچھ سرکش لوگ ایسے تھے جو اُس کے لئے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے سوا بھی

عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ‌ۚ وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ ﴿۸۳﴾

اور کام کرتے تھے - اور ہم اُن کے لئے نگرانی کا کام کرتے تھے ۴۷

ہم نے داؤد کو زرہیں بنانے کا فن بھی سکھایا تھا - تاکہ وہ اپنی قوم کی جنگوں میں حفاظت کرے - اِسی طرح ہم نے سلیمانؑ پر یہ فضل کیا کہ خدا تعالےٰ کے حکم سے ہوائیں اس کے بیڑے کو مختلف جہات میں لے جاتی تھیں جن میں شام اور فلسطین بھی شامل تھے -

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا سے معلوم ہوتا ہے - کہ حضرت سلیمان علیہ السلام خلیج عقبہ سے مشرقی عرب کے اوپر کی طرف اپنا بیڑہ بھیجتے تھے جو سونا وغیرہ لاتا تھا اور اس سے بہت فائدہ اٹھاتے تھے -

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖ میں امر کی ضمیر خدا تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے - اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف بھی - اگر سلیمانؑ علیہ السلام اسجگہ مراد ہوں تو اس سے اُن کا حکم مراد نہیں ہوگا بلکہ اس سے اُن کا کام مراد ہوگا -

۴۷ **حل لغات**:- اَلشَّیٰطِیۡنَ - شَطَنَ الۡبِئۡرُ کے معنے ہوتے ہیں کنوآں بہت گہرا ہوگیا - اور شَیۡطٰن کے معنے ہیں کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ - سرکش انسان (اقرب) پس شیاطین سے مراد دُور دُور تک غوطہ لگانے والے لوگ ہیں جو اُن کی ماتحت قوموں میں سے تھے اور کافر تھے -

تفسیر:- فرماتا ہے - کئی قسم کے سرکش لوگ ہم نے سلیمان علیہ السلام کے ماتحت کر دئے تھے جو اُس کے لئے غوطہ لگاتے تھے اور کئی قسم کے کام کرتے تھے اور ہم اپنی تدبیر سے اُن کی حفاظت کرتے رہتے تھے -

اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جو اپنے زمانہ میں بڑی زبردست حکومت کرتے رہے تھے اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا - قرآنی زمانہ میں حقیقی داؤد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے جنہوں نے اپنے دشمنوں سے عملاً جنگیں کیں اور جنگ کے سامان تیار کئے اور حضرت سلیمانؑ کے مشابہ اس امت میں بنو عباسؓ اور بنو امیہ کی حکومتیں تھیں جن کے عہد میں دولت و ثروت کی یہ کیفیت تھی کہ بنو عباس کے ایک خلیفہ مامون الرشید کے متعلق تاریخ میں لکھا ہے کہ مامون نے ایک دفعہ مصر کے علاقہ کا دورہ کیا - اس کا طریق تھا کہ وہ ہر گاؤں میں ایک رات دن ٹھہرتا تھا - جب وہ طاء النمل نامی ایک گاؤں میں پہنچا تو وہاں اس نے قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور آگے چل پڑا - اس پر اُس گاؤں کی ایک معزز بڑھیا خاتون مامون الرشید کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے درخواست کی کہ آپ ہمارے گاؤں میں بھی قیام فرمائیں - مامون الرشید نے اس کی درخواست کو منظور کر لیا اور وہاں قیام کیا - اس خاتون نے اپنی حیثیت کے مطابق مامون اور اس کے تمام ہمراہیوں کی دعوت کا پُرتکلف سامان کیا - اور جب مامون روانہ ہونے لگا تو اس عورت نے اشرفیوں کی دس تھیلیاں مامون کی نذر کیں - مامون پہلے ہی اس کی دعوت کے اہتمام سے متعجب تھا -

الشَّیٰطِیۡنَ

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ

اور (تو) ایوبؑ کو (بھی یاد کر) جب اُس نے اپنے رب کو پکار کر کہا۔ کہ میری حالت یہ ہے کہ مجھے تکلیف نے آپکڑا ہے۔ اور

اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۟ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا

اے خدا! تُو تو سب رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پس ہم نے اُس کی دُعا سُنی اور جو تکلیف اُس کو پہنچی ہوئی تھی

بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ

اُس کو دُور کر دیا۔ اور اُس کو اُس کے اہل و عیال بھی دئے اور اُن کے سوا اپنی طرف سے رحم کرتے ہوئے

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۟

اور بھی دئے۔ اور ہم نے اس واقعہ کو عبادت گذاروں کیلئے ایک نصیحت کا موجب بنایا۔ ۵۴۹

اَب جو اُس نے اشرفیوں کی دس تھیلیاں دیکھیں تو وہ اَور بھی متعجب ہوُا اور اُس نے اُن اشرفیوں کے قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ وہ خاتون کہنے لگی بادشاہ سلامت یہ تو کوئی بڑی چیز نہیں۔ یہ سونا تو ہمارے گاؤں کی مٹی میں سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ میرے پاس ابھی بہت کچھ سونا موجود ہے۔ جب مامون الرشید نے بات سُنی تو اُس نے اس ہدیہ کو خوشی سے قبول کر لیا۔ (اقوم المسالک فی احوال الممالک ف ۱۳ بحوالہ تہذیب الاخلاق جلد ۲ ص ۱۴۲)

۵۴۸ حل لغات: ۔ اَلضُّرُّ : ضِدُّ النَّفْعِ نقصان۔ سُوْءُ الْحَالِ وَ الشِّدَّةُ ۔ بدحالی اور تکلیف (اقرب)

تفسیر: ۔ اِن دونوں کے بعد حضرت ایوبؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کی ساری عمر مشکلات میں کٹ گئی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لحاظ سے شاید حضرت علیؓ کو حضرت ایوبؑ سے نسبت دی جا سکے۔ اور مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کے لحاظ سے تو بہرحال یہ ایک پیشگوئی ہے جو وقت پر آکر ظاہر ہوگی۔

حضرت ایوب علیہ السلام جن کا ذکر اس جگہ پر آتا ہے اِن کے متعلق مختلف اقوام نے روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں نے عیسائیوں سے اور اُن یہودی مؤرخوں سے جو کہ مذہب کی روشنی میں تاریخ لکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے جو کچھ اُن کے متعلق لکھا ہے وہ یہ ہے کہ " ایوبؑ کے والد کا نام اسوص تھا اُن کے والد کا نام تارح تھا اُن کے والد کا نام رذم تھا۔ اُن کے والد کا نام عیص تھا۔ اور اُن کے والد کا نام اسحاقؑ تھا اور اُن کے والد کا نام ابراہیمؑ تھا۔ اور اُن کی والدہ لُوط بن ہاران کی اولاد میں سے تھیں (عیص نام جو غالباً ایوبؑ کے پردادا کے والد کا تھا عیسو کا مخفف ہے کیونکہ بائیبل میں لکھا ہے کہ حضرت اسحاقؑ کے ایک بیٹے کا نام عیسو تھا) پھر مسلمان مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ ایوبؑ بڑے مالدار تھے اور شام اور اس کے ملحقہ ملکوں کی زمینیں اُن کی ملکیت تھیں اور گائیوں اور اونٹوں بکریوں گھوڑوں اور گدھوں کی اُن کے پاس کوئی انتہا نہ تھی۔ اُن کے پانچسو ہل چلتے تھے اور پانچ سو غلام تھے۔ اہل و عیال بھی بہت تھے

اَلضُّرُّ

مگر آپ دولت کے باوجود بڑے نیک تھے اور مساکین یتامٰی اور بیوگان کی پرورش کرتے تھے۔ اور بڑے مہمان نواز تھے۔ شیطان اپنی کوشش کے باوجود ان کو ورغلانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ آپ پر یمن کے تین آدمی ایمان لائے تھے۔ ابلیس اُن کے زمانہ میں آسمانی خبروں کو چوری چوری سُن لیتا تھا (یہ غیر معتبر ہمارے مفسرین ہر نبی کے متعلق دیتے ہیں) ایک دفعہ (ایوبؑ نے بڑے اخلاص سے درود پڑھا اور فرشتوں نے اس کا جواب دیا تو شیطان نے وہ بھی سُن لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کا درود سُن کر اُس کی بڑی تعریف کی۔ اِس پر ابلیس کو حسد آ گیا۔ اور وہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا کہ ایوبؑ پر جو آپ نے نعمتیں نازل کی ہیں اُن کی وجہ سے وہ نیک ہے۔ اگر آپ اُس کی نعمتوں کو چھین لیں تو وہ آپ کی اطاعت سے نکل جائیگا۔ تب اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ جا مَیں نے تجھے اُس کے مال اور اسباب پر تصرّف بخشا۔ اور اُس نے اِن سب چیزوں کو ہلاک کر دیا مگر ایوبؑ نے تب بھی الحمد للہ ہی کہا۔ تب شیطان دوبارہ اللہ تعالےٰ کے پاس گیا اور کہا ابھی اُس کی صحت تو باقی ہے اس لئے وہ شکرگذار ہے۔ اِس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ جاؤ اس کے جسم پر بھی تجھے تصرّف دیا جاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا اس کی زبان دل اور عقل پر تیرا قبضہ نہ ہو گا۔ چنانچہ اُن کے جسم میں کھجلی کی بیماری پیدا ہو گئی۔ اور جسم کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اور زخموں میں کیڑے پڑ گئے۔ تب بستی والوں نے انہیں گھر سے نکال دیا۔ اُس وقت وہ ایک جھونپڑہ میں چلے گئے۔ جہاں اُن کی ایک بیوی رحمت نامی اُن کی خدمت گار تھی۔ آپ پر ایمان لانے والے تینوں آدمیوں نے بھی آپ کو چھوڑ دیا۔ بعض کے قول کے

مطابق حضرت ایوبؑ اس مصیبت میں ۱۸ سال رہے اور بعض کے قول کے مطابق ۳ سال رہے اور بعض کے قول کے مطابق سات سال رہے۔ اُس وقت کوئی اُن کے قریب تک نہ آتا تھا۔ سوائے اُن کی بیوی کے جو اُن کو کھانا لا کر دیتی تھی۔ جب حضرت ایوبؑ خدا تعالیٰ کی حمد کرتے تو وہ بھی اُن کے ساتھ شریک ہوتی۔ تب شیطان گھبرایا اور اُس نے کہا کہ آدمؑ کی بیوی کو بھی پھسلایا گیا تھا کیوں نہ ایوبؑ کی بیوی کو بھی پھسلایا جائے تب وہ اُن کی بیوی کے پاس آیا۔ اور اُس نے ایک بکری کا بچہ دے کر کہا۔ کہ اگر ایوبؑ میرے نام پر اس کو ذبح کر دیں۔ تو اچھے ہو جائیں گے۔ بیوی نے حضرت ایوبؑ سے یہ ذکر کیا۔ تو انہوں نے اس کو ڈانٹا اور کہا یہ تو خدا کا دشمن ہے تم کیوں اِس کے فریب میں آ ئیں۔ خدا تعالےٰ نے اتنی لمبی مدت تک نعمتیں دی تھیں اگر چند سال مشکلات کے آ گئے تو کیا ہوا۔ پھر قسم کھائی کہ اگر اللہ تعالےٰ نے شفا دی تو وہ بیوی کو اُس کی غلطی پر سو کوڑے لگائیں گے۔ اور بیوی کو گھر سے نکال دیا اور کہا کہ مَیں اللہ کے سوا کسی کے نام پر جانور ذبح کرنے کیلئے تیار نہیں۔ پھر آپ نے دُعا کی کہ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ اِس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے ایوبؑ! مَیں نے تیری دُعا سُن لی۔ اُٹھ اور زمین پر پاؤں مار۔ تو چشمہ پھوٹ پڑا۔ آپ نے اُس سے غسل کیا تو ساری بیماری جاتی رہی۔ اور جوانی کا زمانہ عود کر آیا۔ آپ نے ایک دفعہ پھر پاؤں مارا تو ایک اور چشمہ پھوٹ پڑا۔ اس سے آپ نے پانی پیا تو سب اندرونی بیماریاں جاتی رہیں۔ اس وقت اُن کی بیوی کو خیال آیا کہ گو ایوبؑ نے مجھے میری غلطی پر نکال دیا ہے مگر وہ بھوکے

مرجائیں گے۔ وہ اُن کو ڈھونڈتی ہوئی آئی۔ مگر اُن کو اپنی جگہ پر نہ پایا۔ وہ روتے روتے سب جگہ انکو ڈھونڈنے لگی۔ آخر وہ اُن کو مل گئے۔ اور حضرت ایوبؑ نے اس طرح قسم پوری کی کہ سوتیلیاں اکٹھی لے کر اُن کو ماریں۔ (تفسیر خازن)

یہ واقعہ لوگوں کو اتنا دلچسپ نظر آیا ہے۔ کہ ہندوؤں کی تاریخ میں بھی پایا جاتا ہے اور یہودیوں کی تاریخ میں بھی۔ گو بعض جگہ نام بدل دئے گئے ہیں بائبل میں حضرت ایوبؑ کی ایک مستقل کتاب ہے جس کے ۴۲ باب ہیں۔ اور اس کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ وہ حضرت مسیح سے ۱۵۲۰ سال پہلے گذرے ہیں۔ یعنی حضرت موسیٰؑ سے قریبًا ۲۰۰ سال پہلے۔

مغربی محققین کے نزدیک حضرت ایوبؑ ایک غیر اسرائیلی نبی تھے۔ کیونکہ وہ عیسو کی نسل میں سے تھے جو کہ اسرائیل کا بڑا بھائی تھا۔ اور عوص کے رہنے والے تھے۔ جو دورِ آخر کے SIDON کا شہر تھا اور شام اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع تھا۔
(جیوش انسائیکلوپیڈیا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

مگر میرے نزدیک یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ اِس ملک کے لوگوں کی بنی اسرائیل سے سخت عداوت تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو اپنے علاقہ میں سے گذر کر کنعان نہ جانے دیا تھا اور اس عداوت کے سبب سے بنی اسرائیل ہمیشہ اُن سے جنگ کرتے رہتے تھے۔ اور صرف ایک قلیل عرصہ کے لئے اسیرین لوگوں کے حملوں کے مقابلہ میں ان دونوں قوموں کی آپس میں صلح ہوئی تھی۔ ایسے دشمن قبیلہ کے بزرگ کا واقعہ سب دنیا کے واقعات کو چھوڑ کر بائبل میں درج کرنا خلافِ قیاس ہے

محققین اس امر پر متفق ہیں کہ ایوب کی کتاب میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ نویں سے چوتھی صدی قبل مسیح کی زبان ہے اور اس زمانہ میں یہودی بخت النصر کے ہاتھوں قید ہوکر ہند کے قریب کے علاقوں میں پھیلائے جا چکے تھے۔ اِدھر ہندوؤں میں ایک واقعہ ہریش چندر کے نام سے مشہور ہے۔ جو اس واقعہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ پس کچھ تعجب نہیں کہ یہ وہیں سے لیا گیا ہو۔ اِس کا ثبوت خود ایوب کی کتاب سے بھی ملتا ہے۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ شیطان خدا کے دربار میں حاضر ہوا۔ اب یہ خیال کہ شیطان خدا کے دربار میں جاتا ہے یہود اور اُن کے اردگرد کی اقوام کا نہیں بلکہ خالص ہندوستانی خیال ہے جو بُری اور اچھی رُوحوں کو خدا تعالیٰ کے دربار میں حاضر کرتے ہیں اور اُن کی آپس میں خوب باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

بہرحال پُرانے عہد نامہ میں کتاب ایوب باب ۱ میں لکھا ہے کہ عُوض کی سرزمین میں ایک شخص ایوب نامی تھا۔ وہ شخص نہایت نیک اور متقی تھا۔ اس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ اُس کے پاس ۷۰۰۰ بھیڑیں ۳۰۰۰ اونٹ ۵۰۰ جوڑے بیل اور ۵۰۰ گدھیاں تھیں۔ اس کے نوکر چاکر بہت تھے اور اس کے برابر مشرق میں کوئی مالدار نہ تھا۔ اُس کے بیٹے بڑے مالدار تھے۔ ایوب کے بیٹے جب جوان ہوئے تو ان کی طرف سے قربانیاں کیں تاکہ اگر ان کا کوئی گناہ ہو تو معاف ہو جائے۔ ایک دن خدا کے حضور میں فرشتے پیش ہوئے اور اُن میں شیطان بھی شامل ہوگیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے شیطان سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ اور کیا میرے بندے ایوب کو دیکھا ہے۔ اُس نے کہا۔ اِدھر اُدھر سے پھر کے آیا ہوں اور ایوب کو میں نے دیکھا۔ کہ خدا ترسی کرتا ہے مگر مفت میں نہیں بلکہ اِس لئے کہ تُو نے اس پر بڑی نعمتیں نازل کی ہیں۔

تُو خدا اس کی نعمتیں لے لے۔ پھر دیکھ کہ وہ تجھ پر ملامت کرتا ہے یا نہیں۔

اس پر خدا تعالیٰ نے کہا کہ اِس کے مال کو جس طرح چاہے تباہ کر دے مگر اُس کے جسم پر ہاتھ نہ بڑھائیو۔ اِس کے بعد ایسا ہُوا کہ دشمنوں نے اس کے نوکروں پر حملہ کر دیا۔ اور اُن کو قتل کر دیا۔ اِسی طرح آسمان سے بجلی گری اور اُس نے اُن کے نوکر چاکر اور مال و اسباب کو جلا دیا۔ پھر کسی نے اطلاع دی کہ اُن کے بیٹوں کو غلام بنا کر دشمن لے گئے ہیں۔ اس پر ایوبؑ نے اپنا پیراہن چاک کیا اور رونے لگا اور سجدہ کیا اور کہا کہ مَیں جس طرح ماں کے پیٹ سے ننگا آیا اسی طرح ننگا ہی جاؤں گا۔ مگر ان سب مصائب کے باوجود ایوب نے خدا پر الزام نہ لگایا (باب ۲) اس کے بعد پھر ایک دن فرشتوں میں مل کر شیطان خدا تعالےٰ کے سامنے حاضر ہُوا اور خدا تعالےٰ کے پُوچھنے پر کہ تُو نے ایوب کا حال دیکھا کہ وہ کیسا شکر گذار ہے۔ شیطان نے کہا انسان اپنے جسم کے لئے بھی سب مال قربان کر دیتا ہے تُو اس کے جسم اور ہڈی کو نقصان پہنچا پھر دیکھ اُس کا شکر کہاں باقی رہتا ہے۔ خدا تعالےٰ نے شیطان کو کہا کہ بے شک اس کی جسمانی صحت کو نقصان پہنچا دے مگر اُس کی جان نہ جائے۔ تب شیطان نے اس کی جِلد میں ایک بیماری پیدا کر دی اور سر سے لے کر تلووں تک پھوڑے نکل آئے۔ تب اُس کی بیوی نے کہا اب یہ شکر گذاری چھوڑ۔ خدا کو ملامت کر اور مر جا۔ ایوب نے بات نہ مانی اور کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی نعمتیں لیں اور دیں کچھ نہ۔ تب اُس کے تینوں مرید دُور دُور کے علاقوں سے آئے اور اُس کی حالتِ زار دیکھ کر رونے لگ گئے (باب ۲) تب ایوب نے یہ دیکھ کر کہ اس کو بدی کی طرف پھرانے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنی پیدائش پر لعنت کی (باب ۳) اِس پر اُس کے ایک مرید نے اُس کو کہا کہ عذاب تو خدا کے دشمنوں پر آیا کرتا ہے۔ نیکوں پر نہیں۔ اس لئے ضرور تیرے اندر کوئی بدی ہے (باب ۵) تب ایوب نے کہا۔ سزا بدی کی وجہ سے ملتی ہے۔ سزا کے وقت انسان کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو خدا پر چھوڑ دے (باب ۵) تب ایوب دُعا کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ مجھ پر موت نازل کرے تو بہتر ہے (باب ۶) بعد میں ایوب پچھتاتا ہے۔ اور اس پر عذر کرتا ہے کہ مَیں نے کیوں موت کی تمنا کی۔ (باب ۸) اُن کا ایک مرید بلدد نامی بتاتا ہے کہ خدا تعالےٰ ہمیشہ نافرمانوں کو سزا دیتا ہے (باب ۹) پھر لکھا ہے ایوب نے اپنے معترضین کو جواب دیا کہ مَیں نہ اپنے آپ کو نیک کہتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ خدا عادل نہیں۔ خدا عادل ضرور ہے۔ مگر موت اور ہلاکت تو ہر ایک پر آ رہی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب وہ بے گناہ کو سزا دے رہا ہوتا ہے تو وہ اُس کا امتحان کر رہا ہوتا ہے۔ پھر اُس نے کہا۔ کہ زمین پر شریر حاکم ہیں اور مَیں دیکھ رہا ہوں کہ میری عمر تیز تیز گذر رہی ہے میرا یہ کہنا کہ مَیں پُوری طرح صبر کروں گا بے فائدہ ہے۔ کیونکہ تم لوگ تو پھر بھی مجھے گناہگار قرار دو گے۔ کیونکہ تمہارا یہ یقین ہے کہ خدا تعالےٰ صرف شریر کو سزا دیتا ہے اور میرا یہ یقین ہے کہ خدا تعالےٰ بے گناہ کو بھی تکلیف میں ڈالتا ہے کہ آزمائش کرے (باب ۴۲) آخر میں ایوب کا قصہ بائیبل نے اِس طرح ختم کیا ہے کہ اس کے شاگرد جو اُس سے کج بحثی کرتے تھے اللہ تعالےٰ نے اُن کو الہام کیا کہ بیل اور مینڈھے ایوب کے پاس لاؤ اور اپنے گناہوں کی معافی کے لئے اُس سے سوختنی قربانی کرواؤ۔ اس کے بعد لکھا ہے۔ کہ اُس کے دوست بچے بیویاں سب واپس آ گئے۔

دولت اُس کی دوگنی ہوگئی اور بڑی لمبی عمر تک زندہ رہا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ایوب سے ملتا جلتا قصہ ہندوستان میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں اُس شخص کا نام جس کے ساتھ یہ واقعہ گذرا ہرلیش چندر لکھا ہے۔ واقعہ تقریباً ایوب جیسا ہے کیونکہ اس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ دیوتاؤں کے ساتھ شیطان مل کر خدا کے پاس گیا اور اس سے ہرلیش چندر کی تعریف سُن کر خدا سے اجازت لی کہ میں اس کا مال تباہ کر دوں۔ مگر ہرلیش چندر اپنے سچ اور دیانت پر قائم رہا۔ کئی تجربے ہوئے مگر وہ نہ پھسلا۔ بائبل میں اشارہ ملتا ہے کہ ایوب کا واقعہ ہندوستان سے آیا ہے اور ایوب غالباً اس کے نام کا ترجمہ ہے یا استعارۃً رکھا گیا ہے۔ وہ اشارہ جو ہرلیش چندر کے متعلق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ اتنا مالدار تھا کہ اہلِ مشرق میں ویسا کوئی مالدار نہ تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مشرق یعنی ہندوستان سے آیا تھا اور بائبل نے اس قصہ کو اپنے اندر درج کر لیا۔ ہم نے اوپر مفسرین کی روایتیں بھی دے دی ہیں اور بائبل کی بھی۔ اِن دونوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے یہودیوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں۔ کیونکہ بہت سی باتوں میں یہ روایتیں بائبل کے قصّے سے ملتی ہیں۔ اور بعض میں مختلف بھی ہیں۔ یہ اتفاق اور اختلاف بتاتا ہے کہ ذریعۂ معلومات تو ایک ہی ہے مگر پورا قابلِ اعتبار نہیں۔ قرآن کریم جو اِن سب لغویات سے پاک ہے اُس نے اس قصہ کی لغویات کو حذف کر دیا ہے اور جو واقعات اس نے بیان کئے ہیں اُن سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایوبؑ بڑا مالدار تھا اور اس کا بڑا خاندان تھا۔ وہ ایک مشرک ملک میں رہتا تھا جس کا بادشاہ ظالم تھا۔ ظالم ملک کے متعلق یہ آیت شہادت دیتی ہے کہ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (ص ع ۴) یعنی ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو تھکان اور تکلیف پہنچائی ہے شیطان کے معنے عربی زبان میں سرکش کے ہوتے ہیں (اقرب) پس اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک سرکش بادشاہ مجھے تکلیفیں دیتا ہے اور تھکان اور عذاب بھی پہنچا رہا ہے۔ یعنی اس کے ظلم کی وجہ سے مجھے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑتا ہے اور میرے مال اور خاندان کو وہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اور اس طرح مجھے دکھ دیتا ہے۔ یہ جو ہم نے لکھا ہے کہ وہ بادشاہ کے ظلم سے مجبور تھے کہ ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جائیں۔ اس کا ثبوت یہ آیت ہے کہ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ اور یہ آیت بھی کہ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ۔ یعنی اپنی سواری کو ایڑی مار اور ساتھ ہی سواری کو درخت کی ایک ٹہنی سے بھی مارتا جا تاکہ تیرا سفر جلدی طے ہو۔ جب تُو ایسا کریگا تو سامنے تجھے ایک چشمہ نظر آئیگا جس میں نہانے کا بھی سامان موجود ہوگا اور پانی پینے کا بھی۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے۔ جن لوگوں نے کشمیر دیکھا ہے وہ اس کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کشمیر کے لوگ جب گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑی سے اُترتے ہیں تو بے تحاشا دونوں ایڑیاں گھوڑوں کو مارتے جاتے ہیں۔ اور ایک ہاتھ سے درخت کی شاخ بھی مارتے جاتے ہیں تاکہ سفر جلد قطع ہو۔ اور ٹھنڈے چشمے بھی عام طور پر پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ پس قرآنی روایت کے مطابق اتنا ہی پتہ لگتا ہے۔ کہ ایک ظالم بادشاہ کی تعذیب سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے

وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِدۡرِیۡسَ وَذَاالۡکِفۡلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۸۶﴾ۚۖ

اور اسمٰعیلؑ کو بھی (یاد کر) اور ادریسؑ کو بھی اور ذوالکفلؑ کو بھی۔ یہ سب کے سب صبر کرنے والے تھے۔ ۵۴۹

کے حکم کے مطابق حضرت ایوبؑ نے اپنے ملک سے ہجرت کی جو علاقہ پہاڑی بھی تھا اور چشموں والا بھی تھا۔ اور ایڑیاں انہوں نے گھوڑے کو ماری تھیں نہ کہ زمین پر مار کر چشمہ پھوڑا تھا اور درخت کی موٹی شاخ جس کے آگے کئی چھوٹی چھوٹی شاخیں لگی ہوئی تھیں سواری کو اس کے دوڑانے کے لئے مار رہے تھے۔ نہ یہ کہ اُنکی بیوی نے انکو شرک کی تعلیم دی تھی۔ اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ میں اسے سو کوڑے مارونگا اور پھر قسم سے بچنے کے لئے یہ بہانہ بنایا کہ سو تیلیوں کا ایک جھاڑو پکڑ کر بیوی کو مار دیا۔ یہ دھوکہ مفسرین نے صرف حِنۡث کے لفظ سے کھایا ہے جس کے معنے ہوتے ہیں قسم توڑنا اور توجیہہ یہ کی ہے کہ سو تیلیاں بیوی کو مار دے اور قسم نہ توڑ حالانکہ قرآن میں نہ سو کوڑوں کا ذکر ہے اور نہ سو تیلیاں مارنے کا ذکر ہے۔ ضِغۡثٌ کے معنے صرف ایسی شاخ کے ہوتے ہیں جس میں کچھ خشک تیلیاں بھی ہوں اور کچھ سبز بھی۔ ایسی ہی شاخ گھوڑوں کے مارنے کیلئے لوگ مہیا کرتے ہیں تاکہ سبزی کی وجہ سے وہ لچکدار رہے اور خشکی کی وجہ سے چمڑے میں چبھے۔ حِنۡث کے معنے عربی میں مَالَ اِلَی الۡبَاطِلِ کے بھی ہیں۔ پس بجائے اس دُور از عقل قصہ بنانے کے مفسرین کو چاہیئے تھا کہ [illegible] یہ معنے کرتے کہ ایک مشرک بادشاہ کی بادشاہت سے نکل جانیکا حکم حضرت ایوبؑ کو تھا۔ اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ گھوڑے پر چڑھ۔ ایڑیاں بھی مار اور درخت کی شاخ بھی مار اور جلدی جلدی اس ملک سے نکل جا [illegible] جلدی سے تو مشرکوں سے دُور ہو جائے [illegible] اور اس ملک سے نکلنے میں دیر نہ لگا۔ اور شرک کرنیوالوں کی طرف مائل نہ ہو یعنی دشمنوں میں نہ رہ۔ حِنۡث کے معنے جو مَالَ اِلَی الۡبَاطِلِ کے ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ دل سے باطل کی طرف مائل نہ ہو بلکہ اس جگہ جسمانی میلان بھی مراد ہو سکتا ہے جو ہمسائیگت پر دلالت کرتا ہے اور اسطرف اسجگہ اشارہ ہے۔ فرماتا ہے کہ جلدی جلدی شرک کے علاقہ سے نکل جا۔ گھوڑے کی سواری کی تھکان کی پرواہ نہ کر۔ بادشاہ کے ظلم کی تھکان کا تو کوئی علاج نہیں تھا۔ گھوڑے کی سواری کی تھکان کا علاج موجود ہے۔ سامنے چشمہ ہے اس میں نہا اور اس سے پانی پی اور اس ملک کو چھوڑ دینے پر افسوس نہ کر ہم تیرے تمام رشتہ داروں کو وہاں پہنچا دینگے بلکہ اُن جیسے اور بھی دینگے یعنی اس ملک میں بھی تیرے خیر خواہ پیدا ہو جائینگے۔ اس بات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ایوبؑ سے مشابہت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھاگ کر شرک کا علاقہ چھوڑنا پڑا جہاں پانی نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مکہ میں چھوڑی ہوئی بیویاں کو بھی مدینہ پہنچا دیا اور ویسی ہی پاکباز اور نیک بیویاں مدینہ میں اور بھی دیں۔ یہی حضرت ایوبؑ سے وعدہ تھا کہ اے ایوب! مشرک بادشاہ کی حکومت کو چھوڑ دے اور دوسرے علاقہ میں نکل جا وہاں ہم تیری تکلیفوں کو دُور کر دینگے اور تیرے رشتہ دار بھی پہنچا دیں گے بلکہ اُنہی جیسے اور بھی دینگے۔ اور نہانے اور پینے کے لئے پانی بھی کثرت سے مہیا ہو گا۔

۵۴۹ تفسیر۔ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے تھے۔ گو عیسائی کئی بہانوں سے اُن کو لونڈی کا بیٹا قرار دے کر اپنے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اور حضرت ادریسؑ کے حالات سورۃ مریم کی تفسیر میں درج کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم ذوالکفل کے متعلق اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

ذوالکفل کا ذکر نام لے کر قرآن کریم میں دو جگہ پر آتا ہے۔ ایک تو یہی آیت ہے جس میں اسمٰعیلؑ ادریسؑ اور ذوالکفل کا اکٹھا ذکر آتا ہے۔ اور دوسرے سورۂ صٓ میں اسمٰعیلؑ یسعیاہؑ اور ذوالکفل کا اکٹھا ذکر آتا ہے۔ گویا دو سورتوں یعنی انبیاء اور صٓ میں اِن کا ذکر آتا ہے۔ ایک جگہ پر اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ کے ساتھ اور دوسری جگہ پر اسمٰعیلؑ اور یسعیاہؑ کے ساتھ۔

اسلامی مفسرین نے ذوالکفل کے متعلق بہت سی روایتیں نقل کی ہیں اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک غیر نبی شخص تھا۔ جیسے بعض کے نزدیک ایک نبی نے اور بعض کے نزدیک ایک بادشاہ نے اپنا قائم مقام مقرر کیا جو دن کو روزہ رکھتا تھا اور رات کو عبادت کرتا تھا۔ اور غصہ میں کبھی نہیں آتا تھا۔

ایک روایت عبداللہ بن عمرؓ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں میں یہ آتی ہے جسے علاوہ اور کتابوں کے مسند احمدؒ اور سُنن ترمذی میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ ذوالکفل ایک شخص تھا جس نے ایک عورت کو بدکاری پر مجبور کیا اور اُسے کچھ رقم دی۔ عورت فاقوں کی وجہ سے مجبور تو ہوگئی۔ لیکن رونے لگ گئی۔ اس پر اُسے خدا کا خوف آگیا اور اُس نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور خود بھی توبہ کر لی۔

اِس حدیث میں کوئی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ یہ وہی ذوالکفل ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے بلکہ انہی حدیثوں میں اس کا نام الکفل بھی آتا ہے۔ پس اگر یہ حدیثیں درست ہیں تو بالکل ممکن ہے کہ یہ روایت کسی اور شخص کے متعلق ہو۔ کیونکہ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا نہیں جس کے مرتکب کو انبیاء کے ساتھ گنا جائے۔ اور اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور اسمٰعیلؑ اور یسعیاہؑ کے ساتھ اس کا نام لیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ذوالکفل معرب ہے حزقیلؑ کا۔ یاء واؤ سے بدلتی رہتی ہے اور واؤ فاء سے بدل جاتی ہے۔ پس حزقیل سے حزکفل اور اس سے ذوالکفل ہو جانا کوئی بعید بات نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حزقیل کا عربی میں ترجمہ کرکے اسے ذوالکفل کہہ دیا گیا ہو۔ کیونکہ حزقیل کے معنے ہیں "جسے خدا کی طرف سے طاقت ملی ہو۔" اور کفل کے معنے بھی حصہ کے ہیں۔ پس ذوالکفل کے معنے ہیں جس کو بڑا حصہ ملا ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ عربوں نے حزقیل کا نام سنکر اور عبرانی میں اس کے معنے سنکر اس کا ترجمہ ذوالکفل کر لیا ہو۔

یسعیاہؑ کے ساتھ اس کے نام کا آنا مزید ثبوت ہے کہ یہ نبی حزقیل ہی ہیں۔

حزقیل اور یسعیاہ کا خاص جوڑ تھا۔ جو پیشگوئیاں یسعیاہ نے کی تھیں وہ حزقیل کے زمانہ میں پوری ہوئی تھیں اور یہودی مصنف یسعیاہ اور حزقیل کا باہم مقابلہ بھی کرتے ہیں۔

بائبل کے لٹریچر میں حزقیل کو چار بڑے نبیوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔

حزقیل ایک مشہور مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُن کی ابتدائی عمر یروشلم کی عبادت گاہ میں صرف ہوئی تھی جہاں انہوں نے دینی تعلیم بھی حاصل کی۔

حزقیل ان لوگوں میں سے تھے جن کو بابل کا بادشاہ قید کرکے یروشلم سے لے گیا تھا۔ انکی کتاب میں برابر اُن کی قید کے زمانہ کا ذکر آتا ہے گو وہ علماء کے لیڈر نہیں تھے مگر بوجہ اُن کے بڑھتے ہوئے رسوخ کے بادشاہ نے انکو اس قابل سمجھا کہ اُن کو گرفتار کرکے

یروشلم سے لے جائے ۔

غالبًا ان کی پیدائش ۶۲۲ قبل مسیح کی تھی ۔ اور ۵۹۲ قبل مسیح میں اُن کا الہامی زمانہ شروع ہوتا ہے جب وہ قریبًا تیس سال کے تھے ۔ اندازًا بائیس سال تک انہوں نے نبوت کی اور ۵۷۰ قبل مسیح میں ۵۲ سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی ۔

حزقیل نے شادی بھی کی ۔ یروشلم کی دوبارہ آبادی کی انہوں نے پیشگوئی بھی کی ۔ اور اس کا ذکر قرآن کریم میں سورۂ بقرہ ع ۳۵ میں آتا ہے ۔

حزقیل کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اُن کے زمانہ کے بعد یہود نے قریبًا قریبًا ظاہری بت پرستی چھوڑ دی جو اس سے پہلے زمانوں میں بار بار اُن میں عود کر آتی تھی ۔

بعض ائمہ بائبل کا خیال ہے کہ حزقیل اسرائیلی نبیوں میں سے آخری نبی تھا ۔ اس کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے وہ درحقیقت بڑے بڑے علماء تھے ۔ یا یوں کہہ لو کہ خیالی مجددانہ رنگ رکھتے تھے ۔ نبوت کا رنگ نہیں رکھتے تھے

حزقیل اپنے آپ کو آدم زاد کہتے تھے ۔ چنانچہ دیکھو حزقیل باب ۲ آیت ۱ و باب ۳ آیت ۲۵ و باب ۴ آیت ۱ و باب ۵ آیت ۱ و باب ۶ آیت ۲ (مسیح بھی اپنے آپ کو ابن آدم کہتا تھا ۔ اور حنوک کے متعلق بھی آتا ہے کہ اُسے ابن آدم کہا گیا) غرض کثرت کے ساتھ اُن کو آدم زاد یا دوسرے لفظوں میں ابن آدم کہا گیا ہے ۔ بلکہ قریبًا جہاں بھی خدا اُن کو مخاطب کرتا ہے آدم زاد کے لفظ سے مخاطب کرتا ہے یہ ایک مشابہت ہے جو حزقیلؑ اور ادریسؑ اور مسیحؑ میں ہے ۔

حزقیل کچھ عرصہ تک خاموش بھی رہے اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کے حکم سے خاموش رہا ہوں (حزقیل ۳ : ۲۶) اِس میں اُن کو زکریا سے مشابہت معلوم ہوتی ہے ۔

حزقیل کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنوکدنضر کے بہت مداح تھے اور اسرائیل اور مصر اور طائر کے خلاف اُس نے جو اقدام کئے تھے اُن کو وہ جائز سمجھتے تھے اور اِن لوگوں کی شرارتوں کا اسے نتیجہ سمجھتے تھے ۔

حزقیل کی کتاب غالبًا بائیبل کی پہلی اور آخری کتاب ہے جس کا کچھ حصہ خود نبی نے لکھا ہے ۔ اسی کتاب کے کچھ حصے تو اُن کے بیان کئے معلوم ہوتے ہیں اور کچھ لکھے ہوئے ہیں ۔ (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا صفحہ ۱۴۵۶ تا ۱۴۵۸)

حزقیل نبی اور اسی طرح یرمیاہ نبی کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اس بات کی تائید میں تھے کہ بابلی حکومت کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے اُس وقت کے علماء نے یرمیاہ نبی اور حزقیل دونوں کو ہی ملک کا غدار قرار دیا ۔ جس طرح ٹائٹس کے زمانہ میں رومیوں کی حمایت کرنے والے مسیح کو بھی یہودیوں نے غدار قرار دیا تھا ۔ یا اِس زمانہ کے علماء نے مسیح موعود علیہ السلام کو جنہوں نے سکھوں کے مقابلہ میں انگریزوں کی تعریف کی غدار قرار دیا ۔ اس کے برخلاف حزقیلؑ نے اُن لوگوں کو غدار قرار دیا ہے جو بابلی حکومت کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے تھے ۔

حزقیلؑ کا خیال تھا کہ وہ یہودی جو پکڑ کر بابل لائے گئے اُن کے ذریعہ ایک نئی یہودی قوم جو اپنے مذہب پر قائم ہوگی کھڑی کی جائیگی ۔ چنانچہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور اس کے بعد یہودیوں نے کبھی ظاہری شرک نہیں کیا ۔ کچھ تو اِس وجہ سے کہ جو سزا اُن کو ملی تھی اُس سے سبق حاصل ہوگیا اور کچھ اس وجہ سے کہ ایک لمبے عرصہ تک بُت پرست قوم میں رہنے کی وجہ سے اُن پر بتوں کی حقیقت واضح ہوگئی (اس معاملہ میں حزقیلؑ کو مسیح ناصری اور مسیح محمدی سے مشابہت حاصل ہے)

حزقیلؑ اپنی کتاب کے پہلے باب میں بتلاتے ہیں کہ کس طرح خدا تعالےٰ نے اپنے آپ کو بابل میں ظاہر کیا اور پھر اُن کو نبوت کا کام سپرد کیا ۔ اُن کی کتاب کے

باب ۳ آیت ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے ابتدائی دنوں میں حضرت زکریاؑ کی طرح انہیں خاموش رہنے کا حکم ملا تھا۔

حزقیل اپنی قوم کی دوبارہ نجات اور ترقی کی بھی خبر دیتے ہیں۔ اور ایک لمبے عرصہ تک اُس کے محفوظ رہنے کی پیشگوئی کرتے ہیں حزقیل نے دوبارہ یروشلم کے معبد بنانے کے متعلق بھی پیشگوئی کی ہے۔ اور اس کے متعلق ہدایتیں دی ہیں۔ چنانچہ ان کی کتاب باب ۴۰ و ۴۱ و ۴۲ و ۴۳ و ۴۴ میں وہ تمام قوانین بیان کئے گئے ہیں جن کے مطابق معبد بنایا جائیگا اور جس کے مطابق کاہن کام کریں گے۔

حزقیل فرشتوں کا ذکر نہیں کرتا لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ روحیں اس کو اُٹھا کر لے گئیں۔ اور یقیناً اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

انسان کے متعلق حزقیلؑ کی یہی تعلیم ہے کہ وہ مقتدر ہے اور بد سے نیک اور نیک سے بد ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ اس کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ انسان ارادہ کرے اور عزم کرے۔ چنانچہ حزقیل باب ۱۸ میں تمثیل کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اچھے باپ سے بُرا بیٹا اور بُرے باپ سے اچھا بیٹا پیدا ہو سکتا ہے اور یہ کہ باپ کا گناہ بیٹے کو نہیں پہنچتا اور اُس کی سزا اُس کو نہیں ملتی۔ چنانچہ وہ یہ سوال اُٹھاتا ہے۔ کہ "تم کہوگے کہ کیا بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا سو جبکہ بیٹے نے وہ جو شرع میں درست اور روا ہے کیا اور اُس نے میرے حکموں کو حفظ کیا تو وہ یقیناً جئیگا۔ وہ جان جو گناہ کرتی ہے سو ہی مریگی۔ بیٹا باپ کی بدکاری کا بوجھ نہیں اُٹھاویگا۔ نہ باپ بیٹے کی بدکاری کا بوجھ اٹھاویگا۔ صادق کی صداقت اس پر ہوگی اور شریر کی شرارت اُس پر پڑیگی۔ لیکن اگر شریر اپنی ساری خطاؤں سے جو اُس نے کی ہیں باز آوے اور میرے سارے حکموں کو حفظ کرے اور جو کچھ شرع میں درست اور روا ہے کرے تو وہ یقیناً جیئے گا۔ وہ نہ مرے گا۔ اُس کے سارے گناہ جو اُس نے کئے اس کے لئے محسوب نہ ہونگے۔" (حزقیل باب۱۸ آیت ۱۹ تا ۲۲) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حزقیلؑ توبہ کے ذریعہ سے دائمی زندگی کے قائل تھے۔

پھر وہ توبہ پر زیادہ زور دیتا ہے اور کہتا ہے:-

"سو توبہ کرو۔ اور اپنی ساری بدکاریوں
سے باز آؤ۔ تاکہ بدکاری تمہاری ہلاکت کا
باعث نہ ہو۔ سارے بُرے کام جنہیں کرکے
تم گنہگار ہوتے ہو۔ آپ سے جُدا کرکے پھینک
دو اور اپنے لئے ایک نیا دل اور نئی رُوح
پیدا کرو۔" (آیت ۳۰ و ۳۱) (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا)

حزقیل کے متعلق یہودی لٹریچر میں لکھا ہے کہ وہ جوشوعا کی اولاد میں سے تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ یرمیاہ کا بیٹا تھا۔ حزقیل کے متعلق لکھا ہے کہ اُس نے یسعیاہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ خدا کے تخت گاہ کا حال بیان کیا۔ لیکن یہودی علماء کہتے ہیں کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ یسعیاہ سے بڑا تھا۔ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ اُس نے خدا کے تخت کو صرف ایک دفعہ دیکھا۔ اس لئے زیادہ تفصیل سے یاد رکھا۔ یسعیاہ بار بار دیکھتا تھا۔ اِس لئے اُس کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ علماءِ یہود کے نزدیک حزقیل مُردے زندہ کیا کرتے تھے۔ اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ رؤیا تھی جس کو یہ شکل دے دی گئی ہے (اس بارہ میں بھی انہیں مسیح سے مشابہت تھی)

(میمونیڈ یا کتاب مورانیبوکین باب ۲ آیت ۴۶
جیوش انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۳۱۵ کالم ۲)

قرآن کریم میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہ رؤیا ہی تھی (سورۂ بقرہ رکوع ۳۵)

حزقیل جلا وطنی میں بابل کے پاس ہی فوت ہوئے اور ایک لمبے عرصہ تک اُن کی قبر کی زیارت یہودی اور مسلمان کرتے رہے۔ چنانچہ ڈیر نمرود کے پاس کِفل جگہ پر یہ قبر بتائی جاتی ہے (اسجگہ کا نام کِفل ہونا صاف بتاتا ہے کہ عربوں کی زبان میں حزقیل کا نام ہی کِفل تھا) (جیوش انسائیکلو پیڈیا)

حزقیل نبی بائیبل کے مؤرخوں کے نزدیک ساتویں صدی قبل مسیحؑ کے آخر میں پیدا ہوئے اور قریباً ۵۷۰ سال قبل مسیحؑ کے آخر تک زندہ رہے۔ حزقیل نبی کا دعویٰ تھا کہ خدا تعالیٰ کی رؤیت اُن کو حاصل ہوئی۔ حزقیل زیادہ تر اپنی قوم کی تباہی کی خبریں دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب کے باب ۲ میں انہوں نے ایک رؤیا بیان کی ہے جس میں ایک کتاب انہیں دکھائی گئی اور انہیں کہا گیا کہ تم اس کو کھالو ۔ اس کتاب پر لکھا تھا نوحہ ماتم اور واویلا ۔ اِس میں اشارہ کیا گیا تھا کہ اُن کی ساری زندگی اِن الفاظ کے ماتحت گذرے گی۔

حزقیل کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے یہودیوں میں تہذیب بہت بڑھ گئی تھی۔ اور وہ ایک مضبوط قوم بن گئے تھے گو سیاسی طور پر وہ کمزور ہو گئے تھے۔ اُن کی جتھہ بندی کی وجہ سے کوئی شخص اُن کو حق نہیں سُنا سکتا تھا۔ جو حق بات کہتا تھا سارے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اِسی وجہ سے باب ۳ میں حزقیل سے کہا گیا کہ جو کچھ مَیں تجھے کہوں وہ لوگوں کو پہنچا۔ ورنہ تُو ذمہ دار ہوگا۔ یہ وہی تعلیم ہے جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے کہ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (مائدہ ع۱۰) یعنی اے ہمارے رسول! لوگوں کو وہ ساری تعلیم پہنچا جو مَیں نے تجھ پر نازل کی ہے اور اگر تُو ساری تعلیم نہیں پہنچائیگا تو یہ سمجھا جائیگا کہ تُو نے کوئی حصہ بھی نہیں پہنچایا۔

باب ۵ میں بتایا گیا ہے کہ حزقیل کو اُسترے سے اپنے سر اور ڈاڑھی کے بال منڈوانے کا حکم دیا گیا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہودی ڈاڑھی تو رکھتے تھے مگر اُسے کوئی ضروری چیز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

باب ۶ میں حزقیل بتاتا ہے کہ توحید کی مخالفت کی وجہ سے یہود تباہ کئے جائیں گے مگر تھوڑے سے لوگ بچائے جائیں گے۔

باب ۷ میں وہ پھر بنی اسرائیل کی تباہی کی خبر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی سچی جماعت جب بگڑتی ہے تو غیر قوموں کو اُس پر مسلّط کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ غیر قومیں خود بھی بُری ہیں۔ وہ خواہ کتنی ہی بگڑی ہوئی ہوں سچی کتاب سے تعلق رکھنے والی جماعت پر اُنکو مسلّط کر دیا جاتا ہے تاکہ نبی کی جماعت توبہ کرے اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرے۔

باب ۹ میں وہ بتاتا ہے کہ جو لوگ سچے دین سے تعلق رکھ کر بگڑتے ہیں ان کے حق میں شفاعت بھی قبول نہیں کی جاتی۔

باب ۱۱ میں وہ بتاتا ہے۔ آخر بنی اسرائیل کو نجات دی جائیگی اور وہ بابل کی حکومت کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔

باب ۱۲ میں وہ یہودیوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ الٰہی کلام پر تمسخر اڑاتے ہیں اور پیشگوئیوں کو فضول قرار دیتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ حزقیل کی پیشگوئیوں کو سچا کرکے یہودیوں کو جھوٹا کریگا۔ اس باب میں ایک آیت قرآن کریم کی ایک آیت کے نہایت ہی مشابہ ہے۔ فرماتا ہے :-

"جن کی آنکھیں ہیں کہ دیکھیں پر وہ نہیں دیکھتے اور اُن کے کان ہیں کہ سُنیں پر وہ نہیں سُنتے۔ کیونکہ وہ باغی خاندان ہیں۔" (آیت ۲)

قرآن کریم میں آتا ہے لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (اعراف ع ۲۲) یعنی اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں مگر وہ سُنتے نہیں ۔ وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں ۔ کیونکہ جانور تو پھر بھی کچھ سُن لیتا ہے اور کچھ دیکھتا ہے ۔ مگر یہ روحانی اندھے اور روحانی بہرے نہ کچھ دیکھتے ہیں اور نہ کچھ سنتے ہیں ۔

باب ۱۳ میں وہ ان لوگوں کو ملامت کرتا ہے جو کہ جھوٹے طور پر خدا رسیدہ بنتے ہیں ۔

باب ۲۹ میں وہ مصر کی بنو کدنضر کے مقابلہ میں ایک زبردست شکست کی خبر دیتا ہے ۔ مگر چالیس سال کے بعد وہ پھر اس کے بحال ہونے کی بھی خبر دیتا ہے ۔

باب ۳۷ آیت ۱ تا ۱۴ میں وہ اپنی ایک خواب کا ذکر کرتا ہے جو اُس نے بنی اسرائیل کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارہ میں دیکھا ۔ اِس خواب کا ذکر سورۂ بقرہ ع ۳۵ میں بھی آتا ہے ۔ جہاں فرماتا ہے :۔ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا ۔ قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۔ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۔ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ یعنی اُس شخص کے واقعہ پر غور کرو جو ایک ایسے شہر کے پاس سے گذرا ۔ جس کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی چھتوں کے بل گرا ہُوا تھا ۔ اسکو دیکھ کر اُس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس شہر کی ویرانی کے بعد اُسے کب آباد کریگا ۔ اِسپر اللہ تعالیٰ نے اُسے سو سال تک خواب میں مُردہ رکھا ۔ پھر اُسے اٹھایا ۔ اور فرمایا ۔ اے میرے بندے تو کتنے عرصہ تک اس حالت میں رہا ۔ اُس نے کہا ۔ اے میرے رب ! مَیں اس حالت میں صرف ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں ۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بھی ٹھیک ہے اور تو اِس حالت میں سو سال تک بھی رہا ہے ۔ اب تُو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کی طرف دیکھ وہ سڑا نہیں اور اپنے گدھے کی طرف بھی دیکھ ۔ اور اِن دونوں کا سلامت رہنا دیکھ کر سمجھ لے کہ تیرا خیال بھی اپنی جگہ درست ہے اور ہماری بات بھی ۔ اور ایسا ہم نے اِس لئے کیا ہے تاکہ تجھے لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں ۔ اور تو ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح اپنی اپنی جگہ رکھ کر جوڑتے ہیں ۔ پھر جب اُس پر حقیقت پورے طور پر ظاہر ہو گئی ۔ تو اُس نے کہا ۔ مَیں علی وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے ۔

عوام یہودیوں نے اس خواب کے یہ معنے لئے ہیں کہ حزقیل گویا مُردے زندہ کرتے تھے لیکن چوٹی کے علماء نے یہ تشریح کی ہے کہ درحقیقت یہ ایک خواب تھا ۔ یہی غلط فہمی قرآن کریم کی اس آیت کے متعلق بھی ہوئی ۔ عام طور پر لوگوں نے یہ خیال کر لیا کہ سورۂ بقرۃ کی مذکورہ بالا آیت میں مُردہ کے زندہ کرنے کا ذکر ہے ۔ حالانکہ مُردہ زندہ کرنے کا ذکر نہیں ۔ ایک مُردہ قوم کے زندہ ہونے کا ذکر ہے ۔

باب ۳۸ و ۳۹ میں وہ یاجوج ماجوج کی خبر

وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے اُن سب کو اپنی رحمت میں داخل کیا تھا ۔ اور وہ سب نیکوکار تھے ۔ ۵۵۰

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ

اور ذاالنّون (یعنی یونسؑ کو بھی یاد کر) جب وہ غصّہ کی حالت میں چلا گیا اور دل میں یقین تھا کہ ہم اس کو تنگ نہیں

نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ

کریں گے۔ پس مصائب میں اُس نے ہم کو پکارا ۔ (اور کہا) کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ۔ تو

سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۸﴾ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ

پاک ہے ۔ مَیں یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے تھا ۔ پس ہم نے اُس کی دُعا کو سُنا ۔

وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۹﴾

اور غم سے اُسے نجات دی ۔ اور ہم اِسی طرح مومنوں کو نجات دیا کرتے ہیں ۔ ۵۵۱

دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح وہ دنیا پر چھا جائینگے لیکن آخر اللہ تعالیٰ اُن کی تباہی کے سامان کریگا ۔

پھر باب ۴۰ سے آگے وہ یروشلم کے دوبارہ بنائے جانے کی تفصیلیں بیان کرتا ہے ۔ سارے باب اسکی کتاب کے ۴۸ ہیں ۔

اللہ تعالیٰ اِن تینوں نبیوں کا ذکر کرکے فرماتا ہے کہ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ اور اس سے اشارہ کرتا ہے کہ ایوبؑ کے بعد ہم نے ان تینوں نبیوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ بھی صابر تھے اور ایوبؑ سے مصیبت برداشت کرنے میں مشابہت رکھتے تھے ۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے باپ اور ملک کی جدائی اختیار کرنی پڑی اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو بھی مختلف مصائب اور آفات میں سے گذرنا پڑا جیسا کہ اُن کے حالات سے ظاہر ہے ۔

۵۵۰ **تفسیر** :۔ اِس میں یہ بتایا ہے ۔ کہ یہ لوگ صابر بھی تھے ۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان پر رحمتیں بھی بڑی نازل کی تھیں ۔ جس طرح حضرت سلیمانؑ اور حضرت ایوبؑ کو بڑی دنیوی عزت بھی دی تھی ۔ اِسی طرح اِن تینوں انبیاء کو بڑی دنیوی عزت بھی بخشی گئی تھی ۔ مگر ان پر مصائب بھی بڑے آئے ۔

۵۵۱ **حل لغات** :۔ اَلنُّوْنُ کے معنے ہیں اَلْحُوْتُ یعنی مچھلی (اقرب) پس ذَاالنُّوْنِ کے معنے ہوئے مچھلی والا ۔

ظَنَّ : ظَنَّ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں عَلِمَهٗ وَاسْتَیْقَنَهٗ ۔ کسی چیز کو معلوم کر لیا اور اُس کا یقین کر لیا (اقرب)

نَّقْدِرَ عَلَیْهِ :۔ قَدَرَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے اور قَدَرَ اللّٰهُ عَلَیْهِ کے معنے ہوتے ہیں قَضٰی وَحَكَمَ بِهٖ عَلَیْهِ ۔ اللہ نے اُس کے خلاف فیصلہ کیا ۔

(حاشیہ: ۲ اَلنُّوْنُ ، ۲ ظَنَّ ، ۲ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ)

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّ

اور زکریا کو بھی (یاد کر) جب اُس نے اپنے رب کو پکارا تھا اور کہا تھا کہ اے میرے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑ - اور

اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ؗ وَوَهَبْنَا لَهٗ

تُو وارث ہونیوالوں میں سے سب سے بہتر ہے - اور ہم نے اُس کی دُعا کو سُنا اور اس کو یحییٰ عطا کیا

اور قَدَرَ عَلٰی عَيَالِهٖ کے معنے ہیں ضَيَّقَ اُس نے اہل و عیال پر تنگی کی (اقرب) پس لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کے معنے ہونگے (۱) ہم تنگی نہیں کریں گے (۲) ہم اس کے خلاف فیصلہ نہیں دیں گے -

تفسیر:- اب یونسؑ نبی کا حال بیان کرتا ہے کہ وہ بھی ان سب نبیوں سے مشابہت رکھتے تھے - اُن کو بھی ایک وقت میں تکالیف پہنچیں مگر دوسرے وقت میں خدا تعالیٰ نے اُن کو بڑی عزت بخشی - چنانچہ فرماتا ہے کہ ایک دفعہ وہ ناراض ہو کر اپنے ملک سے نکل گئے مگر دل میں یقین تھا کہ ہم اُس پر تنگی نازل نہیں کرینگے چنانچہ مصیبت کے وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کو پکارا کہ اے خدا تیرے سوا کوئی معبود نہیں تُو پاک ہے - غلطی مجھ سے ہی ہوئی ہے -

بائیبل کی کتاب یوناہ میں یونسؑ نبی کا حال اس طرح درج ہے کہ خدا کی طرف سے اُن کو نینوا کی طرف جو ایک بڑا اور شرارتی شہر تھا جانیکا حکم ہوا اور کہا گیا کہ وہ اُس کے خلاف پیشگوئی کریں - مگر حضرت یونسؑ ڈرے کہ نینوا والے توبہ کرلیں گے اور عذاب سے بچ جائیں گے پس وہ نینوا جانے کی بجائے یافا چلے گئے اور ترشیش کی طرف جانے والے ایک جہاز میں سوار ہو گئے لیکن دفعۃً جہاز کو طوفان نے آگھیرا - ملاحوں نے دیوتاؤں سے بہت دُعائیں کیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا - آخر قرعہ ڈال کر انہوں نے معلوم کرنا چاہا کہ یہ عذاب کس کے سبب سے آیا ہے - اس پر حضرت یونس علیہ السلام کا نام قرعہ میں نکلا اور انہوں نے اُن سے جا کر حال پوچھا - انہوں نے اپنا سب حال بتایا اور کہا کہ میں خدا تعالیٰ کے حکم سے بھاگا ہوں مجھے پانی میں پھینک دو - اس طرح عذاب سے محفوظ رہو گے - چنانچہ لوگوں نے انہیں پانی میں پھینک دیا اور طوفان تھم گیا - خدا تعالیٰ نے ایک مچھلی کو حکم دیا اور وہ حضرت یونس علیہ السلام کو نگل گئی - اس کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام تین دن رات رہے آخر اُن کی دُعا کو اللہ تعالیٰ نے سُنا اور مچھلی کو حکم دیا کہ وہ انہیں اُگل دے - چنانچہ مچھلی نے اُن کو اُگل دیا - اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اُن کی دُعا سُن لی اور اُن کو غم سے نجات دی - اور مومنوں کو ہم اسی طرح نجات دیا کرتے ہیں -

حضرت یونس علیہ السلام کی اس دُعا سے قبولیتِ دُعا کا ایک گُر معلوم ہوتا ہے جسے ہمیشہ اپنے مدنظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ دُعا سے پہلے انسان کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کر لیا کرے اور پھر اپنا مدعا اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا کرے - چنانچہ دیکھ لو حضرت یونس علیہ السلام نے پہلے یہی کہا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ - یعنی اے میرے رب تو کامل تعریف کا مستحق ہے اور تیرے سوا اور کوئی معبود قابلِ پرستش نہیں اور پھر تُو ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے منزہ ہے

يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى

اور اس کی بیوی کو اُس کی خاطر تندرست کر دیا۔ وہ سب لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے

الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۱﴾

تھے اور ہم کو محبت اور خوف سے پکارتے تھے۔ اور ہماری خاطر عجز کی زندگی بسر کرتے تھے ۵۲

وَ الَّتِىْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا

اور اُس عورت کو بھی (یاد کر) جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی۔ پس ہم نے اُس پر اپنا کچھ کلام نازل کیا۔

وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّ هٰذِهٖۤ

اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دُنیا کے لئے ایک نشان بنایا۔ یہ تمہاری اُمت (یعنی تمہارے ابدی دشمن)

اس تسبیح و تحمید کے بعد انہوں نے اپنا مدعا پیش کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی مصیبت میں مدد چاہی۔ یہی طریق ہر مومن کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اور دُعا میں تسبیح و تحمید کو مقدم سمجھنا چاہیئے۔ دنیا میں بھی جب کسی کے دروازہ پر کوئی سائل آتا ہے تو وہ پہلے مالک مکان کی تعریف کرتا ہے اور اُس کی خوبیوں کے گیت گاتا ہے۔ اور پھر اپنا مدعا پیش کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اب میرا آنا رائیگاں نہیں جائیگا۔ یہی طریق عمل دُعا میں اختیار کرنا چاہیئے۔ اور خدا تعالیٰ کی قدرت اور اُس کی عظمت و جبروت کا اقرار کرنے اور اس کی تسبیح و تحمید کرنے کے بعد حرفِ مدعا زبان پر لانا چاہیئے۔

۵۲ **حل لغات**:۔ رَهَبًا۔ رَهِبَ الرَّجُلُ رَهْبًا کے معنے ہیں خَافَ۔ وہ ڈرا (اقرب) پس رَهَبٌ کے معنے ہونگے۔ ڈر اور خوف۔

تفسیر:۔ پھر زکریاؑ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ کہ وہ بھی اسی جماعت میں شامل تھے۔

اور فرماتا ہے کہ زکریاؑ کو بھی یاد کرو جب اُس نے اپنے رب سے دُعا کی۔ اور کہا کہ اے میرے رب! مجھے اکیلا مت چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔ تب ہم نے اُس کی دُعا سنی اور اس کی بیوی کی اصلاح کی اور اس کو یحییٰ عطا کیا۔ (دیکھو۔ اصولی طور پر اس سارے گھرانے کے حالات حضرت ایوبؑ سے ملتے ہیں) پھر وجہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کی تنگیوں کو کیوں بدل دیا۔ اسلئے کہ یہ گروہ نیکی کرنے میں جلدی کرتا تھا اور ہمارے انعام کی رغبت سے اور ہماری سزا کے خوف سے ہمیں پکارتا رہتا تھا۔ اور ہمیشہ ہمارے حضور عاجزی کیا کرتا تھا۔

رَهَبًا

أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾

ایک ہی راہ پر چلنے والے تھے - اور میں تمہارا رب ہوں - پس تم میری ہی عبادت کرو۔ ۵۳

وَتَقَطَّعُوْٓا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾

اور انہوں نے (یعنی انبیاء کے مخالفوں نے) شریعت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنے اندر تقسیم کرلئے تھے (حالانکہ) وہ سب ہماری طرف لوٹائے جانے والے ہیں ۵۴

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ

اور جو کوئی مناسب حال عمل کرے گا اور ساتھ ہی مومن بھی ہو گا - تو اُس کی کوشش کو رد نہ

لِسَعْيِهٖ ۚ وَإِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ

کیا جائیگا - اور ہم اس کے نیک اعمال کو لکھ رکھیں گے ۵۵ اور ہر ایک بستی جسے ہم نے ہلاک کیا ہے

أَهْلَكْنٰهَآ أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى إِذَا فُتِحَتْ

اس کیلئے یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اس کے بسنے والے لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آئیں گے - یہاں تک کہ جب

۵۳ تفسیر :- پھر حضرت مریمؑ کا ذکر کرتا ہے کہ وہ جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی اُس کو بھی یاد کرو اُس پر ہم نے اپنا کلام نازل کیا تھا - اور اُس کو اور اُس کے بیٹے کو تمام دنیا کے لئے نشان بنا دیا تھا -

اور یاد رکھو کہ یہ ساری جماعت ایک ہی قسم کی جماعت ہے - اور میں تم سب انسانوں کا رب ہوں پس میری عبادت کرو -

۵۴ حل لغات : تَقَطَّعُوْا تَقَطَّعَ سے جمع کا صیغہ ہے اور تَقَطَّعَ اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ کے معنے ہیں تَقَسَّمُوْهُ - انہوں نے اپنے معاملہ کو تقسیم کرلیا - وَقِيْلَ تَفَرَّقُوْا فِيْهِ اور بعض ماہرین لُغت کہتے ہیں کہ تَقَطَّعَ اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ کے معنے ہیں - انہوں نے اپنے معاملہ میں اختلاف کیا (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے - ان انبیاء کے مخالف لوگ ایسے تھے کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - مگر آخر وہ سب ہماری طرف ہی آئیں گے اور ہم اُن کا حساب اُن سے لیں گے -

۵۵ تفسیر :- پس جو کوئی اچھے عمل کرے گا اور ساتھ ہی مومن بھی ہو گا تو اس کی کوشش ضائع نہیں جائیگی - اور ہم اس کے سب نیک اعمال لکھتے چلے جائیں گے -

---

يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۷﴾

یاجوج اور ماجوج کیلئے دروازہ کھول دیا جائیگا اور وہ ہر پہاڑی اور ہر سمندر کی لہر پر سے پھلانگتے ہوئے دنیا میں پھیل جائینگے ۵۶

حَدَبٌ

يَنْسِلُوْنَ

۵۶ حل لغات:- حَدَب کے معنے ہیں اَلْمَوْجُ - پانی کی موج یا لہر۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں اَلْغَلِيْظُ الْمُرْتَفِعُ مِنَ الْاَرْضِ۔ سخت اونچی زمین (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلْحَدَبُ. مَا ارْتَفَعَ مِنْ ظَهْرِ الْاَرْضِ۔ زمین پر اٹھی ہوئی جگہ یعنی ٹیلہ۔

يَنْسِلُوْنَ۔ نَسَلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور نَسَلَ الْمَاشِيْ فِيْ مَشْيِهٖ کے معنے ہیں اَسْرَعَ۔ چلنے والے نے اپنی رفتار میں جلدی کی (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے ہر بستی جس کو ہم فنا کر چکے ہیں۔ اس پر اُسوقت تک واپس لوٹنا حرام ہے جب تک کہ یاجوج اور ماجوج کو آزاد نہ کر دیا جائے اور وہ ہر پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی ہر لہر پر سے پھلانگتے کودتے دنیا میں پھیل نہ جائیں۔ یعنی آخری زمانہ میں جبکہ یاجوج اور ماجوج یعنی روس اور مغربی ممالک کو دنیا میں پھیلنے کے لئے آزاد کر دیا جائیگا اور وہ تمام دنیا پر پہاڑ کی ہر چوٹی اور سمندر کی ہر لہر سے کودتے پھاندتے ہوئے پھیل جائیں گے۔ یعنی اِن قوموں کا غلبہ ہو جائیگا جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ تو اس کے بعد اُن کی تباہی کے متعلق ہمارا وعدہ پورا ہوگا۔

چونکہ پہاڑ کی چوٹیاں اور سمندر کی لہریں اونچی ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ دو قومیں جن کے لئے پہاڑوں اور سمندروں کی لہروں کے اوپر سے پھلانگتے اور کودتے ہوئے دنیا میں پھیل جانا مقدر تھا اُن کے متعلق يَنْسِلُوْنَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ آجکل کا زمانہ وہی ہے کہ ایک طرف روس آدھی دنیا پر قابض ہے۔ اور دوسری طرف مغربی ممالک دوسرے حصہٗ دنیا پر قابض ہیں۔ اور دونوں اپنے اپنے اصول کو لوگوں میں راسخ کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایک فریق جمہوریت کو اُس کے تمام عیوب سمیت دنیا میں ترقی دینے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسرا فریق قابلیت اور لیاقت کو ترقی دینا چاہتا ہے اور جمہوریت کی رُوح کو دبانا چاہتا ہے۔ یہ دو اصول اِس وقت دنیا میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک اصل تو اِس بات کی جدوجہد میں مشغول ہے کہ افراد کی طاقت کو بڑھا کر دنیا میں غلبہ حاصل کیا جائے اور دوسرا اصل اس غرض کیلئے کوشاں ہے کہ اعلیٰ قابلیت کو راہنمائی کی باگ ڈور دیکر دنیا پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ ان دونوں گروہوں نے دنیا پر کامل طور پر غلبہ حاصل کیا ہوا ہے اور ساری دُنیا اِن دو گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ اسلام اِن دونوں کے خلاف اور اِن دونوں سے بالکل الگ ایک درمیانی راہ پیش کرتا ہے۔ وہ انفرادیت کو بھی نظرانداز نہیں کرتا اور وہ چیدہ افراد کی طاقتوں سے کام لینے کو بھی ناپسند نہیں کرتا۔ وہ یہ اجازت بھی نہیں دیتا کہ افراد کی حُریت کو کچل دیا جائے اور یہ بھی اجازت نہیں دیتا کہ چیدہ افراد کی قابلیت سے دنیا کو محروم کر دیا جائے۔ غرض اسلامی تعلیم کا دائرہ اپنی وسعت کے ساتھ ان دونوں گروہوں پر حاوی ہے۔ اور وہ دونوں کے درمیان ایک راستہ بتاتا ہے۔ وہ ایک طرف تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ سب انسانوں میں ذہنی مساوات نہیں۔ بعض دماغ زیادہ قابلیت رکھتے ہیں اور بعض کم۔ بعض زیادہ قربانیاں کر سکتے ہیں اور بعض کم۔ بعض زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور بعض کم۔ پس

قوم کو زیادہ سمجھدار زیادہ عقلمند اور زیادہ فہیم و تدبر رکھنے والوں کی قابلیت سے محروم نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر دوسری طرف وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ افراد کی مجموعی رائے بھی بڑی طاقت رکھتی ہے اور اس کو نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں اور نہ اُسے نظر انداز کرنا انسانی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب ہے۔

بہر حال یہ دونوں اصول آجکل کلّی طور پر دنیا کو تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ آدھی دنیا ایک طرف ہے۔ اور آدھی دوسری طرف۔ یعنی آدھی دنیا مغربی ڈیماکریسی کی دلدادہ ہے اور آدھی دنیا ڈکٹیٹرشپ کی طرف مائل ہے مگر خدا تعالیٰ کا کلام بتاتا ہے کہ آخر اسلام کو فتح حاصل ہوگی۔ اور مخالفِ اسلام طاقتیں توڑ دی جائینگی اِن طاقتوں نے دنیا میں بہت دیر تک حکومت کرلی ہے۔ اب خدا کی غیرت بھڑک رہی ہے۔ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت دُنیا میں پھر قائم کی جائے گی خدا کی بادشاہت پھر اس زمین پر لائی جائیگی۔ خدا کے وجود کے دشمن مٹائے جائیں گے خواہ دنیا کی کتنی بڑی قومیں اُن کی تائید میں کھڑی ہو جائیں۔ اور یقیناً وہ دن دنیا کے لئے بڑا مبارک ہوگا۔ ہمارا خدا پھر اپنے تخت پر بٹھایا جائیگا۔ ہمارے رسولؐ کا جھنڈا پھر ہوا میں لہرائیگا۔ اور وہ امن اور صلح کا پیغام جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا پھر دنیا میں پھیلیگا اور دشمنوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور وہ اپنے مُنہ سے اس بات کا اقرار کریں گے کہ وہ خدا کے مقدس پر خاک ڈالنے میں ناکام رہے ہیں اور اپنے اس فعل پر وہ سخت شرمندہ اور نادم ہونگے۔

اِن آیات کے متعلق ایک یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جگہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ تمام قومیں جو ہلاک ہو چکی ہیں اُن کے متعلق ہمارا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ دوبارہ اِس دنیا میں واپس نہیں آئیں گی یہاں تک کہ یاجوج ماجوج کے لئے دروازہ کھول دیا جائیگا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں مُردے زندہ ہونے لگ جائیں گے کیونکہ قرآن کریم دنیا میں مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا قطعی طور پر منکر ہے۔ وہ صاف طور پر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بعض ارواح یہ استدعا کریں گی کہ اُن کو واپس کیا جائے تاکہ وہ دوبارہ نیک اعمال کریں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (سورۂ مومنون آیت ۱۰۱) ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ قیامت تک روحوں اور اس دنیا کے درمیان ایک حدِّ فاصل مقرر کر دی گئی ہے۔ اور کوئی روح اس دنیا کی طرف واپس نہیں لوٹ سکتی پس دنیا میں مُردوں کا دوبارہ احیاء قرآنی تعلیم کے رُو سے بالکل ناممکن ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کا کیا مفہوم ہے۔ سو جیسا کہ خلاصۂ مضامین میں بیان کیا جا چکا ہے اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ جب کوئی قوم ہلاک ہو جاتی ہے تو سنّتِ الٰہیّہ کے مطابق اُسے دوبارہ اٹھنے کا موقعہ نہیں ملتا لیکن یاجوج و ماجوج کے زمانہ میں اُن کی تباہی و بربادی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی رَو چلے گی جس کے نتیجہ میں کفر کا نظام لپیٹ دیا جائیگا اور وہ مسلمان جن میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے پھر ایک فاتح اور طاقتور قوم کی شکل اختیار کریں گے۔ اور اسلام دنیا پر غالب آ جائے گا۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ

اور (خدا کا) سچا وعدہ قریب آجائیگا تو اُس وقت کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا

اور وہ کہیں گے۔ ہم پر افسوس! ہم تو اس دن کے متعلق سخت غفلت میں پڑے رہے بلکہ ہم لوگ تو

ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۸﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ

ظالم تھے۔ (اُسوقت کہا جائیگا) تم بھی اور جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے سب کی سب جہنم کا

جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً

ایندھن بنیں گی۔ تم سب اُس میں داخل ہو گے۔ اگر وہ ہستیاں جن کو یہ لوگ معبود بناتے ہیں۔

مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ لَهُمْ فِيْهَا

واقعہ میں معبود ہوتیں تو پھر وہ کبھی جہنم میں نہ جاتیں۔ اور یہ ہستیاں تو مدتوں اسمیں پڑی رہینگی۔ وہ اُس میں چیخیں گے

زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور وہ اُس میں (سمجھانے والوں میں سے) کسی کی بات نہیں سُنینگے ۵۷

۵۷ حل لغات:۔ شَاخِصَةٌ۔ شَخَصَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور شَخَصَ بَصَرُهٗ کے معنے ہیں فَتَحَ عَيْنَيْهِ۔ وَجَعَلَ لَا يَطْرِفُ مَعَ دَوَرَانٍ فِي الشَّحْمَةِ۔ اُس نے اپنی دونوں آنکھوں کو کھولا اور وہ اس طرح کھلی رہیں کہ وہ حرکت نہ کرتی تھیں۔ گویا ایک طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنا شروع کردیا اور کسی اور طرف نہ دیکھ سکا۔ اسی طرح شَخَصَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہیں رَفَعَهٗ۔ آنکھ کو اٹھایا (اقرب) پس شَاخِصَةٌ کے معنے ہونگے۔ اوپر اٹھنے والی اور ٹکٹکی لگا کر دیکھنے والی آنکھ۔

زَفِيْرٌ:۔ کے معنے اَلدَّاهِيَةُ۔ مصیبت۔ اَوَّلُ صَوْتِ الْحِمَارِ گدھے کی ابتدائی آواز جو اُس کے گلے سے نکلتی ہے جو چیخ کے مشابہ ہوتی ہے (اقرب) مفردات میں ہے اَلزَّفِيْرُ تَرَدُّدُ النَّفَسِ حَتّٰى تَنْتَفِخَ الضُّلُوْعُ مِنْهُ۔ یعنی سانس کا اس طور پر آنا کہ اس سے پسلیاں پھول جائیں (مفردات)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جب وعدہ کے پورا ہونے یعنی ان قوموں کے سزا پانے کا وقت آجائیگا۔ تو گھبراہٹ میں اُن کی آنکھیں چڑھی کی چڑھی رہ جائیں گی۔ اور وہ آپس میں کہیں گے۔ افسوس! ہم اس دن سے غفلت برتتے رہے بلکہ ہم گناہوں میں بڑھتے چلے گئے تب اللہ تعالیٰ اُن سے کہیگا کہ تم اور تمہارے معبود

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا

یقیناً وہ لوگ جن کے متعلق ہماری طرف سے نیک سلوک کا وعدہ ہوچکا ہے وہ اس دوزخ سے

مُبْعَدُونَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا

دُور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آواز تک نہیں سُنیں گے اور وہ اس (حالت) میں جسے

اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ

اُن کے دل چاہتے ہیں ہمیشہ رہیں گے۔ بڑی پریشانی کا وقت بھی اُن کو غمگین

الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي

نہیں کرے گا اور فرشتے اُن سے ملیں گے اور کہیں گے یہ وہ تمہارا دن ہے

كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ

جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ۵۸؎ جس دن ہم آسمان کو اسطرح لپیٹ دینگے جس طرح بہیاں تحریر کو لپیٹ لیتی ہیں

لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ﴿١٠٥﴾

جس طرح ہم نے تمہاری پیدائش کو پہلی دفعہ شروع کیا تھا اُسی طرح پھر اسکو دُہرائینگے یہ ہم نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے ہم ایسا ہی کرینگے

۵۹م

آج جہنم میں جاؤ گے۔ اگر تمہارے معبود سچے ہوتے تو اس ذلت کو کیوں برداشت کرتے؟ اِس آیت میں اِس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گو وہ گمراہی کا زمانہ ہوگا مگر بُت پرستی مٹا دی جائیگی۔ اِسی طرح اس میں یہ بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک وقت میں تو یہ قومیں بڑا فخر کرینگی مگر جب سزا کا وقت آجائیگا تو چلّانے لگیں گی اور ایک دوسرے سے تعاون چھوڑ دیں گی۔

۵۸؎ حل لغات : حَسِيسٌ کے معنے ہیں اَلصَّوْتُ الْخَفِيُّ۔ ہلکی آواز (اقرب)

تفسیر :۔ یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بشارتیں ہونگی۔ وہ اِن عذابوں سے بچائے جائیں گے اور اُن کی بھنک تک نہ سُنیں گے اور جو کچھ اُن کے دل چاہیں گے اُن کو ملے گا۔ اور ایک لمبے عرصہ تک یہی سلوک ہوتا چلا جائیگا۔ بڑے عذاب کی تباہی اُن کو غمگین نہیں کرے گی۔ اور فرشتے اُن پر نازل ہونگے اور اُن کو تسلّی دیتے ہوئے کہیں گے کہ اس دن کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

۵۹؎ حل لغات :۔ نَطْوِيْ طَوٰی سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور طَوَى الصَّحِيْفَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ نَقِيْضُ نَشَرَهَا۔ صحیفہ کو لپیٹا۔ (اقرب) پس نَطْوِيْ کے معنے ہونگے۔ ہم لپیٹیں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ

اور ہم نے زبور میں کچھ نصیحتیں کرنے کے بعد یہ لکھ چھوڑا ہے کہ ارض (مقدس) کے وارث

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا

میرے نیک بندے ہوں گے۔ اس (مضمون) میں ایک پیغام ہے۔

لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً

اُس قوم کے لئے جو عبادت گذار ہے۔ اور ہم نے تجھے دُنیا کے لئے صرف رحمت

لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

بنا کر بھیجا ہے ۵۶۰

اور کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکِتٰبِ کے معنے ہیں طَیِّ الْکَاتِبِ لِلْکِتٰبِ یعنی جس طرح کاتب کتاب کو لپیٹ دیتا ہے (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہ وہ دن ہوگا کہ ہم آسمان کو یعنی اُس وقت کی بادشاہتوں کو اسطرح لپیٹ دیں گے جس طرح کتاب کا صفحہ تحریر کو لپیٹ دیتا ہے۔ اور ہم اعلان کر دیں گے کہ جس طرح ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے۔ یہ پکّا وعدہ ہے جس کو ہم پُورا کرکے چھوڑیں گے۔

۵۶۰ حل لغات:۔ بَلَاغ کے معنے ہیں اَلْاِنْتِهَاءُ اِلٰی اَقْصَی الْمَقْصِدِ وَالْمُنْتَهٰی اپنے مقصد اور مدّعا کی انتہائی حد تک پہنچنا۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلتَّبْلِيْغُ۔ پہنچانا۔ اسی طرح اس کے معنے اَلْكِفَايَةُ کے بھی ہیں یعنی کافی ہونا۔ (مفردات)

بَلَاغ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ہم نے زبور میں کچھ شرائط بیان کرنے کے بعد یہ بات لکھ چھوڑی ہے۔ کہ ارض مقدس کے وارث ہمارے نیک بندے ہونگے اس میں عبادت گذار بندوں کے لئے ایک پیغام ہے اور ہم نے تجھ کو ساری دنیا کی طرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بائیبل میں جو یہ پیشگوئی تھی کہ صرف خدا کے نیک بندے ارض مقدس میں رہیں گے اس سے کوئی اس وقت دھوکا نہ کھائے جبکہ بنی اسرائیل اس ملک پر غالب آجائیں گے۔ کیونکہ اس پیشگوئی میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر کوئی وقفہ پڑا تو پھر خدا کے بندے اس ملک پر غالب آجائیں گے۔ اس لئے فرماتا ہے کہ عبادت گذار بندوں کے لئے اس میں ایک پیغام ہے۔ یعنی مسلمانوں کو تو ہوشیار کر دے کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ پھر بنی اسرائیل اس پر قابض ہو جائیں گے۔ اس لئے یہاں عَابِدِیْن کا لفظ داؤدؑ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کیا اور بتایا کہ میرے بندوں کو کہدے کہ ہوشیار

ہو جاؤ۔ اگر کسی وقت تم نے میرے عباد بننے میں
کمزوری دکھائی تو پھر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو اس
ملک میں واپس لے آئیگا۔ لیکن مسلمانوں کو چاہیئے کہ
پھر عبادت گذار بن جائیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ پھر
غالب آجائیں گے۔ اور اُن کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے
کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب زمانوں کے
لئے رحمت ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا
زمانہ اس وقت ختم نہیں ہو جاتا جب بنی اسرائیل
فلسطین پر قابض ہوں۔ بلکہ اس کے بعد بھی وہ
زمانہ ہے جس کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
رحمت ہیں۔ پس مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ جب
دوبارہ رحمتِ الٰہی جوش میں آجائیگی۔ مسلمان
دوبارہ فلسطین میں غالب آجائیں گے۔

اس آیت میں زبور کی جس پیشگوئی کی طرف اشارہ
کیا گیا ہے اس کا ذکر زبور باب ۳۷ میں آتا ہے
اس میں لکھا ہے:-

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار
نہ ہو اور بدی کرنے والوں پر رشک
نہ کر۔ کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ
ڈالے جائیں گے اور سبزہ کی طرح مرجھا
جائیں گے۔ خداوند پر توکل کر اور نیکی کر
ملک میں آباد رہ۔ اور اس کی وفاداری
سے پرورش پا۔ خداوند میں مسرور رہ۔
اور وہ تیرے دل کی مرادیں پوری کریگا
اپنی راہ خداوند پر چھوڑ دے۔ اور
اُس پر توکل کر۔ وہی سب کچھ کریگا۔
وہ تیری راستبازی کو نور کی طرح اور
تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کریگا
خداوند میں مطمئن رہ۔ اور صبر سے
اُس کی آس رکھ۔ اُس آدمی کے سبب
سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا اور
بُرے منصوبوں کو انجام دیتا ہے بیزار
نہ ہو۔ قہر سے باز آ اور غضب کو
چھوڑ دے۔ بیزار نہ ہو۔ اس سے بُرائی
ہی نکلتی ہے۔ کیونکہ بدکردار کاٹ
ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی
آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔
کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائیگا
تو اُس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر
وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث
ہونگے اور سلامتی کی فراوانی سے
شادمان رہیں گے۔"

(زبور باب ۳۷ آیت ۱ تا ۱۱)

اسی طرح زبور باب ۳۷ آیت ۲۹ میں لکھا
ہے:-

"صادق زمین کے وارث ہونگے
اور اُس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔"

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وعدہ ارضِ
مقدس کے متعلق بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا۔ یہ
کوئی غیر مشروط وعدہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ
نیکی اور تقوٰی اور صلاحیت کی شرط لگائی گئی تھی
اور انہیں کھلے طور پر بتا دیا گیا تھا کہ اگر تم نے
شرارتوں پر کمر باندھ لی اور بدکرداریوں کو اپنا
شیوہ بنا لیا تو یہ ملک تم سے چھین لیا جائے گا
چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں انتباہ
کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم میں سرکشی پیدا ہوگئی۔
تو

"جیسے تمہارے ساتھ بھلائی کرنے اور

تم کو بڑھانے سے خداوند خوشنود ہوا۔
ایسے ہی تم کو فنا کرانے اور ہلاک کر ڈالنے
سے خداوند خوشنود ہوگا - اور تم اس
ملک سے اکھاڑ دئے جاؤ گے۔ جہاں تو
اس پر قبضہ کرنے کو جا رہا ہے اور خداوند
تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کریگا
وہاں تو لکڑی اور پتھر کے اور معبودوں
کی جن کو تو یا تیرے باپ دادے جانتے
بھی نہیں پرستش کرے گا ۔"

(استثناء باب ۲۸ آیت ۶۳ و ۶۴)

مگر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے حضرت
موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی خبر دے دی کہ اس عذاب
کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی تو اُن
پر پھر رحم کیا جائیگا - چنانچہ فرمایا :-

" خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو
پلٹ کر تجھ پر رحم کریگا اور پھر کر
تجھ کو سب قوموں میں سے جن میں خداوند
تیرے خدا نے تجھ کو پراگندہ کیا ہو
جمع کرے گا - اگر تیرے آوارہ گروہ
دنیا کے انتہائی حصوں میں بھی ہوں
تو وہاں سے بھی خداوند تیرا خدا
تجھ کو جمع کر کے لے آئیگا ۔"

(استثناء باب ۳۰ آیت ۳ و ۴)

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل
کو یہ خبر دی گئی تھی کہ جب تمہاری شرارتیں بڑھ گئیں
تو یہ ملک تم سے چھین لیا جائیگا - مگر اس کے
کچھ عرصہ بعد اللہ تعالےٰ تم پر رحم کرے گا اور
یہ زمین پھر تمہارے سپرد کر دی جائے گی - مگر
اس کے بعد پھر دوبارہ ایک تباہی کی خبر دی گئی۔
اور بتایا گیا کہ یہود پھر سرکش ہو جائیں گے اور
پھر اُن پر الٰہی عذاب نازل ہوگا اور وہ اس
ملک سے نکال دئے جائیں گے - چنانچہ حضرت
موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بھی پیشگوئی کی - اور
فرمایا کہ

" انہوں نے اجنبی معبودوں کے
باعث غیرت اور مکروہات سے اُسے
غصہ دلایا .... خداوند نے
یہ دیکھ کر اُن سے نفرت کی کیونکہ اُسکے
بیٹوں اور بیٹیوں نے اُسے غصہ دلایا
(اس جگہ تمام یہودی مردوں اور عورتوں
کو خدا تعالےٰ کے بیٹے اور بیٹیاں قرار دیا
گیا ہے) تب اُس نے کہا - میں اپنا منہ
اُن سے چھپا لوں گا - اور دیکھونگا کہ
اُن کا انجام کیسا ہوگا کیونکہ وہ گردن
کش نسل اور بے وفا اولاد ہیں ....
.... میں اُن پر آفتوں کا ڈھیر لگاؤنگا
اور اپنے تیروں کو اُن پر ختم کر دوں گا
وہ بھوک کے مارے گھل جائیں گے اور
شدید حرارت اور سخت ہلاکت کا لقمہ
ہو جائیں گے اور میں اُن پر درندوں کے
دانت اور زمین پر کے سرکنے والے
کیڑوں کا زہر چھوڑ دونگا - باہر وہ
تلوار سے مرینگے اور کوٹھڑیوں کے اندر
خوف سے - جوان مرد اور کنواریاں -
دودھ پیتے بچے اور پکے بال والے سب
یوں ہی ہلاک ہونگے ۔"

(استثناء باب ۳۲ آیت ۱۶ تا ۲۵)

غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو دو تباہیوں کی خبر دی گئی تھی - اور بتایا گیا تھا کہ اس ملک پر تمہارا قبضہ دائمی نہیں ہو گا - بلکہ پہلے تمہارا قبضہ ہوگا اور پھر تم نکالے جاؤ گے - پھر تمہارا قبضہ ہوگا اور پھر تم نکالے جاؤ گے - اللہ تعالےٰ کا یہ کلام کس شان اور عظمت سے پُورا ہُوا - اس کی تفصیل سورۂ بنی اسرائیل کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے - اللہ تعالیٰ اُس میں فرماتا ہے :- وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا - فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا - ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا - یعنی ہم نے تورات میں بنی اسرائیل کو یہ بات کھول کر پہنچا دی تھی کہ تم یقیناً اس ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے - اور یقیناً تم بڑی سرکشی اختیار کرو گے چنانچہ جب اِن دو دفعہ کے فسادات میں سے پہلی دفعہ کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے بعض بندوں کو تمہاری سرکوبی کے لئے تم پر کھڑا کر دیا - جو سخت جنگجو تھے - اور وہ تمہارے گھروں کے اندر جا گھُسے اور یہ وعدہ بہرحال پورا ہو کر رہنے والا تھا - پھر ہم نے تمہاری طرف دوبارہ دشمن پر حملہ کرنے کی طاقت کو لوٹا دیا - اور ہم نے مالوں اور بیٹوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی اور ہم نے تمہیں جتھے کے لحاظ سے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کر دیا -

پھر فرماتا ہے :- فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا - عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا (بنی اسرائیل ع۱)

جب دوسری بار والا وعدہ پورا ہونیکا وقت آ گیا تاکہ وہ دشمن تمہارے مُنہ خوب کالے کریں اور تمہارے معزز لوگوں سے ناپسندیدہ معاملہ کریں اور اسی طرح مسجد میں داخل ہوں جس طرح وہ اس مسجد میں پہلی بار داخل ہوئے تھے - اور جس چیز پر غلبہ پائیں اُسے بالکل تباہ و برباد کر دیں تو ہم نے اپنی اس پیشگوئی کو بھی پُورا کر دیا - مگر اب بھی کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم کر دے - لیکن اگر تم پھر اپنے اِس رویّہ کی طرف لوٹے تو ہم بھی اپنے عذاب کی طرف لوٹینگے اور یقیناً ہم نے جہنم کو کافروں کیلئے قید خانہ بنایا ہے۔

اِن آیات سے ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کا یہ وعدہ تھا کہ فلسطین کا ملک خدا تعالےٰ کے نیک بندوں کو ملے گا - اور چونکہ پہلے یہود سے یہ وعدہ کیا گیا - اس لئے اُن کو یہ ملک ملا - مگر ملک دیتے وقت خدا تعالےٰ نے کچھ شرائط بھی عاید کر دیں اور فرمایا کہ کچھ عرصہ کے بعد تمہاری شرارتوں کی وجہ سے ہم یہ ملک تم سے چھین لیں گے - چنانچہ فرمایا - فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ - جب اِن دو بار کے فسادوں میں سے پہلی بار کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئیگا تو ہم اپنے حکم کے ساتھ ایک قوم کو مقرر کریں گے جو بڑی فوجی طاقت رکھتی ہوگی اور وہ فلسطین کے تمام شہروں میں گھس جائیگی اور تمہاری حکومت کو تباہ کر دے گی - مگر ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ کچھ مدت کے بعد یہ ملک ہم تم کو واپس دے دینگے اور تمہاری طاقت اور قوت کو بحال کر دیں گے - وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ

أَكْثَرَ نَفِيْرًا ۔ اور ہم تم کو مال بھی دیں گے اور بیٹے بھی دیں گے اور تمہیں تعداد میں بھی بہت بڑھا دینگے لیکن پھر ایک وقت کے بعد ہم دوبارہ یہ ملک تم سے چھین لیں گے ۔ چنانچہ فرمایا :- فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۔ جب وہ دوسرا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئیگا ۔ تو اِس لئے کہ وہ لوگ جن کو عارضی طور پر ہم یہ ملک دینے والے ہیں وہ تمہارے مُنہ خوب کالے کریں ۔ اور جس طرح پہلی دفعہ انہوں نے تمہاری عبادت گاہ کی بے حرمتی کی تھی اُسی طرح اِس دفعہ بھی اُس کو ذلیل کریں ۔ یہ دشمن پھر تمہارے ملک میں جا گھسیگا اور تمہاری عبادت گاہ کو ذلیل کریگا ۔ اور جس جس علاقہ میں جائیگا تباہی مچاتا چلا جائیگا ۔ مگر فرمایا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ کچھ بعید نہیں کہ اب بھی تمہارا رب تم پر رحم کرے یعنی اس کے بعد پھر ہم یہ فیصلہ کرینگے کہ یہ ملک واپس دے دیا جائے ۔ مگر یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ یہودیوں کو دیا جائیگا بلکہ فرمایا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ خدا تم پر رحم کریگا یعنی اِس بدنامی کو دُور کردیگا جو تمہاری دنیا میں ہوئی ۔ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا اور اگر تم اپنی شرارتوں سے پھر بھی باز نہ آئے تو ہم بھی اپنی اُسی سنّت کی طرف لوٹیں گے اور پھر یہ ملک تم سے چھین لینگے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۔ اور جہنم کو ہم تمہارے لئے قید خانہ بنا دیں گے یعنی پھر تم اس ملک میں واپس نہیں آسکو گے ۔

چنانچہ دیکھ لو ۔ خدا تعالیٰ نے کہا تھا ۔ کہ یہ ملک کچھ عرصہ تمہارے پاس رہے گا مگر اسکے بعد چھینا جائے گا ۔ چنانچہ بابلی فوجیں آئیں اور انہوں نے عبادت گاہیں بھی تباہ کیں ۔ شہر بھی تباہ کئے ۔ اور سارے ملک پر قبضہ کرلیا ۔ اور قریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی ۔ اس کے بعد وہ حکومت بدل گئی ۔ اور پھر یہودی اپنے ملک پر قابض ہوگئے ۔

پھر مسیحؑ کے بعد رومی لوگوں نے اس ملک پر حملہ کیا اور اس کو تباہ و برباد کیا ۔ اِسی طرح مسجد کو تباہ کیا ۔ اور اس کے اندر سؤر کی قربانی کی اور اس پر اُن کا لمبے عرصہ تک قبضہ رہا ۔ لیکن آخر رومی بادشاہ عیسائی ہوگیا ۔

اِس لئے یہاں یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہودیوں کو یہ ملک واپس کیا جائیگا بلکہ فرمایا تھا کہ پھر ہم تم پر رحم کریں گے یعنی تمہاری وہ بے عزتی دُور ہو جائے گی ۔ چنانچہ جب رومی بادشاہ عیسائی ہوگیا تو پھر وہ موسیٰؑ کو بھی ماننے لگ گیا ۔ داؤدؑ کو بھی ماننے لگ گیا ۔ اِسی طرح باقی جسقدر انبیاء تھے اُنکو بھی ماننے لگ گیا ۔ تھا وہ عیسیٰؑ کو ماننے والا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی چونکہ موسوی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ عیسائی بادشاہت یہودی نبیوں کا ادب کرتی تھی ۔ تورات کا ادب کرتی تھی ۔ بلکہ تورات کو بھی اپنی مقدس کتاب سمجھتی تھی گویا خدا کا رحم ہوگیا ۔ مگر فرماتا ہے اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۔ اگر اس کے بعد تم لوگ پھر بگڑے اور شرارتیں کیں تو پھر ہم تمہارے ہاتھ سے یہ بادشاہت نکال دیںگے یعنی پھر مسلمان آجائیں گے اور اُن کے قبضہ میں یہ ملک چلا جائیگا اور وہ عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ بنیں گے اور تمہارے لئے پھر جہنم پیدا ہوجائے گا جس میں تم ہمیشہ جلتے رہوگے ۔

اِس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اسجگہ

مندرجہ ذیل امور بیان کئے گئے ہیں :-

۱ - یہ ملک یہود سے چھین کر ایک اور قوم کو دے دیا جائے گا۔

۲ - کچھ عرصہ کے بعد پھر یہ ملک یہود کو واپس مل جائیگا۔

۳ - کچھ عرصہ کے بعد یہ پھر اُن سے چھین لیا جائے گا۔

۴ - اس کے بعد یہ ملک پھر واپس کیا جائیگا مگر یہود کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ بلکہ موسوی سلسلہ کے ماننے والوں یعنی عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا جائیگا۔

۵ - اگر پھر شرارت کی گئی (اب اس میں عیسائی بھی شامل ہو گئے۔ کیونکہ وہ بھی یہودیوں کا ایک گروہ تھے) تو پھر یہ زمین اُن سے چھین لی جائے گی اور ایک اَور قوم کو دے دی جائیگی۔ یعنی مسلمانوں کو۔ مگر اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسجد میں داخل ہو کر اُس کی ہتک کریں گے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے تمام ماتحت انبیاء مقدس تھے۔ مگر اُن کی جگہیں بھی مقدس تھیں۔ اس لئے مسلمان اُن کی مسجدوں میں وہ خرابیاں نہیں کر سکتے تھے جو بابلیوں اور رومیوں نے کیں۔

یہ عجیب لطیفہ اور قوموں کی ناشکری کی مثال ہے کہ بابلیوں نے یہودیوں کے ملک کو تباہ کیا اور اُن کی مسجد کو ذلیل کیا۔ یوروپین مصنف کتابیں لکھتے ہیں تو بابلیوں کو کوئی گالی نہیں دیتا کوئی اُن کو بُرا بھلا نہیں کہتا۔ کوئی اُن پر الزام نہیں لگاتا۔ رومیوں نے اس ملک کو لیا اور اس مسجد میں خنزیر کی قربانیاں کیں۔ عیسائی رومی تاریخ پر کتابیں لکھتے ہیں۔ گبن نے بھی "دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" (THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) لکھی ہے۔ مگر سب کتابوں کو دیکھ لو۔ وہ کہتے ہیں۔ رومن ایمپائر جیسی اچھی ایمپائر کوئی نہیں حالانکہ انہوں نے اُن کی مسجد کو گندہ کیا۔ مگر وہ قوم جس نے اُن کی مسجد کو گندہ نہیں کیا۔ اس کو گالیاں دی جاتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فلسطین فتح ہُوا۔ اور جس وقت آپ یروشلم گئے تو یروشلم کے پادریوں نے باہر نکل کر شہر کی کنجیاں آپ کے حوالے کیں اور کہا کہ آپ اب ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ مسجد میں آکر دو نفل پڑھ لیں۔ تاکہ آپ کو تسلی ہو جائے کہ آپ نے ہماری مقدس جگہ میں جو آپ کی بھی مقدس جگہ ہے نماز پڑھ لی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ مَیں تمہاری مسجد میں اس لئے نماز نہیں پڑھتا کہ مَیں ان کا خلیفہ ہوں۔ کل کو یہ مسلمان اس مسجد کو چھین لیں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ ہماری مقدس جگہ ہے اس لئے مَیں باہر ہی نماز پڑھوں گا تاکہ تمہاری مسجد نہ چھینی جائے۔

پس ایک وہ تھے جنہوں نے وہاں خنزیر کی قربانی کی اور یورپ کا مُنہ اُس کی تعریف کرتے ہوئے خشک ہوتا ہے۔ اور ایک وہ تھا جس نے اُن کی مسجد میں دو نفل پڑھنے سے بھی انکار کیا کہ کہیں مسلمان کسی وقت یہ مسجد نہ چھین لیں۔ اور اس کو رات دن گالیاں دی جاتی ہیں۔ کتنی ناشکر گذار اور بے حیا قوم ہے۔

اب مسلمانوں کے پاس فلسطین آجانے کے بعد سوال ہو سکتا ہے کہ یہ ملک یہودیوں کے ہاتھ بھی نہ رہا اور عیسوی سلسلہ کے پاس بھی نہ رہا۔ یہ کیا معمّہ ہے؟ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اعتراض نہیں پڑتا۔

اس لئے کہ بعض دفعہ جب کسی بات پر جھگڑا ہوتا ہے اور وراثت کے کئی دعویدار بن جاتے ہیں۔ تو سچے وارث کہتے ہیں کہ ہم اُن کے وارث ہیں اور اُن کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت اس جگہ واقعہ ہوئی ہے۔ خدا ملک دینے والا تھا۔ خدا کے سامنے مقدمہ پیش ہوا کہ موسیٰؑ اور داؤدؑ کے وارث مسلمان ہیں یا موسیٰؑ اور داؤدؑ کے وارث یہ یہودی اور عیسائی ہیں۔ تو کورٹ نے ڈگری دی کہ اب موسیٰؑ اور داؤدؑ کے وارث مسلمان ہیں۔ چنانچہ ڈگری سے اُن کو ورثہ مل گیا۔

پھر آگے چل کر فرماتا ہے کہ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا (بنی اسرائیل ع ۱۲) پھر اس کے بعد ایک اور وقت آئے گا کہ یہودیوں کو دُنیا کے اطراف سے اکٹھا کر کے فلسطین میں لا کر بسا دیا جائیگا۔ چنانچہ وہ وقت اب آیا ہے جبکہ یہودی اس جگہ پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔

کراچی اور لاہور میں مَیں جب بھی گیا ہوں مسلمان مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ یہ تو خدائی وعدہ تھا کہ یہ سرزمین مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گی پھر یہودیوں کو کیسے مل گئی؟ مَیں نے کہا۔ کہاں وعدہ تھا۔ قرآن میں تو لکھا ہے کہ پھر یہودی بسائے جائیں گے کہنے لگے اچھا جی۔ یہ تو ہم نے کبھی نہیں سُنا۔ مَیں نے کہا نہیں قرآن پڑھانے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ تم نے سُننا کہاں سے ہے؟ میری تفسیر پڑھو تو اُس میں لکھا ہوا موجود ہے۔

تو یہ جو وعدہ تھا۔ کہ پھر یہودی ارضِ کنعان میں آجائیں گے قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱۲ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا۔ جب وہ آخری زمانہ کا وعدہ آئے گا تو پھر ہم تم کو اکٹھا کر کے اس جگہ پر لے آئیں گے۔

اس جگہ وَعْدُ الْآخِرَةِ سے مراد مسلمانوں کے دوسرے عذاب کا وعدہ ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں پر جب یہ عذاب آئیگا اور دوسری دفعہ ارضِ مقدس اُن کے ہاتھ سے نکل جائیگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ پھر یہود کو اس ملک میں واپس لے آئیگا۔

اس جگہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ یہود کے آنے کی وجہ سے اسلام منسوخ ہو گیا۔ گویا اُن کے نزدیک اسلام کے منسوخ ہونے کی یہ علامت ہے کہ عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ نے اس پر قبضہ کرنا تھا۔ جب مسلمان وہاں سے نکال دئے گئے تو معلوم ہوا کہ مسلمان عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ نہیں رہے۔ یہ اعتراض زیادہ تر بہائی قوم کرتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ یہی پیشگوئی تورات میں موجود ہے۔ یہی پیشگوئی قرآن میں موجود ہے۔ اور اس پیشگوئی کے ہوتے ہوئے اس ملک کو بابلیوں نے سو سال رکھا مگر اُس وقت یہودی مذہب بہائیوں کے نزدیک منسوخ نہیں ہوا۔ ٹائٹس کے زمانہ سے لیکر سو دو سو بلکہ تین سو سال تک فلسطین روم کے مشرکوں کے ماتحت رہا وہ عیسائیوں کے قبضہ میں نہیں تھا۔ یہودیوں کے قبضہ میں نہیں تھا مسجد میں سؤر کی قربانی کی جاتی تھی اور پھر بھی یہودیت کو سچا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہودیوں کے آنے پر نو سال کے اندر اندر اسلام منسوخ ہو گیا کیسی پاگل پن والی اور دشمنی کی بات ہے۔ اگر واقعہ میں کسی غیر قوم کے اندر آجانے سے کوئی پیشگوئی باطل ہو جاتی ہے اور عارضی قبضہ بھی مستقل قبضہ کہلاتا ہے تو تم نے سو سال پیچھے ایک دفعہ قبضہ دیکھا ہے تین سو سال

دوسری دفعہ کافروں کا قبضہ دیکھا ہے۔ اس وقت یہودیت کو تم منسوخ نہیں کہتے۔ اس وقت کی عیسائیت کو تم منسوخ نہیں کہتے۔ لیکن اسلام کے ساتھ تمہاری عداوت اتنی ہے کہ اسلام میں نو سال کے بعد ہی تم اس قبضہ کو منسوخی کی علامت قرار دیتے ہو۔ جب اتنا قبضہ ہو جائے جتنا یہودیت اور عیسائیت کے زمانہ میں رہا۔ تب تو کسی کا حق بھی ہو سکتا ہے کہ کہے لو جی اسلام کے ہاتھ سے یہ ملک نکل گیا۔ لیکن جب تک اتنا قبضہ چھوڑ اُس کا دسواں حصّہ بھی نہیں ہؤا تو اس پر اعتراض کرنا محض عداوت نہیں تو اَور کیا ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے بہائی ہیں جن کا اپنا وہی حال ہے جیسے ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ نہ آگا نہ پیچھا وہ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ مکّہ مسلمانوں کے پاس ہے مدینہ مسلمانوں کے پاس ہے اور یہ دو اہم اسلامی مراکز ہیں۔ ہم اُن سے کہتے ہیں "چھاج بولے تو بولے چھلنی کیا بولے جس میں نو سو سوراخ۔" تمہارا کیا حق ہے کہ تم اسلام پر اعتراض کرو۔ تمہارے پاس تو ایک چپّہ زمین بھی نہیں جس کو تم اپنا مرکز قرار دے سکو۔ اسلام کا مکّہ بھی موجود ہے۔ اور اسلام کا مدینہ بھی موجود ہے۔ وہ تو ایک زائد انعام تھا۔ وہ ملک اگر عارضی طور پر چلا گیا۔ تو کیا اعتراض ہے؟

بہائیت ۱۸۴۴ء سے شروع ہے اور اب ۱۹۵۸ء ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے مذہب کو قائم ہوئے ایک سو چودہ سال ہو گئے۔ اور ایک سو چودہ سال میں ایک گاؤں بھی تو انہوں نے مقدس نہیں بنایا۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں حکومت حاصل نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس بھی تو حکومت نہیں ہم نے تو چند سال میں ربوہ بنالیا پہلے قادیان بنا ہؤا تھا۔ اب ربوہ بنا ہؤا ہے یہاں ہم آتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ اکٹھے رہتے ہیں۔ پھر فلسطین میں بھی کرمل پہاڑ کی چوٹی پر ایک پورا گاؤں احمدیوں کا ہے جس کا نام کبابیر ہے۔ بہائی بھی تو بتائیں کہ دنیا میں اُن کا کوئی مکان ہے یا دنیا میں کسی جگہ پر وہ اکٹھے ہوتے ہیں؟ لیکن اسلام پر صرف نو سال کے قبضہ کی وجہ سے اُن کے بُغض نکلتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسلام ختم ہو گیا اور اپنی حالت یہ ہے کہ عکّہ کو مرکز قرار دیا ہؤا ہے اور کہتے ہیں کہ حدیثوں میں بھی پیشگوئیاں تھیں کہ عکّہ اُن کے پاس ہوگا۔ اور تورات میں بھی پیشگوئیاں تھیں مگر اب عکّہ میں بہائیوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اور اُن کے لیڈر شوقی افندی جو عکّہ کی بجائے سال کا اکثر حصہ سوئٹزرلینڈ میں گذارا کرتے وہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ اور اُن کے بعد ابھی تک بہائیوں کا کوئی قائم مقام بھی تجویز نہیں ہؤا۔ پھر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور کئی جاہل اُن کے اعتراضوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

غرض بابلیوں کے آنے اور رومیوں کے عارضی طور پر وہاں آجانے کو جس کا عرصہ ایک دفعہ ایک سو سال اور دوسری دفعہ قریباً تین سو سال کا تھا۔ اگر موسیٰؑ اور داؤدؑ کے پیغام منسوخ ہونے کی علامت نہیں قرار دیا گیا تو اس وقت یہود کا عارضی طور پر قبضہ جس میں صرف چند سال گذرے ہیں اسلام کے منسوخ ہونے کی علامت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ تو اس کے صادق ہونے کی علامت ہے۔ جب اُس نے خود یہ پیشگوئی کی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ مسلمانوں کو نکالا جائیگا اور یہودی واپس آئیں گے تو یہودیوں کا واپس آنا اسلام کے منسوخ ہونے کی علامت نہیں اسلام کے سچا ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ

پورا ہوگیا۔ باقی رہا یہ کہ پھر عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن کے ہاتھ میں کس طرح رہا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عارضی طور پر قبضہ پہلے بھی دو دفعہ نکل چکا ہے اور عارضی طور پر اب بھی نکلا ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں "عارضی طور پر" تو لازماً اس کے معنے یہ ہیں کہ پھر مسلمان فلسطین میں جائیں گے اور بادشاہ ہونگے۔ اور لازماً اس کے یہ معنے ہیں کہ پھر یہودی وہاں سے نکالے جائیں گے۔ اور لازماً اس کے یہ معنے ہیں کہ یہ سارا نظام جس کو یو۔این۔او کی مدد سے اور امریکہ کی مدد سے قائم کیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیگا کہ وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں اور پھر اسجگہ پر لاکر مسلمانوں کو بسائیں۔

دیکھو حدیثوں میں بھی یہ پیشگوئی آتی ہے۔ حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ فلسطین کے علاقہ میں اسلامی لشکر آئے گا اور یہودی اس سے بھاگ کر پتھروں کے پیچھے چھپ جائیں گے۔ اور جب کوئی مسلمان سپاہی کسی پتھر کے پاس سے گذریگا تو وہ پتھر کہیگا۔ کہ اے مسلمان! خدا کے سپاہی۔ میرے پیچھے ایک یہودی کافر چھپا ہوا ہے۔ اس کو مار۔

جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تھی اس وقت کسی یہودی کا فلسطین میں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ پس اس حدیث سے صاف پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پیشگوئی فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں یہودی اس ملک پر قابض ہونگے مگر پھر خدا مسلمانوں کو غلبہ دیگا اور اسلامی لشکر اس ملک میں داخل ہونگے اور یہودیوں کو چُن چُن کے چٹانوں کے پیچھے ماریں گے۔ پس عارضی طور پر میں اس لئے کہتا ہوں کہ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن کا حکم موجود ہے مستقل طور پر تو فلسطین عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن کے ہاتھ میں رہنی ہے۔ سو خدا تعالےٰ کے عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگ لازماً اس ملک میں جائینگے۔ نہ امریکہ کے ایٹم بم کچھ کرسکتے ہیں نہ ایچ بم کچھ کرسکتے ہیں۔ نہ روس کی مدد کچھ کرسکتی ہے۔ یہ خدا کی تقدیر ہے۔ یہ تو ہو کر رہنی ہے۔ چاہے دنیا کتنا زور لگالے۔

اس جگہ پر ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں وَعْدُ الْاٰخِرَةِ فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد آخری زمانہ ہے۔ مگر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیات میں بھی تو ایک وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کا ذکر ہے جس میں رومیوں کے حملہ کا ذکر ہے تو کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ یہ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا رومیوں کے حملہ کے متعلق ہے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ یہ وہ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اُس صورت میں وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کو عذاب کا قائم مقام قرار دیا ہے اور

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

تو کہدے کہ مجھ پر تو صرف یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ

پس کیا تم اس بات کو مانو گے (کہ نہیں)۔ پس اگر وہ پیٹھ پھیر لیں تو تو اُن سے کہدے کہ میں نے

عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ

تم (میں سے مومن و کافر) کو برابر خبر دے دی ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ وہ امر جس کا تم سے وعدہ کیا گیا

مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تھا قریب ہے یا بعید ۱۶۱

اس صورت میں وعدالآخرۃ کو انعام کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ عذاب کی پیشگوئی کو انعام سمجھ لیا جائے۔ اُس جگہ تو فرمایا ہے کہ جب دوسری دفعہ والا وعدہ پورا ہونے کا وقت آئیگا تو تم کو تباہ کر دیا جائیگا اور اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ جب وعدالآخرۃ آئے گا تو پھر تم کو لاکے اس ملک میں بسا دیا جائے گا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ وعدالآخرۃ اَور ہے اور وہ وعدالآخرۃ اَور ہے۔ وہاں وعدالآخرۃ سے مراد ہے موسوی سلسلہ کی پیشگوئی کی آخری کڑی اور یہاں وعدالآخرۃ سے مراد ہے آخری زمانہ یا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی پیشگوئی۔ پس یہ الفاظ گو ملتے ہیں لیکن دونوں کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ یہ اَور وعدہ ہے اور وہ اَور وعدہ ہے۔ وہ وعدہ عذاب کا ہے۔ اور یہ وعدہ انعام کا ہے اور انعام کا قائم مقام عذاب کا وعدہ نہیں ہو سکتا۔

۱۶۱ حل لغات:۔ اٰذَنْتُكُمْ اٰذَنَ سے متکلم کا صیغہ ہے اور اٰذَنَهُ الْاَمْرَ کے معنے ہوتے ہیں اَعْلَمَهُ بِهٖ۔ اس کو کسی امر کے متعلق بتایا (اقرب) پس اٰذَنْتُكُمْ کے معنے ہونگے۔ میں نے تم کو اطلاع دیدی ہے۔ بتا دیا ہے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ میری وحی تو توحید پر مشتمل ہے۔ باقی سب چیزیں اس کی تابع ہیں۔ پس اگر تم اس آواز کو سُن لو۔ تو تم پر فضل ہو جائیگا۔ اور اگر اس آواز سے مُنہ پھیر لو۔ تو اچھی طرح سُن لو کہ تمہاری تباہی کے وقت کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ جلد آنیوالا ہے یا بدیر۔ لیکن وہ آکر رہے گا۔

اٰذَنْتُكُمْ

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

خدا (تعالیٰ) ظاہر بات کو بھی جانتا ہے - اور جو تم چھپاتے ہو اُسے بھی جانتا ہے -

وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى

اور مَیں نہیں جانتا کہ وہ (بات جو اوپر بیان ہوئی ہے) شاید تمہارے لئے ایک آزمائش ہے اور (اس کے) ایک عرصہ تک تمہیں

حِيْنٍ ﴿۱۱۲﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا

فائدہ پہنچانا مدنظر ہے (یا ہمیشہ عیش کیلئے) ۶۲ (اس وحی کے آنے پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا۔ اے میرے رب!

الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ ع

تو حق کے مطابق فیصلہ کر دے - اور ہمارا رب تو رحمن ہے اور (اے کافرو) جو تم باتیں کرتے ہو اُن کے خلاف اسی سے مدد مانگی جاتی ہے ۶۳

النصف — فِتْنَةٌ

۶۲ حل لغات :- فِتْنَةٌ کے معنے ہیں اَلْخِبْرَةُ وَالْاِبْتِلَاءُ - آزمائش اور امتحان - اَلضَّلَالُ وَالْاِثْمُ وَالْكُفْرُ - گمراہی، گناہ اور کفر اَلْفَضِيْحَةُ - رسوائی - اَلْعَذَابُ - عذاب - اَلْعِبْرَةُ عبرت - اَلْمَالُ وَالْاَوْلَادُ - مال اور اولاد - اِخْتِلَافُ النَّاسِ فِي الْآرَاءِ وَمَا يَقَعُ بَيْنَهُمْ مِنَ الْقِتَالِ لوگوں کی آپس کی آراء مخالفت اور اُن کے درمیان لڑائی اور جھگڑا کا پیدا ہونا بھی فتنہ کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے - خدا ظاہر بات کو بھی جانتا ہے اور چھپی بات کو بھی - اور میں نہیں جانتا کہ جو کلام تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کا انکار تم کو ایک لمبی تباہی میں مبتلا کر دیگا - یا کچھ عرصہ کے لئے تم ترقیات حاصل کر لوگے -

۶۳ تفسیر :- اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی امت کے متعلق ایک دُعا سکھائی گئی ہے - اور کہا گیا ہے کہ اے محمد رسول اللہ: تُو دُعا کر کہ خدایا جس وقت مسلمانوں پر تنزل کا زمانہ آئے اور یہودی پھر ارضِ مقدسہ میں آ جائیں تو گو میری امت کے لوگ اس وقت کمزور ہونگے مگر اصل حکومت تو میری ہی ہوگی جو تیری طرف سے قیامت تک کے لئے خاتم النبیّٖن مقرر ہُوا ہوں - پس مسلمانوں کی شکست میری شکست ہوگی اور مَیں تیرے حضور میں محبوب ہوں اور یہودی تیرے حضور میں مغضوب ہیں بس میں تجھ سے دُعا کرتا ہوں کہ ایسے وقت میں میرا لحاظ کرکے میری قوم اور یہودیوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور میری قوم کو یہودیوں پر فتح دے تاکہ پھر میری قوم عبادی الصّٰلحون میں شامل ہو کر فلسطین پر قابض ہو جائے -

اور یہ ظاہر ہے کہ جو دُعا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے وہ ضرور پُوری ہو کر رہے گی - کیونکہ خدا تعالےٰ

تمسخر نہیں کیا کرتا ۔ پس مسلمانوں کو ایک طرف تو
اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے کیونکہ قرآن کریم
کے ذریعہ سے خدا تعالےٰ نے ان کو تنبیہہ کر دی ہے
اور دوسری طرف انہیں اپنے انجام سے مایوس
نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ خدا تعالےٰ نے اُن کی
دوبارہ کامیابی کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ذریعہ سے دُعا کروا دی ہے ۔ جو
پوری ہو کر رہے گی ۔

کلیدِ مضامین

جلد پنجم

مرتبہ

سیّد عبدالحی

اشاریہ

○

کلیدِ مضامین

جلد پنجم

آ

ا

صفات

ب

پیشگوئی

آنحضرتؐ اور اسلام کے متعلق پیشگوئیاں

ث

○

ج

جمہوریت

جنّت

○

○

○

ش

شرک

ص

ط

ق

○

ھ

ی

اسماء

جلد پنجم

ب

○

غ

توحید کی محبت اور شرک سے بیزاری

اخلاقِ عالیہ

صفاتِ حسنہ

اسوۂ حسنہ

معجزات

مماثلت اور موازنہ

○

ی

مقامات

جلد پنجم

حل اللغات

ی

BIBLIOGRAPHY

جلد پنجم

تفسیر

تفسیر ابن جریر ۴۰، ۱۹۲

تفسیر ابن کثیر ۳۱۰، ۵۴۱

جامع البیان ۳۳۷

روح المعانی مصنفہ علامہ آلوسیؒ ۵۰، ۵۲۸

تفسیر فتح البیان ۱۷، ۱۹۲، ۳۹۲، ۵۴۱

تفسیر قرطبی ۳۳۸

کشاف للزمخشری ۲۹۸

إِمْلَاءُ مَا مَنَّ بِهِ الرَّحْمٰنُ ۳۶۰

WHERY'S COMMENTORY ON QUR'AN

۲، ۸، ۱۴۰

القرآن جارج سیل ۱۹۲

حدیث

جامع صحیح بخاری

۳۹۷، ۴۰۱، ۴۲۲، ۴۴۹، ۴۸۵

۲، ۴۰، ۳۶۹، ۳۷۸، ۳۹۵

صحیح مسلم ۳۳۷

سنن ترمذی ۵۵۵

شمائل ترمذی ۳۹۹

سنن ابی داؤد ۱۱۷، ۵۳۵

مسند احمد بن حنبل ۲۷۰، ۵۵۵

زرقانی ۶

کتب حضرت مسیح موعودؑ و خلفاء سلسلہ

سیرت و تاریخ

اسلامیات

عیسائیت

متفرق

لغات اور دائرۃ المعارف

اخبارات و رسائل

انڈیکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم تبسم صاحب شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد